شامِ شہرِ یاراں

از

عنیزہ سید

شامِ شہرِ یاراں

قسط نمبر: 1

ڈائجسٹ کے باقاعدہ قارئین کے لیے میرا نام شاید نیا نہ ہو۔ میرا اور میرے قارئین کا رشتہ خاصا پرانا ہے۔ رشتے اور اس تعلق کے سہارے گزشتہ کئی ماہ وسال کے دوران میں نے ان گنت کہانیاں لکھیں اور آپ نے پڑھیں۔ آپ کی تعریف وتنقید کی روشنی ہی میں میرا قلمی سفر آگے بڑھا ہے، اس لیے آپ یعنی میرے قارئین میرا قیمتی ترین اثاثہ ہیں۔

ماہنامہ پاکیزہ کا اور میرا تعلق بھی اتنا ہی پرانا ہے جتنا میرے قلم کا تحریر سے۔ پاکیزہ کے منتظمین اور شعبہ ادارت سے منسلک سب ہی لوگوں نے ہمیشہ مجھے محبت، احترام اور اعزاز سے نوازا ہے اور میں اس کے لیے ان کی تہ دل سے مشکور ہوں۔

اپریل کا شمارہ اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے تو ناول شام شہرِ یاراں کی پہلی قسط بھی آپ کے زیر نظر ضرور آئے گی۔

اس ناول کے تقریباً تمام کردار اپنی نارمل زندگی گزارنے کے دوران جن تجربات سے گزرتے ہیں ان کا ان کی عمومی زندگیوں پر کیا اثر ہوتا ہے اور کس طرح بظاہر مشرق ومغرب جیسے فاصلوں اور سمتوں کے تفاوت کے باوجود یہ سب کردار بھی کسی ایک مرکزی نقطہ پر آکٹھے ہوتے ہیں یہ آپ کو ناول کی اقساط پڑھ کر اندازہ ہوتا جائے گا۔ آپ ناول پڑھیں اور اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیے گا۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہوں کہ ناول آپ کی توقعات پر پورا اترے۔

عنیزہ سید



وہ اس شہر میں کتنے عرصے کے بعد آیا تھا، یہ اسے یاد نہیں مگر یہاں آکر اسے احساس ہو رہا تھا کہ جتنا بھی درمیانی عرصہ گزرا تھا اس دوران اس شہر نے اپنی ہیئت ہی بدل لی تھی۔ سب منظر بدل گئے تھے۔ غالباً راستے بھی بدل چکے تھے۔ وہ ایک مختصر سا غیر ترقی یافتہ پرانی تہذیب کا حامل شہر چھوڑ کر گیا تھا۔ درمیان کے عرصے نے شاید جادو کی چھڑی چلا کر شہر کا رقبہ بھی وسیع کر ڈالا تھا اور ساتھ ساتھ اسے نئی شکل صورت بھی عطا کر دی تھی۔ اسے یہاں آکر اجنبیت محسوس ہونے لگی۔ یہاں لوگ بھی پہلے کی نسبت بہت زیادہ تعداد میں موجود تھے اور ٹریفک کا انداز بھی کسی بڑے شہر سے مختلف نہیں تھا۔ وہ یہاں ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا، اسے اس نامانوس ماحول سے وحشت ہونے لگی تھی مگر اس کی مجبوری یہ تھی کہ اسے یہاں ایک اہم سیمینار میں شرکت کرنا تھی اور اس کے اختتام تک اسے یہاں ہی رکنا تھا۔ ایک طرح سے وہ اس سیمینار کے منتظمین میں سے تھا کیونکہ یہ سیمینار اس ادارے نے منعقد کیا تھا جس کا وہ ایک اہم رکن تھا۔

''پی سی میں آپ کے لیے کمرا بک کرالیا گیا ہے سر، گاڑی اور ڈرائیور کی سہولت بھی موجود ہوگی۔'' اسے یہاں آنے سے ایک دن پہلے بتایا گیا تھا مگر اس شہر میں چند دن رہنے کے تصور کے ساتھ ہی اسے پرانے شہر کے اندرونی علاقے میں واقع پیلی قلعی والا وہ مکان یاد آنے لگا تھا جو اتنے برس گزرنے کے بعد بھی اب تک اس کے حافظے میں جوں کا توں موجود تھا۔ وہ اس علاقے کا نام البتہ بھول گیا تھا، اس طرف جانے کے تمام راستے بدل گئے تھے اور اسے یہ بھی یقین نہیں تھا کہ اس مکان کے مکین اب تک اسی شہر کے باسی تھے یا کہیں اور کوچ کر چکے تھے۔

''یہ ایبٹ آباد تو جھرنوں اور آبشاروں کا شہر تھا یار، پھل دار درختوں اور خاموش، صاف ستھرے راستوں کا شہر، یہاں لوگ سکون اور آرام کے لیے آیا کرتے تھے۔ یہ گوشۂ امن کہلاتا تھا، اسے کیا ہوگیا۔ یہ اتنا بدل کیوں گیا؟'' پرل کانٹی نینٹل پہنچنے کے بعد اپنے کمرے میں سامان رکھتے ہوئے اس نے اپنے ہی ادارے کے ایک مقامی کارکن سے پوچھا جو اس کی مدد کے لیے اس کے ساتھ موجود تھا۔

''ترقی کرلی ہے ناں سر اس شہر نے۔ ٹیکنالوجی کی آمد حُسنِ فطرت کے خاتمے کا اعلان کر دیتی ہے۔'' وہ لڑکا مقامی لب و لہجے کے ساتھ مسکرا کر بولا۔

''بہت افسوس ہوا۔'' اس نے یوں سر ہلایا جیسے کسی عزیز کے بچھڑ جانے کے غم کا اظہار کر رہا ہو۔ ''میرا تو سارا تصور ہی غارت ہوگیا۔ راستے بھر میں یہاں آنے کے خیال سے بہت خوش ہوتا رہا۔''

''ایسا لگتا ہے آپ بہت عرصے بعد ایبٹ آباد آئے ہیں۔'' سترہ سالہ لڑکے نے دانت نکوستے ہوئے کہا۔ ''مجھے لاہور دیکھے عرصہ ہوگیا۔ شاید چھ سات سال سے بھی زیادہ، اب اگر میں وہاں جاؤں تو میرا کیا حال ہوگا سر؟''

''ارے یار لاہور تو ہمیشہ سے ہی ایسا ہے مصروف، تیز رفتار اور رش کا مارا ہوا، اتنے سالوں میں زیادہ سے زیادہ اتنا ہی فرق پڑا ہوگا ناں کہ لوگوں اور گاڑیوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا ہوگا۔ باقی سب ویسا ہی ہے بابا مگر یہاں تو لگتا ہے انقلاب آگیا...... افوہ۔'' اس نے ایک بار پھر سر ہلایا۔ وہ لڑکا مسلسل ہنس رہا تھا شاید اس کے جھلانے پر یا پھر شاید اپنے شہر کی تیز رفتار ترقی پر۔

مگر اس شام جب وہ اس لڑکے جس کا نام عدنان تھا کے ساتھ شہر میں گھومنے کے لیے نکلا تو اسے خیال آیا کہ یہ مقامی لڑکا خوش ہونے اور فخر کرنے میں حق بجانب تھا۔ شہر ملٹی نیشنل چین اسٹورز، فاسٹ فوڈ، ریسٹورنٹ

اور بڑے بڑے شاپنگ مالز سے سجا پڑا تھا یہاں بیوٹی سیلونز اور جم کی بھی کمی نہیں تھی اور بڑے نام والی کمپنیوں کے ہیڈ آفس بھی بے شمار تھے۔ ایبٹ آباد ہمیشہ سے اچھے اسکولوں کا شہر جانا جاتا تھا مگر وہ چند ہی گنے چنے اسکول تھے مگر اب تو اس شہر کے چپے چپے پر چند گز کے فاصلے پر اسکول ہی اسکول نظر آ رہے تھے۔

''یہاں کچھ وقت پہلے کی کوئی چیز باقی رہ بھی گئی ہے یا نہیں؟'' اس نے اکتا کر عدنان سے پوچھا۔

''سب چیزیں موجود ہیں سر۔ الیاسی مسجد، شملہ پہاڑی، سربن، ہیڈ کوارٹرز میس، ہرنو۔'' وہ گنوانے لگا۔

''ہرنو!'' حمزہ کے کانوں کو یہ لفظ بہت مانوس لگا اور ایک پرانا منظر اس کی آنکھوں کے آگے سے گزرا۔ ''کل چلیں گے یار ہرنو، ابھی واپس چلتے ہیں۔'' اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ عدنان نے شانے اچکائے اور گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

واپسی پر اسے کئی کام نمٹانے تھے۔ سیمینار کے لیے پہلے سے تیار شدہ خاکے کو فائنل شکل دینا تھی۔ چند متعلقہ لوگوں سے ملاقات اور کئی میلو کرنا تھیں۔ وہ اپنے کام کی دنیا میں کھو گیا اور شہر کی جدیدیت کا دکھ کچھ وقت کے لیے بھول گیا۔

☆☆☆

''میرے بچوں نے اپنی شادیوں کے سلسلے میں میری پسند پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ آپ دیکھ لیں سب کے سب کتنی خوش باش زندگیاں گزار رہے ہیں۔'' مہرین کے لہجے میں تفاخر واضح تھا جو سعدیہ نے محسوس کیا۔ مہرین کے بچے خوش باش زندگیاں گزار رہے تھے، یہ سب ہی جانتے تھے مگر اُن کی شادیوں میں مہرین کی پسند کا کتنا دخل تھا چند لوگوں کو ہی معلوم تھا اور ان واقفانِ حال میں سعدیہ بھی شامل تھیں مگر مہرین ایسی باتیں کیا بھی انہی کے سامنے کرتی تھیں۔ سعدیہ ان کی اس قسم کی باتوں کو بڑے تحمل سے سنا کرتی تھیں مگر اس روز ان کے مزاج پر تلخی حاوی تھی۔

''حمزہ کے متعلق کیا خیال ہے۔ اس کے لیے تمہیں کوئی مناسب لڑکی پسند نہیں آئی، اس کا کب تک تنہا رہنے کا ارادہ ہے۔ اب تو وہ ماشاء اللہ اتنی اچھی جاب کر رہا ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ الفاظ ان کے منہ سے پھسل گئے جو یقیناً مہرین کو پسند نہیں آ سکتے تھے۔

''حمزہ کے لیے لڑکیوں کی مجھے کوئی کمی نہیں۔'' مہرین نے اپنے اندر اٹھنے والی غصے کی لہر کو بہ مشکل دباتے ہوئے کہا۔ ''مگر وہ ابھی اپنی فیلڈ میں مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے اسے یکسوئی کی ضرورت ہے۔ ابھی وہ شادی میں انٹرسٹڈ نہیں ہے۔''

''حمزہ کی اور تمہاری چوائس میں تو زمین آسمان کا فرق ہوگا ناں نا مہرین!'' سعدیہ اس روز مہرین کے تفاخر پر کچھ زیادہ چڑ گئی تھیں، اس لیے انہیں ایسی باتیں کرنے میں مزہ آ رہا تھا جن سے مہرین کو تکلیف ہو سکتی تھی۔ ''بھئی بی اماں کی تربیت نے حمزہ کی شخصیت کو قدرے کیا بلکہ بہت مختلف رخ دے دیا ہے۔ تمہارے اور اس کے مزاج کسی طرح بھی میل نہیں کھاتے بلکہ کبھی کبھار تو ایسا لگتا ہے کہ وہ تمہارا بیٹا ہے ہی نہیں، اس گھر کا فرد ہے ہی نہیں۔''

''کیا مطلب، کیسا لگتا ہے وہ؟'' مہرین کو یہ بات سب سے زیادہ چبھی تھی۔

''اصل میں اس کا brought up (پرورش) مختلف ماحول میں ہوئی ہے ناں، اس میں اس گھر کے ماحول کا سا رنگ نہیں ہے، وہ بہت مختلف لگتا ہے۔'' اب کے سعدیہ کو اپنی بات کو سنبھالا دینا پڑا تھا۔

"وہ دنیا کے بہترین تعلیمی اداروں سے پڑھا ہے، دولت کی اس کے پاس کمی نہیں ہے، کیسے رہنا ہے...... کیسے اٹھنا بیٹھنا ہے...... کیسے بات کرنی ہے...... کیسے کھانا پینا ہے اس سے زیادہ کون بہتر جانتا ہوگا۔ اس کی شخصیت پرفیکٹ ہے۔ وہ تمہیں کیوں مختلف لگتا ہے بھلا......؟"

"اس کا مطلب ہے کہ تم سب فیملی ممبرز پرفیکٹ ہو۔" سعدیہ نے دل میں سوچا اور مسکرائیں۔

"میں نے مختلف ہونے کی بات کی ہے۔ اس کی شخصیت میں کسی کمی کا ذکر تو نہیں کیا۔ تمہارا کیا خیال ہے بی اماں کی تربیت اور ان کے ہاں کے ماحول اور تمہارے گھر کے ماحول میں کوئی فرق نہیں۔ تمہاری اور بی اماں کی شخصیتوں میں تو زمین آسمان کا فرق تھا نا مہرین۔" انہیں یہ ہلکے ہلکے وار کرنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"حمزہ کو واپس آئے کئی برس گزر گئے، ماحول اور تربیت کا فرق اگر تھا بھی تو مٹ چکا ہے، حمزہ میرے باقی بچوں کی طرح ہی ہے، یہ لوگوں کی غلط فہمی ہے کہ وہ مختلف ہے۔" مہرین نے ناگواری سے جواب دیا۔ سعدیہ کو اندازہ ہوگیا کہ جتنا وہ مہرین کو چڑانا چاہتی تھیں، اتنا ہی وہ چڑ چکی تھیں۔ اس لیے انہوں نے اس موضوع پر مزید بات نہ کرنا ہی بہتر جانا اور کوئی اور بات کرنے لگیں۔

☆☆☆

کہنے کو تو یہ نیا ٹھکانا پُرآسائش اور خوب صورت تھا۔ اس کی آرائش اور دلکشی پہلے والے ٹھکانے سے چار گنا زیادہ تھی۔ پچھلے ایک عرصے سے کام پر پڑے مندے کے سارے دلدّر بھی دور ہونے لگے تھے مگر امراؤ بیگم کا دل یہاں اب تک نہیں لگ پایا تھا۔ اس نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی اور جس منظر میں زندگی گزاری تھی وہ اس سے یکسر مختلف تھی۔

"ہر دھندے، ہر کام اور ہر پیشے کا اپنا ایک مخصوص رنگ ڈھنگ ہوتا ہے۔ ایک خاص پس منظر کو اس کے پس منظر سے جدا کر دو تو اس کا انداز بھی بدل جاتا ہے اور لطف بھی۔"

یہ سنہری قول امراؤ بیگم کی مرحومہ ماں زبیدہ جان کا تھا جو اپنے وقت کی نامی گرامی رقاصہ اور پیشہ ور طوائف تھی۔ اس بازار میں جس کا طوطی بولتا تھا اور جسے اپنے پیشے سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا، امراؤ بیگم نے ایک عرصے تک اپنی ماں کے نام کی کمائی کھائی تھی۔ اس ڈیرے پر لوگ زبیدہ جان کے مرنے کے بعد بہت عرصے بعد تک اُس محفل کا ایک عکس پانے ہی کی امید پر آتے رہے جس کے سُرور میں زبیدہ جان نے اپنی زندگی میں انہیں ڈبوئے رکھا تھا۔ اسی چاہ نے امراؤ بیگم کے ڈیرے اور اس کی رونقوں کو آباد کیے رکھا تھا مگر پھر رفتہ رفتہ وہ پرانے لوگ ختم ہونے لگے اور نئی نسل جسے زبیدہ جان کے نام سے واقفیت تھی نہ اس کے فن سے کوئی لگاؤ تھا، ان کے شوق بھی مختلف تھے اور فرمائشیں بھی مختلف۔

امراؤ بیگم کے ڈیرے کی محفلیں ویران ہونے لگیں اور اس کے چوبارے پر دھول اُڑنے لگی۔ اس کی اور اس کی بہن کی بیٹیاں گھنگرو باندھے دن رات رقص کی مشق اور اپنی نانی کے چھوڑے ورثے کی حفاظت کی خاطر انہی ادب آداب اور رکھ رکھاؤ کی تربیت حاصل کرتے جوان ہوئیں جو اس ڈیرے کا خاصہ اور روایت تھی مگر زمانہ بدل گیا تھا۔ پیشے کے آداب بھی بدل گئے تھے۔ ان تنگ گلیوں اور اونچے چوباروں کا رخ کرنے والوں کے انداز اور شوق بھی بدل گئے تھے۔ جب نوبت فاقوں تک آنے لگی تو امراؤ بیگم نے گویا جھرجھری لے کر آنکھ کھولی تھی۔ ملک کے مختلف بڑے شہروں میں اس کی ماں کی رشتے دار خواتین کے ڈیرے آباد تھے۔ ملتان سے اس کی ماں کی خالہ زاد بہن اس سے ملنے آئی اور اس کے چوبارے کی ویرانی دیکھ کر خون کے گھونٹ

بھر کر رہ گئی۔

"اے بی امراؤ تم کس دنیا کی باسی ہو، کن خوابوں میں زندگی گزارتی پھر رہی ہو۔ بی بی ہوش کے ناخن لو۔ کوٹھے جیسی جوان لڑکیوں کا حسن اور فن یوں آنکھ بند کیے بیٹھی ضائع کر دو گی کیا؟" وہ امراؤ بیگم کے سر پر چلائی تھی۔

"نہ آنکھ بند کیے پڑی ہوں نہ خوابوں میں رہتی ہوں۔" امراؤ بیگم نے دکھ بھرے انداز میں کہا۔ "لڑکیاں شکل صورت میں کم ہیں نہ تربیت میں، سرِ شام بن سنور کر اسی طرح دریچوں میں کھڑی ہوتی ہیں، تمام لوازمات کے ساتھ مگر نہ کوئی انسان کا بچہ اوپر آتا ہے اور نہ ہی پان کی گلوری بھجوائی جاتی ہے۔"

"جب ہی تو کہہ رہی ہوں کہ خوابوں کی دنیا میں رہتی ہو تم، اب کہاں زمانے رہے پان کی گلوریوں پر بسائی بھجوانے کے اور بن سنور کے دریچوں میں بیٹھ کر انتظار کرنے کے، تم ماسی زبیدہ کے زمانے میں رہتے رہتے زمانے کی دھول بن جاؤ گی امراؤ بیگم...... ہوش کے ناخن لو اور نئے ادب آداب، نئے اطوار سیکھو۔" امراؤ بیگم اپنی خالہ کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھ گئی اور اس کے مشوروں سے مستفید ہونے کی کوشش کرنے لگی۔

روزگار اور دھندے کو بچانے کے جو طریقے خالہ نے امراؤ بیگم کو بتائے تھے وہ دل کو نہ لگنے کے باوجود امراؤ بیگم ان پر عمل کرنے پر مجبور تھی اگر وہ ایسا نہ کرتی تو فاقوں کی نوبت آجاتی۔ گزرتے وقت اور دھندے کی کمی نے بہت سے لوگوں کو امراؤ بیگم کا ڈیرا خیرباد کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور انہی جانے والوں میں حضوری بخش بھی شامل تھا جو امراؤ بیگم کی اوائلِ جوانی کے دور کی یادگار تھا۔ حضوری بخش نے خاصے کڑے وقتوں میں امراؤ بیگم کا ساتھ دیا تھا مگر ڈیرے کی رونق اس کی کمزوری تھی۔ چراغ جلنے کے ساتھ ہی جو گہما گہمی اس ماحول کا خاصہ تھی وہ امراؤ بیگم کے یہاں کم ہوتے ہوتے معدوم ہونے لگی تھی اور اس کے ساتھ ہی حضوری بخش کا دل بھی ان ویرانیوں سے الجھنے لگا۔ ایک روز وہ ننگے سر اور ننگے پاؤں ہاتھ جوڑے امراؤ بیگم کے سامنے پیش ہوا اور ہمیشہ کے لیے رخصت طلب کرلی۔ امراؤ بیگم جانتی تھی کہ اس طلبیِ رخصت کے بعد حضوری بخش روکے نہ رکے گا۔ اس نے بلاتامل اسے اجازت دے دی مگر اسی رات امراؤ بیگم کا دل مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ حضوری بخش کی ڈیرے پر موجودگی امید کی آخری کرن تھی جو اس کے رخصت ہونے کے بعد ماند پڑ گئی تھی۔ وہ مسہری پر آنکھیں موندے پڑی رہتی، کبھی کبھار آنکھ کھولنے پر جوانی کو خدا حافظ کہتی بیٹیاں پاؤں میں گھنگرو باندھے ناتجربہ کار سازندوں کے بے سُرے سازوں کی لے پر محوِ مشق نظر آتیں۔ چراغ جلائے جانے کے بعد بھی نشست گاہ کا در وہ شاذ ہی اٹھتا۔ اِکا دُکا شوقین جو اِدھر کا رخ کرتا وہ بھی ایک شام کے بعد دوبارہ شکل نہ دکھاتا تھا۔ امراؤ بیگم کا دل ان حالات نے خاصا کمزور کر دیا تھا مگر خالہ کے مشوروں کو سننے اور سمجھنے کے بعد اس نے ایک بار پھر کمزور دل پر قابو پایا اور نئی تگ و دو کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ دو ہفتے کے اندر خالہ نے ملتان سے تین ایسے تحفے اسے بھجوائے جنہیں وصول پاتے ہی امراؤ بیگم کے اُجڑے دیار کی رونقیں گویا دوبارہ لوٹ آنے لگیں۔

☆☆☆

نگین کو صبح کا وقت شادی سے پہلے بہت اچھا لگتا تھا لیکن شادی کے بعد صبح کے وقت کے بارے میں اس کی رائے بدل چکی تھی۔ علی الصباح اٹھ کر ساس، سسر کو بیڈ ٹی دینے سے اس کے مصروف دن کا آغاز ہوتا تھا اور اس کے بعد چل سو چل، میاں جو دفتر جاتے تھے، دو دیور یونیورسٹی کے لیے نکلتے تھے، ایک نند کو کالج جانا ہوتا

''پھر لوگ صرف بتاتے کیوں ہیں کہ کوئی کام کیسے کیا جانا چاہیے۔ کر کے کیوں نہیں دکھاتے۔'' اس نے اشعر کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

''جو لوگ تجربہ کار ہوتے ہیں، وہ اپنے تجربے سناتے ہیں، ہوسکتا ہے کر کے دکھانے کو دل نہ چاہتا ہو۔'' اشعر نے یقیناً بے دھیانی میں جواب دیا تھا۔

''پھر lead کرنے کا شوق کیوں رہتا ہے انہیں، بس تجربے سنا دیا کریں، بھلے کوئی عمل کرے نہ کرے۔'' نگین نے جل کر کہا۔

''تو نہ کیا کرے عمل کوئی، اس میں اتنا ناراض ہونے والی کون سی بات ہے۔'' اشعر نے فائل پر نظریں جمائے جمائے مسکرا کر کہا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بات کو سمجھ رہا تھا۔

''آپ کو پتا ہے میں کیا کہہ رہی ہوں۔'' نگین کو اس کے مذاق اڑانے والے انداز پر غصہ آنے لگا۔

''میری پیاری بیوی!'' اشعر نے بالآخر فائل سے نظریں ہٹا کر اس کی جانب دیکھا۔ ''یہ گھر، اس گھر کی عملداری، اس کے معاملات، میں، میرا دل، میرے بچے سب تمہارے اختیار میں ہیں۔ اتنا سب کچھ اختیار میں ہوتے ہوئے کبھی کبھار تجربات کی روشنی کی طرف دیکھنا پڑ جائے تو آنکھیں چندھیانے کی کیا ضرورت ہے۔ نظریں جھکا لینے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ ہاں اگر روشنی کی ایک آدھ کرن پر نظر پڑ جائے تو کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ ممکن ہے یہ کرن کچھ اچھے مناظر کو واضح کر دے۔''

اسے اشعر کی یہی بات تو اچھی لگتی تھی کہ بظاہر اس کے مسائل کو نہ سنتے ہوئے بھی اسے ان کا حل انتہائی آسانی سے سمجھا تا تھا۔ یہی ذہنی ہم آہنگی اب تک ان کے رشتے کو بہتر انداز میں آگے بڑھا رہی تھی۔

کبھی کبھار وہ یہ بھی سوچتی کہ اگر اشعر کی طبیعت میں اتنا حوصلہ، اتنی نرمی اور اتنی سمجھ بوجھ نہ ہوتی تو اس کا کیا بنتا۔ اسے اپنی شادی سے پہلے کی زندگی یاد آتی جس میں اس کے دن صرف پڑھائی کی مصروفیات اور دیگر مسائل و ذمے داریوں سے آزاد گزر رہے تھے۔ وہ ایک ذہین اور لائق طالب علم تھی، ادبی مزاج رکھتی تھی، کالج میگزین کی ایڈیٹر، ہم نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتی تھیں۔ وہ دن جب زندگی ایک جستجو اور کچھ پا لینے کا نام ہوا کرتی تھی۔ وہ خوابوں اور خیالوں میں ان دیکھی دنیاؤں کی سیر کرنے اور انہیں مسخر کر لینے کے احساس میں گھری رہتی تھی۔ اس کی ان سرگرمیوں کو گھر میں سراہا جاتا تھا اور اس کی کامیابیوں پر سب خوش بھی ہوتے تھے بلکہ سوائے اس کی مرحومہ نانی کے...... کوئی اور اس بات کا ادراک نہیں کرتا تھا کہ ان سب چیزوں میں جو وہ سیکھ رہی تھی ایک بہت بڑی کمی تھی اور وہ کمی جس کی طرف سب سے کم توجہ دی گئی، شادی کے بعد اس کی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔

اسے اپنے لبرل والدین کی اس ادا کی بھی کبھی سمجھ نہیں آئی تھی جو انہوں نے اشعر کا رشتہ آنے پر اسے ایم اے کی پڑھائی چھڑوا کر چٹ پٹ اس کا بیاہ کر کے دکھائی تھی۔ کچھ یوں عجلت میں زندگی کا پانسا پلٹ دیا گیا کہ وہ خود ہڑبڑا کر رہ گئی۔ شادی کا تصور ابھی اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ اس کے بہت سے خواب اور ان دیکھی دنیاؤں کو مسخر کرنے کا عزم تو بکھرا ہی تھا مگر جس نئی مہم کو سر کرنے پر اسے لگا دیا گیا تھا وہ جوئے شیر لانے سے بھی زیادہ محنت طلب تھی۔

''اگر ہم زندگی کی مثبت باتوں کی گنتی کرنا شروع کر دیں تو منفی باتوں کی گنتی کا وقت بہت دیر سے آتا ہے بلکہ اکثر تو آتا ہی نہیں کیونکہ زندگی میں مثبت باتیں اس قدر ہوتی ہیں کہ جن کو گننے کے لیے زندگی چھوٹی پڑ جاتی

تھا اور دو اس کے اپنے بچے جن میں سے ایک اسکول جاتا تھا اور دوسری گود کی بچی تھی۔ نگین کو گھن چکر بننے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی تھی۔ شروع شروع کے ایک دو سال کے بعد اگرچہ اس نے اپنی بدحواسیوں پر خاصا قابو پالیا تھا اور ایک منظم طریقے پر گھرداری چلانے کی کوشش میں کسی حد تک کامیاب بھی ہو چکی تھی مگر صبح کی مصروفیت اور اپنے گھن چکر بننے پر قابو پانا ابھی تک اس کے بس میں نہیں ہوا تھا۔ وہ بھی ایسی ہی ایک صبح تھی اور نگین کا ایک پاؤں باورچی خانے میں اور دوسرا کھانے کے کمرے میں تھا۔ اس کا دماغ کئی باتوں پر جھنجلایا ہوا تھا۔

''خدا جانے ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ڈبل روٹی کے پیکٹ سے ربڑ بینڈ اتار کر رکھو تو وہ غائب ہو جاتا ہے، سیکنڈز میں۔ ادھر اُدھر ہو جاتا ہے اور مل کر ہی نہیں دیتا۔'' وہ سوچ رہی تھی۔ ''دودھ کو جتنی مرتبہ گرم کرو، اتنی مرتبہ اس پر نئے سرے سے بالائی آ جاتی ہے۔'' گھر میں کوئی بھی بالائی والا دودھ استعمال نہیں کرتا تھا۔ اس لیے ہر مرتبہ اسے بالائی علیحدہ کرنا پڑتی تھی۔ اسے بیک وقت کئی کام کرنے پڑتے تھے۔ توے پر روٹی ہوتی، سینڈوچ میکر میں سینڈوچ رکھے ہوتے اور ٹوسٹر میں ٹوسٹ، ایک چولھے پر چائے کا پانی کھول رہا ہوتا۔ ہر طرف دھیان کرتے کرتے کچھ نہ کچھ خرابی ضرور ہو جاتی۔ وہ ہر صبح کا آغاز اس امید اور دعا کے ساتھ کرتی کہ اس روز کوئی گڑبڑ نہ ہو مگر گڑبڑ ہو کر رہتی۔ اس کی ساس اگرچہ روایتی ساسوں کی طرح نکتہ چینی کرنے کی عادی نہ تھیں مگر اسے سمجھانے کے سے انداز میں کئی تلخ باتیں کر جاتیں۔

''اسی لیے تو کہتے ہیں کہ بچیوں کو شروع سے ہر طرح کے حالات کے مطابق گزارہ کرنے کی عادت ہونی چاہیے۔'' وہ کبھی کبھار کہہ دیتیں۔

''اگر ہر کام سے متعلق تھوڑی بہت تیاری پہلے سے کی گئی ہو تو گڑبڑ نہیں ہوتی۔'' کبھی اسے یہ بھی سننے کو ملتا۔

''قصور تمہارا بھی نہیں، تم گھر میں چھوٹی تھیں اس لیے تم پر کوئی ذمے داری ڈالی ہی نہیں گئی۔'' وہ کہتیں۔ ''خیر چھوٹے تو ہم بھی تھے مگر شادی کے بعد بھرا پُرا گھر اپنا اور اس کے بیسوں کام نمٹانا پڑے تو اسی لیے آزمائش پر پورے اترے کہ اماں نے ہر کام سکھا کر بھیجا تھا اور بھئی کام کرنے سے زیادہ کام کرنے کے طریقے سیکھنے میں وقت لگتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری اماں تمہاری پڑھائی کرنے کا لحاظ ہی کرتی رہ گئیں۔ اب اس صائمہ (نگین کی چھوٹی نند) کو دیکھو، پڑھ تو رہی ہے، کام شاذونادر ہی کرتی ہے مگر جب کرنا پڑے تو کس سلیقے سے کرتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے کھلاؤ سونے کا نوالہ مگر دیکھو شیر کی نگاہ سے والے محاورے پر عمل کیا عمر بھر۔''

نگین کو ان کی سب باتیں ہی سچی لگتیں۔ اپنی شادی سے پہلے کی زندگی یاد آنے لگتی، بے فکری کی زندگی، آزاد، خوش باش زندگی، کوئی ذمے داری نہ در دسری۔ کیا اس وقت اس نے کبھی سوچا تھا کہ شادی کے بعد اسے ایسی زندگی کا سامنا کرنا پڑے گا جس میں ذمے داریوں کا بوجھ رات بھر اس کی نیندیں اُڑائے رکھا کرے گا۔ ایک خوبی اس میں یہ بھی تھی کہ وہ فراریت پسند نہیں تھی اور حالات سے سمجھوتا کر لینے کی قائل تھی۔ خود کو بہتر کرنے کا حوصلہ بھی اس میں تھا مگر یہاں مسئلہ یہ تھا کہ اصلاح کرنے کے لیے ہدایات دینے والے تو بہت تھے مگر سامنے آ کر رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

''leading from the front'' وہ کبھی کبھار اپنے میاں اشعر سے سنجیدگی سے بات کرتی۔ ''یہ الفاظ سنے ہیں کبھی آپ نے؟''

''ہوں......'' وہ اپنی آفس فائل میں سر دیے جواب دیتا۔

ہے۔'' اسے کالج کے زمانے کی ایک استاد کی بات اکثر یاد آتی جو اس کے ذہن سے چپک کر رہ گئی تھی۔ یہ بات انہوں نے اس کی آٹوگراف بک پر لکھ کر اسے دی تھی۔ سو اس نے اس نصیحت پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ شاید اس کے پاس اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ اس بات کا بہر حال اسے بڑی اچھی طرح اندازہ تھا کہ اگر وہ منفی باتوں کو پہلے گننا شروع کر دے گی تو جو ہاتھ پاؤں وہ نئی زندگی میں رچنے بسنے کے لیے مار رہی تھی وہ بھی نہ مار سکے گی۔ سو اس نے مثبت پر نظر کرنا شروع کر دی اور اس کے خیال میں سب سے اہم اور سرفہرست مثبت بات اشعر کا مزاج تھا۔ باقی انسان ہونے کی حیثیت سے جو کبھی کبھار ہی منفی پر اس کی نظر پڑ بھی جاتی تو اس میں اس کی فطری جبلت کا ہاتھ تھا، اس کی شعوری کوشش کا اس میں کچھ دخل نہ تھا۔ ہاں جب بھی کوئی لمحہ، کوئی دن اسے بہت مشکل لگتا تو اسے دو لوگ بہت یاد آتے، وہ دو لوگ جو اَب ماضی کا حصہ بن چکے تھے۔ نانی مرحومہ جو اس کی شادی کے بعد محض چند ماہ ہی زندہ رہیں اور حمزہ محمود جو اس کے سگے ماموں کا بیٹا تھا اور جس سے ملاقات ہوئے اب کئی برس گزر چکے تھے۔

☆☆☆

وہ ٹی وی کا ریموٹ ہاتھ میں پکڑے مختلف چینل بدل رہی تھی۔ یہ غالباً ہر گھر کے ہر فرد کا بیکاری کے وقت کا مشغلہ تھا اور اب تو وہ اس مشغلے سے بھی تنگ آ چکی تھی۔ ہر جگہ یکسانیت تھی، ایک جیسے چہرے، ایک جیسی باتیں، میک اپ سے لپے پتے چہرے، نیم عریاں لباس، دیسی اور بدیسی زبان کے مرکب، وہ بددلی سے چینل بدلتی ٹی وی پر نظریں جمائے بیٹھی تھی جب ہی اچانک ایک چینل پر اسے ایک چہرہ ایسا نظر آ گیا جسے وہ ہزاروں میں بھی پہچان سکتی تھی۔ وہ بے اختیار سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اسے اپنی نظروں پر یقین کرنے میں بھی کچھ وقت لگا۔ پہلے اسے اس نے محض مشابہت گردانا چاہا مگر پھر اس کے کان نے وہ نام بھی سنا جو اس چہرے کو دیا جا رہا تھا۔ وہ بلاشبہ نہد تھا جسے وہ ایک لمبے عرصے کے بعد دیکھ رہی تھی۔ اس کوکنگ پروگرام میں وہ کیا کر رہا تھا، اس کی حیرت زدہ نظریں مہارت سے مختلف سبزیاں کاٹتے، کوکنگ پین میں چمچ چلاتے دیکھ رہی تھیں، اس نے chef,s dress .... بھی پہن رکھا تھا اور وہ میزبان سے گفتگو کرتے ہوئے خوشگوار انداز میں چٹکلے بھی چھوڑ رہا تھا اور کئی قسم کی کوکنگ ٹپس بھی بتا رہا تھا۔

''وہ وہاں مختلف فیلڈز میں اسپیشلائزیشن کر رہا ہے۔'' اسے کچھ عرصے پہلے ہی کوکب کی اس کے بارے میں دی گئی معلومات یاد آنے لگیں۔

''اسپیشلائزیشن!'' اس نے ٹی وی اسکرین پر موجود چہرے کو دیکھا اور بے اختیار مسکرا دی۔ ''خوب میدان چنا اسپیشلائزیشن کے لیے تم نے۔''

''کوکنگ اب ایک ضرورت کے محدود کینوس سے نکل کر ایک وسیع میدان میں داخل ہو گئی ہے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''یہ ایک طرح کا آرٹ بن چکی ہے، ایک سبجیکٹ، ایک فیلڈ آف تھاٹ، اس میں جدت بھی آ چکی ہے اور ورائٹی بھی۔ ہر اس چیز میں کشش محسوس ہوتی ہے جو دیکھنے پر آنکھوں کو بھلی لگے، کھانے کے ذائقے کا تو نوالہ منہ میں جانے کے بعد ہی پتا چلتا ہے، کھانے کی ہیئت اور اسے پیش کرنے کا انداز، انسان کے مزاج پر جس طرح اثر انداز ہو سکتا ہے، اس کی اپنی اہمیت ہے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ یہ آواز اور یہ لہجہ علینہ کو کیسے بھول سکتا تھا۔ اب وہ قدیم مصریوں، چینیوں، جاپانیوں اور یونانیوں کے ہاں پائے جانے والے اندازِ طعام کے بارے میں بتا رہا تھا۔

''اف!'' علینہ نے بے اختیار کہا۔ ''فہد رضا اور اتنا سگھڑاپا، کیا فیلڈ ہے یار۔'' اسے محسوس ہوا کہ اس کے لہجے میں طنز تھا۔ ''واہ کتنی خوب معلومات تھیں تمہاری۔ وہ مختلف فیلڈز میں اسپشلائزیشن کر رہا ہے۔ ایک فیلڈ تو یہ ہوگئی، دوسری ہوگی باغبانی جسے ہارٹیکلچر کا نام دے کر دوسروں کو متاثر کیا جاسکتا ہے۔ تیسری ہوگی خاکروبی۔'' وہ سوچتے سوچتے رکی۔ ''اس خاکروبی کو کون سی ماڈرن فیلڈ کا نام دیا جاسکتا ہے؟'' بصد سوچنے کے باوجود اسے کوئی ایسا نام یاد نہیں آیا۔ ''اور کون سی فیلڈ ہوسکتی ہے۔'' وہ مزید سوچنے لگی اور اسے محسوس ہوا کہ اس طرح کی باتیں سوچتے سوچتے اس کا ذہن تلخ ہو رہا تھا۔ سچ بات تو یہ تھی کہ اسے فہد کو یوں اس طرح یہ کام کرتے دیکھ کر ذرا سا بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھا۔ کوکنگ کا پروگرام ختم ہوچکا تھا اور اب اشتہار چل رہے تھے۔ اس نے ریموٹ میز پر رکھ دیا اور خود اٹھ کر کمرے کی بائیں دیوار کی کھڑکی کے قریب آگئی۔ کھڑکی پر برابر کیے پردوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے اس کی نظر ساتھ والے گھر پر پڑی جو باہر پڑتی بارش میں بھیگ رہا تھا۔ کھڑکی کے بند شیشے پر پھسلتی بوندوں اور ساتھ والے مکان کی چھت سے ٹپکتے بارش کے قطروں کو دیکھ کر اسے بہت کچھ یاد آنے لگا۔

یہ سرما کی بارش تھی، آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور باہر شدت کی سردی تھی، ایسا سرما بہت عرصے کے بعد آیا تھا مگر ایسی سردیاں عرصے پہلے اتنی ہی شدت سے آیا کرتی تھیں۔ اسے وہ دن یاد آنے لگے جب وہ سرخ ہوتی ناک کے ساتھ منہ سے نکلتی بھاپ پر قابو پاتی، اسکول یونیفارم میں ملبوس اپنا اسکول بیگ سنبھالتی اپنے گھر سے فہد کے گھر داخل ہوتی تھی۔

''افوہ، ارے علینہ کی ماما نے تو موسم کے تیور دیکھ کر اس کے نیچے پہننے کے کپڑوں میں دو، تین کپڑوں کا مزید اضافہ کردیا، ہے ناں!'' فہد کی اماں اسے دیکھ کر مسکرائیں۔ ان کے ڈائننگ روم میں گیس ہیٹر جل رہا ہوتا تھا۔

''ہاں یہ تو ہے، ماما نے ایک موٹی بنیان اور پہنا دی اور لیگنگز بھی پہلے والی سے زیادہ موٹی پہنا دی، مجھ سے تو ٹھیک سے چلا ہی نہیں جارہا۔'' ہیٹر کے آگے اسٹول پر بیٹھ کر اپنے چھوٹے ہاتھ سینکتی وہ بولتی اور پھر ایک نظر فہد پر ڈالتی جو ناشتے کے معاملے میں اپنی اماں سے ضد کر رہا ہوتا۔ لنچ باکس بیگ میں رکھنے سے انکار کردیتا اور دودھ کا کپ آدھا پی کر چھوڑ دیتا۔ اس کی اماں زبردستی اس کے بال برش کرکے اسے اونی ٹوپی پہناتیں اور زبردستی ہی لنچ باکس اس کے بیگ میں ٹھونستیں۔

''پانی ٹھنڈا ہوجاتا ہے، پیا نہیں جاتا۔'' وہ پانی کی بوتل لینے سے صاف انکار کردیتا۔

''میں نے گرم پانی بھرا ہے، سارا دن نارمل رہے گا۔ وہ بوتل اس کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہتیں۔

''اور یہ لو گلوز پہنو۔'' وہ اس کے ہاتھ میں گلوز پکڑاتیں۔ ''دیکھو علینہ نے بھی گلوز پہن لیے ہیں۔ وہ کتنی فرمانبردار بچی ہے۔ کتنی اچھی بچی ہے۔''

''فرمانبردار بچی، اچھی بچی۔' فہد اسکول وین میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا دُہراتا رہتا۔ ''اچھی بچی میری طرح فرسٹ آکر دکھاؤ کبھی، اچھی بچی تمہارے پاس ٹکٹس والے البم ہیں کیا...... اچھی بچی میرے پاس جتنی بکس ہیں کبھی اتنی بکس پڑھ کر دکھاؤ...... اچھی بچی تمہارا تو ہوم ورک بھی مکمل نہیں ہوتا، کبھی اگر بریک میں، میں تمہیں اپنی کاپی نہ دوں تو تمہیں روز ٹیچر مائرہ سے ڈانٹ پڑا کرے اور اگر میں تمہاری مدد نہ کروں تو تمہیں میتھس کا ایک بھی سوال نہ آئے۔ ہونہہ اچھی بچی، اچھی بچی۔'' وہ اگلی سیٹ پر اپنے جوتے کی ٹو مارتا ہوا کہتا۔

"اچھے بچے صرف موٹے کپڑے اور گلوز ہی نہیں پہنتے، لنچ باکس اور بوتل پکڑنے سے ہی اچھے نہیں بن جاتے۔ ویسے مجھ سے مقابلہ کرکے دیکھو، میرے نمبر ہمیشہ ہر جگہ ہر بات میں تم سے زیادہ آئیں گے۔"

"یہ تو ہے۔" علینہ چپکے چپکے آنسو پیتے ہوئے سوچتی۔ "فہد مجھ سے ہر چیز میں آگے ہے۔ اس کے پاس ٹکٹ البمز ہیں، ڈھیروں بکس ہیں، معلوماتی ویڈیوز ہیں، اس کا ہوم ورک مکمل اور نیٹ ہوتا، کلاس میں وہ سب سے ذہین اور حاضر دماغ اسٹوڈنٹ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بلیزر پر سرٹیفکیٹ کا بیج لگا ہوتا اور کس خوبی سے وہ آف اینڈ آن دی کلاس بچوں کو رعب دار آواز میں ہنکا لیتا۔ ٹھیک ہی تو ہے اچھے بچے صرف موٹے کپڑے اور گلوز ہی تو نہیں پہنتے، لنچ باکس میں جو ملے خاموشی سے کھا لینے کو تو ہی اچھا بچہ نہیں کہا جا سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ہر معاملے میں فہد سے پیچھے ہوں، بہت پیچھے اور یہ بھی سچ ہے کہ اگر ماما کی ڈانٹ کا ڈر نہ ہوتو میں کبھی موٹی لیگنگز اور گلوز نہ پہنوں۔" اس کا دل چاہتا کہ وہ بھی اپنی مرضی سے فہد کی طرح اسکول جاتے ہی ٹوپی اتار کر بیگ میں رکھ لے اور گلوز کہیں گم کردے۔

مگر اس کی ماما میں فہد کی اماں جیسی شرافت کہاں تھی۔ ان کی مشین جیسی زندگی میں پچکارنے، بہلانے اور سمجھانے کا وقت نہیں تھا، وہ سیدھے سیدھے اس کو بتا دیتی تھیں کہ اسے کب، کہاں کیا کرنا ہے اور اس ابتدائی وقت کی ٹریننگ نے علینہ کو بھی ایک چھوٹا سا روبوٹ بنا دیا تھا۔ کیوں اور نہیں کے الفاظ اس کے ہاں ختم ہو چکے تھے، بس سر جھکا کر مان لینے اور تقلید کرنے کی عادت پختہ ہو چکی تھی۔

"بارش!" بادل سرما کی بارش کے دوران عام طور پر نہیں گرجتے تھے مگر اس روز بادل کسی اور ہی موڈ میں تھے۔ جب ہی ان کی گرج نے علینہ کو چونکا دیا تھا۔

"بارش تب بھی برستی تھی جب وقت کے گزرنے کے ساتھ ہم بڑے ہو رہے تھے۔" اس نے سوچا۔ گریڈ ون سے ٹو، تھری، فور اور پھر وہ دن جب کلاسز علیحدہ ہونے کا وقت آ گیا۔ فہد جونیئر کیمبرج میں چلا گیا اور وہ سیدھا سادہ میٹرک کرنے میں مصروف ہو گئی۔

"علینہ اسٹوپڈ، اپنی ماما سے بولو تمہیں بھی جے سی جوائن کرنا ہے۔" اسے یاد آیا۔ اس روز بھی بارش خوب برس رہی تھی جب اسکول سے واپسی کے دوران فہد نے اسے اکسایا تھا۔

"وہ نہیں مانتیں فہد، وہ نہیں مانیں گی۔" علینہ کا بچپن بہت جلد رخصت ہو گیا تھا اور ایک عجیب قسم کی سنجیدگی اس کے چہرے اور لہجے پر حاوی رہنے لگی تھی۔

"افوہ یار، عجیب بودی چیز ہو تم۔" وہ جھنجلا کر بولا تھا۔ "موم کی ناک کی طرح جہاں تمہاری ماما موڑیں مڑ جاتی ہو۔ میں اماں سے کہتا ہوں تمہارے گھر جا کر انہیں سمجھائیں۔"

"کوئی فائدہ نہیں اس کا وہ فیصلہ کر چکی ہیں کہ مجھے میٹرک ہی کرنا ہے۔ انہیں بھی پتا ہے اور مجھے بھی، میں پڑھائی میں بہت اچھی نہیں ہوں، جے سی میں میرے گریڈز کبھی اچھے نہیں آ سکتے، میں پیچھے رہ جاؤں گی اور پھر بھی مجھے میٹرک ہی کرنا پڑے گا۔"

"تم نے انہیں یہ یقین دلایا کہ تم پڑھائی میں کمزور ہو، صرف محنت نہ کرنے کی وجہ سے۔" وہ جھلا گیا۔ "تم فیصلہ کر لو کہ تم سخت محنت کرو گی تو وہ کبھی انکار نہیں کریں گی۔" اس کی اس بات کے جواب میں وہ خاموش رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اسے وہ بات نہیں بتا سکے گی نہ ہی سمجھا سکے گی جو ماما کے مؤقف کی اصل وجہ تھی مگر فہد کی اماں اس بات کو دو لفظوں میں ہی سمجھ گئی تھیں اور ایسا اس وقت ہوا تھا جب وہ فہد کے اصرار پر ماما سے

بات کرنے آئی تھیں۔

"ضروری تو نہیں کہ ہر بچہ لیولز ہی کرے، علینہ کی ماما ایسا نہیں سمجھتیں تو اس میں بحث کی کیا بات ہے۔ وہ بہتر جانتی ہیں کہ علینہ کو کیا کرنا ہے۔" انہوں نے فہد کو اس موضوع پر مزید بات کرنے سے روکتے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں شاید تمہاری ماما بہتر سمجھتی ہیں مگر اس میں حرج ہی کیا ہے کہ کوشش کر لی جائے یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔" اس نے اگلے روز علینہ سے کہا تھا اور وہ ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتی رہی تھی۔

کلاسز بدل جانے سے اسکول میں ان کی رفاقت تقریباً ختم ہو گئی تھی مگر اسکول جانے اور واپسی کے لیے وین ایک ہی تھی اور اس دوران وہ اپنے دوستوں کو چھوڑ کر علینہ کے پاس آ بیٹھتا اور اپنے تمام معمولات یوں بتاتا جیسے علینہ کو وہ سب نہ بتانے سے کچھ نقصان ہو جائے گا۔

وقت گزرنے کے ساتھ اس کی سوچ بھی پختہ اور وسیع ہو رہی تھی اور علینہ غالباً لاشعوری طور پر اس کی تقلید کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ فہد کی پسند ناپسند علینہ کی پسند ناپسند بنتی جا رہی تھی۔ نوے کی دہائی میں جوان ہونے والے فہد کو ساٹھ اور ستر کی دہائی کی چیزیں متاثر کرتی تھیں۔

"چھوڑو یہ سب خرافات، تم ڈورز کو سنا کرو، ہینڈرکس، زیپلین، فلائڈ اور اے سی ڈی سی کو سنا کبھی تم نے، یار کیا کلاس ہے ان کی۔" وہ علینہ کو مشورہ دیتا اور علینہ اپنی کلاس فیلوز کو انہی لوگوں کو سننے کا مشورہ دینے لگتی۔

"راک سنو یار راک۔" وہ کہتی۔ "مریلینا اور یانی کو سنو، یوٹو کے نمبرز لیا کرو۔" جب وہ اپنی دوستوں

سے کہہ رہی ہوتی تو اسے محسوس ہوتا جیسے اس کے لہجے میں فہد کے لہجے کا اثر آ گیا ہو۔

''لڑکیوں کو تو ریسز میں دلچسپی لیتے نہیں دیکھا میں نے کبھی، علینہ تم پہلی لڑکی ہو جو فارمولا ون ریسز دیکھتی ہو۔'' ابھی پچھلے دنوں ہی اس کی ایک کولیگ نے اس سے کہا تھا۔

اس وقت بھی اسے فہد کا خیال آیا تھا۔ فارمولا ون ریسز بھی اس نے فہد کی تقلید میں دیکھنا شروع کی تھیں جس کا خیال تھا کہ دنیا میں سب سے تھرلنگ چیز ایف ون ریسز ہیں یا پھر باسکٹ بال کے میچز۔

''فراری جیسی کوئی دوسری ٹیم ہی نہیں۔ میکلیرن تو دو نمبر ہے ہمیشہ دو نمبر رہے گی۔ ٹیم اسپرٹ ہی نہیں ہے ان میں، شوماکر کی وجہ سے فراری نمبر ون ہے۔ اس کی جگہ ریکلن نے لے لے گا اور ادلانسو کو دیکھا کسی نے؟'' علینہ کو خوب معلوم تھا کہ وہ جوش و خروش سے اس قسم کی گفتگو کس کی یاد میں کیا کرتی تھی۔ اس کی یاد میں جسے یہاں سے گئے چار سال گزر چکے تھے۔ نہ صرف وہ بلکہ اس کی اماں، ابا اور اس کی دونوں بہنیں یہاں سے اچانک ہی چلے گئے تھے۔ راتوں رات بغیر کسی سے الوداعی ملاقات کیے۔ یہ علینہ کی زندگی کا دوسرا بڑا جھٹکا تھا۔ پہلا جھٹکا اسے بابا کی وفات پر لگا تھا جب اپنے اور ماما کے تنہا رہ جانے کے احساس نے اسے بری طرح اپنے گھیرے میں لے لیا تھا اور وہ اس احساس سے ایک عرصے تک نکل نہ پائی تھی اور یہ بات وہ کافی دیر بعد سمجھی تھی کہ فہد کی شخصیت میں اسے ایسا کیا محسوس ہوتا تھا جو وہ اس کی موجودگی میں اچھا محسوس کرتی تھی۔

بابا کے بعد پیدا ہونے والے عدم تحفظ کا احساس، اس نے بہت عرصے بعد فیصلہ کیا تھا۔ اس عدم تحفظ نے اسے فہد کی مضبوط اور پراعتماد شخصیت میں پناہ کا سا احساس دلایا تھا۔

اسے اپنے ماں باپ کی پیچیدہ زندگیوں کی بھی دیر تک سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ اتنے عرصے میں یہ بھی جان نہ پائی تھی کہ وہ اتنے تنہا کیوں تھے۔ بابا کی وفات سے پہلے بھی ماما اسپتال میں جاب کرتی تھیں اور بابا کے بعد تو یہ اور بھی ضروری ہو گیا تھا کہ وہ کام کریں۔ سو اسپتال کے بعد انہوں نے ایک پرائیویٹ کلینک میں بیٹھنا شروع کر دیا تھا اور وہ رات دیر تک تنہا رہتی تھی۔ ان کا کوئی عزیز رشتے دار کیوں نہ تھا یہ ماما نے اسے کبھی نہیں بتایا تھا بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ ان کی رعب دار شخصیت کے خوف سے ایک آدھ مرتبہ کے علاوہ اس نے کبھی پوچھنے کی جرأت ہی نہیں کی تھی پھر اس کے پختہ ہوتے شعور اور اردگرد کے لوگوں کی دبی دبی چہ مگوئیوں نے اسے سمجھایا تھا کہ اس کے ماں باپ نے گھر والوں سے بغاوت کر کے محبت کی شادی کی تھی۔ اسی لیے ہی وہ اس طرح تنہا تھے، ان کا اصل شہر کون سا تھا، وہ یہاں کب سے رہ رہے تھے اور ان دونوں کے والدین ہی نے انہیں معاف نہیں کیا تھا۔ اس قسم کے سوالات کے جوابات کا اندازہ وہ اپنے دل میں ہی لگایا کرتی تھی، ماما سے سوال کرنے کی جرأت اسے کبھی نہ ہوئی۔

ان کی میل ملاقات بھی محدود تھی۔ جس علاقے میں ان کا گھر تھا وہاں بھی فہد کے گھرانے کے علاوہ اکا دکا لوگوں سے ہی ان کی شناسائی تھی۔ فہد کے گھرانے سے زیادہ اس لیے تھی کیونکہ اس کی اماں بہت سمجھدار خاتون تھیں۔ انہوں نے نادیہ سے کبھی ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں سوال نہیں کیے تھے اور وہ نادیہ کی عدم موجودگی میں علینہ کا خیال بھی بہت رکھتی تھیں۔ وہ محبت کرنے والی نرم خو خاتون تھیں جب ہی نادیہ بھی علینہ کے معاملے میں ان پر اعتماد بھی کرتی تھیں۔

یہ ہی محبت اور ذہنی ہم آہنگی علینہ کا کل اثاثہ تھی مگر یہ اثاثہ جب اچانک چھن گیا تو اصل الفاظ میں علینہ کے دل کی دنیا درہم برہم ہو کر رہ گئی۔ کسی دوسرے سے اس کا تعلق نہ ہونے کے برابر تھا اور وہ کسی اور سے

متعلق دل میں وہ جگہ محسوس ہی نہ کر پاتی تھی جو وہاں فہد اور اس کے گھرانے کے لیے تھی مگر وہ اس وقت تک بچپن کو بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی، اس نے اس گھرانے کے چھن جانے کا غم تنہا منا لینے کے بعد خود کو سمجھا لیا تھا کہ اب زندگی کو یونہی اسی ڈگر پر چلنا تھا اور شاید فہد اور اس کے گھر والے ماضی کا حصہ بن چکے تھے مگر اس روز اس کوکنگ پروگرام میں فہد کے ایک مرتبہ پھر سامنے آنے پر اس کے دل کا وہ بند دروازہ پھر سے وا ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

کھٹ، کھٹ، کھٹ کیمرا فلیش اس کے چہرے پر پڑنے کے ساتھ ساتھ ان کے چلنے کی آوازیں ہر طرف سے آ رہی تھیں۔ وہ لوگوں کے ہجوم میں گھرا ہوا تھا، اس کے سامنے مختلف مائک دھرے تھے اور اس سے کئی قسم کے سوال پوچھے جا رہے تھے۔ اسے کیا جواب دینا تھے۔ وہ کیا جواب دے رہا تھا، اس کی سمجھ میں قطعی نہیں آ رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے ذہن کا ایک حصہ ماؤف ہو چکا تھا اور وہ حصہ جو ماؤف نہیں ہوا تھا وہ اسے احساس دلا رہا تھا کہ وہ بے جگہ تھا، جہاں وہ تھا اسے وہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ جو وہ کر رہا تھا وہ اس کے کرنے کا کام نہیں تھا۔ جو وہ کہہ رہا تھا وہ اس کے کہنے کی باتیں نہیں تھیں جو اس سے پوچھا جا رہا تھا وہ اس سے نہیں پوچھا جانا چاہیے تھا۔ اس کا دل سارے ہجوم کو پیچھے ہٹا کر بھاگ جانے کو چاہنے لگا مگر اس حقیقت کا بھی اسے بخوبی ادراک تھا کہ وہ چاہنے کے باوجود ایسا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ شاید یہ جگہ، یہ کام، یہ باتیں اور یہ سوال اب اس کا مستقل مقدر بن چکے تھے۔ ان سے فرار آسان نہیں تھا بلکہ شاید ناممکن تھا۔ اس نے اپنے ذہن کو مکمل طور پر ماحول سے ہم آہنگ کرنے کے لیے سر جھٹکا، اپنے اردگرد نظر دوڑائی اور اپنے منہ کے بالکل قریب رکھے مائک میں مضبوط آواز کے ساتھ بولنے لگا۔

''میرے شہید والد کا مشن میرا مشن ہے، میرے شہید بابا نے اپنی تمام عمر اس علاقے کے عوام کے لیے جدوجہد کرتے گزاری، مخالفین نے ان کے بہت سے خوابوں کو ان کے ساتھ ہی آسودۂ خاک کرنے کی کوشش کی ہے مگر میری آواز ان لوگوں تک پہنچانے کے لیے آپ سب کو میری آواز کے ساتھ آواز ملانا ہوگی۔ میرے شانہ بشانہ کام کرنا ہوگا۔ ہم سب مل کر شہید بابا کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ان کے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے۔'' نعروں کی گونج میں اس کی آواز دبنے لگی تھی مگر اس کے عقب میں کھڑے وقت کے منصوبہ سازوں کے دل کھلے جا رہے تھے۔ ان کے علاقے کی زمین قومی سطح پر ایک نئے رہنما کو متعارف کروانے جا رہی تھی۔

☆☆☆

عدنان نے اسے دو دن میں ہی فرصت کے لمحات میں سارا شہر دکھا دیا تھا۔ اسے وہ علاقہ پھر بھی نظر نہیں آیا تھا جو اس کی یادداشت میں محفوظ تھا، شاید اس کا بھی نقشہ بدل گیا ہے۔ اس نے مایوسی کے عالم میں سوچا۔ ایبٹ آباد آنے سے پہلے اس کے دل میں ایک نامعلوم سی خوشی سر اٹھاتی رہی تھی۔ وہ اس گھر میں ضرور جائے گا اور ان کے مکینوں سے ایک مرتبہ پھر ضرور ملے گا۔ وہ لوگ جن سے مل کر بی اماں جی بھر کر خوش ہوتی تھیں، اتنی خوش کہ ایسا خوش اس نے انہیں کبھی نہ دیکھا تھا مگر یہاں آ کر اسے لگا جیسے سارے راستے گڈمڈ ہو گئے تھے اور حقیقت تو یہ تھی کہ بی اماں کی جو کزن یہاں رہتی تھیں ان کا نام تک اسے ڈھنگ سے یاد نہیں تھا مگر ان کا سراپا اور ان کے چہرے کے نقوش اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ اس کے ذہن میں موجود تھے اور ان کے گھر کا نقشہ بھی۔

"شاید یہ ہی وہ علاقہ تھا یار!" اپنی واپسی سے ایک دن پہلے یونہی گھومتے ہوئے نسبتاً اس پرانے علاقے میں پہنچ کر اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور اس نے عدنان کو مطلع کیا۔

"یہ پرانا علاقہ ہے مگر اب اسے نئے سرے سے بسایا جا رہا ہے تاکہ اسے بھی جدید سہولتوں سے مزین کیا جا سکے۔" عدنان نے جھٹ سے معلومات فراہم کیں۔

وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک اس علاقے میں گھومتے رہے مگر وہاں حمزہ کو کوئی مانوس گھر نظر نہیں آیا۔ علاقے میں لوگوں نے اپنے گھروں کی نئے سرے سے تزئین و آرائش کر رکھی تھی شاید اس لیے بھی اسے مشکل پیش آ رہی تھی۔

"یہ گھر" ایک گھر کی لوکیشن اور انداز و اطوار اسے دیکھے دیکھے سے لگ رہے تھے۔ اس نے اس کے سامنے رک کر اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ یہ گھر پرانا لگ رہا تھا اور آباد بھی۔ وہ نہ سہی شاید اس کے مکینوں کے بارے میں ہی معلومات مل جائیں اور اگر تکا لگ گیا اور یہ وہی گھر ہوا تو پھر تو کیا بات ہے۔ اس نے آزما لینے کا فیصلہ کرتے ہوئے کال بیل کا بٹن دبا دیا۔

"جی فرمائیں......" کچھ دیر بعد ایک معصوم سے چہرے نے گیٹ کے اوپر سے جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھیں محترمہ میں اس شہر میں ایک اجنبی ہوں، مجھے اسی علاقے کی ایک مکین کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔" اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیا بتائے وہ اس کے گھر کے سامنے کیوں کھڑا تھا۔

"کون مکین؟" لڑکی نے گیٹ کی گرل پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ان کا نام غالباً رابعہ کلثوم تھا۔" رابعہ تو اسے کچھ کچھ یاد تھا، کلثوم کا لاحقہ اس نے یونہی ساتھ لگا دیا کیونکہ یہ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ان خاتون کے نام کے ساتھ کوئی لاحقہ ضرور لگتا تھا جہاں، بانو، خاتون یا پھر کلثوم اس کے ذہن میں یہی نام آ رہے تھے اور جو سب سے مناسب لگا اس نے وہی جوڑ دیا۔

"رابعہ کلثوم۔" لڑکی نے آنکھیں میچ کر آسمان کی طرف چہرہ اٹھا کر یاد کرنے کی کوشش کی۔

"وہ اپنی پوتی کے ساتھ رہتی تھیں یہاں، اس کا نام غالباً نہیں یقیناً میرال تھا۔" حمزہ نے اپنے ذہن میں محفوظ رہ جانے والی سب سے اہم یادداشت کو پیش کیا حالانکہ اسے یقین تھا کہ کسی کے بارے میں کچھ معلوم کرنے کے لیے یہ معلومات ناکافی تھیں۔

"اکیلی رہتی تھیں؟" لڑکی نے گرل پر ہاتھ رکھ کر اپنا چہرہ اس پر ٹکاتے ہوئے پوچھا۔

"پوتی کے ساتھ اکیلی رہتی تھیں۔" حمزہ نے تصحیح کی۔

"وہ آرٹ اینڈ کرافٹ سینٹر کی انچارج تو نہیں تھیں؟" لڑکی نے یوں پوچھا جیسے کھوج کے اس کھیل میں اسے مزہ آنے لگا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ کوئی کام تو کرتی تھیں شاید یہی کام تھا وہ۔" حمزہ کو اپنے حافظے کی کمزوری اور ادھوری معلومات پر خاصا افسوس ہوا۔ یقیناً ان خاتون تک پہنچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔

"میرال جونیئر برن ہال میں پڑھتی تھی؟" لڑکی الٹا اس سے سوال کرنے لگی۔

"جی پڑھتی تو تھی کہیں، کہاں یہ مجھے یاد نہیں۔" حمزہ نے مایوسی کے عالم میں کہا۔

"وہ بڑی اچھی ڈیبیٹر تو نہیں تھی؟" ایک اور سوال آیا۔

"پتا نہیں!" حمزہ نے سر ہلایا اس کے سامنے تو اس نے شاید ہی کبھی بات کی ہو۔

"بیڈمنٹن چیمپئن تو نہیں تھی......؟"

"معلوم نہیں۔" حمزہ کو ان سوالات سے وحشت ہونے لگی، کسی کی کھوج لگانے کا ان سوالات سے کیا تعلق تھا۔

"اوہ......" لڑکی نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "پھر تو مجھے معلوم نہیں کہ آپ کس کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے!" حمزہ نے واپسی کے لیے مڑتے ہوئے کہا۔

"ٹھہریں ذرا۔" پیچھے سے آواز آئی۔ "رابعہ صرف ایک ہی خاتون کا نام تھا جو اس علاقے میں رہتی تھیں۔ وہ آرٹ اینڈ کرافٹ سینٹر چلاتی تھیں یہاں اپنے ہی گھر میں یہ ادھر۔" اس نے اپنے دائیں طرف اشارہ کیا۔ "ادھر گھر تھا ان کا جواب ختم ہو چکا کیونکہ رابعہ آنٹی نے اسے بہت پہلے بیچ دیا تھا۔ وہ بالاکوٹ چلی گئی تھیں وہاں بھی کرافٹ سینٹر بنا رکھا تھا انہوں نے مگر ہم نے سنا ہے کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ان کی موت تین سال پہلے ہوئی ہے۔"

"اوہ......" حمزہ کے قدم زمین پر جم سے گئے۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ اس دنیا سے اب تک جا بھی سکتی ہیں۔ بی اماں کی ہم عمر تو ہوں گی ہی پھر جب بی اماں کو دنیا سے گئے اتنے برس گزر گئے تو رابعہ جہاں یا رابعہ کلثوم جو بھی تھیں، وہ بھی ختم ہو سکتی تھیں۔

"اور میرال!" لڑکی نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ حمزہ نے بے اختیار سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ "میرال کے بارے میں سنا ہے کہ وہ اچانک وہاں کے منظر سے کہیں غائب ہو گئی۔ سب لوگوں کا خیال تھا کہ رابعہ آنٹی کے بعد کرافٹ سینٹر وہ چلائے گی مگر وہ راتوں رات کہیں غائب ہو گئی۔ اس کا کچھ پتا غالباً اب تک نہیں لگا۔ کرافٹ سینٹر لوکل گورنمنٹ نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔"

"غائب ہو گئی۔" حمزہ کو شاید زندگی بھر اتنی شدت سے کوئی بات محسوس نہیں ہوئی۔ اس نے عجیب سی نظروں سے اس لڑکی کی طرف دیکھا جو اس قصے کو کسی گوسپ کے سے انداز میں سناتے ہوئے غالباً مزہ لے رہی تھی۔

"محترمہ کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ مجھے درست اطلاعات دے رہی ہیں اور انہی لوگوں کے بارے میں دے رہی ہیں جن کے بارے میں، میں نے آپ سے پوچھا ہے؟" اس نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں قدرے درشتی تھی جس نے لڑکی کو بھی سیدھا کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا۔

"مجھے افسوس ہے اگر آپ کو برا لگا۔" اس نے نیچی آواز میں کہا۔ "لیکن یہ حقیقت ہے کہ جو رابعہ آنٹی اور میرال یہاں رہتی تھیں ان کا یہی قصہ ہے۔" وہ غالباً اب محسوس کر رہی تھی کہ پوچھنے والا کوئی بہت ہی متعلقہ شخص تھا اور اسے یہ بات کسی اور طریقے سے بتانا چاہیے تھی۔ "میرے پاس رابعہ آنٹی اور میرال کی ایک تصویر بھی ہے، فہد کے برتھ ڈے کی، آپ رکیں میں آپ کو لا کر دکھاتی ہوں۔ شاید یہ وہ نہ ہوں جن کے بارے میں آپ نے پوچھا۔" اس نے گھبرا کر بات بنانے کی کوشش کی اور اسٹول جس پر وہ کھڑی تھی سے اتر کر اندر کی طرف بھاگی۔ اس کے جانے اور واپس آنے کے درمیان جتنا وقت حمزہ کو باہر کھڑے رہ کر گزارنا پڑا اس کا ایک ایک لمحہ اسے اذیت ناک محسوس ہو رہا تھا۔ لڑکی کے بھاگتے قدموں کی آواز سن کر وہ لاشعوری طور پر گیٹ کے قریب ہو گیا تھا۔

"یہ، یہ دیکھ لیں۔" لڑکی نے اسٹول پر چڑھ کر ایک تصویر اس کی طرف بڑھائی۔

"یہ دائیں سے چوتھی ہیں رابعہ آنٹی اور ان کے پیچھے میرال۔" حمزہ کے تصویر پکڑ لینے کے بعد اس نے انگلی کے اشارے سے بتایا۔

حمزہ کو خود بھی پتا نہیں چلا کہ وہ تصویر دیکھ کر اتنا اداس اور پریشان کیوں ہو گیا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن سے عرصہ دراز سے کوئی رابطہ نہیں تھا، ایبٹ آباد آنے سے پہلے اُن کا تصور بھی کبھی اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا یہاں آ کر ہی اسے ان کا خیال آیا تھا پھر وہ تصویر میں موجود ان مانوس چہروں کو دیکھ کر اتنا دکھی کیوں ہوا تھا۔ وہ خود کو بھی بتا نہیں سکا تھا۔

"اوہ......" وہ سڑک کے کنارے رکھے ایک اونچے پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر اس کے ساتھ کھڑا عدنان بھی تیزی سے اس کے قریب آ گیا اور گیٹ پر کھڑی لڑکی کے چہرے کے تاثرات بھی بدل گئے۔

"پانی...... مس پانی ملے گا۔" عدنان نے حمزہ کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے لڑکی سے درخواست کی۔

"سر کیا بات ہے، خیریت تو ہے؟" اب وہ حمزہ کی طرف جھک کر اس سے پوچھ رہا تھا۔ حمزہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑی تصویر پر ایک نظر اور ڈالی۔

"its tragic" اس نے سر ہلایا، اسے محسوس ہوا وہ شاک کی سی کیفیت میں تھا۔ بہت سی پرانی باتیں، نصیحتیں، خواہشات اسے ایک، ایک کر کے یاد آنے لگی تھیں۔ وہ اتنا عرصہ کہاں رہا تھا۔ اسے وہ سب کیوں بھول گیا تھا۔ وہ خود کو کوس رہا تھا۔

☆☆☆

اسے اس ماحول میں آئے خاصا عرصہ گزر چکا تھا مگر وہ اس سے مانوس نہ ہو پائی تھی، اس کے مانوس نہ ہو سکنے کی وجہ بھی غیر فطری نہیں تھی۔ یہ ماحول اجنبی تھا، اسے اس سے نفرت کرنا سکھایا گیا تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ اس ماحول کا باسی، حرام پہنتا، حرام کھاتا، حرام پیتا ہے۔ ایک عمر کے وعظ و نصیحت کا اثر ختم کرنے کے لیے چند سالوں کا عرصہ بہت کم تھا۔ وہ اس ماحول میں رہتی تھی، روز جیتی روز مرتی تھی۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ اس کا دل رونا شروع کرتا اور اس وقت تک روتا رہتا جب تک چراغوں کی لو بجھا نہ دی جاتی۔ اس کے کان نامانوس آوازوں کا ساتھ دینے پر احتجاج کرتے اور مانوس آوازوں کو ترستے، مانوس شکلوں کو کھوجتے مگر مانوس آوازیں سنائی دیتی تھیں، نہ مانوس شکلیں نظر آتی تھیں۔

"اس جگہ سے فرار ممکن نہیں میری بٹیا۔ دنیا یہاں کے سائے سے بھاگتی ہے مگر جس پر اس جگہ کا سایہ پڑ جائے یہ اسے چھوڑتا نہیں۔ بھاگ کر جہاں جانے کی کوشش کرو گی یہ سایہ تمہارا پیچھا کرے گا۔ بہتر ہے کہ اسی کو اپنی تقدیر سمجھ کر قبول کر لو۔" تاؤ شریف طبلے کے پیچ کستے ہوئے اسے نصیحت کرتا۔

"تقدیر کیا ہوتی ہے، تاؤ شریف، قسمت کسے کہتے ہیں، مقدر کس بلا کا نام ہے؟" وہ فرش پر بچھے مخملیں قالین کے ڈیزائن پر انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھتی۔

"سب ایک ہی حقیقت کے نام ہیں بٹیا۔" تاؤ شریف اپنا کام چھوڑ کر اس کی طرف دیکھتا۔ "یہ حقیقت اچھی بھی ہوتی ہے اور بُری بھی، جو اچھی پڑ جائے تو موجاں ہی موجاں جو نہ پڑے تو......"

"جو نہ پڑے تو پھر کیا ہوتا ہے تاؤ شریف؟" وہ چونک کر کہتی۔

"پھر بٹیا!" تاؤ شریف اس کا سوال سن کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ "پھر کیا۔ پھر بھی اسے

قبول کرنا پڑتا ہے جو قبول کرے اس کی موجاں ہی موجاں جو نہ کرے وہ بے چارہ دکھی ہی رہتا ہے۔ وہ دکھی رہتا ہے پر حقیقت نہیں بدلتی۔"

"آپ نے قبول کر لیا اپنی زندگی کی حقیقت کو تاؤ شریف؟" وہ عجیب سے لہجے میں پوچھتی۔

"نہ کرنے کا فائدہ کوئی نہیں، بٹیا رانی؟" تاؤ شریف ایک مرتبہ پھر اپنا کام چھوڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا۔

"دن رات کے چکر کو میں بدل نہیں سکتا۔ زندگی کا ایک دن بھی میں کم کر نہیں سکتا پھر جو دن مقدر میں لکھے ہیں ان کو پورا کرنے کا جو سامان اس کی ذات نے مہیا کر دیا ہے اسی پر راضی ہو جاؤں تو بڑی بات ہے۔"

اس پورے ماحول میں ایک تاؤ شریف اور دوسری ماسی جنداں کی ذات تھی جس میں اسے اکثر پناہ ملتی تھی۔ تاؤ شریف طبلچی تھا، ذات کا میراثی جسے در، در کی ٹھوکریں کھانے کے بعد بہ مشکل یہاں پناہ ملی تھی اور ماسی جنداں جو یہاں کی پرانی ملازمہ تھی یہاں کا باورچی خانہ اس کی ذمے داری تھی اور وہ دن بھر گوشت، سبزی مسالوں میں الجھی رہتی تھی اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ وقت کے جدید تقاضوں کو پورا کرنے کی خاطر دو لڑکے بطور کک اور بٹلر بھی یہاں بھرتی کیے گئے تھے مگر ماسی جنداں کی اعلیٰ منتظم صلاحیتوں کی وجہ سے اس کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آ سکا تھا۔ جدید کک اور بٹلر بھی اس کے گُنوں کے آگے پانی بھرتے تھے۔

"حُسن جو ہوتا ہے ناں پتر جی!" ماسی جنداں جا تفل کا چھلکا اتارتے اتارتے کبھی کبھار اسے بتاتی۔ "جانی دشمن بن جاتا ہے اکثر اوقات، حسن کی حفاظت کرنی پڑ جائے ناں تو ہر طرح کے کنجی تالے بھی ناکام ہو جاتے ہیں، یہ چھپائے نہیں چھپتا اور کبھی کبھار بڑا نقصان کر جاتا ہے۔ اب تم خود سوچو پتر جی، یہ حسن نہ ہوتا تو تم خاک پڑی کیا اِدھر ہوتیں کبھی۔ تمہیں تو ابھی خبر بھی نہ ہوتی کہ یہ جو چاند مکھڑا ہے تمہارا اسے کسی تالے کنجی کی ضرورت ہے کہ اس پر ڈاکا پڑ گیا۔ ہو گیا ناں نقصان، پر یہ بھی مقدر کی بات ہے، مقدر ٹھیک ہوتا تو یہ حسن کسی محل کی رانی بن کر موج کر رہا ہوتا، کسی لکھ پتی کی آنکھ کا نور بن گیا ہوتا مگر اس حسن کا جو قدرت نے تمہیں عطا کیا ہے، مقدر ہی یہ تھا کہ یہ ایک کے نہیں لاکھوں کے دلوں کو بہلائے، نذرانے وصول کرے دن رات، اسے قدر افزائی کہتے ہیں کہ خاک میں رُلنا، اللہ جانے پر یہ حسن نہ ہوتا تو، تو ماسی جنداں تو بن سکتی تھی یہاں، زرنگار نہ بنتی کبھی۔"

"زرنگار!" وہ ایک نئی سوچ میں گم ہو جاتی۔ ایک نامانوس نام جبکہ اب تک اسے اس کا عادی ہو جانا چاہیے تھا مگر وہ دوسری ہر بات کی طرح ... اس نام سے بھی مانوس نہ ہو سکی تھی اور وہ جو اس کا نام تھا جس سے ایک عرصے تک وہ پکاری جاتی رہی تھی، وقت کی دھول میں کہیں اٹ چکا تھا۔ وہ بہتیری کوشش کرتی کہ اس نام کی بازگشت سے جان چھڑا لے مگر ایسی ہر کوشش میں ناکام رہتی وہ محدود مگر آزاد ماحول کی پنچھی تھی جسے سنہری پنجرے میں مقید کر دیا گیا تھا۔ اس کے پر کاٹ دیے گئے تھے اور پرواز کی خواہش مارے جانے کی کوشش دن رات کی جاتی تھی۔ اس نے پریوں کی اور شہزادے شہزادیوں کی بہت سی کہانیاں پڑھ رکھی تھیں۔ اسے ان کی دنیا میں رہنے میں مزہ آتا تھا اور عمر کے اس دور میں جب اس کی ہم عمر لڑکیاں پریوں کی کہانیوں سے آگے نکل کر رومانس کی کہانیاں پڑھتی تھیں، وہ اس وقت بھی پریوں کی کہانیوں کے نئے نئے ایڈیشنز خریدا کرتی تھی۔ ایسے وہ کہانی تو بہت ہی پسند تھی جس میں شہزادی کو ایک اونچے مینار میں قید کر دیا جاتا تھا اور شہزادہ اسے ملنے کی خاطر مینار پر چڑھنے کے لیے اس کے دراز بالوں کا سہارا لیتا تھا۔ اس نے یہ کہانی اتنی مرتبہ پڑھی تھی کہ اس کا

www.paksociety.com

ایک ،ایک لفظ اسے ازبر ہو چکا تھا۔ اب بھی جب وہ اس سنہرے محل میں قید ہو چکی تھی ، اسے یہ کہانی بہت یاد آتی تھی مگر اس کا شعور اور سوچ کی پختگی اسے باور کراتی رہتی تھی کہ نہ تو اسے تلاش کرنے کے لیے کوئی شہزادہ وہاں آنے والا تھا اور نہ ہی اس کے بال اتنے دراز تھے کہ شہزادے کے اس تک پہنچنے کا وسیلہ بن سکتے۔ وہ حقیقتوں کے سب منظر جانتی تھی ، وہ حال میں زندہ تھی اور اس کے تقاضوں کو سمجھتی تھی مگر یہ اس کا دل تھا جو نہیں مانتا نہیں تھا جس میں ہر دم ایک کسک سی رہتی تھی اور ایک تڑپ اس سنہری پنجرے سے آزاد ہونے کے لیے اسے کچھ کر ڈالنے پر مجبور کرتی تھی مگر وہ یہاں سے کس طرح نکل سکتی تھی۔ اس کا راستہ اور آگے کے راستوں کا نقشہ اس کی فہم میں نہیں آتا تھا۔ وہ انہی سوچوں میں مگن اس حال میں زندہ تھی ، نامانوس نام ، نامانوس شناخت ، نامانوس شکلوں اور نامانوس آوازوں کے درمیان طبلے کی گونج اور گھنگروؤں کی کھنک کے درمیان ، جانثار ہوتی نظروں اور داد دیتی آوازوں کے درمیان ، ام الخبائث کی بوتلوں اور حرام کے ڈھیروں کے درمیان۔

جب مقدر سو جائے تو آنکھیں جاگنے لگتی ہیں اور آنکھیں خواب سے خالی ہو جاتی ہیں۔

☆☆☆

"حمزہ نے بتایا تھا کہ وہ ایبٹ آباد سے سیدھا لاہور آئے گا اور کچھ دن ہمارے ساتھ رہے گا۔ اس کی کمپنی نئے پروجیکٹس کے لیے فیزیبلٹی رپورٹس تیار کروا رہی ہے مگر ابھی تک تو اس کی آمد کی کوئی خبر نہیں ہے۔" نگین نے اس رات اپنے ہاتھوں پر لوشن ملتے ہوئے اشعر سے کہا۔

"تم نے اس سے پوچھا نہیں ، وہ ابھی تک ایبٹ آباد میں تو نہیں بیٹھا ہوگا۔" اشعر اس وقت بھی کسی جرنل میں کھویا ہوا تھا، محض اس کی بات کا جواب دینے کے لیے بولا۔

"مجھے تو سارا دن فون کرنے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔" نگین نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی مصروفیت کا ذکر کر گئی۔ "رات آتی ہے تو یاد آتا ہے کہ کیا کچھ کرنے والا رہ گیا ہے اور رات گئے کسی کو فون کرنا اچھا نہیں لگتا۔"

"چھڑا چھانٹ تمہارا بھائی ہے حمزہ ، اسے رات گئے فون کر لینے میں کوئی ممانعت نہیں۔" اشعر اس کی مصروفیت والی بات گول کرتے ہوئے بولا۔

"چھڑا چھانٹ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے، اس کی نہ جانے کیسی کیسی مصروفیات ہوں گی ، کہاں وہ ٹھہرا ہوا ہے ، اسے فون کرتے ہوئے تو سوچنا پڑتا ہے کہ نہ جانے کہاں بیٹھا ہوگا۔" نگین نے رسانیت سے کہا۔

"لو بھئی میں کر دیتا ہوں اسے فون...... ابھی پوچھ لیتے ہیں موصوف کہاں ہیں؟" اشعر نے اپنے موبائل پر نمبر ملاتے ہوئے کہا۔ حمزہ نے فون اٹینڈ کر لیا تھا اور اشعر اس کا احوال دریافت کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد بات کرنے کے بعد اس نے فون نگین کو دے دیا اور دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔

"تم رہ کہاں گئے ، میں یہاں انتظار کر رہی ہوں؟" نگین نے اس پر غصہ نکالا تھا۔

"کہاں چلے گئے تم؟" پھر اس نے حیرت کا اظہار کیا۔ "بالاکوٹ ، وہاں کیوں ، وہاں کیا کام ہے تمہیں؟"

"کون سا ضروری کام۔ کیا وہاں بھی تمہاری کمپنی کوئی پروجیکٹ شروع کر رہی ہے یا وہاں بھی کوئی سیمینار ہو رہا ہے۔"

"یہاں آکر کیوں بتاؤ گے ، ابھی بتاؤ ناں ، وہاں کس سلسلے میں گئے تم؟" اشعر سن رہا تھا۔ نگین مسلسل حمزہ سے دریافت کر رہی تھی اور یہ اس کی عادت تھی ، وہ جس بات پر اٹک جاتی تھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی تھی۔

''اشعر کو فون دوں!'' پھر اس نے کہا اور اشعر کی طرف دیکھا، اشعر نے ہاتھ بڑھا دیا۔

''تمہاری اس بہن کی بات کے پیچھے پڑنے کی پرانی عادت ہے، ڈونٹ یو وری۔'' اس نے حمزہ کو مخاطب کیا مگر اسے اپنی اس چہکار کے جواب میں حمزہ کی آواز بجھی بجھی سی محسوس ہوئی۔

''کیا بات ہے یار...... خیر تو ہے؟'' اب اسے بھی کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا۔

''کہاں جاؤں، مسلم ٹاؤن، اچھا تم ایڈریس لکھواؤ۔'' اس نے بیڈ سائڈ ٹیبل پر ڈائری اور قلم پکڑتے ہوئے کہا۔ ''کون صاحب ہیں یہ...... اور کیا کرتے ہیں؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔ ''تم فکر مت کرو یار، میں صبح ہی جا کر پتا کر دوں گا۔'' اس نے کہا۔ ''میں وہاں ہی سے تمہیں کال کر دوں گا اور اگر یہ صاحب مل گئے تو ان سے تمہاری بات بھی کروا دوں گا۔'' اس نے فون بند کرنے سے پہلے کہا۔

''کیا بات ہے؟'' نگین جو ہونقوں کی طرح یہ گفتگو سن رہی تھی، اس کا گھٹنا ہلا کر بولی۔

''حمزہ اتنا سنجیدہ اور پریشان اس سے پہلے کبھی نہیں لگا۔'' اشعر نے سوچتے ہوئے کہا۔

''مسئلہ کیا ہے، مجھے بھی بتائیں۔'' نگین بے صبری سے بولی۔

''کوئی لڑکی ہے، میرال نامی اس کے لیے ایک ایڈریس بتا رہا تھا کہ وہاں سے جا کر اس کے بارے میں معلوم کروں اور یہ بھی کہہ رہا تھا کہ فوری جا کر پتا کروں۔''

''میرال۔'' نگین چونک گئی۔ ''یہ کون لڑکی ہے؟'' اس نے یاد کرنے کی کوشش کی، اسے کہاں سے ملی، کچھ یاد نہ آنے پر اس نے اشعر کی طرف دیکھا۔

''ملی کہاں، یہ لڑکی تو کہیں کھو گئی ہے۔ موصوف اس کی تلاش میں ہیں، اسی کی تلاش میں تو وہ بالا کوٹ تشریف لے گئے ہیں، اَن شیڈولڈ ورنہ تو ان دنوں اسے یہاں ہونا چاہیے تھا لاہور میں۔''

''یہ تو بہت ہی عجیب سی بات ہے، حمزہ اور لڑکی اور وہ بھی کھوئی ہوئی۔'' نگین کو اس بات اور حمزہ کے مزاج میں کوئی مماثلت نظر نہیں آ رہی تھی۔

''کیا معلوم حمزہ نے چپکے چپکے اپنے لیے کوئی لڑکی پسند کر لی ہو، اس کی والدہ کو تو شاید ابھی فرصت ہی نہیں اس بارے میں سوچنے کی۔'' اشعر نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''یہ ہو نہیں سکتا، حمزہ اپنے دل کی ہر بات مجھ سے ضرور کرتا ہے اور لڑکی ڈھونڈ لی تو وہ کہاں گئی، کھو گئی، یہ کیسے ممکن ہے؟'' نگین نے زیرِ لب کہا۔ ''آپ لڑکی کے بارے میں معلوم ضرور کریں، حمزہ کبھی کسی غیر سنجیدہ بات میں نہیں الجھتا۔ اس کا مجھے یقین ہے۔'' اس نے اشعر کو تاکید کی۔

☆☆☆

علینہ کو اس اجنبی کی حالت بھلائے نہیں بھول رہی تھی، جسے وہ رابعہ آنٹی اور میرال کے بارے میں بتا بیٹھی تھی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ وہ ان کے بارے میں پتا کرتا ان کے دروازے تک آ پہنچا تھا۔ رابعہ آنٹی کی کہانی زبان زدِ خاص و عام ہو کر قصۂ پارینہ بنے بھی عرصہ گزر چکا تھا اور اس بات کا امکان کبھی نظر نہیں آیا تھا کہ کوئی ان کے بارے میں یوں پوچھتا پاچھتا یہاں پہنچ جائے گا۔

رابعہ آنٹی گزرے دور کی یادگار تھیں۔ وہ اس علاقے میں رہنے والی واحد ایسی خاتون تھیں جو سگھڑاپے اور سلیقے کے تمام اسرار و رموز سے بخوبی واقف تھیں اور اس علاقے میں رہنے والی وہ مائیں جو اپنی بچیوں کو ان تمام اسرار و رموز سے واقف کرانا چاہتی تھیں وہ ان کو رابعہ آنٹی سے مستفید ہونے کے لیے ان کے پاس بھجوایا



مجھ سے ملیے

السلام علیکم! میں ارم رانی ہوں، میں زندہ دلان شہر لاہور میں تین اپریل کو ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئی۔ میرا نام میرے مرحوم تایا جان جو میرے خالو جان بھی تھے۔ انہوں نے بڑی محبت سے رکھا۔ ہم سات بہن بھائی ہیں اور میرا نمبر تیسرا ہے۔ میں نے گریجویشن کی ہے اور آج کل ایک پرائیویٹ کمپنی میں جاب کرتی ہوں، میں ایک حساس اور نرم دل رکھنے والی لڑکی ہوں، غلط بات مجھ سے برداشت نہیں ہوتی، جھوٹ اور منافقت سے نفرت ہے، میں سادگی پسند ہوں، میری پسندیدہ کتاب قرآن ہے۔ مجھے رنگوں میں کالا سفید اور گلابی بہت پسند ہے۔ جیولری میں چوڑیاں اور رنگ پسند ہے۔ ویسے تو کھانے میں سب کچھ کھا لیتی ہوں لیکن اگر کھانا خوش ذائقہ ہو تو بہت اچھا لگتا ہے۔ کتابیں پڑھنا میرا پسندیدہ مشغلہ ہے، اچھی کتاب ایک بہترین ساتھی ہے جو آپ کو کبھی تنہا، مایوس اور دکھی نہیں ہونے دیتی۔ مجھے شاعری سے بھی لگاؤ ہے، خود بھی لکھتی ہوں، علامہ اقبالؒ، غالب، احمد فراز، پروین شاکر، اور وصی شاہ بہت پسند ہیں۔ کرکٹ بہت شوق سے دیکھتی ہوں مگر پاکستان میں جو کچھ کرکٹ کے ساتھ اور کرکٹر کے ساتھ ہو رہا ہے، اس سے دل بہت دکھتا ہے، مجھ میں چند ایک خوبیاں اور بہت سی خامیاں ہیں، جن کا مجھے ادراک بھی ہے، میں بہت جلد دوسروں پر اعتبار کر لیتی ہوں، جس کے نتیجے میں دھوکا ملتا ہے۔ آپ لوگوں کی محفل میں آ کر مجھے تو بہت اچھا لگا۔ آپ بتائیں کہ آپ کو کیسا لگا؟ .... ارم رانی، لاہور

کرتی تھیں۔ رابعہ آنٹی محبت اور نرم گفتاری کا مرقع تھیں اور علینہ کا ہمیشہ دل چاہتا تھا کہ وہ بھی ان کے پاس جائے اور ان سے وہ سب کچھ سیکھے جو ایک خزانے کی طرح ان کے پاس موجود تھا مگر علینہ کی ماما نے اسے ایسا موقع کبھی نہیں دیا تھا۔ رابعہ آنٹی سے ملاقات بھی فہد کے گھر ہی ہوا کرتی تھی۔ وہ فہد کی اماں کی اچھی دوست تھیں اور جب کبھی زیادہ مہمانداری کے نتیجے میں انہیں ضرورت پڑتی، رابعہ آنٹی ہزار دل کے ساتھ ان کے ساتھ مصروفِ عمل رہتیں۔ فہد کے یہاں ہی اس نے رابعہ آنٹی کے ہاتھ کے بنائے کھانے کھائے تھے اور ان کے سگھڑاپے کے دوسرے نمونے بھی دیکھے تھے۔ وہیں اس کی ملاقات میرال سے بھی ہوئی تھی جو اور بہت سی خوبیوں کے علاوہ اپنی بے تحاشا خوب صورتی کی وجہ سے اسے بے حد باعثِ کشش محسوس ہوئی تھی اور وہ اکثر سوچا کرتی کہ اللہ تعالیٰ نے اکیلی میرال کو جو اتنا بے تحاشا حسن دے رکھا تھا کیا ہی اچھا ہوتا، اس علاقے کی سب لڑکیوں میں برابر تقسیم کر دیتا، اس طرح کچھ تو اس کے حصے میں بھی آتا۔ میرال جونیئر برن ہال میں پڑھتی تھی اور ایک بے حد قابل اور ایکٹو طالبہ کے طور پر مشہور تھی۔

''علینہ تم نے کبھی میرال کا تلفظ سنا ہے، بہت عمدہ اور زبردست ہے۔'' یہ بات بھی اسے فہد نے بتائی تھی۔ ''کبھی اسے ڈبیٹنگ کے مقابلے میں سنو، تمہارے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔ تم نے کبھی اسے بیڈمنٹن اور ٹیبل ٹینس کھیلتے دیکھا ہے۔ یار کیا کمال کی لڑکی ہے۔'' وہ کہتا اور علینہ کا بے اختیار دل چاہتا کہ کاش وہ میرال ہوتی اور فہد اسی طرح اس کی تعریف کر رہا ہوتا۔ اسے میرال ہر لحاظ سے قابلِ رشک لگتی۔ رابعہ آنٹی نے اپنے تمام ہنر بھی اس میں منتقل کر رکھے تھے یوں میرال کا نام اور ذکر ایک مثال کے طور پر لیا اور کیا جاتا تھا۔ کچھ

یوں کہ اپنی ہی صنف سے تعلق رکھنے کی بنا پر کبھی کبھی علینہ کو حسد بھی محسوس ہونے لگتا اور جب رابعہ آنٹی نے یکا یک اپنا آرٹ اینڈ کرافٹ سینٹر ختم کر کے یہاں سے کوچ کرنے کا فیصلہ کیا تو جہاں سب لوگوں کو بہت افسوس ہوا اور سب ہی ان سے یہیں رہنے پر اصرار کرتے رہے تو علینہ کو اپنے دل میں ایک عجیب سی خوشی اترتی محسوس ہوئی اور اس نے مروتاً بھی ایک بار ان سے جانے کا فیصلہ بدلنے کو نہیں کہا۔

مگر جب اس نے رابعہ آنٹی کی وفات کے بارے میں سنا تو اسے دل میں بہت افسوس ہوا اور میرال سے بہت ہمدردی محسوس ہوئی اور جب آنٹیز کا گروپ میرال سے تعزیت کے لیے بالاکوٹ روانہ ہو رہا تھا تو اس کا بھی دل بہت چاہا کہ وہ ان کے ساتھ چلی جائے مگر اپنی ماما کے ڈر سے اس نے اس خواہش کا اظہار ایک بار بھی نہیں کیا لیکن جب یہ آنٹیز یہ خبر لیے واپس لوٹیں کہ رابعہ آنٹی کی وفات کے صرف دو دن بعد میرال راتوں رات وہاں سے غائب ہو گئی اور اب تک اس کی کوئی خبر نہیں، وہ ششدر رہ گئی، کالونی میں ان دنوں یہ خبر موضوع بحث تھی اور علینہ بھی دن کے کئی حصوں میں اسی سوچ بچار میں مصروف رہتی تھی کہ میرال کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔ وہ کہاں چلی گئی ہوگی، اسے کون ساتھ لے گیا۔ جب تک رابعہ آنٹی یہاں رہیں، مقامی لوگوں کے علاوہ شاید ہی کبھی کوئی ان سے ملنے آتا ہو۔ وہ خود تو ایک بار بھی ان کے گھر نہیں گئی تھی مگر اس نے کبھی کسی سے بھی یہ نہیں سنا تھا کہ ان کے کسی عزیز رشتے دار کو ان کے ہاں آتے جاتے دیکھا گیا تھا۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ رابعہ آنٹی کا تعلق کہاں سے تھا، وہ مقامی تھیں یا کہیں اور سے آ کر یہاں آباد ہوئی تھیں مگر میرال اسے جب بھی یاد آتی اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔

''کیا پتا خود ہی کسی کے ساتھ چلی گئی ہو۔'' ایک خاتون رائے زنی کرتیں۔

''رابعہ آپا کو بظاہر کوئی بیماری بھی نہیں تھی پھر یوں آناً فاناً موت، کوئی وجہ تو ہوگی ناں اس کی۔'' کوئی دوسری بھی لقمہ لگاتیں۔

''میرال بہت مختلف بچی تھی، اس کی تربیت بہت اچھی ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں کوئی غلط بات سوچنا بھی غلط ہوگا۔ نہ جانے بے چاری بچی کے ساتھ کیا بیتی ہوگی۔''

کسی کی رائے بالکل مختلف ہوتی۔ ان میں سے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ بالاکوٹ جانے کے بعد رابعہ آنٹی کس طرح اور کن لوگوں کے درمیان رہی تھیں، ان کی تعزیت کے لیے جانے والے گروپ کو یہ پتا چلا تھا کہ میرال نے ان کے کرافٹ سینٹر کا آدھے سے زیادہ انتظام سنبھال رکھا تھا اور وہ دونوں وہاں اچھی خوش باش زندگی گزار رہی تھیں۔

میرال کا کہیں چلے جانا بھی اتنے اچنبھے کی بات نہ ہوتی، لوگ سوچتے کسی عزیز رشتے دار کے ہاں چلی گئی ہوگی مگر یوں راتوں رات غائب ہونا بہت عجیب سی بات ہے۔ لوگ بات کرتے تھے اور یوں میرال کے غائب ہونے کا قصہ اچھی طرح زیر بحث رہنے کے بعد پرانا ہو کر ماضی کا قصہ بن گیا اور اب تک تو یہ بات سب بھول بھلا بھی چکے تھے۔ جب اچانک وہ لڑکا رابعہ آنٹی کو ڈھونڈتا ادھر آ پہنچا تھا اور ان کے متعلق غیر متوقع خبر سن کر اس نے جس ردعمل کا اظہار کیا تھا وہ یقیناً تعجب خیز تھا۔ علینہ نے اسے اندر سے پانی لا کر پلایا تھا اور اس سے انکل گلریز سے ملنے کا بھی کہا تھا۔ وہ رابعہ آنٹی کے بالاکوٹ میں ٹھکانے کے بارے میں اسے بتا سکتے تھے مگر یہ علینہ کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ جب وہ لڑکا واپس جانے کے لیے اس کا شکریہ ادا کر رہا تھا تو اس نے اس سے اس کا نام کیوں پوچھا تھا۔ جواب میں لڑکے نے بے دھیانی میں یا پھر شاید عادتاً اسے اپنا

وزیٹنگ کارڈ نکال کر تھما دیا تھا۔

''اگر ماما کو پتا چل جائے کہ میں اتنی دیر تک کسی اجنبی سے بات کرتی رہی ہوں تو......'' علینہ نے سفید سادہ کارڈ پر سنہرے مہین الفاظ میں پرنٹڈ اس اجنبی کا نام پتا پڑھتے ہوئے سوچا تھا۔

☆☆☆

A true friend is not like rain which pours and goes away a true friend is like air sometimes silent but always around you.

مہرزاد نے گلابی رنگ کے کاغذ پر سیاہ روشنائی میں لکھے ان الفاظ کو نہ جانے کتنی بار پڑھا تھا اور ہر بار پڑھنے پر اسے احساس ہوتا تھا کہ ایک مہذب پرسکون، صلح جو اور محبت کرنے والی دنیا سے بھی اس کا کوئی تعلق تھا اور وہ دنیا جس میں رہ رہا تھا اور جس سے اس نے عمر بھر فرار ہی چاہا تھا، ایک محدود دنیا تھی، جس کے باہر کی فضا کھلی، تازہ اور خوشگوار تھی مگر دوسرے ہی لمحے یہ احساس اسے جکڑ لیتا کہ وہ وقت کے ایک عبوری لمحے میں ہے، اس لمحے کے بعد اس کو یا تو یہاں ہی ٹھہر جانا تھا یا پھر واپس لوٹ جانا تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ دراصل اسے کیا کرنا تھا۔ اس ماحول کی پابندیوں، توقعات اور ادب آداب نے اس کی روح تک مسل کر رکھ دی تھی اور اس کی سمجھ نہیں آتا تھا کہ اس میں ٹھہر جانے کے بعد وہ زندہ کس طرح رہ سکے گا۔ دوسری طرف وہ دنیا تھی جو اس کی اپنی تھی، مانوس اور مہربان جس میں اس نے اب تک سانس لی تھی اور کامیابیاں حاصل کی تھیں، وہ ان دونوں دنیاؤں کے درمیان لٹک کر رہ گیا تھا۔

''مہرا!'' وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا جب ایک مہربان اور مانوس آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ یہ مہربان آواز اس کی اماں جان کی تھی وہ اپنے مخصوص سادہ لباس اور بڑی سی سوتی چادر میں ملبوس تھیں، وہ اپنی جگہ سے اٹھنے لگا۔

''بیٹھا رہ۔'' انہوں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے کہا اور خود اس کے سامنے بیٹھ گئیں۔ وہ سر جھکا کر رہ گیا۔

''پریشان ہے؟'' انہوں نے کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہنے کے بعد پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''مجھے تسلی دینے کی خاطر جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے بچے۔'' انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں جانتی ہوں تو پریشان ہے اور کس لیے پریشان ہے، میں یہ بھی جانتی ہوں، میں تیری ماں ہوں اور ماں کو سب پتا ہوتا ہے، یہ اور بات ہے کہ ماں کے احساسات مصلحت کی چادر اوڑھ کر وقت کے دھارے کا ساتھ دینے لگ جائیں، پتا تو پھر بھی اسے ہوتا ہی ہے۔''

''آپ کو کیا پتا ہے بھلا؟'' اتنے ڈھیر سارے دنوں میں پہلی بار مہرزاد نے کسی کے ساتھ اپنی فریکوئنسی کو ایک ہوتے محسوس کیا تھا۔

''وہ سب جو تو سوچتا ہے، وہ سب جو تو چاہتا ہے، وہ سب جو نہیں چاہتا، تیری خواہشات، تیری امیدیں، تیرا احتجاج، تیرے انکار سب جانتی ہوں میں۔'' ان کے لہجے میں کسی قسم کا انتشار کیوں نہیں تھا۔ مہرزاد کو ان کے پرسکون لہجے پر جھنجلاہٹ محسوس ہونے لگی۔

دعائیں حقیقت میں کبھی رائگاں نہیں جاتیں

اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے۔ جہاں وہ دیکھتا ہے کہ دعا کی بعینہ قبولیت سے کائنات کے نظام میں خلل کا اندیشہ ہے تو وہاں وہ ویٹو پاور استعمال کرتا ہے لیکن وہ دعا کا پھل دینا نہیں بھولتا۔ وہ پھل ہمیں کہیں نہ کہیں سے، کسی نہ کسی صورت مل جاتا ہے لیکن ہم اکثر سمجھ نہیں پاتے اور ہم یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ ہماری دعا قبول نہیں ہوئی۔

جہاں تک دعا کی قبولیت میں تاخیر کا تعلق ہے، جیسا کہ پہلے عرض کیا کہ کائنات کا ہر ذرہ مقررہ وقت پر حرکت میں آتا ہے۔ دنیا میں مختلف واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں، کائنات کو اسکیل ڈاؤن کرتے ہوئے دنیا، دنیا سے ملک، ملک سے شہر اور شہر سے گھر پر لے آئیں۔ وہ دعا جو ہم مانگ رہے ہیں ہوسکتا ہے اس کا تعلق کسی اور شخص سے ہو۔ فرض کریں میں دفتر میں اپنی پروموشن کے لیے دعا کر رہی ہوں۔ وہاں اسی پروموشن کا ایک اور شخص بھی امیدوار ہے۔ لہٰذا اگر میری دعا قبول ہوجاتی ہے تو اس شخص کی قسمت میں جو رزق لکھا ہے وہ اسے کیسے ملے گا؟ اب ہوگا یہ کہ میری دعا کی قبولیت سے پیشتر تو اس شخص کی پروموشن ہوگی یا پھر کسی اور جگہ اس کی بہتر جاب کا انتظام ہوجائے گا اور اس کے بعد میری پروموشن بھی ہوجائے گی۔ دو چیزیں ہم نے دیکھیں۔

1۔ دعا کا قبول ہونا۔

2۔ دعا کا پورا ہونا۔

کوئی بھی دعا قبول تو فوری طور پر ہوجاتی ہے۔ مثال کے طور پر کسی شخص نے دعا کی۔ یاباری تعالیٰ مجھے بیٹا عطا فرمادے۔ اب دعا تو اسی لمحے قبول ہوگئی لیکن اس کے پورا ہونے میں ممکن ہے کہ ایک یا دو سال لگ جائیں۔

رب نے یہی فرمایا ہے۔ ''تمہارا رب دعاؤں کو سننے والا ہے۔'' دوسری جگہ فرمایا۔ ''تمہارا رب دعاؤں کو قبول کرنے والا ہے۔ لفظ ''سمیع'' اور ''استجیب'' استعمال ہوا۔ دعا کے پورا کرنے کے بارے میں خاموشی ہے کیونکہ یہ منسلک ہے رب کی کائنات چلانے کی مصلحتوں کے ساتھ اور رب کی مصلحتیں صرف اس کے نبی کریم ﷺ ہی کو معلوم ہیں۔

ملازمت پیشہ افراد جانتے ہیں کہ تمام ممالک میں بجٹ کا مالی سال fiscal year کہلاتا ہے یا پھر کچھ اداروں میں اسے financial year کہتے ہیں۔ اسی طرح گھر بھی ایک بجٹ کے تحت چلتے ہیں، جو لوگ اپنی آمدنی کے مطابق گزر بسر کرنا چاہتے ہیں اور مقروض نہیں ہونا چاہتے۔ وہ بھی بجٹ بنا کر چلتے ہیں۔

رب ایک بجٹ بنا کر کائنات چلاتا ہے۔ اس کا بھی ایک fiscal year ہے۔ شب قدر کیا ہے؟ دعائیں کثرت سے قبول ہوتی ہیں۔ شب برات گویا یکم جولائی ہے۔ رب کے fiscal year کی جس میں سارے سال کا بجٹ بن جاتا ہے۔ یاد رکھیے تاخیر کا مطلب ہمارے نیک و بد ہونے، اللہ سے دور نزدیک ہونے یا پھر پیر صاحب کے کمزور یا طاقتور ہونے سے نہیں...... یہ کلیتاً رب کا اختیار ہے...... وہ اس کاروبار کائنات کے مطابق ایکشن لیتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ دعائیں کبھی رائگاں نہیں جاتیں اگر دعائیں پوری نہیں ہوتیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں نوازا نہیں بلکہ اصل میں وہ اس دعا کے بدلے ہمیں مصیبتوں سے بچالیتا ہے۔ کچھ اور نعمتیں ہمیں عطا کردیتا ہے۔ اللہ اپنے بندوں کو بے نیل و مرام نہیں لوٹاتا۔ ہمیشہ کچھ دے کر ہی لوٹاتا ہے۔

مرسلہ: روبینہ ظفر، ڈیرا اسماعیل خان

''میں نے خان صاحب سے کہا تھا کہ مہرزاد کو اس ماحول میں ہی رہنے دیں، اسے آزاد فضاؤں کا عادی نہ بنائیں، اسے سخت جان اور پتھر دل بننے کے لیے اسی ماحول میں رہنا چاہیے۔ وہ کسی اور منزل کا مسافر بن گیا تو زندگی اس کے لیے مشکل ہوجائے گی مگر انہوں نے مجھے جاہل عورت سمجھ کر میری بات کو پائی نہیں ڈالا۔ خانوں کے بیٹے، سرداروں کے سپوت بڑے بڑے کالجوں، بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں پڑھتے ہیں۔ ان کے رہنے سہنے کا انداز انگریزوں جیسا ہوجاتا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں کے سامنے وہ پینٹ کوٹ پہن کر انگریزی میں باتیں کرتے ہیں مگر یہ سب کرنے سے ان کے اندر کا خان اُن کے اندر کا سردار مر نہیں جاتا۔ یہ تیرے باپ کی منطق تھی، اس کے سامنے اپنے خاندان کی تاریخ تھی، تیرا دادا، تیرا پردادا، تیرا باپ، تیرے چاچے، تیرے ماے سب ہی یہ کچھ کرنے کے بعد بھی سردار ہی رہے، خان ہی کہلائے۔ وہ انگریز صاحب بہادر کے بچے نہیں بن گئے۔ پر اس کا کیا، کیا جائے کہ میں تیری ماں تھی اور میں نے تجھے اپنا دودھ پلا کر زندگی تیرے اندر ڈالی تھی۔ مجھے اپنے دودھ کے گنوں کا بڑی اچھی طرح پتا تھا۔ سیانے کہتے ہیں ماں کے دودھ کے ساتھ اس کی ساری سوچ بھی بچے کے اندر جاتی ہے۔ اس کے احساسات اور اس کے جذبات سب بچے کے خون میں رچ بس جاتے ہیں۔ مجھے اسی بات سے ڈر لگتا تھا، کوئی نہیں جانتا مگر ماں جانتی ہے کہ اس نے اپنے بچے کے خون میں کیا شامل کردیا ہے۔''

مہرزاد کو محسوس ہوا وہ زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی ماں کو دیکھ اور سن رہا تھا۔ وہ بغیر پلک جھپکے ایک بچے کی سی حیرت کے ساتھ ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی جس ماں سے متعارف تھا اس کی زندگی کا رنگ ڈھنگ تو بہت مخصوص تھا۔ خانوں اور سرداروں کی بیویوں کا سا انداز، حکمرانی اور امورِ سلطنت کی باگ ڈور چلاتی عورت کا سا انداز، اپنے اونچے شملے والے شوہر کے مزاج، مشاغل اور مصروفیات کا ساتھ دیتی عورت جو خود بھی اسی قسم کے کسی دوسرے خاندان سے بیاہ کر ادھر آئی تھی اور اس ماحول میں بڑی خوبی سے رچ بس گئی تھی۔ مہرزاد کو ہمیشہ سے ان کی گود میں ممتا کی مخصوص گرمی محسوس ہوتی اور ان کے وجود سے ایک مخصوص سی خوشبو آتی محسوس ہوتی، ان دونوں احساسات کے علاوہ وہ اپنی ماں کو شاید ذرہ بھر بھی نہیں جانتا تھا مگر آج کا دن مختلف تھا، آج کے دن اس کی ماں اپنی ذات پر پڑے پردے ہٹا کر اس کے سامنے ایکسپوز ہونے کے لیے بیٹھی تھی۔ وہ اس سے وہ باتیں کررہی تھی جو اس نے آج تک کسی سے نہیں کی تھیں اور اس کے بعد بھی شاید یہ باتیں اسے کسی سے نہیں کرنی تھیں۔ وہ عورت جو اس کی ماں تھی اور جسے وہ خود بھی ایک کم تعلیم یافتہ عام سی عورت سمجھتا تھا وہ اس کے سامنے بیٹھی فلسفہ اور منطق سنا رہی تھی۔

''اس کا یقین مجھے اس لیے تھا کہ میرے اپنے ضمیر میں بغاوت تھی، یہ بغاوت میرے دودھ میں اتر کر تیرے خون میں شامل ہوگئی تھی مگر مجھے اس کا ڈر تھا کہ تیرے باپ کی اتنی ساری بیویوں میں سے کسی کے ہاں بھی میرے علاوہ اولادِ نرینہ ہونے کے باعث یہ وقت آنا ہی تھا۔ اس لیے میں کہتی تھی کہ تجھے ادھر ہی رکھا جائے۔ اسی دنیا میں، اتنی ہی وسعت میں جتنی یہاں ہے مگر میری ایک بھی نہ مان کر تیرے لیے مشکل کھڑی کردی گئی ہے۔ یہ دنیا اتنی ہی سخت ہے بہر، یہ تجھے ہلنے کی بھی جگہ نہ دے گی۔ تیرا باپ فطری موت مرگیا ہوتا تو بھی شاید کوئی گنجائش نکل آتی مگر وہ تو شہید ہوگیا، اب شہادت کسی کو ملی یا نہیں یہ کسی کسی کے سوچنے کی بات ہے مگر سچ تو یہ ہے کہ تو ایک شہید کا بیٹا ہے۔ اس علاقے کا سپوت ہے، حاکمیت قائم رکھنی ہے، اپنے خاندان کی ناک اونچی رکھنی ہے، تیرے لیے کوئی فرار نہیں ہے۔ تیرے لیے کوئی راستہ نہیں۔'' وہ اپنے دونوں ہاتھ چہرے

پر رکھ کر رو دیں۔" تجھے اپنا آپ بھول جانا پڑے گا۔ اپنی قربانی دینی پڑے گی۔ اپنا آپ پھونک دینا پڑے گا۔ اس نظام میں...... اس کا ایندھن بننا پڑے گا کیونکہ تیرے باپ کے قاتل زندہ ہیں، تجھے بدلہ بھی لینا ہے اور کسی کو اس علاقے میں آگے بھی آنے نہیں دینا۔ بڑے امتحان دینے ہیں تجھے، بڑی آزمائشوں سے گزرنا ہے مہر، تجھے ایک موت مر کر دوسری زندگی میں جانا پڑے گا۔" اماں رو رہی تھیں اور مہر ان کے سامنے ششدر بیٹھا تھا۔

"یہ زندگی اور اس کے تجربے کیا ایک بے علم کو اتنا باعلم اور منطقی بھی بنا سکتے ہیں جتنا انہوں نے میری کم علم، کم فہم ماں کو بنا دیا ہے۔" اس نے کچھ دیر یونہی انہیں دیکھتے رہنے کے بعد آگے بڑھ کر ان کے ہاتھوں کو ان کے چہرے سے ہٹا دیا۔ وہ ان کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا۔ اس نے ان کے مضبوط وجود کے گرد اپنے بازوؤں کا گھیرا بنا لیا اور ان کا سر اپنے سینے سے ٹکا لیا۔ وہ انہیں مضبوطی سے جکڑے ان کی پشت اپنے ہاتھوں سے سہلا رہا تھا۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب وہ یوں ان کے قریب ہوا تھا۔ اس کے باپ کو مرے بیس دن گزر چکے تھے اور ان بیس دنوں میں ایک بار بھی وہ ان کے اس طرح قریب نہیں آیا تھا، حالات ایسے تھے کہ اسے زیادہ تر وقت باہر مردانے میں گزارنا پڑ رہا تھا اور عدت میں ہونے کی وجہ سے وہ باہر نہیں آ سکتی تھیں مگر یہ اتفاق تھا کہ وہ شدید تھکن کی وجہ سے آج تنہا اپنے کمرے میں آرام کرنے کی غرض سے آیا تھا اور اتفاق سے وہ بھی ادھر آ گئی تھیں۔ ماں کا دل کیا ہوتا ہے اس روز اسے سمجھ میں آیا تھا۔ یہ دل کیسے خود ہی سے سب کچھ جان لیتا ہے، اسے اپنے بچے کے دل کا حال کیسے معلوم ہو جاتا ہے۔ وہ کیسے کیسے تڑپتا ہے۔ یہ بھی اس روز ہی اسے پتا چلا تھا۔

وہ سمجھتا تھا کہ اس ماحول سے دور رہنے کی وجہ سے اس میں اپنے باپ، دادا کی سی بے حسی نہیں آ پائی مگر اس روز اسے احساس ہوا تھا کہ یہ بے حسی اس میں پوری طرح موجود تھی۔ وہ اتنے دن سے یہاں موجود تھا اور اس نے اپنی اس ماں کے پاس پندرہ، بیس منٹ بھی نہیں گزارے تھے جس کی بادشاہت چھن گئی تھی اور جس کے وجود کی اہمیت کی ضمانت صرف اس کا ان کی پشت پر موجود ہونا تھا۔ اس نے ان کے شانے پر ہاتھ سے دباؤ ڈالا۔

"جو بات آپ سوچ رہی ہیں وہ ایسے نہیں ہے، اب وقت بہت بدل چکا ہے۔ اب ہم چاہیں تو ان دونوں دنیاؤں کو ایک ساتھ لے کر چل سکتے ہیں، دونوں میں موجود رہ سکتے ہیں۔ آپ کیا سمجھتی ہیں کہ اگر مجھے اس دنیا میں وادا گیری کرنی ہے تو کیا میں اس کے لیے پرانا لائحہ عمل اپناؤں گا۔" اس نے تھوڑا پیچھے ہٹ کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کی نظروں میں سوال تھا۔

"پھر کیا کرو گے؟" اس سوال میں ایک خوف بھی پوشیدہ تھا۔

"آپ فکر مت کریں، میں روایات سے بغاوت کرنا پسند نہیں کرتا لیکن اگر یہ من کے خلاف ان چاہی ہی سہی ذمے داری مجھ پر آ ہی گئی ہے تو میں اسے اپنی مرضی سے نبھاؤں گا۔ میں انسان کے شعور اور جبلت کا گلا گھونٹنے اور اس کی خواہش پر کلہاڑا چلانے والوں میں سے نہیں ہوں۔ جنگل میں جنگل کا قانون چلانے والی باتیں پرانی ہو چکی ہیں، انسانوں کی بستی کو جنگل قرار دینے والوں کے ذہنی دیوالیہ پن کو نظروں کے سامنے لانے کا وقت ہے اور یہ میں لاؤں گا۔ آپ مجھے کسی بھی موقع پر کسی بھی موڑ پر کم ہمت اور پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں پائیں گی۔ میں نے زندگی میں اور کچھ سیکھا ہو یا نہ ہو، ایک بات ضرور سیکھی ہے یا تو میدان جنگ میں آ ؤ

ہی نہیں لیکن اگر آ جاؤ تو اگلی صفوں میں موجود رہنے کی کوشش کرو۔ اپنے گھوڑے کی باگیں مضبوطی سے تھامے رہو اور اسے پیچھے کی طرف منہ کر کے بھاگنے کی عادت نہ ڈالو، جان گنوا لو یا جان لے لو مگر جان گنوانے کا اصول بھی یاد رکھو، زخم تمہارے سینے پر ہونا چاہیے پشت پر نہیں۔"

وہ آنکھیں کھولے اپنے اس بیٹے کو اس قدر ٹھہرے ہوئے اور مضبوط لہجے میں بولتے سن رہی تھیں۔ وہ اس غیر متوقع ردعمل پر اتنی حیران تھیں کہ ان کی آنکھوں سے بہتے آنسو بھی رک گئے تھے۔ وہ تو اس کے جذبات کو سمجھنے اور اسے یہاں سے فرار ہو جانے کی نصیحت کرنے آئی تھیں، اسے یہ باور کروانے آئی تھیں کہ روایات اور عزتیں کتنی ہی بلند اور اہم کیوں نہ ہوں مگر وہ اسے ان کی بھینٹ چڑھنے نہیں دیں گی کیونکہ وہ ان کے جگر کا ٹکڑا تھا اور جب جگر پر زد پڑتی ہے تو انسان سب مفادات سے بالاتر ہو کر اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اسے اس جنگل اور جنگل کے قانون سے فرار ہو جانے کی ترغیب دینے آئی تھیں مگر وہ تو انہیں کچھ اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔

"آپ سردار مراد علی خان کی بیوی کی حیثیت سے اس علاقے کی حکمران تھیں، اب آپ سردار مہر زاد علی خان کی والدہ کی حیثیت سے یہاں کی حکمران رہیں گی۔ کسی قسم کی کمزوری دکھانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بس میرے لیے یونہی دعا گو رہیں تاکہ مجھے کسی اور بات کا اعتبار ہو نہ ہو، اتنا یقین ضرور ہو کہ میری پشت پر میری ماں کی دعائیں موجود ہیں جن کا حصار مجھے کہیں بھی نیچا نہیں ہونے دے گا۔"

ان کا دل مدت کے بعد جوان ہو گیا تھا، اس نیم مردہ تن میں جیسے نئی جان پڑ گئی تھی۔ اس شکستہ دل اور مردہ تن کا بوجھ اٹھائے وہ کئی سالوں سے یونہی جیے چلی جا رہی تھیں مگر ان کے جوان بیٹے کے مضبوط لہجے نے انہیں گویا زندگی کی نوید سنا دی تھی۔ ان کا دل پل بھر کو جھوم اٹھا مگر اگلے ہی لمحے انہیں کئی تلخ حقیقتیں اور خطرناک ترین عزائم یاد آ گئے۔ پیچ در پیچ الجھے مسائل، منتقی رویے اور عیارانہ ذہن، کیا وہ اپنے اس جوان بیٹے کو ان سب میں جھونک دیں گی

"نہیں......" انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "تو یہاں سے بھاگ جا، سنبھالنے دے اپنی برادری کے مردوں کو اپنے شملے اور حکمرانی، تو بھاگ جا مہر بھاگ جا۔"

"میں نے آپ کو ساری بات تو بتائی ہے، میں نے زندگی میں اور کچھ سیکھا ہو نہ ہو جو سیکھا ہے اس سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔" اس نے ان کا ہاتھ دبا کر کہا۔ "آپ اپنی ساری فکریں اور پریشانیاں مجھے دے دیں۔" وہ مسکرا کر بولا۔

انہیں لگا وہ سب چیزیں جو سردار مراد کے مرنے کے ساتھ درہم برہم ہو گئی تھیں، واپس اپنی جگہ پر آ کھڑی ہوئی ہوں۔ انہوں نے اپنے شانوں سے سب بوجھ ہٹا کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر عزم تھا اور سکون بھی۔



"my heart is a territor conquered by you, now its up to you to make it a stronghold and be its monarch for ever"

"میرا دل تمہارا مفتوحہ علاقہ بن چکا ہے، اب یہ تم پر منحصر ہے کہ اسے اپنا مضبوط قلعہ بنا کر ہمیشہ کے لیے

اس کی حکمران بن جاؤ۔"

اس نے اپنے موبائل کی اسکرین پر روشن یہ الفاظ پڑھے اور زیرِ لب مسکرا دی۔ زندگی کی تلخیوں کے درمیان ایسا ٹھنڈا اور پُرسکون احساس، اس کا کبھی کبھار ہونا بھی غنیمت تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ جس ماحول سے اس کا تعلق بن چکا تھا اس سے کوئی باہر کا بندہ تعلق جوڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کا حسن نمائش بن چکا تھا اور اس کی تعلیم و تربیت سے کسی کو کوئی غرض نہیں تھی، وہ آزاد فضاؤں میں اُڑنے کی عادی تھی مگر اس کے پر تینچ کر دیے گئے تھے۔ طبلے کی تھاپ اور گھنگروؤں کی گونج، آواز کے رس اور حسن کے جلوے دیکھنے کے لیے اِدھر آنے والوں کو اس دل کے حال سے کیا غرض ہوسکتی تھی جو کب کا مر چکا تھا، ہاں مگر وہ جو شاید کسی اور منزل کا بھٹکا ہوا مسافر تھا اور راستہ پوچھنے کی غرض سے اِدھر آ گیا تھا اس کی نظر نہ حسن کے جلوؤں پر پڑی نہ کان طبلے کی تھاپ، گھنگروؤں کی گونج اور آواز کے رس پر گئے۔ اس نے تو وقت کی راکھ میں دبے اس دل کو دریافت کرلیا جو اس کے خیال میں دنیا کا سب سے خوب صورت دل تھا اور اس دل کی مالک وہ لڑکی دنیا کی سب سے اچھی لڑکی...... جب ہی تو اس نے کہا تھا۔

"میرا دل تمہارا مفتوحہ علاقہ ہے۔" وہ اس کی باتیں یاد کر کے بے اختیار مسکرا دیتی اور اس میں آنے والی اس تبدیلی کو کوئی بھی سمجھ نہ پایا تھا ماسوائے تاؤ شریف کے جس کی اپنی کہانی اسی لڑکی کی کہانی سے ملتی جلتی تھی۔ وہ اس مسکراہٹ کی وجہ کے بارے میں قیاس کرسکتا تھا مگر وہ ایسا قیاس کرنے سے ڈرتا تھا۔ اس کے سفید بالوں اور چہرے کی جھریوں میں عمر اور تجربے کا رس گھلا تھا۔ وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ ایسی مسکراہٹ کی تاریخ کیا ہوتی ہے۔ یہ کن حالات سے شروع ہو کر کن نتائج پر ختم ہوتی ہے، معصوم اور بے پروا بے مثال حسن کی مالک اس لڑکی سے اسے عجیب سا لگاؤ تھا، وہ دل ہی دل میں اسے اپنی ذمے داری سمجھتا تھا۔ گو اس ماحول کے اصول اور ڈھنگ کو نظر میں رکھتے ہوئے اس نے کبھی اس بات کا اظہار نہیں کیا تھا مگر وہ خاموش رہتے ہوئے بھی اس کے ہر معاملے پر گہری نظر رکھتا تھا۔ اسے بہت اچھی طرح معلوم تھا کہ مسکراہٹ کی یہ کہانی کب اور کہاں شروع ہوئی تھی۔ اس سنہری محل میں آنے والوں میں وہ کون ایسا منفرد شوقین تھا جس نے ایک تماشائی کی نظر زرنگار پر نہیں ڈالی تھی بلکہ شاید اس نے اس کے چہرے اور جوانی پر ایک بھی نظر نہیں ڈالی تھی۔ وہ جتنی مرتبہ یہاں آیا غائب دماغی کی کیفیت میں بیٹھا رہا، وہ بہت سی چیزوں کا شوقین نظر نہیں آتا تھا مگر اس ماحول میں موجود نظر آنے کے لیے ہر چیز سے شوق فرماتا تھا مگر وہ عادی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو وہ تاؤ شریف کو کوئی جاسوس لگتا جو اس ماحول کے متعلق معلومات جمع کرنے کی غرض سے اِدھر آتا تھا اور ہر ایک چیز پر خاموش نظر رکھتا تھا مگر دو مرتبہ کے بعد تیسری مرتبہ اِدھر کیوں آیا تھا۔ یہ تاؤ شریف کی گھاگ نظروں نے فوراً پالیا تھا پھر اس نے اس کی نظروں کا تعاقب شروع کر دیا، یہ بہت آسان تھا، کسی بھی محفل کے دوران اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہ جس جگہ بیٹھتا تھا وہ اتفاق سے اس آنے والے کے عین سامنے ہوتی یوں اس کی نظروں کا تعاقب آسان ہوگیا تھا۔ وہ زرنگار کے لیے وہاں آتا تھا۔ اسے معلوم تھا مگر اسے زرنگار میں کیا بھایا تھا، اس کا حسن، اس کی مسکراہٹ، معصومیت یا کچھ اور...... وہ کس چیز کا خریدار تھا اس کے جسم کا یا اس کی روح کا۔ تاؤ شریف اندازے لگانے کی مدت میں ہی تھا کہ زرنگار کی ایک رات کے لیے اس نو وارد کی طرف سے بے منت پہنچ گئی۔

(جاری ہے)



شامِ شہرِ یاراں

عنیزہ سیّد

قسط 2

زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے۔۔۔ خیر و شر، نیکی اور بدی۔۔۔ زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت۔۔۔ ہر برائی پر حاوی ہوجاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سیّد نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

www.paksociety.com

''جب ایک بار زندگی میں غلطی ہو جائے تو پھر اس پر پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، غلطی کے نتائج جو سامنے آئیں ان میں سے مثبت کی طرف نظر کرنا بہتر ہوتا ہے۔'' محمود دُرّانی نے اپنے مخصوص ٹھہرے لہجے میں مہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اگرچہ اس بے وقت کی بڑبڑاہٹ کا پس منظر نہیں جانتے تھے جو مہرین نے ان کے دفتر سے واپس آنے کے بعد سے اب تک شروع کر رکھی تھی مگر اس کا مفہوم و مقصد ضرور سمجھ گئے تھے۔

''یہ لڑکا ہر جگہ مجھے شرمندہ کروانے کا تہیہ کیے بیٹھا ہے اگر اس کے انداز اتنے واضح نہ ہوتے تو سعدیہ کیا مجال تھی کہ کُرید کر اس کے بارے میں مجھ سے سوال کرتی۔'' مہرین کے لہجے میں غصہ اور بے بسی دونوں موجود تھے۔

''میرا نہیں خیال کہ وہ دانستہ ایسا کرتا ہے۔'' محمود نے بیٹے کی طرف داری کی جرأت کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ اس کے مزاج سے بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ اتنا ہی بے ساختہ اور سادہ ہے کہ بنا کر یا بڑھا کر کوئی بات اپنے بارے میں کرنا اس کے لیے ناممکن ہے۔''

''وہ جیسا بھی ہے اسے کیا ضرورت پڑی ہے دوسروں کو یہ تاثر دینے کی کہ وہ ہم سب گھر والوں سے اپنے ماں باپ سے، اپنے بہن بھائیوں سے بالکل مختلف مزاج اور الگ شخصیت کا حامل ہے۔ صرف اس لیے کہ......'' مہرین کے غصے اور بے بسی نے ان پر مکمل طور پر قابو پالیا اور وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکیں۔

''صرف اس لیے کہ اسے اس کی ماں کے بجائے اس کی نانی نے پالا ہے۔ اس کی تربیت نانی کے ہاتھوں ہوئی ہے اور یہ کہ اس کی ماں اور نانی کے مزاج میں بہت فرق تھا اس لیے وہ اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے ایک بالکل مختلف شخصیت رکھتا ہے۔'' محمود نے کمالِ تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے نرمی سے مہرین کی ادھوری چھوڑی بات کو مکمل کیا۔

''ہوں......'' مہرین نے ہنکارا بھرا۔

''تو مائی ڈیئر وائف......'' محمود نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ ''یہ کون سی بڑی بات ہے۔ ہمارے خاندان والے، ہمارے عزیز و اقارب کون نہیں جانتا کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ حمزہ آپ کی گود میں نہیں اپنی نانی کے ہاتھوں میں پلا بڑھا ہے، اس نے اپنی زندگی کے کئی سال اپنے ماں باپ کے گھر سے ایک بالکل مختلف ماحول میں گزارے ہیں اس لیے اس کی شخصیت اور مزاج ہم لوگوں سے چنداں مختلف ہے۔ اس میں شرمندہ ہونے یا ناراض ہونے والی بات کون سی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ حمزہ کو آپ نے بی اماں کے حوالے جب اس وقت آپ کتنی مجبور تھیں۔ آپ کی خرابیِ صحت اور پہلے سے دو چھوٹے بچوں کے ساتھ نے آپ کو ایسا کرنے کے لیے مجبور کیا اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بی اماں کون سا کوئی غیر خاتون تھیں۔ آپ کی اپنی والدہ تھیں، ایسے وقت میں انہوں نے کیسے آپ کا ساتھ دیا، ان کی عمر زیادہ نہ تھی، بہت ہمت والی اور ایکٹو خاتون تھیں، ایک بچہ پالنا ان کے لیے مشکل نہیں تھا سو انہوں نے حمزہ کو بہت اچھے انداز میں پالا۔ مہرینؔ میں سمجھ نہیں پا رہا کہ اس جھنجلاہٹ کی وجہ کیا ہے؟''

''آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ وجہ کیا ہے۔'' مہرین نے خفگی سے کہا۔ ''ہمارے سب رشتے دار ہمارے اسٹیٹس اور رہن سہن سے خار کھاتے ہیں حالانکہ یہ اللہ کا دیا ہوا ہے مگر کیونکہ ان کی رسائی میں نہیں ہے اس لیے اپنے دلوں کے پھپھولے یوں پھوڑتے ہیں کہ حمزہ کی شخصیت کے مختلف ہونے کا ذکر کر کے اسے ہمارے گھر کے ماحول میں مس فٹ خیال کرتے ہیں اور وہ لڑکا جو میرا اپنا سگا بیٹا ہے ان کی باتیں سن کر مجھے خود سے اور بھی دل

کھڑا نظر آتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ بی اماں نے اسے حد درجہ محنت کر کے اتنا مختلف بنا بھی دیا۔ میرے اور اس کے مزاج میں ہم آہنگی آ ہی نہیں پائی۔ میں مشرق کی بولوں تو اس کا جواب مغرب کا ہوتا ہے، میں زمین کی کہوں، وہ آسمان کی سناتا ہے۔ اسے ہمارا رہن سہن، ہمارے طور طریقے پسند نہیں، اس گھر میں اسے اپنا آپ مس فٹ ہی لگتا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں وہ گھر سے باہر رہنے کو کتنی ترجیح دیتا ہے۔ گھر میں رہتا بھی ہے تو یوں جیسے کوئی اجنبی، جیسے کوئی مہمان، یہ بہت زیادہ ہے، بہت زیادہ۔'' مہرین کے دل کی بات زبان پر آنے لگی۔

''او وہ تو اصل بات یہ ہے۔'' محمود کو احساس ہوا کہ مہرین کی جھنجلاہٹ کے پیچھے اصل مسئلہ کیا تھا۔ ''اسے ابھی ہمارے پاس آئے کتنا عرصہ ہوا ہے۔'' وہ انہیں سمجھانے لگے۔ ''کسی دوسرے ماحول میں جا کر سیٹ ہونے میں ٹائم تو لگتا ہے، اتنے سارے فرق اور تضاد کے باوجود یہ حقیقت تو جھٹلائی نہیں جا سکتی ناں کہ وہ آپ کا بیٹا ہے اور آپ ہی کا بیٹا رہے گا۔ باقی شخصیتوں کے تضاد اور فرق کو اتنا بڑا مسئلہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ ایسا تو ایک ہی گھر میں پلنے بڑھنے اور ایک ہی ماں کے ہاتھوں پرورش پانے والے بچوں کے درمیان بھی ہو سکتا ہے۔''

محمود اپنے تئیں ایسی باتیں کر رہے تھے جو مہرین کو اپنے ذہن میں سمائی بات جھٹک دینے میں معاون ثابت ہو سکتی تھیں لیکن مہرین خود جانتی تھیں کہ ایسا محض کہہ دینا آسان تھا اصل حقیقت مختلف تھی۔ حمزہ کا مزاج اسے بھی اس ماحول میں سیٹ ہونے کی اجازت نہیں دینے والا تھا۔ انہیں کبھی کبھی شدید خواہش ہوتی کہ وہ وقت کا پہیا الٹا گھما دیں اور اس زمانے میں پہنچ جائیں جب حمزہ کو انہوں نے بی اماں کے حوالے کیا تھا۔ جب ان کی کم عمری، نئے داریوں، اوپر تلے کے تین بچوں اور صحت کی خرابی نے ان کی عقل ماردی اور ہوش اُڑا دیے تھے۔ ایسے میں بی اماں انہیں کیسا فرشتہ محسوس ہوئی تھیں مگر اتنے سال گزر جانے کے بعد جب وہ ایک خوشحال، آسودہ اور پُرسکون زندگی گزار رہی تھیں، انہیں خیال آتا تھا کہ اگر اتنا عرصہ پہلے بھی وہ شعور اور سمجھ میں اتنی ہی پختہ ہوتیں جتنی اب تھیں تو کبھی حمزہ کو خود سے جدا نہ کرتیں۔ انہیں اب پچھتاوا محسوس ہوتا اور حمزہ کی موجودہ شخصیت سے اختلاف بھی۔

☆☆☆

نادیہ نے زندگی کو ان تصورات سے مختلف پایا تھا جو لڑکپن اور اوائلِ جوانی میں ذہن میں آتے تھے۔ انہیں اپنی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالنے کا کوئی خاص شوق تھا نہ ہی انہیں اس کی فرصت ملتی تھی مگر کبھی کبھار ایسا ہوتا تھا کہ راتیں طویل ہو جاتیں اور نیند دور بھاگ جاتی تھی۔ نیند کی خواہش کرتے کرتے ذہن کی رو بھٹکنے لگتی اور بہت سی پرانی یادیں اور پرانی باتیں یاد آنے لگتیں۔ کبھی کبھار یہ یادیں اور باتیں احتساب کا درجہ اختیار کر لیتیں۔ ایک ایک لمحے کا شمار ہونے لگتا۔ کب کہاں کیا غلط ہوا؟ کب، کہاں، کیا نہیں ہونا چاہیے تھا جو ہوا اس کے بجائے کیا کرنا چاہیے تھا؟ کہاں، کہاں ایک درست فیصلہ حالات کو بہتر شکل دے سکتا تھا؟ کہاں، کہاں جذبات سے کام لینے سے زندگی کا نقشہ بدل گیا؟ کہاں عقل نے ساتھ نہیں دیا؟ اور کہاں حالات کو مقدر جان کر سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ رات کی گھڑیاں بیتتی جاتیں اور احتساب کا دورانیہ بڑھتا جاتا۔

پھر انہیں خیال آتا کہ زندگی میں جو مختلف کردار انہیں نبھانے پڑے انہیں انہوں نے کیسا نبھایا۔ انہیں اپنی ہر پرفارمنس میں غلطیاں نظر آتیں، کبھی وہ ایک بیٹی اور ایک بہن تھیں۔ انہوں نے ان دونوں حیثیتوں کو بری طرح لیٹ ڈاؤن کر دیا۔ ان دونوں حیثیتوں کو لیٹ ڈاؤن کرنے کے پیچھے کسی کی بیوی بننے کی خواہش کو دخل تھا۔ وہ سعید کیانی کی محبت میں گرفتار ہو گئیں، یہ ان دنوں ہوا جب وہ دونوں میڈیکل کے فائنل ایئر میں

تھے۔ چار سال تک اکٹھے پڑھنے اور اٹھنے، بیٹھنے کے بعد اُن پر انکشاف ہوا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو چا لگے تھے۔ نادیہ کے لیے یہ ایک انوکھا انکشاف تھا مگر سعید کیانی کے اظہار پر انہیں بالکل بھی برا نہیں لگا بلکہ محسوس ہوا کہ وہ خود بھی ایسا ہی چاہتی اور سوچتی تھیں۔ ہاؤس جاب کے دوران ان کی ذہنی ہم آہنگی بہتر گئی اور انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ ایک دوسرے کے بغیر ان کی زندگی ناممکن تھی۔

سعید نے اپنے بھائی کے ذریعے ان کے ہاں شادی کا پیغام پہنچایا جسے بری طرح مسترد کردیا گیا۔ نادیہ شبیر محبت کرتے ہوئے بہت سے زمینی حقائق فراموش کر بیٹھی تھیں۔ انہیں بھول گیا تھا کہ ان کے خا میں ذات پات، خاندان اور پس منظر کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ ذات، برادری سے باہر شادی کر ناقابلِ معافی سمجھا جاتا تھا، اسی لیے زیادہ تر اپنے خاندان میں ہی شادی کرنے کو ترجیح دی جاتی تھی۔ سعید ایک بالکل مختلف ذات اور برادری سے تعلق رکھتے تھے، ان کے بھائی کی تو ایک سے دوسری بات بھی نہ گئی۔ وہ زمانہ ایسے حالات کو من وعن تسلیم کرلینے کا تھا مگر نادیہ کے ذہن ودل نے بغاوت کردی۔ انہوں اپنے والدین اور بھائیوں کے سامنے صاف الفاظ میں احتجاج کیا اور فیصلہ سنا دیا کہ وہ ہر صورت سعید کیانی شادی کریں گی۔ درمیان کے عرصے میں حالات نے کئی پلٹے کھائے، سعید کے گھر والوں نے نادیہ کے وال کی مرضی کے بغیر شادی کرنے سے انکار کردیا مگر ان دونوں کو پھر بھی من مرضی کرنے سے نہ روکا جاسکا.. اور بغاوت کورٹ میرج پر منتج ہوئی اور ان دونوں کا اپنے والدین سے تعلق ختم ہوگیا جس طرح یہ کہانی نئ تھی اسی طرح اس کے نتائج وعواقب بھی نئے نہیں تھے۔ کورٹ میرج کے بعد زندگی میں قدم جمانے کا آیا۔ دونوں نے ایوب میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا تھا، اس شہر سے دونوں ہی واقف تھے سو دونوں اسی شہر میں قیام کا فیصلہ کرلیا۔ دونوں کے خیال میں انہوں نے ایک جائز کام غلط طریقے سے کیا تھا۔ د کے ذہنوں پر اس کا بوجھ تھا، اس ذہنی بوجھ نے دونوں کو ہی سماجی زندگی سے دور کردیا۔ لوگ ان کے با میں سو طرح کی باتیں سوچ سکتے تھے، وہ اتنے تنہا کیوں تھے، کوئی ان سے ملنے کیوں نہیں آتا تھا؟ ان والدین اور عزیز واقارب کہاں تھے؟ سعید سے زیادہ نادیہ کے ذہن پر اس کا بوجھ تھا، سعید کا ساتھ دنیا کی بڑی نعمت تھا مگر اس نعمت کے حصول کے لیے جو کچھ انہوں نے گنوایا اس نقصان کا تخمینہ لگانا ناممکن تھا۔ ا نے خود کو اپنے کام میں بری طرح مصروف کرلیا۔

شادی کے تین سال بعد ان کے ہاں علینہ آگئی‘ دونوں کے لیے یہ موقع بھی خوشی اور افسوس کا احساس لے کر آیا۔ خدا تعالیٰ نے انہیں ایک نعمت سے نوازا تھا مگر اس نعمت کی خوشی منانے کے لیے اکیلے تھے۔ ان کے چند ایک انتہائی قریبی دوستوں نے ان کے والدین سے رابطہ کرنے اور انہیں منا کوشش کی مگر ناکام رہے۔ یہ زندگی جس کے لیے دونوں نے ہی بڑی قربانی دی، دونوں کے لیے سب ہونے کے باوجود دونوں کو بوجھ... محسوس ہونے لگی۔

”یا تو کوئی بڑا قدم اٹھاؤ نہیں، جب اٹھالو تو پچھتاؤ نہیں۔“ نادیہ کی ایک پرانی دوست نے ایک با سے کہا تھا مگر وہ ان الفاظ کی روح کو قبول نہ کر پائی تھیں۔ پچھتاوؤں نے ان کے دل میں گھر کرلیا افسردہ اور ناخوش رہنے لگی تھیں مگر خدا کا شکر ہر حال میں کس قدر ضروری تھا، اس کا خیال انہیں اس وقت جب صرف بتیس سال کی عمر میں سعید اچانک ہارٹ فیلئر کا شکار ہوگئے۔ یہ اتنی غیر متوقع بات تھی کہ ناد ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی گنگ رہ گئے جو انہیں صرف جانتے تھے۔

”پچھتاوے، دکھ اور افسوس اپنے وقت پر ہی اچھے لگتے ہیں۔ وقت نکل جائے تو انسان کو ہر حال میں خوش رہنے کی عادت ڈال لینی چاہیے ورنہ بڑا نقصان ہوجاتا ہے۔“

اس وقت انہیں سعید کی کہی ہوئی ایک پرانی بات بھی یاد آئی مگر انہیں لگنے لگا تھا کہ اب ان کی زندگی میں پچھتاوؤں کے سوا کچھ رہ نہیں گیا تھا۔ اس موقع پر بھی ان کو ان کے لواحقین نے نہیں پوچھا تھا گو یہ خبر دونوں کے گھرانے تک پہنچ چکی تھی۔ حالات کی اس سختی نے نادیہ کو حد درجہ بے حس بنا دیا تھا۔ انہیں اپنی زندگی میں کچھ خاص دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ ایک خاص قسم کی میکانکی زندگی گزارنے کی عادی ہونے لگی تھیں۔ اس مشینی زندگی کے اثرات ان کے اس مختصر گھر اور علینہ پر کس طرح اثر انداز ہو رہے تھے یہ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ انہیں صرف اتنا یاد تھا کہ ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ پچھتاوؤں کا شکار ہوگیا تھا اور باقی کا حصہ اپنی بقا کی جنگ لڑتے گزر جانا تھا۔ زندگی میں ان کا بہت بڑا نقصان ہوگیا تھا اور اس نقصان نے ان کے دل پر بہت بری طرح اثر کیا تھا۔ زندگی اسی ڈھنگ سے گزر رہی تھی اور اس کو اسی طرح گزر جانا تھا مگر ان کو شاید کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ ان کی اس ذہنی تنہائی نے علینہ کو کس قدر تنہا کرکے رکھ دیا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے ڈرامے کے کسی کردار سے بھی انصاف نہیں کرسکی تھیں۔ بیٹی کی حیثیت سے انہوں نے ماں باپ کو لیٹ ڈاؤن کردیا تھا، بیوی کی حیثیت میں انہوں نے وہ مختصر وقت پچھتاوؤں میں گزار دیا اور ماں کے کردار تک آتے، آتے بے حسی ان کے گرد گھیرا تنگ کرچکی تھی۔ وہ سوچتی تھیں، یاد کرتی تھیں، پچھتاتی تھیں مگر خود کو بدل ڈالنے کا عہد کبھی نہ کرپائیں، طویل تاریک اور سرد راتیں یونہی بیتتی چلی گئیں۔

☆☆☆

بینش نے کپڑے دھو کر نچوڑے اور رنگ برنگے کپڑوں سے بھری نیلے رنگ کی بالٹی اٹھائے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ چھت پر دھوپ تیز تھی، اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ کندھے پر رکھے خشک کپڑے سے اس نے الگنی جھاڑی اور بالٹی میں رکھے کپڑے ایک، ایک کرکے جھٹک، جھٹک کر سوکھنے کے لیے پھیلانے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے اردگرد کے منظر کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔ اونچی نیچی چھتوں والے بے شمار گھر ایک دوسرے کے ساتھ جڑے کھڑے تھے۔ یوں جیسے صدیوں سے یونہی ایک دوسرے کے سہارے کھڑے ہوں۔ ان گھروں کے مکینوں کے دکھ سکھ، خوشیاں اور غم ایک دوسرے سے منسلک تھے۔ دلوں میں کدورتیں کم پیار زیادہ تھا۔ نسل در نسل خاندانوں کی دوستیاں اور تعلق ہوتے رہے تھے، مکینوں کے چہرے بدلتے رہے تھے مگر تعلقات کی نوعیت ہمیشہ سے ایک سی تھی۔ بینش کو یہ ماحول اور اس سے منسلک روایات اور تاریخ بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ ان سے مانوس اور وابستہ تھی۔ وہ یہاں رہنے والے اپنے ہم عمر ان لوگوں کو بھی جانتی تھی جو اس ماحول سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے جنہیں یہ سب گھٹا ہوا اور فرسودہ لگتا تھا۔ ان پیچ در پیچ تنگ گلیوں سے باہر کا ماحول انہیں کشادہ اور ہوادار لگتا تھا، پرانے شہر کو چھوڑ کر وہ اس علاقے میں نو آباد نئے شہر کی طرف کوچ کر جانا چاہتے تھے جہاں کھلی سڑکیں، کھلی ہوا، جدید بستیاں، پُرآسائش کھلے گھر اور زندگی کی تمام جدید سہولیات میسر تھیں۔ یہاں رہنے والے کئی مکینوں نے اس کوچ کا اہتمام کر بھی لیا تھا اور نئی زندگی کی طرف پرواز کرچکے تھے مگر لوئر مڈل کلاس طبقے کے وہ خاندان جن کی زندگیاں اپنی بقا کی جنگ لڑتے گزر جاتی ہیں اب بھی یہیں مقیم تھے اور انہی کے دم سے ان گلی محلوں کی دنیا آباد تھی۔ یہاں رونق تھی، شور تھا، رنگ اور ہنگامے تھے۔ بینش کو رنگ بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ اپنے ہاتھ سے دھوئے ہوئے کپڑوں کے رنگوں میں کھوئی ہوئی اور مسحور تھی جب اس کی نظر آسمان

پر اُڑتی رنگ برنگی پتنگوں پر پڑی، یہ ایک مسحورکُن منظر تھا، بسنت کے دن ختم ہو چکے تھے، بہار اپنی آمد کے آثار چھوڑ کر جا چکی تھی۔ دن طویل اور روشن ہو رہے تھے، فضا میں حدت بڑھ رہی تھی مگر ان گلی محلوں میں رہنے والے بچوں پر موسم کی خنکی اور حدت سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ اس گرم دوپہر میں بھی پتنگیں اُڑا رہے تھے، بینش کو بلند فضاؤں میں اُڑتی رنگ برنگی پتنگیں بھی بہت پسند تھیں۔

''تم بھی ایک بڑا گُڈا منگوا لو شیدے پتنگ ساز کی دکان سے۔'' اسے یوں محو دیکھ کر سامنے والے گھر کی بالکنی میں آئی بانو نے کہا۔ وہ سبزی کے چھلکوں کی ٹوکری پکڑے ہوئے تھی جسے اس نے کھلے دل سے نیچے گلی میں الٹا دیا تھا۔ نیچے بہت نیچے یہ چھلکے کسی راہ گیر کے سر پر پڑیں یا کسی نالی کو بند کرنے کا سبب بنیں اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ اگر گلی میں چلتا کوئی راہ گیر سر اٹھا کر اس عزت افزائی پر مغلظات بکنے لگتا تو بھی بانو کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اسے ان مغلظات کا جواب دینا بخوبی آتا تھا۔

''مجھے گُڈے اُڑانے نہیں آتے بانو۔'' بینش نے مسکرا کر جواب دیا۔

''ہاں تمہیں ضدیں کرنی آتی ہیں اپنی اماں سے کہ تم نے کالج میں آگے پڑھنا ہے۔'' بانو نے اسے یاد دلایا۔

''یہ کوئی بری بات ہے کیا؟'' بینش نے بالٹی میں موجود پانی کو ایک سائیڈ پر گراتے ہوئے کہا۔

''پر جب تمہاری اماں اور بھائی تمہیں آگے نہیں پڑھانا چاہتے تو تم کیسے پڑھو گی؟'' بانو نے جیسے اس کا مذاق اڑایا۔

''قسمت میں ہوا تو ضرور پڑھ لوں گی، نہیں ہوا تو نہیں پڑھوں گی۔'' بینش کے لہجے میں اطمینان تھا۔ بانو کو اس کے اس اطمینان سے ہمیشہ سے چڑ تھی۔

''جو مرضی کر لو، مجھے نہیں لگتا کہ تم اس سے آگے پڑھ سکو گی۔'' اس نے بینش کو کسی حقیقت کا احساس دلانا چاہا۔ بینش زیرلب مسکرائی اور بالٹی اٹھا کر نیچے کی طرف چل دی۔ ''میں نے کریلے پکائے ہیں آج پیاز، ٹماٹر ڈال کر کھاؤ گی...... بھیجوں؟'' اسے پیچھے سے بانو کی آواز آئی۔ بینش نے مسکرا کر پیچھے کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ آپس کی تمام تلخیوں کے باوجود ان کے درمیان پیار اور خلوص کا رشتہ قائم تھا۔

نیچے آ کر اس نے صحن میں رکھی واشنگ مشین دھوئی، واشنگ پاؤڈر، نیل اور صابن سمیٹ کر صحن دھونے لگی۔ ابھی اسے بہت سے دوسرے کام بھی کرنے تھے۔ اماں نے ابھی تک اسے سبزی نہیں لا کر دی تھی اور اسے دوپہر کا کھانا بھی بنانا تھا۔ اس کے دونوں بھائی ٹھیک ڈیڑھ بجے نماز اور کھانے کے وقفے کے لیے دکان بند کر کے آ جاتے تھے اور اس وقت تک کھانا تیار ہو جانا لازمی تھا۔ اس نے بیٹھک میں جا کر گلی میں کھلنے والی کھڑکی کھول کر باہر دیکھا، تنگ اور طویل گلی خالی تھی، اماں کا دور دور تک کچھ پتا نہیں تھا، اسے اندازہ ہو گیا کہ اب تک جو وہ واپس نہیں آئیں تو ابھی کچھ دیر اور بھی واپسی کی توقع نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ یقیناً کسی کی طویل گفتگو میں مصروف ہو چکی تھیں۔ اس نے مایوسی سے کھڑکی بند کی اور اندر کمرے میں جا کر فون کا ریسیور اٹھا کر بھائی کی دکان کا نمبر ملانے لگی۔ اسے اب بھائی کو صورتِ حال بتا کر پکانے کے لیے کچھ منگوانا تھا۔

☆☆☆

مہرزاد کو اپنے مزاج پر قابو پانے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آ رہی تھی اور یہ بات اس کے اپنے لیے بھی حیران کُن تھی۔ اس کے باپ کا ترکے میں چھوڑا ہوا نظام پیچیدہ اور بے اصولیوں پر مبنی تھا۔ اس نظام کی پشت پر صدیوں پر محیط اقتدار اور حاکمیت کا احساس کھڑا تھا۔ وہ اس تاریخ کو کھولنا نہیں چاہتا تھا، وہ اچھی طرح

جانتا تھا کہ اس تاریخ میں سیکڑوں مظلوموں کی آہیں، سسکیاں اور دکھ رقم تھے۔ اسے اس تاریخ کو پڑھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ اسے بغیر دیکھے، پڑھے ہی اس کا بھرپور احساس تھا، وہ اپنے باپ کے قتل کے بعد جب یہاں پہنچا تھا اس وقت بھی اس کو آنکھیں اور ذہن آنے والے دنوں کو دیکھ اور ادراک کر رہی تھیں۔ اسے بخوبی علم تھا کہ وہ چند گھنٹوں کے اندر تھنگ سے ایوری تھنگ بنا دیا جائے گا، اس کے سر پر وہ اونچا شملہ سجا دیا جائے گا جو علاقے کی سرداری کی علامت تھا۔ اس کے پاس اس روز اتنا بھی وقت نہیں تھا کہ وہ چند لمحے کے لیے اس بدقسمتی پر افسوس کر لیتا کہ ایک سردار کی میت کو دفن کرنے سے پہلے ہی دوسرے سردار کی سرداری کا اعلان کیا جا رہا تھا۔ اسے اتنا بھی وقت نہیں ملا کہ اپنے مرے ہوئے باپ کے سرہانے کچھ دیر بیٹھ کر اس سے ایک خاموش مکالمہ ہی کر لیتا۔ وہ شاید اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ اس ابدی حقیقت سے جا ملا تھا جسے اس نے اپنی پوری زندگی فراموش کیے رکھا تھا اور اب وہ ان لمحوں کی طرف جا رہا تھا، جہاں اسے سر جھکا کر عمر بھر سر اٹھا کر زندگی گزارنے کا حساب دینا تھا۔ وہ یہ سب کرنا چاہتا تھا مگر اس وقت ساری غیر مرئی حقیقتیں کہیں پس منظر میں چلی گئی تھیں اور پیش منظر میں لوگوں کا ہجوم تھا، بادشاہ گر تھے، میڈیا تھا، روشنیاں تھیں، سوال جواب تھے اور نعرے تھے۔ ''جب تک سورج چاند رہے گا مراد خان تیرا نام رہے گا۔ زندہ ہے مراد خان زندہ ہے، شہید ہے شہید ہے مراد خان شہید ہے۔'' جس نظام کے ہاتھوں وہ لوگ ستائے ہوئے تھے اور پسی ہوئی زندگی گزارنے پر مجبور تھے اسی نظام کے ایک امین کی غیر فطری موت پر انہیں اس جذباتی انداز میں مشتعل کر دیا گیا تھا کہ وہ لمحوں میں اس کی جان کا انتقام لینے پر تیار ہو گئے تھے۔ علاقے کے بادشاہ گروں کو اپنے فن میں کمال حاصل تھا۔ انہوں نے لمحوں میں صورتِ حال کو بھانپ لیا تھا اور شام ہونے سے پہلے، پہلے سردار مہرزاد خان کو ایک تمثیلی کردار کے مانند دنیا کے سامنے لے آئے تھے یوں کہ نہ دیکھنے والوں کو کوئی اعتراض تھا اور نہ ہی مہرزاد نے اس معاملے پر دوسری سوچ سوچی تھی۔ نظام چلانے والے دنیا سے چلے جاتے تھے، نظام زندہ رہتا تھا، اس نظام کے امین اس علاقے سے باہر بھی ایک کردار رکھتے تھے۔ ملکی سیاست پر ان کو ہمیشہ سے ایک خاص قسم کا اختیار حاصل رہا تھا۔ اسٹیبلشمنٹ کی جڑوں میں ان کے بندے بیٹھے تھے جن کا کام مراعات کے عوض ان کی کاٹھی مضبوط کرنا تھا۔ اپنے باپ کے مرنے کے چند گھنٹوں کے بعد سردار مہرزاد خان ملکی سطح پر ایک نئے لیڈر کی حیثیت میں متعارف ہو چکا تھا۔

مگر مہرزاد کو اس بات پر خود بھی حیرت محسوس ہوئی تھی کہ اس اچانک بدلی ہوئی صورتِ حال نے اس کے ذہن و دل پر کچھ خاص اثر نہیں چھوڑا تھا۔ اپنی اماں سے گفتگو سے پہلے وہ شاید کبھی جان نہ پاتا کہ اسے اس ماحول سے ایک خاص طریقے سے کیوں دور رکھا گیا تھا گو اس کی اٹھان اور پرورش ویسے ہی کی گئی تھی جیسے ہمیشہ سے یہاں کے سرداروں کی روایت تھی مگر شاید اماں کی سائیکی کا اثر اتنا تھا کہ اسے اس ماحول میں یوں رچنے بسنے کا موقع نہیں ملا تھا جو یہاں کی روایت تھی مگر اس کے باوجود اسے یوں زندگی کی تمام تر روش بدل جانے سے بھی کوئی فرق محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ دوستوں کے اس ہجوم میں جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا، دوست بہت کم اور مارِ آستین زیادہ تھے۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ دوستوں کے اس ہجوم میں اس کے باپ کے قاتل بھی موجود تھے اور وہ لوگ بھی جن کے لیے اس کی اپنی جان لینے پر تیار ہو جانا چنداں مشکل نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شطرنج کی جو بساط یہاں بچھی تھی اس کے مُہرے کن کن لوگوں کے اشارے پر حرکت کرتے تھے، شہ مات کون دیتا تھا اور بادشاہ کو چاروں طرف سے نرغے میں لے کر چت کون کرتا تھا۔ دوستوں کے اس

ہجوم میں کوئی بھی دوست نہ تھا، اس نے چند دنوں کے اندر فیصلہ کرلیا تھا اور اپنے من کے اندر اپنی دنیا بسالی۔ بھی اسے مشکل نہیں لگا تھا۔ من کی اس دنیا میں اسے مشورہ دینے والا بھی اس کا دل تھا، خطرات سے آگاہ کرنے والا بھی اس کا دل تھا اور ان سے بچانے والا بھی اس کا دل تھا۔ چند ہفتوں کی ذاتی مشق کے بعد اسے اس کام میں بھی مہارت حاصل ہوگئی کہ وہ انسانوں کے اس ہجوم میں اٹھتا، بیٹھتا تھا۔ سب کے مشورے لیتا تو سب سے گفتگو کرتا تھا مگر مانتا اپنے دل کی تھا، یوں کہ اس کے گرد موجود بادشاہ گروں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی تھی۔ یہ وہ بادشاہ گر تھے جن کی مجبوری تھی کہ اس خاندان کا بیٹا، ہی نظام کا سردار ہوسکتا تھا، علاقے کے لوگ کسی اور قبیلے اور خاندان سے تعلق رکھنے والے کو اپنا سردار ماننے پر بھی تیار نہیں ہوسکتے تھے اس لیے انہیں اسی خاندان کے وارث کو اختیارات سونپنا پڑتے تھے مگر اس بار ان کے دلوں میں ایک خاص امید تھی۔ ان کا خیال تھا کہ کم عمر، ناتجربہ کار، مغرب پسند سردار مہر زاد خان کو ان تمام معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں ہوگی، وہ اسے علامت کے طور پر پیش کرکے اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنے میں کامیاب ہوجائیں گے مگر ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ یہ نیا سردار آنے والے وقت میں ان کے لیے سب سے ٹیڑھی کھیر ثابت ہونے والا تھا۔ وہ جانتا تھا، سمجھتا تھا، معاملات کو سلجھا سکتا تھا اور مسائل سے نبٹ سکتا تھا۔ جو زندگی کو میدانِ جنگ سمجھتے ہوئے محاذ کا سامنا کرنے کے فلسفے کا پیروکار تھا۔ جسے سامنے سے آئے ہوئے وار کا مقابلہ کرنا اچھا لگتا تھا اور جو پشت پر کھائے ہوئے زخم کو اپنی توہین سمجھتا تھا، جو حملہ کرنا اور حملے کا سامنا کرنے کے علاوہ دفاع کی پالیسیز کو بھی اچھی طرح سمجھتا تھا اور جسے یہ بھی معلوم تھا کہ ایسی شخصیت کا مالک ہوتے ہوئے اسے عمر بھر دوستوں سے زیادہ دشمنوں سے واسطہ پڑنے والا تھا۔

☆☆☆

اسے کوکنگ کے پروگرام میں شامل ہونا بہت اچھا لگتا تھا۔ کوکنگ اس کا جز وقتی مشغلہ تھا۔ ایم بی اے فنانس کی ڈگری رکھنے والے اس نوجوان کے پاس کوکنگ کورسز کے ڈھیروں ڈھیر سرٹیفکیٹس تھے۔ اس کا یہ انوکھا شوق اس کے گھر والوں اور دوستوں کسی کو بھی پسند نہیں تھا مگر اس کا کیا، کیا جاتا کہ یہ شوق اس کے دل میں گھر کرچکا تھا۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کرکے کچھ عرصہ پہلے ہی واپس وطن لوٹا تھا، اس کی ڈگری نے اسے ایک بڑے ادارے میں فوراً ہی بہت اچھی جاب دلوادی تھی۔ جاب اور اس پرانے مخصوص ماحول میں ایڈجسٹ کرنے کے بعد اس نے اپنے مشغلے کے حوالے سے منظر پر نمودار ہونا شروع کردیا۔ وہ ایک پانچ ستارہ ہوٹل کی طرف سے منعقد کیے گئے کھانا بنانے کے مقابلے میں شریک ہوا اور اس نے پہلا انعام جیت لیا۔ یوں یہ سلسلہ شروع ہوگیا۔ جلد ہی اس کا نام اس حوالے سے معروف ہونے لگا اور وہ ٹی وی چینلز پر بلایا جانے لگا۔ ایک ایوننگ شو میں آدھے گھنٹے کے لیے مخصوص کوکنگ پروگرام میں باقاعدہ شرکت کرنا اسے یہ بھی ایک آرٹ معلوم ہوتا تھا جب وہ مہارت سے سبزیاں کاٹ رہا ہوتا اور انہیں پکاتے ہوئے ان کے کلرز اور ٹیکسچر کو برقرار رکھنے کی تلقین کررہا ہوتا اور بنے ہوئے کھانے کو پیش کرنے کے طریقے سکھا رہا ہوتا تو اسے اپنا آپ کسی بڑے آرٹسٹ سے کم نہیں لگتا تھا۔ اسے آہستہ آہستہ اندازہ ہورہا تھا کہ پروگرام کے دوران اس کی گفتگو اس کے اسٹائل اور اس کے کام سے لوگ خصوصاً خواتین متاثر ہورہی تھیں، خواتین خصوصاً کم عمر لڑکیوں میں مقبول ہورہا تھا۔ پروگرام سے پہلے اور خاص طور سے پروگرام کے دوران آنے والی فون کالز اور پروگرام کے بعد ملنے والی ای میلز، خطوط اور فون اسے اپنی نظر میں ہی خاصا اہم بنا رہے تھے۔ مگر وہ اس سب کو انجوائے کررہا تھا۔ اسے نہ تو اس کام کو مستقل پیشہ بنانے کا شوق تھا اور نہ ہی اپنی بڑھتی ہوئی مقبولیت پر مغرور

ہونے کا اس کا کوئی ارادہ تھا۔ اسے پروگرام کے دوران آنے والی کالز اٹینڈ کرنے اور پوچھے جانے والے سوالات کے جواب دینے میں مزہ آتا تھا۔ خواتین اور لڑکیوں کی کھنکتی ہوئی پُرمسرت آوازیں، اکثر متوقع اور کبھی کبھار غیر متوقع سوال اسے بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ وقت کے ایک، ایک لمحے کو انجوائے کرنے کا قائل تھا اور یہی اس کی شخصیت کی کشش کا باعث تھا۔

مگر اس روز جب وہ اپنے پروگرام میں دو جاپانی ڈشز بنانا سکھا رہا تھا۔ اسے ایک بہت ہی غیر متوقع کال موصول ہوئی تھی۔ اس کے کان میں لگے ائرپیس پر آپریٹر کی آواز آئی۔ ”سر! مس علینہ سعید فرام ایبٹ آباد۔“

”اوہو!“ بے اختیار اس کے منہ سے الفاظ نکلے تھے اور سبزی کاٹتے ہوئے پہلی بار اس کا ہاتھ چوکا تھا۔ شکر تھا کہ اسے کوئی زخم نہیں آیا تھا۔

”آن ائر مت کیجیے، ان کی بات کو صرف مجھ تک محدود رہنے دیجیے۔“ اس نے ہلکے سے آپریٹر سے کہا تھا اور بعد میں وہ کئی منٹ اس بات پر شکر ادا کرتا رہا کہ بر وقت اسے یہ بات سوجھ گئی تھی، ورنہ اس فون کال کے لائیو ہوجانے کی صورت میں کیا ہوجاتا، وہ یہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس کال میں گفتگو کا آغاز ہی... غیر متوقع انداز میں ہوا تھا۔

”آپ کو علم ہے کہ آپ کتنے بڑے گدھے ہیں۔“ دوسری طرف سے نسوانی آواز میں کہا جارہا تھا۔ ”خواتین کے لیے مخصوص کام کرتے ہوئے شرم نہیں آتی آپ کو، بڑی بڑی باتیں کیا کرتے تھے ایک زمانے میں آپ۔ اب کبھی غور سے خود کو دیکھا ہے، یہ سبزیاں اور گوشت کاٹتے بھونتے کیسے للّو لگ رہے ہوتے ہیں جناب، شرم نہیں آتی آپ کو، ہاں آپ کو نہیں آتی ہوگی مگر ہم تو شرم سے ڈوب، ڈوب جاتے ہیں کہ کبھی ہم بھی تم سے تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔“

”کال کٹ گئی یا پھر شاید ٹھیک طریقے سے کنیکٹ ہی نہیں ہوئی۔“ اس نے اپنی ساتھی میزبان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”مشتاق بھائی آپ ان کو میرا ذاتی نمبر دے دیجیے اگر دوبارہ کال آئے کیونکہ پروگرام کا وقت ختم ہونے والا ہے، دوبارہ شاید ان کی کال ملے نہ ملے۔“ اس نے آپریٹر کو بہ آوازِ بلند ہدایت کی اور ان الفاظ کے ساتھ ہی کال واقعی کٹ گئی۔ وہ بال بال بچا تھا، مگر اس کا دل خوشی سے سرشار تھا۔ ایک لمبے عرصے کے بعد وہ آواز اس کے کانوں میں آئی تھی جسے وہ اپنے بچپن کی ساتھی کہا کرتا تھا۔ وقت نے اس آواز کی مالک پر خاصا اچھا اثر ڈالا تھا یہ اس کے لہجے کے اعتماد نے اسے بتایا تھا۔ اچانک اس کا دل پروگرام کو جلد از جلد وائنڈ اپ کرنے کے بعد آپریٹر سے اس کالر کا نمبر لینے کو چاہنے لگا تھا۔ فہد رضا کو اتنے برسوں میں پہلی مرتبہ کسی نسوانی آواز نے اپنی طرف کھینچا تھا۔

☆☆☆

تاؤ شریف کو زرنگار کے لیے آنے والی پے منٹ پر حیران ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی مگر جس چیز نے اسے درحقیقت حیران کیا تھا وہ زرنگار کا یہ پے منٹ قبول کرلینا تھا۔ وہ گھبرا گیا تھا۔ وہ زرنگار سے بات کرنا چاہتا تھا اسے سمجھانا چاہتا تھا، اس نو واردو کی پے منٹ زرنگار کے لیے اعزاز کی بات کیوں نہ ہو، اسے قبول کرلینے کے بعد زرنگار امراؤ بیگم کی کوئی بات ٹال نہ سکے گی، پھر کسی پے منٹ کو واپس نہ بھجوا سکے گی اور پھر وہ سلسلہ شروع ہوجائے گا جسے زرنگار سے منسلک کرتے ہوئے تاؤ شریف جیسے شخص کے لیے بھی انتہائی اذیت کا باعث تھا۔ اگرچہ وہ جانتا تھا کہ اس سنہری محل کے اصول بھی یہ تھے اور اس کا چلن بھی یہ ہی تھا۔ ان اصولوں

سے انحراف کسی کے لیے بھی ممکن نہ تھا۔ امراؤ بیگم زرنگار کے بھلے کتنے ہی نخرے کیوں نہ اٹھا رہی تھی ایک ایک روز خود اسے اس کے لیے آئی پے منٹ پکڑتا ہی تھی مگر یہ کام جتنا مؤخر ہوتا جا رہا تھا تاؤ شریف کا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا مگر اب زرنگار نے پے منٹ کو خود شرفِ قبولیت بخشا تھا اور اس افتتاحی رات کو وہ پاگل کر دینے کی حد تک حسین نظر آ رہی تھی، اس نے دل لگا کر تیاری کی تھی، اس کا لباس اور بناؤ سنگار اس کی ذاتی توجہ کا مظہر تھے۔ امراؤ بیگم اپنے اس حسین ترین ہیرے کی بلائیں لیتے نہ تھکتی تھی۔ اس ہیرے کی آمد نے اس کے سینے کی قدر بڑھا رکھی تھی اور یہی ہیرا آئندہ آنے والے سالوں میں اس کے لیے چین ہی چین لکھنے والا تھا۔ اس نووارد اور اس کے دو ساتھیوں کی آمد پر ان کی تواضع خوش رنگ مشروب سے کی گئی تھی۔ تاؤ شریف اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھا تھا اور براہِ راست نووارد کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ کم عمر تھا۔ اس کے چہرے پر زمانہ سازی اور تجربے کا کوئی خاص عکس نظر نہ آتا تھا ہاں مگر اس کے چہرے پر ایک مخصوص قسم کا رعب داب تھا۔ جسے محسوس کرتے ہی کوئی بھی مرعوب ہو سکتا تھا۔ تاؤ شریف کی گھاگ نظروں نے محسوس کیا کہ اس کا تعلق کسی بڑے خاندان سے تھا جو محض کھاتا پیتا نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے ایک اہم تاریخ تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیا تھی اس نے ایک بار بھی آنکھ اٹھا کر امراؤ بیگم کی پالی ادھر اُدھر پھرتی حسین و جمیل، شوخ و شنگ تتلیوں کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اس کی منتظر نظریں بار بار اسی جانب اٹھتی تھیں جہاں سے زرنگار کی آمد متوقع تھی۔ امراؤ بیگم اس کے شوق کو تاؤ دینے کے چکر میں تھی اسی لیے دانستہ زرنگار کو بلانے میں تاخیر کر رہی تھی۔ اس تاخیر پر نوجوان کی نظر دل میں الجھن اترنے لگی تھی اور بے چینی بھی۔ وہ بار بار اپنے موبائل کو آن کر کے وقت دیکھتا تھا۔ زرنگار کی آمد پر روشنیوں کی لو مدھم کر دی گئی۔ اس کی آمد کو اس ڈرامائی انداز میں پیش کرنے کا تصور بھی امراؤ بیگم نے ہی سوچا ہوگا، تاؤ شریف نے قیافہ لگایا تھا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ زرنگار کی موجودگی میں اس وقت روشنیوں کی کوئی حقیقت رہی بھی نہیں تھی۔ وہ سراپا روشنی لگ رہی تھی۔ اس کے وجود سے اٹھنے والی خوشبو ماحول پر چھا گئی تھی اور کچھ دیر پہلے اٹھنے والی آوازیں ایک دم خاموش ہو گئی تھیں پھر فضا میں موسیقی کی آواز ابھری، سازندوں کو موسیقی کے بارے میں پہلے سے ہی ہدایات دے دی گئی تھیں۔ زرنگار کیسا گاتی تھی، اس کے گلے میں کتنا سُر تھا، اس کا معیار کیا تھا، تاؤ شریف نے محسوس کیا کہ اس نووارد کے لیے یہ سب چیزیں غیر اہم تھیں۔ وہ زرنگار کا گانا سننے یہاں نہیں آیا تھا، اس کے چہرے پر کسی اور لگن کے آثار تھے مگر وہ اس آغاز کو ماحول کا اصول سمجھ کر صبر سے بیٹھا تھا۔ زرنگار کی وہ محفلِ موسیقی جو سراسر امراؤ بیگم کے ذہن کی اختراع تھی ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہی اور اس کے بعد زرنگار کو نووارد کے ساتھ اس آراستہ و پیراستہ کمرے میں بھیج دیا گیا جو اُن کے لیے خاص طور سے تیار کیا گیا تھا۔ اس کمرے کے بند ہوتے دروازے کو دیکھتے دیکھتے تاؤ شریف کے دل کی دھڑکن بندسی ہونے لگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بارات، نکاح اور رخصتی کے وہ منظر ناچنے لگے تھے جو اس نے مہذب اور قانونی لوگوں کے ہاں دیکھے تھے۔ اس کا دل رونے لگا تھا۔ فرق کچھ بھی نہیں تھا مگر بہت فرق تھا۔ اس نے یہ منظر بھی بہت دیکھ رکھے تھے مگر زرنگار کے تصور کے ساتھ ہی وہ قانونی غیر قانونی، روایتی غیر روایتی کے موازنے میں پڑ گیا تھا۔ اس نے اپنی سرخ پڑتی آنکھوں کو انگلیوں کی پوروں سے خشک کرتے ہوئے اپنے ساز سمیٹے اور ان پر مخملیں کپڑا ڈال دیا۔

''بہت بڑی آسامی ہے خانزادہ مہر زاد مراد خان!'' اس کے کانوں میں قریب کھڑے اسلم کی آواز پڑی۔ ''زرنگار اور امراؤ بیگم کی قسمت چند سالوں کے لیے تو کھل گئی سمجھو۔''

''خانزادہ مہرزاد مراد خان!'' تاؤ شریف نے اپنے دل میں دہرایا۔ ''اس کا شملہ اونچا عزت بڑی بلند۔'' اس نے سوچا۔

''فرق کیا پڑے گا؟'' وہ اپنے کمرے میں پہنچنے تک سوچتا رہا۔ ''فرق تو بہت پڑے گا۔'' پھر اس کے ... نے جواب دیا۔ ''مگر کیسے؟'' یہ سوال بہت دیر تک اس کے دل میں اٹھتا رہا...... وہ اس کا جواب جاننا بھی ... دینا نہیں چاہتا تھا۔

☆☆☆

''میری سمجھ میں نہیں آتا حمزہ تم پر آفت کیا آن پڑی ہے۔'' وہ نگین تھی جو پچھلے پندرہ منٹ سے مسلسل حمزہ ... بحث کر رہی تھی، وہ اسی صبح لاہور پہنچا تھا اور آفس بھگتانے کے بعد نگین کی طرف آیا تھا۔ ''کون ہے یہ لڑکی میرا ... کے لیے تم نے میرے اتنے سوئٹ اور سہل پسند میاں کو گھن چکر بنا رکھا ہے، وہ مسلم ٹاؤن والے صاحب سے ... پوچھتے ہیں تو وہ انہیں اکبری دروازے کے کسی محلے کا پتا پکڑا دیتے ہیں، وہاں جاتے ہیں تو انہیں بتایا جاتا ہے ... موصوفہ کے آثار ٹاؤن شپ میں پائے جانے کے امکان ہیں اور ٹاؤن شپ والے چوبرجی کے کسی قدیم محلے ... پتے کی چٹ پکڑا دیتے ہیں۔ وہاں سے راز کھلتا ہے کہ کبھی وہ یہاں آئی تھی اب تو یقیناً فیصل ٹاؤن کی کسی کوٹھی ... رہتی ہوگی۔ تم یہ بتاؤ کہ تم میرے میاں کو لاہور کا جغرافیہ پڑھانے کے چکر میں تو نہیں ہو؟''

نگین کے لہجے میں شکوہ کم اور اپنائیت بے حد زیادہ تھی، حمزہ خاموشی سے بیٹھا اس کی بات سن رہا تھا ... کی خاموشی نے نگین کو ایک دم چونکا دیا اور اس نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں تھکن کے آثار تھے، وہ پہلے کی نسبت کمزور اور افسردہ نظر آرہا تھا۔ اس کا دل گھبرا گیا وہ جس بات کو اس طرح مذاق کے رنگ میں کر رہی تھی اس بات میں کوئی بہت اہم بات تھی، اسے اچانک احساس ہوا، وہ حمزہ کو بہت اچھی طرح جانتی تھی، وہ کسی بات کی وجہ سے بہت بری طرح الجھا ہوا تھا، وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ اس ... اپنی تکرار روک دی اور خاموش ہوتے ہوئے اس بات کی منتظر ہوئی کہ حمزہ اسے خود کچھ بتائے گا مگر پندرہ ... کی خاموشی کے بعد اس نے سنجیدہ سے لہجے میں معذرت کی۔

''مجھے افسوس ہے نگین، اشعر کو میری وجہ سے اتنی زحمت ہوئی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ انہیں اتنا ... پڑے گا۔'' نگین کو اس کی اس بات نے بری طرح چونکا دیا۔ حمزہ کا انداز خاصا بدلا ہوا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ یقیناً کہتا۔ ''کتنے جوتے گھس گئے تمہارے میاں صاحب کے، بتاؤ میں نئے دلوا دوں گا۔'' مگر اس وقت اس نے غیر متوقع اور خلافِ مزاج جواب دیا تھا۔

''حمزہ کیا بات ہے؟'' کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد نگین نے پوچھا۔ ''اچھا اگر تمہارا دل شیئر کرنے کو نہیں چاہ رہا تو نہ سہی مگر اتنے سنجیدہ اور خاموش تو مت نظر آؤ ناں پلیز۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے نگین، میں صرف تھکا ہوا ہوں۔'' حمزہ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ ''آرام کروں گا، ذہن فریش ہو جائے گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

''تم یہیں رہو آج ہمارے پاس، وہاں اپنے فلیٹ میں کہاں اکیلے پڑے رہو گے۔'' اس ... اپنائیت سے کہا۔

''تمہارے گھر میں اتنے لوگ ہیں یار، تمہاری سسرال والے ہیں، یہ مناسب نہیں لگتا، میں ... ہو جاؤں گا اور اب تو یہیں ہوں ملاقات ہوتی رہے گی، تم فکر مت کرو۔'' حمزہ نے رسان سے کہا۔

''حمزہ۔'' نگین نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''تم وعدہ کرو جب دل کو مناسب لگے۔ مجھے ضرور بتاؤ گے۔''

''اوکے۔'' حمزہ زبردستی مسکرایا۔ ''تم جانتی ہو تمہارے علاوہ کسی اور کو بتا تا بھی نہیں ہوں۔''

''مجھے امید ہے کہ تم مجھے ضرور بتاؤ گے۔ میں تمہیں یوں اداس نہیں دیکھ سکتی۔'' نگین نے اسے احساس دلانا چاہا کہ وہ اکیلا نہیں تھا۔

حمزہ کے جانے کے بعد نگین پر افسردگی چھا گئی۔ وہ ہفتے کا دن تھا اور اگلے دن چھٹی تھی۔ دن کے بیشتر کام وہ نمٹا چکی تھی اس لیے دوپہر کے وقت میں اسے اتنی فرصت تھی کہ وہ کچھ دیر کے لیے تنہا بیٹھ سکے۔ وہ اکیلے بیٹھ کر سوچنا چاہتی تھی کہ وہ کون سی اتنی اہم ہستی تھی جس نے حمزہ کو یوں پریشان کر رکھا تھا اور جس کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔

تنہا بیٹھتے ہی اسے بہت سے پرانے دن یاد آنے لگے تھے۔ اس کا اور حمزہ کا بچپن ایک ساتھ گزرا تھا۔ حمزہ اس کی سگی پھپھو کا بیٹا تھا جو اسلام آباد میں رہتی تھیں مگر حمزہ نگین کے گھر کے بالکل ساتھ والے گھر میں نگین کی دادی جو حمزہ کی نانی تھیں کے پاس رہتا تھا وہ لوگ انہیں بی اماں کہتے تھے۔ حمزہ کا یہاں ہونا بھی ایک کہانی تھی۔ حمزہ کی امی کے ہاں اوپر تلے تین بچے میجر آپریشن سے ہوئے تھے، تیسرا بچہ حمزہ تھا۔ جس کی پیدائش کے بعد وہ شدید بیمار ہو گئیں ان کے پاس پہلے سے دو بچوں کا ساتھ تھا، ایسے میں ان کی بی اماں یعنی نگین کی دادی ہی ان کے کام آئیں وہ ننھے حمزہ کو اپنے پاس لے آئیں۔ یہاں اس چھوٹے سے بچے کو پالنے میں ان کی بہو یعنی نگین کی امی نے بھی بڑا ساتھ دیا تھا۔ حمزہ تھوڑا بڑا ہوا تو اس کی اماں نے اسے اپنے پاس واپس لے جانا چاہا مگر اب حمزہ نے جانے سے انکار کر دیا وہ بی اماں کے ساتھ اپنی اماں کے گھر ہو آیا تھا اور اسے وہاں چند دن رہنا بھی اچھا نہیں لگا تھا، کجا مستقل وہاں رہنے کا تصور، اس نے اپنی اماں کو صاف انکار کر دیا وہ ان کے ساتھ ہرگز نہیں جائے گا۔

''میں نے بھانپ لیا ہے مہرین، اسے وہاں رہنا ذرا بھی اچھا نہیں لگا تھا۔'' نگین کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس کی دادی اور پھوپی کے درمیان اس سلسلے میں کیا بحث ہوئی تھی۔

''ساری غلطی اور حماقت میری ہے۔'' مہرین نے بی اماں کو بے ساختہ جواب دیا تھا۔ ''میں ہی پاگل تھی جو بچے کو اچھے، کھلے اور صاف ماحول میں پالنے کے بجائے یہاں ان گلی محلوں میں بھیج دیا۔ یہ گلی اور محلے کا کلچر ہے جو اس کے مزاج میں رچ بس گیا ہے۔ یہی اسے وہاں نہیں ملا جب ہی وہاں جانے سے بدکتا ہے۔''

''تمہارے بچوں اور حمزہ کے مزاج اور تربیت میں فرق آ گیا ہے مہرین، تم سمجھ نہیں پائیں۔'' بی اماں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی۔

''تربیت؟'' وہ غصے سے بولی تھیں۔ ''تربیت نام کی کوئی چیز ہوتی ہے اس کی، سارا دن تو چھتوں کو پھلانگتا، پتنگیں اور کنچے لوٹتا پھرتا ہے۔ دوست اس کے ایک سے ایک چنڈال اور جنگلی ہیں، نہ آپ ان محلوں سے نکلیں نہ ناصر (نگین کے والد) ان کے بچے بھی یہی کچھ کرتے پھرتے ہیں اور یہ حمزہ بھی ان کی مکمل کاپی بن کر رہ گیا ہے۔''

''اب تو بن گیا بہن جو بننا تھا اس کو، تمہیں اتنے سال میں خیال نہیں آیا کہ یہاں رہ رہا ہے، کیا بن رہا ہے، کیسے پل بڑھ رہا ہے، اب جب اتنا بڑا اور سمجھ دار ہو گیا تو تمہاری ممتا پھوٹ پڑی۔'' بی اماں عجیب سے صدمے کی کیفیت میں نظر آ رہی تھیں۔

''مجھے آپ پر پورا بھروسا تھا، میرا خیال تھا کہ آپ کو اس بات کا خیال رہے گا کہ میرے دوسرے جس ماحول میں پل بڑھ رہے ہیں ویسا ہی ماحول آپ حمزہ کو بھی دیں گی تا کہ ان کی شخصیتوں میں کوئی فرق نہ آئے مگر آپ نے تو اسے پورے کا پورا ہی کشمیری محلے کے کلچر کے رنگ میں رنگ دیا۔''

مہرین کو اندازہ ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ بی اماں کو کتنی تکلیف دے رہی تھیں۔

''پھر ایسا کرو کہ لے جاؤ اسے۔'' بی اماں نے دکھ سے کہا۔ ''نہیں جاتا تو زبردستی لے جاؤ، یہ زیادتی کی بات ہے کہ بچے کو اس کی ماں کی پسند کے مخالف تربیت دی جائے۔''

''مجھے یہیں رہنا ہے، میں کبھی اسلام آباد نہیں جاؤں گا۔'' حمزہ نے سخت اور دُرشت لہجے میں کہا۔ ''مجھے یہیں رہنا ہے۔'' اس نے ایک ہی رٹ لگالی، وہ بی اماں کے پلّو کے ساتھ لگ گیا۔

''اس عمر میں اسے یہاں سے لے جانا اس کی سائیکی خراب کرنے کے مترادف ہے بہتر ہے کہ اسے یہیں چھوڑ دیا جائے، بی اماں کی تربیت میں کوئی خرابی نہیں ہے، ہاں ماحول کا فرق ضرور ہو سکتا ہے مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آپ خود بھی اسی ماحول میں رہتی تھیں اور یہیں آپ نے پرورش پائی ہے، بی اماں کے ہاتھوں ہی آپ کی تربیت ہوئی ہے۔ یہ بھی قدرت کا فیصلہ ہے کہ حمزہ کو یہاں رہنا تھا اور بہتر ہے کہ اب وہ یہیں رہے۔'' حمزہ کے ابا نے سارے حالات کو بھانپ لینے کے بعد بہت سکون کے ساتھ اپنی بیوی کو سمجھایا تھا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے آپ کا ہے کو میری حمایت کریں گے۔'' مہرین نے سر جھٹک کر کہا۔ ''آپ کو بھی انہی گلی محلوں کی زندگی پسند ہے۔''

بحث جہاں بھی ختم ہوئی اس کا نتیجہ یہ ہی نکلا کہ حمزہ، بی اماں کے پاس ہی رہا، یہ بات نگین کے لیے ڈھیروں خوشی کا باعث تھی، اس کا حمزہ کے ساتھ بچپن کا ساتھ تھا۔ وہ اکٹھے کھیلتے، اکٹھے پڑھتے تھے۔ ان کی عادتیں ایک جیسی تھی، ان کی دلچسپیاں ایک جیسی تھیں، حمزہ عمر میں اس سے کچھ ہی ماہ بڑا تھا، اسی لیے ان دونوں کی آپس میں اتنی گاڑھی چھنتی تھی۔

نگین کو اپنی دادی کا گھر بہت پسند تھا، قدیم طرزِ تعمیر پر بنا وہ کشادہ کمروں اور اونچی چھتوں والا گھر ان دنوں بھی بہت اچھا لگتا تھا جب طرزِ تعمیر نے نئی کروٹ لے لی تھی اور لوگ اسی کے مطابق جدید گھر بنا رہے تھے۔ بی اماں کے گھر کے صحن میں ایک طرف بنے نیچے سے شیڈ کے نیچے ایک بڑا سا حمام ہر وقت موجود رہتا تھا۔ جس کے پانی کو ضائع نہ کرنے کی تلقین بی اماں ہر وقت کرتی رہتی تھیں مگر نگین اور حمزہ کو جب بھی موقع ملتا وہ اس کی ٹونٹی کے نیچے پلاسٹک کا ٹب رکھ کر اس میں کاغذ کی کشتیاں بنا کر چلاتے رہتے تھے۔ کبھی جو بی اماں کی نظر پڑ جاتی تو خوب ڈانٹ پڑتی مگر یہ مشغلہ اتنا پسندیدہ تھا کہ وہ دونوں ڈانٹ کھانے اور یہ سمجھنے کے باوجود کہ پانی ضایع کرنا غلط ہے، یہ کام اکثر کرتے تھے۔ گرمیوں کی دوپہروں اور شاموں اور سردیوں کی صبحوں اور راتوں میں نگین کو وہ گھر بے حد یاد آتا تھا۔ اس کا اپنا گھر بی اماں کے گھر کے بالکل ساتھ تھا لیکن اس کے ابا نے اس میں کئی ترامیم کر کے اسے قدرے جدید شکل دے رکھی تھی پھر بھی نگین کا دل اپنے گھر سے زیادہ بی اماں کے گھر ہی لگتا تھا۔

دوپہر کے وقت محلے کے بچے اسکول کا ہوم ورک کرنے اور سپارہ پڑھنے کے لیے بی اماں کے گھر جمع ہوتے تھے اور یہ وقت حمزہ اور نگین کے لیے بڑا دلچسپ ہوتا تھا۔ جب دونوں ہائی کلاسز میں پہنچ گئے تو بی اماں کا ان پر اعتماد بڑھ گیا وہ ان بچوں کی رہنمائی کے لیے ان دونوں کو ان کے پاس بٹھا دیتیں۔ نگین کو بچپن سے استانی بننے کا بہت شوق تھا اور یہ شوق پورا کرنے کا اس سے بہتر موقع کیا ہو سکتا تھا۔ وہ ان بچوں پر بڑا

جاتی، کسی چھوٹے موٹے ڈنڈے سے کام لیتی اور استانی بن جانے کا ٹھیک مزہ لیتی۔ حمزہ اس کی سنجیدہ شکل اور حرکتیں دیکھ دیکھ کر ہنستا اور وہ اس سے لڑتی کہ وہ بچوں پر اس کا رعب ختم کر رہا ہوتا تھا۔ نگین سوچنے بیٹھتی تو ایسی ہی ہزاروں باتیں اسے یاد آتیں جن سے اس کی وابستگی تھی مگر جو بات اسے ہر بات سے زیادہ عزیز تھی وہ حمزہ کے ساتھ گہری ذہنی ہم آہنگی تھی۔ وہ اپنے دل کی بات ایک دوسرے سے کہے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ ایک دوسرے کی خوشی اور دکھ کو بغیر پوچھے، بتائے چہرے سے دیکھ کر ہی بھانپ لیتے تھے۔ حمزہ کے بارے میں نگین کا خیال تھا کہ وہ خاصا introvert تھا مگر اپنے دل کی بات وہ نگین سے ضرور کرتا تھا۔

''تمہیں کبھی افسوس ہوتا ہے کہ تم اپنے اماں ابا کے پاس رہنے کے بجائے یہاں رہتے ہو؟'' ایک بار نگین نے سنجیدگی کے ساتھ اس سے پوچھا تھا۔

''شاید کبھی کبھی میں اس بات کو محسوس کرتا ہوں۔'' وہ صاف گوئی سے کام لیتا۔ ''مگر جو زندگی یہاں ہے اس سے محروم رہنا بھی بدقسمتی ہوتی۔''

''وہ کیسے؟'' نگین کو اس جواب پر حیرت ہوتی۔

''بی اماں کی شخصیت میں بڑا افسوں ہے نگین۔'' اس روز وہ بات کرنے کے موڈ میں تھا اس لیے اس نے اسے تفصیل سے بتایا تھا۔ ''ایسے لوگ بہت کم رہ گئے ہیں۔ تم نے دیکھا وہ ماموں کے اتنے قریب رہتے ہوئے بھی اس عمر میں اکیلی رہتی ہیں۔ یہ گھر ایک اکیلے بندے کے لیے بہت بڑا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں میرا ان کا ساتھ نہ ہوتا جب بھی وہ یہاں اکیلی ہی رہ رہی ہوتیں۔ تمہیں پتا ہے وہ یہاں اکیلے رہنے کو کیوں ترجیح دیتی ہیں۔''

''کیوں؟'' نگین نے دلچسپی سے سنتے ہوئے پوچھا۔

''کیونکہ اس گھر کے در و دیوار میں ان کا مزاج رچ بس گیا ہے۔ اس گھر کے ماحول میں ایک مخصوص ٹھہراؤ اور تحمل ہے جو بی اماں کی ذات کا حصہ ہے۔ میں نے یہ ماحول کہیں اور نہیں دیکھا۔ ان کی شخصیت کا صبر، حوصلہ اور تحمل اس گھر کی فضا پر چھایا رہتا ہے۔ وہ خوش رہتی ہیں، تنگ نہیں پڑتیں، غصے میں نہیں آتیں، تم نے دیکھا اس گھر کے کونے کونے میں خوشی کا اور شکر گزاری کا احساس ٹپکتا ہے۔'' نگین کو محسوس ہوا اس کا کہا ایک ایک حرف سچ تھا۔ اسے یہ ساری کیفیات محسوس ہونے لگیں۔

''یہ سب بہت rare ہے۔ میں نے اپنی کسی خالہ کے کسی ماموں کے اور اماں کے مزاج میں یہ چیز نہیں دیکھی، یہ ممکن نہیں کہ بی اماں نے ان کے ذہنوں میں ڈالی نہ ہو مگر وہ نئے ماحول کو نئے انداز کو اڈاپٹ کر گئے ہیں، یہاں بے جگہ محسوس کرتے ہیں۔''

''تمہیں ہمیشہ یہاں تو نہیں رہنا حمزہ۔'' نگین کو خیال آیا۔ ''اب سے کچھ دیر بعد جب پریکٹیکل لائف میں قدم رکھو گے تو ممکن ہے اس وقت یہ جگہ تمہیں چھوڑنی پڑے، تم بھی نئے ماحول اور نئے انداز کو اڈاپٹ کر جاؤ گے اور یہاں بے جگہ محسوس کرو گے۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ ایسا ہو۔'' حمزہ نے سر ہلایا۔ ''میں یہاں بی اماں کے ساتھ تنہا رہا ہوں، اس گھر کا ماحول میرے مزاج میں بھی رچ بس گیا ہے، میں یہاں سے کہیں اور جا کر تو بے جگہ محسوس کر سکتا ہوں یہاں نہیں، تمہیں پتا ہے نگین! بی اماں نے زندگی کے وہ سنہرے اصول میرے مزاج کا حصہ بنا دیے ہیں جو ہم رسالوں، کتابوں کے اقوالِ زریں والے صفحات پر پڑھتے اور بھول جاتے ہیں۔ مجھے خود بھی پتا نہیں چلا کہ ایسا کیسے ہوا مگر یہ سب انہوں نے بھی لاشعوری طور پر کیا۔ روایات اور اخلاق کے اصولوں سے پیار آج کی دنیا کے اصول

نہیں رہے مگر میں نے محسوس کیا کہ جہاں یہ نہ ہوں وہاں مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ میں اپنی اماں کے پاس اسی سے تو رہ نہیں سکا۔ وہاں مجھے یہ دونوں چیزیں نظر نہیں آتیں۔"

"تم قدامت پسند بن گئے ہو۔" نگین نے اسے تنگ کیا۔

"یہ قدامت پسندی نہیں ہے لیکن انسان کی زندگی کے کچھ اصول ایسے بھی ہونے چاہئیں جن کی وجہ سے وہ اس ماحول کا حصہ نظر آئے جس میں وہ رہتا ہے۔ ورنہ تو بندہ اوپرا، اوپرا سا لگتا ہے۔" یہ ایک منفرد سی بات تھی مگر نگین نے بہت بعد میں یہ جانا کہ اسی منفرد بات کی وجہ سے حمزہ باقی لوگوں سے مختلف نظر آتا تھا۔ اس کے اپنے خاندان کے لوگ کھاتے پیتے اور جدید طرز زندگی کے شیدائی تھے اور بی اماں کے گھر کے ماحول کا مذاق اُڑاتے تھے مگر حمزہ کسی قسم کے کامپلیکس کا شکار نہیں تھا۔ وہ ان سب میں اسی اعتماد سے اٹھتا بیٹھتا تھا جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھا وہاں اس کی اور ان کی شخصیات میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا تھا۔

"مہرین کے گھر میں حمزہ اب رہ ہی نہیں سکتا۔" نگین کی ای کبھی کبھار خیال ظاہر کرتیں۔ "بڑی مشکل بات ہے۔"

جب بی اماں کا انتقال ہوا اس وقت حمزہ لاہور میں پڑھ رہا تھا۔ وہ ویک اینڈ پر باقاعدگی سے گھر آتا تھا، نگین کی شادی ہو چکی تھی، بی اماں کی موت ان سب کے لیے بہت بڑا صدمہ تھی مگر حمزہ کے لیے ایک بڑا جھٹکا ثابت ہوئی تھی۔ وہ بی اماں کے سائے سے محروم ہو گیا تھا اور دوسری طرف اس کی اماں اب اس سلسلے میں کوئی دلیل سننے کو تیار نہ تھیں کہ وہ ان کے پاس جا کر نہیں رہے گا۔ نگین بخوبی سمجھ سکتی تھی کہ حمزہ کی زندگی میں وہ وقت سب سے کڑا تھا مگر اس وقت تک وہ میچور اور کمپوزڈ ہو چکا تھا کہ اس نے کسی پس و پیش کے بغیر اپنی اماں کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد اگرچہ وہ اس سے رابطے میں رہا مگر ملاقات کا موقع کم ہی آتا۔ اب کچھ عرصے سے جب حمزہ کو اس فرم کی جاب مل گئی اور اس کا پہلا ٹرانسفر لاہور ہو گیا تو نگین سے ملاقات کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔

نگین اب اس کو دیکھتی تھی تو اسے محسوس ہوتا تھا کہ حمزہ کی شخصیت اور مزاج میں کافی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ یہ ایک فطری سی بات تھی مگر اس کا وہ مخصوص ٹھہراؤ اور تحمل اب بھی اس کے مزاج سے جھلکتا تھا۔ جس نے اسے باقیوں سے منفرد بنا رکھا تھا اور جس کی وجہ سے وہ اپنے باقی گھر والوں سے اتنا مختلف لگتا تھا کہ اکثر لوگ حیرت سے مہرین سے پوچھتے تھے کہ کیا یہ واقعی ان کا بیٹا ہے۔

☆☆☆

"تم علینہ ہو؟" علینہ کو اپنے سیل فون پر ایک اجنبی آواز سنائی دی، یہ کون تھا جو اتنی بے تکلفی سے اس سے بات کر رہا تھا۔

"آپ کون ہیں؟" اس نے بے اختیار پوچھا۔

"میں وہی ہوں جس کو کچھ دن پہلے لائیو شو میں آپ کوس رہی تھیں۔" دوسری جانب سے آواز آئی۔

"ار... ے......" علینہ کے دل نے ایک دھڑکن مِس کر دی۔ "فہد!" وہ اس روز لائیو شو میں اپنی آواز سنائی نہ دیے جانے پر بہت مایوس تھی۔

"آئی ایم سوری! اس روز میں نے دانستہ تمہاری کال رُکوا دی، جو تم کہہ رہی تھیں وہ آن ائر چلا جاتا تو مسئلہ ہو جاتا۔"

"ہاں شاید۔" علینہ کو اس کی بات فوراً سمجھ میں آ گئی۔

"کیسی ہو؟" دوسری جانب سے پوچھا گیا۔ "میں نے بہت بے صبری سے تمہارا نمبر لیا آپریٹر سے یار آئی سوچ مِس یو!" وہ بے تکلفی سے کہہ رہا تھا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ تمہیں یہاں سے گئے عرصہ ہو گیا تم اس دوران ملک سے باہر رہے پھر تم مجھے کب کہاں اور کیسے مِس کرتے ہو، میرا خیال ہے کہ میرا تو نام بھی تمہیں اس روز یاد آیا ہوگا جس روز میں نے کال کی تھی۔"

"میں بھول گیا ہوتا تو اس روز بھی یاد نہ آتا۔" دوسری جانب سے سنجیدگی سے کہا گیا۔ "تم میری واحد ایسی پرانی یاد ہو جسے میں کبھی بھلا نہیں سکا۔ تم کیسی ہو لینہ، کیا کر رہی ہو، آنٹی کیسی ہیں، ایبٹ آباد کیسا ہے، وہ سڑکیں، وہ راستے شملہ، سربن، برن ہال، پی ایم اے روڈ، عباسی مسجد اور ہرنو کیسے ہیں، اس شہر کی فضائیں اور ہوائیں کیسی ہیں؟ میں اس سب کو بہت مِس کرتا ہوں۔ میں بہت دنیا گھوما ہوں مگر اس شہر کی فضا کی خوشبو اور اس شہر کے رنگوں جیسے رنگ میں نے کہیں اور نہیں دیکھے، نہ محسوس کیے، لینہ تم سوچ نہیں سکتیں کہ اس روز تمہاری کال نے مجھے کتنا خوش کیا۔ مجھے لگا میں اس لائیو شو میں آیا ہی اس لیے تھا کہ اس کے ذریعے تمہارے ساتھ میرا رابطہ ممکن ہونا تھا۔"

"ارے یہ تو ویسے کا ویسا ہی ہے۔ اتنا ہی بے تکلف، اتنا ہی سادہ۔" علینہ نے لمحوں میں اندازہ لگایا۔

"اور کتنے مزے سے تم مجھے گدھا کہہ رہی تھیں اس روز۔ ارے، کیا یہ کام گدھوں کے کرنے کا ہے، تم کسی ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے جاتی ہو تو کیا گدھوں کا پکایا کھانا کھاتی ہو۔" پھر اچانک جیسے اسے لڑنا یاد آ گیا۔

"اچھا مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم خانساماں ہونے پر فخر کیا کرو گے، مالی گیری، بیرا گیری، ڈرائیوری اور خاکروبی کے اعلیٰ کورسز کرنے کب تشریف لے جا رہے ہو بیرونِ ملک؟" علینہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہوں۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔”آئیڈیا برا نہیں۔ اگر ایسے کورسز منعقد ہوئے تو کرنے پر غو جاسکتا ہے۔“ پھر وہ دونوں بے اختیار ہنس دیے۔ اب وہ ایک دوسرے سے اتنے سالوں میں گزر والے حالات کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو اپنے بارے میں بتا رہے تھے۔

”ارے، یوں لگتا ہے کہ برسوں کے بعد کسی اپنے سے ملاقات ہوئی ہو۔“ اس رات علینہ نے لی لیٹے لیٹے سوچا۔”اور بات بھی یوں کہ جیسے درمیان کا وقت آیا ہی نہ ہو، سچ ہے فہد اس لائیو شو میں آیا ہی لیے تھا کہ اس کی میری بات ہونی تھی۔“ اس روز وہ بہت دنوں بعد دل سے خوش تھی بہت خوش۔

☆☆☆

”تیری ضد بھی تو انوکھی ہے بینش۔“ صالحہ نے کچن میں بیٹھے کھانا کھاتے ہوئے بینش کو مخاطب کیا۔”ر رشید اور مجید کو میں کیا سمجھاؤں اور تو کیا سمجھائے کہ تو نے اس کالج میں داخلہ لینا ہے جس میں لڑکے اور لڑک اکٹھے پڑھتے ہیں اور تو نے وہاں جو پڑھائی کرنی ہے اس کو کرنے کے بعد تیرے ہاتھ کمہاروں والا ہنر آ جائے گا مٹی کے برتن بنانے لگ جائے گی۔ وہ تجھ سے کیا یہ سوال نہ کریں گے کہ کمہاروں کی طرح برتن ہی بنانے سیکھنے تو پڑھائی پر اتنا خرچہ کرنے کے بجائے اپنے ناکے چلی جا پسرور، وہاں بہتیرے ہوتے ہیں کمہار اور کمہاروں برتن، بہتیرا پیسہ کماتے ہیں وہ ادھر اُدھر برتن بیچ کر بلکہ پورے پاکستان میں۔“ صالحہ نے اپنے تئیں بہت اچھی پیش کی تھی۔ جس کو سننے کے بعد بینش کو اپنے دماغ سے پڑھنے کا کیڑا بالکل ہی نکال دینا چاہیے تھا۔ بینش جھنجھلا منہ دھرے بڑی دلچسپی سے اماں کو سوکھی روٹی پر کریلے پیاز رکھے رغبت سے کھاتے دیکھ رہی تھی۔

”اس کام میں اور اس پڑھائی میں بڑا فرق ہے اماں۔“ اس نے اپنی دلچسپی اور محویت کو جھٹک کر کہا۔ ”کمہاروں کا پیشہ اور مہارت تعلیم کا ایک شعبہ بن گیا ہے۔ اس کی باقاعدہ تعلیم انسان کو برتن سازی کے فن کا بنا دیتی ہے اور آپ کو اندازہ نہیں کہ آج کل اس کی کتنی اہمیت ہے اور اس کے ذریعے کتنی شہرت اور کتنا پیسہ کما جاسکتا ہے۔“

”لے شہرت کو ہم نے آگ لگانی ہے۔“ صالحہ نے سادگی سے کہا اور لسی کے گلاس کو ایک سانس میں ختم کر کے ہونٹوں کو دوپٹے سے پونچھا۔”ہاں پیسے کی بات کر، پیسہ تو لڑکیاں خوب کما رہی ہیں، ثمینہ کو دیکھ جس ہوٹل میں کھانا دیتی ہے لوگوں کو، وہاں سے پیسہ بھی ملتا اور بچا بچایا ڈھیر کھانا بھی، وہ ہوٹل والے اگلے گرم کر کے تھوڑی دیتے ہیں پچھلے دن کا کھانا، وہ رات کو سب بانٹ دیتے ہیں اپنے کام کرنے والوں درمیان پر ثمینہ نے تو کچھ خاص پڑھائی نہیں کی، پھر بھی کما رہی ہے خوب، تو جو کہہ رہی ہے اس پر تو پیسہ ہی بہت لگتا ہے، پہلے اتنا پیسہ لگاؤ پھر کماؤ، اس وقت تک ہم تجھے یہاں تھوڑی ہی بیٹھا چھوڑیں گے، اس وقت تک تو اپنے اگلے گھر چل پڑی ہوگی، اگلوں کو فائدہ پہنچانے، پیسہ ہم لگائیں فائدہ اگلے اٹھائیں، یہ بھی کوئی بات ہوئی۔“ صالحہ کے لہجے میں قطعیت تھی وہ ہرگز بینش کا ساتھ دینے والی نہیں تھیں۔

”میں بھائیوں سے خود ہی بات کرلوں گی اماں، مجھے یقین ہے وہ میری بات ٹالیں گے نہیں۔“ اس نے صالحہ کے کھانا ختم کرنے کے بعد برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا وہ اتنی دیر اماں کے بہلا دے میں رہی، خود ہی بھائیوں سے بات کر لیتی آر یا پار فوراً ہی پتا چل جاتا۔

اس کے رشتے داروں کا خیال تھا کہ اپنے حالات اور ماحول سے اس کا مزاج میل نہیں کھاتا تھا۔ وہ کہ اور ہی دنیا میں رہتی بستی تھی مگر خود وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ایسا نہیں تھا۔ وہ جن حالات اور ماحول میں پلی بڑھی

تھی اس سے اس کی جذباتی وابستگی تھی اور اسے ان سے کوئی اختلاف نہیں تھا، ہاں اسے پڑھنے اور اچھا پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے گوالمنڈی کالج سے ایف اے کیا تھا اور اب اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ فائن آرٹس میں بی اے کرے۔ اس کا دل پنجاب یونیورسٹی سے زیادہ نیشنل کالج آف آرٹس میں داخلہ لینے کو چاہتا تھا مگر اسے معلوم تھا کہ اس کے بھائی اس پر نہیں مانیں گے۔ اگر وہ وہاں کے ماحول کے بارے میں کچھ نہ بھی جانتے ہوئے تو بھی وہاں کے اخراجات کے بارے میں جان کر ہی منع کر دیں گے۔ جبکہ خود اس کا یہ خواب تھا کہ وہ وہاں پڑھے۔ اس کے پاس پنجاب یونیورسٹی ہی ایک ایسی چوائس تھی جس کے لیے بھائیوں سے اصرار کیا جاسکتا تھا۔ ایسے موقع پر جب اپنے دل کی کوئی بات کہنا ہوتی اسے اپنے ابا بہت یاد آتے۔ جو اس کے ساتھ شفیق بھی تھے اور اس کی بات ماننے کو ہر دم تیار بھی رہتے تھے لیکن جن کے سائے سے وہ بہت جلد محروم بھی ہوگئی تھی۔ اسے خیال آتا کہ وہ زندہ ہوتے تو نہ صرف پڑھنے کا بلکہ این سی اے میں پڑھنے کا اس کا خواب بھی ضرور پورا ہوتا۔ اس سے دونوں بڑے بھائی جن کی وہ اکلوتی بہن تھی وہ بھی اس کے ساتھ بہت پیار کرتے تھے مگر بہت سی باتیں ایسی تھیں جن پر وہ اس کا نقطۂ نظر سمجھ نہ پاتے تھے، ابا کی وفات کے بعد ان دونوں کو ہی اپنی پڑھائی چھوڑ کر ابا کی کپڑے کی بڑی دکان سنبھالنا پڑی تھی۔ ابا کی دکان دادا کے زمانے سے بہت چلتی تھی اور واقف لوگ امرتسر کے ان کشمیری شیخ برادران پر اعتماد بھی ان کے باپ دادا کی دیانتداری کی وجہ سے ہی کرتے تھے۔ بھائیوں کی طبیعت میں ایمانداری اور حلم ابا کی وجہ سے آیا تھا، دونوں محنتی اور حوصلے والے تھے، کاروبار پہلے سے بھی بہتر ہوگیا تھا اور اب تو چھوٹا بھائی اسی دکان کی ایک برانچ انارکلی میں بھی کھولنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ بینش کو ابا کے بعد انہوں نے کسی طرح کی کمی نہیں ہونے دی تھی اور بہت لاڈ پیار سے رکھا تھا مگر اس کی جن باتوں کو وہ سمجھ نہیں پاتے تھے ان کے سلسلے میں وہ بے بس تھے۔

”میرا تو خیال ہے بینش بیٹا تو سیدھا سیدھا بی اے کرلے اپنے اس گوالمنڈی والے کالج سے ہی۔“ اس رات جب کھانے کے دوران بینش نے براہِ راست بھائیوں سے بات کی تو بڑے بھائی نے رسان سے سمجھانے کی کوشش کی۔

”تو اور کیا یہ ہی تو میں اسے سمجھاتی ہوں، ہم نے تجھے اگلے گھر بھیج دینا ہم نے کون سا تجھ سے نوکریاں کروانی ہیں۔“ اماں نے بیٹے کا موقف سن کر بینش کی طرف ایسی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا جیسے کہہ رہی ہوں اور لے مزہ خود بات کرنے کا۔

”پر بھائیان۔“ بینش نے اپنے مخصوص انداز میں کہنا چاہا۔

”پر والی کوئی بات رہ ہی نہیں گئی۔“ اماں جھٹ سے بولیں۔”بھائی نے کہہ تو دیا ہے کہ کیا کرنا ہے، چل تیرا شوق ہے تو وہ جماعتیں اور پڑھ لے ورنہ ہمارے گھر تو لوگ ابھی سے رشتہ پوچھنے آتے ہیں اللہ کے فضل سے کوئی کمی نہیں ہے۔“

”او اماں آپ تو چپ کرو۔“ چھوٹے بھائی نے الجھ کر کہا۔”تم بتاؤ بینش صاف، صاف کیا دل چاہتا ہے تمہارا؟“ بینش کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا، یہ ہی وقت تھا کہہ دینے کا یہ وقت نکل جانے کے بعد واپس آنے والا نہیں تھا۔

”میرا دل چاہتا ہے میں فائن آرٹس پڑھوں، ایف اے میں میری ٹیچرز میرے کام کی بہت تعریف کرتی تھیں، وہ یہی کہتی تھیں کہ اگر میں پروفیشنل ایجوکیشن حاصل کرلوں تو بہت اچھا ہو جائے گا۔“ اس نے دانستہ

www.paksociety.com

انگریزی کے الفاظ بولے اسے معلوم تھا کہ ان کا اثر کیا ہونے والا تھا۔

''یہ تو بڑے فخر کی بات ہے۔'' چھوٹے بھائی نے دانتوں میں خلال کرتے ہوئے بڑے بھائی کی طرف دیکھا۔ ''سب بچوں کو تو ٹیچرز مشورے نہیں ناں دیتیں۔''

''پھر؟'' بڑے بھائی نے چھوٹے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ہم تو پڑھنے کا شوق پورا نہ کر سکے۔ حالانکہ میں بھی اپنے ٹیچرز کا بڑا پسندیدہ طالب علم تھا مگر قسمت!'' چھوٹے بھائی نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''پر اب تو کوئی مسئلہ نہیں ہے، بینش اگر پڑھ سکتی ہے اسے شوق بھی ہے تو پڑھنا چاہیے، ساری دنیا پڑھ رہی ہے اب تو، جتنا پڑھ لے اتنا ہی اچھا ہے۔ زندگی کا کوئی ڈھنگ طریقہ تو آئے گا۔''

''ہا...... ہائے۔'' اماں اس کایاپلٹ پر حیران ہوئیں۔ ''پر وہ تو کہتی ہے پڑھ کر میں نے برتن بنانے ہیں مٹی کے کمہاروں کی طرح۔''

''یہ تو اور بھی اچھا ہے، صرف پڑھائی نہیں ہنر بھی سیکھ لے گی۔'' چھوٹا بھائی کچھ زیادہ ہی دیالو ہو رہا تھا۔ ''کہاں سے لینے ہیں داخلہ فارم بینش، مجھے بتا دے میں منگوا دوں گا۔'' اس نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا، بڑا بھائی کچھ نہیں بولا، یوں یہ طے ہوگیا کہ بینش نے آئندہ آنے والے وقت میں کیا کرنا تھا۔

☆☆☆

وہ کمرا نفاست سے سجایا گیا تھا، اس میں ہر طرح کی سہولت میسر تھی، کلر اسکیم اور فرنیچر بے حد دلکش تھا مگر اس کا دھیان ان میں سے کسی چیز پر بھی نہیں تھا۔ وہ جس کو صرف دیکھنے کی خاطر یہاں آیا تھا وہ مجسم اس کے سامنے موجود تھی۔ اس کا دھیان اس کے خوب صورت لباس اور بناؤ سنگار پر بھی نہیں تھا۔ وہ تو صرف اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں صرف اس کے چہرے پر اٹکی تھیں۔ اس کا چہرہ جو اس کے دل کا آئینہ تھا اور پکار پکار کر بتاتا تھا کہ اس کا دل کتنا خوب صورت، معصوم اور سادہ تھا۔ اس کے چہرے کی دلکشی اس کے لیے ایک اضافی چیز تھی، اصل میں اس کا دل تھا جس نے اسے اپنے سامنے جھکا دیا تھا۔ ''ارے کیا یہ دل یہاں آنے والے ہر شخص کو نظر آتا ہے؟'' وہ پوچھنا چاہتا تھا مگر یہ بات اسے کبھی نہیں پوچھنا تھی۔ اس سوال کے ساتھ ہی اس تلخ حقیقت بھی سامنے آجاتی تھی جس سے نظریں چار کرنا بھی مشکل تھا اور نظر بچانا بھی مشکل۔ یہاں اس حسن اس خیرہ کر دینے والی خوب صورتی کو دیکھنے کے لیے آنے والا وہ اکیلا نہیں تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں کوئی بھی چند سکوں کے عوض من پسند چہرہ دیکھنے اور من پسند جسم سے ناتا جوڑنے کے لیے آسکتا تھا۔

''اُف!'' اس کے حلق میں زہر سا بھر گیا جسے اس نے ٹھنڈے مشروب کے ایک گھونٹ کے ساتھ حلق سے اتارا اور اس حقیقت سے نظر بچانے کے لیے ایک بار پھر اس وجود پر بھرپور نظر ڈالنے لگا۔ اس کا چہرہ، اس کا جسم وہ اوپر سے دیکھتے، دیکھتے نیچے آنے لگا۔ اس کے ہاتھ بے حد خوب صورت تھے پھر اس کی نظر اس کے بازو میں پہنے خوب صورت جڑاؤ کنگن پر اٹک گئی۔

''تمہیں معلوم ہے میں یہاں کیوں آیا ہوں، تم جانتی ہو کہ میں نے اس ایک رات کی بھاری قیمت کیوں ادا کی ہے؟'' اس نے بھاری لہجے میں اسے مخاطب کیا تھا۔

* *

تپتی دوپہر دھیرے دھیرے شام میں ڈھل رہی تھی۔ دھوپ دیواروں سے اوپر چھتوں کی طرف جانے لگی تھی مگر تپش کا اثر کم نہیں ہو رہا تھا۔ فضا میں ہوا کا احساس ذرا برابر بھی نہیں تھا، چرند پرند سب کسی سائے میں چھپے بیٹھے تھے اور ماحول پر عجیب افسردہ سی خاموشی چھائی تھی۔ بینش نے کتنی دیر تک چھت کے پنکھے کے ہلتے پروں کو گھورتے رہنے کے بعد اکتا کر وہاں سے نظریں ہٹائیں اور اپنے بستر کے ساتھ والی کھڑکی سے چق ہٹا کر باہر گلی میں جھانکا۔ گلی بھی سنسان تھی، گلی میں ہر دم کھیلتے رہنے والے بچے بھی شاید اس گرمی کی حدت کو برداشت نہ کرتے ہوئے گھروں کو بھاگ گئے تھے۔ دور گلی کے آخری سرے پر فالسوں کی چھابڑی کسی گھر کی سیڑھیوں پر رکھے ایک شخص اکتایا ہوا کھڑا نظر آیا جو چہرے پر آئے پسینے کو بار بار شانے پر رکھے پیلے کپڑے سے پونچھ رہا تھا۔

''کتنی محنت طلب کمائی ہوگی اس شخص کی۔'' اسے خیال آیا۔ ''صبح کسی باغ سے فالسے توڑتا ہوگا اور پھر دن بھر گلی، گلی پھر کر انہیں بیچتا ہوگا۔ باغ والے کو پیسے دینے کے بعد اس کے پاس کیا بچتا ہوگا؟'' اسے خیال آیا۔ ''ارے، یہ شخص تو آئیڈیل ہے۔'' اس نے سوچا۔ ''جس دور میں کمائی کرنے کے لیے اتنے شارٹ کٹس دستیاب ہوں اس دور میں اتنی محنت اور مشقت کی کمائی کرنے والا آئیڈیل ہی تو قرار دیا جانا چاہیے۔'' یہ بات اس نے دانیال سے سنی تھی، اس بات کے یاد آتے ہی بینش کا دھیان باقی سب باتوں سے ہٹ کر دانیال کی طرف چلا گیا۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کے فائن آرٹس ڈپارٹمنٹ میں بی ایف اے سیکنڈ ایئر کا طالب علم تھا اور ایک انتہائی قابل طالب علم سمجھا جاتا تھا۔ اس کی شخصیت اور فن اسے واقعی دوسروں سے ممتاز نظر آنے میں مدد دیتے تھے۔ بینش نے اسے یونیورسٹی میں اپنے پہلے ہفتے کے دوران ہی نوٹ کر لیا تھا، اس کی وہ پہلی مکمل بات جو اس نے سنی تھی اس کا خیال تھا کہ اسے عمر بھر نہیں بھولے گی۔

''تم بتاؤ تمہاری ترجیح کیا ہوگی؟'' وہ اپنے کسی دوست سے پوچھ رہا تھا۔ ''تمہارے قریب ہی ایک سپر اسٹور ہے جہاں ہر چیز مل جاتی ہے آئس کریم سمیت اور تمہیں سامنے سے آئس کریم کی ریڑھی کھینچتا پسینے میں شرابور گرمی کا ستایا ہوا شخص آتا نظر آئے، کھانی تو تمہیں آئس کریم ہی ہے بتاؤ کس سے لوگے سپر اسٹور والے سے یا اس آدمی سے؟''

''آئس کریم کی کوالٹی پر منحصر ہے۔'' اس کے دوست نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''اگر تم اس ریڑھی والے کی مدد کے خیال سے کہہ رہے ہو تو اسے چند پیسے ویسے دے دوں گا۔''

''اس کی عزتِ نفس کی پروا نہیں کرو گے؟'' دانیال کی بات نے بینش کو باقاعدہ اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''ان لوگوں کی بھی کوئی عزتِ نفس ہوتی ہے؟'' اس کے دوست نے ہنس کر جواب دیا تھا۔ ''اس روز اس شخص کو دیکھا تھا جو اس روڈ سائڈ ہوٹل کے قریب موجود تھا جہاں سے ہم نے کھانا کھایا تھا، ہمارے کھانا کھانے کے بعد وہ سب پلیٹوں میں سے بچا ہوا جمع کر کے وہیں ہمارے سامنے کھانے لگ گیا تھا ایک سائڈ پر بیٹھ کر، ان لوگوں کی میرے بھائی کوئی عزتِ نفس نہیں ہوتی......'' وہ ہنس رہا تھا۔

''انہی لوگوں کی تو عزتِ نفس ہوتی ہے منصور۔'' بینش نے دیکھا دانیال کے چہرے پر کرب تھا۔ ''یار اس عزتِ نفس کی پروا ہم لوگوں نے نہ کر کر کے اس کو مار ہی دیا ہے مگر یقین جانو انہی لوگوں کے پاس تو عزتِ نفس ہوتی ہے۔''

''ایک بات تو بتاؤ۔'' منصور نے اس سے پوچھا۔ ''تمہیں اتنا احساس ہے ایسے لوگوں کا تو اس روز تم اس شخص کو کھانا کیوں نہیں کھلا دیا؟''

''اسی خوف سے کہ اس کی عزتِ نفس میرے یوں کھانا کھلانے پر مجروح نہ ہو جائے، وہ جس طرح کھا رہا تھا... نظروں میں آنے پر شرمندہ نہ ہو جائے، مجھے اس بات سے ہمیشہ بہت ڈر لگتا ہے یار۔'' وہ کہ رہا تھا۔ ''تمہیں فٹ پاتھ پر بیٹھا وزن کی مشین رکھے لوگوں کا وزن بتانے والا وہ شخص یاد ہے جسے ہم نے بغیر پیسے دینے کی کوشش کی تھی بغیر وزن کیے، کتنا لڑا تھا وہ شخص ہم سے، کیسے حقارت سے اس نے ہمارے پیسے ہماری طرف پھینک دیے تھے۔ میں اس روز سے ہی ان لوگوں کی عزتِ نفس مجروح ہو جانے کے خیال سے ڈرا ہُوا ہوں۔''

''سب ڈرامے ہیں یار، ان لوگوں کی کوئی عزتِ نفس نہیں ہوتی۔ پیسہ دکھا کر ان سے کوئی کام بھی لے لو کوئی فرق نہیں پڑتا ان کو۔'' اس کے دوست نے کہا تو وہ لمبی بحث میں پڑ گئے۔

دانیال کا تعلق کسی امیر اور اونچے گھرانے سے تھا۔ یہ بات بینش کو ڈپارٹمنٹ میں اس کی پہلی دوست آمنہ نے بتائی تھی جو دانیال کو ذاتی طور پر بھی جانتی تھی۔ اس روز اس کی اپنے دوست کے ساتھ اس بحث کو سننے کے بعد بینش کو لگا جیسے اسے کہیں بہت اندھیرے میں انسانیت کی روشنی نظر آ گئی ہو۔ ڈپارٹمنٹ میں پہلے ہفتے کے دوران وہ خاصی گھبرائی ہوئی سی رہی تھی۔ یہاں کا ماحول' یہاں کے رنگ ڈھنگ پورا کلچر ہی مختلف تھا۔ گوالمنڈی کالج سے یہاں تک سفر طے کر لینا الگ بات' یہاں آ کر خود کو ایڈجسٹ کرنا دوسری بات تھی۔ پہلے ہفتے میں بینش کو اپنی جیسی کوئی نظر نہیں آئی، اگلے ہفتے میں اس کی دوستی آمنہ سے ہوئی جو اگرچہ طبقاتی اعتبار سے اس سے بہت مختلف تھی مگر محبت کرنے والی پُرخلوص لڑکی تھی۔

''تمہیں پتا ہے بینش تم کتنی پیاری لڑکی ہو۔'' اس نے دوستی کے پہلے دن ہی اس سے کہہ دیا تھا۔

''میں پیاری ہوں؟'' بینش کو اپنے خالص اندرونِ لاہور پہ قابو پانے میں خاصی دقت ہوتی تھی جس کے زیرِ اثر اچھی خاصی بولی جانے والی اردو بھی پنجابی محسوس ہوتی تھی۔

''ہاں تو اور کیا۔'' آمنہ نے بے پروائی سے کہا تھا۔ ''ہم لوگ جس خوب صورتی کو حاصل کرنے کے لیے لاکھ جتن کرتے ہیں، وہ تمہارے پاس ویسے ہی ہے قدرتی اور خالص اور اوپر سے تم ابھی تک ویسے ہی خالص ہو، تمہاری روح خالص ہے ابھی تم پر ماحول کی ناخالصیت کا اثر نہیں ہوا اس لیے تم اتنی پیاری دِکھتی ہو لیکن مجھے ڈر ہے یہ ڈپارٹمنٹ تم پر اثر کر کے چھوڑے گا۔''

''ہائے اللہ نہ کرے۔'' بینش کو ڈپارٹمنٹ میں موجود لڑکے لڑکیوں کی بے ساختگی اور کُھلا ڈلا میل جول یاد آ گیا، کیا وہ کبھی ایسی ہو سکتی تھی: کیا وہ اتنی بے ساختہ اور بے قابو ہو سکتی تھی کہ ساتھ پڑھنے والے لڑکے سے یوں گفتگو کرے اور بے تکلف ہو جائے جیسے کسی لڑکی کے ساتھ ہوتی ہے۔

''یہ تم ابھی کہہ رہی ہو ناں بینش۔'' آمنہ نے اپنے شولڈر کٹ سلکی بالوں کو ہاتھ سے برابر کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اپنی آنکھوں سے سیدھی سادی معصوم لڑکیوں کو ماحول کا اثر پکڑتے دیکھا ہے مگر تم فکر مت کرو، تمہاری قسمت اچھی ہے کہ میں یہاں ہوں، میں تمہاری روح کی خالصیت کی حفاظت کروں گی۔ مجھے خالص روحیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ بینش اس ڈپارٹمنٹ میں میرے جاننے والے بہت ہیں۔ کچھ پرانے دوست بھی ہیں اچھے فرینڈز ہیں مگر میں دوستی صرف تم سے کروں گی کیونکہ تم جیسے لوگوں کے قریب رہنا میں اپنے لیے اعزاز سمجھتی ہوں۔''

بینش کے لیے یہ ایک غیر متوقع سی بات تھی۔ یہ ٹھیک تھا کہ وہ ایک سیدھی سادی لڑکی تھی اور اس ماحول میں آ کر ایک مرتبہ تو بری طرح گھبرا گئی تھی مگر آمنہ یوں اس سے دوستی کے لیے ہاتھ بڑھائے گی اس کا خیال اسے نہیں آیا تھا مگر اسے ایک سہارا چاہیے تھا ایک دلاسا، اسے یہاں سروائیو کرنے کے لیے ایسے ہی ساتھ کی ضرورت تھی سو اس نے بلا تامل دل سے آمنہ کی دوستی کو قبول کر لیا تھا اور وہ آمنہ ہی تھی جو اسے نئی نئی چیزوں سے روشناس کروا رہی تھی۔ بینش نے ایف اے میں فائن آرٹس نہیں پڑھا تھا، وہ سائنس کی اسٹوڈنٹ تھی مگر کالج کے فنکشنز پر پوسٹرز اور بیک گراؤنڈز بنانے میں اس کا بڑا شہرہ تھا۔ جب ہی میڈیکل کے لیے اچھے نمبر نہ آنے پر اس کی ایک ٹیچر نے اسے فائن آرٹس پڑھنے کا مشورہ دیا تھا۔ فائن آرٹس سے اس کے ذہن میں جس چیز کا تصور آتا تھا اس میں مٹی کے برتن بنانے کا فن سب سے نمایاں تھا۔ وہ ٹی وی پر اس سے متعلق کئی پروگرام دیکھ چکی تھی اور اس کے لیے فائن آرٹس پڑھنے کے خیال میں سب سے زیادہ خوشی کا مقام ہی یہ تھا کہ وہ مٹی کے برتن بنانا سیکھ لے گی مگر شروع، شروع میں اسے یہ کورس لائن مشکل اور پڑھائی کا شیڈول سخت لگا تھا۔ اس کی انگریزی بہت اچھی نہیں تھی اس کے لیے یہ سب سے بڑی جھینپ تھی، اس کے ڈپارٹمنٹ میں اکثر لوگ بڑی روانی سے انگریزی بولتے تھے۔ وہ ان کی بات سمجھ جاتی مگر... وہ انہیں انگریزی میں جواب نہیں دے پاتی تھی۔

''یہ کوئی شرمندگی والی بات نہیں۔'' اس سلسلے میں بھی آمنہ نے اس کو تسلی دی۔ ''تم پورے اعتماد کے ساتھ اردو میں جواب دیا کرو، بے شک تم اپنی انگریزی بہتر کرنے کی کوشش کر سکتی ہو مگر اردو پر شرمندہ ہونے کا کبھی نہ سوچنا یہ سب سے بڑی جہالت ہوگی۔'' اور بینش نے دیکھا تھا کہ اس کے اعتماد کے ساتھ اردو بولنے پر کوئی بھی اس کی طرف استہزائیہ نظروں سے نہیں دیکھتا تھا ہاں اگر یہی بات وہ جھینپ کر کرتی تو یقیناً بہت سی نظروں میں استہزا ہوتا۔ لیکچرز کو سمجھنے اور عملی کام کو کرنے میں بھی آمنہ اس کا پورا پورا ساتھ دیتی تھی۔ بینش کے لیے آمنہ وہ فرشتہ ثابت ہوئی تھی جو خاص طور سے کسی کام پر مامور کر دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات وہ سوچتی تھی کہ شاید وہ اس نئی دنیا میں کبھی قدم نہ جما پاتی اگر آمنہ وہاں موجود نہ ہوتی۔ وہ اس ڈپارٹمنٹ میں موجود رنگ برنگ لوگوں کو دیکھ کر بہت گھبرائی تھی مگر آمنہ اور دانیال کی شخصیتوں میں اسے وہ رنگ بھی نظر آیا تھا جسے اس نے بلا تامل انسانیت کا رنگ دے دیا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے لیے طبقاتی فرق، رنگ، زبان، ماحول کوئی بھی چیز معنی نہیں رکھتی تھی۔ وہ لوگوں کو انسان سمجھتے تھے اور انسانوں کی طرح ہی تعلق قائم رکھتے تھے۔ آمنہ کے بعد جس شخص کو دیکھتے رہنے اور سنتے رہنے کی خواہش بینش کے دل میں ابھری تھی وہ دانیال رضا تھا اگرچہ خود دانیال رضا نے شاید بہت دیر تک اس عام اور سادہ سی لڑکی کے ڈپارٹمنٹ میں موجود ہونے کا نوٹس بھی نہیں لیا تھا۔

☆☆☆

''تمہیں معلوم ہے کہ میں یہاں کیوں آیا؟'' مہرزاد نے اپنا سوال دُہرایا تھا۔ اس سوال کے دُہرائے جانے پر زرنگار جیسے گہرے خیال سے نکلی تھی۔ اس نے اپنے بھاری پپوٹے اٹھا کر اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

''یہ آنکھیں یقیناً دنیا کی خوب صورت ترین آنکھیں ہیں۔'' مہرزاد کو خیال آیا۔ ''کیا یہ لڑکی میرے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے؟'' اس نے لمحے بھر کو سوچا۔ ''اوہ کیا یہ بات میں بہت جلد نہیں سوچنے لگا۔'' اس نے خود سے سوال کیا اور پھر سوچنے کا سلسلہ موقوف کر کے دوبارہ سے زرنگار کی جانب متوجہ ہوا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟" اس نے تیسری بار یہ سوال کیا تھا۔

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔" زرنگار نے اپنا بھاری دوپٹا درست کرتے ہوئے کہا۔ "مگر اتنا مجھے ضرور معلوم ہے کہ جس خاطر اکثر لوگ یہاں آتے ہیں، یہ راستے اور یہ جگہ جن خیالات کو ذہن میں جنم دے کر لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے آپ ان خیالات سے بالاتر ہیں۔ آپ کوئی معمولی اور عام شخص نہیں ہیں۔ نہ ہی آپ کی سوچ اتنی عامیانہ ہو سکتی ہے۔ معمولی اور عام شخص سے میری مراد دولت، جائداد اور حیثیت ہرگز نہیں کیونکہ یہاں آنے کا تصور صرف وہی کر سکتے ہیں جو صاحب دولت، صاحب جائداد اور صاحب حیثیت ہوتے ہیں۔ آسٹے دال کے چکر میں الجھے شخص کا یہاں کیا کام مگر آپ معمولی اور عام شخص اس لیے نہیں ہیں کہ آپ کا ذوق اور آپ کی سوچ بہت بلند، بہت غیر معمولی اور بہت خاص ہے۔ اس کا اندازہ مجھے ان چند ملاقاتوں میں جو اب تک ہوئیں، آپ کی فون کالز اور آپ کے پیغامات سے ہو چکا ہے۔"

"اسی لیے تم نے ایک رات میرے نام کر دینے میں تامل نہیں کیا۔" مہرزاد کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔

"یقیناً......!" زرنگار کے لہجے میں اعتماد تھا۔

"اور اگر تمہارا یہ یقین غلط ثابت ہو جائے اور میں بھی تمہارے جسم اور تمہارے حسن کا خریدار بن کر رات گزار دوں تو......؟" مہرزاد اس کے چہرے کے تاثرات کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔" نہ اس کے چہرے کے تاثرات بدلے نہ لہجے کا اعتماد ڈگمگایا تھا۔

"کیوں تمہیں اس بات کا یقین ہے اس قدر؟"

"میری عمر زیادہ نہ سہی مگر چہروں، لہجوں اور آنکھوں میں جھانکنے والے خیالات کو سمجھنے میں اتنا وقت گزارا ہے میں نے کہ اس سلسلے میں میرا اندازہ غلط ثابت ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ لمحے جو میں نے یہ تجربہ حاصل کرتے گزارے ان کا شمار کیا جائے تو میری کل عمر سے ان کی گنتی شاید بڑھ جائے۔ آپ کا کیا خیال ہے جو لڑکی یہاں اس مارکیٹ میں پہنچ گئی وہ خود اپنی مرضی سے ان راستوں پر چل کر آئی ہوگی۔ اس کے راستے میں کانٹے اور کنکر نہ ہوں گے اس کے زخم زخم پاؤں سوچ، فہم، ادراک، شعور اور تجربے کی دھول سے پاک ہوں گے۔" اس نے کہتے کہتے مہرزاد کی طرف دیکھا۔ وہ محویت سے اس کی بات سن رہا تھا۔

"نہیں خانزادہ صاحب، حقیقتیں خیالات کے برعکس ہوتی ہیں۔" وہ مسکرا کر بولی تھی۔ "تجربات اور مشاہدات کا ایک لمبا سلسلہ ہے میرے ساتھ اور یہاں موجود ہر لڑکی کے ساتھ۔ ہمیں لہجے اور تاثرات، سوچ اور خیالات پڑھ لینے میں لمحہ بھی نہیں لگتا۔ اسی لیے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ یہاں آپ کی آمد کا مقصد عام اور معمولی نہیں ہے۔ آپ کے ارادے وہ ہرگز نہیں جن کو لے کر دوسرے تمام مرد یہاں آتے ہیں۔"

"تم بہت پازیٹو ہو میرے متعلق...... حیرت ہے۔" مہرزاد نے دلچسپی سے اس کی بات سننے کے بعد کہا۔

"ہونا بھی چاہیے، آپ ہیں ہی ایسے، آپ کی شخصیت کا عنوان ہی مختلف ہے۔" زرنگار کے لہجے کے اعتماد اور یقین نے مہرزاد کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

"تم دیکھنے میں بہت معصوم لگتی ہو، تمہارا ہر انداز تمہاری کم عمری اور معصومیت کا عکاس ہے، میرا تو خیال ہے تمہارا مشاہدہ بہت کمزور ہے۔ کوئی بہت تجربہ کار انسان بھی دھوکا کھا جائے اور کبھی یقین نہ کرے کہ تم جو بہت تجربے اور مشاہدے کا دعویٰ کر رہی ہو وہ درست ہے۔" اس نے کہا۔

"نہ کرے......!" وہ بے پروائی سے بولی تھی۔ "پروا کسے ہے مگر جو حقیقت ہے وہ حقیقت ہے۔ مجھے غلط

بیانی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ سے تو ہرگز نہیں، آپ سے میں جھوٹ بول نہیں سکتی اور جب تک آپ سے ملاقات کا سلسلہ رہے گا میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔"

"کیوں، مجھ میں کیا خاص بات ہے؟" مہرزاد چونکا۔

"آپ......" وہ کہتے کہتے رکی اور ہنس دی۔ "آپ کو میں نے بتایا تو ہے آپ مختلف ہیں، آپ عام نہیں ہیں بہت خاص ہیں۔ آپ منفرد ہیں۔"

"اچھا......" مہرزاد نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تو ابھی ابھی جو تم نے دعویٰ کیا ہے اس پر پورا اترنا چاہیے تمہیں۔"

"کون سا دعویٰ؟" وہ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"یہی کہ تم مجھ سے جھوٹ نہیں بولو گی۔" مہرزاد نے یاد دلایا۔

"بالکل نہیں بولوں گی، یہ تو طے ہے۔" وہ اسی کامل اعتماد کے ساتھ بولی۔

"پھر یہ بتاؤ کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟" مہرزاد نے ایک مرتبہ پھر پوچھا۔

"بتایا تو ہے کہ مجھے اس کا ٹھیک اندازہ نہیں ہے۔" زرنگار نے کہا۔

"زرنگار......" مہرزاد نے کہا اور توقف کیا۔ "یہ نام تمہاری شخصیت کے ساتھ موزوں نہیں لگتا، تمہارا یہ نام ہونا بھی نہیں چاہیے، مجھے یقین ہے کہ یہ نام اس ماحول اور اس ماحول کے بنانے والوں کا دیا ہوا ہے۔ کیا ہم تمہاری کھوج میں جا سکتے ہیں زرنگار۔ کیا ہم تمہاری تاریخ میں سے تمہارے اصل کو لوکیٹ کر سکتے ہیں؟"

"تو آپ اس لیے آئے ہیں۔" زرنگار نے فوراً اندازہ لگایا۔

"حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے کسی بھی بات سے فرق نہیں پڑتا، تمہارا پس منظر کیا ہے یا اب تم کس پیش منظر میں موجود ہو۔ مجھے کسی بھی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ تمہیں پرکھنے اور سمجھنے کے لیے میرے پیمانے مختلف ہیں مگر میں یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ تم یہاں کیسے؟" مہرزاد نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"جاننے کی خواہش۔" زرنگار ہولے سے ہنسی۔ اس کے لہجے میں طنز تھا، استہزا تھا یا شاید پھر کچھ بھی نہیں تھا۔ "خواہش بھی ہے اور فرق بھی نہیں پڑتا۔"

"ہاں خواہش بھی ہے اور فرق بھی نہیں پڑتا۔" مہرزاد نے اس کے لہجے اور ہنسی سے متاثر ہوئے بغیر کہا۔ "تمہارا یہاں ہونا ایک بھیانک حقیقت ہے مگر مجھے اس بھیانک حقیقت کا سامنا کرنے سے بھی خوف نہیں آتا۔ جاننے کی خواہش اس لیے ہے کہ وہ چہرے دیکھنا چاہتا ہوں جنہوں نے ایک خوش رنگ پھول کو کیکر کے جنگل میں لا سجایا ہے۔ یاد رکھنا کیکر کا جنگل ہو یا خوش رنگ، خوش نما باغ، پھول پھول ہی رہتا ہے نہ اس کا نام کوئی بدل سکتا ہے نہ اس کی خوب صورتی چھین سکتا ہے، یہ ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔"

"یہ خوش کن باتیں دل کو بھایا کرتی ہوں گی کبھی مگر اب دل ہر حقیقت سے آگاہ ہے نہ کیچڑ میں کھلنے والے پھول والی بات بھاتی ہے نہ کیکر کے جنگل میں سجے پھول کی بات اچھی لگتی ہے، کون ہے جو کیچڑ اور کیکر کے جنگل میں سجے پھول تک رسائی چاہتا ہے۔ کون ہے جو کیچڑ میں لت پت ہونا یا کیکر میں الجھ کر خود کو زخمی کرنا چاہے گا۔ کتابی باتیں کتابوں میں چھپے حرفوں کو پڑھتے ہوئے ہی اچھی لگتی ہیں، عملی زندگی بہت مختلف ہے، کیچڑ میں اُگے اور کیکر میں الجھے پھول کو دیکھ کر تعریف تو ہر کوئی کر سکتا ہے اس کی خوب صورتی سے آنکھوں کی پیاس بھی بجھائی جا سکتی ہے مگر ان تک رسائی کوئی بھی نہیں چاہتا، کون چاہے گا ایسا؟" اس نے سوالیہ نظروں سے

مہرزاد کی طرف دیکھا۔

''میں......'' وہ بے اختیار بولا اور پھر ہنس دیا۔ ''سچ بتاؤں، مجھے یہ دعویٰ کرتے ہوئے عجیب سا لگ رہا ہے، زندگی دعوؤں کے ساتھ نہیں عمل کے ساتھ بجتی ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ میرے جیسے شخص کی اس جگہ پر آمد کا مقصد صرف اس پھول کی خوش نمائی سے آنکھوں کی پیاس بجھانا نہیں ہے۔ مجھے اس پھول تک رسائی مقصود ہے جب ہی تو بار بار یہ سوال کر رہا ہوں کہ کیا تم جانتی ہو میں یہاں کیوں آیا ہوں؟''

''کہانیاں کہنے اور کہانیاں سننے۔'' زرنگار نے اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی میں پڑی قیمتی انگوٹھی کو گھماتے ہوئے کہا۔

''حقیقت سننے......'' مہرزاد نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''حقیقت سنانے کا وقت بعد میں آئے گا اور میں وعدہ کرتا ہوں، وہ میں تمہیں ضرور سناؤں گا۔''

''یہ حقیقت الف لیلہ کی کہانیوں کی طرح طویل بھی ہو سکتی ہے لیکن میں شہرزاد نہیں ہوں۔'' زرنگار کے جملے نے مہرزاد کو چونکا دیا۔

''میں بھی بادشاہِ وقت نہیں ہوں۔'' وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اگر تم مجھے سناؤ تو یقین جانو میں اسے اپنی عزت افزائی سمجھوں گا۔''

''آپ نے ایک رات کی قیمت ادا کر رکھی ہے، یہ رات بہت قیمتی ہے مگر کم ہے۔'' زرنگار نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''میں ایسی ایک ہزار راتوں کی قیمت ادا کرنے پر تیار ہوں اگر تم مجھے حقیقت سنانے پر تیار ہو جاؤ، ایک ہزار راتوں کی قیمت ادا کر دینے سے اگر تمہاری زندگی میں رات کی غلامی سے آزادی کی صورتِ حال پیدا ہو جائے تو مجھے اور کیا چاہیے۔'' زرنگار نے محسوس کیا مہرزاد خان کا لہجہ بوجھل ہو رہا تھا، زندگی کی ایک خوب صورت حقیقت اس کے اختیار میں تھی مگر وہ اجتناب برت رہا تھا۔ وہ ایسی باتیں کر رہا تھا جو یہاں آنے والا کوئی بھی دوسرا شخص نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا اندازہ بلکہ یقین سو فیصد درست تھا۔ مہرزاد خان دوسروں سے مختلف اور منفرد تھا...... زرنگار کو اپنے اندازے کی صداقت پر یقین کامل ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

زوئی حسین کی زندگی کے انداز میں انتہا سے زیادہ یکسانیت تھی، وہ ایک سی روٹین پر لگی بندھی زندگی گزارنے کی عادی تھی۔ اس کا دن صبح سات بجے شروع ہوتا تھا، وہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتی تھی جس کی صفائی ستھرائی وہ خود کرتی تھی۔ صبح وہ اپنے لیے ناشتا، اپنے ساتھ لے جانے کے لیے کچھ اسنیکس جو وہ دوپہر میں کھانے کے وقفے کے دوران کھاتی تھی اور رات کا کھانا سب اکٹھا ہی بناتی تھی۔ اس کے چھوٹے سے کچن میں دو برنر کا ایک چولھا تھا جس پر وہ ناشتا اور رات کا کھانا تیار کرتی، اسنیکس کے لیے وہ بجلی کے جدید آلات استعمال کرتی تھی، چھوٹے سے فلیٹ کی صفائی میں اسے زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔ سب کاموں سے فارغ ہو کر وہ ٹھیک آٹھ بجے نیچے اتر کر اسٹاپ پر پہنچ جاتی جہاں اس کے دوا ساز ادارے کی بس اسے لینے کے لیے ٹھیک آٹھ بج کر پانچ منٹ پر پہنچ جاتی تھی۔ وہ سارا دن ادارے کی لیبارٹری میں گزارتی تھی۔ اس کا تعلق ریسرچ کے شعبے سے تھا۔ لیبارٹری کے اندر کا مخصوص ماحول اور بُو اس کے دماغ میں رچ بس گئی تھی۔ لیبارٹری کے اس شعبے سے منسلک رہنا اس ملک میں اس کی رہائش کے دن بڑھانے کا سب سے اہم ذریعہ تھا۔ اس لیے

اس ماحول اور اس بُو سے تنگ نہیں پڑی تھی۔ اس کے کام کے اوقاتِ کار طویل تھے وہ شام پانچ بجے فارغ ہوتی تھی اور ادارے کی بس پر بیٹھتے بیٹھتے تقریباً چھ بج جاتے تھے۔ شہر بھر میں اس وقت برقی قمقمے جگمگا رہے ہوتے جب زوئی حسین واپس گھر پہنچتی تھی، اس وقت تک اس کا دماغ اور جسم تھک چکے ہوتے تھے مگر اس کا تعلق شدید محنت کی عادی قوم سے تھا اس لیے یہ تھکن اسے بہت زیادہ محسوس نہیں ہوتی تھی۔ گھر واپس آنے کے بعد بھی وہ زیادہ تر تنہا رہتی تھی۔ اس کا میل ملاپ کم ہی لوگوں سے تھا جس علاقے میں وہ رہتی تھی وہ لوئر مڈل کلاس لوگوں کا علاقہ تھا اس کے اوپر نیچے دائیں بائیں فلیٹس میں ایسی گھریلو خواتین رہتی تھیں جو زوئی کے بارے میں شدید تحفظات رکھتی تھیں اور اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں بناتی تھیں۔

''یہ لوگ سانپ، مینڈک اور چھپکلی تک کھا لیتے ہیں، یہ لڑکی بھی یقیناً ایسی ہی چیزیں کھاتی ہے جب ہی اس کے کچن سے عجیب و غریب قسم کی بو آتی ہے۔'' زوئی کو معلوم تھا کہ یہ بات تو اس کے بارے میں شدومد سے کی جاتی تھی۔

''کاکروچ اور چوہے بھی پکاتی ہے۔ میرے بچوں نے خود دیکھا ہے کچن کی کھڑکی میں سے جھانک کر۔'' مسز امتیاز تو یہ بات بہت وثوق سے کہتی تھیں۔

''جانے کوئی دین مذہب بھی ہے اس کا کہ نہیں، سنا ہے ان چینیوں کا کوئی دین مذہب نہیں ہوتا، یہ کسی خدا کو نہیں مانتے، توبہ استغفار۔ اس بلڈنگ میں ضرور ایک فلیٹ اس چینی لڑکی کو دینا تھا ان لوگوں سے سارا ماحول خراب ہو سکتا ہے۔'' بوڑھی مسز ستار کہا کرتی تھیں۔

ایک اکیلی زوئی حسین پورا ماحول کیسے خراب کر سکتی تھی، یہ کبھی کوئی نہیں بتاتا تھا۔ وہ بھی ان حالات میں جب وہ صبح کی گئی شام گئے گھر لوٹتی تھی اور اپنے کام سے کام رکھتی تھی۔ زوئی کو ان باتوں سے تکلیف ہوتی تھی، اسے اپنے بارے میں چہ مگوئیاں کیے جانے پر افسوس بھی ہوتا تھا مگر وہ اس معاشرے کی عمومی سوچ اور گفتگو سے بہت اچھی طرح واقف ہو چکی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ چہ مگوئیاں کرنا فارغ البال عورت کی فطرت تھی، خواہ وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں رہتی ہوں اس لیے وہ ان خواتین کی باتیں بہت زیادہ محسوس نہیں کرتی تھی البتہ جس بات پر اسے سب سے زیادہ دکھ ہوتا تھا وہ یہ بات کیے جانا تھا کہ وہ لادین تھی، اگرچہ وہ خود بھی بہت اچھی طرح نہیں جانتی تھی کہ وہ مذہبی لحاظ سے کس جگہ کھڑی تھی مگر اسے اپنی ماں اور باپ دونوں کے مذاہب سے پیار تھا۔ اس کی ماں خالص چینی عورت تھی اور بدھ مذہب کو ماننے والی تھی اگرچہ اس کے نانا نانی تاؤازم کے پیروکار تھے اور اس کا باپ مسلمان تھا اگرچہ اس کے باپ نے تمام عمر چین میں گزاری مگر وہ بھی خود زوئی کی طرح مخلوط النسل تھے۔ زوئی کے دادا چینی النسل تھے اور دادی پاکستانی مسلم۔ زوئی کے دادا بھی مسلمان تھے، زوئی اس بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے دادا اور دادی کی شادی کا محرک کیا تھا مگر اسے ان دونوں سے شدید پیار تھا اور اپنی دادی سے محبت کی وجہ سے ہی اس نے فارمیسی پڑھنے کے لیے پاکستان کا انتخاب کیا تھا۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ ڈگری کے حصول تک کا دورانیہ پاکستان میں گزارتے، گزارتے اسے کس طرح اس ملک اور یہاں کے لوگوں سے اتنا پیار ہو گیا تھا کہ ڈگری کے حصول کے بعد اس کا واپس جانے کو ایک فیصد بھی دل نہیں مانتا تھا۔ یہ بہت مشکل وقت تھا۔ اس کے اسٹوڈنٹ ویزے کی مدت ختم ہو رہی تھی اور اسے واپس جانا تھا جبکہ وہ کسی صورت بھی خود کو واپسی پر آمادہ نہیں پاتی تھی۔ اس کی اسی خواہش کو دیکھتے ہوئے اس کے ایک استاد نے اسے ریسرچ سے منسلک ہو جانے کا مشورہ دیا۔ ریسرچ سے وابستگی کے حصول کے لیے اسے کئی ایک دوا ساز کمپنیوں کے پیچھے خوار ہونا پڑا تھا اور اس کے مطلوبہ کاغذات ملنے تک اس کے ویزے کی مدت

بڑھائے جانے کے باوجود ختم ہو چکی تھی مگر اسے خوشی تھی کہ ریسرچ سے منسلک ہو جانے کی وجہ سے اس کا ویزے پر ریسرچ کے اختتام تک قیام کا اجازت نامہ ثبت ہو چکا تھا۔ زوئی کو یہاں رہنے سے بہت سکون ملتا تھا۔ وہ ان فضاؤں اور ہواؤں سے مانوس ہو چکی تھی۔ وہ اس زمین کی محبت میں اتنی بری طرح گرفتار تھی کہ اسے یہاں کے لوگوں کے رویے اور ادر مزاج سے بھی اُنس ہونے لگا تھا۔ یہاں رہتے ہوئے اسے اس وطن کی یاد بہت کم ستاتی تھی جہاں اس نے زندگی کے اٹھارہ سال گزارے تھے۔ وہ یہیں بس جانے کے خواب دیکھ رہی تھی اور اس کی اس خواہش پر اس کے دوست اور ساتھ کام کرنے والے حیران ہوتے تھے۔

"یہاں کے لوگ اِدھر سے باہر فرسٹ ورلڈ کے کسی ملک میں جانے کو بے چین رہتے ہیں زوئی..... عجیب لڑکی ہو جس کو اپنا اتنا اچھا، صاف ستھرا، پُرسکون ملک یاد نہیں آتا اور تم یہاں رہ جانا چاہتی ہو۔" ان میں سے اکثر کہتے تھے۔

زوئی کو خود بھی سمجھ نہیں آتا تھا کہ ایسا کیوں تھا، کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ بچپن سے لے کر اس وقت تک کی زندگی جب وہ یہاں آئی تھی کی جامد خاموشی اور مشین جیسی رفتار نے اس کا دل اچاٹ کر ڈالا تھا۔ کبھی اسے خیال آتا کہ اس کی ماں کی شخصیت میں جو گہما گہمی، ملنساری، محبت اور رچاؤ تھا اس کے اَسرار کو کھوجنے کے لیے وہ یہاں آئی اور پھر یہاں ہی رہ گئی یا پھر شاید اس ملک کی ثقافت کی رنگا رنگ اور نت نئی جہتوں نے اس کے پاؤں باندھ لیے تھے۔ جو بھی تھا ٹھیک سے سمجھ میں نہ آنے کے باوجود ایک حقیقت یہ تھی کہ زوئی حسین جس کا شکل، صورت، تاریخ اور ثقافت بالکل مختلف تھی پاکستانی ماحول کے عشق میں گرفتار ہو چکی تھی۔

☆☆☆

"اگر تم سمجھتی ہو کہ مجھے بی اماں کی کہی ہر بات کا لحاظ ہے اور میں اسے پورا کرنے کی کوشش اب بھی کرتا ہوں جبکہ وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں تو سمجھ لو کہ اس لڑکی میرال کا تعلق بھی اسی بات سے ہے۔" حمزہ نے کھانا کھاتے ہوئے نگین کی اس بات کا جواب بہت اچانک دیا تھا جو وہ اس سے پچھلے کئی دن سے پوچھ رہی تھی۔

"اس لڑکی میرال کا تعلق بی اماں سے ہے؟" نگین کو پانی پیتے پیتے اُچھو لگ گیا۔

"ہاں بالکل بی اماں سے۔" حمزہ نے آخری نوالہ کھانے کے بعد پلیٹ پرے کھسکاتے ہوئے جواب دیا۔

"وہ کیسے؟" نگین مارے تجسس کے کھانا کھانا بھول گئی۔

"تمہیں یقیناً نہیں مگر ماموں اور ممانی کو ضرور یاد ہوگا کہ بی اماں کی ایک دوست ایبٹ آباد میں رہتی تھیں وہ ان کی دور پار کی عزیز بھی تھیں مگر دوستی کا رشتہ عزیز داری سے زیادہ قریبی تھا، دونوں ایک دوسرے کو خطوط بھی لکھا کرتی تھیں۔ دو مرتبہ وہ خاتون ہمارے ہاں سیالکوٹ آئی بھی تھیں اور کئی مرتبہ بی اماں گرمی کی چھٹیوں میں ان کے پاس جاتی تھیں۔ چند ایک بار مجھے بھی اتفاق ہوا ان کے ساتھ جانے کا۔"

"پھر.....؟" نگین ایک سانس میں ہی ساری کہانی جان لینا چاہتی تھی۔

"پھر یہ کہ مجھے ان دونوں کا آپس کا پیار بہت اچھی طرح یاد تھا، ان خاتون کے گھر کا ماحول اور لوگ بھی میرے ذہن میں تھے۔ وہ بہت خوب صورت خاتون تھیں ان کے حُسن کو عمر کی گریس نے چار چاند لگا رکھے تھے۔ وہ ہمیشہ یاد رہ جانے والی شخصیتوں میں سے ایک تھیں جو رواداری اور مروت بی اماں کی شخصیت کا خاصہ تھی وہ ان کی شخصیت کا بھی حصہ تھی۔ میں ان سے خاصا متاثر تھا۔ بی اماں کے برعکس ان کے ساتھ خاصی بڑی ٹریجڈیز ہو چکی تھیں، ان کے شوہر کا انتقال ہو ہی چکا تھا مگر ایک فضائی حادثے میں ان کا بیٹا اور بہو بھی ان کا

ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ وہ اپنی اکلوتی پوتی کے ساتھ ایبٹ آباد میں رہتی تھیں۔ اس پوتی کی پرورش انہوں نے ہی کی تھی اور میں کبھی بھول نہیں سکتا کہ وہ اتنی کم عمری میں بھی کیسی مہذب اور سمجھدار لڑکی تھی۔"

"حسین بھی ہوگی اپنی دادی کی طرح؟" نگین نے اضافہ کیا۔

"یہ کیسے کہا تم نے؟" حمزہ اس سنجیدہ ترین گفتگو میں پہلی بار مسکرایا۔ "ہو سکتا ہے کہ اس کے والد اور والدہ اتنے حسین نہ ہوں اور وہ ان میں سے کسی ایک پر چلی گئی ہو۔"

"بس میرا اندازہ ہے کہ وہ حسین ہوگی اپنی دادی کی طرح۔" نگین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "یہ اندازہ کیوں ہے پھر کبھی بتاؤں گی۔"

"اچھا....." حمزہ زیرِ لب مسکرایا۔

"چلو تم آگے سناؤ۔" نگین نے برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔

"بی اماں کی وفات کے بعد مجھے ان کی دوست کے بارے میں تقریباً بھول ہی گیا بلکہ اس سے بھی پہلے ان کی زندگی میں بھی وہ آخری دفعہ جب سیالکوٹ آئیں، میرا خیال ہے کہ میں فرسٹ ایئر میں پڑھتا تھا، تمہیں بھی شاید یاد ہوں وہ خاتون جو پائن کونز لائی تھیں اور سفید مکئی کا آٹا اور کھٹا ترین انار دانہ اور ریڈ بلڈ مالٹے جان پور کے۔" حمزہ نے یاد دلایا۔

"اصل میں، میں کوشش تو بہت کر رہی ہوں کہ مجھے ایسی کوئی شخصیت یاد آ جائے لیکن ابھی تک مجھے بالکل یاد نہیں آ رہا کہ وہ کون تھیں۔" نگین نے سادگی سے جواب دیا۔

"ہاں....." حمزہ نے سر ہلا کر کہا۔ "اچھا، شاید تمہیں اس لیے یاد نہ آ رہی ہوں کہ اس آخری آمد پر وہ صرف ایک رات ہی ٹھہری تھیں اور پھر بی اماں کی بیماری کے دوران اور ان کی وفات پر بھی ان کا کوئی اتا پتا نہیں آیا بلکہ شاید کسی نے ان کو اطلاع ہی نہیں دی۔"

"کون دیتا؟" نگین نے کہا۔ "ابو کو ہی دینی چاہیے تھی یا پھر تمہیں لیکن کبھی کبھار ملنے والے ایسے مواقع پر اکثر ذہن سے نکل جاتے ہیں۔"

"اور پھر میں تو بی اماں کے بعد بہت سی باتوں سے غافل ہو گیا۔" حمزہ کے لہجے میں دکھ سا اتر آیا۔ "یاد رہا تو صرف اتنا کہ بی اماں نہیں رہیں۔"

"پھر ان دوست کا خیال کیسے آیا تمہیں؟" نگین کو تجسس کا دورہ دوبارہ سے پڑ گیا۔

"ایبٹ آباد جانے کے اتفاق سے۔" حمزہ نے تھکن سے بھاری ہوتا سر ڈائننگ چیئر کی پشت سے ٹکاتے ہوئے کہا۔ "ایبٹ آباد پہنچتے ہی میرے دماغ میں بی اماں کے ساتھ وہاں تک کا سفر اور ان کی دوست کے ہاں قیام روشن ہو گیا۔ مجھے اس شہر کی فضا میں بسی مخصوص خوشبو سے بہت کچھ یاد آنے لگا۔ تمہیں پتا ہے نگین کہ ہر شہر کی اپنی ایک الگ خوشبو ہوتی ہے، اپنی ایک الگ فضا۔" وہ بات کرتے کرتے کسی اور موضوع کی طرف چلا گیا۔

"ہوں....." نگین نے بے دھیانی سے سنتے ہوئے یونہی سر ہلا دیا۔

"اور وہ خوشبو اور فضا ہمارے ذہنوں میں محفوظ ہو جاتی ہے، خواہ کتنے سالوں بعد ہی کیوں نہ اس شہر میں واپس جاؤ وہ فضا اور خوشبو ذہن کے کسی خانے سے نکل کر فٹ سے حواس میں بس جاتی ہے اور پھر بہت کچھ یاد آنے لگتا ہے۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔" نگین کو اب خیال آیا کہ اس کا اپنا تجربہ بھی ایسا ہی کہتا تھا۔

"خیر....." حمزہ کو اپنی ادھوری چھوڑی بات یاد آ گئی۔ "خیر... میں تمہیں سنا رہا تھا کہ جب میں ایبٹ آباد

پہنچا تو مجھے بہت کچھ یاد آنے لگا۔ رابعہ آنٹی کا گھر، اس کا نقشہ، وہ علاقہ، ان کی باتیں، سب سے بڑھ کر بی اماں۔'' حمزہ نے سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔

'' پھر تم ان سے ملنے چلے گئے۔'' نگین نے متوقع بات کہی۔

'' ہاں، میں جانا چاہتا تھا مگر ان کا ایڈریس بھول گیا تھا، دراصل وہ شہر اتنا بدل گیا ہے کہ سارے راستے اور علاقے گڈمڈ ہوگئے اور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کدھر جاؤں جو وہ مل جائیں مگر نہیں صاحب وہ تو علاقہ جیسے کہیں گم ہوگیا تھا۔ جب میں ڈھونڈ، ڈھونڈ کر مایوس ہوگیا تو یونہی گھومتے گھماتے ایک دیکھے دیکھے علاقے میں ایک گھر سے پتا کرنے پر ان کا سراغ مل ہی گیا۔''

'' وہ تو بہت خوش ہوئی ہوں گی تمہیں دیکھ کر۔'' نگین اس سراغ مل جانے والی بات سن کر خوش ہوگئی۔

'' نہیں، وہ وہاں نہیں تھیں۔'' حمزہ نے بجھی آواز میں کہا۔

'' ارے.....'' نگین نے غور سے اسے دیکھا۔ '' وہ کہیں اور شفٹ ہوگئیں کیا؟''

'' ہاں.....'' حمزہ نے مختصر جواب دیا۔

'' کہاں.....؟''

'' اس دنیا سے عالم بالا میں۔'' حمزہ نے ایک اور مختصر جواب دیا۔

'' ارے.....'' نگین کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ '' تمہارا مطلب ہے کہ.....''

'' ہاں.....'' حمزہ نے سر ہلایا۔

'' اوہ..... بہت افسوس ہوا۔'' نگین نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا اور کچھ دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی۔

'' یہ ایک متوقع سی بات ہونی چاہیے تھی۔ بی اماں جا سکتی ہیں تو وہ بھی تو تقریباً ان کی ہم عمر ہی ہوں گی۔'' نگین نے خاموشی کو توڑنے کے لیے کہا۔

'' مجھے علم ہوا کہ وہ وفات سے کچھ عرصہ قبل ایبٹ آباد سے بالاکوٹ شفٹ کر گئی تھیں۔ میں نے ان کے بارے میں بتانے والی لڑکی سے ان کی پوتی کے بارے میں پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کر دیا۔''

'' اچھا.....'' نگین نے اچھا کو لمبا کرتے ہوئے کہا۔ '' تو تم اس لیے بالاکوٹ گئے تھے۔ ان لوگوں کے بارے میں معلوم کرنے بلکہ پوتی کے بارے میں معلوم کرنے۔''

'' معلوم کرنے نہیں بلکہ اس سے تعزیت کرنے اور یہ بتانے کہ میں بی اماں کا پوتا ہوں اور اگر بی اماں زندہ ہوتیں تو وہ بھی ضرور اس کے پاس افسوس کرنے کے لیے اور اسے یہ بتانے کے لیے کہ عزیز رشتے دار نام پر وہ اس کے لیے موجود ہیں، پہنچتیں۔'' حمزہ نے تصحیح کی۔

'' اوہ ہاں.....'' نگین نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔ '' یہ تم نے اچھا کیا..... بہت اچھا کیا۔ بی اماں ہوتیں تو ضرور ایسا ہی کرتیں۔''

'' میں وہاں ایسا ہی کرنے کے لیے گیا تھا مگر میں وہاں پہنچا تو وہ مجھے وہاں نہیں ملی۔'' حمزہ نے بتایا۔

'' ارے..... وہ کہاں گئی؟'' نگین نے چونکتے ہوئے کہا۔

'' اس کے ارد گرد رہنے والے لوگوں نے بتایا کہ رابعہ بانو کا انتقال اس تباہ کن زلزلے کے نتیجے میں ہوا جس نے اس پورے علاقے کو موت کی وادی بنا دیا تھا۔ ان کی پوتی میرال زلزلہ زدگان کے لیے لگائے گئے عارضی امدادی کیمپوں میں سے ایک میں زخمی حالت میں موجود تھی لیکن ایک رات وہ اچانک وہاں سے غائب ہوگئی۔ اس کا کچھ اتا پتا نہیں معلوم تھا وہاں کے لوگوں کو۔'' حمزہ کی آواز بات کرتے کرتے بھاری ہوگئی۔

'' اوہ میرے خدا.....'' نگین کو جیسے سخت شاک لگا۔

'' پتا نہیں کیوں نگین مگر یہ صورت حال جان کر میں ایک عجیب سے دکھ، عجیب سی پریشانی میں مبتلا ہوگیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ سب میرے کسی بہت ہی اپنے کے ساتھ ہوا ہو۔ مجھے یاد آیا کہ رابعہ بانو بی اماں سے کہا کرتی تھیں کہ ان کا اور ان کی پوتی کا خدا کے بعد ایک دوسرے کے علاوہ کوئی نہیں یا پھر بی اماں تھیں جو ان سے ملا کرتی تھیں عزیز، رشتے دار اپنی اپنی زندگیوں میں مست اور دوست احباب بہت ہی کم..... پھر تم سوچو کہ اس تباہ کن قیامت جیسی صورت حال میں کون تھا جو اس لڑکی کے سر پر موجود تھا۔ تم ذرا اندازہ لگانے کی کوشش کرو کہ اس لڑکی پر کیسی قیامت ٹوٹی ہوگی۔ اس قیامت خیز منظر کو دیکھنا۔ اس کا شکار ہونا، دنیا میں اپنا واحد رشتہ کھو دینا اور پھر اجنبی مددگاروں کے درمیان زخمی حالت میں موجود ہونا ہی ایک ایسا عذاب ہوگا جس کا تصور کرنا مشکل ہے پھر نہ جانے اس کے ساتھ کیا نا گہانی ہوئی کہ وہ وہاں سے غائب ہوگئی۔'' حمزہ کہتے کہتے چپ ہوگیا۔ اس کے چہرے پر کرب تھا۔

'' تم سوچ نہیں سکتیں کہ بالاکوٹ میں قیام کے دوران مجھے اس زلزلے کے دوران اور بعد کی کیسی کیسی کہانیاں سننے کو ملیں۔ سننے اور دیکھنے میں بہت فرق ہے۔ کیا کیا ہوا اور کس کس کے ساتھ ہوا بتانا مشکل ہے۔ میں نے سب سنا مگر اس سننے کے دوران جس بات پر میرا دل اور میرا دماغ اٹک کر رہ گیا وہ میرال کا وہاں سے غائب ہو جانا تھا۔ میں نے وہاں ہر اس شخص سے ملاقات کی جو میرال اور رابعہ بانو کو تھوڑا بہت جانتا تھا۔ ان میں ایک خاتون ایسی بھی تھیں جنہوں نے بتایا کہ گزشتہ سال انہوں نے میرال کی شکل کی ایک لڑکی کو مسلم ٹاؤن کے ایک گھر میں دیکھا تھا، ان کے بقول وہ گھر ان کی بہن کی کسی دوست کی ماں کا تھا، وہ وہاں کسی کی عیادت کرنے گئی تھیں۔ میرال پہچان لیے جانے پر اس منظر سے غائب ہوگئی، ان خاتون کے دریافت کرنے پر گھر والوں نے بتایا کہ وہ ان کی بیٹی کی دوست تھی۔ یہ وہی گھر ہے جس کا پتا میں نے اشعر بھائی کو دیا تھا۔ مجھے اس خبر نے اس شاک میں مبتلا کر دیا۔ جس سے نکلنا مشکل تھا مگر میں اتنی جلدی اس کے بارے میں معلوم کر لینا چاہتا تھا کہ خود یہاں آنے کا انتظار بھی نہیں کر سکا اور اشعر بھائی کو فون پر ہی کہہ دیا۔ میں پوری سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہا ہوں نگین کہ مجھے اس لڑکی کو ہر حال میں تلاش کرنا ہے۔ شاید اس تباہ کن واقعے کے نتائج نے ایسی کئی کہانیوں کو جنم دیا ہو۔ میں یا تم ہر جگہ ہر ایک کی کھوج میں نہیں جا سکتے مگر یہ معاملہ کچھ اور ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے بی اماں کے حوالے سے یہ ہمارا فرض بنتا ہے کہ اس لڑکی کی کھوج لگائیں۔ خدا نہ کرے کہ وہ وا ہے جو یہ ساری بات سن کر کسی بھی ذی عقل کے ذہن میں آ سکتے ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی اس کے سلسلے میں درست ثابت ہو..... مگر اس کا پتا لگانا بہت ضروری ہے۔ وہ ایک انتہائی شریف اور باعزت فیملی کی بیٹی ہے اور وہ خود بھی یقیناً بہت مہذب اور ڈیسنٹ لڑکی ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرا ایبٹ آباد جانا اور اس کے متعلق دریافت کرنا اور اس واقعے کی خبر تک پہنچنا اسی لیے ہوا کہ اس لڑکی جس کی تلاش اور حالات سے کسی ایک شخص کو بھی دلچسپی نہیں تھی کے لیے کوئی تو ہو جو پریشان ہو، شاید ہماری تلاش اس کے کسی کام آ جائے۔''

'' حمزہ ایک بات پوچھوں؟'' نگین نے اس کے جذبات کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

'' ایسی کوئی بات نہیں ہے نگین۔'' وہ جیسے بن سنے ہی سمجھ گیا۔ '' میرا اس لڑکی سے کوئی ایسا قلبی تعلق نہیں ہے۔ میں تو ان لوگوں کو بالکل ہی بھلا چکا تھا اور بھولا ہی رہتا اگر ایبٹ آباد نہ جاتا۔ مجھے تو شاید ڈھنگ سے

اس لڑکی کی شکل بھی یاد نہیں مگر اس کا یوں بے آسرا ہونا مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔ ایسا تو ہم کسی بھی انسان کے لیے محسوس کر سکتے ہیں ناں اور اگر تم اس علاقے میں جا کر ابھی اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی ان لوگوں کے حالات دیکھو تو یقیناً سوچو گی کہ ان میں سے جتنے لوگوں کی مدد کر سکتی ہو ضرور کرو...... پھر یہ تو ایک ایسی لڑکی ہے جو بی اماں کے تعلق کے حوالے سے ہمیں عزیز ہونی چاہیے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو حمزہ۔'' نگین نے آہستہ آواز میں کہا اور برتن سمیٹنے لگی۔ اس کے دل پر اچانک ہی ایک عجیب سی اداسی چھا گئی تھی۔ میرال نامی اس لڑکی پر سے گزرنے والے حالات کا اثر بھی تھا اور زلزلے کا شکار ہونے والے باقی لوگوں کا دکھ بھی نئے سرے سے جاگ گیا تھا۔ اسے حمزہ کی انسانیت پسندی کا بھی احساس ہو رہا تھا۔ حمزہ ہو بہو بی اماں کی تربیت کا پرتو تھا۔ وہ بھی جہاں کسی کو تکلیف میں دیکھتی تھیں، غمزدہ ہو جاتی تھیں اور فوراً مدد کو تیار بھی۔ کئی ایسی خواتین بھی اس نے ان کے پاس مالی طلب کو آتے دیکھی تھیں جن کے چہروں سے خود بی اماں بھی شناسا نہیں ہوتی تھیں۔ اِدھر اُدھر سے ان کی سخاوت اور نیک دلی کی خبر سن کر ہی اُدھر آ جاتی تھیں اور بی اماں چپکے سے ان کی توفیق بھر امداد کرنے کے بعد کسی کے استفسار کرنے پر بتاتی تھیں۔

''وسیلہ انسان خود نہیں بنتا، اسے خدا وسیلہ بناتا ہے اب اگر خدا بنا دے تو کیا ناشکری کر دوں اس کی مہربانی کی، شکر ہے اس نے کسی کی ضرورت پوری کروانے کے لیے میرا انتخاب کیا، یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ کام کسی اور کو سونپ دیتا اور میں سوتی رہ جاتی۔''

''اوکے...... پھر میں چلتا ہوں، اشعر بھائی تو نہ جانے کب پہنچیں۔'' کچھ دیر بعد نگین کے کان میں حمزہ کی آواز آئی وہ اس کی ساس کو سلام کرنے کے بعد اسے خدا حافظ کہنے آیا تھا۔

''حمزہ۔'' نگین نے اسے خدا حافظ کہنے سے پہلے کہا تھا۔ ''ہم میرال کو ضرور ڈھونڈیں گے۔ اگر دنیا میں ہوئی تو ضرور ملے گی۔''

''ہم۔'' حمزہ نے دُہرایا اور مسکرایا۔ ''اچھا، ہاں ضرور۔'' وہ مسکرا رہا تھا جیسے اسے وہ سراہٹ مل گئی ہو۔ ''اچھا خدا حافظ۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔'' نگین جیسے مطمئن ہو گئی۔

☆☆☆

اسے اس گھر کے کسی بھی کام میں دلچسپی محسوس نہیں ہوتی تھی اور بوا جی اسے ہر کام میں طاق کر دینا چاہتی تھیں۔ کھانا پکانا، کپڑے سینا، کپڑے دھونا، صفائی ستھرائی، کپڑوں کو استری کرنا، بستر بنانا، یہاں تک کہ چارپائیاں بُننا بھی وہ اس کو سکھا چکی تھیں اور وہ اپنے مزاج اور طبیعت کے عین خلاف یہ سب کچھ سیکھ بھی چکی تھی مگر اس کی زندگی ایک مسلسل جھنجلاہٹ بن چکی تھی۔ جب بھی وہ تنہا ہوتی اسے اپنی محرومیوں پر کُڑھنے اور جلنے کا نادر موقع مل جاتا۔ وہ رہ رہ کر اپنے مرے ہوئے ماں باپ کو یاد کرتی جو اگر زندہ ہوتے تو نہ جانے وہ کس ریاست کی شہزادی ہوتی۔

''ہم اکثر زندگی کی حقیقتوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے اپنی محرومیوں کی گنتی میں پناہ لینے لگتے ہیں۔ جیسے وہ محرومیاں نہ ہوتیں تو ہماری ٹوپیوں میں کئی طرح کے پر لگے ہوتے۔ ایسا کرتے ہوئے ہم یہ نہیں سوچتے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ اگر یہ محرومیاں نہ ہوتیں تو ہم کسی اور بہت بڑی مصیبت میں پھنسے ہوتے، دراصل ہمیں کسی بھی حالت میں خوش رہنا آتا ہی نہیں ہے۔'' اس کی پسندیدہ ترین استاد مسز اعجاز نے اسے ایک بار سمجھایا تھا

مگر اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینے کے باوجود اسے تنہا رہ کر اپنی محرومیوں پر کُڑھنا بہت اچھا لگتا تھا۔

''کیا ہے خود تو آرام سے دنیا سے منہ موڑ کر آرام سے خاک کی چادر اوڑھ کر سو گئیں اور میرے لیے عمر بھر کی مصیبتیں جھیلنا چھوڑ گئیں۔'' وہ اس کھلے میدان میں موجود بے شمار قبروں میں سے ایک قبر کا تصور کرتے ہوئے سوچتی، وہ قبر اس کی ماں کی قبر تھی۔ ''کیا تھا جو مجھے بھی ساتھ لے جاتیں۔'' پھر اسے ایک اور نیا خیال آتا۔ ''اور آپ!'' وہ اپنے باپ کی قبر کو یاد کرتی۔ ''اپنے پیچھے چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر مر جانا کہاں کی بہادری ہے، مزہ تو جب آتا جو زندگی کا سامنا کرتے۔'' بوا جی نے اسے بتایا تھا کہ اس کے ماں باپ کی آپس میں کبھی نہیں بنی تھی، وہ ہر معاملے میں ایک دوسرے کی ضد تھے اور زندگی میں کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جسے کبھی انہوں نے افہام و تفہیم سے حل کیا ہو، ان کی ہر بات بحث بن جاتی تھی اور بحث جھگڑے پر منتج ہوتی تھی۔

''کیا ہی اچھا ہوتا جو ایسے میاں بیوی جن کی آپس میں نہ بنتی ہو بچے پیدا کرنے کی غلطی نہ کیا کریں۔'' ایسی باتیں سن کر وہ اکثر یہ بھی سوچتی تھی۔ مگر پھر اسے ابراہم لنکن یاد آ جاتا تھا جو کہتا تھا کہ ''سنا ہے بلیاں اور بلے آپس میں بہت لڑتے ہیں مگر دنیا میں بلی کے بچوں کی تعداد حیران کن حد تک زیادہ ہے۔'' ''انسان بھی بالکل بلی کا سا مزاج رکھتے ہیں۔'' وہ سوچتی۔ ''آپس میں جتنا مرضی لڑتے رہیں بچے بے شمار پیدا کرتے ہیں۔'' اسے اس حقیقت کو یاد کر کے اور بھی غصہ آتا۔

''مگر تمہارے ماں باپ نے تو کوئی بڑی حماقت نہیں کی، ان کی شادی کے چار سال بعد تم پیدا ہوئیں اور تمہاری پیدائش کے ٹھیک تین سال بعد تمہاری اماں زندگی سے سمجھوتا نہ کر سکنے کی وجہ سے برین ہیمبرج کا شکار ہو گئیں۔'' بوا جی اسے سکون سے سمجھاتیں۔

''اور اگرچہ زندگی میں ان کی آپس میں کبھی نہیں بنی مگر ان کے مرنے کے صرف دو سال بعد ہی ابا جان بھی حادثے میں جان گنوا بیٹھے۔ اب کیا پتا وہاں آگے بھی سکون سے بیٹھے ہیں کہ وہاں بھی بحث اور جھگڑے میں پڑے ہیں۔''

''وہ تو مزے میں ہوں گے، مصیبت تو میرے لیے ہے۔'' وہ کُڑھنے کے دوران میں سوچتی۔ ''بوا جی کی خوشامد کرتے کرتے زبان تھکنے لگتی ہے اور کرنی اس لیے پڑتی ہے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے، اپنی بقا کے لیے ان کے سہارے کی سخت ضرورت ہے اور سہارا خوشامد کے جواب میں ہی مل سکتا ہے۔'' حالانکہ ایسا ہرگز نہ تھا۔ بوا جی کی ساری محبت اور ساری توجہ اس کے لیے تھی۔ مگر وہ ان کامپلیکسز کا کچھ کر نہیں سکتی تھی جو بچپن سے ہی اس کی زندگی کا حصہ بن کر رہ گئے تھے۔ اسے اپنے ساتھ کے بچوں کے والدین کو دیکھ کر اور بھی رونا آتا۔

''اللہ میاں کو دیکھو۔ پچیس بچوں کی اس کلاس میں سے صرف میرے والدین کو ہی لے جانا تھا اور وہ بھی دونوں کو۔'' وہ سوچتی۔ ''اگر وہ ہوتے تو پیرنٹس ٹیچرز میٹنگ میں موجود ہوتے جیسے ان سب کے والدین موجود ہیں۔'' وہ اسکول میں آنے والے والدین کو دیکھ کر سوچتی۔ ''کیسا ایک، ایک نمبر پر لڑتے ہیں یہ ٹیچرز سے ایک بوا جی ہیں جو آرام سے کہہ دیتی ہیں جتنی تم نے محنت کی اتنا پھل کھایا، استاد کبھی کسی کا حق نہیں مارتے۔'' جو بھی ہو یہ گریس مال باپ کا سا دل تو کبھی نہیں لا سکتیں۔ اپنے اندر۔'' وہ خود کو مطمئن کرتی اور مزید چڑ جاتی سچ تو یہ تھا کہ ناپسندیدہ کام سے گھبرا کر وہ ماں باپ سے محرومی کے ماتم میں پناہ لینے کی عادی ہو چکی تھی۔

''اور یہ دیکھو یہ بھی کوئی کام ہے جو یہ مجھ سے کروا رہی ہیں۔'' دھوپ میں سوکھنے کے لیے رکھی سرخ مرچوں کی ڈنڈیاں توڑتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔ ''اچھی بھلی بازار میں پسی ہوئی مرچوں کے پیکٹ مل جاتے ہیں مگر ان کا ہر کام نرالا اور مشقت طلب ہی ہوتا ہے۔''

تم بن ہے گھر ویران میرا

گھر بھر میں تھی برکتیں تم سے ماں، وہ گھر جو ایک شفیق ماں سے محروم ہو گیا

ہوش سنبھالا تو ایک ایسی شفیق ہستی کو اپنے گرد پایا جس کے رویتے نے پیار اور محبت سے آشنا کیا۔ ہستی جو ہمیں ہر پل مضبوطی کا احساس دلاتی تھی ان کے ہونے سے کوئی بھی پریشانی یا غم پاس نہیں پھٹکتا تھا۔ ہماری چھوٹی چھوٹی سی خواہشوں اور ہماری ضرورتوں کے حصول میں دن رات ایک کر دیتیں۔ وہ تھیں میری جان ہستی، میری ماں جس کی چھاؤں ہمیں غموں کی دھوپ سے بچائے رکھتی تھی، اب وہ ہم میں نہیں۔ وہ سب بہن بھائیوں کی چاہت تھیں۔ اتنی ہی خوش اخلاق، باہمت خاتون صرف اپنے کام سے مطلب رکھتی تھیں۔ ان کا پیار ہی ہم بہن بھائیوں کے لیے مثالی تھا شاید بیان نہ کر سکوں خود تو وہ اس دنیا میں ہی ساری تکلیفیں جھیل گئیں، وہ تکلیفیں دو ڈھائی مہینے کیسے جھیل گئیں وہ ان کا گرنا بیڈ سور ہونا ہی ان کا ناسور بن گیا وہ ان کی نظریں جو کبھی نہیں بھول پاؤں گی وہ کچھ کہنا بھی چاہتی تھیں تو ان کی آواز نے ان کا ساتھ نہیں دیا، ہم پوچھتے بھی کہ کیا تکلیف ہے تو صرف رو دیتی تھیں۔ حسرت بھری نظریں دل دہلا دیتیں۔ جب ہم سے کوئی بچھڑ جاتا ہے تو وہ رات چاہے سردی کی ہو چاہے گرمی کی لو جسم کے آر پار ہو جاتی ہے۔ رب نے یہ کائنات اور اس کا تمام حسن ان ہی رشتوں سے بچا رکھا ہے جب یہ رشتے نہ ہوں تو موسموں کی بے رونقی اور روکھے پن کا احساس زیادہ دلاتی ہے۔ یہ موسم پہلے بھی آتے تھے مگر ہمارے والدین کے سنگ یہ بہت خوب صورت ہو جاتے تھے۔ آج یہ بدمزہ سی وجہ سے ہیں کہ ان کی یادوں کی ہوک سے لمحے غمگین ہوئے جاتے ہیں اور آنکھیں پُرنم رہتی ہیں۔ وہ منظر کبھی نہ بھولنے والا دھندلا سا گیا ہے، وقت کی چاپ سنائی نہیں دیتی اتنی خاموشی چھائی ہے۔ سات مہینے بیت گئے ماں سے بچھڑے لگتا ہے کہ ابھی دروازہ کھلے گا اور وہ ہنستی مسکراتی سب کو آواز دیتی داخل ہوں گی۔ وہ آخری وقت کافی تکلیف میں ان کا گزرا تھا مگر ہمارے چہرے دیکھتے ہی ان میں حوصلہ پیدا ہو جاتا۔ ہر شخص ہر انسان نے موت کا مزہ چکھنا ہے مگر جب کوئی جان سے زیادہ عزیز ہستی جدا ہوتی ہے تو درد کا احساس ہمیشہ ہی غم کو ہرا کر دیتا ہے۔ بس اللہ تعالیٰ سے یہی التجا ہے کہ میری ماں کی مغفرت فرما اور ان کی قبر کو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بنا دے اور ہم سب سے جو کمی اور کوتاہی ان کی زندگی میں رہ گئی وہ دور کرنے کی توفیق عطا فرما، آمین!

مرسلہ: صوفیہ قمر، کراچی

"ثابت مرچیں لا کر اچھی طرح دھو کر سکھائی جائیں گی، روزانہ انہیں دھوپ میں بکھیرنا اٹھانا بھی ایک الگ ڈیوٹی بن جاتی ہے اور پھر ان کی ڈنڈیاں توڑ کر انہیں پسوایا جائے، کمال ہے ایک ایسے دور میں جب سہولتیں اور آسانیاں اس قدر میسر ہیں یہ صدیوں پیچھے کی روایت چلا رہی ہیں۔" وہ اس طرح کے کاموں میں مشغول ہو کر غائب دماغی کی کیفیت کا شکار ہو جاتی تھی۔

"ابھی ہلدی منگوا کر اسے بھی ابال کر سکھانا ہے اور پسوانا ہے، سالن کا رنگ خراب ہو جاتا ہے اگر مسالا غلط ہو تو۔" اس کو ایسی سوچ سے چونکا کر ہوش میں لانے والی بھی بوا جی ہی ہوتی تھیں۔

"نمک بھی منگوا لیں، وہ بھی دھو کر سکھائیں گے۔" اس نے جل کر کہا۔

"ہاں بات تو ٹھیک ہے مگر یہ آیوڈین والے نمک والی بات دل کو نہ لگتی ہوتی تو ضرور کر لیتی ایسا....." وہ بے نیازی سے بولیں۔

"دو بندوں کے کھانے میں مسالا پڑتا ہی کتنا ہے مگر اہتمام کس قدر ہے۔" وہ کڑھ کر سوچتی۔

اور اسی پر بس نہیں وہ اسے سلائی کڑھائی کی ماہر بھی بنانا چاہتی تھیں۔ خود انہوں نے ایک نجی ادارے کے تعاون سے سلائی مرکز بنا رکھا تھا، جس سے شہر کی کئی خواتین اور بچیاں استفادہ حاصل کر رہی تھیں۔

"میں پڑھائی کروں یا سلائی سیکھوں، میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا۔" ان کی اس فرمائش پر کہ وہ سلائی مرکز سے سلائی سیکھے وہ جھنجلا جھنجلا کر کہتی تھی۔

"پڑھائی کے وقت پر پڑھائی کرو اور سلائی کے وقت پر سلائی۔ جب چھٹیاں ہوں ان دنوں میں سلائی کڑھائی سیکھا کرو، ہنر سب اچھے ہوتے ہیں، ہاتھ میں ہوں تو کام آتے ہیں۔

"مجھے آپ کی اس تھیوری سے ذرا بھی اتفاق نہیں ہے۔" وہ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ کبھی نہیں پائی۔ شدید اختلافات کے باوجود نہ جانے کیوں وہ بوا جی کے سامنے بول نہیں پاتی تھی، اپنا ردِعمل دکھا نہیں پاتی تھی۔ ان کی شخصیت کا یہ رعب تھا یا ان کی وہ محبت تھی جو کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نگاہ کے مترادف تھی کے سامنے اس کی زبان گنگ ہو جاتی تھی۔

"اگر تم یہ کام نہ سیکھو گی تو لوگ کہیں گے چراغ تلے اندھیرا والی بات ہے۔ زندگی کا اعتبار کوئی نہیں، آج محل میں بسنے والے کل کٹیا میں رہنے پر مجبور ہو جائیں، بڑے بڑے بادشاہوں پر کڑا وقت آتا رہا ہے، اگر اس برے وقت کا تصور ذہن میں ہو تو انسان آپ سے آپ ہی ہر کام سیکھ لیتا ہے، نہ جانے کب کس ہنر کی ضرورت پڑ جائے۔" وہ رسان سے سمجھاتیں۔

"کبھی اچھی بات نہ سوچیے گا میرے بارے میں۔" وہ کڑھ کر سوچتی۔ "محل میں تو آج بھی نہیں رہ رہی، آنے والے کل کے لیے محل نہ سہی ایک شاندار گھر تو سوچا جا سکتا ہے ناں مگر بوا جی۔" اسے خیال آتا۔ "ہمیشہ بدترین سوچیں گی میرے لیے، کبھی جو خیر کا کلمہ نکالا ہو میرے لیے انہوں نے اور بے ہنری اور بے سلیقگی کا ہنر گرا انہیں مجھ ہی میں نظر آتا ہے خیر سے، حالانکہ کیسی اچھی وہ مس سلیم شیرانی ہیں جو سمجھتی ہیں کہ انگریزی ادب کے بارے میں وسیع معلومات رکھنے والی مجھ ایسی اسٹوڈنٹ انہیں اپنے پورے کیریئر میں نظر نہیں آئی اور مس علیم کے خیال میں مجھ ایسی ڈیبیٹر اسکول نے کبھی پیدا نہیں کی۔ میں بوا جی کو کیسے سمجھاؤں کہ میرا میدان اور میرا مقام وہ نہیں جو وہ سمجھتی ہیں، میرا مقام اور میرا میدان کچھ اور ہے۔" وہ اپنے خوابوں کی دنیا میں کھو جاتی۔ جہاں ادب کے بڑے بڑے کردار اس کے منتظر ہوتے تھے، وہ ان سے گفتگو کرتی، بحث و مباحثے میں حصہ لیتی

اور خود اپنے آپ کو بھی دنیا کی مشہور ترین ہستیوں میں سے ایک خیال کرتی۔ اس کے بچپن سے ہی اس کا پسندیدہ ترین مشغلہ تھا، یہ اس کے ساتھ ایک اچھا اتفاق ہوا تھا کہ بوا جی نے اسے شہر کے سب سے اچھے اسکول میں تعلیم دلوائی تھی۔ اسکول کے ماحول اور تربیت نے اس کے اندر موجود پیدائشی اوصاف کو خاطر خواہ جلا بخشی تھی۔ اسے دنیا بھر کی چیزوں کے بارے میں بلا کی معلومات حاصل تھیں۔ اس کا شمار اسکول کی ذہین ترین طالبات میں ہوتا تھا اور نہ صرف اسکول میں بلکہ گھر میں بھی ان کی رہائشی کالونی کے مکین اس پر رشک کیا کرتے تھے۔ لائق اور محنتی تھی اور ہر گھریلو امر میں طاق تھی، ایسی لڑکی بہت سوں کی آئیڈیل قرار دی جا سکتی تھی۔ مگر صرف اسے معلوم تھا کہ وہ ان تمام اوصاف کی مالک ہونے کے باوجود کتنی منفی سوچ کی مالک تھی۔ خود اس نے اپنے آپ کو negative (منفی) اور sadist (یاسیت پسند) کا خطاب دے رکھا تھا۔ اسے خود بھی معلوم تھا کہ اس کے یہ دونوں اوصاف باقی سب خوبیوں پر بھاری تھے اور انہیں ختم کرنے کا ذریعہ بن سکتے تھے۔ جس وقت وہ خود ترسی اور خود رحمی کا شکار ہو جاتی اس وقت دنیا کی بڑی سے بڑی خوشی بھی اسے اس کیفیت سے نکالنے میں ناکام ہو سکتی تھی۔ یہ بات اسے بہت بعد میں جا کر معلوم ہوئی تھی کہ ان دونوں خامیوں سے بھی بڑی ایک خامی اس کے مزاج کا حصہ تھی بلکہ اس کی شخصیت پر حاوی تھی اور یہ وہ خامی تھی جو آنے والے دنوں میں طور پر اس کی زندگی کا پانسہ پلٹنے والی تھی۔ یہ بھی اسے بہت بعد میں پتا چلا تھا کہ اس خامی کا نام ناشکری تھا۔

☆☆☆

زندگی کے اس دور میں جب ہر نوجوان سائنس اور ٹیکنالوجی کے پیچھے خوار ہو رہا تھا اور فنانس اور ایڈمنسٹریشن کے میدان مار لینے کے پیچھے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ دانیال کو آرٹ میں دلچسپی تھی۔ اس کی ڈرائنگ بچپن سے ہی بہت اچھی تھی۔ اس کے گھر کے ماحول نے اس کے شوق کو ہوا دی تھی۔ اس کے ڈیڈ کو فنِ مصوری میں اچھی خاصی دلچسپی تھی۔ اس کے گھر میں نامور مصوروں... کی مشہور پینٹنگز موجود تھیں۔ خود اس کا گھر آرٹ کا ایک نادر نمونہ محسوس ہوتا تھا، جدید فنِ تعمیر کا ایک نادر نمونہ، اس کی ممی کا ذوق بھی بہت اچھا تھا اور یہ ممی ہی تھیں جنہوں نے دانیال کے اندر ایک پیدائشی آرٹسٹ کو دریافت کر لیا تھا۔ وہ صرف چھ سال کا تھا جب انہوں نے بچوں کے ایک آرٹ مقابلے میں اس کی رجسٹریشن کروائی تھی۔ اس نے وہ مقابلہ بہت بڑے مارجن سے جیتا تھا۔ اس کے بعد وہ اسے ہر ایسی جگہ لے جانے لگیں جہاں اس کے فن کو جلا بخشے جانے کا امکان ہوتا۔ گرمی کی چھٹیوں میں وہ آرٹ اسکولز کے سمر کیمپ میں شرکت کرتا اور آرٹ مقابلوں میں حصہ لیتا۔ وہ پیدائشی طور پر دائیں کے بجائے بائیں ہاتھ پر مضبوط تھا۔ اور جب وہ بائیں ہاتھ سے اپنے سامنے موجود کینوس پر مقابلے کے عنوان سے متعلق تصویر بناتا ہوا لائنیں کھینچتا تو ایک مکمل مصور معلوم ہوتا۔

"میں تمہیں دنیا کے بڑے آرٹ اداروں میں داخلہ دلواؤں گی۔" ممی اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہتیں وہ خوش ہو جاتا اور آرٹ پڑھنے سے متعلق اس کا ارادہ مضبوط ہو جاتا۔ مگر سینئر کیمبرج کے دوران اس کے ذہن اور سوچ نے اچانک یوٹرن لے لیا۔ اس کی وجہ اس کے بھائی کا فلائنگ کا شوق تھا۔ اس کا بڑا بھائی چارٹرڈ اکاؤنٹنسی میں دلچسپی رکھتا تھا اور اس کا ارادہ بیرونِ ملک جا کر تعلیم حاصل کرنے کا تھا اسے اپنے اے لیولز رزلٹ کا انتظار تھا اور اسی دوران اس نے ایک فلائنگ کلب جوائن کر لیا تھا۔ ویک اینڈ پر کبھی کبھار دانیال کو بھی ساتھ چلنے کی آفر کرتا، اس نے اب تک جو سیکھا تھا اسے گھر کے کسی فرد کو دکھانے کا شوق تھا مگر گھر میں کسی اور کو فرصت ہی نہیں تھی سو دانیال ایک بار عاصم کا دل رکھنے کو اس کے ساتھ چلا گیا۔ عاصم اپنی ٹریننگ کے ابتدائی مراحل میں تھا اور اس کا ٹریننر اس پر رسک نہیں لیتا تھا مگر دانیال نے وہاں ان لوگوں کو بھی دیکھا جو ٹریننگ کے آخری مراحل میں تھے یا تربیت حاصل کر چکے تھے۔ وہ زندگی میں کئی بار جہاز کے ذریعے سفر کر چکا تھا، اندرونِ ملک بھی اور بیرونِ ملک بھی مگر اس نے کبھی غور نہیں کیا تھا بڑے بڑے پروں والے جس مشینی پرندے پر بیٹھ کر وہ سمندر پار تک کا سفر گھنٹوں میں کر لیتا تھا اسے اڑانے میں کیا مزہ آ سکتا تھا۔ اس روز اس نے پہلی بار محسوس کیا تھا کہ اس کام میں کتنا مزہ تھا، کتنا تھرل تھا۔ وہ پورا دن اس نے فلائنگ کلب میں گزارا تھا اور وہاں موجود لوگوں کی شام تک اس کے بارے میں حتمی فور پر ...... یہ رائے تھی کہ عاصم سے بہت پہلے وہ فلائنگ سیکھ سکتا تھا اور فلائنگ کلب سے نکلنے سے پہلے وہ اس بات کا قوی ارادہ کر چکا تھا کہ وہ فلائنگ سیکھے گا نہ صرف سیکھے گا بلکہ اس کو اپنا کیریئر بھی بنائے گا۔

"کیریئر پلان میں یہ اچانک تبدیلی تمہاری زندگی کا سارا ٹیمپو خراب کر سکتی ہے۔" ممی نے اس کا ارادہ سن کر رائے دی تھی، وہ شاید ایک دم اس کی مخالفت نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

"ابھی کیریئر بنانے کا سلسلہ شروع ہی کہاں ہوا ہے۔" اس نے بے نیازی سے کہا تھا۔ "آرٹ ایک ایسا ہنر ہے جو پیدائشی موجود ہوتا ہے انسان میں، اسے کوئی چھین یا چرا نہیں سکتا، اسکیچ بنانا اور پینٹنگز بنانا میرے ہاتھ کا ہنر ہے، اس میدان میں پیشہ ورانہ تعلیم میرے ہنر کو بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے مگر اس کے بغیر بھی میں آرٹسٹ تو کہلا ہی سکتا ہوں۔ تاریخ ایسے آرٹسٹوں کے ناموں سے بھری پڑی ہے جنہوں نے پکاسو، مائیکل اینجلو، وان گو، ڈاونچی، مانے اور پیزارو کی لائف ہسٹریز، تکنیک، کام اور بڑے بڑے کاموں کے بارے میں نہیں پڑھا مگر وہ پھر بھی آرٹسٹ تھے اور ان کے کام کی خوب صورتی کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا، یہ وہ میدان ہے جس میں تھیوری اتنی اہم نہیں جتنا کہ عملی کام اہم ہے، اس لیے ضروری نہیں کہ اس فیلڈ میں بڑے بڑے تعلیمی اداروں سے بڑی بڑی ڈگریاں لے کر کام کیا جائے، ان ڈگریوں کے بغیر بھی میرا کام اور میرا ہنر میرا ہی رہے گا۔" اس نے جواب میں لمبی تقریر جھاڑی تھی۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ میدان بھی ایک ٹھیک ٹھاک کمائی والا پیشہ بن چکا ہے، تم نے دیکھا نہیں اس میں کتنی نئی، نئی جہتیں نظر آ رہی ہیں۔ پہلے لوگ صرف پینٹرز یا مجسمہ ساز ہوتے تھے اب ہنر کاری بھی فیلڈ آف آرٹ ہے، سنار، کمہار، جولاہے سب کے کام فیلڈ آف پروفیشنل آرٹ بن چکے ہیں۔ تم اپنے اس پیدائشی فن میں زیادہ نام اور زیادہ پیسہ کما سکتے ہو بہ نسبت اس میدان کے جو تمہارے لیے بالکل نیا ہے اور ایک جذباتی جنون کی شکل میں تمہارے دماغ میں سما گیا ہے۔" ممی نے اسے سنجیدگی سے سمجھایا تھا۔ شاید ان کی نظروں کے سامنے دنیا بھر کی ان مشہور آرٹ گیلریز کے منظر گھوم رہے تھے جن کی دیواروں پر وہ تصور ہی تصور میں اس کا کام سجا ہوا دیکھتی تھیں۔

"یہ جذباتی جنون نہیں ہے۔" دانیال نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ "جو کیفیت میرے دل و دماغ پر گزر رہی ہے فلائنگ کلب میں جا کر، وہ جذباتی جنون نہیں ہے۔ بلندیوں پر اڑنے کی خواہش جنون نہیں تجسس ہے۔ اوپر فضا میں وہ کون سا جہان ہے جسے مسخر کرنے کی ذمے داری ہے انسان پر، ہوا کا دوش کیسا ہوتا ہے۔ ہوا کے دوش پر توازن برقرار رکھنے کا عمل کیسا لگتا ہے، آپ یوں سمجھیں کہ میری زندگی کو ایک نیا رخ عطا ہو گیا ہے۔ زندگی صرف ایک ہی کام کرنے کے لیے عطا نہیں کی گئی۔ اس کائنات میں کرنے کے لیے بہت سے کام ہیں، انسان کی کامیابی اس بات میں ہے کہ وہ ایک زندگی میں کتنے کام کرتا ہے اور کیسے کرتا ہے۔"

''یہ تمہاری عمر کی سوچ ہے اور یہ سوچ ایسی ہی ہونی چاہیے اس لیے میں مخالفت نہیں کروں گی، کچھ عرصے بعد ہی تمہیں پتا چل جائے گا کہ زندگی ایک کام کو ڈھنگ سے کرنے کے لیے بھی ناکافی ثابت ہوتی ہے، کجا یہ سارے کام۔'' ممی نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔ ''ٹھیک ہے تم اپنا شوق پورا کرلو، عاصم کررہا ہے، تم بھی ضرور کرو، فلم وقت کو استعمال کرنے کا ایک اچھا ذریعہ ہے یہ۔'' ممی نے اس کی بات کو سنجیدہ نہیں لیا تھا اور یہ ان کی غلطی تھی۔

☆☆☆

''ارے علینہ تم ابھی تک سوچ بچار ہی میں پڑی رہتی ہو، ارے بھئی سوچ بچار کی عمر تو گزر گئی اب تو تم پریکٹیکل لائف میں داخل ہو جانا چاہیے۔ کچھ کرو ڈارلنگ زندگی کو ضائع کیوں کررہی ہو؟'' علینہ کے کانوں میں وہ آواز گونج رہی تھی جو آج کل اکثر اس سے مخاطب ہوتی تھی۔

''کیا کروں، میں تمہاری طرح ڈیرنگ (بہادر) نہیں ہوں جو نت نئے تجربے کرتی پھروں۔ میں کیا تمہاری طرح شیف کو موس قسم کا کام کرلوں، اُف فہد تم کتنے بہادر ہو، تمہارے دل میں جو آتا ہے کرلیتے ہو، تمہیں کسی کی کہی بات کا خوف ہوتا ہے نہ ہی کسی کے مذاق کا۔'' اسے اپنے کہی بات یاد آئی۔

''ارے تم کون سی صدی میں جی رہی ہو بی بی۔ یہ پروفیشنل ازم کا دور ہے۔ یہ کام پیشہ بن چکا ہے، ہر چیز پیسہ یعنی money بن چکا ہے۔ تم نے وہ مشہور مقولہ نہیں سنا جو جدید دور کی پیداوار ہے، لوگ کہتے ہیں کہ جب تمہیں ذرا سی فرصت ملے تمہیں چاہیے کہ تم خود کو پیسہ کمانے والی مشین میں تبدیل کرلو۔'' اس نے کہا تھا۔

''ارے یہ ہم سے نہیں ہوتا۔'' علینہ نے بے ساختہ جواب دیا تھا۔ ''پیسہ عملی زندگی کی ایک بڑی حقیقت ہوتا ہوگا مگر کیونکہ میں ابھی عملی زندگی میں داخل نہیں ہوئی، اس لیے میرے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔''

''تمہارے لیے وقت کی بھی کوئی اہمیت نہیں کیا؟'' دوسری جانب سے پوچھا گیا تھا۔

''وقت بہت اہم چیز ہے۔'' علینہ نے اعتراف کیا۔ ''مگر کیا کریں کہ میرے پاس ہے بہت زیادہ فرصت میں، اس لیے مجھے اس کی بھی کوئی اہمیت محسوس نہیں ہوتی۔'' اسے احساس ہورہا تھا کہ وہ یہ ساری باتیں صرف اپنے مخاطب کو زچ کرنے کے لیے کررہی تھی۔

''ارے تمہیں وقت کی اہمیت کا احساس نہیں ہے؟'' دوسری جانب سے حیرت کا شدید اظہار کیا گیا۔

''مت بتاؤ مجھے یقین نہیں آرہا۔''

''میرے پاس وقت گزارنے کے لیے کوئی معقول کام نہیں ہے، اس شہر میں مواقع بھی محدود ہیں اور مجھے کوئی بھی کام کرنے کی اجازت نہیں دیتیں، پھر میں کیا کروں، میں کچھ کرتی نہیں اس لیے میرے پاس وقت بہت ہے اور اسی لیے مجھے وقت کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ گزرتے لمحوں کی گنتی سے اکتاہٹ محسوس ہوتی ہے۔'' علینہ نے برملا اعتراف کیا۔

''ڈونٹ ٹیل می علینہ کہ تم ابھی تک ماماز بے بی mama's baby ہی ہو، تم نے اپنا قد کاٹھ نہیں نکالا، تم ابھی تک اسی بڑے درخت کے نیچے موجود چھوٹا سا پیڑ ہو جسے اونچا ہونے اور ٹہنیاں پھیلانے کے لیے جگہ نہیں ملتی۔'' ایک مرتبہ پھر حیرت کا شدید اظہار کیا گیا۔

''یہ حقیقت ہے فہد۔'' علینہ اعتراف کے موڈ میں تھی۔ ''میری ماما کو بون سائی پلانٹس bonsai plants میں بہت دلچسپی ہے، وہ پودوں کو کاٹ چھانٹ کر چھوٹے پودے بنائے رکھنا پسند کرتی ہیں، میں بھی ان کا ایک بون سائی پلانٹ ہوں۔''

''اوہ آئی ایم سوسوری۔'' علینہ کو ان الفاظ کے سننے سے زیادہ تکلیف کبھی کسی بات کے سننے پر نہیں ہوئی تھی۔

''تم اب بھی اسی طرح کی تنہائی کا شکار ہو یار۔ کچھ ایسے دوست بنا لیے ہوتے جو تمہاری تنہائی بانٹ سکتے۔'' فہد کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس معصوم اور حالات کی شکار لڑکی کو کس طرح دلاسا دے سکتا تھا۔

''کیا کسی دوست کے پاس اتنا فالتو وقت ہوتا ہے کہ وہ کسی کی تنہائی بانٹنے کے خیال سے اس کے ساتھ لگا بیٹھا رہے؟'' علینہ کے لہجے میں طنز تھا یا خود ترسی فہد کی سمجھ میں نہیں آیا مگر اس کا دل دکھی ہوگیا۔

''ہاں ہوتا ہے، بالکل ہوتا ہے۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔ ''مثلاً میرے پاس تمہارے لیے بہت وقت ہے، تمہاری باتیں سننے کے لیے، تمہاری خوشیاں اور تمہارے دکھ شیئر کرنے کے لیے اور اپنی باتیں تمہیں سنانے کے لیے، میرے پاس بہت وقت ہے یقین کرو۔''

''تم مجھ پر ترس کھارہے ہو۔'' علینہ کو عجیب سا احساس ہوا۔

''ہرگز نہیں۔'' وہ فوراً بولا۔ ''ترس کھانے کے لیے یہاں بھی بہت لوگ موجود ہیں، تم سے تعلق دوسرا ہے، تمہارے ساتھ تو خود مجھے بھی ایک تعلقِ قلبی محسوس ہوتا ہے۔ کیا ہم چند سال پرانی دوستی کی مکمل تجدید نہیں کرسکتے؟''

''ہوں۔'' علینہ نے کچھ دیر تک سوچا۔ ''ماما کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئے گی۔''

''انہیں بتا کون رہا ہے۔'' فہد نے کہا۔ ''ضروری تو نہیں کہ ہر بات ہر کسی کے ساتھ شیئر کی جائے۔ مجھے معلوم نہیں کہ تم اسے پسند کروگی یا نہیں اور قبول کروگی یا نہیں مگر میری پیشکش برقرار رہے گی، تم جب چاہو جس وقت چاہو مجھے کال کرسکتی ہو۔ تمہارے لیے میں ہر وقت حاضر ہوں۔'' اس کے لہجے میں خلوص تھا اور اپنے اس رویے پر وہ خود بھی حیران ہورہا تھا۔

''لائیو کوکنگ شو کے دوران بھی۔'' علینہ کی آواز میں اچانک ہی مسرت چھلکنے لگی۔

''وہاں بھی۔'' فہد نے مسکرا کر کہا۔ ''میں کال بلاک کرا کے سن سکتا ہوں، وہاں سے فارغ ہو کر تمہیں کال بیک کرسکتا ہوں، تم فکر مت کرو تم جہاں بھی جب بھی مجھ سے بات کرنا چاہوگی، میں دستیاب ہوں گا۔''

علینہ کو محسوس ہوا جیسے اس کی عمر بھر کی تنہائی لمحے بھر میں ختم ہوگئی ہو۔ اسے دوسراہٹ کا احساس ہونے لگا۔

''میوزک سنتی ہو آج کل؟'' فہد نے اچانک پوچھا۔

''ہاں، کبھی کبھار۔'' علینہ نے مختصر جواب دیا۔

''موویز دیکھتی ہو؟''

''بہت کم۔''

''اسپورٹس دیکھتی ہو، فارمولا ون اور باسکٹ بال، تمہیں علم ہے کیا ہورہا ہے اسپورٹس کی دنیا میں؟''

''شاید نہیں۔''

''نیوز چینلز تو دیکھتی ہوگی، حالاتِ حاضرہ پر معلومات کا کیا حال ہے؟''

''نہ ہونے کے برابر۔''

''پھر کرتی کیا رہتی ہو؟''

''کچھ نہیں کرتی اور کچھ نہ کرنا بھی آہستہ آہستہ کرتی ہوں۔''

''اوہو۔'' فہد بے اختیار ہنس دیا۔ ''چلو میں تمہیں چند سی ڈیز بھجواتا ہوں، میوزک اینڈ موویز بھجوادوں؟'' اس نے پوچھا۔

''تم مجھے بتادو، میں خریدلوں گی۔''

''ٹھیک ہے، ایسے ہی سہی۔'' وہ فوراً مان گیا۔ ''اور میرا کوکنگ شو دیکھنا مت بھولنا اور کوکنگ بھی اک آرٹ ہے۔''

''جیسے آنے والے کل میں خاکروبی اور کپڑے دھونا بھی ایک آرٹ بننے والا ہے۔'' علینہ نے مذاقاً کہا۔

''کوئی حرج نہیں اور کوئی پتا نہیں کہ ایسا ہی ہو۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''تم سب سرٹیفکیٹس لے لینا ان آرٹس میں، تم یونیک بننے کے شوقین تھے اور تم یونیک بننے کی سیڑھیاں چڑھنے کے شوق میں کچھ بھی کرسکتے ہو۔''

''جو بھی سمجھ لو، میں تو ایسا ہی ہوں۔'' وہ برا منائے بغیر بولا۔

اور علینہ کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ کسی کے برا منانے کے خوف کے بغیر کسی سے مذاق کرنا کیسا لگتا ہے۔

☆☆☆

''ڈیزائننگ کا تعلق صرف ڈیزائننگ سے ہوتا ہے، اس میں کسی دوسرے فیلڈ آف آرٹ کی گنجائش نہیں ہے، یہ خود ہی ایک وسیع مضمون ہے۔'' آمنہ نے بینش کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''چلو اماں کی ایک پریشانی تو ختم ہوئی کہ میں مٹی کے برتن بنانا سیکھ کر کمہاروں جیسے کام کرنا شروع کردوں گی۔'' بینش نے آمنہ کی بات یاد کرتے ہوئے کہا۔ وہ گھر سے آرٹ کی تعلیم حاصل کرنے نکلی تھی اور اس کا خیال تھا کہ اسے تصویریں بنانا، پورٹریٹ بنانا، مٹی کے برتن بنانا اور مجسمہ سازی جیسے ہنر سیکھنے کے علاوہ کتابیں پڑھنا پڑیں گی۔ مگر جب اسے ڈیپارٹمنٹ میں پڑھائے جانے والے مضامین اور فیکلٹی ڈیپارٹمنٹس کے بارے میں بتایا گیا تو اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا کہ وہ کیا پڑھے۔

''بی ایف اے پینٹنگ سے بہتر ہے تم ڈیزائننگ میں داخلہ لو۔'' اس کے کالج کی ایک استاد نے اپنے تئیں اسے صائب مشورہ دیا اور اس نے ڈیزائننگ میں داخلہ لے لیا۔ اب اسے یہ میدان مشکل لگ رہا تھا۔ اگر آمنہ کا ساتھ اسے نہ ملتا تو شاید وہ حوصلہ ہار چکی ہوتی۔ آمنہ کی دوستی نے اسے شروع کی بہت سی مشکلات سے بچالیا تھا... اور جوں جوں وہ کورس کو سمجھنے لگی تھی اس کا پریشان حال دل مطمئن ہونے لگا تھا، ذرا سا سنبھلنے کے بعد جس اتفاق نے اسے مزید خوشی عطا کی تھی وہ دانیال ابراہیم کا بھی ڈیزائننگ کا طالب علم ہونا تھا۔ اسے پہلی مرتبہ اپنی ٹیچر کا مشورہ اچھا لگا تھا۔

اس نے گھر میں بیٹھے، پڑھتے ہوئے، کلاس میں لیکچر لیتے ہوئے، راستے میں آتے جاتے کئی بار اپنے آپ سے یہ سوال کیا تھا کہ دانیال میں اس کی دلچسپی کی وجہ کیا تھی۔ کیا وہ بہت خوش شکل اور اسمارٹ تھا؟ اس لیے اس سوال کا جواب ''کہہ سکتے ہیں'' ہوتا تھا۔ کیا وہ بہت امیر تھا اس لیے؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہوتا تھا، کیا اس کی شخصیت منفرد تھی؟ اس بات کا جواب یقیناً ''ہاں'' ہوا کرتا تھا۔ پھر وہ اس کھوج میں پڑ جاتی کہ دانیال ابراہیم میں کیا انفرادیت تھی جو باقیوں میں نہیں تھی۔ اس سوال کے کئی جواب اس کے ذہن میں آتے تھے مگر کوئی جواب بھی بہت زیادہ تسلی بخش نہیں تھا۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ اس سوال کے جواب کو وہ کچھ عرصہ ملتوی رکھے گی... کیونکہ اس سوال کے جواب کے لیے اسے کئی کلیوز چاہیے تھے جو اسے مل نہیں پا رہے تھے۔ اس نے خود سے یہ سوال کرنا چھوڑ کر دانیال کی شخصیت کا خاموش جائزہ لینا شروع کردیا تھا۔

(جاری ہے)



شامِ شہرِ یاراں

عنیزہ سید



زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے... خیر وشر، نیکی اور بدی... زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت... ہر برائی پر حاوی ہوجاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سید نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

اپنے فلیٹ کی اطلاعی گھنٹی بجنے پر زوئی حسین کو ذرا سا اچنبھا ہوا تھا۔ اس سے ملنے کم ہی لوگ آتے تھے اور ہفتے کی شام کو تو شاید ہی کوئی آتا تھا۔ یہ ویک اینڈ بہت دن بعد ایسا ویک اینڈ تھا جب اس کا دل اسے بھرپور طریقے سے منانے کو چاہ رہا تھا۔ وہ اپنے لیے جھینگوں کا شوربہ اور ابلے ہوئے چاول بنا رہی تھی۔ اسے پاکستان میں موجود چائنیز ریستوران میں ملنے والے کھانوں میں وہ مانوس ذائقہ کبھی محسوس نہیں ہوا تھا جو اس کے وطن سے منسوب تھا۔ وہ اپنا شوق کبھی کبھار خود اپنے علاقے کے ذائقے کے مطابق کھانا بنا کر پورا کرتی تھی اس روز بہت عرصے کے بعد اس کا دل حقیقتاً خوش تھا اور اس نے اپنے چھوٹے سے کیسٹ پلیئر پر اپنے پسندیدہ پاکستانی گلوکار نصرت فتح علی خان کی غزل لگا رکھی تھی اسے میرا غم میری ہر خوشی تم سے ہے، سننے میں بہت مزہ آتا تھا۔ اب وہ اس زبان اور الفاظ کو سمجھنے لگی تھی اور اسے ان میں ایک خاص لوچ اور سُر محسوس ہوتا تھا۔ اب تو وہ اردو کے بعد پنجابی زبان بھی سمجھنے لگی تھی اور خوشی سے اپنے ساتھیوں کو بتاتی تھی کہ وہ ایک دن ایک اچھی زبان دان بن جائے گی جسے چار زبانوں پر عبور حاصل تھا۔

اطلاعی گھنٹی کی آواز اس کے لیے غیر متوقع تھی اور آنے والا مہمان اس سے بھی زیادہ غیر متوقع۔ وہ اس شخص سے واقف نہیں تھی اس کا چہرہ بھی نامانوس تھا...... مگر آنے والے کو یقین تھا کہ وہ زوئی حسین سے ہی ملنے آیا تھا۔

”آپ بیٹھیے۔“ زوئی نے کم آمیز ہونے کے باوجود اپنی روایتی میزبانی کے آداب سنبھالتے ہوئے کہا۔

”میں جانتا ہوں۔ آپ میری آمد پر حیران ہیں کیونکہ آپ مجھے بالکل نہیں جانتیں۔“ آنے والے نے کھڑے کھڑے کہا۔

”یہ میرا تعارف ہے۔“ اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اسے پکڑایا۔ زوئی کو اس وزیٹنگ کارڈ میں کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔ اس نے اس پر ایک طائرانہ نظر بھی نہیں ڈالی۔

”مجھے آپ سے کچھ معلومات لینی تھیں۔“ وہ کہہ رہا تھا اور پہلی دفعہ زوئی کو خیال آیا کہ ہوسکتا تھا وہ شخص انٹیلی جنس کے کسی محکمے سے متعلق ہو اور ایک غیر ملکی کے اپنے ملک میں طویل قیام کی وجہ جاننے میں دلچسپی رکھتا ہو۔ ایک لمحے میں زوئی حسین کی نظروں کے سامنے کئی ایسی مثالیں گھوم گئیں جن میں غیر ملکیوں سے پوچھ گچھ کا ایسا طریقہ نظر آتا تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ ہاتھ میں پکڑے کارڈ پر نظر ڈالی۔

☆☆☆

”لڑکیاں تو قدرت کی حسین ترین تخلیق ہوتی ہیں۔ خدا نے انہیں فرشتوں کی سی مسکراہٹ عطا فرمائی اور پھولوں کی سی نرمی، لڑکیوں کی شکل میں خدا نے والدین کے لیے محبت اور خوشی تخلیق فرمائی۔“ اس نے کتاب میں لکھے یہ الفاظ پڑھے اور کتاب بند کردی۔ یہ الفاظ اس کے دل کو بہت بھائے تھے مگر اپنی زندگی میں اسے خود سے متعلق یہ احساس کبھی نہیں ہوا تھا۔ ”اگر لڑکیاں والدین کے لیے محبت اور خوشی ہیں تو میرے والدین میری پیدائش پر خوش کیوں نہ ہوئے۔ انہوں نے خوشی کے وہ شادیانے کیوں نہ بجوائے جو بجواتے اگر خدا ان کو لڑکا عطا فرماتا۔“ اس نے سوچا۔ ”میں نے سنا ہے میری پیدائش پر تو ابو کو اتنا صدمہ ہوا کہ انہوں نے کئی دن تک میری شکل ہی نہ دیکھی اور امی، ابو کے موڈ کو دیکھ کر ڈر گئیں یقیناً دل میں انہیں بھی مجھ سے نفرت ہی ہوئی ہوگی کہ اگر میرے بجائے لڑکا ہوتا تو وہ ابو کو تحفے کی طرح پیش کرکے بالآخر ان کا دل جیت لینے میں کامیاب ہوجاتیں۔“ اس نے گہری سانس لی۔

”یہ سب کتابوں میں لکھی باتیں ہیں۔“ سوچتے سوچتے اسے خیال آیا۔ ”حقیقت اس کے برعکس ہے۔

لڑکیوں سے متعلق والدین کے جذبات بھی اور ہیں اور عمومی سوچ بھی بالکل مختلف ہے، میں، میری ماں، میری نانی کی ماں، ان کی ماں پھر ان کی ماں، نسل در نسل اسی عمومی سوچ کے بھگتان بھگت رہے ہیں اور صدیاں گزر جانے کے باوجود ہماری قسمت کی لکیر نہیں بدلی۔“ یہ ہی تو اس کی شخصیت کا خاصہ تھا وہ منفی سوچ سوچنے پر اترتی تو نفی کی کوئی ایسی حد باقی نہ رہ جاتی جس تک وہ سفر نہ کرتی تھی۔ ”نہ جانے وہ کون سی دنیا ہوتی ہوگی جہاں بیٹیاں اپنے والدین کے لیے تحفہ اور رحمت بن کر اترتی ہوں گی۔ یہ حقیقت کی دنیا تو وہ ہے جہاں انتہائی لبرل والدین بھی بیٹی کی پیدائش پر ایک مرتبہ تو ضرور سوچتے ہیں کاش اللہ تعالیٰ اس کے بجائے بیٹا عطا فرما دیتا۔“ اس نے اپنی سوچ کو ایک نتیجے پر پہنچاتے ہوئے ایک اور تلخ بات سوچی اور یہ ہی خیالات شام کو بوا جی کے بھی گوش گزار کردیے۔

”تمہیں کس نے کہہ دیا کہ تمہارے والدین تمہاری پیدائش پر خوش نہیں تھے؟“ بوا جی نے کٹے ہوئے قیمے کے کوفتے بناتے بناتے ہاتھ روک کر حیرانی سے پوچھا۔

”خود آپ نے۔“ اس نے دہی بڑے کھاتے ہوئے تیز مسالے کی وجہ سے آنکھوں میں اترتا پانی ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

”میں نے کہا؟“ بوا جی کو جھٹکا لگا۔

”تو اور کیا، ایک مرتبہ بتایا تھا آپ نے کہ ابو نے میری پیدائش کے کئی دن بعد مجھے دیکھا تھا۔“

”اس لیے کہ وہ تمہاری پیدائش کے وقت محکمے کے کسی کام سے ملتان گیا ہوا تھا۔ مجبوری تھی اس کی، تمہارے پیدا ہونے کے چار روز بعد اس کا آنا ممکن ہوسکا تھا۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ تمہاری پیدائش پر ناخوش تھا۔“ بوا جی تقریباً ناراض ہوگئیں۔

”امی نے اُن کی بنتی جو نہیں تھی، سوچتے ہوں گے ایک اور مصیبت آگئی امی کے جیسی۔“ اس نے ان کی بات ان سنی کرتے ہوئے مزید خیال آرائی فرمائی۔

”امی سے نہ بننے کا مطلب یہ کب تھا کہ وہ پہلی اولاد سے ہی منہ موڑ لیتا۔ موموتم کیسی، کیسی باتیں سوچتی ہو۔“ بوا جی اس کے مزاج اور منفی سوچ سے واقف تھیں مگر جس طرح وہ باتوں کا مطلب اپنی مرضی کے مطابق نکالتی تھی انہیں اس سے سخت اختلاف تھا مگر وہ عین اس وقت پر جب وہ کوئی ایسی غلط بات کر رہی ہوتی تھی اسے ٹوک دینے کی قائل نہیں تھیں۔ ان کے سمجھانے کا طریقہ مختلف تھا۔ وہ اسے ٹھیک بات بھی باتوں باتوں میں ہی سمجھاتی تھیں۔

”میرا نہیں خیال کہ میں غلط سوچتی ہوں۔“ اس نے پلیٹ سنک پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”بوا جی جب شادی من چاہی نہ ہو تو اس شادی سے ہونے والی اولاد اور وہ بھی لڑکی کیسے من چاہی ہوسکتی ہے۔“ وہ اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔

”تم نے اس کا ایسا رویہ کبھی نہیں دیکھا، وہ تو اکثر مجھ سے تمہاری باتیں کرتا تھا۔ کہا کرتا تھا۔ ’بوا جی میری بیٹی بہت خوب صورت ہے، حد سے زیادہ خوب صورت، دعا کریں کہ اس کی قسمت بھی اتنی ہی خوب صورت ہو۔‘“ بوا جی نے سالن کے مسالے میں چمچہ چلاتے ہوئے کہا۔ ”وہ تمہارے لیے نت نئی خوب صورت چیزیں سا خرید کر لاتا تھا۔ کپڑے، جوتے، کھلونے، پاؤڈر، لوشن، بسکٹ، دلیے کے پیکٹ، واکرز، پش چیئرز جیسے جیسے تمہاری عمر بڑھتی رہی اس کے مطابق وہ ایک سے ایک قیمتی اور اچھی چیز خرید کر لاتا رہا۔ اس وقت تک جب

اس کی اپنی عمر رک گئی۔ اس کے بہت سے شوق، خواہشات اور سوچیں اس کی عمر کے رک جانے کے ساتھ ہی رک گئیں اگر وہ نہ جاتا اور تم کو اس عمر میں بھی پاتا تو تم دیکھتیں، باپ کی محبت کیسی ہوتی ہے۔ باپ کیسا ہوتا ہے۔" ان کی آواز بھرانے لگی۔

"یہ سب تو قیاس آرائی ہے۔" وہ ذرا برابر بھی متاثر نہ ہوئی۔ "منطق کی رُو سے ان کا رویہ یہ کبھی نہ ہوتا، ان دونوں کے آپس کے اختلافات کا نشانہ یقیناً میں ہی بنتی۔"

"بولو کڑوا، کڑوا میری بچی زیادہ مٹھاس بھی خطرناک ہی ہوتی ہے۔" بوا جی نے حسب عادت بات کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے اوپر طاری ہونے والے اداس موڈ سے فوراً ہی باہر نکل آئی تھیں اور ایسا انہیں اس کے لیے کرنا پڑتا تھا۔

"بوا جی آپ نے ان دونوں کو علیحدہ ہو جانے کا مشورہ کبھی کیوں نہیں دیا۔" بوا جی کے نرم رویے نے اسے بھڑکا دیا، اس نے ایک اور تلخ بات کر کے اپنے تئیں انہیں بھی بھڑکانے کی کوشش کی۔

"ماں دل اور گھر بسانے اور بسے رہنے کی آرزو کرتی ہے، اس کے لیے دعا کرتی ہے، کوشش کرتی ہے، ماں گھر اجاڑ لینے کا مشورہ کیسے دے سکتی ہے اپنی اولاد کو بیٹا۔" انہوں نے سلاد کے لیے پیاز کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ وہ بھڑکنا جانتی ہی نہیں تھیں اور ایسے موقع پر بھڑکنا تو بڑی حماقت ہوتی۔

"اور وہ مائیں کیسی ہوتی ہیں جن کی اپنی بہوؤں سے بنتی نہیں اور وہ ایسے تمام حربے استعمال کرتی ہیں کہ ان کا گھر نہ بس سکے، اس طرح وہ اپنے بیٹوں کے گھر ہی اجاڑ رہی ہوتی ہیں ناں!" اسے ایک نئی سوجھ گئی۔

"ہوتی ہوں گی ایسی مائیں، میں ایسی ماں ہرگز نہیں تھی۔ میں جانتی تھی کہ میرا بیٹا جذباتی تھا اور جذباتی لوگ اکثر ایسی حماقتیں کر جاتے ہیں جن پر بعد میں پچھتاوا ہوتا ہے اس لیے میں نے اس کے غلط رویے کی کبھی پشت پناہی نہیں کی۔" بوا جی نے بات کو ختم کرنا چاہا۔

"پھر ایسا کیوں ہوا کہ......" وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔ بوا جی کو اندازہ ہونے لگا کہ اب اسے خاموش کرانے اور اس بےمقصد بحث کو ختم کرنے کے لیے سختی اختیار کرنا پڑے گی۔

"تم نے وہ رومال مکمل کر لیا جس پر لیزی ڈیزی ٹانکا سیکھ رہی ہو؟" انہوں نے اس کی بات کاٹ کر اس کو یاد دلایا۔ انہوں نے اسے ایمبرائیڈری کی کتنی ہی کتابیں لے کر دی تھیں جو یونہی بیکار رکھی رہتی تھیں۔

"لیزی ڈیزی بہت آسان ہے، میں نے فاطمہ آپا سے کہہ دیا ہے کہ وہ مجھے کشمیری ٹانکا سکھا دیں۔" اپنی بات کاٹے جانے پر وہ از حد خفا ہو گئی مگر اس نے انہیں جواب ضرور دیا۔

"آسان سے مشکل کی طرف جاؤ تو مشکل بھی آسان لگتی ہے۔ اتنی لمبی چھلانگیں لگانے کی کوئی ضرورت نہیں، فاطمہ ٹھیک سکھا رہی ہے، تم پہلے وہ سیکھو جو وہ بتاتی ہے پھر اگلے ٹانکے پر جانا، چلو مکمل کر و رومال۔ وقت ضائع کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔" بوا جی نے اپنا لہجہ یکسر تبدیل کر لیا۔ وہ تقریباً پیر پٹختے ہوئے باہر نکل گئی۔ پیر پٹخنا اس کے احتجاج کی نشانی تھی۔

☆☆☆

فلائنگ کلب میں اس کا انسٹرکٹر بہت خوش مزاج اور باذوق تھا۔ دانیال کو یہ بھی اپنی خوش قسمتی محسوس ہوئی۔ وہ قیوم احمد کے ساتھ گزارے وقت سے خوب حظ اٹھاتا۔

"تم ذہین شخص ہو، بہت زیادہ ذہین۔" قیوم نے اسے بتایا۔ "تم ایسے شخص ہو جسے اسٹیل کا ایک ٹکڑا دے

دیا جائے تو وہ اس سے بننے والی ہر شے کا نام اور بنانے کا طریقہ بتا دے، سوئی سے لے کر بہت بڑے برتن تک ہر چیز کا۔"

"یہ اوور اسٹیمنٹ ہے۔" دانیال نے ہلکا سا احتجاج کیا۔

"ہرگز نہیں۔" قیوم سر جھٹکتا۔ "بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ تمہاری ذہانت کا اسٹینڈرڈ بیان کرنے کے لیے میں نے ایک بھونڈی سی مثال دی ہے۔ اس کو کسی اور طرح سے بیان کرنا چاہیے۔"

"ارے... ارے۔" دانیال ہنسا۔ "آپ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئے۔"

"نہیں......" قیوم نے اس کی بات مسترد کرتے ہوئے کہا۔ "دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو ایک وقت میں دو بالکل مختلف میدانوں میں طبع آزمائی کرتے ہوں گے۔ ایک دوسرے کے انتہائی مخالف میدانوں میں جن میں سے ایک، کا تعلق ٹیکنالوجی سے ہو اور دوسرا آرٹ کا میدان ہو۔"

"ارے آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ آرٹ اور ٹیکنالوجی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔" دانیال بےاختیار ہنس دیا۔ "آرٹ کے ہی بطن سے ٹیکنالوجی کا ظہور ہوا اور دونوں کا تعلق تصور سے ہے۔ ٹیکنالوجی میں آرٹ اور آرٹ میں ٹیکنالوجی کا استعمال ہمیشہ سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔"

"پھر بھی دونوں متضاد میدان ہیں۔" قیوم نے سنجیدگی سے کہا۔ "بہت سارے نامور مصوروں نے ٹیکنالوجی کے بارے میں بہت منفی بیان دیے ہیں اور اسے انسانی ذہن اور سوچ کا ایک بھیانک اور بدصورت پہلو قرار دیا ہے۔"

"مگر ٹیکنالوجی میں تو خوب صورتی ہے، رس ہے اور مزہ ہے۔" دانیال نے اپنا موقف بیان کیا۔ "اب اسی کو دیکھ لیجیے، جب میں جہاز کو اڑانے کی کوشش کرتا ہوں اور بلندیوں پر جاتا ہوں تو مجھے یہ تمام کائنات انتہائی خوب صورت محسوس ہوتی ہے۔ فضاؤں میں قدرت کا انمول فن نظر آتا ہے اور ان کی وسعتوں میں، میں کھو سا جاتا ہوں۔ ٹیکنالوجی اور آرٹ کا اس سے حسین امتزاج کیا ہو گا۔"

"واہ......" قیوم بےاختیار بولا۔ "اسی لیے تو میں نے تمہیں غیر معمولی طور پر ذہین قرار دیا۔ تم نے ایک ایسے موضوع پر مجھے قائل کر لیا جس کے بارے میں میری سوچ بالکل مختلف تھی اس سے پہلے میں نے غلط مثال نہیں سادی تھی، یہ ایسے ہی ہے کہ اسٹیل کا ٹکڑا نظر آنے پر تم سوئی اور کیل سے لے کر بڑی بڑی چیزیں بنانے کا طریقہ بیان کر دو۔"

"اس کا مطلب ہے کہ مجھے باتیں بنانے کا فن بھی آتا ہے۔" دانیال ہنسا۔

"ایک دم آتا ہے۔" قیوم کو اس غیر معمولی لڑکے میں واقعی بہت دلچسپی محسوس ہوئی تھی۔

"اوہ......" دانیال نے سر ہلایا۔ "پھر تو مجھے سوچنا چاہیے، یہ کوئی اچھی بات تو نہیں۔"

"اس میں کیا برائی ہے۔" قیوم نے اس کا شانہ تھپکا۔ "یہ تو بڑے کمال کا فن ہے جو بہت کم لوگوں کو آتا ہے۔ جیسے مجھے تو بالکل بھی نہیں آتا۔"

"آپ کو فلائنگ تو آتی ہے ناں!" دانیال محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ "اس سے بڑی کیا بات ہے، جتنی تھرل اور جتنا مزہ اس کام میں ہے اس کو انجوائے کرنے کے بعد کسی اور چیز کے سیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ کائنات کی وسعتیں اور بلندیوں کے اسرار آپ سب جانتے ہیں سر آپ بہت خوش قسمت ہیں۔"

"جتنی سرعت سے تم یہ کام سیکھ رہے ہو، مجھے لگتا ہے کہ کچھ وقت بھی نہیں گزرے گا اور تم مجھے سکھا رہے

ہو گئے۔'' قیوم نے کہا۔

''جی نہیں۔'' دانیال نے نفی میں سر ہلایا۔ ''استاد کا استاد بننے کی خواہش مجھے ہرگز نہیں، یہ انتہائی غیر منطقی سی بات ہے، مجھے آپ سے ہمیشہ چند قدم پیچھے ہی رہنا ہے۔ استادی استاد کو ہی زیب دیتی ہے۔''

''میں بتا رہا ہوں کہ تم جو بھی کام کرو گے اس کی پرفیکشن اور خوب صورتی کی انتہا کو چھو وُ گے کیونکہ تم آپے میں رہنا جانتے ہو جو ہم میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔'' قیوم نے ایک اور بیان دیا۔

وہ آپے میں رہنا جانتا تھا یا نہیں یہ اسے معلوم نہیں تھا مگر وہ اپنے ہر کام کے بارے میں بہت واضح سوچ رکھتا تھا اور جذباتی فیصلے کرنے سے گریز کرتا تھا اگرچہ اس کی ممی نے فلائنگ سیکھنے کے فیصلے کو جذباتی ہی قرار دیا تھا مگر اس کا اپنا خیال تھا کہ یہ جذباتی فیصلہ نہیں تھا۔ والٹن فلائنگ کلب میں اس کے کئی ہم عمر فلائنگ سیکھنے آتے تھے مگر جتنی تیزی سے وہ سیکھ رہا تھا اس نے کئی لوگوں کو حیران کر دیا تھا۔ بعض اوقات اسے ایسا لگتا جیسے وہ کوئی نیا کام نہیں سیکھ رہا تھا۔ ایسے جیسے یہ کام اسے پہلے سے آتا تھا، وہ صرف مشق کر رہا تھا اور اسے صرف اپنے گھنٹے پورے کرنے تھے۔ فلائنگ سے متعلق اس کے ذہن میں کوئی واضح خاکہ ہی نہیں تھا کہ اسے اس نے کہاں استعمال کرنا تھا، وہ اسٹوڈنٹ پائلٹ کورس کر رہا تھا اور اس وقت اس کے ذہن میں صرف یہ بات تھی کہ اسے آسمان کی بلندیوں کو چھونا اور فضا کی وسعتوں کو پانا ہے۔

☆☆☆

اس نے بہت دلچسپی سے زوئی حسین کی چپٹی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور پتلے ہونٹوں کو دیکھا، وہ مخصوص چینیوں جیسے خدوخال کی حامل تھی، اپنی انتہائی سفید رنگت کی وجہ سے گڑیا جیسی لگتی تھی۔ اس نے سرخ اور کالے رنگ کے امتزاج کے چیک پرنٹ والا اسکرٹ پہن رکھا تھا اور سفید بلاؤز۔

''جاپانیوں اور چینیوں کے نقوش میں کچھ فرق ہوتا ہے، ان کے نقوش چھوٹے چھوٹے اور تم لوگوں کے پھیلے پھیلے سے ہوتے ہیں۔'' اس نے اسے دیکھتے ہوئے رائے زنی کی۔

''تم بوت مین ہو۔'' زوئی نے اپنی ٹانگ پر خارش کرتے ہوئے کہا۔ اسے کچھ دیر پہلے اس وقت بھڑ نے کاٹ لیا تھا جب وہ لیبارٹری سے ملحقہ لان میں کسی پھول کی خوب صورتی پر فدا ہوتی اسے قریب سے دیکھنے کے لیے چلی گئی تھی۔

''ارے کیوں، کیا ہوا؟'' وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔

''میرا ٹانگ پر بھڑ کاٹ گیا، تم ہنس رہے ہو۔'' زوئی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''اوہ آئی ایم سو سوری۔'' وہ زبردستی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو بری بات ہے مگر زوئی یار یہ تم گھٹنوں تک اسکرٹ پہن کر اپنی باقی کی سفید سفید ٹانگوں کی نمائش کرتی ہو ناں یہ ایمان سے ہم سے نہیں برداشت ہوتیں، ہماری بھڑیں کیا کریں۔''

''گھٹنوں تک کہاں ہے۔'' زوئی نے نادانستہ طور پر اپنے اسکرٹ کو نیچے کھینچتے ہوئے کہا۔ ''دیسے لوگ کا دھیان ایسی باتوں پر زیادہ جاتا ہے۔ ایمان کمزور ہے تمہارا۔''

''ایمان......'' وہ مسکرایا۔ ''اچھا یہ بتاؤ زوئی تمہارا کوئی ایمان ہے، کسی دین کو مانتی ہو تم؟''

''واہ جی۔'' زوئی نے اپنی چھوٹی، چھوٹی آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''جیسے صرف آپ مسلمان ہو، الحمدللہ میں پکی مسلمان ہوں۔''

''ارے آپ پکی مسلمان ہیں۔'' وہ پھر سے ہنس دیا۔ ''اور ہم سب کچے مسلمان ہیں؟'' اس نے سوال کیا اور پھر زوئی کا ناراض چہرہ دیکھ کر پھر سے سنجیدہ ہو گیا۔ ''میں سمجھا تم نے اپنے نام کے ساتھ حسین کا لاحقہ صرف یہاں رہنے کے خیال سے لگایا ہے تاکہ لوگ تمہیں سانپ، چھپکلیاں کھانے والی نہ سمجھیں، اچھا تو تم پکی مسلمان ہو، نماز بھی پڑھتی ہے کبھی کہ نہیں، آتی ہے پڑھنی؟''

''آتی ہے پڑھنی۔'' زوئی نے روٹھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مگر کبھی کبھی پڑھتی ہوں۔'' پھر اس نے شرمندہ ہوتے ہوئے اعتراف کیا۔ ''میرے پاس قرآن پاک ہے جو تین زبانوں میں ہے، عربی، انگلش اور چائنیز، وہ میں اکثر پڑھتی ہوں۔''

''اوہ ویٹس گریٹ۔'' وہ بے اختیار بولا۔ ''مجھے چائنیز مسلم بہت دلچسپ لگتے ہیں۔ کبھی حج پر جانے سے پہلے ان کا کیمپ دیکھا تھا اسلام آباد میں، چینگو مینگو چھوٹی چھوٹی داڑھیوں اور چھوٹے چھوٹے قد والے، یار کمال کے تاجر ہوتے ہیں یہ لوگ، اس موقع پر بھی تجارت کر رہے ہوتے ہیں۔''

''تم لوگ کتنے سکون اور بے رحمی سے دوسرے لوگوں پر تبصرہ کر لیتے ہو۔'' زوئی نے کہا۔ ''تم لوگوں کو اس کے سوا کوئی کام نہیں۔ ہائے......'' بات بات کرتے کرتے اسے اس جگہ پھر چبھن کا احساس ہوا جہاں بھڑ نے کاٹا تھا۔ اس نے جھک کر اسکرٹ اوپر اٹھا کر دیکھا وہ جگہ سرخ ہو رہی تھی اور اس پر سوجن بڑھ رہی تھی۔

''میں مین آفس سے کوئی دوا لے کر لگا لوں۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم تو صرف اور صرف باتیں بنانا جانتے ہو۔'' وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اندر کی طرف چل دی۔ نادر مراد نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ پچھلے چھ ماہ سے زوئی حسین کے ساتھ کام کر رہا تھا اور اسے یہ چائنیز لڑکی بہت دلچسپ محسوس ہوتی تھی۔ اسے اس بات پر اکثر حیرت ہوتی کہ اپنا وطن اور گھر بار چھوڑ کر وہ یہیں رہ گئی تھی کیونکہ اس کے بقول اسے اس ملک سے محبت ہو گئی تھی۔ اسے یہاں بہت سے غیر موافق حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا مگر پھر بھی ایسا لگتا تھا جیسے وہ یہاں ارچ بس جانے کی خواہش رکھتی تھی۔

''تمہیں یہاں رہنے میں کیا مزہ آتا ہے زوئی، یہاں کے لوگوں کا رویہ کچھ ایسا اچھا تو نہیں؟'' وہ کہتا۔

''یہ تو ہوتا ہے، کسی بھی غیر ملکی کو کہیں بھی حیرت سے ہی دیکھا جاتا ہے۔'' وہ سکون سے جواب دیتی۔

''تمہیں دکھ نہیں ہوتا؟'' وہ حیرت سے پوچھتا۔

''نہیں کیا......'' وہ بے نیازی سے کہتی۔ ''ایک دن میں اس ملک کی فرد بن جاؤں گی۔ اس کا حصہ بن جاؤں گی۔''

''وہ کیسے؟'' وہ دلچسپی سے پوچھتا۔ ''تمہاری ریسرچ ختم ہو گئی تو تمہیں یہاں سے جانا پڑے گا۔''

''ہم نے سوچ لیا ہے، میں کسی پاکستانی سے شادی کر لوں گی۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں جواب دیتی۔

''ارے......!'' نادر مراد نے یہ بات پہلی مرتبہ سنی تو وہ حیران رہ گیا۔ ''تم کسی پاکستانی سے شادی کرو گی؟''

''ہاں تو اور کیا۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔ ''کیوں کیا پاکستانی سے شادی نہیں کر سکتی میں؟''

''مشکل سی بات معلوم ہوتی ہے۔'' وہ محظوظ ہوتے ہوئے بولا تھا۔

''کیوں، کیا پاکستانی غیر ملکی لڑکیوں سے شادی نہیں کرتے؟'' اس نے معصومیت سے سوال کیا تھا۔

''کرتے ہیں، کیوں نہیں کرتے۔'' نادر مراد نے جواب دیا۔ ''بلکہ اکثر اس غیر ملکی لڑکی سے شادی کرتے

ہیں جن سے انہیں کوئی فائدہ ہو جیسے کسی دوسرے ملک کی نیشنلٹی کے لیے، روپے پیسے کے لیے یا پھر ایسے ہی اور لالچ کے لیے۔''

''ایسا کوئی لالچ تو میرے پاس نہیں ہے کسی کو دینے کے لیے۔'' نادر مراد کو محسوس ہوا زوئی کو یہ سن کر ... سا ہوا تھا۔ ''ارے.....'' پھر اسے اچانک کوئی خیال آیا۔ ''محبت کی شادی نہیں کرتے کسی غیر ملکی لڑکی سے؟''

''محبت.....'' نادر مراد دل کھول کر ہنسا۔ ''کرتے ہوں گے۔'' زوئی کا بگڑتا چہرہ دیکھ کر اس نے ... اپنی ہنسی کنٹرول کی۔ ''مگر میں نے کسی پاکستانی لڑکے کو کسی چینی لڑکی سے محبت کرتے اور پھر شادی کرتے ... دیکھا ہے نہ سنا ہے اس لیے کچھ کہہ نہیں سکتا۔''

''کیوں، چینی لڑکیوں سے محبت نہیں ہو سکتی؟'' وہ ایک بار پھر حیرت اور مایوسی کے عالم میں بولی۔

''پتا نہیں۔'' وہ شانے اچکا کر بولا۔ ''میں نے نہیں دیکھا۔''

''روپے پیسے اور نیشنلٹی کے علاوہ کسی کو صرف بیوی کی بھی تو ضرورت ہوتی ہوگی، یہ بھی تو ایک ... ہے۔'' وہ بولی۔ ''ایک کماؤ بیوی۔''

''سوچ لو۔'' نادر مراد معنی خیز انداز میں بولا۔ ''ایسا تو کوئی گڈ فار نتھنگ قسم کا شخص ہی کہے گا۔ ورنہ بیویوں کی کیا کمی ہے اسے بیوی ہر طرح کی مل جاتی ہے یہاں۔''

''چلو گڈ فار نتھنگ ہی سہی۔'' زوئی نے اس کی آخری بات نہیں سنی۔ وہ غالباً ایک ہی نکتے کو سوچ رہی تھی۔ ''مجھے پاکستانی نیشنلٹی تو مل ہی جائے گی اس سے شادی کر کے، تم پلیز میرے لیے کوئی ایسا ڈھونڈ دو۔'' پھر اس نے ملتجیانہ انداز میں نادر مراد سے کہا۔

''میں.....'' نادر مراد حیران رہ گیا۔ ''یار میں کہاں سے دیکھوں گا، کون مانے گا میری بات ہی؟''

''وہ بھی تو ہوتے ہیں جو غیر ملکی...... لڑکیوں کو خرید کر ان سے شادی کرتے ہیں۔'' زوئی نے یاد دلایا۔ ''کیونکہ ان کو ایک بیوی کی ضرورت ہوتی ہے، ایسا ہی کوئی ڈھونڈ دو۔''

''ارے... رے.....'' نادر مراد اس کی اس انوکھی خواہش پر حیران رہ گیا۔ ''تم گزارہ کر لو گی کسی بھی شخص کے ساتھ؟''

''ہاں۔'' زوئی نے مختصر جواب دیا۔ ''کچھ ایسا ہو جائے جس کے ذریعے مجھے نیشنلٹی مل جائے، ... رہنا ہے پلیز۔''

''بہت ہی حیران کر دینے والی بات ہے۔'' نادر مراد نے اس گفتگو کے بعد بارہا سوچا۔ ''ایسی کیا بات ہے اس ملک میں جو یہ لڑکی تمام عمر یہاں ہی گزارنے کے لیے دیوانی ہو رہی ہے۔'' اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی۔ وہ زوئی کی شخصیت کے اس عجیب و غریب پہلو پر اکثر سوچا کرتا تھا۔

☆☆☆

If I had a single flower for every time I think about you, I would walk for ever in my garden.

(اگر تمہارے بارے میں سوچنے پر ہر بار مجھے ایک پھول عنایت ہوا کرتا تو میری تمام عمر تمہارے خیال کے باغات میں گھومتے گزر جاتی)

زرنگار نے اپنے سیل فون پر آیا یہ پیغام پڑھا اور بار بار پڑھا۔ اسے ان الفاظ کی سچائی اور خلوص

برابر بھی شک نہیں تھا۔ گزشتہ رات...... ایک طویل اور جاگتی رات تھی...... ایسا بہت عرصے کے بعد ہوا تھا کہ اسے ایک طویل رات جاگنے میں مزہ آیا تھا۔ وہ رات کہانی کہتے گزری تھی۔ اس کے روبرو ایک ہمہ تن گوش اور محو سامع تھا، جس کے چلے جانے کے بعد بھی اس کی شخصیت کا اثر ہر چیز پر موجود محسوس ہوتا تھا، در و دیوار، صوفہ، بیڈ، کرسیاں، قالین، سب کسی ایسے کی آمد اور رخصت کی گواہی دے رہے تھے جو انتہائی جاندار شخصیت کا حامل تھا جو مختلف تھا بہت مختلف۔ زرنگار اس شخصیت کے جادو میں کھوئی ہوئی تھی۔

''یہ پہلی رات تھی، کیسی گزری؟'' امراؤ بیگم نے خصوصی طور پر اس کے کمرے میں آکر اس سے پوچھا تھا۔

''راتیں تو ہمیشہ سے آتی رہی ہیں اماں، پہلی دوسری کا کیا ذکر۔'' اس نے اسے ٹالنا چاہا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ میں کس لحاظ سے پہلی رات کی بات کر رہی ہوں چندا۔'' امراؤ بیگم کے لہجے اور زبان میں شیرینی تھی۔ نہ جانے کیوں زرنگار سے بات کرتے ہوئے وہ مرعوب اور محتاط ہی رہا کرتی تھی۔

''ہر نئی بات، ہر نئی چیز سامنے آتی ہے اور گزر جاتی ہے، ایسے ہی یہ بھی گزر گئی۔'' زرنگار نے ایک اور ایسی بات کی جو مبہم تھی۔

''جسم فروشی دنیا کا سب سے بڑا کاروبار ہے میری چندا۔'' امراؤ بیگم نے ایک برہنہ حقیقت پر سے نادیدہ پردہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں یہ کاروبار نہ ہوتا ہو، کیا امیر ملک، کیا غریب ملک...... یہ کاروبار اتنا وسیع اور اتنا منافع بخش اس لیے ہے کہ انسان کی فطرت پر نفسانی خواہشات کا غلبہ ہے، بھوک کے بعد یہ دوسری بڑی ضرورت ہے انسان کی، بہت بھوکا انسان پیٹ بھر لے تو پیٹ کی بھوک پر نفس کی بھوک غالب آجاتی ہے اور دنیا کا سب سے بڑا کاروبار اسی ایک بھوک پر قائم و دائم ہے۔''

زرنگار کے لیے اب یہ گفتگو نئی نہیں رہی تھی مگر اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ الفاظ اس کی سماعتوں پر ہتھوڑے برسا رہے ہوں۔ ''کس بے شرمی سے ایک انتہائی گھٹیا کاروبار کی تاریخ اور اہمیت پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔'' اس نے سوچا تھا۔

''ہر انسان کی تقدیر لکھی جا چکی ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔'' پھر امراؤ بیگم نے ایک نئی بات کہنا شروع کیا۔ ''ہم ڈیرے دار کوٹھے والیاں ہیں پیدائشی، نہ ہم نے اس جگہ پیدا ہونے کی خواہش کی نہ ہی ہم سے پوچھا گیا ہم کس سے احتجاج کرتے؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے زرنگار کو دیکھا اور اس کا سپاٹ چہرہ دیکھ کر دوبارہ دیا ہوا۔ ''یہ فضائیں ایسی ہیں جن میں سے کسی کا گزر بھی ہو جائے تو اس کی ذات مشکوک ہو جاتی ہے اور ہم جیسے جو پیدائشی طور پر ہی یہاں کے ہیں کو یہاں سے باہر عزت کوئی نہیں دیتا، اس لیے ہمارا یہاں سے باہر نکل جانے کی خواہش کرنا حماقت کی انتہا ہی کہلایا جا سکتا ہے۔'' زرنگار کو اس گفتگو میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی، نہ ہی اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ امراؤ بیگم یہ باتیں اسے کیوں سنا رہی تھی۔

''ایک انسان وہ ہوتا ہے جو پیدا ہی غریب گھرانے میں ہوتا ہے، ایک وہ ہوتا ہے جسے حالات غربت کی طرف لے جاتے ہیں، وہ جو عادی ہوتا ہے اس کے بجائے وہ جسے یہ حالات برداشت کرنے پڑیں، بہت مشکل سے وقت گزارتا ہے...... کوئی انتہائی تندرست انسان اچانک بیمار پڑ جائے تو اس کی اذیت کا اندازہ لگاتا مشکل ہے، اسی طرح وہ لڑکی ہے جو پیدائشی کوٹھے والی نہیں حالات کی ستم ظریفی کے باعث ان فضاؤں میں آ جائے تو اس کی اذیت بھی بہت بری ہوتی ہے......'' امراؤ بیگم نے بات کرتے کرتے ذرا توقف کیا۔

''تو......؟'' زرنگار نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''تو یہ میری چندا کہ امارت سے غربت کی طرف آنے والے کو بھی غربت کا عادی بننا پڑتا ہے، جس کو بھی بیماری کی اذیت سہنا پڑتی ہے اور وہ جو کوٹھے والی نہیں اسے بھی قبول کرنا پڑتا ہے کہ جس فضا کا سایہ پر پڑ چکا ہے اس کے اثر سے نکلنا ممکن نہیں۔''

''بہت بڑی بات کی۔'' زرنگار نے تلملاتے ہوئے سوچا۔ اس کا خیال تھا کہ امراؤ بیگم اس کی اس سے ہمدردی کا اظہار کرنے والی تھی یا اسے کسی اچھی بات کی نوید دینے والی تھی۔

''اسی برصغیر پاک و ہند میں بڑی بڑی بادشاہ زادیوں کو غدر نے کوٹھوں پر پہنچا دیا، وہ کس کرتیں۔'' امراؤ بیگم نے اس کی خاموشی پر ایک اور دلیل دینے کی کوشش کی اور امید بھری نظروں سے اس جانب دیکھا شاید اس کا مزاج بہتر ہو گیا ہو۔

''تم خوش قسمت ہو۔'' ایک اور بھونڈی دلیل شروع ہوئی۔ ''جو یہاں آئیں تو کیا راج پایا، ایک سردار مہر زاد خان تمہاری ایک ہزار راتوں کے لیے پیشگی رقم دینے پر تیار ہے اور کوئی شرط نہیں رکھتا، اس بڑی خوش قسمتی کیا ہوگی تمہاری.....''

''خوش قسمتی؟'' زرنگار نے حیرت سے امراؤ بیگم کی جانب دیکھا۔ ''اوہ ہاں اماں! میں بھول گئی تھی کہ جگہ پر خوش قسمتی کا مفہوم مختلف ہے۔''

''مگر میں ایسے سودے کرنے کی قائل نہیں ہوں، ایک ہی شخص کے نام لکھ دوں تمہیں اور تمہاری خوب صورتی کو۔'' امراؤ بیگم نے ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

''خوب صورتی کا ریٹ کبھی فکس نہیں ہوتا اس منڈی میں، خوب صورتی کو زبان ملنے کی دیر ہوتی ہے ریٹ یوں چڑھتا ہے چٹکیوں میں۔'' اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اب اگر یوں پیشگی پکڑ لوں مہر زاد خان سے ایک ہزار راتوں کی تو ریٹ چڑھنے کے زمانے میں تو ہم خسارے میں گئے ناں، اس لیے میں نے سوچا ہے کہ اس سے بات کر دوں، ہمیں ہر رات کا الگ معاوضہ چاہیے، منظور ہوگا تو مان لے گا ورنہ یہاں دل والے بہت۔''

زرنگار کو اس گفتگو کو سن کر عجیب متلی سی ہو رہی تھی۔ کتنی آسانی سے ایسی باتیں کی جا رہی تھیں جن پر انسان کٹ مرے۔

''کہانیاں کہنے اور سننے کا معاوضہ ضرورت سے زیادہ طلب کیا جا رہا ہے مگر مجھے آپ پر بھروسا بھی ہے اور اعتماد بھی اور آپ کا یقین بھی ہے۔'' اس روز مہر زاد خان کو زرنگار کی جانب سے پیغام ملا تھا۔

☆☆☆

''تمہیں کبھی ماں کا خیال نہیں آیا، تمہیں یاد ہی نہیں آتا کہ تمہاری کوئی ماں بھی ہے۔'' مہرین نے حمزہ سے نہ جانے کون سی بار گلہ کیا۔

''ایسی بات نہیں ہے ممی، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' حمزہ نے مخصوص الفاظ دہرا دیے۔

''ایسی ہی بات ہے، سب لوگ مجھ سے یہی کہتے ہیں کہ حمزہ کو آپ میں اور اپنے بہن بھائیوں میں کوئی دلچسپی ہے ہی نہیں، تم جانتے ہو مجھے یہ بات سن کر کتنی شرمندگی ہوتی ہے۔''

''آپ کو شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ایسی کوئی بات ہے ہی نہیں۔'' اس نے ان کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

''تمہیں یاد ہے کہ تم آخری مرتبہ ہمارے پاس کب آئے تھے؟'' انہوں نے سوال کیا۔ ''مجھے بالکل یاد نہیں، لگتا ہے کئی سال گزر گئے۔'' انہوں نے کہا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ مجھے آپ سے ملے کافی عرصہ ہوگیا مگر اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں آپ لوگوں سے ملنا نہیں چاہتا بلکہ کچھ مصروفیت ایسی رہی کہ میں اتنا وقت نہیں نکال سکا، آپ جانتی ہیں کہ میری جاب ابھی زیادہ پرانی نہیں ہے، مجھے اس میں ایڈجسٹ ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔''

''جاب تو سب ہی کرتے ہیں، یوں ماں باپ کو چھوڑ کر جاب کرتے کسی کو نہیں دیکھا۔'' وہ اپنی بات پر مُصر تھیں۔

''چلیں ٹھیک ہے، میرا آپ سے وعدہ رہا کہ اس ویک اینڈ پر میں سب کام چھوڑ کر آپ کے پاس ضرور آؤں گا۔''

''دیکھتے ہیں تم کتنا اپنے وعدے کا پاس کرتے ہو۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میں نے تمہیں پا کر بغیر کھو دیا ہے۔''

مہرین کے اس آخری جملے نے حمزہ کو اداس کر دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک عمر کے بعد اپنی ماں کے دل میں امڈ آنے والی ممتا کا وہ کیا کرے۔ ماں کے دل کے اس جذبے کی کمی کو اس نے ہمیشہ محسوس کیا تھا مگر اسے بِن کہے، بِن پوچھے بہت بچپن ہی میں اس سے محروم کر دیا گیا تھا۔ کسی روشن اور صاف سلیٹ کے مانند اس کے ذہن نے وہی قبول کر لیا جو اس پر لکھا گیا۔ وہ ماں سے محروم ہوا مگر ممتا سے شاید اس طرح محروم نہیں ہوا جیسا حالات کے مطابق اسے ہونا چاہیے تھا۔ بی اماں کی گود میں اس نے ہمیشہ وہی نرمی اور وہی وسعت محسوس کی جو ماں کی گود کا خاصہ ہوتی ہے۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ سود سے بڑھ کر بیاج والی بات کے مطابق بی اماں شاید اسے اپنی سگی اولاد سے بھی زیادہ چاہتی تھیں۔ وہ ان کا ادھیڑ عمری کا مشغلہ بن گیا تھا جسے انہوں نے بڑی محبت سے پورا کیا تھا، وہ پیچھے نظر دوڑا کر دیکھتا تو اسے ایسی کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی جسے وہ محرومی قرار دے سکتا لیکن پھر بھی جب وہ مہرین سے ملتا تو اسے دل میں ایک کسک ضرور محسوس ہوتی شاید اس کا دل ایک مکمل گھر، ایک مکمل خاندان کی خواہش کرتا تھا لیکن اسے یہ اچھی طرح یاد تھا کہ جب کبھی اسے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے درمیان رہنے کا موقع ملا اسے اپنا آپ بے جگہ محسوس ہوا۔

''ڈال سے گرا پھل دوبارہ ڈال پر نہیں لگ سکتا۔'' اسے بی اماں کی کہی یہ بات سچ محسوس ہوتی۔ وہ چند دنوں میں ہی اکتا کر واپس بی اماں کے پاس جانے کی خواہش کا اظہار کرنے لگتا۔ نہ اسے وہ ماحول پسند آتا نہ ہی اپنے بہن بھائیوں کی عادات، واپس بی اماں کے پاس پہنچ کر وہ گویا سکھ کی سانس لیتا۔ اس کی زندگی کے یہ دونوں رخ زندگی کا حصہ بن گئے تھے اور شاید اس کے مزاج پر اثر انداز بھی ہوئے تھے۔ بی اماں کے چلے جانے کے بعد اسے پوری دنیا میں اپنا آپ تنہا اور اداس لگتا تھا۔ اس وقت میں ماں باپ کی غیر معمولی توجہ اور پیار بھی تنہائی اور اداسی کے اس احساس کو ختم نہ کر پائے تھے نہ ہی وہ خود کو ان سے قریب محسوس کر پایا تھا۔ بی اماں کے بعد زندگی ہی بدل گئی تھی اس نے خود کو پڑھائی اور مستقبل کی منصوبہ بندی میں مصروف کر لیا تھا۔ وہ کم ہی گھر جاتا تھا۔ اسے اپنے بہن بھائیوں سے خواہش اور کوشش کے باوجود قربت محسوس نہیں ہو سکی۔ کبھی کبھار تو اسے اپنا آپ اتنا تنہا محسوس ہوتا کہ اس کا دل گھبرا جاتا۔ ایسے میں اسے نگین کی یاد آتی جو اس کی سگی ماموں زاد بہن اور بچپن کی ساتھی تھی۔ نگین سے اس کی اچھی ذہنی ہم آہنگی تھی اور وہ اپنے دل کی اکثر باتیں اس سے کر لیا کرتا تھا۔ وہ نگین کی شادی شدہ زندگی کی باتیں بھی بڑے دھیان اور دلچسپی سے سنا کرتا تھا۔ اس کے

مسائل سنتا اور بساط بھر انہیں سلجھانے اور مشورہ دینے کی کوشش بھی کرتا تھا، نگین کے میاں اشعر سے اس کی اچھی دوستی ہوگئی تھی، اسی وجہ سے نگین سے تعلق قائم رکھنے میں بھی آسانی تھی مگر اس روز اپنی اصلی اور حقیقی ماں کا شکوہ سن کر اسے احساس ہوا تھا کہ وہ غلطی کر رہا تھا۔ ماں باپ کی عدم دلچسپی سے اسے بچپن سے ہی ان کی قربت کے جس بنیادی حق سے محروم کر دیا تھا وہ اس کی قسمت تھا۔ دنیا کی کوئی دلیل بھی ماں باپ کے حقوق پورے نہ کرنے کی حمایت نہیں کر سکتی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے ایک بنیادی فرض سے مسلسل کوتاہی کر رہا تھا۔ یہ بھی بی اماں کی سخت تربیت کا اثر تھا کہ اسے گناہ، ثواب اور نیکی، بدی کے تقریباً سارے سبق رٹے ہوئے تھے، حقوق و فرائض کا باب بھی یاد تھا، اسی لیے اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے اپنے ماں باپ کے سلسلے میں ہر حال میں اپنا رویہ بدلنا تھا۔

☆☆☆

''یہ لڑکی اس کالج آف آرٹس کا حصہ معلوم نہیں ہوتی۔'' دانیال نے اس روز آئی پیڈ پر پچھلے فنکشن کی تصویریں دیکھتے ہوئے خیال ظاہر کیا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی پنسل جس چہرے کی طرف اشارہ کر رہی تھی، ثمرین اس کو بہت اچھی طرح جانتی تھی۔

''ارے یہ بینش ہے۔'' ثمرین نے اسے بتایا۔ ''ہاں یہ ذرا مختلف ہے۔''

''انٹرسٹنگ۔'' دانیال نے لڑکی کے سر پر اچھی طرح اوڑھے گئے دوپٹے کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کچھ بدحواس سی شخصیت کی مالک ہے۔'' اس نے خیال ظاہر کیا۔

''ارے، بے چاری کا پس منظر ہی ایسا ہے۔'' ثمرین نے تصویریں آگے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔ ''اندرونِ لاہور کی باسی ہیں محترمہ۔'' اس نے مزید معلومات گوش گزار کیں۔

''ہوں۔'' دانیال نے غور سے بینش کی تصویر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اندرونِ لاہور کی باسی کیا یہاں پڑھنے نہیں آسکتی؟'' اس نے یہ سوال ثمرین کی طرف دیکھے بغیر کیا تھا۔

''خیر یہ تو میں نے نہیں کہا۔'' ثمرین نے شانے اچکائے۔ ''مگر کچھ ایڈجسٹ نہیں کی اس کی شخصیت ڈیپارٹمنٹ کے ماحول میں۔''

''کر جائے گی..... کر جائے گی۔'' دانیال نے خیال ظاہر کیا۔ ''ویسے یہ سوچنا بالکل غلط ہے کہ دوپٹا سر پر اوڑھنے والی اور اندرونِ لاہور سے تعلق رکھنے والی بہت زیادہ انگریزی نہ جاننے والی لڑکی ڈیزائننگ نہیں پڑھ سکتی۔ تمہیں بتاؤں اصل اور سچا ٹیلنٹ اسی کلاس سے نکلتا ہے، تم نے ہنرکدہ میں جا کر دیکھا ہے وہاں کیسے لوگ پڑھنے اور سیکھنے آتے ہیں۔'' اس نے ثمرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اس کی طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پر خود ہی بولا۔ ''وہ لوگ جن کی این سی اے اور اس کالج آف آرٹس تک رسائی ممکن نہیں ہو پاتی، کسی بھی وجہ سے مگر یار کیا کمال کے فنکار ہیں وہ لوگ، ان کی مہارت کے آگے تو ہم بھی پانی بھرتے ہیں۔''

''اس لڑکی بینش میں بہرحال مجھے تو کوئی ایسی غیر معمولی صلاحیت نظر نہیں آتی، میں تو اس کے انٹری ٹیسٹ پاس کرنے اور میرٹ پر آجانے پر حیران ہوں۔'' ثمرین نے بے نیازی سے کہا۔

''اس نے تمہیں ایک بات پر حیران کر دیا، ممکن ہے آنے والے وقت میں بہت سی اور باتوں پر بھی حیران کر دے۔'' دانیال نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''بعض اوقات بہت معمولی لوگ انتہائی غیر معمولی کام کر جاتے ہیں یاد رکھنا۔''

''تم یہ بات ایسے کر رہے ہو جیسے تمہیں اس کا یقین ہو، کیا یہ کوئی پیش گوئی ہے؟'' ثمرین نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں طنز تھا یا تمسخر دانیال تفریق نہ کر پایا۔

''میں کوئی قسمت کا حال بتانے والا تو ہوں نہیں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن کچھ چہرے ایسے ہوتے ہیں جن پر کچھ باتیں واضح لکھی نظر آ جاتی ہیں۔ اس لڑکی کے چہرے پر تین باتیں واضح لکھی نظر آ رہی ہیں۔ شوق، عزم اور یقین...... ایک معمولی چہرے پر یہ تین انتہائی غیر معمولی چیزیں اتنی واضح نظر آئیں تو چونک جانا لازم ہے ثمرین بی بی۔''

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم چہرے پڑھ لینے کا فن بھی جانتے ہو۔'' ثمرین نے دل میں ذرا سی جلن محسوس کرتے ہوئے کہا۔ اسے اپنے متعلق یہ زعم تھا کہ دانیال جیسا لیے دیے رہنے والا لڑکا صنفِ نازک میں صرف اس کے قریب تھا، اسے بینش میں دانیال کی یہ دلچسپی بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

''میں چہرے پڑھ لینے کا فن نہیں جانتا ہوں، یہ تو ایک عام فہم سی بات ہے۔ بعض چہرے ہوتے ہی ایسے ہیں جن پر ایک نظر ڈالنے سے ہی شخصیت کے چند اسرار سمجھ میں آ جاتے ہیں۔'' دانیال نے ثمرین کے لہجے کی چبھن کو محسوس کیا اور دل ہی دل میں اس پر ہنس دیا۔

اس کے بعد اس نے خود بھی محسوس کیا کہ وہ لاشعوری طور پر اس لڑکی بینش کی شخصیت کا مشاہدہ کرنے لگا تھا۔ بظاہر اس دلچسپی کی کوئی وجہ نہیں تھی مگر وہ اس لڑکی میں دلچسپی لینے لگا تھا۔

☆☆☆

''ہم صدیوں سے رائج قانون اور قرنوں سے چلی آتی روایات کو یکسر ختم نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے ہمیں وقت چاہیے، ہم یہ بھی بتا دینے پر قادر نہیں ہیں کہ ہمیں کتنا وقت چاہیے، شاید اس میں سالہا سال لگ جائیں، شاید آنے والی کئی نسلوں کو اس کے لیے تردد کرنا پڑے، کوشش کرنی پڑے۔'' یشل رئیس نے دھیان سے اس شخص کی بات سنی جس کے انٹرویو کے لیے اس پانچ ستارہ ہوٹل میں آئی تھی جس میں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔

''اس لیے کہ آپ لوگ اس علاقے کے قانون اور روایات کو ختم کرنا یا بدلنا چاہتے ہی نہیں۔'' یشل نے ایک سخت بات کی۔ ''موجودہ نظام اور روایات کو برقرار رکھنے میں ہی آپ کی بقا مضمر ہے۔ یہ نظام اور اصول بدلے نہیں اور آپ کا غلبہ گیا نہیں۔''

''ہمارے جیسے لوگوں پر اس قسم کی تنقید اب ایک پرانی بات ہوگئی۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ ''آپ یہ بتائیں کہ وفاقی حکومت نے کون سا انقلابی اقدام اٹھایا اب تک اس علاقے کی ترقی کے لیے جہاں انسان اور حیوان ایک ہی جگہ سے پانی پینے پر مجبور ہیں۔ ہم جیسے بھی ہیں وفاق کے باغی تو ہرگز نہیں۔ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر جتنے مضمون اور ریویو ان علاقوں کے حالات پر لکھے جاتے ہیں وہ اسٹیبلشمنٹ میں موجود لوگوں کی نظروں سے بھی گزرتے ہوں گے۔ ان کو کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ دراصل حقیقت یہ ہے کہ نظریں چرانا اوپر سے نیچے تک ہم لوگوں کا مشغلہ بن چکا ہے اور ایک دوسرے کو کوتاہیوں کے الزام دینا ہمارا شیوہ۔ انہی مشغلوں اور شیووں کو بہلانے کے دوران اصل مسائل نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔''

''آپ نے بھی ابھی یہی کیا ہے، آپ نے باتوں کے طوطا مینا میں مجھے ٹال دینے کی کوشش کی ہے مگر خان صاحب معاف کیجیے گا آپ اصل مسائل سے کوتاہی اور چشم پوشی کریں گے تو زیادہ قابلِ گردن زنی ہوں گے۔'' یشل رئیس نے سخت لہجے میں کہا۔ ''آپ کا تعلق نوجوان نسل سے ہے اور آپ کی تعلیم آپ کو روشن

خیال اور انقلابی سمت عطا کرنے کے لیے کافی ہے۔ آپ کو وقت کے تقاضوں کا اندازہ دوسروں سے بہتر طور پر ہونا چاہیے۔ آپ اس طرح معاملات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔''

''آپ درست کہتی ہیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''مگر آپ یہ مت بھولیے کہ وقت کے تقاضے کو سمجھنے کا فرض صرف ہم پر ہی نہیں آپ پر بھی ہے۔ آپ کے پیشے کے تقاضے بھی بدل گئے ہیں۔ درست اور مثبت تنقید جو تعمیری بھی ہونی چاہیے، آپ کے پروفیشن کا سلوگن ہے۔ صدیوں سے چلی آ رہی روایات پر تنقید درست مگر ہم جیسے لوگوں کو درست سمت کی نشاندہی کرنا اور مسائل کے ممکنہ حل کی طرف رہنمائی آپ لوگوں کا بھی فرض ہے۔ آپ اپنا فرض نبھائیں اور ہمیں ہمارا نبھانے دیجیے۔ ممکن ہے ہم بہتری کی طرف گامزن ہو جائیں اور انقلاب لانے کے لیے نسلوں کی کاوش کا انتظار نہ کرنا پڑے۔''

''ہوں......'' یشل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''آپ اپنے علاقے میں نہری پانی کی تقسیم بہتر بنانے، تعلیمی اداروں کو آباد کرنے اور خواتین کے حقوق کی بحالی جیسے مسائل کے حل کے لیے کیا اقدامات کر رہے ہیں، خان صاحب اسلام آباد جیسے پُرفضا اور خوشگوار مقام پر بیٹھ کر دل خوش کن باتیں کرنا اور کتابی منصوبوں کا اعلان کرنا بہت آسان ہے مگر ان کو عملی شکل دینا شاید بہت مشکل۔''

''آپ کا تعلق جنوبی پنجاب سے متعلق تحقیقی مطالعہ والے گروپ سے تو نہیں ہے؟'' مہر زاد خان نے دلچسپی سے پوچھا۔ ''ان علاقوں کے مسائل کے متعلق آپ کا علم اور مشاہدہ قابلِ ستائش ہے۔''

''شکریہ۔'' یشل نے سپاٹ چہرے کے ساتھ کہا۔ ''مگر یہ کوئی کمال کی بات نہیں ہے۔ ہم جس شخصیت کا انٹرویو کرتے ہیں اس کے پس منظر اور شخصی خاکے سے متعلق تمام معلومات کا مکمل علم ہونا ہمارے پیشے کا تقاضا ہے، ویسے بھی میرا اپنا تعلق انہی علاقوں سے ہے، سمجھیں کہ میری تحقیق اور علم بہت عملی اور ذاتی ہے شاید اسی لیے حقیقت سے زیادہ قریب ہے۔''

''اوہ، بہت دلچسپ۔'' مہر زاد کے لیے یہ ایک انکشاف تھا۔ ''آپ کا تعلق کس جگہ سے ہے؟''

''بات یہ ہے سر کہ انٹرویو میں کرنے آئی ہوں دینے نہیں۔'' یشل نے پہلی بار مسکرا کر کہا۔ ''کیا بہتر نہ ہوگا کہ ہم آپ کی شخصیت کے کچھ لطیف پہلوؤں کا بھی جائزہ لے لیں۔''

''خوب ٹالا آپ نے۔'' مہر زاد مسکرا دیا۔ ''پوچھیں جو آپ پوچھنا چاہتی ہیں، ویسے کیا آپ کو یقین ہے کہ ہم جیسے سخت جان اور پتھر دل لوگوں کی شخصیات کے کچھ لطیف پہلو بھی ہو سکتے ہیں۔''

''یقیناً ہوتے ہیں بلکہ دیگر لوگوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں۔'' یشل نے مسکرا کر کہا۔

''اوہو...... گڈ۔'' مہر زاد بھی جواباً مسکرایا۔ ''آپ میرے اندازے سے زیادہ باعلم اور واقفِ حال نکلیں، چلیں دیکھتے ہیں آپ کی معلومات کے تھیلے میں کیا، کیا ہے؟''

''یہ ایک اچھا انٹرویو تھا۔'' ہوٹل کی لابی سے باہر نکلتے ہوئے یشل نے سوچا۔ ''یہ شخص صرف کاغذی پڑھا لکھا نہیں ہے، یہ واقعی پڑھا لکھا ہے، اس کی شخصیت میں اسرار ہے۔ اس کی شخصیت عام فہم نہیں ہے مگر یہ بات یقینی ہے کہ خاصی چارمنگ ہستی ہے اور شخصیت کو چار چاند لگانے والے سارے لوازم پورے ہیں اب دیکھنا تو یہ ہے کہ اس کلاس اور اس سیاست کے آکٹوپس اس کو کیسے اپنے پنجوں میں جکڑتے ہیں اور کتنا وقت لگاتے ہیں اس کارِ خیر میں۔'' وہ سوچتے ہوئے آگے بڑھی۔

''حسِ لطیف بھی خاصی لطیف ہے موصوف کی۔'' اس رات اس نے انٹرویو کی ریکارڈنگ دوبارہ سنتے

ہوئے اپنا پیپر ورک شروع کرتے ہوئے خود اپنے ہی سامنے خیال ظاہر کیا تھا۔

☆☆☆

''خدا نے آپ کو چند بنیادی حسیات عطا فرمائی ہیں۔ ان بنیادی حسیات میں سے ایک حس ذائقے کی حس ہے، پیٹ کی بھوک ایک فطری چیز ہے۔ پیٹ کی بھوک مٹانے کو تو سبز چارے سے بھی مٹ سکتی ہے مگر تمدنی ترقی نے انسان کو جہاں اور بہت سی چیزوں کے بارے میں بہتر سوچ اور عمل کی طرف گامزن کیا وہاں پیٹ کی بھوک مٹانے کے نت نئے طریقے بھی سکھائے۔ چقماق رگڑ کر آگ جلانے والے انسان کو کیروسین آئل، بجلی اور گیس کے چولھوں تک سفر کرا دیا، نت نئے مسالوں سے روشناس کرایا۔ جڑی بوٹیوں کا کھانے میں استعمال سکھایا۔ گائے کے دودھ سے گھی بنانے سے لے کر اولیو آئل کو کنگ تک کا سفر انتہائی طویل مگر بہت دلچسپ ہے۔ دیکھ لیجیے کہ فطری امر یعنی پیٹ کی بھوک ایک جیسی ہے مگر اس کو مٹانے کے طریقے ہر خطے، ہر کونے، ہر براعظم، ہر ملک بلکہ ایک ملک کے مختلف حصوں میں مختلف ہیں، سو یہ کہنے والے کہ کوکنگ نہ تو ایک فن ہے اور نہ ہی ایک تاریخ غالباً لاعلمی کی دنیا میں رہتے ہیں، کھانا کھانے سے پہلے کھانے والے کی نظر کو بھائے اور پھر وہ اس بھوک کو مٹائے تو کھانا بنانا ایک فن کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ دنیا کے مختلف کونوں میں بننے والے کھانوں کے ناموں کی فہرست طویل اور ان گنت ہے اور ذائقے کی دنیا کے رنگ بے شمار۔ یہ ایک جدید آرٹ بن چکا ہے۔ یہ ایک ایسا پیشہ بن گیا ہے جو آمدنی کا ذریعہ بھی ہے اور اچھے ذوق کی تسکین بھی۔''

علینہ نے اتوار کے اخبار میں فہد کا طویل انٹرویو پڑھتے ہوئے ان چند لائنوں کو ہائی لائٹ کر دیا اور ایسا یقیناً اس نے لاشعوری طور پر کیا تھا۔

''اس انٹرویو میں ایسی کیا خاص بات ہے جو تم نے اس کو نمایاں کر دیا۔'' ناشتے کے بعد لاؤنج میں بیٹھ کر اخبار پڑھتے، پڑھتے نادیہ نے اس سے پوچھا۔ علینہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اسے یہ خیال ہی نہیں آیا تھا کہ ماما اس روز چھٹی پر تھیں اور چھٹی کے دن وہ اخبار پر نظر ضرور ڈال لیتی تھیں۔ اس نے ایک بار نظر اٹھا کر انہیں دیکھا شاید فہد کے نام اور تصویر کو دیکھ کر انہیں کچھ یاد آ گیا ہو مگر ان کا ذہن ایسے کئی گوناگوں مسائل میں الجھا ہوتا تھا کہ ایسا ہونا ناممکن تھا۔

''مجھے یہ لائنز دلچسپ لگی تھیں اس لیے ہائی لائٹ کر دیا مگر شاید مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' اس نے یوں کہا جیسے کوئی انتہائی بڑی حماقت کر دی ہو۔

''اچھی بات ہے تمہیں مطالعے کی عادت ہونی چاہیے۔'' نادیہ کے ردِعمل نے اسے چونکا دیا۔ ''میں دیکھ رہی ہوں کہ نہ تو تمہارا کوئی مشغلہ ہے، نہ شوق، تم انتہائی غیر فعال اور ڈل زندگی گزار رہی ہو۔ تمہیں چاہیے کہ کوئی کام کرنے کا سوچو۔''

''اللہ، اللہ یہ ماما بول رہی ہیں۔'' علینہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ ''میں کیا کام کروں ماما، میری گریجویشن کام کے لیے کافی نہیں ہے۔ مجھے کہاں جاب ملے گی؟'' اس نے مایوسی سے کہا۔

''میں جاب کی بات نہیں کر رہی ہوں۔'' نادیہ نے اب کے ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بات کی۔ ''میں چاہتی ہوں کہ تم گھر بیٹھے ہی کوئی کام کر لو، تمہیں لکھنے پڑھنے کا شوق ہے، اخبار اتنے ڈھیروں ڈھیر منگواتی ہو مطالعہ وسیع کر لو اور کچھ لکھنے کی کوشش کیا کرو۔''

''لکھنے کی کوشش؟'' علینہ نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ ''لکھنا تو ایک پیدائشی فن ہے۔ لکھ تو صرف

وہ سکتا ہے جو پیدائشی طور پر لکھاری ہو، جس کے اندر یہ جراثیم موجود ہوں، میرے ساتھ تو ایسا کوئی معاملہ نہیں ہے۔ میں تو صرف قاری بن سکتی ہوں اور وہ میں ہوں۔''

''جب انسان پیشگی طور پر یہ فرض کر لے کہ کوئی کام ایسا ہے جو وہ نہیں کر سکتا تو پھر وہ واقعی وہ کام زندگی بھر نہیں کر سکتا۔'' نادیہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''جبکہ میں سمجھتی ہوں کہ جو انسان اتنے وسیع مطالعے کا عادی ہو اس کا مشاہدہ بھی وسیع ہونا چاہیے اس کو لکھنے کا ہنر آنا چاہیے۔''

''میں کوشش کروں گی۔'' علینہ نے آہستہ آواز میں کہا۔ اسے معلوم تھا کہ نادیہ سے بحث کرنا فضول تھا۔

''تمہاری دوستوں کا کیا حال ہے، کبھی ملاقات ہوئی؟'' نادیہ نے ایک اور غیر متوقع سوال کیا۔ علینہ کا دل حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔

''وہ سب مصروف ہیں، کچھ پڑھائی میں اور کچھ اپنے کاموں میں، کبھی کبھار کسی کا فون آ جاتا ہے، ملاقات ہوئے تو دیر ہو گئی۔'' اس نے یہ بات بھی نیچی آواز میں کہی تھی۔

''تم اتنی زرد اور کمزور کیوں ہو رہی ہو، تم اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتیں۔'' یہ بات وہ اکثر کہا کرتی تھیں اس لیے علینہ کو حیرت نہیں ہوئی۔

''انسان کی اچھی صحت کا تعلق صرف خوراک سے نہیں ہوتا، صحت اچھی ہونے کے لیے چند اور لوازم کا ہونا بھی ضروری ہے ماما۔ آپ کیسی ڈاکٹر ہیں جن کو یہ بات سمجھ نہیں آتی۔'' اس نے کہنا چاہا مگر ہمیشہ کی طرح کہہ نہیں پائی تھی۔

''تم کو کب سے پتا کرو، ایم اے کے ایڈمشن کب ہو رہے ہیں اگر تم ماسٹرز کرنا چاہتی ہو تو کر لینا چاہیے، اس بے وجہ کی فرصت کا کچھ علاج ہونا چاہیے۔'' نادیہ نے آخری بات بھی ایسی کی جس نے علینہ کو حیرت کے سمندر میں اچھی طرح غوطے دینے شروع کر دیے۔ علینہ کے خیال میں یہ شاید دنیا کی آخری بات تھی جو نادیہ کرتیں، اس نے اپنی اب تک کی زندگی ماں کے موڈ کے تابع رہ کر گزاری تھی، اسے لگتا تھا جیسے اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں تھی، بہت سی باتیں ایسی تھیں جو وہ کہنا چاہتی تھی مگر اپنے اور ماں کے درمیان جھجک کا ایک ناقابلِ عبور فاصلہ وہ کبھی عبور نہ کر پائی تھی۔ ''مائیں تو از خود بیٹیوں کے دل کی بات کو سمجھ جاتی ہیں، ان کے چہرے دیکھ کر دل کا حال جان لیتی ہیں، ماں اور بیٹی کے رشتے میں اکثر اوقات بات کہنے کے لیے الفاظ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔'' اس نے کہیں پڑھا تھا مگر اسے اپنے اور اپنی ماں کے درمیان ایسا رشتہ کبھی نظر ہی نہیں آیا تھا لیکن اتوار کا وہ دن ایک بالکل مختلف دن تھا۔ اس روز نادیہ نے تین ایسی باتیں کی تھیں جن سے پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا تھا کہ اس کے اور ماں کے درمیان اجنبیت کی دیوار غالباً پہلے سے کچھ چھوٹی ہو گئی تھی۔

اس نے یہ بات فہد کا فون آنے پر اسے بھی کہی تھی۔

''یہ سب میرا کمال ہے۔'' اس نے جواب میں ہنس کر کہا۔ ''نہ تم میرے انٹرویو کو ہائی لائٹ کرتیں، نہ وہ تم سے گفتگو کا آغاز کرتیں۔'' جواب میں اس کی خاموشی پر وہ قدرے سنجیدہ ہو گیا۔ ''جب حق نہ مل رہا ہو تو ناں علینہ تو اسے آگے بڑھ کر چھین لینا چاہیے۔ جب کوئی آپ کی بات سن اور سمجھ نہ رہا ہو تو اسے زبردستی اپنی بات سنانی اور سمجھانی چاہیے۔ اس میں کوئی برائی اور خامی نہیں۔ ضروری نہیں کہ ہمارے بزرگ ہمارے لیے ہمیشہ ٹھیک ہی سوچتے ہوں۔ فیصلہ بھلے وہ ہی کریں۔ ان تک اپنے دل کی بات ضرور پہنچانی چاہیے، تم نے غلط کیا جو اپنی ماما کو ناممکن قرار دے کر ان کے اور اپنے درمیان فاصلے کو قائم ہی رہنے دیا۔ تمہیں چاہیے تھا کہ ان کا

تعاقب کرتیں، ان کی شخصیت پر چڑھے خول کو توڑنے کی کوشش کرتیں اگر یہ خول تمہارے لیے اذیت ناک ہے تو اُن کے لیے بھی کوئی خوشگوار نہ ہوگا۔ ان کی ذات کا کھوج لگانے کا کام صرف تم کرسکتی تھیں لینہ بلکہ کرسکتی ہو، کیوں نہیں کرتیں یہ بتاؤ۔" علینہ کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ فہد کو کیا بتاتی کہ وہ بہت آرام سے ہتھیار پھینک دینے والوں میں سے تھی کیونکہ لڑنے کا ہنر اسے سکھایا ہی نہیں گیا تھا۔

"تمہیں اپنے مزاج کو تھوڑا سا بدلنا پڑے گا لینہ۔" اس کی طرف سے جواب نہ آنے پر وہ خود ہی بولا۔ "دیکھو سیدھی سادی گریجویشن کے بعد شادی کرلینے اور گھر بسا لینے کا زمانہ اب پرانا ہوچکا۔ اب تو لڑکیاں زیادہ سے زیادہ پڑھنے اور ڈگریز لینے کے چکر میں پڑی ہیں، کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں پروفیشنل تعلیم کی حامل لڑکیاں کام نہ کررہی ہوں، شادی بھی کرتی ہیں تو برابری کی سطح پر کرتی ہیں، میاں بیوی ایک گاڑی کے دو پہیے کی مثال کے مطابق اور میرا خیال ہے کہ اگرچہ قربانی کا جذبہ اب بھی لڑکی میں ہی زیادہ ہوتا ہے پھر بھی بدلتے ہوئے حالات کے مطابق آج کی لڑکی زیادہ خوشحال اور بہتر زندگی گزار رہی ہے۔"

"مجھے بہت لمبی چوڑی باتیں نہیں آتیں مگر میں اپنی ہمت سے بڑھ کر کام کیسے کرسکتی ہوں، مجھے میری حدود کا اچھی طرح اندازہ ہے۔" علینہ نے مختصر سی بات کی۔

"حدود کی بھی خوب رہی۔" وہ جواب میں جیسے تلملا کر بولا۔ "جب میں وہاں تھا اس وقت بھی تمہیں وہ کرنے پر اکسایا کرتا تھا جو تمہارا دل چاہتا تھا، میں اب بھی ایسا ہی کروں گا۔ میں اب بھی تمہیں اکساؤں گا کہ اپنی ماما کی متعین کردہ حدود سے باہر نکل آؤ لینہ! میں تمہیں ان سے بغاوت کرنے کو یا ان سے گستاخی کرنے کو نہیں کہہ رہا مگر کچھ حقوق تمہارے بھی ہیں، تمہاری سوچ، تمہارے شوق اور تمہاری سہولت، ان کو بھی احساس دلاؤ کہ یہ تینوں چیزیں تمہارا حق ہیں، وہ تمہیں اتنا فار گرانٹڈ کیوں لیتی ہیں انہیں بتاؤ کہ ان کی بیٹی جسے وہ اپنے پروں تلے دبائے رکھنا چاہتی ہیں، ہونے کے علاوہ بھی تمہاری ایک الگ شخصیت ہے اسے نشوونما پانے دو، اس شخصیت کو خوف اور بے یقینی کے حصار سے نکل کر ایک مضبوط اور قدآور درخت بننے دیں تاکہ آنے والے کل میں اس کی شاخیں بھی کسی کو سایہ دینے کے قابل ہوسکیں، وہ تمہیں تنہا اور رنڈ منڈ درخت بنا رہی ہیں جس کے قریب کوئی بھی نہیں پھٹکتا۔" علینہ کو اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔

"معاف کرنا لینہ، میں کچھ زیادہ ہی تلخ اور درشت ہورہا ہوں۔" کچھ دیر بعد فہد کو خود ہی احساس ہوا۔ "تم مجھے ہمیشہ کی طرح عزیز ہو اور یہ جو اتفاقیہ رابطہ ہمارے درمیان قائم ہوا ہے، میں چاہتا ہوں کہ یہ تمہارے لیے بہتر ثابت ہوسکے۔ تم میں بہت پوٹینشل ہے، بہت ٹیلنٹ، پلیز اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو۔"

"اگر میں ایسا نہ کرسکوں تو کیا ہوگا فہد؟" علینہ نے پہلی مرتبہ نسبتاً اونچی آواز میں کہا۔

"کچھ نہیں ہوگا۔" وہ بغیر چونکے بولا۔ "تمہاری ماما تمہیں کسی اور اَن چاہی زندگی کی طرف دھکیل دیں گی کیونکہ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارے مستقبل کا فیصلہ کرتے ہوئے تم سے کچھ پوچھیں گی نہیں صرف تمہیں بتائیں گی اور تم ہمیشہ کی طرح سرینڈر کرکے ان کے پسند کیے ہوئے شخص کے ساتھ پوری زندگی گزارنے کے لیے تیار ہوجاؤ گی۔"

"اس میں کوئی خرابی ہے کیا؟" علینہ نے پوچھا۔

"شاید تمہارے لیے نہ ہو۔" وہ صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے بولا۔ "مگر میرے خیال میں ایک اچھی شادی شدہ زندگی گزارنے کے لیے لڑکے اور لڑکی کے درمیان اچھی باہمی ذہنی ہم آہنگی کا ہونا بہت ضروری ہے۔"

"تم کیا سمجھتے ہو میرے ساتھ اچھی باہمی ذہنی ہم آہنگی قائم کرنے کی کوئی خواہش کرے گا؟"

"کیوں، تم میں کیا برائی یا کمی ہے جو اس بات پر تمہیں شک ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"مجھ میں ایسی کوئی خصوصیت نہیں ہے، کون ہے جو ذہنی ہم آہنگی کی وجہ سے مجھ سے شادی کرے گا؟ کون ہے جو مجھ سے محبت کرے گا...... تم کروگے؟" علینہ پر بے بسی کی ایک ایسی کیفیت طاری ہوگئی جس کے باعث وہ الفاظ اس کے منہ سے نکلنے لگے جو وہ نارمل حالات میں کبھی بھی کہنے کا تصور نہیں کرسکتی تھی۔

"ارے علینہ، میری بات کیا کرتی ہو، میرا خیال ہے کہ میں پہلے سے ہی تم سے محبت کرتا ہوں۔" فہد رضا کے الفاظ نے اسے بری طرح چونکا دیا۔

"میرا دل رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے فہد میں اپنی حقیقت سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔" علینہ نے اسی بے بسی کے عالم میں کہا۔

"مجھے خود ترسی سے زیادہ اس دنیا میں کسی اور بات سے چڑ نہیں ہے لینہ اور تم بہت بری طرح خود ترسی میں مبتلا ہو، یہ بات مجھے پسند نہیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "تم میں ہر وہ خوبی موجود ہے جو کسی بھی سمجھدار لڑکے کی آئیڈیل میں ہوسکتی ہے۔"

"میرا مذاق مت اڑاؤ فہد، میں پہلے ہی بہت ڈپریسڈ ہوں۔" علینہ کی آواز کپکپانے لگی۔

"میں مذاق نہیں کررہا علینہ، میں سنجیدہ ہوں۔" وہ حقیقت میں سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "میں اس موضوع پر تم سے پھر بات کروں گا، تم خود کو کمپوزڈ رکھو اور اپنے بارے میں بے یقینی کی کیفیت سے نکلنے کی کوشش کرو۔" اس نے فون بند کرنے سے پہلے کہا۔ اتوار کا وہ دن علینہ کے لیے انتہائی مختلف اور حیران کردینے والا ثابت ہوا تھا۔

☆☆☆

"صدیوں سے کھیتی باڑی کرتے چلے آرہے انسانوں نے ایگریکلچرل انجینئرنگ نہیں کررکھی تھی پھر بھی اُن کی اگائی فصلیں جاندار اور صحت مند ہوتی تھیں۔ جدید ٹیکنالوجی زیادہ اور بے موسمی فصلیں اگانے کے طریقے سکھانے کے علاوہ کیا دے رہی ہے جدید انسانوں کو؟" شہباز صاحب نے اپنے سامنے دھرے رجسٹر اٹھا کر ایک سائڈ پر کرتے ہوئے کہا۔

"اور کھادیں اور کیڑے مار دوائیں جی۔" منشی فضل حسین نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"اور بیماریاں اور اسپتال کے بل جناب۔" شہباز صاحب نے تھکن کا غصہ نادیدہ زرعی ماہرین پر نکالتے ہوئے ان کے کام کی خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا۔

"باہر مہمان آئے ہیں جی آپ سے ملنے کے لیے۔" اسی دم عبدالرحمان چپڑاسی نے اندر آکر بتایا۔ "پینٹ شرٹ والے جی گاڑی میں بیٹھ کر۔"

"او چلو جی۔" منشی فضل حسین نے جھٹ پٹ اپنے کھاتے بند کرتے ہوئے دانت نکوسے۔ "انسپکشن والے آگئے۔ اپنا حساب کتاب سیدھا کرلیں جناب۔"

"بلاؤ بھئی مہمانوں کو۔" شہباز صاحب نے اپنے چہرے کی بیزاری اور کوفت پر مسکراہٹ کا پردہ ڈالنے کی کوشش میں مصروف ہوتے ہوئے عبدالرحمان کو اشارہ کیا۔

شہباز صاحب نجی زرعی بینک کی اس قصباتی برانچ کے منیجر تھے۔ اس بینک کا عملہ محدود اور عمارت چھوٹی تھی یہاں بینک کے ہیڈ آفس سے آنے والے کبھی کبھار ہی آیا کرتے تھے اور شہباز صاحب اس بات پر

حیران تھے کہ ابھی پچھلے ہفتے تو افسران سب حساب کتاب چیک کر کے گئے تھے۔ وہ اپنی ساری بیزاری بھلا کر خود کو ذہنی طور پر آنے والے مہمانوں سے گفتگو کے لیے تیار کرنے لگے مگران کی توقع کے خلاف آنے والے کا چہرہ نیا اور ناشناسا تھا۔ اس نے احترام کے ساتھ ان سے ہاتھ ملایا اور ان کے سامنے دھری کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

''میرا تعلق آپ کے بینک سے نہیں ہے شہباز صاحب۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں کسی اور کام کے سلسلے میں حاضر ہوا تھا۔''

''جی جناب فرمائیں۔'' شہباز صاحب نے کسی اور کام کی ممکنہ نوعیت کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا۔

''یہ میرا کارڈ ہے اسی کے ذریعے آپ سے میرا تعارف بہتر طور پر ہو سکتا ہے، میرا خیال ہے مجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے اپنا کارڈ ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ شہباز صاحب نے ایک نظر ہاتھ میں پکڑے کارڈ اور دوسری آنے والے پر ڈالی اور کارڈ آنکھوں کے قریب کر کے پڑھنے لگے۔

''اوہو.....'' ایک لمحے کے لیے تو انہیں سمجھ نہیں آیا کہ اس شخص کو ان سے کیا کام ہو سکتا تھا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں جناب۔'' انہوں نے حواس باختہ سے انداز میں کہا۔

''سمجھ جائیں گے شہباز صاحب بلکہ میں سمجھاتا ہوں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا اور نیچی آواز میں انہیں کچھ بتانے لگا۔

اس شام گھر آتے ہوئے شہباز صاحب کا ذہن بے حد الجھا ہوا اور پریشان تھا۔ وہ راہ چلتے کی نیکیاں کرنے کے عادی نہیں تھے اور ایک سیدھی سادی زندگی گزار رہے تھے۔ دفتر سے گھر اور گھر پر شام پڑے آنے والے دو تین لڑکوں کو ٹیوشن پڑھانے کے علاوہ ان کی زندگی کے معمول میں کوئی اتار چڑھاؤ نہیں تھا مگر ایک ایسی نیکی جو سوئے اتفاق انہیں کرنی پڑ گئی تھی اب انہیں ایسا لگ رہا تھا، ان کے گلے کا ہار بننے والی تھی۔ ان کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس ایک کام سے جو انہوں نے اپنے معمول سے ہٹ کر کیا تھا۔ اپنی لاتعلقی کیسے ظاہر کریں جبکہ وہ شخص جو اُن کے پاس آیا تھا اس کام کی جزئیات تک سے واقف تھا۔ وہ اس شخص اور اس کے محکمے کے کام کی عمدگی کے دل ہی دل میں قائل بھی ہونے لگے تھے مگر اس پریشان دل کا کیا کرتے جو عجیب و غریب وسوسوں اور واہموں میں پھنس گیا تھا۔

☆☆☆

''تم فلائنگ سیکھنے کا کوئی مقصد اپنے ذہن میں رکھ لو۔'' ایک روز قیوم نے دانیال سے کہا تھا۔ ''تم کو کمرشل پائلٹ بننا ہے یا پرائیویٹ پائلٹ؟''

''مجھے ان دونوں میں سے کچھ بھی نہیں بننا۔'' دانیال نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ''مجھے صرف فلائنگ سیکھنی اور جہاز اڑانا ہے۔ میرے تربیتی گھنٹے پورے ہو لینے دیں پھر میں آپ کو بتاؤں گا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔''

''وہ ممکنہ مقصد کیا ہوگا جو تم مجھے اس وقت بتاؤ گے؟'' قیوم نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں آپ کو جہاز کے پیچھے چھٹتے دھویں سے تصویریں بنا کر دکھاؤں گا۔ مصوری کی دنیا میں ایک نئے اسکول آف آرٹ کو متعارف کرواؤں گا۔'' دانیال کی بات پر قیوم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، وہ مذاق کر رہا تھا یا سنجیدہ تھا۔ دانیال کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی اور اس کی نظریں خلا میں کچھ دیکھ رہی تھیں۔

''آئیڈیا برا نہیں۔'' قیوم نے بغیر بحث کے خیال ظاہر کیا۔ ''مگر میرے بچے یہ ناممکن سی بات ہے، ناقابلِ عمل۔''

''ہاں، یہ ایسا ہی لگتا ہے۔'' دانیال نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''مگر اس کا کیا جائے کہ مجھے ناقابلِ عمل کام کرنے کا جنون ہے۔''

''ابھی تم اسٹوڈنٹ پائلٹ کورس کر رہے ہو بیٹا، ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں، تمہیں ذہن میں رکھنا چاہیے کہ تم کو آگے کون سا کورس لینا ہے۔''

''یار آپ لوگ فلائنگ سکھاتے ہو، ساتھ میں اتنا کچھ پڑھانے کی کیا ضرورت ہے۔ بس یہ اختلاف ہے مجھے، میرا دل چاہتا ہے کہ آپ مجھے فلائنگ آورز پورے کروا دو اور پھر میں اپنا ایک چھوٹا سا ائرکرافٹ خرید لوں پھر یہ فضائیں ہوں اور میری مرضی اس کے بعد میں آپ کو دکھاؤں کہ ناقابلِ عمل کو قابلِ عمل کیسے بناتے ہیں۔''

''آہستہ آہستہ میرے بچے۔'' قیوم نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''تم کچھ زیادہ جلدی میں لگتے ہو۔ ہر کام قدم بہ قدم سیکھنے کا جو طریقہ ہے وہ سب سے بہتر ہے، تم پرائیویٹ پائلٹ کورس کرو، صرف آٹھ مہینے کی بات ہے کم از کم چالیس گھنٹے، زیادہ سے زیادہ ایک سو دس گھنٹے، تمہارے جیسے ذہین اور شوقین پائلٹ کے لیے یہ کچھ بھی نہیں۔''

''آپ نے یہ کیوں کہا کہ ائرکرافٹ انجن سے نکلنے والے دھویں سے تصویریں بنانا ناممکن ہے؟'' دانیال کا ذہن ابھی تک اسی بات میں الجھا ہوا تھا۔

''کیونکہ تصویر درست بنی ہے یا اس میں کچھ خامی ہے یہ بتانے والا کوئی نہیں ہوگا، یہ لمحاتی تصویر دیکھنے والا کون ہوگا، خود بنانے والا بھی نہیں اور جن فضائی کرتبوں کا تم تصور کر رہے ہو، جن کے ذریعے تم یہ تصویریں بناؤ گے وہ بھی بہت بڑا رسک ہیں۔'' قیوم نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''جس کام میں رسک ہو وہ نہیں کرنا چاہیے؟'' دانیال نے اس سے پوچھا۔

''کوشش کرنی چاہیے کہ ایسے کام سے جہاں تک ممکن ہو بچا جائے۔'' قیوم نے جواب دیا۔

''پھر دنیا بھر کے جو غیر معمولی کام کرنے والے لوگ ہیں، ان کا نام جلی حروف میں کیوں لکھا جاتا ہے؟'' دانیال نے پوچھا۔

''جو لوگ رسک لیتے ہیں وہ جنونی ہوتے ہیں اور جنون کچھ خاص پسند نہیں کیا جاتا ہمارے مذہب میں۔'' قیوم نے نقطۂ نظر بیان کیا۔

''اُفوہ.....'' دانیال نے سر جھٹکا۔ ''جس بات کے خلاف کوئی اور دلیل نہ سوجھے اس کے خلاف مذہب کی دلیل آ جاتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ایسی کوئی بات زور دے کر کہی گئی ہے، انسان کی فطرت میں جستجو اور کوشش ایسے ہی نہیں رکھ دی گئی مائی ڈیئر سر۔''

''فی الحال میں اس بات کا جواب نہیں دوں گا۔'' قیوم نے کہا۔ ''مجھے تم سے ایک ہی بات کرنی ہے، تمہیں اس کورس کے بعد پرائیویٹ پائلٹ کورس اور پھر کمرشل پائلٹ کورس پر نظر رکھنی چاہیے، تم یہ کر سکتے ہو اور اب جو میرے پاس آ گئے ہو تو تمہیں مکمل پائلٹ بنا کر ہی بھیجوں گا۔'' قیوم کا اس کے شوق اور ٹیلنٹ کو ضائع کر دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

☆☆☆

''تم بہت خوش تو کبھی نظر نہیں آئیں مگر آج کل تم کچھ پریشان سی لگ رہی ہو۔ کیا میں وجہ پوچھ سکتا ہوں؟'' اس روز کھانے کے گھنٹے میں نادر مراد نے زوئی سے پوچھ ہی لیا۔ جواب میں اس نے اپنی چھوٹی

چھوٹی مگر سیاہ چمکدار آنکھیں اٹھا کر اس کی جانب یوں دیکھا جیسے اسے اس سوال کا مفہوم سمجھ میں نہ آیا ہو۔

''یار مجھے بات کرنے کا ڈھنگ بہت اچھی طرح نہیں آتا۔'' نادر مراد اس کے دیکھنے کے اس انداز پر گڑبڑا گیا۔ اسے لگا جیسے وہ کوئی غلط بات کر گیا ہو۔

''میں حیران ہوں تم لوگوں کو بھی پتا چل جاتا ہے کہ ارد گرد رہنے والا کوئی شخص پریشان ہے یا خوش؟'' زوئی نے کہا۔

''کیوں، ہم لوگ پتھر دل نظر آتے ہیں کیا؟'' نادر مراد نے مسکرا کر پوچھا۔

''پتھر دل کا تو کچھ پتا نہیں، ہاں اب یہاں کے لوگ بھی مصروف اور بے پروا نظر آنے لگے ہیں۔ معاشرے پر مشین کی سی رفتار اور روبوٹ کی سی جذباتی بے حسی چھائی محسوس ہوتی ہے۔'' زوئی نے اپنے دل کی بات کہی۔

''اوہ...... گویا تم ہم لوگوں سے مایوس ہو گئی ہو۔'' نادر مراد کو دلی افسوس ہوا شاید زوئی کے دل سے اچھے جذبات کم ہو رہے تھے۔

''مایوس تو نہیں ہوں۔'' زوئی نے چائے کی پیالی میں چمچ چلاتے ہوئے کہا۔ ''ابھی یہاں کے لوگ ایک دوسرے سے متعلق نظر آتے ہیں، یہ زندہ دل ہیں اور چھوٹی چھوٹی خوشیاں شیئر کرتے ہیں مگر جس چیز کا ذکر میں کر رہی ہوں اس میں بھی ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ مالی وسائل میں اضافے کی دوڑ اور مہنگائی نے لوگوں کو جذباتی بے حسی اور وقت کی کمی عطا کر دی ہے۔''

''یہ ایسا ہی ہے جیسا تمہارے ملک میں ہے؟'' نادر مراد نے اس سے پوچھا۔

''نہیں۔'' زوئی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہاں کا معاملہ اور ہے، وہاں ایک لمبے عرصے سے زندگی ایک مخصوص ڈھنگ سے گزاری جا رہی ہے، وہاں کے بچے، بچے کو احساس دلایا جاتا ہے کہ وطن کی ترقی میں اس کو اپنا حصہ ڈالنا ہے، اس احساس کے ساتھ بڑا ہونے والا بچہ بڑے ہونے تک اتنا محنتی، جفاکش اور سنجیدہ ہو چکا ہوتا ہے کہ اس کے اندر جذبات کی سرکشی، گرمی اور فطری زندہ دلی نہ ہونے کی حد تک کم ہو چکی ہوتی ہے۔ وقت کی رفتار کے ساتھ تیز رفتار چلتی مشین کا پہیا بن چکا ہوتا ہے۔ اس کی زندگی میں کام زیادہ آرام کم کے اصول کا عمل دخل ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ خوشیوں کے موقع اور تہوار بھی گھڑی کی سوئیوں کو دیکھ دیکھ کر مناتا ہے اور روبوٹ کے مانند وقت کے ساتھ اپنے کام پر واپس لوٹ جاتا ہے، معاشرے کے کچھ اصول بھی ایسے ہیں کہ جن کی تقلید کرتے کرتے وہ جذباتی بے حسی کے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔''

''ارے...رے۔'' نادر مراد مسکرایا۔ ''کیا یہی وجہ ہے جو تم اپنے وطن سے خائف اور ہمارے اس ملک سے محبت کرنے لگی ہو۔''

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔'' زوئی نے اپنی جینز کے پائنچے درست کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا پھر یہ بتاؤ کہ مغموم کیوں ہو؟'' نادر مراد نے اپنا سوال دُہرایا۔ ''کیا وطن یاد آ رہا ہے؟''

''اوہ...... ہاں۔'' زوئی کو یاد آیا کہ ان کی گفتگو کا آغاز کس بات سے ہوا تھا۔ ''تم یہ بتاؤ نادر مراد کہ کسی بے کس کی مدد کرنا تمہارے ہاں جرم ہے؟''

''ہرگز نہیں۔'' نادر مراد نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہمارا مذہب تو بے کس کی مدد کرنے کی ترغیب بلکہ حکم دیتا ہے۔''

''یوں مت کہا کرو نادر مراد۔'' زوئی نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ ''ہمارا مذہب، تمہارا مذہب کیا ہوتا ہے؟''

''میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں الحمدللہ مسلمان ہوں۔''

''یہ خوشی کی بات ہے کہ تم نے اپنے لیے اس مذہب کا انتخاب کیا ورنہ تمہارے آباؤ اجداد کے خون میں یہودی اور عیسائی مذہب کی لہریں بھی جوش مارتی رہی ہیں۔'' نادر مراد نے اس کو ہنسانے کی کوشش کی۔

''مذاق مت اڑاؤ میرا۔'' زوئی کے لیے یہ معاملہ بہت حساس تھا۔ ''اسلام جیسے عالمگیر مذہب کی روشنی دیکھ لینے کے بعد کسی اور مذہب کی تقلید کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''اوہ گریٹ۔'' نادر مراد نے بے ساختہ کہا۔ ''میں یقیناً بے حد متاثر ہوا ہوں۔''

''ہونا بھی چاہیے۔'' زوئی نے ازراہِ تفنن کہا۔ ''تم لوگ مسلمان ہونے پر فخر کرنا بھول گئے، میں فخر کرتی ہوں۔''

''اچھا یہ بتاؤ، مغموم کیوں ہو؟'' نادر مراد نے تیسری بار سوال کیا۔

''مغموم نہیں پریشان ہوں۔'' زوئی نے تصحیح کی۔

''کس بات پر؟'' نادر مراد نے پوچھا۔

''کسی کی مدد کرنے پر ملنے والی سزا کا سوچ کر۔'' زوئی نے مبہم سی وجہ بتائی۔

''مدد پر سزا؟'' نادر مراد نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''ہاں مدد پر سزا۔'' زوئی کی مسکراہٹ میں اداسی اور دکھ تھا۔ ''نادر مراد میں تم کو بتاؤں گی کہ مدد پر سزا کیسے مل سکتی ہے مگر اب کام کا وقت شروع ہو گیا ہے ہم اس پر پھر کسی دن بات کریں گے۔''

نادر مراد کو لگا ایسا اس نے صرف اسے ٹالنے کے لیے کہا تھا۔ خود اس نے بھی اس کی بات سننے پر اصرار اسی وجہ سے نہیں کیا مگر اسے زوئی کی پریشانی پر پریشانی تھی۔

☆☆☆

نگین کی ساس کا پارا اس دن صبح سے ہی چڑھا ہوا تھا۔ شاید ان کا بلڈ پریشر ہائی تھا یا پھر ابو سے کوئی جھگڑا ہوا تھا۔ صبح سے ہی ہر بات پر تنقید کر رہی تھیں۔ ہر ایسے دن پر نگین کے دل کی جھنجلاہٹ بھی معمول سے زیادہ ہوتی تھی۔ وہ بظاہر بہت سکون سے کام کر رہی ہوتی تھی مگر دل ہی دل میں بری طرح جھنجلاتی تھی۔ اسے ہر کام زہر کی طرح برا لگ رہا ہوتا تھا۔

''اس گھر میں سودا سلف خریدنے کا ڈھنگ کسی کو نہ آیا کبھی۔'' وہ اپنے سامنے ایک دن پہلے خریدا مہینے بھر کا سودا سلف بکھیرے بیٹھی تھیں۔

''ہمارے گھر میں تیز مرچ کا استعمال ہوتا ہی نہیں، مہینے بھر کے لیے پاؤ ڈیڑھ پاؤ مرچ کافی ہوتی ہے مگر جب بھی خریدی جائے گی ایک کلو سے کم نہیں خریدی جائے گی، کتنی بار کہا ہے کہ پسی مرچ پرانی ہو جائے تو اس کے رنگ اور ذائقے میں فرق آ جاتا ہے مگر مجال ہے جو کوئی سنے۔'' کچن میں سبزی بناتی نگین کے کان میں ان کی آواز صاف پڑ رہی تھی۔

''اور یہ چینی، ہونہہ......'' وہ سخت غصے میں بولی تھیں۔ ''موٹے دانے کی چینی جو کسی طرح گھل کر ہی نہیں دیتی اور تیز خوشبو کے نہانے کے صابن، ان کے استعمال سے گھر بھر کی آنکھوں کی الرجی نہیں جاتی مگر جب خریدنے جائیں گے یہ ہی خریدے جائیں گے۔'' اب وہ باقاعدہ چیزوں کو پٹخ رہی تھیں۔ ''اور یہ ثابت گرم مسالے کا پیکٹ دیکھو، آنکھیں بند کر کے خریدا جاتا ہے۔ زمانے بھر کی لونگیں اس میں موجود ہیں جب ہی تو گرم مسالا پس کر سیاہ رنگ ہو جاتا ہے اور جس کھانے میں پڑتا ہے اسے بھی سیاہ رنگ کر دیتا ہے۔'' نگین کا دماغ

پہلے سے زیادہ الجھنے لگا، اس نے پٹخنے کے سے انداز میں سبزی کی ٹوکری سنک پر رکھی اس کے اس اقدام سے سنک پر رکھے چمچ جھنجھنا کر نیچے گر گئے۔

''اور یہ ٹوتھ پیسٹ۔'' باہر تنقیدی تقریر جاری تھی۔ ''ہزار مرتبہ کہا ہے کہ یہ ٹوتھ پیسٹ سب کے دانتوں کو برباد کر رہا ہے مگر مجال ہے جو کوئی سمجھ جائے۔ شیمپو ہیں تو وہ غلط برانڈ کے، چائے کی پتی کے بڑے بڑے والے اتنے بیگ لائے جاتے ہیں اور اندھا دھند پتی استعمال کی جاتی ہے مگ بھر بھر کے کالی سیاہ چائے پی جاتی ہے اور بیٹے جلائے جاتے ہیں۔''

''اور دل جلانے کے لیے آپ کی باتیں سنی جاتی ہیں۔'' نگین نے سنک کی ٹونٹی کھول دی۔ تیز دھار پانی کے شور میں باہر سے آنے والی آواز قدرے کم ہوگئی۔

''ہم نے سنا تھا کہ بھولاتے وقت اس کی ڈگری نہیں سگھڑاپا اور تربیت دیکھنی چاہیے، ہم نے نہ ڈگری دیکھی نہ تربیت۔'' سامان کا پوسٹ مارٹم کرنے کے بعد آخری بات جو انہوں نے کہی اس نے نگین کا دل بری طرح تپادیا اگرچہ ان سالوں میں وہ بہت کچھ برداشت کرنے کی عادی ہوگئی تھی مگر بعض اوقات اس کا دل بری طرح دکھ جاتا تھا۔ اسے لگا جیسے اس کی آنکھوں میں مرچیں بھر گئی ہوں اور حلق میں کانٹے اُگ آئے ہوں، اسی دم کچن سلیب پر دھرا اس کا سیل فون بج اٹھا۔

''اگر اشعر کی کال ہوئی تو آج اچھی سنیں گے وہ مجھ سے۔'' اس نے فیصلہ کرتے ہوئے فون اٹھایا۔ یہ کال حمزہ کی تھی اس نے فون آن کر کے کان سے لگالیا۔

''اگر آج شام کو تم فارغ ہو تو میرے ساتھ چلنا، میرال کے متعلق مجھے ایک جگہ کا علم ہوا ہے مگر وہ ایک خاتون ہیں جن سے ملنا ہے اس لیے میرا اکیلے جانا مناسب نہیں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''اور ایک یہ ہیں۔'' نگین کا تپا ہوا دماغ مزید جھنجلا گیا۔ ''اب انہیں اس میرال کے علاوہ کچھ یاد ہی نہیں۔ دن رات بس اسی کی سوچیں بس اسی کی فکریں۔'' وہ جانتی تھی کہ وہ بلاوجہ جھنجلا رہی تھی مگر وہ اپنے احساسات پر قابو نہیں کر پا رہی تھی۔ اسے اس انجانی لڑکی سے بلاوجہ کی چڑ محسوس ہونے لگی۔

☆☆☆

''مجھے ہر طرح کی موسیقی پسند ہے مگر موسیقی سننے کے لیے ایک مخصوص موڈ کا ہونا ضروری ہے۔''

''مجھے خوب صورتی اچھی لگتی ہے، جس چیز میں بھی ہو مجھے بدصورتی میں بھی کبھی کبھار خوب صورتی کا کوئی نہ کوئی پہلو نظر آ جاتا ہے۔ اس پہلو کو دیکھ کر میں اسے خوب صورت، بدصورتی قرار دیتا ہوں۔''

''یہ تو بہت عجیب سی بات ہے، بدصورتی کیسے خوب صورت ہو سکتی ہے۔''

''آپ اس ٹرم پر غور کیجیے گا۔ جوں جوں غور کریں گی آپ کو سمجھ آتی جائے گی۔ آپ کو بہت سی بدصورتیوں میں خوب صورتی نظر آنے لگے گی۔''

''چلیں اس طرح ہم ایک نئی اصطلاح سے تو متعارف ہوئے۔''

''میں کسی سے مخاطب ہوتے ہوئے اس کے چہرے سے زیادہ آواز کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، میں آواز سے انسان کی شخصیت کے متعلق اندازہ لگانے والوں میں سے ہوں۔''

''اور اگر آپ کا واسطہ کسی گونگے سے پڑ جائے تو؟''

''خاموشی کی بھی ایک اپنی آواز ہوتی ہے، مجھے خاموشی کی زبان سمجھنے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔''

''میری زندگی کا خوب صورت ترین لمحہ جب کسی نے کہا کہ یہ میرا وعدہ ہے آپ سے کہی کسی بات میں کوئی جھوٹ کوئی غلط بیانی شامل نہیں ہوگی۔''

''مجھے خود پر فخر محسوس ہوا جب ایک غلط جگہ پر مجھے ایک صحیح اور مختلف شخص قرار دیا گیا۔''

''میری پسندیدہ ترین جگہ جہاں کہانیاں کہی اور کہانیاں سنی جاتی ہیں۔''

''میرا شوق اور میری خواہش...... کیچڑ میں کھلے اور خاردار جھاڑیوں میں اُگے پھول تک رسائی۔''

''میری زندگی کی جہتیں بہت زیادہ اور بہت مختلف ہیں، میری خواہش ہے کہ میں ہر سمت کی آزمائش پر پورا اتروں، میری دعا بھی یہی ہے کہ خود سے وابستہ توقعات پر پورا اتر سکوں۔''

''میں بہت اچھا انسان نہیں ہوں مگر ایک اچھا انسان بننے کی خواہش رکھتا ہوں۔''

''میرا پیغام انسانیت ہے جہاں تک پہنچے۔''

زرنگار نے اس طویل انٹرویو کے چیدہ چیدہ جواب نہ جانے کتنی بار پڑھے تھے مگر اس کا دل مزید کئی بار پڑھنے کو چاہ رہا تھا۔ اتوار کے دن کا یہ خصوصی ایڈیشن خادم علی نے اسے لاکر دیا تھا جو مہرزاد خان کا خصوصی ملازم تھا۔

کئی مرتبہ یہ انٹرویو پڑھنے کے بعد اسے بہت سے جوابات میں چھپے مفہوم کی سمجھ آنے لگی تھی۔

''چہرے کے بجائے آواز، خاموشی کی زبان، کیچڑ میں کھلے اور خار میں اُگے پھول تک رسائی، کہانیاں کہنے اور سننے کی جگہ، زندگی کا خوب صورت ترین لمحہ اور قابل فخر بات۔'' اسے سب باتوں کی سمجھ آ رہی تھی اور اسے حیرت بھی ہو رہی تھی کیا وہ اس عزت اور اہمیت کے قابل تھی جس کے قابل گردانی جا رہی تھی اس کا دل کانپنے لگا۔

''مگر یہ خوب صورت بدصورتی کیا ہے؟'' اس نے سوچا اور اس نئی اصطلاح کو سمجھنے میں اسے بہت سے دن لگ گئے جبکہ اس کا ذہن اس اصطلاح کے ہر پہلو کے بارے میں سوچتے سوچتے تھک چکا تھا۔

☆☆☆

''سیاست کے میدان میں یہ انٹری دلچسپ بھی ہے اور خوب صورت بھی۔'' تابندہ نے اتوار کے خصوصی ایڈیشن میں شائع ہونے والے اس انٹرویو کو پڑھنے کے بعد فیصلہ دیا۔

''اکثر ایسی انٹریز اوپر اوپر سے بہت دلچسپ اور خوب صورت نظر آتی ہیں مگر اندر سے اتنی کریہہ اور گھناؤنی ہوتی ہیں کہ ان پر نظر پڑ جائے تو متلی ہونے لگتی ہے۔'' نیشل نے اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے کہا۔

''تم تو اس مہرزاد خان سے مل چکی ہو، اتنا لمبا انٹرویو کر چکی ہو، تم بتاؤ تمہارا کیا اندازہ ہے اس کے بارے میں، میں تو بھئی امپریس ہوگئی۔'' تابندہ نے انٹرویو کے ساتھ چھپی تصویریں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایسے لوگ پیاز کے مانند ہوتے ہیں، پرت در پرت اور جو بھی شخص ان کی پرت کھولنے بیٹھ جائے اس کی آنکھوں میں آنسو آنا لازمی ہوتے ہیں۔'' نیشل نے ایک عمومی بات بتائی۔

''اپنے ذاتی تجربے کی بات نہیں سناؤ گی!'' تابندہ نے مسکرا کر پوچھا۔

''ذاتی تجربے کی چھوڑو، ہم ان سب سے ملتے ہیں۔ بات کرتے ہیں، ان کی باتوں اور شخصیتوں پر جاؤ تو لگتا ہے ان سے اچھا کوئی نہیں اور ان کے کرداروں کو دیکھو تو وہ تو تمہیں بھی سب پتا ہے کہ کیا ہوتے ہیں۔ اسی لیے تو کہتی ہوں کہ کسی میں کوئی فرق نہیں، سب ایک جیسے ہیں۔ کسی روز اسی مہرزاد خان کے بارے میں بھی

کوئی دلچسپ قسم کا اسکینڈل نما اسکوپ سامنے آجائے گا، تم فکر نہ کرو، تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔" یشل مسکرا رہی تھی۔

"ان بے چاروں کی جو کجیاں ہوتی ہوں گی، سو تو ہوں گی، ان کی شخصیتوں کو بنانے یا مسخ کرنے میں تم لوگوں کا بھی بڑا رول ہوتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ تم لوگ ان کے پے رول پر ہوتے ہو جس سے بڑا معاوضہ ملتا ہے زیادہ عظمت کی بلندیوں پر اور جس سے نہیں ملا اس سے بڑا ملعون کوئی نہیں۔" تابندہ نے اس پر چوٹ کی۔

"ہاں، یہ بھی غلط نہیں اس پیشے کے انداز ہی بدل چکے ہیں اگرچہ رشوت بازی کا یہ میدان آج سے نہیں ہمیشہ سے گرم ہے کسی نہ کسی شکل میں مگر اب تو اس کے طریقے ہی بدل گئے ہیں، کسی غلام منڈی کی طرح بولیاں لگتی ہیں اور بڑے بڑے کالم اگلنے والے قلم غلام بنالیے جاتے ہیں مگر غم نہ کرو میری پیاری سہیلی یہ بازار ہمارے ہاں ہی نہیں پوری دنیا میں گرم ہیں۔ نیوز ویک، ٹریبون، وال اسٹریٹ، جرنل اور ٹریبون تک بھی اس سے محفوظ نہیں۔ امیج بلڈنگ اور امیج بلڈرز کا یہ ان کہا ان سنا تانا ہر جگہ جڑا ہوا ہے پس پردہ۔" یشل کو اپنے پیشے سے وابستہ بے اصولیوں کی تاریخ سے اچھی طرح واقفیت تھی۔

"جب ہی تو پوچھتی ہوں کہ تمہیں اس پیشے میں کیا دلچسپی محسوس ہوئی۔ کسی زمانے میں تو ہوتی ہوگی اس میں کشش اب تو اس میں گند زیادہ ہے؟" تابندہ نے بار بار کیا جانے والا سوال پوچھا۔

"ارے اب تو ہی اس میں زیادہ کشش ہے مائی ڈیئر، اب اس پیشے میں گلیمر کا اضافہ ہو گیا ہے۔ میڈیا کی ترقی نے اس سے وابستہ لوگوں کی قدر بڑھا دی ہے، بہت تسلی ہوتی ہے جب یہ لمبے لمبے لفافے ہاتھ میں آتے ہیں اس پیشے سے وابستہ بزرگ تو خونِ جگر پیتے اور زخمِ دل کھاتے مر گئے، اب الٹا حساب ہے، اس پیشے سے وابستہ لوگوں کی چاندی ہو رہی ہے پھر ہم کیوں فائدہ نہ اٹھائیں۔" یشل صاف گو تھی اور اسے یہ اعتراف کر لینے میں کوئی خاص مسئلہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ "خیر ان باتوں کو چھوڑو تم اس خان مہرزاد کی ذاتی باتیں پڑھو، دیکھو تو موصوف کس قدر رومینٹک مزاج ہیں، کیچڑ میں کھلے کنول اور خار میں اگے گل تک رسائی چاہنے کی خواہش کرتے ہیں۔ واہ کیا مہم جو طبیعت پائی ہے جناب نے۔" اس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"میں نے تو پہلے ہی بتا دیا یشل ڈیئر۔ میں تو امپریس ہو گئی ہوں، کبھی موقع ملے تو مجھے بھی ساتھ وہاں لے جانا جہاں یہ صاحب موجود ہوں۔ یار مجھے اس شخص کو قریب سے دیکھنے کا شوق ہونے لگا ہے۔ he has got a charismatic personality، یار کم کم ایسا ہوتا ہے۔ تم جانو مجھے نہ تو سیاست سے دلچسپی ہے نہ سیاست دانوں سے مگر اس شخص کی تو بات ہی کچھ اور ہے اور تم نے مجھے اس کو قریب سے دیکھنے کا موقع دلانا ہے یاد رکھنا۔" تابندہ کہہ رہی تھی اور یشل اپنے تصور میں خود بھی مہرزاد خان کی شخصیت کا تجزیہ کرنے میں مصروف تھی۔

"خیر جتنا چاہو موازنہ کر لو، تقابلی جائزے لے لو، اس شخص میں کوئی الگ بات ہے ضرور مگر وہ الگ بات کیا ہے۔ اس کا تعین ابھی مشکل ہے۔"

☆☆☆

وہ مہم جو تھا یا مشکل پسند، اسے دوسروں کو چونکا دینے کا شوق تھا یا وہ اپنے دل کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا جو بھی تھا اس کا ذہن ہمیشہ نت نئے تجربے کرنے کی کوشش میں رہتا تھا۔ اس نے قیوم کے سامنے اپنا ارادہ ظاہر کر دیا تھا۔ اس نے فلائنگ سیکھنے کا آغاز محض ذرا دیر کی دلچسپی پیدا ہو جانے پر کیا تھا مگر اس کے سیکھنے کے دوران

اس کا ذہن اسی اڑتے جہاز سے کچھ نیا کرتب دکھانے کو سوچنے لگا تھا۔ اسے دنیا بھر کے کرتب بازوں کی کہانیاں پڑھنے کا بچپن سے شوق تھا اور یہ کہانیاں پڑھتے پڑھتے وہ خود کو اسی قسم کے کرتب دکھاتے تصور کرتا تھا۔ اسے ہنگری کے کرتب باز ہڈنی میں خاص طور سے دلچسپی تھی۔ وہ اس کے کرتبوں کے بارے میں پڑھتا تھا اور اس کے نزدیک وہ ایک بہت بہادر شخص تھا۔ فلائنگ آورز پورے ہونے سے قبل اس نے اپنے ایک دوست اسد کو ایک دلچسپ میل بھیجی تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

my rule says during flight when you are looking for target of opportunity and you are operating in search mode,if you get target of opportunity,change your mode to lock on mode, push off search mode and go for it with full burners.

اسد فلائنگ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا مگر دانیال کے عزائم اور سوچ کے بارے میں اسے تھوڑا بہت اندازہ تھا۔

" you are crazy"

اس نے جواب میں اسے لکھا تھا۔ اس میل کے ٹھیک ایک ہفتے کے بعد اسد کو اطلاع ملی تھی کہ پرواز کے دوران دانیال کا تربیتی طیارہ گر گیا تھا اور وہ شدید زخمی حالت میں اسپتال میں داخل تھا۔ اسد کے دل میں دانیال کی میل پڑھنے کے بعد جو وہم سر اٹھاتے رہے تھے وہ ٹھیک ثابت ہوئے تھے۔ اس واقعے کے دو ہفتے بعد وہ اپنی چھٹیوں پر لندن سے پاکستان پہنچا تھا۔ مہنگے ترین اسپتال کے پرائیویٹ روم میں ایڈمٹ دانیال کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جو زخمی نہ ہو، اس کا زندہ بچ جانا ایک معجزہ تھا۔ دانیال کی والدہ جنہیں اسد نے ہمیشہ خوش باش اور نک سک سے تیار دیکھا تھا، سفید اور ستا چہرہ لیے بیٹھی تھیں اور انہوں نے اسے دیکھ کر بری طرح رونا شروع کر دیا تھا۔ ان کا جوان بیٹا موت و زیست کی کشمکش میں تھا۔ زندگی کی صورت میں بھی اس کے جسم کے کسی نہ کسی حصے کا مفلوج ہو جانا یقینی نظر آ رہا تھا، اسد کے پاس ایسے الفاظ نہیں تھے جو وہ اپنے غم کی شدت کا اظہار کرتا یا ان کو تسلی دے سکتا۔

"میں نے سوچا تھا یہ اس کا وقتی شوق ہے، کچھ عرصے سیکھ لینے کے بعد چھوڑ دے گا۔" وہ ہچکیوں کے ساتھ بھیگی آواز میں کہہ رہی تھیں۔

"یہ محض شوق نہیں تھا آنٹی، یہ جنون بن چکا تھا۔" اسد کی نظروں کے سامنے دانیال کے لکھے الفاظ ناچنے لگے۔

"وہ اس ٹیکنیکل کام میں بھی مصوری کرنے کی کوشش میں لگ گیا تھا۔" وہ بتا رہی تھیں۔ "اس نے حادثے سے صرف ایک رات پہلے مجھ سے کہا۔ میں کچھ ایسا کرنے والا ہوں جس کی وجہ سے آپ مجھے ڈسکوری چینل پر دیکھنے والی ہیں، ورلڈ بک آف ریکارڈز میں میرا نام آنے والا ہے۔ یہ وہ کام ہوگا جو پہلے کسی نے نہیں کیا۔"

"میں نے پھر اپنی بات دہرائی، مجھے نہ تو کسی فلائنگ ریکارڈ کا شوق ہے نہ ہی اس کی وجہ سے تمہاری شہرت کا۔ تم اپنے آورز مکمل کرو اور دوبارہ سے اپنی فیلڈ آف آرٹ جوائن کرو۔ میں بڑے بڑے آرٹ انسٹیٹیوٹس کے فارم منگوا رہی ہوں، تمہیں اب اپنے ایڈمشن کی فکر ہونی چاہیے۔" اس پر جواب میں اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور بولا۔

"ارے کیسی ماں ہیں آپ، میں مشہور ہونے جا رہا ہوں اور آپ منع کر رہی ہیں۔"

”میں نے عاصم کو بھی ڈانٹا، وہ خود تو فلائنگ آورز نامکمل چھوڑ کر اپنی پڑھائی کی طرف متوجہ ہو چکا تھا اور یہ جو شخص اسے دیکھنے گیا تھا اسے اپنی جان کا روگ بنا رہا تھا۔“

”وہ کیا ریکارڈ بنانا چاہ رہا تھا؟“ اسد نے اپنی کانپتی آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

”وہ جہاز کے انجن کے دھویں سے مصوری کرنے کی کوشش میں مصروف تھا اور یہ اتنا خطرناک شوق تھا کہ اس کا نتیجہ یہ ہی نکلنا تھا۔“

”آپ کو معلوم نہیں ہوا کہ وہ ایسی خطرناک کوشش میں مصروف تھا؟“ اسد نے پوچھا۔

”مجھے تو خیر علم نہیں ہوا مگر اس کے انسٹرکٹر جس سے وہ یہ بات ڈسکس کر چکا تھا کے بھی وہم و گمان میں نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی یہ کارنامہ انجام دینے کی کوشش کرے گا۔“ اسد نے پہلی مرتبہ آنٹی کو اس بری طرح روتے دیکھا تھا۔

”اسے بلندیوں سے پیار تھا مگر بلندیوں نے اس کی اونچی پروازوں کو قبول نہیں کیا۔“ اسی شام جب قیوم اپنے سب سے چہیتے شاگرد کو دیکھنے کے لیے آیا تو اس نے اسد کو بتایا۔

”اس کی ڈائمینشنز اور کنٹرول بالکل درست تھا۔ اس نے اتنی جلدی بنیادی اصول سیکھ لیے تھے کہ باقی کا وقت وہ محض اپنے تربیتی گھنٹے پورے کرنے میں گزار رہا تھا مگر یہ جو اسی دوران اسے نیا جنون چڑھا تھا وہ میں جانتا تھا، بہت خطرناک تھا۔ میں نے اسے مذہب کا حوالہ دے کر اس سے منع کرنا چاہا تو اس نے میرا پوائنٹ مسترد کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمیں جب کسی بات کے خلاف کوئی دلیل نہیں سوجھتی تو ہم مذہب کا حوالہ دینے بیٹھ جاتے ہیں۔“

”اسے ہمیشہ سے کچھ الگ سا کر دکھانے کا شوق تھا۔“ اسد نے کہا۔ ”ہم سمجھتے تھے کہ وہ آرٹ کی دنیا میں نام پیدا کرے گا اور پاکستان کے نمبر ایک مصوروں کی فہرست میں کھڑا ہو جائے گا مگر اس نے اچانک اپنا ٹریک بدل لیا۔“

”دانیال بے حد ذہین ہے، اتنا ذہین کہ مجھے اس کی ذہانت سے خوف آتا ہے۔ اس نے اپنا ٹریک نہیں بدلا، وہ مصوری کرنے کے لیے آسمان کی بلندیوں پر چلا گیا، وہ لائیو پینٹنگ شو کرنا چاہتا تھا اور یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کے کام کو دیکھنے والے چند ایک نہیں ہزاروں ہوں۔ it was an open show which ended in a close tragedy“

قیوم نے کہا تھا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کے سامنے ایک جیتا جاگتا زندگی سے بھرپور توانا جسم مصنوعی سانسیں لے رہا تھا۔ ایک اعلیٰ پائے کا دماغ مفلوج ہوتا نظر آ رہا تھا۔ ایک بھرپور مستقبل ناکارہ ہو رہا تھا۔ اس نے اسد کی طرف دیکھا، وہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ a great tragedy دونوں کی نظروں کا مفہوم یہ ہی تھا۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

☆☆☆

اس نے دور اونچے پہاڑوں پر جلتی روشنیوں کو دیکھا، وہ بالکل ستاروں کے مانند دکھائی دے رہی تھیں۔ آسمان پر بادل چھائے تھے اور گرج چمک کا سلسلہ کافی دیر سے جاری تھا۔ ”بادل اب برسے کہ اب برسے۔“ وہ سوچ رہی تھی۔ ”اور ماما ابھی تک کلینک سے واپس نہیں آئیں۔“ اس نے بیرونی گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ ”جوں جوں عمر اور تجربہ بڑھتا جا رہا ہے ماما کا زیادہ وقت کلینک اور اسپتال میں ہی گزرنے لگا

ہے۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مصروف زیادہ ہو گئیں یا انہیں اپنے پیشے سے پہلے سے زیادہ پیار ہو گیا ہے۔“

”علینہ!“ وہ اپنی سوچوں میں گم تھی جب دیوار کے اس پار سے اسے کسی نے آواز دی۔ وہ کوکب تھی، وہ اٹھ کر دیوار کے قریب آ گئی۔ ”میں تمہارے لیے فارمز لے آئی ہوں، اب تم کو ایڈمشن لینا ہی پڑے گا۔“ وہ کہہ رہی تھی۔ علینہ کا دل خوشی سے اچھل پڑا، وہ کتنے دن سے ان فارمز کی منتظر تھی۔ اس سے پہلے کہ ماما کا ارادہ بدل جائے، اسے ایڈمشن لینا تھا۔

”فارمز فل کر کے صبح مجھے بتانا، صبح کالج چلیں گے۔“ کوکب کہہ رہی تھی اور وہ اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔ جب اچانک بادل برسنے لگے۔ ”ارے میں جا رہی ہوں۔“ کوکب اسٹول سے اتر کر اندر کو بھاگ گئی۔

”اُف موسم کتنا اچھا ہو گیا۔“ علینہ نے برآمدے میں آ کر سوچا مگر پھر اس کا دل مایوس ہو گیا۔ اس موسم کا لطف اٹھانے کے لیے کوئی بھی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اسے اپنی تنہائی بری طرح کھلنے لگی۔ اسی وقت اسے اندر فون کی بیل سنائی دی۔ ”کاش یہ فہد... کا فون ہو۔“ اس نے سوچا اور اندر کی طرف بھاگی مگر یہ فون فہد کا نہیں تھا۔ یہ ایک اجنبی آواز تھی، تھوڑی سی بات کے بعد اسے یاد آیا یہ وہی شخص نہیں تھا جو میرال اور اس کی دادی کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔ وہ ان دونوں کے بارے میں کچھ معلومات لینا چاہ رہا تھا۔

”کیا آپ نے میرال کو تلاش کر لیا؟“ اس نے تجسس کے مارے بے اختیار اس شخص سے پوچھا۔

”آپ دعا کریں میں اس کو تلاش کر سکوں۔“ اس شخص کے لہجے میں عجیب سی اداسی تھی۔

”جب آپ اس کو تلاش کر لیں تو پلیز مجھے ضرور بتائیے گا۔“ علینہ کی آواز میں بچوں کا سا شوق تھا۔

”ضرور، میں آپ کو ضرور بتاؤں گا۔“ اس شخص نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

”کتنی خوش قسمت ہے میرال۔“ علینہ نے سوچا۔ ”یہ شخص اس کا کیا لگتا ہے، کزن یا پھر لور؟“ اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ ”عجیب رومینٹک سی اسٹوری ہے۔ یہ اس کو جگہ جگہ تلاش کرتا پھر رہا ہے اور وہ اپنا کہیں نشان بھی نہیں چھوڑ کر گئی۔“ اس شام اس نے اتنی تنہائی محسوس کی کہ انتظار کرنے کے بعد فہد کو خود سے ہی فون کر لیا اور میرال والا قصہ۔ جو وہ اب تک اسے بتا نہیں پائی تھی، سنا دیا۔

”ارے یار وہ تو ایک جیم (gem) تھی، اس کے ساتھ کیا ہوا!“ وہ سن کر کہہ رہا تھا۔ ”اس لڑکی میں بہت خوبیاں تھیں، وہ لڑکی ہونے کی ایک بہت خوب صورت مثال تھی۔ مجھے وہ اب بھی یاد آتی ہے۔ تم نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ اس کے ساتھ یہ عجیب سی ٹریجڈی ہو گئی۔“ وہ بار بار افسوس کر رہا تھا۔

”فضول میں، میں نے اسے بتا دیا۔“ علینہ کو افسوس ہونے لگا۔ ”اب یہ اس کے سوا کوئی اور بات ہی نہیں کر رہا۔ سچ ہے میرال میں ضرور کوئی ایسا جادو تھا جو بغیر چلائے چلتا تھا۔ یہ دونوں جو اتنے عرصے سے اس سے ملے بھی نہیں۔ اس کے غائب ہو جانے پر یوں افسردہ ہو رہے ہیں۔“ وہ شام کسی طرح بھی اچھی ثابت نہیں ہوئی تھی۔ پہلی بار اسے فہد سے بات کرنے کا بھی مزہ نہیں آیا تھا۔ اس جیسی قنوطی لڑکی کے لیے یہ ایک بات رات بھر کڑھنے کے لیے کافی تھی۔

☆☆☆

وہ گھر کی چوکھٹ پر کھڑا تھا۔ وہ بلند دیواروں اور اونچی چھتوں والا گھر کسی کھنڈر کا منظر پیش کر رہا تھا۔ وہ صحن اور غلام گردشیں جن میں اس کا بچپن، لڑکپن اور اوائل جوانی کھیلتے کودتے، اٹھتے بیٹھتے، پڑھتے سنتے گزری تھی۔ دھول سے اٹی ہوئی تھیں۔ کبھی کے اگائے اکا دکا درختوں کے خشک اور زرد پتے ہر جگہ بکھرے پڑے تھے۔ درو

دیوار وحشت اور ویرانی کا احساس دلا رہے تھے۔ اس کا دل ایک دم بیٹھ سا گیا۔ یہاں آنے کے راستے میں وہ جتنا بھی گھر کی ویرانی اور وحشت کا تصور کرتا حقیقت سے تصور ہر طرح کم رہ گیا تھا۔ کتنی ہی دیر دروازے پر کھڑے رہنے کے بعد وہ ہمت کر کے اندر داخل ہوا۔ زرد اور خشک پتے اس کے جوتوں کے نیچے آ کر چرمرائے، دھول کی دبیز تہ پر جوتوں کے نشان چھوڑتا، وہ چھوٹے صحن میں آ گیا۔ کھانے کے کمرے کے دروازے نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی اور وہ ایک سائڈ پر جھول رہا تھا۔ کمرے کا فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ پرانی طرز کے روشندانوں میں پرندوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ قدموں کی آواز سن کر وہ سب باہر کی طرف اُڑنے لگے تھے۔ استعمال کی تقریباً سب چیزیں اس کے ماموں اور خالائیں لے گئے تھے اور گھر ویران پڑا تھا۔ بی اماں کے انتقال کے بعد اس نے جو سیالکوٹ چھوڑا تھا تو دوبارہ اِدھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ بی اماں کے انتقال پر یہ فیصلہ ہوا تھا کہ گھر کی از سرِ نو مرمت اور تزئین کرنے کے بعد اسے کرائے پر اٹھا دیا جائے گا مگر ابھی تک اس سلسلے میں کسی نے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ پچھلے دنوں چھوٹے ماموں نے اسے فون پر کہا تھا کہ وہ ایک بار جا کر گھر کی حالت دیکھ آئے اور اس رقم کا اندازہ لگانے کی کوشش کرے جو اس کی مرمت و آرائش پر اٹھنی تھی۔ وہ ماموں کا کہا ٹال نہیں سکتا تھا اس لیے نہ چاہنے کے باوجود اِدھر چلا آیا مگر اس گھر کی حالت اس کے تصور سے بھی کہیں زیادہ بدتر تھی۔ وہ دل پر پتھر رکھ کر کمرا کمرا گھومتا رہا اور پھر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا آیا۔ انہی چھتوں پر اس کا بچپن پتنگیں لوٹتے اور اڑاتے گزرا تھا۔ وہ بی اماں کے کمرے کے باہر سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ اس کا دل پھٹ رہا تھا۔

"مکان مکین کے دم سے قائم رہتے ہیں، مکینوں کے بغیر مکان بھوتوں کا بسیرا بن کر رہ جاتے ہیں۔ مکانوں کو آباد رکھنا چاہیے، زیادہ دن خالی نہیں چھوڑنا چاہیے، مکانوں میں انسانوں کی آوازیں ابھرتی ہی اچھی لگتی ہیں، وحشت کی چڑیلوں کی چیخیں نہیں۔" اسے بی اماں کی کہی ہوئی ایک بات یک دم ہی یاد آ گئی۔ کیا وہ جانتی تھیں کہ ان کے بعد ان کا مکان بھوتوں کا بسیرا بن جائے گا اور اس میں انسانوں کی آوازیں نہیں، وحشت کی چڑیلوں کی چیخیں ابھرا کریں گی۔ اس نے سوچا اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ آسمان صاف اور نیلا تھا اور اس پر اڑتے پرندے اور بلند ہوتی پتنگیں اپنی رنگوں کی بہار دکھا رہی تھیں۔ ساتھ کے گھروں سے لوگوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور نیچے گلی میں بچوں کا شور تھا۔

"سب کچھ ایک سا رہتا ہے بس چہرے بدل جاتے ہیں۔" اس نے اٹھ کر بی اماں کے کمرے کی کھڑکی سے نیچے گلی میں جھانک کر گلی ڈنڈا کھیلتے بچوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ "کل اسی جگہ ہم کھیلتے تھے، آج یہ بچے۔ سب وقت کا کھیل ہے وقت کا۔" اس نے مڑ کر کمرے پر نظر ڈالی۔ بی اماں کا نواڑی پلنگ اپنی جگہ سے غائب تھا، ان کا دیوان، ان کی بک شیلف اور ڈریسنگ ٹیبل، لوہے کی چھوٹی الماری اور استری ٹیبل سب غائب تھے اور کمرا ویران اور خالی تھا۔ "یہاں ایک گول میز رکھی رہتی تھی۔" اس نے کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر سوچا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "دیکھیں بی اماں آپ نے مجھے کتنا تنہا اور خالی کر دیا۔" اس نے تصور میں انہیں مخاطب کیا پھر اس کی نظر دیوار گیر الماری کے ادھ کھلے کواڑ پر جا پڑی اس نے آگے بڑھ کر الماری کے دونوں پٹ کھول دیے۔ بی اماں کی تنکوں کی ٹوکری ٹوٹی ہوئی حالت میں وہاں رکھی تھی اور ایک موی لفافے میں رکھے چند پرانے کاغذ غالباً غیر اہم اور فضول جان کر یونہی رکھے رہنے دیے گئے تھے ورنہ تو سب کچھ میدانِ جنگ کے بعد ہاتھ لگنے والے مالِ غنیمت کی طرح لوٹ لیا گیا تھا۔ اس نے وہ ٹوٹی ہوئی ٹوکری اور موی لفافہ

اٹھالیا۔ دونوں چیزوں پر گرد تھی، اسے بے اختیار چھینک آ گئی۔

"تمہیں تیز خوشبوؤں اور گرد سے الرجی ہے، ان دونوں چیزوں سے پرہیز کیا کرو۔" اسے ایک بار پھر بی اماں کی کہی بات یاد آ گئی۔ وہ تیزی سے ان کے کمرے سے باہر نکلا اور نکلتے نکلتے کمرے کے ساتھ ملحقہ غسل خانے پر اس کی نظر پڑ گئی۔ لوہے کا پرانا حمام اپنی جگہ موجود تھا اور لکڑی کی دیمک کھائی چوکی بھی۔ اسے بی اماں کا باتیں کرنے والا مٹھو یاد آ گیا جس کی نظر اگر کسی وقت حمزہ پر ایسے میں پڑ جاتی جب وہ ہاتھ دھونے سے پہلے صابن پر پانی ڈال کر گیلا کر رہا ہوتا تو وہ دہائی دے کر بی اماں کو بلاتا۔

"بی اماں، بی اماں حمزہ نے پھر صابن گیلا کیا۔"

"میں کس بات کو یاد کروں اور کس کو بھلا دوں۔" اس کے حلق میں گولا سا پھنسنے لگا۔ اسے لگا وہ کچھ دیر اور یہاں رکا تو پاگل ہو جائے گا۔ وہ سرعت سے سیڑھیاں اترا اور اتنی ہی تیزی سے دونوں صحن عبور کر کے بیرونی دروازے پر پہنچ گیا۔ کچھ دیر وہاں کھڑے رہنے کے بعد اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ گھر کی وحشت اور تنہائی حسرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"جیتا رہ میرے بچے جیتا رہ۔" کسی نے بآوازِ بلند اسے دعا دی تھی۔

☆☆☆

وہ فضا میں محوِ پرواز تھا، اس کے سامنے آسمان کی وسعتیں تھیں اور وہ زمین سے بہت بلند تھا۔ دورانِ پرواز وہ کبھی اتنا پُرجوش اور خوش نہیں ہوا تھا جتنا اس روز تھا۔ اس روز پہلی مرتبہ اس نے اپنے پیچھے چھٹتے دھوئیں کو جہاز کی قلابازیوں کے ذریعے ایسی شکلیں دینے کی کوشش کی تھی جو دیکھنے والوں کو سمجھ آ سکیں۔ وہ خود تو انہیں دیکھ نہیں سکا تھا مگر اسے یقین تھا کہ اس تجربے کے بعد آئندہ جب بھی وہ ایسا کرے گا تو جس کسی کو بھی اس نے اپنی پرواز کا مشاہدہ کرنے کا کہا ہوگا وہ ضرور دیکھ پائے گا کہ اس نے کیا بنایا۔ وہ اپنے تجربے کی کامیابی پر اتنا خوش تھا کہ اس نے اسی خوشی میں اپنے چھوٹے ائیر کرافٹ کو کئی بار ایسی قلابازیاں دلائیں جو اس سے پہلے اس نے کبھی تجربہ نہیں کی تھیں۔ وہ بے حد ایکسائٹڈ تھا، پُرجوش اور خوش، خوش، ایک بار، دو بار، تین بار، چوتھی، بار پانچویں بار وہ خوشی سے اچھلتے دل کے ساتھ اپنے نئے تجربے کو بار بار آزمانے میں مصروف تھا اور ہر بار پہلے سے بہتر محسوس کر رہا تھا۔ "اب واپس جانا چاہیے۔" اس نے سوچا۔

"دانیال تم اوور ایکسائٹڈ ہو رہے ہو، اب تمہیں واپس آ جانا چاہیے۔" قیوم کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"میں واپس آ رہا ہوں سر، آپ ذرا میری واپسی پرواز دیکھیے۔"

"جسٹ تھیواسے لک۔" اس نے خود کو کہتے سنا تھا اور اس کے جہاز نے ایک جھٹکا کھایا تھا۔ فضا کی وسعتیں اسی طرح اس کی نظروں کے سامنے پھیلی تھیں۔ جہاز کے نظام پر اس کا کنٹرول بالکل ٹھیک تھا مگر کہیں کچھ تھا جو غلط ہو گیا تھا بہت غلط۔ اسے محسوس ہوا وہ جو کرنا چاہ رہا تھا وہ ہو نہیں پا رہا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے اچانک دھندی چھا گئی تھی اور ہر چیز اس کے کنٹرول سے باہر ہو رہی تھی۔ وہ جن فضاؤں میں محوِ پرواز تھا انہی فضاؤں میں کنٹرول کے بغیر ڈولنے لگا تھا۔ کچھ تھا جو اسے تیزی سے نیچے، بہت نیچے لے جا رہا تھا۔

"دانیال کیا ہو رہا ہے؟" اسے قیوم کی آواز سنائی دی تھی۔

"دانیال یہ کیا ہے؟" اسے دوبارہ سنائی دیا۔

"دانیال......دانیال...... you are lossing your sight" پھر اسے آواز آئی۔

اس کے حواس ایک دم مختل ہو گئے تھے۔ اس نے اپنی دھندلائی نظریں چاروں طرف گھمانے کی کوشش کی۔ ہر طرف گرد اور دھند تھی۔ اسے کچھ بھی صاف طور پر نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کا وجود ایک دم بے وزن ہو رہا تھا اور وہ ایک کاغذ کے ٹکڑے کے مانند نیچے کو گر رہا تھا۔

''کیا یہ وہ گھڑی ہے؟'' اس کے ماؤف ہوتے دماغ نے سوال کیا تھا۔

''کیا یہ وہ احساس ہے۔''

''کیا یہ وہ بے وجودی ہے۔''

''کیا یہ وہ سرحد ہے۔''

''کیا یہ بے بسی ہے۔''

''اے میرے اللہ کیا تو مجھے معاف کردے گا۔''

''اے میرے اللہ کیا کہیں تھوڑی سی زندگی باقی ہے۔''

''اے میرے اللہ، میں تو وقت کو ٹالتا رہا ہوں، مجھے اپنی زندگی کے دراز ہونے کے بارے میں کچھ شبہ نہ تھا۔ میں تو نیکی کرنے کو تیرے راستے کی پیروی کرنے کو، تجھے سمجھنے کو، تیرا ہو جانے کو ہمیشہ ٹالتا رہا ہوں۔ ابھی بہت وقت ہے، ابھی بہت وقت ہے کہہ کر... اے میرے اللہ میں تو زندگی اور زندگی کی نعمتوں کا مزہ چکھنے اور لطف اٹھانے میں ہی مصروف رہا، یہ سوچ کر کہ ابھی تو زندگی ہی زندگی ہے۔ اوہ میرے خدا! مجھے تو یہ خیال کبھی بھی نہیں آیا کہ یہ جو آب مجھے آن دبوچنے والی ہے یہ تو ہر لحہ ساتھ تھی، یہ تو تعاقب میں تھی، یہ تو اس لمحے کے انتظار میں تھی۔''

''اے میرے اللہ! کیا کوئی گنجائش ہے معافی کی؟ میں بے حد گناہ گار ہوں مگر گناہ گاری کیا ہے اور یہ گناہ ہی کیا ہے۔ یہ تو میری سمجھ میں آیا ہی ابھی ہے پھر میرے جیسے کے لیے گنجائش کیسے نکلے گی۔ اوہ میرے خدا! مجھ پر اس ایک لمحے میں کیا کچھ واضح ہو گیا مگر اب تو بہت دیر ہو چکی، بہت دیر ہو چکی۔''

''زندگی اے زندگی...... تو مجھے الوداع کہہ رہی ہے اور میں سمجھتا تھا کہ تیری میری تو نہ ختم ہونے والی رفاقت ہے، زندگی اے زندگی! تجھ سے بے وفا بھی کوئی چیز ہے۔ جس سرحد پر میں خود کو کھڑا پا رہا ہوں۔ اس میں تجھ سے محض ایک ساعت کے فاصلے پر وہ کھڑی ہے جو مجھے خوش آمدید کہنے کو تیار ہے اور وہ مجھے بتا رہی ہے کہ ہمیشہ رہنے والی رفیق تو میں ہوں۔ زندگی تو نے مجھے اب تک کس فریب میں مبتلا رکھا، تیرے رنگ اتنے دلفریب تھے کہ میری آنکھوں پر تیری ہی دلفریبی کی پٹی بندھی رہی، مجھے علم ہی نہیں ہو سکا کہ تیری سرحد پرے کیا ہے اور مجھ سے اس کا فاصلہ کتنا کم ہے۔''

''اے میرے خدا...... مجھے معاف کردے۔ میرے اعمال کی بدشکلی کو معاف کردے۔ میرے خدا میں سچے دل سے توبہ کرتا ہوں تو مجھے معاف کردے۔'' اس کا بے وزن وجود جیسے کسی گہری کھائی میں گر رہا تھا۔ اس نے اپنی بند آنکھوں کو کھولنے کی کوشش کی۔ اس کے سامنے دونوں مسکرا رہی تھیں۔ زندگی بھی اور موت بھی۔ اس کی فطرت کے بشری تقاضوں نے بے اختیار اس کا ہاتھ زندگی کی طرف بڑھا دیا مگر اسے یہ پتا نہیں چل سکا اس کا بڑھا ہوا ہاتھ کس نے تھاما تھا۔ اس کا بے وزن وجود شاید بری طرح کسی سخت چیز سے جا ٹکرایا تھا۔

''دانیال، دانیال...... تم میری آواز سن رہے ہو۔'' اس کے کانوں سے یہ آخری آواز ٹکرائی تھی۔ یہ آخری آواز قیوم کی تھی۔ اس کے بعد اس کے اردگرد ہر چیز ساکن ہو گئی تھی، ہر طرف اندھیرا تھا اور سکون تھا۔

(جاری ہے)

شامِ شہرِ یاراں

عنیزہ سیّد

قسط 4



زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے... خیر و شر، نیکی اور بدی... زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت... ہر برائی پر حاوی ہوجاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سیّد نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

''تمہیں اردو اور انگریزی زبان دونوں پر عبور حاصل ہے۔ تم ایک اچھی قلم کار بن سکتی ہو، تمہیں کوشش کرنی چاہیے اس سلسلے میں چھوٹے چھوٹے پیراگراف لکھا کرو، مختلف موضوعات پر اور پھر مجھے دکھایا کرو۔'' اس کی انگلش کی ٹیچر نے اسے کہا تھا اور اس بات نے اس کے اندر ایک نئی روح پھونک دی تھی، اس نے اسکول میگزین کے لیے چھوٹے چھوٹے مضمون لکھنے شروع کر دیے۔

''تم ایکٹو ہو اور کھیل کی تکنیک کو سمجھتی ہو، تمہیں کھیلنا چاہیے۔'' اسکول کے لان ٹینس کوچ نے اسے ایک دو بار کھیلتے دیکھ کر کہا۔ اس نے روزانہ فارغ وقت میں ٹینس کی پریکٹس کرنا شروع کر دی۔

''تمہارا لہجہ اور تلفظ خوب صورت ہے، میں اگلے تقریری مقابلے کے لیے تمہارا نام دے رہی ہوں، تمہیں ابھی سے تیاری کرنا شروع کر دینی چاہیے۔'' اردو کی ٹیچر نے اسے کہا تھا۔ وہ ارادہ کر کے کسی کام کو شروع نہیں کرتی تھی۔ اس کی قسمت اس پر مہربان تھی۔ وہ اسکول کی چندان لڑکیوں میں شمار ہونے لگی تھی جن کو غیر معمولی کہا جاتا تھا۔

''نماز پڑھا کرو، دعا مانگا کرو، اللہ سے فلاح مانگا کرو۔'' اس کی کامیابیوں کی خبر سن کر بوا جی کہا کرتیں مگر وہ ناشکری تھی۔ اس کے شکوے ختم نہیں ہوتے تھے، اپنی کامیابیوں میں بھی اسے کمیاں نظر آتی تھیں، اسے ہمیشہ دوسروں کی شخصیتوں، کاموں اور چیزوں میں کشش نظر آتی تھی، وہ نہ صرف اسکول میں بلکہ اپنی کالونی میں بھی رول ماڈل کے طور پر پیش کی جاتی تھی۔ لوگ اپنی بچیوں کو اس کی مثالیں دیتے تھے اور سمجھاتے تھے کہ ان کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔ وہ ایسی باتیں سن کر بظاہر بہت بے نیاز اور عاجزی پسند نظر آنے کی کوشش کرتی تھی مگر دل ہی دل میں ایسی باتوں پر بھی اسے شکوہ کرنا نہ بھولتا۔

''میرا اور ان لڑکیوں کا کیا مقابلہ۔'' وہ سوچتی۔ ''ان کے سروں پر ان کے والدین سلامت ہیں، ان کے بہن بھائی ہیں، عزیز رشتے دار ہیں، ان کو جو رونقیں اور سرپرستی میسر ہے وہ میرا مقدر کہاں۔''

عزیز رشتے دار کے نام پر بوا جی کی ایک دوست نما کزن البتہ کبھی کبھار ان کے یہاں آ جاتی تھیں جو سیالکوٹ میں رہتی تھیں، بہت ہی کم کبھی بوا جی بھی اس کو ساتھ لے کر ان سے ملنے سیالکوٹ جایا کرتی تھیں اور ایبٹ آباد سے سیالکوٹ کے اس سفر میں وہ بہت خوش رہا کرتی تھی۔ وہ بھی کہیں جا رہی تھی، اسے بھی کسی سے ملنا تھا، ماحول کی تبدیلی میسر آنے والی تھی، وہ اس شہر کو فیسی نیٹ کرتی جہاں وہ کبھی کبھار جا سکتی تھی۔ بوا جی کی دوست نما کزن کو سیالکوٹ میں بی اماں کے نام سے بلایا جاتا تھا۔ بی اماں کا ایک نواسا ان کے پاس رہتا تھا جو کچھ کم گو، حساس اور لیے دیے رہنے والا لڑکا تھا۔ بی اماں کے نام کی نسبت سے وہ اسے محمد علی جوہر کہا کرتی تھی، وہ نہ تو اس بات پر ہنستا تھا نہ ہی برا مناتا تھا۔ عجیب بے حس سا لڑکا تھا، اپنے کام سے کام رکھنے والا۔ اسے وہ چھٹیاں اکثر یاد آتیں جب بی اماں اور ان کا نواسا ان کے پاس چند دن رہنے کے لیے آئے تھے۔ پنجاب میں ان دنوں سخت گرمی پڑ رہی تھی اور ایبٹ آباد میں موسم اچھا تھا۔ یہاں آ کر دونوں کے مرجھائے ہوئے چہرے کھل اٹھے تھے۔ حمزہ اپنے ساتھ اسکول کی کتابیں بھی لایا تھا۔ اسے چھٹیوں میں ملنے والا کام کرنا تھا۔

''کتنے بورنگ اسکول میں پڑھتے ہو تم جہاں تمہیں اتنا زیادہ ہوم ورک مل جاتا ہے چھٹیوں میں۔'' وہ اسے کہا کرتی تھی۔

''بس ایسے ہی ہے۔'' وہ نیچی سی آواز میں کہتا۔

''ارے کیا ایسے ہی ہے، اپنے ٹیچرز سے کہا کرو ناں کہ اتنا زیادہ ہوم ورک نہ دیا کریں۔ اتنے زیادہ

عنوان ہیں جن پر تمہیں مضمون لکھنے ہیں، انگریزی میں بھی اور اردو میں بھی۔'' وہ اُس سے ملنے والے کام کی تفصیل پڑھتے ہوئے بولی۔

''ہو جائے گا کام۔'' وہ اسی سنجیدگی سے قلم چلاتے ہوئے جواب دیتا۔

''اچھا لاؤ، کچھ مضمون میں لکھ دوں تمہیں، دیکھو تو میں کیسا لکھتی ہوں۔'' اس نے کھلے دل سے پیشکش کرتے ہوئے کہا۔

''آپ تو ظاہر ہے بہت اچھا لکھتی ہوں گی۔'' اس نے اسی متانت سے جواب دیا۔

''ہونہہ...... آپ۔'' اس نے دل میں برا مناتے ہوئے کہا۔ ''ایسے تھوڑی۔ جب میں لکھوں جب بتانا۔'' اسے اپنی ذہانت اور قابلیت پر اعتماد تھا۔ اس نے اسی دوپہر بیٹھ کر ایک انگریزی اور اردو کا مضمون اس کے لیے لکھا۔

''یہ بہت اچھا ہے، آپ کا ذخیرۂ الفاظ بہت وسیع ہے۔ بہت شکریہ۔'' جواب میں اس نے فقط تین جملوں میں بات ختم کر دی۔

''افوہ......'' وہ جھنجلا اٹھی۔ ''کتنا بددماغ اور بدتمیز ہے، تھینکس بس۔'' اس شام وہ دل ہی دل میں اس سے سخت ناراض رہی۔

''ہے تو یہ بھی میری طرح ہی ناں بے چارہ، اس کے بھی ماں باپ مر گئے ہوں گے جب ہی بی اماں کے پاس رہتا ہے۔ ارے اس میں تو اعتماد ہی نہیں ہے، جب ہی اتنا کم گو اور سنجیدہ بنتا ہے، بات کر سکے تو کرے ناں۔'' وہ اپنے دل میں قیاسے لگاتی رہی۔

''اس کے سامنے نہ کہہ دینا ایسی فضول بات۔'' بوا جی کو اس کی سوچ کا علم ہوا تو انہوں نے اسے ڈانٹ دیا۔ ''اس کے ماں باپ زندہ ہیں اور اچھی خاصی زندگی گزار رہے ہیں، یہ تو اس کی نانی نے اسے گود لے رکھا ہے اور یہ اپنی نانی کا اتنا لاڈلا ہے کہ وہ اسے خود سے جدا نہیں کرتیں ورنہ اس کو اپنے ماں باپ کے گھر کس چیز کی کمی ہے۔''

''چلو جی قصہ ختم۔'' وہ سخت مایوس ہوئی۔ ''یہ بھی باقی لوگوں کی طرح ہی ہے۔ ایک صرف میں ہی الگ ہوں بے چاری، جس کے ماں باپ نہیں ہیں۔ جب ہی تو یہ اتنا مغرور اور خود پسند سا ہے۔''

''یہ ماں باپ کی محرومی کا رونا کب تک رویا جائے گا۔'' آخر بوا جی کو غصہ آ گیا۔ ''ذرا اپنے اردگرد نظر دوڑاؤ، تم نے کبھی اُسے دیکھا ہے ڈاکٹر نادیہ کی بیٹی کو کتنی چھوٹی سی ہے، اس کے والد کا بھی تو انتقال ہو چکا ہے اور اس کی ماں سارا سارا دن بے چاری محنت مزدوری کرتی رہتی ہے، وہ چھوٹی سی بچی اکیلی رہتی ہے سارا دن، وہ بھی تو جیتی ہے، اب تمہارے ہی گلے نہیں ختم ہوتے۔''

''آپ کو ساری عمر اس محرومی میں گزارنی پڑے تو جانوں...... جو جس کیفیت سے نہیں گزرا ہوتا، وہی ایسی بڑی، بڑی باتیں کرتا ہے۔ ٹھیک ہے مت رکھیے میرے ساتھ ہمدردی مگر یہ مت بھول لیے گا کبھی کہ میرے دل سے اس محرومی کا اثر کبھی نہیں جائے گا۔'' وہ پہلی مرتبہ بوا جی کے ساتھ تلخ ہو کر بولی تھی۔ اپنی بات کہہ کر وہ جیسے ہی کمرے سے باہر نکلنے کے لیے مڑی اسے دروازے میں کھڑی بی اماں اور حمزہ نظر آئے۔ یقیناً انہوں نے اس کی تلخ اور گستاخانہ لہجے میں کہی بات سن لی ہو گی۔ وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو گئی۔ سب کی نظروں میں ان کی شخصیت کا تاثر بہت اچھا تھا۔ اسے دلی قلق ہوا کہ بی اماں اور حمزہ کے ذہن میں اس کا تاثر خراب

ہوگیا تھا۔

''آپ کو جو کام اسکول سے ملتا ہے، مجھے بھی دکھایا کیجیے۔ آپ کے اسکول کا معیار بہت اچھا ہے، مجھ بھی اندازہ ہونا چاہیے کہ ایسے اسکول میں پڑھائی کیسے ہوتی ہے۔'' اگلے روز اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب حمزہ نے پہلی مرتبہ اس سے اتنی تفصیلی بات کی۔

''میں جونیئر برن ہال میں پڑھتی ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''آؤ میں تمہیں اپنی کتابیں دکھاؤں۔''

''آپ کی لکھائی ماشاء اللہ بہت اچھی ہے اور لکھنے کا انداز بھی خوب ہے۔ آپ خاصی ذہین ہیں۔'' حمزہ نے تعریف کی۔ اس قسم کی تعریفوں کی وہ عادی تھی۔

''آج میری ٹیچر نے مجھے ہیومن رائٹس پر مضمون لکھنے کے لیے کہا ہے۔'' وہ بتانے لگی۔

''کیا میں بھی اس موضوع پر مضمون لکھ سکتا ہوں؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''کیوں نہیں، تم بھی لکھو پھر دیکھتے ہیں کہ ہمارے کتنے پوائنٹس ملتے جلتے ہیں۔'' اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

اس نے ایک اچھا مضمون لکھا تھا مگر حمزہ کا مضمون پڑھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔ اس نے حمزہ کا لکھا مضمون اپنی کاپی میں رکھ کر بیگ میں رکھ لیا اور اگلے روز اپنی ٹیچر کو دکھایا۔

''یہ مضمون کسی بڑے سے لکھوایا آپ نے؟'' ٹیچر نے سوال کیا۔ ''ہینڈ رائٹنگ آپ کی نہیں ہے۔''

''یہ مضمون ہمارے گھر آئے ایک مہمان نے لکھا ہے۔'' اس نے صاف بتایا۔

''کسی سینئر کلاس کے اسٹوڈنٹ نے لکھا ہے مضمون؟'' ٹیچر نے غالباً سہ بارہ وہ مضمون پڑھنے کے بعد پوچھا۔

''وہ بھی اسی کلاس میں پڑھتا ہے ٹیچر۔'' اس نے کہا۔

"he is a real genius then" ٹیچر نے بے اختیار کہا۔ ''ونڈر فل، زبردست!''

''شکل سے تو اتنا مسکین سا لگتا ہے۔'' اس نے سوچا۔ ''پتا نہیں اتنا اچھا مضمون کیسے لکھ لیا۔'' اس نے رشک اور حسد کے ملے جلے احساس کے تحت واپسی پر حمزہ سے ٹیچر کی تعریف کا ذکر نہیں کیا مگر وہ اپنے دل میں ہر دم اس سے مقابلہ کرنے کی دُھن میں رہنے لگی۔ لیکن ان احساسات کے باوجود حمزہ کی وہ چھٹیاں اس کے لیے یادگار ثابت ہوئی تھیں۔ اس بار بی اماں پہلے سے زیادہ دن ٹھہریں اور وہ لوگ برنو، شملہ پہاڑی، سرنان اور الیاسی کی سیر کرنے کے بعد ٹھنڈیانی اور نتھیا گلی تک ہو آئے۔ اس سفر میں حمزہ اور اس نے خوب لطف اٹھایا۔ وہ ایک دوسرے سے بے تکلف بھی ہوئے اور مختلف کھیل بھی کھیلتے رہے۔ جاتے ہوئے حمزہ اس سے سردی کی طویل چھٹیوں میں سیالکوٹ آنے کا وعدہ لے کر گیا تھا۔

☆☆☆

''ہماری داستانیں چراغ جلانے سے شروع ہو کر چراغ بجھانے پر ختم ہو جاتی ہیں۔'' امراؤ بیگم نے کئی مرتبہ کی سنائی بات دُہراتے ہوئے کہا تھا۔ ''ہمارے پیشے کی تمام کہانیاں کم و بیش انہی اوقات کے گرد گھومتی ہیں۔'' وہ کہہ رہی تھی۔ ''دنیا کی کوئی زبان ایسی نہ ہوگی جس میں طوائف کا قصہ نہ لکھا گیا ہوگا۔ ادھر ہمارے ہاں بڑے، بڑے نامور لکھاری مشہور ہی بازارِ حسن کی کہانیاں لکھ کر ہوئے۔ یہ اپنے منٹو صاحب، ادھر عصمت چغتائی اور واجدہ تبسم کیا بڑے، بڑے نام ہیں، سب نے طوائفوں کی کہانیاں لکھیں اور مشہور ہوئے۔ کسی طوائف، رنڈی لگی کسی کو طوائف کے کوٹھے پر روحانیت مل گئی۔ سب اپنے، اپنے انداز سے ... کہتے رہے مگر کہانی ایک ہی تھی۔''

''منٹو صاحب، عصمت چغتائی، واجدہ تبسم۔'' زرنگار کے کانوں میں جیسے عرصے بعد کچھ مانوس سے نام پڑے تھے جنہیں وہ عرصہ ہوا بھول ہی گئی تھی۔ ''کبھی میں بھی پڑھا کرتی تھی ان نامور لکھاریوں کی مشہور کہانیاں۔'' اس نے سوچا۔ ''اور وہاں سے چل کر میں بھی انہی کہانیوں کا ایک کردار بن گئی۔'' پھر اس نے اپنے ارد گرد کے منظر پر نظر ڈالی۔ ''زندہ کہانی کا جیتا جاگتا کردار۔'' اس نے خود کو ٹائٹل دیا۔

''خود کو محدود نہ کر ڈالو میری بچی۔ میری بات مان جاؤ۔'' پھر امراؤ بیگم اپنی اصل بات پر آ گئی۔

''کیا بات مان جاؤں اماں؟'' اس نے نرمی سے کہا۔

''صرف ایک مہرزاد خان ہی نہیں یہاں اور بھی بہت ہیں تمہارے حُسن کے پرستار جو تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لیے تنہائی میں تمہارے ساتھ ایک لمحہ گزارنے کے لیے اپنی آدھی، آدھی دولتیں لٹانے کو تیار ہیں۔'' امراؤ بیگم بہت میٹھا بول رہی تھی اور زرنگار اس مٹھاس میں گھلی تلخی کے ذائقے کو اپنی زبان اور اپنے حلق میں اترتا محسوس کر رہی تھی۔

''تم جانتی ہو اماں، مہرزاد خان کی ایک ہی شرط ہے۔'' اس نے کسی لگی لپٹی کے بغیر صاف جواب دینے کا فیصلہ کیا۔

''جانتی ہوں۔'' امراؤ بیگم نے سر ہلایا۔ ''مگر اس کی ایک ہزار راتیں نہ جانے کب ختم ہوں گی اور وہ کون سا ایک ہزار راتیں تواتر سے گزارے گا یہاں۔ دس، دس دن کا وقفہ ڈالنے کے بعد ایک رات وہ یہاں آتا ہے یوں تو میری عمر ختم ہو جائے اس کی ہزار راتیں نہ ختم ہوں گی۔''

''کیا وہ دس دن خالی جانے دیتا ہے اماں، کیا وہ تمہیں اتنا نہیں دیتا جو دس ہزار دنوں کے معاوضے کے مطابق ہوتا ہے۔'' زرنگار نے پوچھا۔

''مگر میری جان خود کو محدود مت کر، اپنے حسن کی لو کو بڑھا کر چہار سو پھیلا دے تاکہ اس شہر کیا، اس علاقے کا ذرہ ذرہ روشن ہو جائے تیرے حسن کی لو سے۔ میری بچی! اپنی جوانی کو اپنے حسن کو عمر بھر کا روگ نہ بنا۔ طوائف کا کوئی محبوب نہیں ہوتا، وہ کسی کی معشوق نہیں ہوتی۔ طوائف کا محبوب پیسہ ہوتا ہے اور اس کا حسن اور اس کا جسم اس کا اے ٹی ایم کارڈ ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ جب چاہے جہاں سے چاہے کیش نکلوا سکتی ہے۔'' زرنگار کو اس قسم کی گفتگو سن کر ہمیشہ متلی سی محسوس ہوتی تھی مگر اسے ایسی باتیں سننے کی عادت ہو چکی تھی اس لیے اب وہ اپنا ردِعمل ظاہر نہیں کرتی تھی۔

''آپ مہرزاد خان کو اپنی رضامندی دے چکی ہیں اماں، اب مکریں گی کیسے؟'' اس نے امراؤ بیگم کو یاد دلایا۔

''طوائف کی کوئی زبان بھی نہیں ہوتی، کوئی وعدہ، کوئی قسم نہیں ہوتی۔ وہ اپنی سوئی بدلتے حالات اور نئی پیشکش دیکھ کر پھیر لیتی ہے۔ میری چندا یہ چند سنہرے اصول ہیں اس کاروبار کے ان کو سیکھ لو، تم نازک پھول ہو، میں تم پر کوئی زور زبردستی نہیں کرنا چاہتی مگر یہ روز روز کا نقصان بھی برداشت نہیں۔ سوچ لو...... یہ سلسلہ کب تک چل سکتا ہے۔'' امراؤ بیگم کو دراصل جو بات اسے بتانا تھی وہ بین السطور اُسے بتا چکی تھی۔ زرنگار نے اس کی اس بات کا جواب نہیں دیا۔

''میرے سر میں درد ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر منہ پھیر کر لیٹ گئی۔

☆☆☆

''ہیلو آپ کیسی ہیں؟'' بینش اپنے دھیان میں بیٹھی کام کر رہی تھی جب اس کی سماعت سے آواز ٹکرائی اس نے چونک کر دیکھا اس کے سامنے دانیال بیٹھا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

''میں آپ سے مخاطب ہوں مس۔'' اس نے دوبارہ کہا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' بینش نے محسوس کیا کہ اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ اسے خود پر غصہ بھی آیا۔ اب تک اس نے اعتماد کے اس فقدان پر خاصی حد تک قابو پالیا تھا جو یہاں آنے کے بعد شروع کے دنوں میں اس پر حملہ آور ہوا تھا مگر آج کی صورتِ حال مختلف تھی آج وہ شخص پہلی مرتبہ براہِ راست اس سے مخاطب ہوا تھا جس کو دیکھ کر ہمیشہ اس کا دل بری طرح دھڑکتا تھا۔

''میں نے سنا ہے کہ آپ اپنی کلاس میں خاصا بہتر جا رہی ہیں، آپ کا نام بینش ہی ہے ناں؟'' وہ اسے حیران کر دینے کے موڈ میں تھا۔

''جی ہاں۔'' اس نے سر ہلایا۔

''آپ کا یہ جی ہاں میری پہلی بات کے جواب میں ہے یا دوسری بات کے؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''جی کیا مطلب؟'' بینش اس کی بات بالکل سمجھ نہیں پائی۔

''مطلب یہ کہ آپ اپنی کلاس میں خاصی بہتر جا رہی ہیں یا آپ کا نام بینش ہے، دونوں میں کس بات کا جواب جی ہاں ہے۔'' بینش نے ایک لمحے کے لیے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا اگر وہ بھی ان دوسرے لوگوں کی طرح اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کر رہا تھا جو اُسے پس ماندہ علاقے کی مکین سمجھ کر اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کرتے تھے تو اسے بے حد مایوسی ہوئی تھی مگر اس نے دیکھا دانیال کا چہرہ سنجیدہ تھا اور وہ بالکل بھی ہنستا ہوا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''میرا نام بینش ہے۔'' اس نے اب کے ذرا اعتماد کے ساتھ بات کی۔

''اور آپ کا کام؟'' وہ پہلی مرتبہ ذرا سا مسکرایا۔

''ابھی کام کرنے کا مارجن ہی بہت کم ہے۔ ابھی تو تھیوری زیادہ پڑھ رہے ہیں۔'' بینش کو اپنے اندر لاہور کے لوگوں والے مخصوص لہجے پر قابو پانے میں اب بھی دشواری پیش آتی تھی۔

''ہوں.....'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''اگر مشکل پیش آئے کچھ سمجھنے میں تو آپ مجھ سے پوچھ سکتی ہیں۔ مجھے دانیال کہتے ہیں اور میں کیونکہ آپ سے سینئر ہوں اس لیے آپ کو سمجھا سکتا ہوں۔'' بینش حیرت کے سمندر میں تیرنے لگی۔

''یہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ کیا یہ حقیقت ہے یا کوئی خواب؟'' اس نے خود سے پوچھا۔

''ہمارا ایک گروپ ہے جو آرٹ کی پروموشن کے لیے کام کر رہا ہے۔ یہ جو ہم سیکھ رہے ہیں جو پڑھ رہے ہیں یہ ایک محدود دائرہ ہے، آرٹ اس سے باہر اس سے آگے بہت وسیع اور بہت پھیلا ہوا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ آرٹ جو ہمارے اس خطے اور اس ملک کے مخصوص پس منظر اور تاریخ کی عکاسی کرتا ہے اسے پروموٹ کیا جائے، سامنے لایا جائے۔ ہمارے جو نامور مصور ہیں ان کے اسکول آف تھاٹ کو پروموٹ کیا جائے اگرچہ مختلف سطحوں پر اس سلسلے میں پہلے سے ہی کام ہو رہا ہے مگر ہمارا طریقہ ذرا مختلف ہے۔ ہم فٹ پاتھوں پر گلیوں اور بازاروں میں، ہجوم اور سکون میں ہر جگہ فنکار ہاتھوں کو تلاش کرتے ہیں وہ جو خداداد صلاحیتوں سے مالا مال ہیں مگر وسائل کی کمی اور محدود شعور کی وجہ سے اپنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے اور ان کو اجاگر کر

سے محروم ہیں۔ ہم ان کو سامنے لانے، ان کو اپنے ٹیلنٹ کو پالش کرنے اوران کی سرپرستی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ ہمیں جوائن کرنا پسند کریں گی؟'' وہ کہہ رہا تھا اور بینش حیران تھی، آج کا دن کیسا تھا، وہ کس کا چہرہ دیکھ کر گھر سے نکلی تھی۔ اس نے فجر کی نماز کے بعد کیا دعا مانگی تھی۔ صبح سے اب تک اس نے کون سی ایسی نیکی کی تھی وہ یاد کرنے کی کوشش کررہی تھی۔

دانیال سے بات کرنا اس کی ایک ایسی خواہش تھی جس کی کوئی وجہ بتانے سے وہ قاصر تھی۔ اسے یہ شخص ویلکٹ کرتا تھا، وہ اپنے اس احساس کو کوئی نام دینے سے یا اسے ڈیفائن کرنے سے بھی قاصر تھی۔ اسی طرح وہ اپنی اس خواہش اور اس احساس پر قابو پانے سے بھی قاصر تھی مگر وہ اتنا ریزرو اور سنجیدہ رہتا تھا کہ اسے یقین تھا کہ اس نے کبھی ارادہ کرکے اس پر ایک نظر بھی نہیں ڈالی ہوگی۔ وہ اس کا حلقۂ احباب دیکھتی جن کا تعلق ایک مختلف طبقے اور ثقافت سے تھا تو بالکل مایوس ہوجاتی تھی۔

''ایسے لوگ مجھ ایسیوں کو قابلِ توجہ کہاں سمجھتے ہیں۔'' وہ احساسِ کمتری کے مارے نہیں بلکہ اپنی حقیقت پسندی کی وجہ سے ایسا سوچتی تھی مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ انسان کسی کے بارے میں سوچنے کا انداز ہی بدل لے پھر وہ سوچتی۔ ''وہ مغرور نہیں لگتا، خود پسند بھی نہیں ہے، ہاں مگر بے نیاز اور بے پروا ہے۔ اس نے کبھی میرا مذاق اڑایا نہ ہی کوئی طنز کیا۔ اس لیے وہ دوسروں سے بہتر ہے۔'' اور اسی سوچ کی وجہ سے وہ دانیال کا احترام بھی کرتی تھی اور اس سے بات کرنے کی خواہش بھی رکھتی تھی اور اپنی حقیقت پسندانہ طبیعت کی وجہ سے اسے اپنی اس خواہش کے پورا ہونے کی ایک فیصد بھی توقع نہ تھی۔

مگر وہ ایک مختلف انسان تھا۔ دانیال نے اسے اچانک نہ صرف مخاطب کیا تھا بلکہ وہ اسے اپنا حلقہ جوائن کرنے کی دعوت بھی دے رہا تھا۔ اسے فوری طور پر اس پیشکش کا بھی کوئی جواب نہیں سوجھا تھا۔

''آپ خاموش ہیں، مس آئی ایم سوری میں شاید کچھ زیادہ بول گیا۔'' اس کی خاموشی کو دیکھ کر دانیال کو نہ جانے کیا احساس ہوا تھا جو اس نے یہ بات کہی تھی۔

''نہیں......'' بینش نے سر ہلایا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں۔''

''مجھے خود بھی نہیں پتا کہ میں آپ سے ایسا کیوں کہہ رہا ہوں۔'' وہ بولا۔ ''مگر یقین جانیں میرا دل چاہتا ہے کہ آپ ہمارے حلقے کو جوائن کرلیں۔''

''میں بالکل نئی ہوں اس میدان میں۔'' بینش نے اپنا گلا ذرا سا کھنکھارنے کے بعد کہا۔ اسے اپنی آواز بیٹھتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ ''اور مجھے بہت سی باتیں سمجھ میں بھی نہیں آئیں ابھی۔ مجھے زبان کا بھی مسئلہ ہے، میں نے شروع سے اردو میڈیم اسکول میں پڑھا ہے، بنیادی تعلیم انسان کے کیریئر پر کس حد تک اثر انداز ہوتی ہے یہ مجھے بھی اب پتا چلا ہے، میں اتفاق سے اس میدان میں اس لیے آگئی ہوں کہ میرا خیال تھا کہ فائن آرٹس صرف تصویریں بنانے، مٹی کے برتن بنانے اور مجسمے بنانے کا نام ہے۔ یہ کتنا وسیع شعبہ ہے اور اس میں کیا کچھ ہورہا ہے، یہ بھی مجھے یہاں آنے کے بعد ہی پتا چلا ہے بلکہ شاید مکمل طور پر تو اب بھی نہ پتا چلا ہو۔ میں اس میدان کی وسعت دیکھ کر دنگ رہ گئی ہوں۔ میری ڈرائنگ اچھی تھی اور مجھے تصویروں میں رنگ بھرنے کا ڈھنگ آتا تھا، اسی لیے ایف ایس سی پری میڈیکل میں بہت اچھے نمبر نہ لے سکنے پر میری ایک ٹیچر نے مجھے یہاں داخلہ لینے کا مشورہ دیا تھا مگر یہ کتنی مختلف دنیا ہے اور میرے لیے کتنی ناقابلِ حصول ہے۔ میں ابھی تک اسی سوچ کے دائرے میں گھوم رہی ہوں۔ تعلیم کے میدان میں مجھے محنت کرنے کی عادت ہے، شاید اسی لیے

آپ کو کسی نے بتا دیا ہو کہ میں اپنی کلاس میں بہتر جا رہی ہوں مگر سچ بات تو یہ ہے کہ میں ابھی خود کو یہاں خام بے جگہ محسوس کرتی ہوں۔'' بینش کو خود بھی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ اتنی تفصیلی بات اتنے صاف گو انداز میں بیان کر رہی تھی۔ بس اسے ایسا لگا تھا کہ چند لمحوں کے لیے اس کے اور دانیال کے درمیان ایسی کمیونیکیشن فریکوئنسی قائم ہو گئی تھی جس کے ہوتے ہوئے اسے یقین تھا کہ وہ اپنی بات کہہ سکتی ہے اور سننے والا اس کی بات سن سکتا ہے۔ اتنے واضح انداز میں تو اس نے ابھی تک یہاں کسی اور سے بات نہیں کی تھی شاید آمنہ سے بھی نہیں۔

''ہوں......'' وہ جو اپنے دونوں ہاتھ جوڑے ہاتھوں کے انگوٹھے دانتوں میں دبائے بیٹھا تھا اس کی بات کو بہت دھیان سے سن رہا تھا بولا۔

''یہ کوئی ایسی مشکل صورتِ حال نہیں ہے۔'' اس نے گہری سانس لینے کے بعد سیدھے ہو کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے سب مسائل کا بہت آسان حل ہے میرے پاس، یہ ہم لوگوں کی بدقسمتی ہے جو ہم اگر کسی کو مشکل میں پھنسے دیکھتے ہیں یا اپنی محدود سوچ کی وجہ سے کسی کو خود سے کم پاتے ہیں تو اس کی مشکلات میں اضافے کا سبب بننے لگتے ہیں مگر تم فکر نہ کرو۔'' اس نے ایک دم آپ سے تم پر آتے ہوئے بینش کے چہرے پر ایک نظر ڈالی شاید وہ اس کے چہرے کے تاثر کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا اسے اس کی یہ بے تکلفی پسند بھی آئی تھی یا نہیں۔

''تم مجھ سے ایک وعدہ کرو۔'' بینش کے چہرے پر اسے نہ جانے کیا نظر آیا تھا جو وہ مزید بے تکلف ہوا۔ بینش نے اس کی جانب دیکھا۔

''کوئی بھی مشکل پیش آئے، کیسا بھی مسئلہ ہو تم مجھے بتانے سے، مجھ سے ڈسکس کرنے سے نہیں جھجکو گی۔''

بینش کی نظروں میں بے یقینی اور تذبذب تھا۔

''ڈرو مت۔'' وہ مسکرایا۔ ''میں ایکسپلائٹ کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ مجھ پر اعتماد کر کے دیکھو شاید میں تمہارے کام آسکوں۔''

بینش نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تمہیں ڈیزائننگ جوائن کرنے کا خیال کیوں آیا۔ کیا تم اسے آسان پاتی ہو؟'' پھر اس نے سوال کیا۔ بینش اس کا کیا جواب دیتی کہ اس نے یہ میدان اس لیے منتخب کیا کہ دانیال بھی یہی پڑھ رہا تھا۔ اس نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ''اگر تم فائن آرٹس کو پینٹنگ، پوٹری اور مجسمہ سازی سمجھ کر اِدھر آئی تھیں تو تمہیں بی ایف اے پینٹنگ کی کلاسز جوائن کرنا چاہیے تھیں۔'' پھر وہ بولا۔ ''کتنے کریڈٹ آورز مکمل ہوئے ہیں تمہارے؟'' بینش نے اس بات کا بھی جواب نہیں دیا۔

''چلو وہ میں خود پتا کرلوں گا۔'' وہ بولا۔ ''فیلڈ بدلنی ہے؟'' اس نے نرمی سے پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' بینش اسے کیا بتاتی کہ وہ ایک ایسے گرداب میں پھنس گئی تھی جہاں نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والا حساب ہو رہا تھا۔

''میں تمہاری مدد کردوں گا۔'' وہ بولا۔ ''میں تمہاری رہنمائی کروں گا۔ مجھ سے دوستی کرو گی؟'' اس نے اچانک سوال کیا۔ بینش کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا جس ماحول سے وہ آئی تھی وہاں لڑکے اور لڑکی کی دوستی کو کیا سمجھا جاتا تھا اسے اچھی طرح معلوم تھا۔

''کم آن......'' وہ ہنسا۔ ''میں ان کم عمر لڑکوں میں سے نہیں ہوں جن کی دوستی سے ڈرا جائے، میں ذرا عمر

چور ہوں ورنہ میری جو عمر ہے اس میں مجھے یہاں سے پڑھ پڑھا کر کسی عملی میدان میں گئے بھی ایک دو سال گزر چکے ہونے چاہیے تھے۔ میں نے اس جگہ کو لیٹ جوائن کیا۔ اچھا چلو دوستی نہ کرو، اپنے پرابلمز ضرور شیئر کرلیا کرنا۔'' پھر وہ سنجیدگی سے بولا۔

''میں آپ سے دوستی کروں گی۔'' اُس نے سنا وہ کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

''تم نے میرے لیے کوئی لڑکا نہیں دیکھا۔'' زوئی نے ایک ہفتے کے دوران تیسری مرتبہ نادر سے پوچھا۔

''ارے بھئی میں کیا تمہیں رشتے کرانے والی مائی لگتا ہوں جو اتنی جلدی تمہارے لیے لڑکا دیکھ لوں گا۔ یہ کام اتنی جلدی تھوڑی ہو جاتے ہیں اور تمہارے سلسلے میں تو مسئلہ ہی بڑا ہے۔''

''کیوں، کیا مسئلہ ہے میرے سلسلے میں؟'' وہ ناراض سی شکل بنا کر بولی تو نادر کھلکھلا کر ہنس دیا۔

''کیوں، ہنس کیوں رہے ہو؟'' وہ مزید ناراض ہوئی۔

''پتا ہے کیا۔'' وہ بہ مشکل اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''جب تم ناراض ہوتی ہو تو تمہاری چھوٹی، چھوٹی آنکھیں اور بھی چھوٹی ہو جاتی ہیں سکڑ کر اور تمہاری ناک اور بھی چپٹی ہو جاتی ہے۔''

''نادر......'' وہ چیخی۔ ''میں سنجیدہ ہوں۔''

''اوہ ہاں......'' وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''مگر تمہیں اتنی جلدی کیوں ہے یار، ابھی دیکھو ناں ایک لڑکا جو تمہاری طرح کم عمر ہو جو برسرِ روزگار بھی ہو، شادی بھی کرنا چاہتا ہوں اور کسی چائنیز سے شادی کرنے پر اسے اعتراض بھی نہ ہو اتنی جلدی کہاں سے دستیاب ہوگا۔''

''میری عمر بہت کم نہیں ہے۔'' زوئی نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''ارے یہی تو مسئلہ ہے، تم چائنیز جتنے مرضی بڑے ہو جاؤ، تمہاری شکلوں پر کچھ اتنی معصومیت چھائی ہوئی ہوتی ہے کہ اپنی عمر کے لگتے ہی نہیں ہو۔ کچھ تم لوگ اتنے سفید بگلے جیسے ہوتے ہو خوامخواہ ہی پیارے لگتے ہو۔ یار تمہیں قدرتی طور پر بہت سے ایڈوانٹیج حاصل ہیں۔''

''نادر......'' وہ چیخی۔ ''میں بہت سیریس ہوں اور تمہیں ہر وقت مذاق کی سوجھی رہتی ہے۔''

''کیا کروں ڈیئر فرینڈ میں اِدھر اُدھر کی اس لیے ہانک رہا ہوں کہ تمہاری بات کا فی الحال کوئی جواب ہی نہیں ہے میرے پاس۔'' نادر کو اس کی سنجیدگی پر ترس آ گیا۔

''افوہ......میرے پاس وقت اتنا کم رہ گیا ہے۔ یہ ریسرچ ختم ہو گئی تو سمجھو میرا بوریا بستر گول...... پھر بتاؤ میں کیا کروں گی؟'' اس نے بے چارگی سے نادر کی طرف دیکھا۔ ''کوئی ایسا بھی نہیں جو صرف نکاح کرلے مجھ سے بے شک مجھ سے پیسے لے لے۔''

''ارے، پیسے دے کر نکاح کرو گی۔ لڑکا خریدو گی۔'' نادر ایک بار پھر بے اختیار ہنس پڑا۔

''تم پھر ہنسے۔'' زوئی غصے سے بولی۔

''کیا کروں......تم باتیں ہی ایسی کرتی ہو۔'' نادر نے کہا۔ ''میری سمجھ میں تو یہ ہی نہیں آتا کہ تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔ یار ریسرچ ختم ہوتی ہے تو تمہیں چاہیے کہ سیدھی، سیدھی اپنے وطن سدھار جاؤ، وہاں کسی چیانگ کائی ٹیک سے شادی کرلینا اور مزے سے زندگی گزارنا۔ یہاں کیا رکھا ہے جس کے لیے مری جا رہی ہو۔''

''تم سے بات کرنا ہی فضول ہے۔'' وہ منہ پھلا کر بولی۔ ''جیسے یہ حل مجھے آتا ہی نہیں۔ مجھے واپس جانا

ہوتا تو مسئلہ ہی کیا تھا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ مجھے یہاں رہنا ہے پاکستان میں۔''

''پھر کیا کریں، فوری طور پر کہاں سے لڑکا ڈھونڈیں؟'' نادر کو اس کے احساس پر دکھ سا ہونے لگا۔

''تم میری مدد کرنا چاہتے ہو، میری مدد کر سکتے ہو یا نہیں؟'' وہ غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''میں بالکل تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ سنجیدہ ہوگیا۔ ''مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارے اس عجیب وغریب مسئلے کا حل کیسے ہو۔ میں اس کا حل کہاں سے تلاش کروں؟''

''تم اس کو حل کر سکتے ہو تم خود ہی حل کر سکتے ہو۔'' زوئی نے کہا۔

''وہ کیسے؟'' نادر نے اس کی طرف دیکھا۔

''مجھ سے تم شادی کرلو۔'' زوئی نے آسانی سے وہ بات کہہ دی۔

''ارے......رے......'' نادر گڑبڑا سا گیا۔

''ہاں تو اس میں کیا مشکل ہے، میں صرف نکاح کے لیے ہی تو کہہ رہی ہوں۔ میرے پیپرز بن جائیں، مجھے یہاں رہنے کی اجازت مل جائے تو تمہارا کیا جاتا ہے صرف نکاح کر لیتے ہیں۔ میں تمہیں کوئی پوری شادی کرنے یا اپنی ذمے داری اٹھانے کا تھوڑی کہہ رہی ہوں۔ باہر کے ملکوں میں جا کر بھی تو پیپر میرج کرتے ہو ناں وہاں کی لڑکیوں سے تم لوگ نیشنلٹی کے لیے، سمجھو یہاں تم کسی کے کام آ سکتے ہو اسی مقصد کے لیے۔'' وہ کہہ رہی تھی اور نادر دنگ بیٹھا تھا۔

''ارے سوچ کیا رہے ہو؟'' زوئی نے اس کی نظروں کے سامنے ہاتھ ہلایا۔ ''مجھ سے پیسے لے لینا تم اس نکاح کے۔'' وہ مسکرائی۔

''ارے، تم مجھے اتنا گھٹیا سمجھتی ہو۔'' نادر نے سخت لہجے میں کہا۔

''تو پھر کس سوچ میں پڑ گئے؟'' نادر نے اس کی طرف دیکھا۔ زوئی کے چہرے پر ایک آس تھی، اس کی آنکھوں میں امید تھی جیسے اسے یقین تھا کہ نادر اسے منع نہیں کرے گا۔

''ڈر گئے ناں۔'' وہ بے بسی سے ہنس دی۔ ''کوئی زبردستی تھوڑی ہے انکار کر دو۔''

''بات یہ نہیں ہے زوئی۔'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''میرے نزدیک یہ اتنا اہم فریضہ ہے کہ اس کو مذاق میں لیا ہی نہیں جا سکتا۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو پیپر میرج کی حقیقت کو نہیں جانتے۔ میں اسٹرونگ کمٹمنٹ کو ماننے والوں میں سے ہوں۔ میرے نزدیک نکاح کا بھی وہی مفہوم ہے جو شادی کا ہے۔ جب یہ ہو جاتا ہے تو دو انسان ایک دوسرے کی ذمے داری بن جاتے ہیں اور یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔''

''میں صرف مدد کرنے کی بات کر رہی تھی۔'' زوئی کے چہرے کے زاویے اس کی بات سن کر اور بھی مضحکہ خیز ہو گئے۔ ''چلو کوئی بات نہیں نادر۔ مجھے افسوس ہے میں نے تمہیں پریشان کر دیا، مجھے معاف کر دو۔''

''کوئی بات نہیں یار، تم اتنی بے بس ہو رہی ہو، ایسے میں ایسی بات کہہ دینے میں کوئی حرج بھی نہیں۔'' نادر نے اپنے لہجے کی سنجیدگی ختم کرتے ہوئے کہا۔

''میں چلی جاؤں گی واپس۔'' پھر وہ بولی۔ ''شاید میرے لیے یہاں جگہ ہی نہیں ہے۔ میرا واپس جانا ہی میرا مقدر ہے۔''

''تمہاری خواہش اتنی شدید ہے کہ دیکھو خدا کوئی صورت نکال ہی دے۔'' اب نادر کو پہلی بار اس کی بات کا مذاق اڑانے پر افسوس ہوا تھا۔

''بریک اوور...... چلو واپس کام پر چلتے ہیں۔'' زوئی نے مسکراتے ہوئے کہا مگر نادر جانتا تھا کہ وہ کس دل سے مسکرائی تھی۔

☆☆☆

مہرزاد خان کو اپنی اس نئی زندگی میں مختلف چیلنجز درپیش تھے اور اسے اپنے لیے ایک مکمل لائحہ عمل طے کرنا تھا۔ جب وہ اپنے علاقے میں جاتا تھا اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کے اردگرد تلوے چاٹنے والوں، تالیاں بجانے والوں اور سدا بھاگ لگے رہیں کہنے والے، بھانڈوں اور میراثیوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو ہمہ دم اس بات کا جائزہ لیتے رہتے تھے کہ رس پیدا کرنے والی ان مشینوں کو جن کو وہ اپنے لیڈر، اپنے آقا اور اپنے سردار قرار دیتے تھے کس طرح آخری قطرہ تک نچوڑ لینے کا اہل بنایا جا سکتا تھا۔ وہ اپنے علاقے کی روایات اور انداز سیاست و رہنمائی سے خوب اچھی طرح واقف تھا، اس کے مرحوم والد نے اسے دوران تعلیم ''ساؤتھ ایشین اسٹڈیز'' کا مضمون بطور خاص پڑھوایا تھا اگرچہ وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ اس مضمون کے پڑھ لینے سے اسے کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا۔ کتابوں میں لکھے الفاظ اگر محض پڑھ لینے کی حد تک ہی پڑھے جائیں اور ان کو عملی شکل نہ دی جا سکے تو پھر ان کا کتابوں میں بند رہنا ہی ٹھیک ہوتا ہے، پڑھنے نہ پڑھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ سوچا کرتا تھا۔

اپنے والد کی وفات جسے بڑے پیمانے پر شہادت قرار دے کر خوب ایکسپلائٹ کیا گیا تھا کے بعد جب سرداری کا کلاہ اس کے سر پر رکھا گیا تھا۔ اس نے اپنے مستقبل کا ایک کچا سا نقشہ تو اسی وقت اپنے ذہن میں بٹھا لیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ علاقے کی روایات کے گرداب میں پھنسنے سے ہر ممکن بچنے کی کوشش کرے گا مگر

جوں جوں وقت گزر رہا تھا اسے محسوس ہو رہا تھا کہ علاقے کی روایات ایسا آکٹوپس تھیں جن کے شکنجے سے بچنے کے لیے بار بار پہلو بدلنا بہت حد تک ناممکن تھا۔ یہاں کی دشمنیاں بھی پرانی اور مخصوص تھیں اور دوستیاں بھی۔ وہ اپنے اردگرد نظر دوڑاتا۔ اس کے ہم عمر کزنز اور رشتے دار دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسی طرح کی زندگی گزار رہے تھے جیسی ان کے آباؤ اجداد نے گزاری تھی۔ ان کی زندگیوں کے دُہرے معیار تھے، علاقے میں وہ روایتی کردار نبھاتے اور یہاں سے باہر جدید انسانوں کا روپ دھار لیتے۔ لاٹھی، گولی، دھونس، دھاندلی، ظلم اور جبر وہ اپنی حاکمیت قائم رکھنے کے لیے کسی بھی چیز سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ اس کے باپ کا قتل بھی ایسے ہی کسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ وہ گولی کسی ایسی سمت سے ہی آئی تھی جو دوست کی سرزمین سمجھی جاتی تھی مگر جہاں کے دوستوں کو اس کے والد سے کوئی خاص خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ ایسے چہروں کو منظرِ عام سے ہٹا کر قبر تک پہنچا کر ان کی لاشوں پر سیاست کرنا بھی یہاں کا ایک ایسا اصول تھا جو صدیوں سے چلا آ رہا تھا۔ چند ماہ کے اندر ہی مہرزاد خان کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ایسا کچھ کرنے سے فی الحال قاصر تھا جو مختلف ہوتا اور جو روایات کی اس مِتھ کو توڑ سکتا۔

”ٹیل کی زمینوں تک پانی پہنچانا۔“

”مزارعوں، کاشتکاروں اور کسانوں کو ان کے جائز حقوق دینا۔“

”تعلیم کو عام کرکے پڑھے لکھے جنوب کا نعرہ لگانا۔“

”این جی اوز کے درست ہونے اور ان کو دی جانے والی گرانٹ کے درست استعمال کا جائزہ لینا۔“

”پینے کے صاف پانی کی فراہمی۔“

یہ وہ ایشوز تھے جو علاقے سے باہر نکلنے پر آزاد میڈیا کی طرف سے بار بار اس سے پوچھے جاتے تھے اور وہ ان کے جواب دیتے دیتے تھکنے لگا تھا۔ اس کے والد کی وفات کے بعد خالی ہو جانے والی سیٹ پر ضمنی انتخابات قریب تھے۔ اس بار آزاد میڈیا اس انتخاب کو ایشوز کا انتخاب بنا ڈالنے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ اس کے مدِ مقابل سیاسی جماعت نے کسی بااثر شخص کے بجائے طبقے کے ایک پڑھے لکھے نوجوان کو ٹکٹ دیا تھا۔ مدِ مقابل سیاسی جماعت اپنے تمام جماعتی وسائل اس انتخاب میں جھونک رہی تھی۔ مہرزاد خان کے حق میں سب سے مضبوط عنصر اس کے باپ کی سو کالڈ شہادت تھی، وہ علاقے کے ایک شہید کا بیٹا تھا، یہ قربانی عوام کے حقوق کی جنگ لڑتے ہوئے دی گئی تھی اس لیے اس سیٹ پر جانشینی کے علاوہ بھی شہید کے بیٹے کا حق تھا۔ اس کی پارٹی، اس کے عزیز رشتے دار، اس کے کارکن سب سردھڑ کی بازی لگا رہے تھے مگر مہرزاد کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس سلسلے میں کی جانے والی کوششوں میں کسی چیز کی کمی تھی۔

”تمہیں ایک مضبوط اعصاب کے مالک، ہوشیار، چست، حاضر دماغ، ذہین، میڈیا منیجر کی ضرورت ہے، ایک ایسا ترجمان جو تم سے بھی زیادہ تمہارے حق میں بات کرنے کا اہل ہو۔ فوراً سے پیشتر ایسا شخص تلاش کرو۔“ اس کے ایک قریبی دوست نے اسے وہ مشورہ دیا تھا جو اس کے دل کو لگا تھا۔ اس نے لیڈنگ اخبارات میں بغیر اپنا نام دیے اشتہار دیا اور اسے ملک کے مختلف کونوں سے بے شمار پروفائلز مع درخواستوں کے وصول ہوئی تھیں۔ شارٹ لسٹڈ امیدواروں کے انٹرویو کے لیے وہ اپنے اسلام آباد آفس میں خود بیٹھا تھا۔ وہ چار انٹرویوز کے بعد ہی وہ تھک بھی گیا تھا اور مایوس بھی ہو چکا تھا۔ پانچویں امیدوار ایک لڑکی تھی جسے دیکھ کر وہ چونک گیا تھا۔ اس نے اس لڑکی کو پہلے کہاں دیکھا تھا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

میری بیٹی کی شادی



میری چھوٹی لاڈلی بیٹی گھومنے پھرنے اور کورس کرنے کینیڈا گئی ہوئی تھی۔ اچانک مقدر نے یاوری کی اور اس کے خوابوں کا شہزادہ ہماری دہلیز تک آ پہنچا۔ افراتفری میں اپنی دوست کو فون کیا کہ واپسی کی ٹکٹ کرواؤ اور صوفیہ کو واپس بھجواؤ کہ دولہا میاں دیکھنے کو بے چین ہیں کہ دیکھ کر اور مل کر فیصلہ کرنا تھا۔ صوفیہ واپس آئی ہونے والے سسرال کو بمعہ نوشہ میاں بلوایا گیا۔ میرا داماد ماشاء اللہ بہت لائق، شرارتی اور خیال رکھنے والا ہے۔ دونوں کی رضامندی سے بات طے ہو گئی۔ مہندی سادگی سے اپنے گھر ہوئی اور بارات بینڈ باجے کے ساتھ دھوم دھام سے آئی۔ بارات والے دن بھی دولہا میاں کی شوخیاں، شرارتیں عروج پر تھیں۔ رخصتی گھر سے ہوئی اور سب سے دلچسپ بات صوفیہ جونہی سسرال پہنچی۔ بینڈ باجے والے استقبال کے لیے گیٹ پر موجود اور وہ بھی رات کے ایک بجے اور بے پناہ ہوائی فائرنگ اور پٹاخوں کی گونج میں دلہن کو سسرال لایا گیا۔ دو دن بعد دونوں دو ہفتے کے لیے تھائی لینڈ ہنی مون پر چلے گئے۔ ماشاء اللہ خوش ہیں اللہ سدا خوش رکھے، آمین۔

از: فرزانہ مسعود، راولپنڈی

”میرا نام ہیشل رئیس، پیشہ صحافت، تعلیم ایم فل ماس کمیونیکیشن۔“ وہ اس کے منیجر کے سوال پر بتا رہی تھی۔

”اوہ......“ مہرزاد کے ذہن میں جھماکا ہوا اور ساتھ ہی اس نے اس لڑکی کو اپنی میڈیا منیجر کے طور پر منتخب کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا۔

☆☆☆

انہوں نے ایک نظر بیڈ پر چت پڑے مختلف نالیوں اور ڈرپوں میں جکڑے وجود پر ڈالی اور دوسری نظر اپنے ہاتھ میں پکڑے چھوٹے آئینے پر ڈالی۔ انہیں محسوس ہوا کہ وہ دنوں میں بوڑھی ہو گئی تھیں۔ ان کے بالوں میں سفیدی جھانکنے لگی تھی اور چہرے پر ایج لائنز ابھر آئی تھیں۔ یہ وہ سفید بال تھے جن کے کہیں کہیں سر نکالنے سے پہلے ہی وہ انہیں بہترین ہیئر ڈائی کے فیشن کلر میں چھپا لیتی تھیں۔ ایج لائنز باقاعدگی سے فیشل کروانے اور اسکن ٹائٹنگ ٹریٹمنٹ کی وجہ سے کبھی نظر نہ آ سکی تھیں مگر اب انہیں کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ ان کا جوان بیٹا موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ وہ سارا سارا دن اور ساری ساری رات اس کے سرہانے بیٹھی رہتی تھیں۔ ان کو ہر قریبی رشتے کا اصرار بھی وہاں سے اٹھا نہیں سکا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کا چہرہ دیکھ دیکھ کر جیتی تھیں۔ ایک، ایک لمحہ انہیں امید و بیم کی کیفیت میں مبتلا کیے رکھتا تھا۔ انہیں یاد نہیں آتا تھا کہ انہوں نے زندگی میں آخری بار نماز کب پڑھی تھی۔ قرآن پاک کی تلاوت کب کی تھی، خدا کے حضور حاضر ہو کر دعا کب مانگی تھی لیکن بیٹے کے حادثے کے بعد انہیں اچانک بھولی ہوئی نمازیں اور چھوڑی ہوئی تلاوت یاد آ گئی تھی۔ نہ جانے کہاں، کہاں اور کس، کس کی سکھائی دعائیں یاد آ گئی تھیں۔ وہ ایک فیشن ایبل جدید عورت جو ذہین تھی اور دنیا جہان کی معلومات رکھتی تھی سے پلٹا کھا کر محض ایک ماں بن کر رہ گئی تھیں۔ انہیں اپنے اس بیٹے کی زندگی کا ایک، ایک لمحہ کسی فلمی تصویر کی

طرح یاد آ رہا تھا۔ وہ ذہنی طور پر اپنے اس بیٹے سے سب سے زیادہ قریب تھیں، اس کی زندگی کے ہر موڑ پر، ہر اہم موقع پر، ہر خوشی، ہر پریشانی میں وہ اس کے ساتھ ساتھ رہی تھیں۔ انہوں نے اس کے بہت بچپن میں اس کے اندر ایک آرٹسٹ کو پہچان لیا تھا۔ انہوں نے ہر ایسا اہتمام کیا تھا جس کے ذریعے اس کے اندر موجود اس پیدائشی فن کو پنپنے کا موقع مل سکتا تھا۔ وہ خود اس کو آرٹ کے مقابلوں میں لے کر جاتی رہی تھیں اور انہوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ ایک عظیم آرٹسٹ بن سکتا تھا۔ وہ اپنے اسی راستے پر گامزن تھا جب اچانک اس پر ایک نئے شوق، ایک نئے جنون نے حملہ کیا تھا۔ وہ فلائنگ سیکھنے کے جنون میں مبتلا ہو گیا تھا۔ انہوں نے اسے منع کرنے کی پوری کوشش کی مگر اس کے منع نہ ہونے پر اس کو وقتی جنون قرار دے کر نظر انداز کر دیا تھا اور یہی ان کی غلطی تھی، ان سے بھول ہو گئی تھی، بہت بڑی بھول جس کے نتیجے میں وہ ایک مصنوعی سانس لیتے اس لمبے چوڑے وجود کے سرہانے بیٹھے، بیٹھے دن رات کے پھیر کو بھی فراموش کر چکی تھیں۔

☆☆☆

وہ ہفتہ واری تعطیل کا دن تھا، زوئی کا ارادہ اپنے چھوٹے سے فلیٹ کی مکمل صفائی کا تھا۔ اسی لیے وہ اس روز بھی روزانہ کی طرح صبح سویرے ہی جاگ گئی تھی۔ وہ خوش تھی کہ اس روز اس نے تسلی کے ساتھ نماز بھی پڑھ لی تھی۔ اس نے توسٹ سینکے اور مزیدار آملیٹ بھی بنایا تھا۔ اسے فرصت اور اطمینان کے ساتھ ناشتا کرنے میں بھی اس روز خوب لطف آیا تھا۔ ناشتے کے بعد اس نے جھاڑ پونچھ کا کپڑا اور جالے اتارنے والا برش اٹھایا اور صفائی میں جُت گئی۔ دوپہر کے تقریباً بارہ بجے تک اس کا فلیٹ صاف ستھرا ہو کر چمک رہا تھا اور وہ خود گرد آلود ہو چکی تھی۔ وہ نہا کر کپڑے بدلنے کا ارادہ کر رہی تھی جب بیرونی گھنٹی بجی۔

''ارے، اس وقت کون آ گیا؟'' اس نے سوچا اور ہاتھ میں پکڑی چیزیں کچن میں رکھ دیں۔ اس کا خیال تھا کہ قریب کے کسی فلیٹ میں رہنے والا کوئی بچہ شرارت سے گھنٹی بجا کر بھاگ گیا ہوگا مگر دروازہ کھولنے پر غیر متوقع طور پر اسے نادر باہر کھڑا نظر آیا۔ وہ اس غیر متوقع آمد پر سخت حیران تھی۔ نادر کے ساتھ ایک تیس پینتیس سالہ خاتون بھی تھیں۔

''مجھے افسوس ہے میں آمد سے پہلے تمہیں اطلاع نہیں دے سکا۔'' نادر نے اس کی حیرت پر محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا سیل فون یا تو بند ہے یا سائلنٹ پر ہے، کچھ مسئلہ ہے اس کے ساتھ۔''

''ارے، وہ تو میرے بیگ ہی میں پڑا رہ گیا کل سے۔'' اس نے کہا اور سوالیہ نظروں سے اس کے ساتھ آئی خاتون کی طرف دیکھا۔

''اپنے دولت کدے کے اندر قدم رنجہ نہیں فرمانے دو گی کیا؟'' نادر نے پوچھا۔ زوئی کو اس کی بات قطعی پلے نہیں پڑی۔ نادر بے اختیار ہنس دیا۔ ''اندر آنے کو نہیں کہو گی، ویسے تم تو دعویٰ کرتی ہو کہ تمہیں تین زبانیں آتی ہیں۔''

''ارے آؤ، آؤ۔'' زوئی کو اپنی بے خیالی پر شرم محسوس ہوئی۔ ''پلیز آؤ ناں۔'' وہ ایک طرف ہٹتے ہوئے بولی۔

وہ دونوں اندر آ گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا لاؤنج تھا جس کو زوئی نے سادگی سے سجا رکھا تھا۔

''یہ میری آپا ہیں۔'' اندر آ کر بیٹھنے کے بعد نادر نے اس کا تعارف اپنے ساتھ آنے والی خاتون سے کرواتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک پرائیویٹ کالج میں ہسٹری کی لیکچرار ہیں، شادی شدہ ہیں اور ان کے تین بچے ہیں۔ آج میں نے انہیں پیشکش کی کہ آپ جو ہمیشہ ٹی وی پر چھوٹی آنکھوں اور سفید رنگت والی چائنیز لڑکیوں کو دیکھ کر کہتی ہیں کہ یہ

کتنی معصوم اور کم عمر نظر آ رہی ہیں، آئیں آج میں ایسی ہی ایک چائنیز حسینہ سے آپ کو ملوا لاؤں۔''

''ارے، میں کب حسینہ ہوں؟'' زوئی نروس ہو گئی۔

''اپنے ملک میں تو تم لوگ ایک جیسی شکلوں کی وجہ سے شاید گرِیڈ نہ کی جا سکتی ہو مگر ہمارے ملک میں تمہیں حسینہ کہلوانے کا پورا حق ہے۔'' نادر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''خیر میں آج اپنی آپا کو تم سے ملوانے لایا ہوں، مجھے امید ہے کہ تمہیں برا نہیں لگا ہوگا۔''

''مجھے برا کیوں لگے گا، مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔ آپ لوگ بیٹھو، میں ذرا چینج کر کے آتی ہوں۔'' زوئی کو اپنے گرد سے اَٹے کپڑوں سے وحشت ہو رہی تھی اس لیے اس نے ان سے کچھ دیر کے لیے معذرت کر لی۔ نہانے اور کپڑے تبدیل کرنے کے دوران بھی وہ نادر کی اپنی آپا کے ساتھ اس غیر متوقع آمد کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

اس روز ہی اس نے چھوٹے اسفنج کیک بیک کیے تھے اور قیمہ نوڈلز بنایا تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ اس کے گھر میں مہمانوں کی تواضع کے لیے کچھ چیزیں موجود تھیں اور اسے قریبی بیکری کی طرف نہیں دوڑنا پڑے گا۔

''تم بہت اجنبی سی بہت مختلف لگ رہی ہو، اس طرح میزبان کے روپ میں۔'' نادر نے چائے کے ساتھ اسفنج کیک کھاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا امیج خاص پروفیشنل لڑکیوں کا سا ہے، کام میں مصروف، سفید کوٹ میں ملبوس، دواؤں کی بو میں بسی ہوئی مگر یہ ایک مختلف لک ہے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''تم نے وہاں سے باہر مجھے دیکھا ہی کب ہے۔'' زوئی مسکرائی۔ ''مجھے تو خود بھی ایسا لگتا ہے کہ میں ہر وقت اسی حلیے میں رہتی ہوں، گھر میں ٹھہرنے کا دورانیہ تو کم ہوتا ہے اور تمہارا اپنا بھی تو یہی حال ہے، آج تم بھی مختلف نظر آ رہے ہو، گو تم ایڈمن میں کام کرتے ہو۔''

''نادر ہم چار بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔'' نادر کی آپا نے بتایا۔ ''یہ ہمیں بہت عزیز ہے، یہ ڈاکٹر بننا چاہتا تھا مگر ہمارے مالی حالات اچھے نہیں تھے اس لیے میرٹ پر نام آنے کے باوجود یہ ڈاکٹر نہیں بن سکا۔ یہ ان لوگوں میں سے ہے جو اللہ کی رضا میں راضی رہتے ہیں اور بہت خوشی سے راضی رہتے ہیں۔ اب یہ اچھا کما رہا ہے، اللہ کا بہت شکر ہے، ہم چاروں بہنوں کی تو شادی ہو گئی، اب ہم چاہتے ہیں کہ اس کا گھر بھی بس جائے۔''

''تو جلدی کیجیے ناں، میں بھی نادر کی شادی میں شریک ہونا چاہوں گی۔'' زوئی بچوں کی سی مسرت کے ساتھ بولی۔ ''لیکن اگر اس کی شادی اگلے سال تک نہ ہو سکی تو پھر میں شاید کیا یقیناً اس کی شادی میں شرکت نہیں کر سکوں گی۔'' دوسرے ہی لمحے اسے کچھ یاد آ گیا اور اس کے چہرے پر مایوسی سی چھا گئی۔

''ارے، کیوں نہیں کر سکو گی شرکت؟'' آپا نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

''اگلے سال کیا چند ماہ کے بعد ہی مجھے یہاں سے جانا ہوگا۔'' زوئی کے لہجے میں اداسی اور دکھ تھا۔ ''میرا یہاں قیام کا عرصہ ختم ہونے والا ہے کیونکہ میری ریسرچ ختم ہونے والی ہے۔''

''تم یہاں رہنا چاہتی ہو؟'' نادر کی آپا نے دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بھی اداسی تھی، اس کے شانوں تک کٹے سیاہ بال بھیگ کر مزید سیاہ نظر آ رہے تھے۔ اس کی رنگت سفید تھی اور ناک چپٹی۔ ''یہ کتنی مختلف نظر آتی ہو گی، یہاں کے لوگوں میں۔'' انہوں نے سوچا تھا۔

''چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔'' زوئی نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔ ''میں یہاں رہ نہیں سکتی کیونکہ مجھے یہاں کی شہریت نہیں مل رہی۔ مجھے واپس جانا ہوگا کیونکہ یہ میرا ملک نہیں ہے۔''

''تم یہاں کیوں رہنا چاہتی ہو، کیا تمہیں یہ جگہ اجنبی اور نامانوس نہیں لگتی؟'' آپا نے سوال کیا۔

''مجھے وہ جگہ اجنبی اور نامانوس لگتی ہے مگر اس سے بھی کیا ہوتا ہے، مجھے یہاں سے جانا ہی ہے اور میں نے اپنے ذہن اور دل کو اس کے لیے منا بھی لیا ہے۔'' وہ کہہ رہی تھی۔

''تم جا کر پھر واپس آجانا، کسی نئے پروجیکٹ کو جوائن کر لینا، یہ کچھ ایسا مشکل کام تو نہیں۔'' آپا نے کہا تھا اور زوئی کو ایسا لگا جیسے اپنی بہن کی اس بات پر نادر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''جب واپس آکر تم شہریت کے لیے درخواست دو گی تو ممکن ہے وہ قبول ہو جائے شاید ان لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آجائے کہ یہ لڑکی بار بار یہاں ہی آتی ہے۔ اس کو اس ملک سے پیار ہو گیا ہے اس لیے یہ یہاں رہنا چاہتی ہے۔'' نادر کے چہرے کی حیرت اپنی بہن کی باتیں سن کر بڑھتی جا رہی تھی۔

''اچھا زوئی، اب ہم چلتے ہیں، تم سے مل کر خوشی ہوئی۔'' پھر اس کی آپا ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں زوئی اس اچانک آمد اور اچانک واپسی پر بہت حیران تھی۔

☆☆☆

''وقت بہت بڑا امتحان لیتا ہے انسان کا، فاطمہ بڑھاپے کا یہ زمانہ ہے اور مجھے نئے سرے سے ایک ذمے داری اٹھانا پڑ گئی ہے۔ میرے لیے خصوصی دعا کرنا، خدا مجھے اس ذمے داری کو پورا کرنے کی توفیق دے، بچیوں کی تربیت مشکل کام ہے اور اس سلسلے میں میرا تجربہ ہے ہی نہیں۔ اس لیے یہ کام زیادہ مشکل نظر آتا ہے۔ میرے لیے دعا کرو، میرے لیے دعا کرو۔'' حمزہ نے اس پیلے شکستہ کاغذ پر لکھے ہوئے مٹتے الفاظ پڑھے۔

یہ خط رابعہ کلثوم نے بی اماں کے نام لکھا تھا۔ تاریخ اور القاب و آداب کے علاوہ خط کے بہت سے مندرجات پھٹ چکے تھے اور درمیان کا ایک ٹکڑا رہ گیا تھا، یہ ٹکڑا حمزہ کو ان کاغذات میں سے ملا تھا جو اس نے اس مرتبہ سیالکوٹ والے گھر سے اٹھائے تھے۔

''انسان کا بڑھاپا کیسا ہوتا ہے، یہ مجھے اب سمجھ میں آیا ہے۔'' ایک اور شکستہ کاغذ پر لکھا تھا۔ ''قویٰ کمزور اور حواس پہ قابو رکھنا مشکل ہونے لگتا ہے مگر میں خود کو یقین دلانے میں مصروف رہتی ہوں کہ میں ابھی بوڑھی نہیں ہو رہی کیونکہ مجھے زندگی میں ابھی بہت سے کام کرنے ہیں، میرال کی زندگی اور اس کا مستقبل بنانا ہے، یہ کام مضبوط اعصاب اور جوانوں کی سی ہمت کے ساتھ ہی ہوگا۔ میرے لیے دعا کرنا۔''

حمزہ نے ایک پرانے لفافے میں موجود تیسرا خط نکالا۔

''بعد سلام کے عرض ہے کہ پچھلی مرتبہ میری سیالکوٹ آمد پر جو دعدے وعید بچوں کے متعلق ہوئے تھے ان کو گرہ سے باندھ کر رکھنا۔ تمہارے لیے تو وقت آنے پر بہت لوگ ہوں گے جن میں سے انتخاب کر سکو گی مگر میں تنہا ہوں اور ڈری ہوئی ہوں، خدا کے بعد میرا صرف تمہی آسرا ہو، میں امید کے ساتھ آنکھ اٹھاتی ہوں تو صرف تم پر ہی جا پڑتی ہے اور تم سے آگے کہیں اور ٹھہرتی نہیں۔ دیکھو میرا اول آس باندھ کر آیا ہے، حمزہ کی ماں شاید اس بات کو پسند نہ کرے کیا ہی اچھا ہو جو تم کسی کے کان میں ڈال دو تاکہ سند رہے اگر تم ایسا کر سکو تو مجھ سے بڑھ کر خوش کوئی نہ ہوگا۔''

اس خط میں اپنا تذکرہ پڑھ کر حمزہ چونک گیا تھا۔ یہ ذکر کیوں اور کس سلسلے میں تھا اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ بی اماں نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جو رابعہ آنٹی سے کسی وعدے وعید کی طرف اشارہ کرتی۔ ایسا کون سا وعدہ تھا جو امی کو ناپسند ہو سکتا تھا۔ وہ سوچنے لگا اور پھر اس نے باقی کے کاغذات پھر کبھی دیکھنے کا ارادہ

کرتے ہوئے اس لفافے کو پھر سے بند کر دیا، اس کی طبیعت بھاری ہو رہی تھی، اس کے مزاج پر اداسی چھائی ہوئی تھی، اسے بی اماں کے گھر کی شکستگی، وحشت اور ویرانی بھلائے نہیں بھول رہی تھی۔ وہ گھر جہاں صبح شام بی اماں سے قرآن پاک پڑھنے کے لیے آنے والے بچوں کی تلاوت کی آوازیں آیا کرتی تھیں، وہاں اب چڑیوں کی چوں چوں کے علاوہ کوئی آواز نہیں آتی تھی۔

''جب ہم اس چار دیواری میں رہ رہے تھے تب کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا کہ یہ وقت گزر جانے کے بعد اس کی ویرانی کا عالم یہ ہوگا۔'' یہ بات اس نے کئی مرتبہ سوچی تھی اور ہر مرتبہ یہ بات سوچنے پر اس کا دل جیسے ڈوب، ڈوب جاتا تھا۔ اس کی اداسی میں مزید اضافہ ان خطوط، اس پرانے اندازِ تحریر، رکھ رکھاؤ اور محبت کے اظہار نے کیا تھا۔ وہ لوگ خواب ہو گئے تھے اور ان کے ساتھ ہی ایسے رویے بھی خواب ہو چکے تھے۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا اور اپنا بچپن اور اس سے وابستہ لوگ فلم کی طرح اس کی نظروں کے سامنے آ رہے تھے۔ جب ہی اس کا موبائل بج اٹھا۔ اس کا ذرا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ یہ کال اٹینڈ کرے مگر پھر اس نے فون اٹھا لیا، یہ نگین کا فون تھا۔ اس نے بہت دن بعد اسے یاد کیا تھا۔ وہ دل میں نگین سے خفا تھا، اس نے ایک دو مرتبہ اس کے ساتھ بہت سرد رویہ برتا تھا، وہ اس کے گریز کی وجہ جاننے سے قاصر تھا مگر اس نے نگین سے رابطے اور ملاقات کم کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا، اسے شک گزرا تھا کہ شاید نگین اپنے سسرال والوں کی وجہ سے اس سے اجتناب برتنا چاہتی تھی جب ہی اس نے خود کئی دن سے اس کے ساتھ رابطہ نہیں رکھا مگر اس وقت نگین نے خود اسے کال کی تھی۔

''تم کہاں غائب ہو گئے لاٹ صاحب، ہمیں بالکل ہی بھلا دیا۔'' اس کے فون آن کرنے پر وہ ہشاش بشاش آواز میں کہہ رہی تھی۔ ''میں تو اشعر سے کہہ رہی تھی کہ اخبار میں تلاش گمشدہ کا اشتہار دے دیں، حمزہ خود آتا ہے نہ فون کرتا ہے، میں کروں تو اس کا فون بند ملتا ہے، لگتا ہے میرال کو تلاش کرتے کرتے خود بھی گم ہو گیا ہے۔'' اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ ہمیشہ کی طرح خود ہی بولے چلے جا رہی تھی۔ ''کہاں گم تھے یہ بتاؤ؟'' پھر وہ ذرا رکتے ہوئے بولی۔

''میں نے کہاں جانا ہے یار، میں یہیں تھا فون بند تھا تو تم آفس کے نمبر پر فون کر لیتیں، دن کے وقت تو میں وہیں ہوتا ہوں۔'' اس نے نرمی سے جواب دیا تھا۔

''مگر تم نے خود کیوں فون نہیں کیا اتنے دن سے اور آئے بھی نہیں ہماری طرف۔''

''میں مصروف رہا بہت پچھلے دنوں شاید اس لیے۔'' اسے فوری طور پر یہی بہانہ سوجھا تھا۔ نگین بال کی کھال اتارنے والوں میں سے تھی وہ اس کے سوالات سے ڈرتا تھا۔

''ابا کا فون آیا تھا وہ بھی تمہارا پوچھ رہے تھے۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ تم سیالکوٹ گئے یا نہیں، حمزہ تم کو سیالکوٹ جانا تھا؟'' اس کی توقع کے برعکس اس نے اس کے بہانے پر جرح نہیں کی۔

''ہاں......'' وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔

''ارے پاگل مجھے بھی ساتھ لے لینا تھا، میں بھی ہو آتی، ایک بار اپنے پرانے محلے اور پرانے گھر کو دیکھ آتی۔'' وہ کہہ رہی تھی۔

''تمہارا گھر تو اس محلے کے نقشے سے غائب ہی ہو گیا نگین۔'' حمزہ نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ ''اس کی جگہ تو تمہارے گھر کے خریدار نے ایک شاندار تین منزلہ محل کھڑا کر لیا ہے۔ اب تو گمان بھی نہیں گزرتا کہ کبھی یہاں وہ مختصر سا گھر بھی تھا جس میں ہم کھیلا کرتے تھے۔''

''اوہ......'' نگین کو بھی یقیناً ایک فطری دھکا لگا تھا۔ ''اور بی اماں کا گھر؟'' اس نے فوری سوال کیا۔

''وہ موجود ہے، بھوتوں اور چڑیلوں کا مسکن بنا۔''

''اس کے متعلق کوئی فیصلہ کر کیوں نہیں لیا جاتا حمزہ، یوں تو ایک دن وہ گر جائے گا۔'' وہ کہہ رہی تھی۔

''گر جانے دو، ہمارا اس پر کیا بس، یہ تو ماموؤں کی صوابدید پر ہے، اس کے متعلق کیا فیصلہ کرتے ہیں، ممکن ہے وہ اس کا ملبہ بیچنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہوں۔''

''تم ابا سے بات کرو، انہیں بتاؤ کہ وہاں کیا حال ہے، وہ اور چھوٹے چچا اس کا کچھ کر لیں، بی اماں کی روح کس قدر تڑپتی ہوگی ناں حمزہ اس گھر کی ویرانی اور زبوں حالی پر۔''

''میں انہیں بتا بھی دوں گا نگین تو وہ کچھ نہیں کریں گے، وہ دبئی اور امریکا میں مزے کر رہے ہیں ایک پرانی، شکستہ اور قریب الخاتمہ عمارت میں انہیں کوئی دلچسپی ہو نہیں سکتی۔ انہیں چاہیے کہ اسے بھی بیچ دیں۔ انہوں نے تو کبھی وہاں جانا ہے نہ اس کا حال سنوارنا ہے، انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کے ماں باپ کی قبروں کا کیا حال ہے۔ نانا جی کی قبر تو بی اماں نے پختہ کروائی تھی مگر بی اماں کی قبر اسی طرح کچی ہے اور خراب ہو رہی ہے۔ خیر وہ تو میری ذمے داری رہی، اس کو میں ٹھیک کروالوں گا، ہاں گھر کے سلسلے میں میرا کوئی اختیار نہیں، صرف ماموں ہی اس کا کچھ کر سکتے ہیں۔'' حمزہ کو احساس ہو رہا تھا کہ اس کا لہجہ تلخ تھا مگر وہ اس تلخی پر قابو نہیں کر پا رہا تھا۔

''تم ابا سے بات کرو آج ہی۔'' نگین کے لہجے میں دکھ تھا اور غصہ بھی۔ ''انہیں یہ کام فوراً کرنا چاہیے ورنہ بی اماں کی ناراضی ہم سب کے لیے عتاب بن جائے گی۔''

''میں تو انہیں بتا دوں گا مگر کرنا انہوں نے وہی ہے جو اُن کا من چاہے گا، اتنے سالوں میں اس بات کا پتا نہ جانے انہوں نے کتنی مرتبہ لگوایا ہے کہ گھر کا کیا حال ہے اور اس کی مرمت پر کتنا پیسہ لگے گا مگر آج تک کوئی عملی کام ہوا نہیں۔'' حمزہ نے تلخی سے کہا اور فون بند کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ ایسا بھی وہ غلط کر رہا تھا مگر اس نے سوچا تھا کہ وہ نگین سے معذرت کر لے گا۔

☆☆☆

''دعا دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے، اس کے آگے سب دوائیں، سب ڈاکٹر، سب تدبیریں ہیچ ہیں اور ماں کے دل سے نکلی دعا واہ کیا کہنے۔ ماں کے دل سے نکلی دعا تو سینے سے نکل کر سیدھی عرش پر جا پہنچتی ہے۔ اس کی باری لگتی ہے نہ نمبر لگتا ہے، بس اِدھر نکلی اُدھر پہنچی۔ یوں جیسے قطار میں اپنی باری کے انتظار میں کھڑے لوگوں کو کوئی دھکا دے کر آگے نکل جائے۔ سو میری بچی یاد رکھنا، سب تدبیریں اپنی جگہ جو دعا تمہارے دل سے نکلتی ہے بیٹے کے لیے اس کی برابری کوئی چیز نہیں کر سکتی۔'' صوفی محمد عنایت صاحب نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''میں ان لوگوں میں سے ہوں صوفی صاحب جو غفلت میں پڑے رہتے ہیں، جن کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھنا بھول جاتے ہیں، میں بہت گناہ گار ہوں۔ کیا گناہ گاروں کی دعائیں قبول ہو جاتی ہیں؟'' ان کی آنکھوں میں آنسو اور آواز میں لرزش تھی۔

''تم خوش قسمت ہو بیٹی جو غفلت سے اٹھا لی گئی ہو۔ کبھی ان کا تصور کیا جو تمام عمر غفلت میں پڑے رہتے ہیں جنہیں کوئی دھکا لگتا ہے نہ ٹھوکر اور پھر وہ یونہی اس دنیا سے چلے جاتے ہیں، تم بتاؤ وہ اچھے ہیں یا پھر تم!'' وہ

ایسا بھی ہوتا ہے



26 جون 2009ء کو ہماری شادی ہوئی۔ شادی کے شروع کے دن بڑے یادگار ہوتے ہیں۔ ہر شے محبت کے رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے اور بات بے بات لبوں پر مسکان آجاتی ہے۔ رومانس کا ذکر ہو اور ساون کا موسم نہ ہو، یہ کیسے ممکن ہے۔ ہماری شادی کے ایک مہینے بعد برسات کا آغاز ہوا۔ شادی کے بعد جب پہلے دن آفس میں ری جوائنگ دی (واضح رہے کہ شادی سے پہلے ہم کوکنگ میگزین میں سب ایڈیٹر تھے) تو خوب تیار ہو کر میاں کا من پسند جوڑا پہن کر سہانے موسم کو انجوائے کرنے کے خیال سے بائیک پر سوار ہو کر گنگناتے ہوئے، شوخ ہواؤں کے سنگ سفر کا آغاز کیا تو راستے میں بوندا باندی ہو گئی۔ ہم بہت خوش ہوئے کہ واہ، واہ کیا رومینٹک سین ہے ساون اور ساجن سنگ سنگ...... مگر پھر یوں ہوا کہ آفس تک پہنچتے پہنچتے برسات تیز ہو گئی۔ آفس پہنچے تو پتا چلا کہ موسم کے خطرناک تیوروں کے باعث خواتین اسٹاف کو چھٹی دے دی گئی۔ اب جو واپسی کا سفر شروع ہوا تو مت پوچھیے...... وہ ساون جسے خوب صورت یاد کا نام دینے والے تھے۔ اب یاد کر کے جھرجھری بھی لیتے ہیں اور ہنستے بھی ہیں کیونکہ کراچی کی سڑکوں پر جمع ہونے والے پانی نے آدھے گھنٹے کا سفر تین گھنٹے میں مکمل کروایا اور جو اپنے سوٹ کی طرف دیکھا تو آنکھیں چھلک آئیں کیچڑ اور گندے پانی کی چھینٹوں سے سارا سوٹ داغدار ہو کر رنگ بھی چھوڑ چکا تھا اور میاں جی، جن کے سنگ ہم نے ڈوئٹ گاتے ہوئے، گرما گرم کچوریاں کھانے کا پروگرام بنایا تھا، منہ پھلا کر بولے۔ ''اور نکلو۔ بارش میں، سہانے موسم کے مزے لینے۔'' سو ایسا بھی ہوتا ہے۔

مرسلہ...... سویرا فلک، کراچی

پڑ چھوڑ رہے تھے۔

''مگر صوفی صاحب میرا بیٹا موت اور زندگی کی کشمکش میں پڑا ہے، میں اس زندہ لاش کو دیکھتی ہوں تو خود بھی دن میں ہزار مرتبہ مرتی ہوں۔ خدارا کچھ ایسی دعا فرمائیں کہ میرا بیٹا جی اٹھے، میں اسے چلتا پھرتا، ہنستا مسکراتا دیکھ سکوں، صوفی صاحب مجھ سے یہ مزید برداشت نہیں ہوتا۔'' وہ ان کی بات سمجھ کر بھی نہیں سمجھ پا رہی تھیں اور پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے وہی بات دوبارہ کر رہی تھیں جس سے انہوں نے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔

''میں تمہارے دکھ کو سمجھتا ہوں بیٹی، میں دانیال کے لیے دعا کرتا ہوں۔ بہت زیادہ کرتا ہوں مگر جو بات تمہاری اپنی دعا میں ہے وہ کسی اور کی دعا میں نہیں۔'' صوفی صاحب تحمل سے بات کر رہے تھے۔

''اگر مجھ گناہ گار کی دعائیں قبول ہو سکتی ہوتیں تو اب تک میرا بیٹا اٹھ کر کھڑا ہو چکا ہوتا، صوفی صاحب، میں جانتی ہوں کہ مجھ گناہ گار کی دعا عرش تک پہنچتے پہنچتے ایک لمبا عرصہ لگائے گی اور پھر بھی اسے قبولیت کا شرف ملے نہ ملے، کون جانتا ہے۔'' وہ کہہ رہی تھیں۔

''غلط بات مت کرو بیٹی، اپنے جذبات کو قابو میں رکھو۔'' صوفی صاحب نے اضطراب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم سب ایک خدا کے بندے ہیں، گناہ گار اور بے گناہ دعا کی قبولیت کسی کے ساتھ مشروط نہیں۔ یہ سب انسان کی پکار پر، اس کے خدا پر یقین پر، اس کے دل کی تڑپ پر منحصر ہے، تم جتنی رقت اور عاجزی کے ساتھ اسے پکارو گی اتنی ہی جلدی وہ تمہاری پکار کی طرف متوجہ ہوگا۔ توبہ اور استغفار کا در ہر وقت کھلا ہے ہم سب کو اپنے احتساب کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے، ہمیں چاہیے کہ اپنے عمل پر ضمیر کا پہرے دار بٹھائے رکھیں جو بھول چوک کی نشاندہی کرتا رہے لیکن میری بچی انسان کی فطرت میں ہے بھول چوک اور غفلت، سو اگر تمہیں

ٹھوکر لگی ہے تو جاگ جاؤ، استغفار اور توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ اس تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرو اور اسے پکارو، دل سے پکارو، تڑپ اور عاجزی کے ساتھ پکارو، وہ تمہاری سنے گا، ضرور سنے گا۔''

''صوفی صاحب ٹھیک کہتے ہیں بیٹی۔'' وہ بے آواز اشک بہائے چلی جارہی تھیں جب اسی کمرے میں موجود ایک اور خاتون نے ان کو مخاطب کیا۔ انہوں نے چونک کر اپنے اردگرد دیکھا۔ وہی کمرا تھا، وہی سیٹنگ تھی مگر صوفی صاحب اپنی مخصوص جگہ پر موجود نہیں تھے۔ وہ نہ جانے کتنی دیر سے وہاں بیٹھی تھیں، چونکنے کے بعد انہیں پہلا خیال دانیال کا آیا۔ وہ اتنی دیر تک ان کے بغیر رہا ہوگا وہ تو بار بار اس کا ماتھا چومتیں اور اس کے بال ٹھیک کرتی تھیں، اس کے چہرے کو چھو کر اس کے لمس کو محسوس کرتی تھیں، آج وہ اتنی دیر ان کے لمس کے بغیر رہا ہوگا، اس کا وقت کیسا گزرا ہوگا، کہیں خدانخواستہ اس کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہوگئی ہو، وہ مزید چونک گئیں۔ وہ فوراً وہاں سے نکل جانا چاہتی تھیں مگر خاتون نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں بٹھالیا۔

''صوفی صاحب نماز پڑھنے کے لیے گئے ہیں بیٹی، وہ کہہ کر گئے ہیں کہ ان کے واپس آنے تک تم یہیں بیٹھوگی۔'' وہ کہہ رہی تھیں۔

''مجھے دیر ہوگئی، میرا بیٹا میرا انتظار کر رہا ہوگا۔'' وہ ہاتھ چھڑا کر اٹھیں۔

''بیٹھ جاؤ بیٹی۔'' انہوں نے دوبارہ ان کا ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا۔ ''کوئی دعا، کوئی ورد، کوئی وظیفہ تمہیں ایسا ضرور مل جائے گا جو تمہارے دل کو سکون پہنچائے گا، تمہیں چین اور سکون ملے گا، باقی جو تقدیر میں لکھا ہے، وہ تو لکھا جاچکا ہے، یہ سب جو ہم کرتے پھرتے ہیں یہ تو صرف ہمارے جینے کے بہانے ہیں، خود کو تسلی دینے کے ذریعے ہیں، تمہارے ساتھ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی بڑا حادثہ ہوچکا ہے مگر بیٹی یہ حادثے اور سانحے ہی تو خدا کی خدائی کے عکاس ہیں۔ یہ نہ ہوں تو ہم تو خدا کو بالکل ہی بھول جائیں۔''

''ہم خدا کو بالکل ہی بھول تو جاتے ہیں۔'' انہوں نے روتے ہوئے کہا۔ خاتون نے کسی ماں کی طرح انہیں سینے سے لگایا۔ اپنے ساتھ بیٹھی بچی کو ان کے لیے پانی لانے کو کہا اور دھیرے دھیرے ان کی پشت سہلانے لگیں۔

''مجھے بتاؤ، تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟'' وہ پوچھ رہی تھیں۔ انہوں نے ہچکیوں کے درمیان اپنی پریشانی کی وجہ بتائی۔

''اولاد کی چوٹ بہت سخت لگتی ہے۔'' ان کی بات سن کر خاتون نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''میں خود بھی یہ چوٹ کھائے ہوئے ہوں۔ میرا جوان بیٹا بھی ایک حادثے میں مر گیا تھا۔''

''میرا بیٹا زندہ ہے۔'' انہوں نے فوراً کہا۔

''خدا اسے زندگی اور صحت عطا فرمائے، میں تم کو اولاد کی چوٹ کے بارے میں بتا رہی تھی، میں بھی ایسے ہی دکھی ہوگئی تھی مگر پھر صوفی صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ صبر کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں، مجھے ہمت اور حوصلے سے کام لینا ہوگا، صوفی صاحب کی زبان میں ان کی بات میں بہت اثر ہے۔ میں نے ان کی بات پلّے سے باندھ لی اور اب تک اسی ہمت کے بل پر جی رہی ہوں جو صوفی صاحب کے کہنے پر باندھی تھی۔'' خاتون بتا رہی تھیں۔ ''میں آزاد کشمیر سے یہاں آئی ہوں، صوفی صاحب سے ملنے کے لیے۔''

''اتنی دور سے۔'' وہ ذرا سنبھلتے ہوئے بولیں۔ ''کیا صوفی صاحب کی شہرت اتنی دور دور تک پھیلی ہوئی ہے؟''

''یہ خدا کے بندوں کا وصف ہے بیٹی، اسے فیض کہتے ہیں، ہمارے جیسی خلقِ خدا کو یہ خود بخود پہنچتا ہے، اس خوشبو کو سونگھتے سونگھتے ہم جیسے خود بخود مرکز تک پہنچ جاتے ہیں، صوفی صاحب کے بہت سے معتقد آزاد کشمیر میں رہتے ہیں، صوفی صاحب یہاں سے اپنے پیاروں کے پاس جاتے رہتے ہیں، اس مرتبہ مجھے خود صوفی صاحب سے بہت سی باتیں کرنی تھیں اس لیے میں ان کی وہاں آمد کا انتظار کیے بغیر خود یہاں پہنچ گئی، تم بتاؤ نہیں صوفی صاحب کے بارے میں کس نے بتایا، تم کیسے ان تک پہنچیں؟''

''مجھے اسپتال میں موجود ایک صاحب نے ان کے بارے میں بتایا، میں پیروں فقیروں کے پاس جانے کو ضعیف الاعتقادی کہا کرتی تھی مگر ان صاحب نے کہا کہ جیسے ذہنی بیماریوں کے مریضوں کی کونسلنگ کے لیے لوگ سائیکاٹرسٹ کے پاس جاتے ہیں ویسے ہی روحانی بیماریوں میں مبتلا لوگ اپنی کونسلنگ کے لیے صوفی صاحب جیسے لوگوں کے پاس جاتے ہیں۔ یہ کوئی روایتی پیر نہیں جو معجزے کر دکھانے کے دعوے کرتے ہیں۔'' انہوں نے کہا۔

''پھر تم نے صوفی صاحب کو کیسا پایا؟'' خاتون نے پوچھا۔

''میں کونسلنگ کے عمل سے گزر رہی ہوں، شاید مجھے سکون مل جائے۔''

''ضرور ملے گا، میری بیٹی اور یہ جو دانیال کے لیے صوفی صاحب بتا رہے ہیں کہ تمہاری اپنی دعا، تمہاری اپنی پکار سب سے بڑی تدبیر ہے تو اسے آزما کر دیکھ لو، صوفی صاحب کبھی غیر حقیقی بات نہیں کرتے۔'' خاتون کے لہجے میں اتنی اپنائیت تھی کہ وہ ان سے دل کی بات کرتے ہوئے ذرا بھی نہیں جھجکیں، وہ بہت انا پسند مشہور تھیں۔ کسی اجنبی سے زیادہ بات نہیں کرتی تھیں مگر اس روز ان کا دل چاہ رہا تھا کہ ان خاتون سے باتیں کرتی ہی چلی جائیں، وہ جو واپسی کے لیے بے چین تھیں ان سے یوں محوِ گفتگو ہوئیں کہ انہیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ اس شام صوفی صاحب کے پاس سے واپسی پر ہر نماز کے بعد پڑھنے کے لیے ورد اور آزاد کشمیر سے آئی خاتون کا نام پتا اور ٹیلی فون نمبر ان کے پرس میں موجود تھے۔

☆☆☆

''ہماری قومی تاریخ کا ہمیشہ سے یہ المیہ رہا ہے کہ جب کوئی شخص روایتی سیاست سے ہٹ کر حقیقت پسندانہ سوچ اختیار کرے اور اپنے لوگوں کے لیے واقعی کچھ کرنا چاہے اسے کبھی قبول نہیں کیا جاتا۔ وہ اسٹیبلشمنٹ کا معتوب بن جاتا ہے اس کے گرد ایسا گھیرا تنگ کر دیا جاتا ہے کہ اس کا حقہ پانی ہی بند ہو جائے۔ وہ منظر سے جب تک بالکل غائب نہ ہو جائے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا جاتا مگر آج کے آزاد میڈیا سے ہم یہ امید کرتے ہیں کہ اب کی بار ایسا نہیں ہونے دیا جائے گا۔ جھوٹ کو جھوٹ اور سچ کو سچ ہی پیش کیا جائے گا۔ حلقے سے ووٹرز کی رہنمائی کی جائے گی کہ ان کے لیے کیا بہتر ہے، فیصلہ کرنے کی صلاحیت بہتر بنانے میں ان کی مدد کی جائے گی۔'' لیٹل رئیس ایک مختصر پریس کانفرنس میں بول رہی تھی۔ ضمنی انتخابات میں صرف دو ہفتے رہ گئے تھے اور انتخابی مہم اپنے عروج پر تھی۔ لیٹل رئیس کے انتخاب کے بعد مہر زاد خان کی میڈیا مہم بہت بہتر اور میچور ہوچکی تھی۔ اس کے پاس پہلے سے ہی دو مثبت پوائنٹ موجود تھے۔ ایک تو یہ اس کی آبائی سیٹ تھی دوسرا وہ ایک شہید کا بیٹا تھا۔ مخالف پارٹی نے اگرچہ اس بار اپنی سیاست کا انداز بدل لیا تھا مگر مہر زاد خان کے یہ دو مثبت پوائنٹ اس مرتبہ کسی حد تک اسے انتخاب جتوانے کے لیے کافی تھے۔

''تم اتنی پُرکشش تنخواہ لے رہی ہو یار۔ تم نے بہت عقلمندی کا ثبوت دیا۔'' تابندہ نے اسی روز لیٹل سے

کہا تھا۔

''یہ وقت پیسہ بنانے کا ہے ڈارلنگ۔'' یشل نے اپنے بکھرے بال سمیٹتے ہوئے جواب دیا۔ ''اپنی تعلیم، اپنے ہنر، اپنے پیشے کو پیسہ بنانے کی مشین بنانے کا وقت ہے۔ جب ان لوگوں کو ہماری ضرورت ہے تو کیوں نہ ہم اس ضرورت کو پوری کرنے کے دام کھرے کریں۔ تم میڈیا کی طاقت کا اندازہ کرو کہ یہ لوگ میڈیا ایڈوائزر کو پریس سیکریٹریز کو منہ مانگے پیسے دے رہے ہیں، جب ایسا ہے تو ہم کیوں نہیں، ہم اپنے ہنر کا اپنی محنت کا معاوضہ لیتے ہیں۔ دن رات جان کھپانی پڑتی ہے، پریس کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان لوگوں کے تیکھے، کھٹے، میٹھے کٹیلے ہر طرح کے سوالوں کا جواب دینا پڑتا ہے۔ پرنٹ میڈیا میں ان کے حق میں مضمون لکھنے پڑتے ہیں اور جو شخص اتنا کام کرے اسے منہ مانگا معاوضہ مانگنے کا حق بھی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم لوگ لفظوں سے بُت گری کرتے ہو، امیج بلڈنگ دراصل بت گری کا دوسرا نام ہی تو ہے۔'' تابندہ ہنسی تھی۔ ''مگر یار بندہ بہت ڈیشنگ ہے اور اسے معلوم ہے کہ ڈیشنگ نظر کیسے آیا جا سکتا ہے۔ اسے دوسروں کو متاثر کرنے کا فن آتا ہے، میں تو سمجھو مسمرائز ہوگئی ہوں جس دن پہلی مرتبہ اسے قریب سے دیکھا۔''

''ہاں یہ مختلف ہے۔'' یشل نے اعتراف کیا۔ ''پہلے پہل میرا یہ خیال تھا کہ یہ بھی یہاں کے ان سرداروں میں سے ہوگا جو دُہری شخصیتوں کے حامل ہوتے ہیں، مہذب دنیا کے سامنے اور، اپنے علاقے میں اور مگر میں نے اسے یہاں بھی دیکھا ہے اور وہاں بھی، یہ ایک جیسا رہتا ہے، نرم گفتار، سنجیدہ اور پُرسکون۔ میں نے پہلی مرتبہ کسی سردار کو اپنے لوگوں کے ساتھ یوں گھلتے ملتے دیکھا ہے جیسے وہ انہی میں سے ہو۔ میں نے پہلی مرتبہ لوگوں کے مسائل کو سنجیدگی سے سنے جاتے اور حل ہوتے دیکھا ہے اور یہ کام کرنے کے لیے اسے کسی وقت، کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا مگر تابندہ مجھے ڈر ہے کہ ایسے شخص کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ یہاں منظر میں رہنے کے لیے تاوان ادا کرنے کی روایت پڑ چکی ہے اور یہ شخص ایسا کوئی تاوان بھرنے کے موڈ میں نظر نہیں آتا۔ ایسے مست اور بے نیاز لوگوں کو ماضی کا قصہ بنا دیا جاتا ہے۔ مجھے اس کا مستقبل روشن نظر نہیں آتا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا، کیا یہ الیکشن ہار جائے گا؟'' تابندہ نے چونک کر پوچھا تھا۔

''نہیں۔'' یشل نے سر ہلایا۔ ''الیکشن میں یہ آسانی سے جیت جائے گا لیکن اگر یہ یونہی بے نیازی برتتا رہا، چوگے کھانے والوں کو چوگا نہ دیتا رہا اور اپنے کام سے کام رکھنے کی پالیسی پر قائم رہا تو یہ اس کا پہلا اور آخری الیکشن ثابت ہوگا۔ اس مرتبہ کے بعد یہ منظر سے ہٹا دیا جائے گا۔''

''میری عقل میں تو اتنی بڑی، بڑی باتیں نہیں آتیں۔'' تابندہ نے سر ہلایا۔ ''مگر میں اس کے لیے ہمیشہ نیک خواہش اور اچھی دعا ہی کروں گی، مجھے اس نے خاصا متاثر کیا ہے۔''

یشل کی ذاتی رائے یہ تھی کہ یہ الیکشن مہرزاد خان کے لیے بہت آسان ثابت ہوگا۔ وہ کیا سب اخبار، چینل اور تجزیہ نگاروں کی یہی رائے تھی اور یہ رائے اس وقت تک مکمل طور پر قائم تھی جب تک بولڈ اینڈ سیریز سردار مہرزاد خان کے متعلق وہ اسکینڈل سامنے نہیں آ گیا جس کو سن کر یشل رئیس کو بہت دیر تک اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

بینش کی اماں لوئر مڈل کلاس طبقے کی روایتی ماں تھیں۔ وہ خود پڑھی لکھی نہیں تھیں مگر انہیں اپنی بیٹی پر فخر تھا کہ وہ نہ صرف پڑھ رہی تھی بلکہ ایسی پڑھائی کر رہی تھی جو عام قسم کی تعلیم سے مختلف تھی مگر حقیقت میں انہیں بینش کا اپنے محلے اور طبقے کی دوسری لڑکیوں سے انتہائی مختلف ہونا کچھ زیادہ پسند نہیں تھا اور اب تو وہ دیکھ رہی تھیں کہ بینش روز بروز بہت بدلتی جا رہی تھی۔ انہیں اس بات پر بھی تشویش تھی کہ وہ اسکول کالج کے روایتی وقت کی نسبت دیر سے گھر آتی تھی۔ اس تشویش کا اظہار انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں سے بھی کیا تھا اور ان کو اس وقت سخت مایوسی ہوئی جب دونوں نے ہی ان کی بات کو ہنسی میں ٹال دیا۔

''چھوڑ اماں، یہ بھی کوئی مسئلہ ہے جس پر پریشان ہوا جائے۔ بینش کوئی عام سا بی اے، ایف اے نہیں کر رہی، وہ اعلیٰ ڈگری کے لیے پڑھائی کر رہی ہے اور اس میں دیر سویر ہو جاتی ہے۔ ہم سارا دن اپنی دکان پر بیٹھے اعلیٰ پڑھائی کرنے والی لڑکیوں کی آنیاں جانیاں دیکھتے رہتے ہیں۔ وہ ساری ہی دیر سے آتی ہیں، تھکی ہاری، لٹی ہوئی، ماہی کو دیکھیں تو یہ بھی ایسی ہی تھکی ہاری معلوم ہوتی ہے۔ تو نے ساری عمر اماں گھر سنبھالتے اور کھابے پکاتے کھاتے گزار دی۔ تجھے کیا پتا، کتنی محنت والی پڑھائی ہوتی ہے یہ۔''

''کیا فائدہ ایسی پڑھائی کا، پیچھے سے گھر سنبھالنا اور پکانے کھانے ہی ہیں ناں۔'' اماں نے کمزور سا احتجاج کیا۔

''اس کا شوق ہے اماں، اس کا ہر شوق پورا کریں گے۔'' بڑے بیٹے نے پیار سے کہا۔ ''پہلے تو ہمیں توفیق نہیں تھی مگر اب تو ہم اس کے سارے شوق پورے کر سکتے ہیں ناں۔'' اماں کو بھائیوں کے بہن سے اس پیار پر فخر محسوس ہوا مگر وہ دل میں اس بات سے خوفزدہ تھیں کہ بینش کی عادتیں اور شوق اپنی ان ہم عمر لڑکیوں سے جو اسی محلے میں رہتی تھیں بہت زیادہ بدل چکے تھے۔

''آج میں نے سری پائے پکائے ہیں، بڑے مزیدار، ماہی آ کھا لے گرم گرم۔'' وہ کبھی کبھی بہت پیار سے کہتیں تو بینش انکار کر دیتی۔

''اماں سری پایوں میں بہت زیادہ کیلوریز ہوتی ہیں، کولیسٹرول لیول بھی بڑھا دیتے ہیں یہ، مجھے دوپہر والا سالن دے دیں گو بھی آلو کا۔''

''ہائے ہائے، نہ تو نے اس روز ہریسے کو ہاتھ لگایا تھا نہ چنوں، پوری حلوے کو، تیرے بھائی اتنے شوق سے لائے تھے اس دن بھی سوکھے مارے توس کھا کر ناشتا کیا تھا، تیرا دماغ تو نہیں پھر گیا ماہی۔'' وہ اپنے پسندیدہ دسترخوان پر کھانا رہ جانے پر بھڑک اٹھتیں۔

''اماں، ہلکی اور جلد ہضم ہو جانے والی خوراک کھانے کی عادت ڈالیں آپ بھی۔ یہ خالص کشمیریوں والے کھابے کھا کھا کر اپنی ہی صحت سے دشمنی کر رہی ہیں ہاں!'' بینش نرمی سے انہیں سمجھانے کی کوشش کرتی مگر یہ تبدیلی اور یہ گریز انہیں ہضم نہیں ہو پا رہا تھا۔ ان کا یہ خیال روز بروز مضبوط ہوتا جا رہا تھا کہ پڑھنے کے لیے اجازت دے کر انہوں نے اچھی بھلی لڑکی ہاتھ سے گنوائی تھی۔

☆☆☆

شہباز صاحب کی بیوی ناصرہ اپنے میاں کے چہرے سے عیاں پریشانی کے آثار کو بھانپ رہی تھی مگر اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا کہ اس پریشانی کے پیچھے کیا راز تھا۔

''میں تو پڑھی لکھی نہیں ہوں شہباز صاحب اور میری سمجھ میں بہت سی باتیں نہیں آتیں مگر پھر بھی کچھ تو بتائیں، دفتر میں پریشانی ہوگئی ہے کیا، حساب کتاب تو ٹھیک ہے ناں دفتر کا؟'' ناصرہ نے کوئی تیسری مرتبہ شہباز صاحب سے پوچھنے کی کوشش کی تھی۔

''دفتر کا حساب بالکل ٹھیک ہے ناصرہ بی بی، پر مسئلہ بہت بڑا آن پڑا ہے۔'' بالآخر شہباز صاحب کہہ بتانے پر آ ہی گئے۔

''کیا مسئلہ ہے؟'' ناصرہ نے سر پر جمی چادر کو مزید جمانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے تو کبھی آنا نہ پائی اِدھر سے اُدھر کی۔ پوری پوری تنخواہ میں گزارہ کرتے ہیں۔ پانچ وقت آپ مسجد میں نماز پڑھتے ہیں، علاقے کے سارے لوگ آپ کی ایمانداری کے گواہ ہیں پھر کیا پریشانی ہے۔ ہماری کسی سے لڑائی، نہ جھگڑا، نہ ہماری کوئی زمین جائداد، بس ایک یہ مکان ہی مکان ہے پھر ہمارے ساتھ کیا مسئلہ ہوتا ہے۔'' وہ اپنے تئیں قیاس لگانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''بس مسجد میں نماز پڑھنے اور وہاں صبح، صبح جھاڑو لگانے سے ہی تو مسئلہ ہو گیا ناصرہ بی بی۔'' شہباز صاحب نے بالآخر زبان کھولی۔ ''وہ جو لڑکی تھی تین سال پیچھے اِدھر آئی جاپانی بی بی کے ساتھ، اس کا سارا قصہ ہے۔''

''ہائے، اس کا کیا قصہ ہے۔ وہ تو بے چاری خود مصیبت زدہ تھی، اس نے کیا مصیبت ڈالنی تھی کسی کو۔'' ناصرہ کو یک دم سب کچھ یاد آ گیا۔

''اوئے ایجنسیاں لگی ہوئی ہیں اس کے پیچھے۔ کتوں کی طرح سونگھتے پھر رہے ہیں وہ کہ کہاں گئی وہ لڑکی اور کس، کس نے اس کی مدد کی۔ او خدا سے کوئی خصوصی دعا مانگ ناصرہ بی بی یہ تو بندوں کی پشتیں کھنگال چھوڑتے ہیں۔''

''ہائے میں مرگئی۔'' ناصرہ نے بے تابی سے ہاتھ ملے۔ ''شہباز صاحب ہم تو نمانے سے لوگ ہیں ہمارا کیا واسطہ اتنی بڑی، بڑی باتوں سے۔''

''بس خیر مانگ بھلیے لوکے، بڑا برا وقت آنے والا ہے۔ خیر مانگ خیر۔'' شہباز صاحب نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

''لو جی نیکی کا صلہ یہ ملتا ہے اِدھر، اس طرح تو نیکی کرے ہی نہ بندہ کبھی عمر بھر۔'' ناصرہ نے ایک مرتبہ پھر ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''نیکی کرنے سے پہلے اس شخص کا آگا پیچھا پھرولنا پڑتا ہے اب، اس سے پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا، اب پھونک پھونک کر قدم اٹھانا پڑتا ہے۔'' شہباز نے انہیں بتایا۔

''معصوم سی بچی لگتی تھی وہ اور جاپانی بی بی تو بالکل ہی معصوم تھی، ہم کیا جانتے تھے کہ اتنی خطرناک نکلے گی۔''

''وہ خطرناک تھی یا نہیں یہ تو مجھے پتا نہیں مگر اس کے لیے جو لوگ اِدھر اُدھر پوچھتے پچھاتے پھر رہے ہیں وہ خطرناک ہیں، مجھے تو سب خبریں ہیں ان کے ہاتھ جو لوگ لگ جاتے ہیں ان کا کھرا نہیں ملتا پھر ان کے گھر والوں کو ساری ساری عمر، اسی لیے تو کہتا ہوں کہ خیر مانگ خدا سے خیر مانگ۔'' ان کی آواز نیچی ہو گئی۔

اس روز گھر میں چولھا نہیں جلا اگرچہ چھٹی کا دن تھا۔ سارا دن گھر میں سوگ کی سی کیفیت رہی۔ ناصرہ کو رہ رہ کر وہ معصوم شکلیں اور بے ضرری نیکی یاد آتی رہی۔ اس نے بہت محبت اور دل سے ان دونوں بیبیوں کی خدمت کی تھی اور ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ آئندہ بھی ان سے رابطے میں رہیں گی لیکن دونوں نے ہی دوبارہ شکل نہیں دکھائی تھی۔ ناصرہ سوچتی رہی کیا وہ کبھی سوچ سکتی تھی کہ یہ بے ضرری نیکی ان کے گلے پڑ جائے گی۔

☆☆☆

ثمرین، دانیال سے دوسروں کی نسبت بہت قریب تھی۔ وہ اس کے ساتھ بہت سی باتیں شیئر کرلیا کرتا تھا

اور وہ اس کے اس گروپ میں بھی شامل تھی جو اُن لوگوں کو پروموٹ کرتا تھا جو بہت اچھے آرٹسٹ تھے مگر وسائل نہ ہونے کی وجہ سے پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے سے قاصر تھے۔ دانیال کی کمپنی میں ثمرین بہت خوش رہتی تھی، اسے وہ منفرد اور اچھا لگتا تھا اور اسے اس بات پر فخر بھی محسوس ہوتا تھا لیکن کچھ دنوں سے وہ دیکھ رہی تھی کہ دانیال پریویس کی بینش کو کمپنی دینے لگا تھا اسے یہ تبدیلی قطعی اچھی نہیں لگی۔ بینش جیسی لڑکی کو اتنی اہمیت دینا اسے اپنی ہتک محسوس ہو رہی تھی اور اس روز اس نے اپنی خلش کا اظہار دانیال کے سامنے کر بھی دیا تھا۔

''تم غلط سوچ رہی ہو ثمرین، بینش جیسی لڑکیاں عام اور غیر اہم نہیں ہوتیں۔ وہ بہت کم کم نظر آتی ہیں اور بہت کچھ کر دکھانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ میں نے صرف اسے S P o t کیا ہے۔ باقی اس کی رہنمائی اور مدد میرا خیال ہے کہ ہم سب کا فرض ہے۔'' دانیال نے بہت سکون کے ساتھ جواب دیا۔

''یہاں اور بھی بہت سے باصلاحیت اور محنتی لوگ ہیں جن کی ہم مدد کر رہے ہیں پھر یہ خصوصی عنایت بینش پر ہی کیوں؟'' ثمرین کے دل نے سخت جلن محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''تم ٹپیکل ویمنش جیلسی کا شکار ہو رہی ہو ثمرین!'' دانیال نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں کون سا ایسا راجا اِندر ہوں، جس کی دوستی پر کسی کو چبھن محسوس ہو، میں تو سب کا دوست ہوں، میری نیچر سے سب سے زیادہ تم ہی واقف ہو لیکن تمہارے اس ردِعمل سے مجھے حقیقی معنوں میں دکھ سا محسوس ہو رہا ہے۔''

''تم جو بھی سمجھو۔'' اس نے پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک اتنی جونیئر اسٹوڈنٹ سے تمہارا یہ التفات، مجھے اس کی سمجھ نہیں آئی۔''

''تم یہ سمجھو کہ وہ مختلف لگتی ہے اور یقیناً اچھی بھی لگتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنے شعبے میں نام بھی کمائے اور عزت بھی۔ میں اس کی ہر ممکن مدد کرنے کا ارادہ کر چکا ہوں اور یقیناً کروں گا بھی، اس سے میری اور تمہاری دوستی میں میرا خیال ہے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' دانیال نے رسان سے سمجھانے کی کوشش کی۔

''مجھے دوستی کے معاملے میں تمہاری چوائس پر حیرت ہے اور افسوس بھی۔'' ثمرین نے غصے سے کہا۔ ''میں نہیں سمجھتی کہ اس بے چارے سے بیک گراؤنڈ کی لڑکی تمہاری کسی مدد کے ساتھ کہیں جا پہنچے گی۔''

''چلو تم کچھ بھی کہو، میں اپنی سی کوشش ضرور کروں گا بلکہ چاہوں گا کہ تم بھی میرے ساتھ مل کر اس کی رہنمائی کرو، اس کی مدد کرو، یہ نیکی کا کام ہے۔'' دانیال نے اسی سکون کے ساتھ کہا۔

''مجھے اس قسم کی نیکیاں کرنے کا کوئی شوق نہیں۔'' ثمرین نے اپنے چہرے سے ناراضی کا تاثر چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

''لیکن تم ہمارے گروپ کی ایکٹویٹیز میں شامل رہتی ہو، وہ بھی تو نیکی کے کام ہیں۔'' دانیال نے پوچھا۔

''وہ اور بات ہے، وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اخراجات کے متحمل نہیں ہوتے، یہ لڑکی افورڈ کرتی ہے، میرٹ پر آئی ہے اور بہترین اساتذہ سے تعلیم حاصل کر رہی ہے اس کی رہنمائی کی کیا ضرورت ہے ہمیں۔''

''چلو میں برا نہیں مناؤں گا تم اگر نہیں پسند کرتیں تو تم بے شک اس سلسلے میں میری مدد نہ کرو لیکن پلیز اپنا ذہن ٹھیک رکھو، تم ایک بڑی آرٹسٹ ہو، آرٹ کو سمجھتی ہو اور جو شخص آرٹ کو سمجھتا ہے وہ بہت حساس ہوتا ہے۔ اس بڑی خوبی کو اپنا اثاثہ سمجھو اور ایک بالکل بے ضرری بات کا برا منا کر اس اثاثے کو شک کا نشانہ نہ بناؤ۔''

''تم جو بھی سمجھو، مجھے تمہارے اسٹینڈرڈ اور چوائس پر حیرت ہے۔'' ثمرین نے اٹھتے ہوئے کہا۔ دانیال خاموشی سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اسے ثمرین کے اس ردِعمل پر دکھ اور حیرت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ پچھلے تین سال

سے ساتھ تھے اور ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ اس کی فنکارانہ صلاحیتوں کا معترف تھا اور اس کی خوبیوں کا بھی اعتراف کرتا تھا۔ ثمرین کے گھرانے سے اس کے گھرانے کا بھی پرانا تعلق تھا۔ وہ اسے ایک اچھا دوست سمجھتا تھا مگر ثمرین، بینش سے اس کی دوستی پر اس طرح تلملائے گی یہ اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

بی اماں اور حمزہ ہوا کے تازہ جھونکے کے مانند زندگی کی خاموش روانی میں آتے اور پھر کچھ دنوں بعد چلے جاتے۔ ان کے جانے کے کئی دن بعد تک وہ اداسی اور تنہائی محسوس کرتی اور پھر زندگی کے معمول کی عادی ہو جاتی، اسکول میں اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کا اعتراف برملا اور اکثر کیا جانے لگا۔ وہ انٹر اسکول کی ہم نصابی اور غیر نصابی مقابلوں میں ہمیشہ شرکت کرنے لگی اور اس کے پاس اعزازات اور سرٹیفکیٹس کے ڈھیر لگ گئے۔ گھریلو امور میں ماہر بنانے کے لیے بواجی گھر پر موجود تھیں۔ انہوں نے اپنا سارا سلیقہ اور ہنر اسے منتقل کر دیا۔ وہ سارا سارا دن مختلف کاموں میں مصروف رہتی مگر پھر بھی نہ جانے کیوں اس کا دل اکثر ناراض، اداس اور ناخوش رہتا تھا۔ بواجی کا ضرورت سے زیادہ محتاط رویہ اس کے لوگوں سے میل ملاپ میں خاصی بڑی رکاوٹ تھا، اس کی سہیلیوں کی تعداد بھی کم تھی، اپنی کالونی کے تقریباً ہر گھر سے کوئی نہ کوئی بچی بواجی کے ہنر کار مرکز میں سلائی کڑھائی سیکھنے کے لیے آتی تھی۔ ان سب سے اس کی اچھی گپ شپ رہتی تھی۔ وہ خود بھی ان لوگوں کی طرف جانا چاہتی تھی مگر بواجی اسے وہاں جانے کی اجازت صرف اس وقت دیتیں جب وہ خود کہیں جا رہی ہوتیں۔

''میرے پاس اچھے معلوماتی رسالوں کی جو جلدیں ہیں وہ کیوں نہیں پڑھتی تم؟'' بواجی اس کی بوریت دیکھ کر پوچھتیں۔

''مجھے ان میں کچھ بھی قابلِ مطالعہ نظر نہیں آتے، آپ مجھے وہ کتابیں پڑھنے دیں جو میرے ابو کی الماری میں بند پڑی ہیں۔'' وہ کہتی۔

''وہ کتابیں تمہاری ذہنی سطح سے بلند ہیں، ابھی تم اپنی ذہنی سطح کے مطابق کتابیں اور رسالے پڑھو۔'' بواجی ہمیشہ یہی بات کہتیں۔

مگر اسے ابو کی الماری میں رکھی کتابیں اتنی پرکشش معلوم ہوتیں کہ وہ ہر دم انہیں ہی پڑھنا چاہتی تھی اور بواجی کو پتا بھی نہیں چلا کہ کب اس نے اس الماری کے تالے کو ہیئر پن سے کھول بھی لیا، یہ اس کی او لیول کے امتحان کے بعد کے دن تھے، بواجی دستکاری اسکول میں مصروف رہتیں اور وہ ابو کی الماری کی کتابیں پڑھتی رہتی۔ بواجی سے لاکھ اختلاف کے باوجود اس نے کبھی ان سے چھپ کر کوئی کام نہیں کیا تھا، یہ پہلی چوری تھی جو اس نے کی تھی۔ اسے کتابیں پڑھنے کی لت لگ چکی تھی۔ اسے ان میں سے بیشتر کتابوں کے متن کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر وہ ان کا ایک، ایک لفظ پڑھتی تھی۔ انہی دنوں اس نے اردو ادب کے مشہور ناول پڑھے اور ناول نگاروں سے متعارف ہوئی۔ انگریزی ادب وہ اسکول میں بھی پڑھ چکی تھی اور اس سے متعارف بھی تھی مگر ابو کے ذخیرے میں روسو، والٹیر، دوستوفسکی، جین آسٹن، ہارڈی اور ڈکنز کی کتابیں تھیں۔ ہومر کی الیاڈ بھی اس نے جب ہی دیکھی تھی اور ہٹلر کی خود نوشت بھی، ایڈم اسمتھ کی اقتصادیات بھی اور ابن خلدون کا مقدمہ بھی۔ انہی دنوں اپنے باپ سے اس کا نیا تعارف بھی ہوا۔ کتابیں یقیناً کئی بار پڑھی گئی ہوں گی مگر بہت قرینے اور سلیقے سے سنبھال کر رکھی گئی تھیں۔ کسی بھی کتاب کا کوئی بھی صفحہ کہیں سے مڑا ہوا یا خراب نظر نہیں آتا تھا۔ کسی کتاب کے کسی ورق پر کوئی لفظ نہیں لکھا تھا نہ ہی کسی جملے کو انڈر لائن کیا گیا تھا ماسوائے پہلے ورق کے جہاں بہت خوب صورت لکھائی میں صلاح الدین لکھا تھا جو اس کے والد کا نام تھا۔

(جاری ہے)



شامِ شہرِ یاراں

عنیزہ سیّد

قسط 5

زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے… خیر و شر، نیکی او ربدی… زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت… ہر برائی پر حاوی ہوجاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سیّد نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اُگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

”مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ تمہاری آپا اتنی جلدی کیوں واپس جانے پر مصر ہو گئیں۔“ اگلے روز ٹی بریک میں زوئی نے نادر سے پوچھا تھا۔

”ہوں.....“ نادر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ قدرے پریشان نظر آ رہا تھا۔

”کیا، انہیں میں اچھی نہیں لگی؟“ زوئی نے سوال کیا۔ ”یقیناً میں انہیں اچھی نہیں لگی ہوں گی، بے شک الحمدللہ میں مسلمان ہوں مگر دو ملکوں کے لوگوں کے درمیان کلچر اور روایات کا کچھ فرق تو ہوتا ہی ہے، شاید وہ اس فرق کی وجہ سے اچھا محسوس نہیں کر رہی تھیں۔“ اس نے خیال ظاہر کیا۔

”نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“ نادر نے کہا۔

”پھر کیا ہوا؟“ زوئی کے لہجے میں بے چینی تھی۔ ”ابھی تو میں اس خوشی کو ہی ہضم نہیں کر پائی تھی کہ میرے گھر مجھ سے کوئی یوں ملنے آیا ہے کہ وہ چلی بھی گئیں۔“

”مجھے افسوس ہے زوئی، میں تم سے شرمندہ ہوں۔“ نادر اسے یوں پریشان دیکھ کر بولا۔ ”آپا کو یوں نہیں کرنا چاہیے تھا مگر شاید اس میں بھی میرا ہی قصور تھا، مجھے انہیں تمہارے ہاں لے کر آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔“

”کیا تم انہیں زبردستی لائے تھے نادر؟“ زوئی کو حیرت محسوس ہوئی۔

”نہیں یار، زبردستی تو نہیں لایا تھا اور میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ایسے کریں گی مگر تمہارے گھر آنے کا آئیڈیا تو میرا ہی تھا، اس لیے یہ میرا ہی قصور ہوا ناں، میں بہت شرمندہ ہوں تم سے زوئی۔“

”پلیز ایسے مت کہو نادر۔“ زوئی کو اس کا بار بار شرمندگی کا اظہار کرنا اچھا نہیں لگا۔ ”تمہارا کوئی قصور نہیں اور مجھے برا بھی نہیں لگا۔ کچھ دیر کے لیے ہی سہی وہ میرے گھر آئیں تو میرے لیے یہی کافی ہے۔“

”تم ایک بات بتاؤ زوئی۔“ نادر نے اس سے کہا۔

”ہاں بولو۔“

”اگرچہ میرے گھر والے اس پر خوش ہوں گے نہ ہی رضامند مگر کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟“ زوئی کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ ”میں یہ بات سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔“ نادر نے اس کے چہرے پر پھیلی حیرت کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں اسی لیے آپا کو لے کر تمہاری طرف آیا تھا، میں چاہتا تھا کہ یہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو جائے مگر آپا کا اپنا مزاج ہے وہ نہ جانے کیا سوچ کر اس بات پر رضامند نہیں ہیں۔“

”انہیں میں اچھی نہیں لگی، سیدھی سی بات ہے اور یہ ایک غیر حقیقی بات ہوگی جس کا ذکر تم کر رہے ہو۔“ زوئی نے حقیقت پسندانہ رائے کا اظہار کیا۔

”مگر ضروری نہیں کہ ان کی رضامندی کو شرط بنایا جائے۔ میں اپنے لیے فیصلے کرنے میں آزاد ہوں اور مجھے اس بات میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا کہ میں خود سے تمہارے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر لوں۔“ نادر نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”میں تمہاری فطری نیک طبیعت سے آگاہ بھی ہوں اور اس کی معترف بھی مگر اس سے فائدہ اٹھانا کوئی دانشمندی کی بات نہیں، میری خواہش تھی کہ میں اس ملک کی شہری بن جاتی مگر ہر خواہش پوری ہونا ضروری نہیں۔ شاید خدا کو یہ منظور ہی نہیں، اس لیے میں خدا کی مرضی پر رضامند ہوں۔ تمہارا بہت شکریہ تم نے میرے لیے اتنا اچھا سوچا مگر میں ایسا نہیں کر سکتی۔“ زوئی نے نادر کی بے حد شکر گزار ہوتے ہوئے کہا۔

”میں تم پر کوئی احسان نہیں کر رہا ہوں زوئی حسین۔“ نادر نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے اس معاملے پر

بہت سوچا اور پھر مجھے خیال آیا کہ شادی تو مجھے کرنی ہی ہے اور کیونکہ میرے ذہن میں کوئی اور لڑکی نہیں ہے اس مقصد کے لیے تو پھر تم جسے میں اتنے عرصے سے جانتا ہوں اور تمہارے کردار کے کھرے پن اور تمہاری معصومیت پر مجھے کوئی شک نہیں تو کیوں نہ تم سے ہی شادی کر لوں۔“

”ارے، یہ کیا بات ہوئی؟“ زوئی کے لہجے میں بچوں کی سی خوشی اتر آئی۔

”ارے یہی تو بات ہوئی۔“ نادر ہنسا۔ ”مجھے خوشی ہوگی جب میری اگلی نسل چپٹی ناک، چھوٹی آنکھوں مگر گندمی رنگت کی حامل ہوگی۔“

”تم ہر بات میں مذاق کرتے ہو نادر۔“ زوئی نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مگر تمہارے گھر والے اس پر بھی رضامند نہیں ہوں گے، مجھے اس بات کا یقین ہے۔“

”نہ ہوں۔“ نادر نے ایک بار پھر بے پروائی سے کہا۔ ”آج نہیں ہوں گے، کل ہو جائیں گے۔ تم ایسا کرو میرے ساتھ نکاح کر لو، تمہارا ویزا ایکسپائر ہو رہا ہے۔ تمہیں واپس جانا ہے، تمہاری دوبارہ واپسی کا راستہ ہموار ہو جائے گا اور اس وقت تک میرے گھر والے بھی رضامند ہو جائیں گے۔“ اس نے تجویز پیش کی۔

”کیا یہ ممکن ہے؟“ زوئی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”بالکل ممکن ہے۔“ نادر نے پُریقین انداز میں کہا۔

”میں تمہاری ممنون ہوں۔“ زوئی نے کہا۔ ”میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری بہت خدمت کروں گی اور بالکل پاکستانی لڑکیوں کی سی زندگی گزاروں گی۔“

”اوئے خدا سے ڈرو یار، میں اتنا کنزرویٹو ہرگز نہیں ہوں۔“ نادر نے ہنستے ہوئے کہا۔ زوئی کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ گئی، اسے اس انتہائی ناامیدی کے عالم میں اتنے بڑے معجزے کی توقع ہرگز نہیں تھی، اسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

اس گفتگو کے صرف ایک ہفتے کے بعد زوئی اور نادر کا نکاح مسجد میں ہوا اور اس نکاح کے پانچ دن کے بعد زوئی حسین جواب زوئی نادر تھی اپنے آبائی ملک چین روانہ ہو گئی جہاں سے اسے کچھ ہی عرصے بعد واپس اس ملک میں آنا تھا جو اس کے خوابوں کی سرزمین تھی اور جہاں سے اب اسے واپس جانے پر کوئی مجبور نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

انتخاب سے صرف دو ہفتے پہلے سردار مہر زاد خان کے متعلق میڈیا میں خبر آئی کہ اس کا لاہور کی ایک کال گرل زرنگار سے گہرا تعلق ہے، اتنا گہرا کہ اس کال گرل کی قربت کے لیے مہر زاد خان لاکھوں لٹانے پر بھی تیار رہتا ہے۔

”لے یہ پورٹریٹ آف ریڈ لائٹ ایریا۔“ تابندہ نے یہ خبر سن کر... نیشل رئیس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا تمہاری اگلی تحقیق کا عنوان یہ ہوگا؟“

”ریڈ لائٹ ایریا پر مزید کیا تحقیق کرنی، دنیا کی تحقیق کی تاریخ بھری پڑی ہے اس عنوان سے۔“ نیشل نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”ہیں کون یہ محترمہ جن کی زلف کے اسیر یہ لیڈی کلر صاحب ہیں۔“ تابندہ نے کہا۔

”پتا نہیں۔“ نیشل جو صوفے پر لیٹی تھی اٹھتے ہوئے بولی۔ ”لیکن یہ کوئی بہت ہی اونچی شے ہوگی کیونکہ

جس مہرزاد خان کو میں جانتی ہوں وہ اسٹینڈرڈ پر کمپرومائز نہیں کرسکتا۔"

"اوہو....." تابندہ بے اختیار ہنسی۔ "اسٹینڈرڈ وہ بھی ایک courtesan (بازاری عورت) خصوصاً کسی امیر کی نور نظر کے لیے۔"

"یقیناً......" یشل اپنی بات پر قائم تھی۔ "اس کا اسٹینڈرڈ ہر معاملے میں مختلف اور اونچا ہے اور وہ اس پر کمپرومائز نہیں کرتا اگرچہ یہ خبر بہت شاکنگ ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس لڑکی میں کوئی بہت ہی خاص بات ہوگی جو مہرزاد خان وہاں چلا گیا اس کے پیچھے۔"

"اتنی خوش گمانی!" تابندہ نے معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں، اتنی خوش گمانی۔" یشل نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں سمجھتی ہوں کہ اس بات میں ضرور کوئی اہم نکتہ ہے، میڈیا اور اس کے مخالفین تو ضرور اس اسکینڈل کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کریں گے مگر حقیقت کچھ اور ہے۔"

"کیا تم اب بھی اس کے لیے کالم لکھوگی اور صحافیوں کے سوالوں کے جواب دوگی؟" تابندہ کا سوال اہم تھا۔

"میں اسی کام کے تو پیسے کماتی ہوں، ظاہر ہے میں ایسا ہی کروں گی۔" یشل نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "یہاں تو جو انتہائی غلط ہوتا ہے اسے درست اور سچا بنا کر پیش کردیا جاتا ہے۔ یہ تو غلط ہے ہی نہیں، اسے درست ثابت کرنا کون سا مشکل ہوگا۔"

"اتنا اعتماد!" تابندہ نے دوبارہ اسی معنی خیز انداز میں کہا۔

"ہاں، اتنا اعتماد۔" یشل نے اسی مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

☆☆☆

"مجھے ذاتی زندگی کے بخیے ادھیڑے جانے پر کوئی حیرت نہیں۔" اسی شام جب مہرزاد خان سے یشل کی ملاقات ہوئی تو اس نے کہا۔ "مجھے معلوم تھا ایسا ہوگا بلکہ میں حیران تھا کہ ایسا اب تک ہوا کیوں نہیں۔"

"آپ ذرا بھی پریشان نہیں ہوئے؟" یشل نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کے چہرے پر سکون تھا۔

"نہیں۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مگر وہ چیخ رہے ہیں۔" یشل نے اسے یاد دلانا چاہا۔

"انہیں چیخنے دو۔" وہ اسی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تم پریشان ہو کیا؟" پھر اس نے ذرا رک کر سوال کیا۔

"نہیں۔" یشل نے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا۔ "مگر ہمیں اپنی حکمت عملی سوچنی ہوگی۔"

"کچھ بھی نہیں سوچنا۔" مہرزاد خان نے پُرسکون انداز میں کہا۔ "اس کا بندوبست مشکل نہیں، تمہیں صرف یہ کرنا ہے کہ اسے کسی ایکسپوژر سے بچانا ہے۔ کیا میں یہ سمجھوں کہ میری بات تمہاری سمجھ میں آگئی ہے؟" یشل کی خاموشی پر اس نے خود ہی سوال کیا۔

"جی بالکل، میں سمجھ گئی ہوں۔"

"اور کیا میں سمجھوں کہ تم مجھے ایک فیور دوگی؟" اس نے دوسرا سوال کیا۔ جواب میں یشل نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں اگر تم سے درخواست کروں کہ میں اب کچھ عرصے اس تک نہیں جاسکتا اور اگر یہ ممکن ہو کہ تم اس کی تسلی کے لیے......"

"میں سمجھ گئی سر، میں ضرور، آپ یقین رکھیں۔" یشل نے اٹکتے ہوئے ایک ادھورا سا جواب دیا۔

"تمہارا جواب ڈی کوڈ ہوگیا۔" وہ ذرا مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں ممنون ہوں گا۔"

☆☆☆

"آرٹ ایک محدود میدان ہرگز نہیں ہے۔" دانیال کہہ رہا تھا۔ "نہ ہی زبان کی حدود کا کوئی اندازہ کرسکا ہے اب، یہ دونوں چیزیں یونیورسل ہیں، ہاں ان دونوں کا انداز جدا جدا ہے مختلف خطوں میں۔"

"تم کتنی قسم کے آرٹ کو اور کتنی زبانوں کو جانتے ہو؟" بینش نے سوال کیا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی ڈیپارٹمنٹ کے ہال میں منعقد ہونے والی تصویری نمائش دیکھ کر باہر نکلے تھے۔

"سب کو جاننے کے لیے کتنی ہی زندگیاں اور لمبی عمریں چاہیے ہوتی ہیں۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"پھر بھی۔" بینش نے دوبارہ پوچھا۔

"پھر یہ کہ میں سیکھنے کے عمل میں ہوں بینش۔" وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ وہ یونیورسٹی گیٹ سے نکل کر مال روڈ پر نکل آئے تھے۔ "میرے ساتھ لنچ کروگی؟" اس نے پوچھا تھا۔

"میرے خدا!" بینش کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ "یہ کیسے ممکن ہے۔" اس کے دماغ نے سوچا۔ وہ اس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھا اور سمجھ رہا تھا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔" پھر وہ ہنس کر بولا۔ "پھر کبھی سہی، تمہیں یونیورسٹی بس پکڑنی ہے ناں۔"

"مجھے لنچ کرنا ہے۔" بینش نے فوری فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ اسے اپنی آواز اجنبی سی لگ رہی تھی۔

"نہیں...... اگر دل نہیں مانتا تو یہ کوئی ضروری نہیں۔"

"آپ کو کہاں لنچ کرنا ہے؟" بینش نے اس کی بات کو ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ مجھے لے کر چلیں گے؟"

"اوہ شیور۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "میں کروایٹرز کیفے جا رہا تھا، چلوگی؟ آؤ ان کی آرٹ گیلری بھی دکھاؤں تمہیں۔"

بینش بہت بہادر اور بے جھجک لڑکی نہیں تھی۔ دانیال کے ساتھ سڑک پر چلتے ہوئے اسے ڈر بھی لگ رہا تھا اور یوں پکڑ لیے جانے کا ڈر تھا جیسے اس نے کوئی چوری کی ہو۔ مال کی بے حد گنجان ٹریفک کی وجہ سے انہیں کئی جگہ رکنا بھی پڑا تھا اور اپنے اردگرد دوڑتی بھاگتی گاڑیوں میں بیٹھے اور سڑک پر چلتے پھرتے لوگ خواہ مخواہ ہی اسے آشنا اور جانے پہچانے لگ رہے تھے۔ اپنے محلے سے اپنے رشتے داروں میں سے کوئی اگر دیکھ لے تو وہ سوچتی رہی مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ جو کچھ جاننا چاہتی تھی اور جو سیکھنا چاہتی تھی جیسی ہو جانا چاہتی تھی اس کے لیے اسے اپنی جھجک پر قابو پانا ہوگا۔ وہ ایک نئی دنیا سے متعارف ہوئی تھی اور اس دنیا کی باسی بننا چاہتی تھی۔ اس کے لیے اسے لوگوں کی نیتوں پر اعتماد کرنا تھا اور کچھ ایسی ممنوعہ روایتوں کو قبول کرنا تھا جو اس نئی دنیا میں بسنے کے لیے اس کی مددگار ثابت ہوسکتی تھیں۔

اس تیز رفتار اور گنجان ٹریفک کے درمیان سے گزر کر وہ کروایٹرز آرٹ گیلری پہنچے تھے، بینش نے یہ گیلری پہلی مرتبہ دیکھی تھی، یہاں کئی لوگ دانیال کے جاننے والے تھے، وہ ان سے بینش کو ایک باہنر طالب علم کے طور پر متعارف کرواتا رہا، وہ سب لوگ آرٹ کی دنیا سے متعلق تھے، وہ دانیال کی اتنے سارے لوگوں سے

واقفیت پر حیران تھی پھر دانیال نے اسے پارٹی فوڈ سے متعارف کروایا اور اسے آرٹ سے متعلق مختلف نئی باتیں بتاتا رہا۔ یہ سب ہینش کے لیے بالکل نیا تھا۔ اسے اپنی قسمت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ دانیال کی کمپنی کی متمنی تھی، دانیال نے خود اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ وہ یہ سب کچھ دیکھنا اور سیکھنا چاہتی تھی اور اسے یہ سب دیکھنے اور سیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ وہ دل کی خوشی سنبھال نہیں پا رہی تھی۔

''آپ اس ڈیپارٹمنٹ میں آنے سے پہلے کیا کرتے تھے؟'' کھانے کے دوران اس نے دانیال سے پوچھا تھا۔

''خیالی پلاؤ پکاتا تھا ہواؤں میں اڑتا تھا۔'' اس نے ہنس کر جواب دیا۔ اس روز ہینش نے پہلی مرتبہ غور کیا تھا، دانیال کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی جو بہت کم لوگوں کی آنکھوں میں نظر آتی ہے۔ اس کے لہجے اور عمل میں بلا کا اعتماد ہوتا تھا، ایسا اعتماد جس کے سامنے ہر شخص مرعوب ہو جایا کرتا، وہ دن ہینش کے لیے بہت اہم ثابت ہوا تھا۔

☆☆☆

علینہ ماسٹرز کی کلاس جوائن کر چکی تھی اور خاصی مصروف ہو چکی تھی۔ اس کی زندگی سے بوریت اور بے مصرف ہونے کا احساس بھی غائب ہونے لگا تھا اور اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کے اندر اعتماد کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے دل لگا کر پڑھنے کا عہد کیا تھا اسی لیے اسے پڑھائی میں بھی کوئی مشکل پیش نہیں آ رہی تھی۔ سب باتوں کے ہوتے ہوئے یہ وہ کبھی نہیں بھولی تھی کہ اس کے اعتماد کو بڑھانے میں اور سب باتوں کے علاوہ فہد کا بہت ہاتھ تھا اگر فہد سے اس کا رابطہ نہ ہوتا تو شاید وہ اپنے لیے کچھ بھی نہ سوچ پاتی۔ سارے دن کی مصروفیت کے باوجود وہ رات کو سونے سے پہلے فہد سے بات کرنا نہیں بھولتی۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اپنے ہر کام میں اسے فہد کی رہنمائی کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

''کیا میں تمہارے بیٹے کو دیکھنے آ سکتی ہوں عافیہ بیٹی؟'' انہیں یہ آواز مانوس تو لگی تھی لیکن وہ فون کرنے والی کو پھر بھی پہچان نہیں پائی تھیں۔

''مجھے افسوس ہے، میں آپ کو پہچان نہیں پائی۔'' انہوں نے کہا تھا۔

''میں اس روز صوفی صاحب کے ہاں تم سے ملی تھی۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''اوہ......'' عافیہ کو فوراً یاد آ گیا۔ ''کیوں نہیں، آپ ضرور آئیں، میں آپ کی منتظر رہوں گی۔'' انہوں نے کہا اور فون بند کر کے دانیال کی طرف مڑیں۔ وہ اسی طرح مشینوں کے ذریعے سانس لیتا ان کے سامنے تھا۔ اس کے قریب رکھی کرسی پر قیوم بیٹھا تھا، اس کی نظریں بھی دانیال کے چہرے پر جمی تھیں۔

''آپ بھی فخر محسوس کریں گے سر کہ آپ نے ایک ایسے لڑکے کو ٹرین کیا جو ورلڈ بک آف ریکارڈز میں نام ریکارڈ کروانے جا رہا ہے۔'' قیوم کے کانوں میں آواز گونج رہی تھی۔

''میں یہاں آیا تو صرف اِدھر کا جائزہ لینے تھا مگر یہاں آ کر میں نے محسوس کیا کہ میں تو اسی کام سے متعلق ہوں اور یہ مجھے سیکھنا ہے، میں آپ کے پاس سیکھنے آیا ہوں، کیا آپ سکھائیں گے؟''

''لوگ کہتے ہیں محبت اور جنگ میں سب جائز ہے، ان دونوں میں ایک تیسری چیز کا بھی اضافہ کر لیں سر، محبت، جنگ اور جنون میں سب کچھ جائز ہے۔ مجھے فلائنگ کا جنون ہو گیا ہے سر اور اس کو سیکھنے کے لیے

میرے نزدیک سب کچھ جائز ہے، مجھے اصول و ضوابط کے کتابچے میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی۔''

''ابھی تک تو کوئی لڑکی والا معاملہ نہیں، ابھی تو اپنے یہ sesna (سیسنا) ہی حسینائیں نظر آتی ہیں جن کے عشق میں، میں گرفتار ہو گیا ہوں۔''

آوازیں، باتیں، قہقہے، ہنسی، مذاق وہ سب جو کہیں فضاؤں میں گم ہو گیا تھا اور وہ شخص جو بولتا، ہنستا اور مسکراتا تھا ایک زندہ لاش کی صورت ان کے سامنے پڑا تھا۔ وہ سب اتنے بے بس تھے، اتنے بے بس کہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے اور صرف کسی معجزے کے منتظر تھے۔ عافیہ نے قیوم کو ان خاتون کے بارے میں بتایا جو انہیں صوفی صاحب کے ہاں ملی تھیں۔

''بہت دعا کی ضرورت ہے، بہت دعا کی۔'' قیوم نے کہا۔

''وہ بھی نیک خاتون معلوم ہوتی تھیں، میرا دل اچانک چاہا کہ وہ یہاں آ کر دانیال کے لیے دعا کریں۔'' عافیہ کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

''ماما پلیز!'' ان کے دوسرے بیٹے عاصم نے انہیں شانوں سے تھام لیا۔ ''آپ نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ اب آپ نہیں روئیں گی، پلیز ماما۔''

''میں رو نہیں رہی ہوں بیٹا، میں امید و یاس کے ایک ایسے چکر میں پھنسی ہوں کہ مجھے ذرا سی روشنی بھی اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے اور میری آنکھیں جھلملانے لگتی ہیں۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا ماما، پلیز آپ خود کو سنبھالیں۔'' عاصم نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

''میں ٹھیک ہوں، بس اب میں ٹھیک ہوں۔'' انہوں نے بیٹے کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

اسی شام آزاد کشمیر والی خاتون بیگم اکرام اللہ اپنی پوتی کے ساتھ ان کے پاس آئیں۔ یقیناً دانیال کی حالت دیکھ کر انہیں جھٹکا لگا تھا۔ شاید وہ اتنی بری صورتِ حال کی توقع نہیں کر رہی تھیں مگر پھر انہوں نے خود کو سنبھال لیا۔

''اللہ کی مہربانی سے ناامید مت ہونا بیٹی، ناامیدی گناہ ہے۔ امید دیم کی یہ صورتِ حال تمہاری آزمائش بھی ہو سکتی ہے۔ کیا معلوم آزمائش پر پوری اترو تو خدا تم پر بڑا کرم کر دے۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولیں۔

''آپ بھی دعا کیجیے، میں بڑی آزمائش میں پڑ گئی ہوں، خدا میرا امتحان ٹال دے۔'' انہوں نے دانیال کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ بیگم اکرام اللہ جنہیں عافیہ اب خالہ جان کہہ کر پکار رہی تھیں نے اپنی کرسی دانیال کے قریب کر لی۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور وہ آنکھیں بند کیے کچھ پڑھ رہی تھیں، اس اثنا میں عافیہ ان کی پوتی سے باتیں کرتی رہیں۔ بیگم اکرام اللہ نے عافیہ کو دانیال کے لیے پڑھنے کی کچھ دعائیں بتائیں اور اس کے بعد اُن کا عافیہ کے پاس آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

☆☆☆

''فرینڈز کیفے میں کوئی تمہارا منتظر ہو گا۔ اس سے ملنے کے لیے شام چھ بجے تم ضرور وہاں پہنچ جانا۔'' زرنگار نے مہرزاد خان کا میسج اپنے موبائل پر پڑھا۔

''وہ کون ہو سکتا ہے جو میرا منتظر ہو گا۔'' اس نے سوچا۔ اس پیغام نے اسے تذبذب میں ڈال دیا تھا...

مہزاد خان کو اِدھر آئے کافی دن گزر چکے تھے اور امراؤ بیگم کا اس پر دباؤ بڑھنے لگا تھا۔ امراؤ بیگم اب ہر حال میں زرنگار کو اپنی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ بنانا چاہتی تھی، زرنگار کے مسلسل انکار نے اب اسے برافروختہ کر

ڈالا تھا۔ اب تک اس نے زرنگار کے ساتھ انتہائی نرم اور مشفقانہ رویہ روا رکھا تھا، وہ جانتی تھی کہ زرنگار پڑھی لکھی تھی اور اس کا دور دور تک اس پیشے سے کوئی تعلق نہ تھا، ایسی لڑکیاں اس ماحول سے مانوس ہونے میں بہت وقت لیتی تھیں اور ان کی تربیت ایک صبر آزما کام تھا، زرنگار خوب صورت تھی اور اسے گفتگو کا ڈھنگ آتا تھا۔ وہ اس نادر ہیرے سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتی تھی اور مناسب موقع کی تلاش میں تھی۔ اسے اپنی عقل پر غصہ بھی آتا تھا، وہ کیوں مہرزاد خان کے دیے لالچ میں آ گئی تھی۔ مہرزاد خان سے کیے قول سے پھرنا بھی اس کے لیے مشکل تھا، وہ اس پس منظر سے تعلق رکھتا تھا جہاں گولی کی موت ایک معمولی اور عام سی بات سمجھی جاتی تھی۔ امراؤ بیگم کا یہ نیا ٹھکانا مہذب امرا کے رہائشی علاقے میں تھا، یہاں ایسا کوئی جھگڑا فساد اس کے بوریا بستر گول ہو جانے کے مترادف ہوتا۔ وہ اسی لیے زرنگار کو دبے لفظوں میں اکساتی تھی مگر وہ دیکھ رہی تھی کہ زرنگار کی نگاہیں مہرزاد خان کی شخصیت سے پرے کچھ نہیں دیکھتی تھیں۔ وہ اس کے جال میں الجھ گئی تھی۔ یہ بات خطرے کی علامت تھی، امراؤ بیگم جانتی تھی کہ پیشہ ور عورت صرف ایک کے بستر کی ہو جائے تو اس کی تباہی میں کوئی شک نہیں رہتا۔ وہ اپنی بیٹیوں اور اپنے پاس موجود دوسری لڑکیوں کو ایسی بے شمار کہانیاں سناتی رہتی تھی جن میں چند روز کے مہمانوں کے جال میں پھنس جانے والیوں کی تباہی کا قصہ ہوتا۔ ''طوائف شریف خاندانوں کی فرد کبھی نہیں بن سکتی، جو ایسا کرنے کی کوشش کرتی ہے منہ کے بل گرتی ہے۔'' اس کی ہر کہانی کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا تھا اس کے پاس موجود لڑکیاں اس سنہری قول کو سمجھ چکی تھیں مگر زرنگار کا معاملہ اور تھا جتنی وہ خوب صورت تھی، اتنا ہی زیادہ اس کا نخرہ تھا، اس کے اور چھور کی امراؤ بیگم کو کم ہی سمجھ آتی تھی مگر یہاں موجود ہونے کے سلسلے میں زرنگار ابتدائی ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد مکمل شکست قبول کر چکی تھی اس لیے امراؤ بیگم اس کے یہاں سے فرار ہو جانے کا سوچ کر بھی پریشان نہیں ہوتی تھی اسی لیے وہ جب بھی اور جہاں بھی جانے کا کہتی تھی امراؤ بیگم اسے گاڑی اور ڈرائیور فوراً مہیا کر دیتی تھی۔

اس شام بھی زرنگار نے امراؤ بیگم سے گاڑی اور ڈرائیور مانگے تھے جو اسے فوراً مل گئے تھے۔ زرنگار مہرزاد خان کے غائب ہو جانے پر پریشان تھی اسی لیے اس کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گئی تھی۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کی پتلی ہلنے لگی تھی اور دائیں پاؤں کا انگوٹھا بھی حرکت کرنے لگا تھا، اپنے اردگرد گونجنے والی کسی بلند آواز پر اس کا جسم ردِعمل ظاہر کرنے لگا تھا۔ ڈاکٹرز نے عافیہ اور جہانگیر کو یہ بات انتہائی خوشی کی ساتھ سنائی تھی۔

''یہ بڑی کامیابی ہے، ہم چاہتے تھے کہ وہ ایسے ہی ردِعمل ظاہر کرے، اب آگے قوی امید ہے۔'' ڈاکٹر سرفراز نے انہیں بتایا تھا۔

''اب آگے کیا ہوگا؟'' عافیہ کے لیے چھوٹی سی کامیابی کی یہ خبر بھی بہت اہم اور بڑی تھی۔

''جسم کے حیاتی نظام کا تعلق براہِ راست دماغ کے ساتھ ہوتا ہے۔ دانیال کے ردِعمل ظاہر کرتے ہیں اس کا دماغ ویوز کو وصول کر رہا ہے، اب اس میں آگے مزید بہتری پیدا ہوگی انشاء اللہ جس روز وہ ویوز کو وصول کرنے لگ گیا، اسی روز اس کی تیزی سے صحت یابی کی صورت پیدا ہو جائے گی۔'' ڈاکٹر سرفراز، جہانگیر کو سمجھا رہے تھے۔

''آپ فکر نہیں کریں مسز جہانگیر، ایک روز آئے گا جب دانیال اٹھ کر چلے گا۔ نہ صرف چلے گا بلکہ آرٹ

کی دنیا میں بڑا نام پیدا کرے گا۔'' اب وہ عافیہ کو تسلی دے رہے تھے۔ عافیہ اب صرف دانیال کی صحت اور زندگی کی خواہشمند تھیں، آرٹ کی دنیا میں نام پیدا کرنے کی خواہش کہیں بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچتیں، کیا کبھی اپنی زندگی میں وہ دانیال کو صحت مند اور چلتا پھرتا دیکھ سکیں گی۔ اس سوال کے آگے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان تھا، اس سوال کا جواب کوئی نہیں دے سکتا تھا اور جہاں سے اس سوال کا جواب آنا تھا وہاں ان کی دستک روز بروز زور پکڑتی جا رہی تھی۔

بیگم اکرام اللہ واپس آزاد کشمیر جا چکی تھیں مگر ان کا عافیہ سے مسلسل فون پر رابطہ رہتا تھا۔ ان کی شخصیت میں عافیہ کو نہ جانے کیوں ایک پناہ سی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ ان کی باتیں دھیان سے سنتی اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتیں اور انہیں محسوس ہوتا تھا کہ دانیال کے ساتھ ہونے والے حادثے نے انہیں جس شدت کی بے چینی اور بے سکونی میں مبتلا کر دیا تھا، بیگم اکرام اللہ کی کہی باتوں پر عمل کر کے ان کی بے چینی اور بے سکونی کی شدت میں کمی ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ اب اس بات کو بھی خدائی مدد سمجھنے لگی تھیں کہ ان کی ملاقات بیگم اکرام اللہ سے ہوئی۔ ان کے اپنے حلقے میں ایسی کوئی شخصیت موجود نہیں تھی جو اُن کے دکھ کو اس طرح محسوس کرتی جیسے بیگم اکرام اللہ نے کیا تھا۔

☆☆☆

''تمہیں سیاست میں کوئی دلچسپی ہے؟'' اس روز دانیال نے اچانک بینش سے پوچھا تھا۔

''نہیں۔'' بینش نے ہمیشہ کی طرح مختصر جواب دیا تھا۔ وہ ابھی مشاہدہ کرنے میں مصروف تھی اس لیے مختصر بات کرتی تھی۔

''کیوں؟''

''بس یونہی کبھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں، آپ کو ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہاں!'' وہ مسکرایا۔ ''مجھے ہے، میں دنیا کے بڑے بڑے سیاستدانوں کے حالات پڑھتا رہتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ مختلف کامیاب سیاستدانوں کی شخصیتوں میں کیا چیز، کیا بات مشترک ہے۔''

''پھر آپ کو پتا چلا؟'' بینش نے پوچھا۔

''ہاں پتا چلا اور اتفاق سے کچھ باتیں سب میں مشترک ہیں، اسی لیے جب میں کسی نئی سیاسی شخصیت کو دیکھتا ہوں تو مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کامیاب رہے گی یا نہیں۔''

''یہ تو بہت اہم بات ہے۔'' بینش نے بے ساختہ کہا۔

''اب اس شخصیت کو دیکھو۔'' اس نے صبح کا اخبار کھول کر میز پر پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ سردار مہرزاد خان ہے، آج کل اس کا نام مستقبل کے ایک بڑے سیاستدان کے طور پر لیا جا رہا ہے۔'' بینش نے اخبار اپنے سامنے کھسکایا، یہ چہرہ اس نے ایک دو بار ٹی وی کے ٹاک شوز میں دیکھا تھا۔

''کیا خیال ہے یہ کامیاب رہے گا یا نہیں؟'' بینش نے پوچھا۔

''بہت کامیاب رہے گا۔'' دانیال نے یقین کے ساتھ کہا۔

''مگر یہاں تو اس کے کسی اسکینڈل کا ذکر ہے، کیا اسکینڈلائز شخص ہی کامیاب سیاستدان بن سکتا ہے؟'' بینش نے اخبار پڑھتے ہوئے کہا۔

''کچھ اسکینڈلز شخصیات کو اہم بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔'' دانیال نے کہا۔ ''اور آج کل تو اسکینڈل بنائے ہی اوور پروجیکشن کے لیے جاتے ہیں۔''

''مگر یہ تو کسی کال گرل......'' بینش کہتے کہتے رک گئی۔

''ہاں یہ بات اہم ہے، اب دیکھنا یہ پڑے گا کہ یہ خاتون کون ہیں؟'' دانیال نے اخبار پر دوبارہ نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

''آپ کیسے دیکھیں گے جبکہ یہاں اس کا کوئی نام نہیں، مشکل نہیں ہے؟''

''دیکھ لیں گے، دیکھ لیں گے، یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں، اس کا پتا بھی چل ہی جائے گا۔'' اس نے اخبار سمیٹتے ہوئے کہا۔

''کال گرلز کے متعلق کیسے پتا چلتا ہے اور کہاں سے پتا چلتا ہے؟'' بینش پوچھنا چاہتی تھی مگر ایسا کوئی سوال کرتے ہوئے اسے جھجک محسوس ہوئی اور اس نے اس سوال کو دل ہی میں رہنے دیا لیکن یہ سوال اس کے ذہن میں اٹک کر رہ گیا۔ دانیال اس لڑکی کے متعلق کہاں سے اور کیسے پتا کرے گا۔ وہ اتنے عرصے میں اپنے محلے سے باہر کی دنیا کے بارے میں کافی کچھ جان گئی تھی اور اپنے ذہن میں اٹھتے سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کی کوشش میں مصروف رہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے روز بروز بڑھتے اعتماد میں دانیال کی دوستی کا بڑا ہاتھ تھا۔

☆☆☆

نادر نے خود سے کئی مرتبہ یہ سوال کیا تھا کہ اس نے زوئی سے نکاح کیوں کیا۔ کیا وہ زوئی کی بے بسی سے متاثر ہو گیا تھا؟ یا نیکی کمانا چاہتا تھا یا اس کے دل نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ زوئی جیسی بے ضرر لڑکی سے نکاح کرے۔ اسے خود سے کوئی حتمی جواب کبھی نہیں ملا تھا مگر یہ بات طے تھی کہ اس نے زندگی میں کبھی یہ نہیں سوچا

تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کی رضامندی کے بغیر کوئی کام خصوصاً شادی جیسا اہم کام کرے گا مگر اب وہ ایسا کر چکا تھا۔

زوئی کے گھر سے واپسی پر اس کی آپا نے اسے سخت سست سنائی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اسے زوئی جیسی معمولی شکل اور دوسری تہذیب سے تعلق رکھنے والی لڑکی سے شادی کرنے کا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ وہ اس بات کو سوچ کر بھی برافروختہ ہوتی رہتی تھیں کہ زوئی سے شادی کے نتیجے میں وہ ایک مخلوط نسل کو دنیا میں لانے کا باعث بنے گا جو اُن کے لیے قطعی ناقابلِ قبول تھا۔ آپا نے واپس آ کر امی کو بھی اس سلسلے میں بھڑکا دیا تھا اور بات بالکل ہی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ نادر کے والد کا انتقال کئی سال پہلے ہو چکا تھا، وہ پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا اور بہنوں کا بہت لاڈلا بھی۔ اس نے میڈیکل کالج میں داخلے میں ناکامی کا سامنا کرنے کے بعد فارمیسی کی تھی اور اب اسی دواساز ادارے سے منسلک تھا جہاں زوئی کام کرتی تھی۔ گھر میں وہ اپنی امی کے ساتھ رہتا تھا، اتفاق سے اس کی پانچوں بہنیں لاہور میں ہی رہتی تھیں اور اکثر و بیشتر اپنی والدہ کے پاس ان کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ حقیقت میں گھر کا سارا نظام بہنوں کے مشوروں پر ہی چلتا تھا، ایسے میں نادر کا اپنی بات پر اصرار کرنا تقریباً ناممکن تھا مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ زوئی سے شادی کے خیال کو دل سے نکال نہیں پایا۔ شاید اسی لیے اس نے زوئی کی واپسی کے پیشِ نظر عجلت میں وہ فیصلہ کر لیا تھا جس پر بعد میں وہ کئی دن تک سوچتا رہا تھا مگر اب جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ بہت دن سوچتے رہنے اور پریشان رہنے کے بعد اس نے یہ معاملہ خدا پر چھوڑ دیا۔ اپنے گھر میں اس نے پھر کبھی زوئی کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ خود زوئی سے اس کا نیٹ پر رابطہ رہتا تھا۔ وہ بار بار اپنے شکر گزار ہونے کا اظہار کرتی اور اسے جلد از جلد کاغذات مکمل کروانے کی تاکید کرتی، وہ یقیناً فوری طور پر واپس آنا چاہتی تھی۔ نادر اس سلسلے میں اپنے کسی قریبی دوست کو اعتماد میں لینا چاہتا تھا۔ ابھی وہ اسی سوچ میں تھا کہ کس دوست سے بات کرے اس کی امی کی طبیعت بگڑ گئی، وہ سردی لگ جانے کے باعث نمونیے کا شکار ہو گئی تھیں، نادر اُن کی تیمارداری میں مصروف رہا، اسی وجہ سے کئی دن نکل گئے۔

اس روز اس کا مکمل ارادہ تھا کہ وہ آفس جا کر اپنے قریبی دوست طاہر سے اس سلسلے میں بات کرے گا مگر وہ تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچا ہی تھا کہ اطلاعی گھنٹی کی آواز نے اسے بیرونی دروازے پر پہنچا دیا۔ اس کے سامنے تین نامانوس چہرے تھے۔

''ہم میرال صلاح الدین کیس کے سلسلے میں آپ تک پہنچے ہیں۔'' ان میں سے ایک نے اپنا کارڈ نادر کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''کون میرال صلاح الدین؟'' نادر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''شاید آپ نہ جانتے ہوں مگر آپ کی منکوحہ زوئی حسین ضرور جانتی ہیں۔'' دوسرا شخص بولا۔

نادر کے عقب میں کھڑی بڑی آپا کے ہاتھ سے چھری چھوٹ کر نیچے جا پڑی۔

''ہمیں امید ہے آپ ہم سے تعاون کریں گے۔'' پہلے شخص نے کہا۔

نادر کو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا سوائے اس کے کہ وہ نادانستگی میں کچھ غلط کر بیٹھا تھا، بہت ہی غلط......

☆☆☆

ان اسٹیٹ آف دی آرٹ کچن میں وہ اپنی مرضی چلانے پر مختار تھا۔ اس کو کنگ چینل کے لیے ایک کوکنگ شو کرنے کا معاوضہ مہینے بھر کا خرچہ عیاشی سے چلانے کے لیے کافی تھا اور وہ مہینے میں چار شو کیا کرتا تھا۔ شروع

میں اسے ان چار شوز کے لیے اتنی مغز ماری کرنی پڑتی تھی کہ کئی بار اس کا دل اس معاہدے سے بھاگ جانے کو چاہتا تھا جو اس نے اس چینل سے کر رکھا تھا مگر پھر آہستہ آہستہ وہ ان تمام اجزائے ترکیبی سے واقف ہو گیا جو مہینے کے چاروں شوز کو کامیاب کرنے میں اہم کردار ادا کرتے تھے اور اب تو یہ عالم تھا کہ وہ مختلف چینلز کے لیے ایک پُرکشش ذریعۂ آمدن کا نشان بن چکا تھا۔ ایک چینل سے معاہدے کی مدت پوری کرنے کے دوران اسے کئی چینلز سے پُرکشش ادائیگی کی دعوت مل چکی تھی مگر اسے ابھی ٹھیک طرح سے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کی زندگی کی ترجیحات کیا ہیں اور انہیں درجہ بدرجہ کس ترتیب سے رکھنا ہے۔

وہ کراچی جیسے بڑے شہر میں ایک کشادہ، خوب صورت، نفاست اور جدید خطوط پر سجے اپارٹمنٹ کا مالک تھا۔ اس کے پاس ایک بڑی کمپنی کی بہترین کار کا جدید ترین ماڈل موجود تھا، وہ ڈیزائنرز کلاتھ پہنتا تھا اور برانڈڈ جوتے اس کے پیروں کی زینت بنتے تھے۔ اتفاق کی بات یہ تھی کہ یہ سب اسے بہت امیر ماں، باپ کی اولاد ہونے کے نتیجے میں ملا تھا نہ ایک پاکستانی کوکنگ چینل پر کوکنگ شو سے ملنے والے معاوضے کو جمع کر کے اس نے خریدا تھا۔ وہ پاکستان تقریباً گیارہ برس بعد واپس آیا تھا، اس کے والد اس وقت ایبٹ آباد چھوڑ کر تھائی لینڈ گئے تھے جب اس کی عمر صرف چھ برس تھی اس کے بابا تلاشِ روزگار میں تھائی لینڈ گئے اور چند سال وہاں گزارنے کے بعد اٹلی کا رخ کر گئے۔ تیرہ سال کی عمر تک وہ اپنی والدہ اور چھوٹی بہن کے ساتھ ایبٹ آباد میں رہا، پہلے تھائی لینڈ اور پھر اٹلی سے آنے والے پیسوں کی بدولت ان کی زندگیاں آسان گزر رہی تھیں۔ پھر ماما کو کہیں سے اڑتی اڑاتی خبر ملی کہ بابا تھائی لینڈ چھوڑنے سے پہلے ایک مقامی تھائی خاتون سے عقدِ ثانی کر چکے تھے۔ ماما کا ردِعمل اچانک اور فہد کو بعد میں آنے والی عقل کے مطابق بچگانہ اور جذباتی تھا۔ ماما نے... فی الفور ایبٹ آباد کا گھر چھوڑ دینے اور بابا سے لاتعلقی اختیار کر لینے کا اعلان کیا اور عجلت میں ایبٹ آباد چھوڑ کر نانا، نانی کے پاس کراچی شفٹ ہو گئیں۔ اس وقت فہد کی عمر تیرہ برس تھی۔ ایبٹ آباد اس کا اپنا شہر تھا، جہاں وہ پیدا ہوا اور تیرہ برس تک رہا تھا۔ وہاں اس کے دوست تھے، استاد اور اسکول تھا، وہ ان تینوں سے اتنا مانوس تھا کہ ایبٹ آباد سے چلے جانے کے بعد کئی مہینے مسلسل وہ بسترِ علالت پر ہی رہا تھا۔ اس کا بخار جانے کا نام نہ لیتا تھا اور قوتِ گویائی جیسے ختم ہو گئی تھی۔

''تمہاری ماں پر بڑا کڑا وقت پڑا ہے میری جان!'' نانی اس کی پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کرتیں۔ ''تم اب بہت چھوٹے بچے نہیں ہو، تم بڑے ہو چکے ہو اور تمہیں اپنی ماں کا ساتھ دینا ہے۔''

''کڑا وقت پڑے تو لوگ اپنا گھر اور اپنا شہر تو نہیں چھوڑتے ناں؟'' وہ بخار سے سرخ پڑتی آنکھیں کھول کر کہتا۔

''چھوڑنا پڑتا ہے میرے بچے کبھی کبھار۔'' وہ اس کی پیشانی پر پڑے سیاہ بال پیچھے ہٹاتے ہوئے کہتیں۔ ''تم اپنے ذہن میں یہ بات بٹھا لو کہ اب تم کو اپنی ماں کا اور چھوٹی بہن کا خیال رکھنا ہے۔'' نانی چپکے چپکے اسے یاد کراتیں۔

اس کے ذہن نے بہت آہستہ آہستہ زندگی میں در آنے والی تبدیلیوں کو قبول کیا تھا مگر قبول کر لینے کے اس عرصے کے دوران اس کے دل میں کئی بار بہت سے باغیانہ خیال بھی ابھرے تھے۔ گھر سے بھاگ کر واپس ایبٹ آباد چلے جانے کا خیال، اٹلی جا کر بابا کے پیٹ میں چھرا گھونپ دینے کا خیال، نانا کے ساتھ کبھی کبھار تفریح کے لیے ساحلِ سمندر پر جانے کے دوران سمندر میں چھلانگ لگا کر اپنی زندگی ختم کر دینے کا خیال، کتا

بہاں بعد وہ اپنے ذہن میں آنے والے خیالات کو یاد کر کے تنہا بیٹھا ہنستا رہتا۔

کراچی آنے کے بعد ماما نے ایک پرائیویٹ کالج میں جاب کر لی، وہ خود اور اس کی چھوٹی بہن نانا کے گھر کے قریب ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھنے لگے، اولیول کا خواب ادھورا رہ گیا۔ نانا نے اسے میٹریکولیشن کلاسز میں داخل کرا دیا۔ اسے سمجھ نہیں آتا کہ جو رقم بابا اب بھی بھجوایا کرتے، اسے قبول کیوں کیا جاتا تھا اور اگر قبول کر لیا جاتا تو پھر وہ اولیول جاری کیوں نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں سوال ابھرتے تھے مگر پھر ماما کی اچانک سے گرتی صحت نے اسے سوال کرنے، باغی خیالات کا شکار بننے اور ہر نئی صورتِ حال پر غصیلے ردِعمل ظاہر کرنے سے روک دیا۔ ماما کی کمزور صحت اور آئے دن بستر پر پڑ جانے کے معمول نے اسے دنوں میں احساس دلا دیا کہ وہ بڑا ہو چکا تھا اور اب ماما اور تحریم اس کی ذمے داری تھیں۔ نانا، نانی میں جب تک ہمت رہی، ان تینوں کا ساتھ دیتے رہے۔ نانی کی وفات کے بعد نانا بیمار اور چڑچڑے ہو گئے تو منجھلے ماموں ناروے سے آ کر انہیں اپنے ساتھ لے گئے، نانا کے ہاؤسنگ سوسائٹی والے گھر پر بڑے اور منجھلے ماموں نے کبھی اپنا حق نہیں جتایا، چھوٹے ماموں جو سری لنکا کی کسی علاقائی کرکٹ ٹیم کے کوچ تھے نے اپنی نوکری سے فارغ ہونے کے بعد ہاؤسنگ سوسائٹی والے گھر پر اپنا حق جتایا۔ اس وقت تک فہد خود ایم بی اے کے فائنل سمسٹر میں تھا اور تحریم میڈیکل کالج کے تھرڈ ائیر میں تھی۔ ماما کو معدے کی تکلیف نے کچھ کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا، آمدنی کا ذریعہ تھائی بھات اور اطالوی لیرے، بچا کر جمع کیے ہوئے وہ اکاؤنٹس تھے جن سے ماہانہ منافع کی شکل میں پیسے مل جاتے تھے۔ بڑے اور منجھلے ماموں کے سمجھانے کے باوجود چھوٹے ماموں اپنے دعوے سے دست بردار ...نہ ہوئے تو وہ بیمار ماں اور بہن کو لے کر ایک ایسے بڑے مکان میں شفٹ ہو گیا جہاں کئی فیملیز ایک، ایک کمرے میں کرائے دار کے طور پر رہتی تھیں۔ وہ بھی ایک کمرے میں اپنا مختصر سامان سیٹ کر کے رہنے لگے۔

بابا تک ان حالات کی خبر کس نے پہنچائی وہ نہیں جانتے تھے لیکن ایم بی اے فائنل کے امتحان کے فوراً بعد انہوں نے اسے تھائی لینڈ بلا لیا تھا۔ وہ اٹلی سے واپس تھائی لینڈ آنے کے بعد وہاں اپنا ایک ریسٹورنٹ چلا رہے تھے۔ فہد نے اس وقت پہلی بار اپنے باپ کو ایک بالغ ذہن اور نظر کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ اسے ایسے بھی بے نیاز اور لاتعلق انسان نہیں لگے تھے جیسا ماما نے انہیں اتنا عرصہ ثابت کیے رکھا تھا۔ ایک دو بار انہوں نے اسے اپنی کسی مجبوری کی داستان سنانے کی کوشش بھی کی تھی لیکن اس نے ان کی مجبوریوں میں دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ جو گزر چکا تھا وہ اس کتاب کے صفحے پلٹانے کی کوشش بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شاید اس کے پاس اس کے لیے وقت بھی نہیں تھا۔ اسے آگے بڑھنا تھا، اسے اتنا پیسہ کمانا تھا جس سے ماما کا علاج تواتر سے جاری رہ سکے اور تحریم کی تعلیم مکمل ہو جائے۔ ایک مقصد زندگی میں آ جانے کے بعد اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ بابا کے ریسٹورنٹ کو چلانے کا تجربہ اپنی جگہ، ریسٹورنٹ کے شیف سے دوستی نے اس کا دھیان کھانا بنانے اور کھانا بنانے میں شہ زور آزمائی لانے کی طرف لگا دیا۔ وہ فنانس اور بزنس بھول کر اس نئے میدان کا کھلاڑی بن گیا۔ تھائی لینڈ سے بنکاک، بنکاک سے اٹلی، اٹلی سے آسٹریلیا، چین اور پھر دبئی۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے میں صرف دو سے ڈھائی سال لگائے۔ تحریم ڈاکٹر بن گئی اور اس کی کامیابی کو اس کے ساتھ مل کر منانے کے لیے جب وہ پاکستان آیا تو اس کے پاس مختلف درجوں کے کوکنگ کورسز کے اتنے بے شمار سرٹیفکیٹس تھے کہ اس نے خود کو شہر کے ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ سرکل میں ایک سرٹیفائڈ کک کے طور پر جلد ہی متعارف کروا لیا۔ انہی دنوں اسے دو مختلف جگہوں سے دو پُرکشش جابز کی پیشکش ہوئی۔ ایک پرائیویٹ بینک کے ٹریژری برانچ پر کام کرنا اس کی

دیرینہ خواہش تھی، اس وقت بھی یہ خواہش اس کے دل میں ابھرتی تھی جب وہ آئی بی اے سے ایم بی اے کر رہا تھا۔ دوسری پیشکش ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ہفت واری براہِ راست کوکنگ شو میں باقاعدہ تنخواہ پر حصہ لینے کی تھی۔ یہ دو ایسی آفرز تھیں جنہیں بیک وقت قبول کر لینے اور نبھانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اس نے بابا کے پاس واپسی کا ارادہ موخر کرتے ہوئے یہ دونوں آفرز قبول کر لیں۔ اس کے پاس گھاٹ گھاٹ سے جمع کیا ہوا پیسہ بھی تھا۔ وہ اپنی ماں اور بہن کو اے کلاس لیونگ دینے کے قابل تھا۔ مختلف خاندانوں کے ساتھ ایک مشترک گھر کا ایک کمرا شیئر کرنے کے اسٹینس سے اٹھ کر وہ اس لگژری اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئے جو اس نے ہی ڈیویم کرائے پر لیا تھا۔ وہ دونوں جابز جنہیں اس نے اپنے گزشتہ تجربوں کی روشنی میں بخوبی نبھانا شروع کیا تھا۔ اس کے بینک اکاؤنٹس کا حجم بڑھانے کے لیے کافی تھیں۔ تحریم اور ماما، اس کو جب شیف نائف سیٹ کی مختلف چھریوں سے سبزیوں کی کٹائی اور گوشت کے باریک نفیس پارچے کاٹتے دیکھتیں تو انگشت بدنداں رہ جاتیں۔ تحریم اسے ایک بڑے فنکار کا ٹائٹل دیتی تھی جبکہ ماما کو اس کا یہ ہنر پسند نہیں آیا تھا۔

''تم وہ کام اتنے فخر سے کرتے ہو جن کے لیے شرفا اور امرا خانساماں تنخواہ پر رکھا کرتے تھے۔'' وہ ناراض لہجے میں کہتیں۔

''آپ غور کریں تو دنیا کا ہر جدید پیشہ، کسی ایسے ہی قدیم پیشے کی ترقی یافتہ شکل نظر آئے گا جس کے لیے شرفا اور امرا موتیوں کی مالائیں اور اشرفیوں کی پوٹلیاں دان کیا کرتے تھے۔'' اس نے ایک بار مسکرا کر ماما کو جواب دیا تھا۔ ماما اس کے جواب سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی تھیں۔ اگر اس کے اس شوق کے ساتھ ساتھ اس کی بینک جاب نہ چل رہی ہوتی تو یقیناً ان کے دل میں اس کی کمائی کے حوالے سے ایک دکھ کا احساس زیادہ شدید ہوتا لیکن اس کے شوق اور ہنر پر ناراضی کا اظہار کرنے کے لیے ماما زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکیں۔

پاکستان واپسی کے چھ ماہ بعد معدے کا کینسر جس سے وہ کئی سالوں سے لڑ رہی تھیں۔ بالآخر ان کی زندگی کو شکست دے گیا۔ وہ بابا سے علیحدگی اختیار کرنے پر، ایبٹ آباد والا گھر چھوڑ آنے پر اور ماما کے خود کو عام سے اسکول میں داخل کرا دینے پر کتنا ہی ناراض کیوں نہ تھا، وقت گزر جانے کے ساتھ ساتھ اسے انسانوں کے ایسے عملوں اور ردِعمل کی وجوہات سمجھ آنے لگی تھیں جن کو وہ اس ناپختہ عمر میں نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اگرچہ وہ اب سمجھتا تھا کہ ماما، بابا کی دوسری شادی کو ایک حقیقت جان کر قبول کر لینے کے بعد بابا ہی کی کمائی پر بہت زندگی بھی گزار سکتی تھیں مگر وہ ماما کے دل ٹوٹ جانے کی کیفیت کو کسی پیمانے کے ذریعے جان نہ سکنے کو ناکامی گردان کر انہیں بھی اتنے ہی نمبر دینے لگا تھا جتنے دوسری صورتِ حال کو دیتا تھا۔

ماما کے انتقال کے چھ ماہ بعد تحریم نے اپنے ایک کلاس فیلو ڈاکٹر سے شادی کر لی۔ تحریم کے شوہر کا ایک بھائی امریکا میں رہتا تھا۔ اس نے ان دونوں میاں بیوی کو اپنے پاس بلوا لیا۔ یوں پاکستان آنے کے صرف ایک ڈیڑھ سال کے اندر وہ اس شہر میں تنہا رہ گیا جس کی طرف ہجرت کے لیے آج بھی اس کے دل میں اتنی ہی کڑواہٹ تھی جتنی پہلی بار یہاں آنے کے وقت تھی لیکن اس نے اب تک خود کو ملکوں اور شہروں کے مزاجوں میں بسا لینے کا ہنر بھی جان لیا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں قدم جمانے کی جدوجہد کے سارے تجربے کو ایک جملے میں سمو کر کہا کرتا تھا۔

"when there is an aim, there is a heart"

(جہاں زندگی میں کوئی مقصد شامل ہو جاتا ہے، وہاں اس مقصد کو پا لینے کے لیے دل بھی حوصلہ پکڑ لیتا ہے۔)

تحریم کے چلے جانے کے بعد اس نے خود کو مزید مصروف کر لیا، جس چینل پر وہ اب تک ہفت وار کوکنگ

کر رہا تھا اس کی طرف سے بھی اسے انہی دنوں آفر آئی تھی، جن دنوں وہ آسٹریلیا میں تھا، ایک بار اس نے ایک چینل پر ہونے والے ماسٹر شیف مقابلے میں حصہ لیا تھا۔ اسے ان پروگرامز کی شوٹنگ کے دوران بہت مزہ آتا تھا، وہ مقابلہ تو خیر وہ نہیں جیت سکا تھا مگر اس پروگرام کی شوٹنگز کے دوران ہونے والے تجربات اس کی زندگی کے دلچسپ ترین تجربات میں شامل تھے۔ اسی لیے اس نے اس چینل کی آفر بھی قبول کر لی۔ اس اسٹیٹ ٹو آرٹ قسم کے کچن میں کوکنگ کرنا'، ناظرین کی کالز سننا اور ان کا جواب دینا بھی ایک دلچسپ تجربہ تھا اور اسی تجربے کے دوران اتفاق سے اس کا ناتا ایبٹ آباد سے پھر جڑ گیا تھا۔ اس کی بچپن کی کلاس میٹ علینہ سے اس کا رابطہ قائم ہوا اور علینہ سے ایبٹ آباد اور اس شہر کی یادیں ذہن میں دوبارہ زندہ ہونے لگی تھیں، انہی خوب صورت یادوں میں ایک یاد میرال کی بھی تھی۔ میرال جسے اپنے ایبٹ آباد کے زمانۂ طالب علمی میں وہ اس کی ذہانت اور خود اعتمادی کی وجہ سے آئیڈیلائز کیا کرتا تھا۔

☆☆☆

مہرزاد کے کہنے پر اس کے بتائے ہوئے ریستوران میں پہنچنے تک اس کے ذہن میں سوال تھے اور وہ انتشار کا شکار بھی تھا۔

''میرا منتظر، مہرزاد کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔'' خدشے بھی تھے اور اعتماد بھی تھا۔ ''مہرزاد کسی غلط انسان کو مجھ سے ملاقات کے لیے نہیں بھیج سکتا۔'' فریڈیز کیفے کے انٹرنس پر کھڑے ہو کر اس نے آخری بات سوچی تھی اور ذہن سے تمام سوال اور خدشات جھٹک کر اس ٹیبل کی طرف بڑھ گئی جس کے بارے میں اسے ریسپشن پر بتایا گیا تھا اس کے لیے ریزروڈ تھی۔ اس ٹیبل پر ایک لڑکی اس سے پہلے بیٹھی اپنے موبائل پر مصروف تھی۔ ذہن ایک بار پھر کنفیوژن کا شکار ہوا لیکن اب وہ اِدھر آ چکی تھی اس لیے آگے بڑھ کر اس لڑکی کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

''میں زرنگار ہوں۔'' اس نے دھوپ کا چشمہ میز پر رکھتے ہوئے اس لڑکی کو مخاطب کیا۔

''اوہ!'' لڑکی کا دھیان موبائل فون کی اسکرین سے ہٹا۔ ''آئی ایم سوری مجھے خبر نہیں ہوئی آپ آ چکی ہیں۔''

''جی میں دیکھ چکی تھی کہ آپ اپنے کام میں محو تھیں۔'' اس نے کہا۔

''میں بس آپ کے انتظار میں تھی اور اسی انتظار کی کوفت سے بچنے کے لیے دھیان اِدھر لگا لیا۔'' اس نے چلتے ہوئے فون بند کیا اور سر اٹھا کر زرنگار کو دیکھنے لگی۔

''کیا میں آپ سے تعارف حاصل کر سکتی ہوں اور کیا آپ وہی ہیں جنہیں سردار مہرزاد نے یہاں مجھ سے ملاقات کے لیے بھیجا ہے۔'' زرنگار نے اس کی محویت توڑتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں ضرور!'' وہ چونکتے ہوئے بولی۔ پھر اس نے دائیں بائیں دیکھا اور کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اپنے موبائل فون پر کچھ الفاظ ٹائپ کیے اور زرنگار کی نظروں کے سامنے فون رکھ دیا۔

''میرا نام ہیتل رئیس ہے اور میں سردار مہرزاد کی پریس سیکرٹری کے طور پر کام کر رہی ہوں۔'' زرنگار نے وہ ٹائپ شدہ الفاظ پڑھے اور ہلکا سا مسکرائی۔

''اوہ...... اس کا مطلب آپ سردار مہرزاد کا دفاع کرنے پر مامور ہیں۔''

''آپ کے بارے میں جتنا سنا تھا آپ اس سے زیادہ ذہین معلوم ہوتی ہیں۔'' ہیتل نے لہجے جبر کے لیے کھنکنے کے بعد کہا۔

''اچھا......'' اس نے حیران ہونے کا اظہار چہرے کے تاثرات کے ذریعے کیا۔ ''آپ نے میرے بارے میں کچھ سنا۔''

''کچھ نہیں، بہت کچھ۔'' یشل نے پُراعتماد انداز میں کہا۔

''ہوں......'' اس نے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا اور پھر یشل کی طرف دیکھا۔ ''پھر تو آپ مجھے خوب جانتی ہوں گی۔''

''آپ کی آواز اتنی پست کیوں ہوگئی اور لہجہ کمزور۔'' یشل مسکرائی۔ ''سردار مہر زاد جس بھی شخصیت کو اسپیشل قرار دے دیں، ان کی آواز اتنی نیچی اور لہجہ ایسا کمزور تو نہیں ہونا چاہیے۔''

''طنز کر رہی ہیں؟'' زرنگار نے میز پر رکھے کلچ کو الٹتے پلٹتے ہوئے کہا۔

''حیران ہو رہی ہوں، طنز نہیں کر رہی۔'' یشل نے تصحیح کی۔

''میرا خیال ہے ہمیں سیدھی بات کرنی چاہیے، مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟'' زرنگار نے توقف کرتے ہوئے لمحے بھر کے لیے اسے غور سے دیکھا اور آنکھیں جھپکانے کے بعد دوبارہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''ہاں ضرور......'' یشل نے سر ہلاتے ہوئے اس کی پہلی بات کا جواب دیا اور بازو موڑ کر میز پر رکھتے ہوئے زرنگار کی طرف جھکی۔ ''آپ جانتی ہیں کہ سردار مہر زاد آپ کے کتنے قریب ہیں، پھر آپ کو یہ کیسے نہیں پتا کہ آپ کو یہاں کیوں بلوایا گیا ہے۔''

''شاید انہیں پہیلیاں بجھوانے کا شوق ہو۔'' زرنگار نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے مجھے واقعی نہیں پتا۔''

''ایک پہیلی تو آپ خود ہیں زرنگار، جس کو سردار صاحب کسی سے نہیں بجھوا رہے، خود بوجھنے کی کوشش میں ہیں۔'' یشل نے برجستہ کہا۔

زرنگار نے اپنی خوب صورت آنکھوں کے بھاری پپوٹے اٹھاتے ہوئے اوپر دیکھا یشل نے دیکھا ایسا کرنے سے اس کی گردن بالکل سیدھی ہوگئی تھی۔

''کتنی لمبی اور خوب صورت گردن ہے اس کی۔'' اس نے سوچا۔ ''یہ لڑکی واقعی ایک ایسے حسن کا شاہکار ہے جو بناؤ سنگار کا محتاج نہیں ہوتا۔''

''ایک بات بتاؤں یشل!'' پھر وہ یشل کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''انسان پہیلیاں ہوتے نہیں، انسان پہیلیاں بنا دیے جاتے ہیں۔''

یشل نے اس کی بات سن کر یوں سر ہلایا جیسے اس کی بات سمجھ رہی ہو۔

''انسان تو سب کے سب ایک ہی فطرت پر پیدا ہوتے ہیں، کم یا زیادہ ایک جیسے اعضا کے ساتھ۔'' پھر وہ شاید اپنی بات کی وضاحت کرنے لگی۔ ''خوبیاں اور خامیاں جو عادات و مزاج کا حصہ بنتی ہیں وہ انسان پیدائشی طور پر ساتھ نہیں لاتا۔ اپنے ماحول سے، اپنی تربیت سے، اپنے حالات سے اڈاپٹ کرتا ہے، خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جو ایک سا ظاہر باطن، صاف شفاف شخصیت، قسم کھا کے نام لیے جانے والا کردار رکھتے ہیں اور......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''اور بد قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جو پہیلی بن جاتے ہیں۔'' الفاظ یشل کے منہ سے بلا ارادہ پھسل گئے، وہ زرنگار کی بات مکمل کرنے کا کوئی ارادہ کیے بغیر اس کی بات مکمل کر گئی۔

''شاید تمہیں سردار مہر زاد سے میرے سلسلے میں اختلاف ہے۔'' زرنگار نے چونک کر اسے دیکھا۔

''so wise you are'' جواب یشل کے ذہن میں کلبلایا لیکن اس نے اس جواب کو

زبان پر آنے روک دیا۔ ''میں آپ کو ہرٹ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔'' اس نے الفاظ کا لباس تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ سردار مہر زاد کے اب تک کے فیصلے دیکھ سن کر ہی میں نے ان کی جاب آفر قبول کی تھی۔''

''پھر اختلاف کہاں ہے؟'' زرنگار نے پُراعتماد انداز میں یوں سوال کیا جیسے اسے یقین تھا کہ یشل کو اس کے وجود سے کچھ اختلاف ضرور تھا۔

''میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں اور میری ڈیوٹی کے کچھ اصول و ضوابط ہیں، جن کو پڑھنے اور ان پر تفصیل سے بات کرنے کے بعد ہی میں نے اس کاغذ پر دستخط کیے تھے جس کو اپائنٹمنٹ لیٹر کہتے ہیں۔'' یشل نے جواب دیا۔

''تو ٹھیک ہے پھر جب کبھی ڈیوٹی سے آف ہو پھر بتانا اختلاف کیا ہے۔'' زرنگار نے کہا۔ ''یہ میرا نمبر...'' اس نے اپنا نمبر یشل کو دینا چاہا۔

''ایک سنٹ پلیز......'' یشل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے منع کرتے ہوئے کہا۔ ''یہی بات آپ کو بتانے کے لیے آج مجھے بھیجا گیا ہے۔''

''کون سی بات......؟'' اس نے بھاری پپوٹے اٹھائے۔

''آپ ہر کسی کو اپنا نمبر دینے میں جلدی نہ کیا کریں، یہ بے احتیاطی ہوتی ہے۔''

''میں ہر کسی سے ملتی کہاں ہوں جو نمبر دینے لگوں۔'' اس نے برا مناتے ہوئے کہا۔

''میں بھی تو ہر کسی ہو سکتی ہوں۔'' یشل نے جتایا۔

''تمہیں تو سردار مہر زاد نے بھیجا ہے۔''

''ہو سکتا ہے اس نے نہ بھیجا ہو۔'' اس نے مزید جتایا۔ ''ہو سکتا ہے جسے اس نے بھیجا ہو اسے اغوا کر لینے کے بعد مجھے یہاں بھیج دیا گیا ہو، ہو سکتا ہے میں سردار مہر زاد کے مخالفین میں سے ہوں۔'' اس نے کہتے کہتے غور سے زرنگار کو دیکھا جو نارمل انداز میں اس کی بات سن رہی تھی۔ ''ہو سکتا ہے میرے ذریعے آپ کا نمبر ان لوگوں تک پہنچ جائے جو سردار مہر زاد کو تباہ کر دینا چاہتے ہوں۔'' اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''ممکنات کی تو کوئی حد ہی نہیں ہے میم...... خصوصاً سردار مہر زاد کے سلسلے میں...... اور آپ تو خود بھی کتنے ہی ایسے مراحل سے گزر چکی ہیں جن سے گزرنے کے بعد آپ کو پھونک پھونک کر قدم رکھنے جیسے جملے کی سمجھ آ چکی ہوگی۔'' اس نے اپنی بات مکمل کی۔

''مرحلے...... گزر چکی۔'' زرنگار نے اس مرتبہ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''اوہ معذرت خواہ ہوں۔'' اس نے ہونٹ دانتوں تلے دبائے۔ ''ڈیوٹی پر ہوں مگر آف ڈیوٹی بات کر گئی۔''

''خیر!'' پھر اس نے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا اور اپنے بیگ سے ایک قیمتی فون کا ڈبا نکال کر زرنگار کی طرف کھسکایا۔ ''یہ آپ کے لیے ہے۔'' اس نے اسے دیکھا۔ ''اس میں موجود ''سم'' اتنی خصوصی ہے کہ آپ سے التجا ہے اسے کسی گمنام آشنا کو مت دیجیے گا، اس نمبر پر جو مجھے بھی معلوم نہیں صرف سردار صاحب ہی آپ سے رابطہ کر سکتے ہیں۔''

زرنگار نے ایک نظر اس ڈبے پر ڈالی اور دوسری یشل پر۔ ''اور کچھ......'' اس نے پوچھا۔

''اور یہ......'' یشل نے بیگ سے گاڑی کی ایک چابی نکال کر میز پر رکھی۔ ''آپ کو کہیں آنے جانے کے لیے امراؤ بیگم سے گاڑی لینے کے لیے بہانے نہیں بنانا پڑنے چاہئیں، یہ آپ کی ذاتی گاڑی کی چابی ہے جو کل تک آپ کے پاس پہنچ جائے گی، امراؤ بیگم تک یہ پیغام پہنچا دیا گیا ہے۔''

''مجھے کہیں نہیں جانا ہوتا۔'' زرنگار نے ہاتھ کے جھٹکے سے چابی واپس یشل کی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔

”سردار مہرزاد کو تو آپ کو بلانا ہوتا ہے ناں۔“ یشل کا لہجہ سپاٹ مگر نظریں کچھ جتانا چاہ رہی تھیں۔

”میرا مطلب ہے، آپ کو یہ بھی بتانا مقصود تھا کہ سردار صاحب الیکشن کی مصروفیات کے سبب شاید اب خود آپ کے پاس نہ آسکیں تو ظاہری بات ہے انہیں آپ کو وہاں بلانا ہوگا جہاں وہ ہوں گے۔“ زرنگار کی نظروں میں الجھن دیکھ کر اس نے فوراً وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”امراؤ بیگم تک یہ پیغام بھی پہنچا دیا گیا ہے۔“ یشل کی آخری بات سننے کے بعد زرنگار نے گہری سانس لیتے ہوئے سر جھٹکا اور فون کا پیک اور چابی ہاتھ بڑھا کر اٹھالی۔

”آپ ذہین ہیں۔“ یشل نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”امید ہے کہ آپ میری باتوں کا بین السطور سمجھ گئی ہوں گی۔“ زرنگار نے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا اور جواب دیے بغیر اپنا کلچ اور دھوپ کا چشمہ اٹھا کر اپنی جگہ سے اٹھنے لگی۔

”آپ سے ملاقات ایک اچھا تجربہ رہا۔“ یشل نے بھی کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”اس تجربے سے میں نے بہت کچھ جان لیا۔“ وہ مسکرائی۔

”کیا جانا آپ نے؟“ زرنگار نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

”یہی کہ بدصورتی میں چھپی خوب صورتی کیا ہوتی ہے۔“

”کیچڑ میں کھلے اور خاردار جھاڑیوں میں اگے پھول تک رسائی کی خواہش دل میں کیوں جنم لیتی ہے۔“

”خاموشی کی زبان سمجھ لینا کیا ہوتا ہے۔“

”انسانیت کیا چیز ہے۔“

یشل نے لفظوں کو ٹھہر ٹھہر کر ادا کیا۔

”صحافیوں کا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ لفظوں کو ڈی کوڈ کرنے کی کوشش کریں۔“ زرنگار نے سنجیدہ لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گئی۔

یشل اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

”اُف.....“ زرنگار کے نظروں سے غائب ہونے کے بعد وہ گرنے کے سے انداز میں اپنی چیئر پر بیٹھ گئی۔ ”کیا ٹیپکل میٹنگ تھی، ایک کورٹی زاں (بازاری عورت) اور ایک سردار کے تعلق کو آگے بڑھانے والی پرلیما سیکرٹری۔“ اسے اپنی سوچ پر خود بھی ہنسی آگئی۔

”یہاں ہوتے میاں سڈنی شیلڈن تو ایک نیا معرکۃ الآرا ناول اس کہانی پر پائپ لائن میں آجاتا۔“ وہ مسکرائی اور اپنا بیگ کندھے پر ڈال کر باہر جانے کے راستے کی طرف مڑ گئی۔

☆☆☆

”بی اماں نے تمہیں مردم بیزار بنادیا ہے دراصل.....“ مہرین اس روز بھی حمزہ کو آڑے ہاتھوں لینے کے موڈ میں تھیں۔ ”نہ تو تمہارا کوئی سوشل سرکل ہے نہ کوئی قریبی دوست، کیا تمہاری عمر کے لوگ ایسے ہوتے ہیں؟“

”میں خود کو امپروو کرنے کی کوشش کررہا ہوں می.....“ اس نے نیچی آواز میں کہا۔ ”آپ مجھے تھوڑا ٹائم دیں، مجھے بھی خوشی ہوگی کہ میں ویسا بن جاؤں جیسا آپ چاہتی ہیں۔“

”مجھے نہیں لگتا ایسا ممکن ہے۔“ مہرین نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔ ”بی اماں جس سانچے میں تمہیں ڈھال چکی ہیں، اس سے نکلنا تمہارے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔“

”کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا ممی۔“ وہ جیسے خود کلامی میں مصروف تھا۔ ”لیکن آپ.....“ پھر اس نے سر اٹھا کر مہرین کی طرف دیکھا۔ ”پلیز آپ اس میں بی اماں کو قصوروار مت ٹھہرایا کریں، میرا مزاج ہی ایسا ہے، ورنہ بی اماں جتنی سوشل تھیں وہ تو آپ جانتی ہی ہیں۔“

”سوشل تھیں.....!“ مہرین سر جھٹکتے ہوئے بولیں۔ ”محلے داریوں اور دور دراز کی رشتے داریوں کو نبھانے کی حد تک سوشل، تیرے میرے بچوں کو قرآن پڑھادیا۔ چھوٹی موٹی بیماریوں کے علاج کے لیے لوگوں کو ٹوٹکے تجویز کردیے، گھر میں رکھی سبزی، پھل اور سالن کی کٹوریاں ان پھوہڑ ہمسائیوں کو دے دیں جو کسی قسم کا تردد کرنے سے بھاگتی ہیں۔ دوپہر بھر کھٹکتے دروازے کے جواب میں فریزر سے برف کے کٹورے نکال، نکال کر بانٹ دیے، نہ اپنا اسٹیٹس دیکھا نہ اگلے کا، ہر کسی کی شادی، موت پر جاپہنچے۔ غرارے والے، گوٹے والے، پان والے، حقے والے، شربت والے، پنساری، موچی، ترکھان، مستری سب ہی کی خوشیوں میں جھوما جارہا ہے، سب ہی کے دکھوں پر رویا جارہا ہے، یہی سوشل ایکٹوٹیز تھیں بی اماں کی۔“ اسے ممی کا لہجہ اور اس میں چھپی حقارت ـــ ناقابلِ برداشت لگی لیکن اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے سر جھکالیا۔

”شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ممی.....“ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا۔ ”مگر آپ کو یاد ہوگا آپ خود بھی تو... بی اماں اور ان کی سوشل ایکٹوٹیز سے ہی کبھی تعلق رکھتی تھیں۔“ اسے لگا ممی کے سامنے بی اماں کی اس سے زیادہ حمایت وہ کرہی نہیں سکتا تھا۔

”رکھتی تھی نہیں، ان کی بیٹی ہونے کی وجہ سے بچپن سے لے کر شادی ہونے تک اپنی آنکھوں سے یہ سوشل ایکٹوٹیز دیکھتی رہی تھی لیکن کیا ضروری ہے۔“ وہ اپنے شانے اچکاتے ہوئے بولیں۔ ”کہ اگر اللہ نے بندے کا سماجی مرتبہ خود پہلے سے بہتر کردیا ہو تو پھر بھی وہ اس سے نچلے درجے سے متعلق رہنے میں خوشی محسوس کرے۔ اب میرا، میری باقی بہنوں اور بھائیوں کا اسٹیٹس الحمدللہ بہت بہتر ہے تو کیا مصیبت آئی ہے ہمیں کہ ہم واپس انہی لوگوں کے حلقوں میں جا گھسیں جو ہائی اسٹینڈرڈ لیونگ میں ہمارے ہم پلہ ہوسکتے ہیں نہ ہی اس کو حاصل کرنے کے لیے کوشش کرسکتے ہیں۔“ انہوں نے اپنی بات کے ردِعمل میں حمزہ کے تاثرات جاننے کے لیے اس کے چہرے کی طرف دیکھا مگر اس نے چہرہ نیچے جھکایا ہوا تھا، انہیں اندازہ نہیں ہوا کہ ان کی بات اسے کیسی لگی تھی۔

”آپ کی یہ بات بھی شاید ٹھیک ہے ممی، وقت کے ساتھ انسان کی سوچ کو بھی ترقی کے عمل میں شامل ہونا چاہیے۔ سوچ ہی کو نہیں، احساسات اور جذبات کو بھی.....“ اس نے چہرہ اوپر کرتے ہوئے کہا وہ اپنے دل میں ٹھان چکا تھا کہ اپنی ماں کو خود سے مایوس نہیں ہونے دے گا، اسی لیے ان کی کسی بھی بات سے اختلاف نہ کرنے کے قوی فیصلے پر عمل کی یہ بھی ایک کڑی تھی۔

”تم سلمان بھائی کی بیٹی رانیہ سے تو ملے ہی ہو۔“ اس کی اس درجہ سعادت مندی کو محسوس کرکے وہ بھی تھوڑا کھلنے لگیں۔

”سلمان بھائی؟“ اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا، اسے فوری طور پر واقعی اس نام سے کوئی شخصیت یاد نہیں آئی تھی۔

”افوہ، مریم کے چچا سلمان جو اس رات ڈنر پر ہماری طرف آئے ہوئے تھے جس دن اتفاق سے تم بھی گھر پر تھے۔“

”اوہ ہاں، یاد آگیا۔“ ایک ادھورا سا خاکہ اس کے ذہن کے پردے پر لہرایا۔

”انہی کی بیٹی رانیہ، وہ بھی تو ساتھ تھی ان کے۔“ مہرین کو خوشی ہوئی کہ اسے سلمان نامی شخص یاد تھا۔ ”تم

سے ہی تو اس کا خصوصی تعارف کروا رہے تھے وہ۔“

”جی......جی۔“ اس نے سر ہلایا جبکہ اس کا ذہن اس لڑکی کا چہرہ یاد کرنے میں مصروف تھا جس سے دھیانی میں اس نے ہیلو ہائے کی تھی۔

”تم ایک آدھ بار ان کے گھر جا کر اس لڑکی سے ملو، اس کو جانچو۔“ انہوں نے کہا۔

”اچھا......“ اس نے ماں کی طرف دیکھا۔”لیکن کیوں، کس سلسلے میں؟“

”میں چاہ رہی ہوں کہ تمہارا اور رانیہ کا رشتہ ہو جائے، اچھے لوگ ہیں، ویل سیٹلڈ، ویل آف۔“ انہوں نے اصل بات بتائی۔

”اوہ......“لیکن ممی میرا تو فی الحال شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ اس نے اس بار سعادت مندی کے نقاب سے باہر آ کر کہا۔

”کیوں......کیا بوڑھے ہو کر شادی کرو گے؟“ وہ تنک کر بولیں۔ ”یہ ہی تو عمر ہے شادی کی......تم پڑھ لکھ چکے ہو، جاب کر رہے ہو ماشاء اللہ ذمے داریاں نبھانے کے قابل ہو چکے ہو، اب شادی نہ کرنے کا ارادہ نہ ہونے کی کیا تک ہے بھئی۔“

”تک کو چھوڑیں ممی۔“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”لیکن آئی ایم سوری فی الحال میں ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ مجھے میرے مزاج اور معیار کے دُہرے پن اور پیچیدگیوں سے باہر نکل لینے دیں پلیز......میرے مزاج اور شخصیت ایک اکائی پر کھڑے ہوں گے جب ہی میں زندگی کے معاملات بہتر طریقے سے کسی کے ساتھ شیئر کر سکوں گا، یوں تو کبھی آپ کے معین کردہ معیار اور کبھی بی اماں کی تربیت کے بھوت مجھے ڈبل مائنڈڈ کرتے رہیں گے اور جو بھی لڑکی میرے ساتھ زندگی گزارنے آئے گی اس کے لیے مشکل ہو جائے گی۔“

”یہ کوئی مضبوط اور قابل قبول وجہ نہیں ہے۔“ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولیں۔

”شاید آپ کو نہ لگے لیکن میرے لیے یہ بہت اہم بات ہے۔“ اس نے قطعیت کے ساتھ کہا۔ ”باقی کسی دوسرے معاملے میں آپ حکم کریں، میں حاضر ہوں۔“ واپس سعادت مندی کے چولے میں گھستے ہوئے آخری بات اس نے دانستہ کہی تھی اور شاید اسی بات کی وجہ سے وہ مزید بحث نہیں کر سکی تھیں۔

☆☆☆

”تم نے اس چپٹی ناک اور چیاں آنکھوں والی لڑکی سے نکاح کر لیا نادر......؟“ اچانک آنے والے بندوں سے ابتدائی بات چیت کرنے کے بعد جب وہ کوئی کاغذ لینے کے لیے اندر آیا تو ڈائننگ چیئر پر سر پکڑ کر بیٹھی آپا نے سرسراتی آواز میں اس سے پوچھا۔ یہ وقت نادر کی زندگی کا شاید سب سے کڑا وقت تھا، اسے چاروں اطراف سے آنے والے سوالات کا سامنا کرنا تھا، اسے اپنے مخاطبین کی نظریں، نظریں نہیں اسکن مشینز محسوس ہو رہی تھیں جو اس کے جسم کے اندر شریانوں میں دوڑتے خون کی رفتار کو جانچ رہی تھیں اور انہی لمحات میں اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دینے اور نتائج و عواقب کی پروا نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”جب انسان چاروں طرف سے گھر جاتا ہے اور جائے فرار بظاہر کوئی نظر نہیں آتی تو دل و دماغ کو فوری طور پر ایسا ہی فیصلہ کر لینا چاہیے۔“ اس نے ایک لمحے کے لیے رک کر سوچا تھا۔

”آپ کو اعتراض نکاح پر ہے یا اس کی چپٹی ناک اور چیاں آنکھوں پر۔“ اس نے پنجوں کے بل نیچے بیٹھ کر سائڈ بورڈ کی نچلی دراز کھولتے ہوئے کہا۔

”تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے؟“ آپا اس کے انداز پر حق دق رہ گئی تھیں۔ یہ وہ نادر تھا جسے ابھی تک وہ گود میں اٹھائے بچے کی طرح لاڈ پیار سے پال رہی تھیں۔

”مذاق ہے تو خاصا سنگین ہے۔“ اس نے ایک فائل میں لگے کاغذات پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”ہے نا آپا؟“ پھر وہ ان کی طرف دیکھ کر بولا۔

”واہ نادر پہلا قدم تم نے اپنی مرضی اور اختیار کے ساتھ اٹھایا اور وہی الٹا پڑ گیا۔“ آپا جوش میں آ کر طنزیہ گفتگو کرنے لگیں۔ ”وہ نہ صرف چپٹی ناک اور چیاں آنکھوں والی ہے بلکہ پکی کرمنل بھی ہے، جب ہی تو یہ ایجنسیوں والے اس کی بُو سونگھتے تم تک آن پہنچے ہیں۔“

”ایجنسیوں والے، تم تک......“ الفاظ نے نادر کے جسم میں چیونٹیاں سی دوڑا دیں۔ ”گھروں سے اٹھائے جانے والے بے قصور لوگ، لاپتا افراد، گمشدہ نوجوان، ان کے گھر والے، احتجاجی کیمپ، بھوک ہڑتالیں، پوسٹر، بینرز، اعلیٰ سطحی ملاقاتیں۔“ ان گنت بار ٹی وی کی اسکرین پر دیکھے گئے مناظر اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئے۔ خون اس کی رگوں میں سمندر میں آئے طوفان کی طرح تلاطم خیز ہوا۔

”میں نہیں مانتا کہ ایک نیک جذبہ، اتنے برے انجام سے دوچار ہو سکتا ہے۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا، کچھ دیر نیچے بیٹھے رہنے سے اس کے پاؤں جیسے سونے لگے تھے، اٹھ کھڑے ہونے پر ایڑیوں اور پنجوں میں سنسناہٹ سی ہونے لگی تھی۔

”نیکی، نیک جذبہ، خیر سگالی۔“ آپا بلند آواز میں بڑبڑائیں۔ ”دیکھ لینا ابھی اس کے مزید کیا نتائج نکلتے ہیں۔“

”کاش لوگ مشکل وقت میں خیر کے کلمے پڑھنے کے عادی ہو سکتے۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل کو انتہائی اضطراب کے عالم میں بار بار ٹانگ سے ٹکراتے ہوئے کہا اور واپس اس کمرے میں چلا گیا جہاں اچانک آنے والے بیٹھے تھے۔

”ہم آپ کے پچھلے پورے ریکارڈ سے پہلے سے واقف ہیں مسٹر نادر......“ اس کی پکڑائی فائل پر نظر ڈالتے ہوئے آنے والوں میں سے ایک نے کہا۔

”آپ کے صاف ستھرے ریکارڈ پر صرف ایک ہی چڑھاؤ یا اتار موجود ہے اور وہ ہے آپ کا زوئی حسین سے نکاح......“ بولنے والا بول رہا تھا اور وہ سن رہا تھا۔ ”آپ کو ایک ایسی غیر ملکی لڑکی سے نکاح کی ضرورت کیوں پیش آئی جس کے اس ملک میں قیام کی مدت ختم ہو رہی تھی اور یہ نکاح بھی اس طریقے سے ہوا کہ تا حال آپ کے گھر والے، دوست، عزیز، رشتے دار، سب اس سے ناواقف تھے، یہ خفیہ اور ایمرجنسی میں ہوا نکاح اپنے پیچھے کیا مقاصد لیے ہوئے تھا، یہ ایک بڑا سوال ہے۔“

”دیکھیں سر آپ یقین کریں کہ میں نے اس نکاح کے محرک سے آپ کو پوری طرح آگاہ کر دیا ہے اور مکمل ایمانداری کے ساتھ کیا ہے۔“ نادر نے سن ہوتے ذہن پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”زیادہ عرصہ نہیں گزرا مسٹر نادر کہ ہمارے محکمے کے ایک آفیسر نے زوئی حسین سے ان کے فلیٹ پر ملاقات کر کے ان کو بتا دیا تھا کہ وہ کس مقصد کے لیے ان کے پاکستان میں قیام کے دوران کی مصروفیات کا ریکارڈ چھان رہے تھے، ملک کے شمالی علاقہ جات اور آزاد کشمیر میں آنے والے اس ریکارڈ زلزلے کے دوران ریلیف کیمپز اور والنٹیر گروپس اور زلزلے سے متاثرہ لوگوں کے متعلق اگر میں چند ہی کہانیاں آپ کے گوش گزار کر دوں تو شاید آپ کے ہوش اڑ جائیں۔ ایسے ہی ایک کیس پر ہم آج کل کام کر رہے ہیں، میرال صلاح الدین

...... نامی لڑکی اسی زلزلے کے متاثرین میں سے ایک تھی، ریسکیو آپریشنز کے دوران ہی وہ ایک غیر ملکی شخص کے امدادی کیمپ سے غائب ہوئی تاحال اس کا سراغ نہیں مل سکا۔ ہماری اب تک کی تشویش کے مطابق کے جن چند لوگوں کے ساتھ موجود ہونے کے ثبوت ہمیں ملے ہیں ان میں سے ایک مس زوئی حسین جواب زوئی نادر ہیں بھی ہیں۔''

''مگر میری معلومات کے مطابق زوئی حسین زلزلے کے ریسکیو آپریشنز کے دوران کسی بھی امدادی کے ساتھ متاثرہ علاقوں میں نہیں گئی تھی۔'' نادر نے ایک نکتہ اٹھانے کی کوشش کی۔

''ہم کب کہہ رہے ہیں کہ وہ گئی تھیں۔'' اس شخص نے پیشہ درانہ طنزیہ مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے کہا۔ ''ہماری تفتیش کے مطابق امدادی کیمپ سے غائب ہونے کے بعد میرال صلاح الدین کو زوئی حسین کے ساتھ میدانی علاقوں کے ایک گاؤں میں ایک مقامی بینک کے منیجر کے گھر میں دیکھے جانے کے ثبوت موجود ہیں۔''

''میں اس سلسلے میں فی الحال آپ کو کچھ بتا نہیں سکتا کیونکہ میں ایسی کسی ایکٹویٹی سے واقف ہی نہیں ہوں۔'' نادر نے سر ہلایا۔

''غیر ملکی لڑکیوں سے شادیوں کے شوق کبھی کبھار مہنگے پڑ جاتے ہیں مسٹر نادر...... آپ شاید خود کو انٹرنیشنل چائنا مارکیٹ کا ایک بڑا ایکسپورٹر دیکھ رہے تھے تصور میں۔'' وہ شخص مزید تلخ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''ایسا کچھ نہیں تھا۔'' نادر نے بے بسی سے سر ہلایا۔ ''میں نے یہ نکاح کیوں کیا، میں آپ کو بتا چکا ہوں۔''

''آپ نے مجھے تو بتا دیا مگر یہ ثابت کیسے کریں گے کہ بغیر اس بات کی تحقیق کیے کہ ایک غیر ملکی لڑکی پاکستانی نیشنلٹی حاصل کرنے کے لیے اتنی بے چین کیوں ہے، آپ اسے صرف پاکستان سے محبت جان کر اسے یہ نیشنلٹی دینے کے لیے اس سے نکاح کر لیتے ہیں...... آپ کتنے معصوم ہیں مسٹر نادر۔''

''ظاہری بات ہے میں اپنی سوچ کا کوئی ثبوت آپ کو نہیں دے سکتا اس لیے آپ کے پاس اختیار ہے آپ جو سلوک مجھ سے کرنا چاہیں کریں، میں یہیں موجود ہوں۔'' نادر کو لگا وہ صورتِ حال کو سمجھنے سے پہلے اس کے سامنے ہتھیار ڈال چکا تھا۔

''فی الحال کسی عمومی یا خصوصی سلوک کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا۔'' اب کے دوسرے شخص نے کہا۔ ''آپ کا اب تک کا ریکارڈ سادہ اور سیدھا ہے، ہم آپ سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ آپ اپنی منکوحہ سے رابطے میں رہتے ہوئے ہمارے لیے مزید معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ بنیں گے اور زوئی حسین کو اس کے طے شدہ پروگرام کے مطابق پاکستان واپسی سے نہیں روکیں گے۔ یہ دو چیزیں ہی مسٹر نادر آپ کی آزادی اور سلامتی کی ضمانت بن سکتی ہیں۔''

''یقیناً میں ایسا ہی کروں گا۔'' نادر نے سر ہلایا۔ ''کیونکہ مجھے بھی پیچیدگیوں میں پڑنے اور اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے کا کوئی شوق نہیں بلکہ یہ واقعہ میرے لیے آئندہ زندگی میں اگر زندگی ہے ایک بہت بڑا سبق بننے والا ہے۔''

''گڈ......'' دوسرے شخص نے اپنی جگہ سے اٹھ کر نادر کے شانے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں آپ سے مکمل تعاون کی امید ہے۔'' مشکل ترین وقت کو فی الحال ٹلتے دیکھ کر نادر نے جسم میں آہستہ آہستہ واپس آتی زندگی کے ساتھ سر ہلا دیا۔ آنے والوں نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا اور ان میں سے ایک نے اسے بتایا کہ زوئی حسین کے واپس آنے تک وہ انڈر آبزرویشن رہنے والا تھا اور اس کا نام ای سی ایل میں ڈالا جا چکا تھا۔

☆☆☆

''میں نے رات ایک بہت اچھا خواب دیکھا۔'' ایک صبح عافیہ نے بیگم اکرام اللہ کو فون پر کہتے سنا، عافیہ ان رات بہت دنوں بعد گھر آئی تھیں۔ ان کے شوہر اور بڑے بیٹے نے زبردستی انہیں گھر آنے اور رات بھر نیند لینے پر آمادہ کیا تھا۔ ہائی پوٹینسی ٹرینکولائزر کی دو گولیاں عرصے بعد ان کو پوری نیند سلانے میں کامیاب رہی تھیں لیکن صبح فجر کی اذان کے وقت ان کی آنکھ بغیر کسی کے جگانے اور الارم کی آواز کے کھل گئی تھی۔ فجر کی نماز انہوں نے توجہ اور دھیان سے پڑھی تھی اور نماز کے بعد سجدے میں گر کر گڑگڑا گڑگڑا کر اپنی عرض پیش کی تھی، انہیں اپنے اور اپنے ان دیکھے خدا کے درمیان ایک عجیب سا تعلق بنتا محسوس ہونے لگا تھا۔ جہاں کہنے والی زبان تو عام سی تھی مگر سننے والی طاقت بہت بڑی، غیر معمولی اور ہر چیز پر قادر تھی۔ نماز کے بعد صوفی صاحب کے بتائے وظائف اور قرآن پاک کی تلاوت کے دوران بھی وہ اس ان دیکھی طاقت سے ہی ہم کلام رہی تھیں ایسی طاقت جس سے تمام امیدیں وابستہ تھیں، جو ہر غم کا مداوا تھی۔

بہت دنوں بعد وہ علی الصباح اپنے گھر کے لاؤنج میں آکر بیٹھی تھیں، ان کی نظروں کے سامنے موجود لاؤنج کی گلاس وال کے پردے پیچھے ہٹے ہوئے تھے اور شیشے کے اس پار موجود فرنٹ لان کے سرسبز پودے، پیڑ، درخت اور پھول، مشرق سے ابھرتے سورج کی اولین اور کمزور کرنوں کی روشنی میں واقع ہو رہے تھے۔ اس منظر اور چند لمحے پہلے اس طاقت کی یاد میں مگن رہنے کے اثر نے ان کے دل میں ایک عجیب سی سرشاری بھر دی تھی، وہ بے یقینی اور مایوسی کے حصار سے چند لمحوں کے لیے ہی سہی باہر نکلی تھیں۔ اسی دم بیگم اکرام اللہ کی کال نے ان پر خوش امیدی اور یقین کا ایک نیا در وا کیا تھا۔

''میں نے رات ایک بہت اچھا خواب دیکھا۔'' بیگم اکرام اللہ نے کہا تھا۔ ''میں نے دانیال بیٹے کو تمام زندہ حیات کے ساتھ اپنے پاؤں پر چلتے پھرتے دیکھا یوں جیسے وہ کبھی کسی حادثے سے دوچار ہوا ہی نہیں تھا اگرچہ خواب دیکھنے کے دوران میرے لاشعور میں یہ تصور موجود رہا کہ دانیال ایک بڑے حادثے کا شکار ہو چکا ہے۔'' وہ کہہ رہی تھیں۔

''اوہ، یہ تو بہت اچھا خواب ہے۔'' عافیہ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا ان کا دل ایک انجانی مسرت کے زیرِ اثر تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ ''پھر کیا ہوا؟'' انہوں نے بے چینی سے پوچھا۔

''پھر میں نے دیکھا صوفی صاحب دانیال بیٹے کو یوں چلتے پھرتے دیکھ کر مسکراتے ہیں اور مجھ سے کہتے ہیں۔ ''دیکھا ماں کی دعا کیسے کیسے معجزے دکھاتی ہے مگر یاد رکھیے گا معجزے اللہ کی طرف سے وقوع پذیر ہوتے ہیں انسان ان پر ہرگز قادر نہیں۔''

''اوہ...... میرے خدا!'' عافیہ نے اچھلتے دل کو قابو کرتے ہوئے کہا۔ ''پھر کیا ہوا۔''

''پھر یہ ہوا کہ صوفی صاحب نے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا عافیہ بیٹی کو میری جانب سے بھی مبارک باد دیجیے گا اور اس سے کہیے گا میں خود اس کو مبارک باد نہ پیش کر سکوں گا کیونکہ میری فلائٹ کا وقت ہو گیا ہے۔'' بیگم اکرام اللہ نے کہا۔

''صوفی صاحب کہاں جا رہے تھے؟'' عافیہ نے بے ساختہ پوچھا۔

''یہ تو انہوں نے نہیں بتایا، بہر حال خواب کون سا بہت طویل ہوتے ہیں جو ایسے سوال و جواب کیے جا سکیں، اتنا ہی خواب دیکھا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی، فجر کی اذان ہو رہی تھی۔'' بیگم اکرام اللہ نے نرمی سے کہا۔

''صبح کے وقت دیکھے جانے والے خواب تو سچے ہوتے ہیں سنا ہے۔'' عافیہ نے کہا۔
''ہاں سنا تو ہے۔'' بیگم اکرام اللہ نے کہا۔
''میں آج اسپتال جانے سے پہلے صوفی صاحب کی طرف جاؤں گی، ان سے بات کرنے سے بہت سکون ملتا ہے۔'' عافیہ نے فوراً ارادہ کرتے ہوئے کہا۔
''ہاں ضرور جانا۔'' بیگم اکرام اللہ نے کہا اور دو چار اِدھر اُدھر کی باتیں مزید کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔
اسپتال جاتے ہوئے راستے میں انہوں نے ڈرائیور سے راستہ بدل کر صوفی صاحب کے گھر کی طرف گاڑی موڑنے کو کہا۔ وہ بہت دن بعد صبح کے وقت گھر سے باہر نکلی تھیں۔ سڑکوں پر ٹریفک معمول سے زیادہ تھا، دفتروں کی طرف جانے والوں کی گاڑیاں، اسکولوں کی بسیں اور ویگنیں، کالج اور یونیورسٹی کی گاڑیاں، سگنلز پر رکنے والی گاڑیوں کی لمبی قطاریں لگ جاتیں۔
''افوہ...... مجھے اسپتال چلے جانا چاہیے تھا سیدھے......'' ان کا دل گھبرانے لگا۔ دانیال کو دیکھے کتنے دن ہو گئے، جانے وہ سویا ہوا ہوگا یا اس کی حسیات جاگ رہی ہوں گی۔'' ایک ہی سوال ان کے ذہن میں گھوم رہا تھا۔
''یوٹرن سے گاڑی واپس موڑ لو۔'' انہوں نے اسی گھبراہٹ میں ڈرائیور سے کہا۔
''بس اگلی ہی لین میں تو صوفی صاحب کا گھر ہے بیگم صاحبہ۔'' ڈرائیور نے کہا اور ان کے جواب کا منتظر رہا۔
''اچھا......'' انہوں نے سامنے سڑک پر نظر دوڑائی۔ ''چلو پھر زیادہ دیر نہیں رکنا، بس ان سے دعا کروا کے نکل آئیں گے۔''
''افوہ...... بیگم صاحبہ صوفی صاحب کی لین میں بھی آج بڑا رش ہے، یہ مین روڈ تو نہیں ہے لیکن یہاں بھی گاڑیوں، بسوں اور آٹو رکشاؤں کی لمبی قطاریں ہیں۔'' ڈرائیور نے اگلی لین میں گاڑی موڑنے کے بعد کہا۔
''اوہ...... کہیں آج اِدھر کوئی خصوصی اجتماع تو نہیں ہو رہا۔'' انہوں نے بھی سامنے نظر ڈالتے ہوئے کہا۔
''نہیں بیگم صاحبہ، پچھلی بار جب ہم اِدھر آئے تھے تو باہر بیٹھے ہوئے ایک معتقد نے مجھے بتایا تھا کہ صوفی صاحب اجتماع وغیرہ نہیں کرتے، وہ زیادہ ہجوم پسند نہیں فرماتے۔'' ڈرائیور نے جواب دیا اور شیشہ نیچے کر کے قریب سے گزرتے ایک شخص سے اس رش کی وجہ پوچھنے لگا۔ عافیہ کے فون پر عاصم کی کال آ گئی، وہ ان سے پوچھ رہا تھا' وہ اب تک اسپتال کیوں نہیں پہنچی تھیں۔ عاصم سے بات کر کے فون بند کرتے ہوئے انہوں نے ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ اس کی سائڈ کا شیشہ آہستہ آہستہ اوپر ہو رہا تھا۔
''بیگم صاحبہ، صوفی صاحب کا آج اذانِ فجر سے کچھ دیر قبل وصال ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔'' ڈرائیور نے چہرہ پیچھے موڑتے ہوئے...... انہیں بتایا عافیہ پر جیسے سکتے کی کیفیت طاری ہو گئی۔
''میری فلائٹ کا وقت ہو گیا ہے۔'' اذانِ فجر سے کچھ دیر پہلے ہی صوفی صاحب نے بیگم اکرام اللہ کو خواب میں بتایا تھا۔

☆☆☆

بینش نے ساری رات لگا کر کچھ ایسے ڈیزائن بنائے تھے جو اس کے اسائمنٹ میں شامل تھے۔
''ایک تو ہمارے گھر میں اخبار آنے کا بھی رواج نہیں ہے۔'' ڈیزائنز کو محفوظ کرنے کے لیے اسے کسی کور میں لپیٹنا تھا مگر اپنے گھر میں اسے ایسا کوئی بڑا کاغذ نہیں مل رہا تھا جس میں وہ انہیں لپیٹ کر رکھ سکے۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی کمرا کمرا پھر رہی تھی اور چیزیں اٹھا اٹھا کر اخبار کے کسی بھولے بھٹکے ٹکڑے کو

رہی تھی جو غلطی سے ہی کسی وجہ سے ان کے گھر آ گیا ہو۔

"ہم نے اخبار کیا کرنا ہے۔" باورچی خانے میں چولھے کے آگے بیٹھی پراٹھوں کے انبار پکاتی اماں نے بلند آواز میں کہا۔ "اخبار سے تن ڈھکتا ہے نہ پیٹ بھرتا ہے اور اس میں چھپی خبریں پڑھنی مجھے آتی ہیں نہ حمید، شفیق کو اتنی فرصت ہے کہ وہ بیٹھ کر اخبار پڑھیں، خواہ مخواہ کا خرچہ ڈھائی تین سو کا شو مارنے کے لیے باندھ لیں کیا۔"

"افوہ...... اماں، آپ کوئی ایسا ہی جواب دینا جس سے پتا لگے ہم کتنے جاہل ہیں۔" وہ چیں بہ جبیں ہوتی باورچی خانے میں آ گئی۔

"ہاں تو کتنے تو ہم پڑھے لکھے ہیں۔" اماں نے بل دار جناتی پراٹھا چنگیر میں رکھ کر اس پر آلو، پالک کی بھجیا ڈوئی بھر کر ڈالی اور گرم بھجیا پر مکھن کا ایک ٹکڑا رکھ دیا۔ مکھن کا ٹکڑا گرم بھجیا پر رکھے جاتے ہی پگھل کر سبز اور زرد بلغوبے پر اِدھر اُدھر بہنے لگا۔

"لے دھیان سے ناشتا کر لے...... اخبار کا سیاپا چھوڑ دے اب......" پھر وہ چمکارتے ہوئے بولیں اور اس کی طرف دیکھتے دیکھتے رک گئیں۔ "رات کو جو تیل تیرے بالوں میں ڈالا تھا، وہ نکال دیا ناں شیمپو مل کر۔" انہوں نے اس کے روکھے سنہری مائل بھورے بالوں کو دیکھا جن کی لٹیں کیچر سے نکل کر اِدھر اُدھر بکھر گئی تھیں۔ "بڑے سواہ ہو گئے ہیں بال روز دھل دھل کر تیل کے بغیر۔" اماں کو غصہ آنے لگا۔ "اور یہ گلابی قمیص کے ساتھ چٹی شلوار کیوں پہن لی کیمرک کی، میں نے تو گلابی ریشم کی شلوار خریدی تھی اس کے ساتھ۔ اتنا خجل خوار ہو کر لی تھی۔ ڈلی بازار سے رنگ ہی میچ نہیں ہوتا تھا۔ بہن شریفاں تو مجھے کہہ رہی تھی چٹا ریشم لے لے اور منیرے رنگریز سے رنگوا لے پر میں نے بھی رنگ ملا کے ہی چھوڑا۔" اماں کو بات کی تفصیل سنانے کا شوق تھا۔ "ناں پر تو نے چٹی کیمرک کیوں پہن لی اس کے ساتھ۔" پھر انہیں یاد آ گیا کہ بینش نے ان کی محنت پر پانی پھیر دیا تھا۔

"مجھے نہیں پسند ریشمی کپڑے۔" بینش نے ناک سکیڑ کر کہا۔

"اور میں تو گلابی چپل بھی لائی تھی نگوں والی تیرے لیے، تو نے کپڑے کی پمپی کیوں پہن لی؟" پھر اماں اس کے کینوس شوز پر جا پڑی۔

"افوہ...... اماں مجھے نگوں والی چپل پہن کر یونیورسٹی جا کر تماشا نہیں بننا۔" بینش جھنجلا گئی۔ "اور خدا کے واسطے بار بار گلابی، گلابی کہہ کر اس رنگ کا بیڑا غرق تو نہ کریں، یہ ٹی پنک کلر ہے ٹی پنک۔" اس نے کہا اور چائے کا مگ میز پر سے اٹھا کر چائے کے گھونٹ بھرنے لگی۔

"ہا ہائے...... پراٹھا تو کھا ساتھ میں نے آلو ساگ صبح ہی بھونا ہے، تازہ رات کا پڑا ہوا نہیں ہے۔" اماں سب بھول کر چنگیر اس کی طرف بڑھانے لگیں۔

"ہائے اماں صاف کولیسٹرول ہے یہ پراٹھا، مجھے نہیں کھانا۔" وہ منہ بنا کر بولی اور چائے کا مگ ہاتھ میں لیے سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آ گئی۔

"کاکے او کاکے!" ساتھ والی چھت پر ہمسائیوں کے چھوٹے بیٹے کے سوا کوئی نہیں تھا جو پتنگ کی ڈور سلجھاتا آسمان پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ بینش کے پکارنے پر وہ دونوں چھتوں کے درمیان کھڑی منڈیر کے قریب آیا۔

"جا بھاگ کے مجھے سلیم نائی کی دکان سے دو چار پرانے اخبار تو لا دے۔ جا شاباش میرا بھائی، مجھے دیر ہو رہی ہے۔" اس نے کاکے سے درخواست کرتے ہوئے اسے پچکارا۔ کاکا جیسے بینش کے اشارے کا منتظر تھا بھرتا سیڑھیاں اترا اور ٹھیک دس منٹ بعد ہاتھ میں چند اخبار پکڑے دوبارہ آن حاضر ہوا۔

''شاباش کاکے!'' بینش نے اخبار لیتے ہوئے پیار سے کاکے کے گال کو چھوا۔ ''تم بہت اچھے ہو کاکے۔'' مسکرائی اور کسی مشہور نغمے کی دھن پر گنگناتی ہوئی سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئی۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے ایک اخبار نیچے بچھا کر ڈیزائنرز والے کاغذ اوپر رکھے اور دوسرا اخبار ان پر رکھ کر باریک ڈوری سے انہیں باندھنے لگی۔

''قاتل حسینہ زرنگار!'' اوپر والا اخبار کسی مقامی اخبار کا شام کا ایڈیشن تھا۔ جس کے صفحہ نمبر دو کے درمیان ایک خوب صورت چہرہ جگمگا رہا تھا۔ ''معروف ذرائع کے مطابق زرنگار کے ابھرتے ہوئے سیاست دان سردار مہرزاد خان کے ساتھ خصوصی تعلقات ہیں۔ سردار مہرزاد خان جو اپنے آبائی حلقے سے اپنے شہید والد کے قتل کے بعد قومی اسمبلی میں خالی ہو جانے والی نشست پر ضمنی انتخابات میں حصہ لے رہے ہیں اور اس حلقے سے اس انتخاب میں مضبوط ترین امیدوار خیال کیے جاتے ہیں کے بارے میں انتخاب سے صرف دو ہفتے قبل اس خبر کا سامنے آنا معنی خیز ہے۔'' بینش نے تیزی سے اس خبر پر نظر دوڑائی۔ یہ وہی سیاست دان تھا جس کی بات اس روز دانیال کر رہا تھا اور یقیناً وہ پری چہرہ حسینہ وہی کال گرل تھی جس کا پتا چلانے کی بات دانیال نے کی تھی۔

''اوہ گڈ......'' اس نے اخبار کے کاغذ کی سطح پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس پر پڑی شکنیں دور کیں۔ ''آج دانیال کو دکھانے کے لیے میرے پاس یہ خصوصی خبر اتفاق ہی سے آ گئی۔'' اس نے سوچا۔ ''مزہ آئے گا۔'' سوچ کر مسکرا رہی تھی۔

☆☆☆

''کیا چل رہا ہے آج کل......؟'' فہد نے علینہ سے پوچھا۔ وہ ویک اینڈ کی رات تھی اور پورے ہفتے کے بعد پہلی بار اسے تسلی سے کسی کو کال کرنے کا وقت ملا تھا۔

''جو بھی چل رہا ہے، اچھا چل رہا ہے۔'' علینہ کے لہجے میں بشاشت تھی۔ ''زندگی میں پہلی بار مجھے پڑھائی میں مصروف ہونے میں مزہ آ رہا ہے۔''

''اچھا ہے اسٹڈیز سے دور رہ کر تمہیں اس کی قدر آ گئی۔'' وہ مسکرایا۔

''میں چیزوں کو اپنی کلاس فیلوز کی نسبت جلدی سمجھ لیتی ہوں۔ شاید اس لیے کہ میں فزیکل اور مینٹلی دونوں ہی قسم کی عمروں میں ان سے بڑی ہوں۔'' علینہ نے کہا۔

''یہ تو ظاہری بات ہے ایسا ہونا بھی چاہیے لیکن تم کبھی بھی اتنی ڈمب نہیں رہی ہو جتنا ظاہر کرتی رہی ہو خود کو۔'' فہد نے اس کی حوصلہ افزائی کرنے کی کوشش کی۔ ''ویسے میں تمہاری ماما کو شاید کبھی سمجھ نہ پاؤں۔ مجھے یاد ہے وہ ہمیشہ unexpected حرکتیں کرتی رہی ہیں۔''

''حرکتیں......؟'' علینہ نے اس کے جملے کا ایک لفظ یوں دُہرایا جیسے اس کی وضاحت طلب کر رہی ہو۔

''معاف کرنا شاید میں غلط لفظ بول گیا۔ مجھے زیادہ واضح لفظ بولنا چاہیے جو کہ افسوس ہے کہ اس وقت میرے ذہن میں نہیں آ رہا۔'' فہد نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کوئی مناسب لفظ یاد کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

''خیر چھوڑو!'' پھر اس نے یاد کرنے کا سلسلہ موقوف کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا مطلب ہے کہ وہ اچانک سے کوئی ایسا فیصلہ کر لینے کی عادی معلوم ہوتی ہیں جن کی ان سے توقع نہیں کی جا سکتی۔''

''مثلاً......؟'' علینہ نے کہا۔

''مثلاً تمہیں مزید پڑھنے کی اجازت دینے کا فیصلہ......'' فہد نے فوراً کہا۔ ''کیا تمہیں توقع تھی کہ وہ اس کی اجازت دیں گی۔''

''ہرگز نہیں۔''

''اسی طرح ایک بار یاد ہے انہوں نے تمہیں میرال کے ساتھ کالج اسپورٹس گالا میں جانے کی اجازت دے دی تھی جس کی تمہیں ہرگز امید نہیں تھی۔ اس سال میرال نے انٹر کالجز چیمپئن شپ جیتی تھی لان ٹینس اور بیڈمنٹن میں یاد ہے ناں تمہیں۔''

''ہاں، شاید!'' علینہ کا لہجہ یک دم سست ہو گیا۔ ''تمہیں تو بہت پرانی باتیں بھی یاد ہیں۔''

''ہاں، مجھے بہت پرانی باتیں بھی یاد ہیں، خصوصاً وہ باتیں جو میرال سے اور تم سے متعلق ہیں۔'' فہد نے ناسٹلجک ہوتے ہوئے کہا۔

''اس ہفتے کے شو میں تم نے جو ٹائی پہنی ہوئی تھی، وہ کہاں سے لی۔'' علینہ نے گفتگو کا موضوع یکسر بدلتے ہوئے کہا۔ ''اس کا ڈیزائن اور رنگ شاندار تھا۔''

''یہ پرانی باتوں کے دوران ٹائی کہاں سے آ گئی؟'' فہد کو اچانک سے موضوع بدلا جانا ناگوار گزرا تھا۔

''میں ماضی سے زیادہ حال میں رہنا پسند کرتی ہوں ناں اس لیے......'' علینہ اس کے لہجے کو محسوس کر کے گڑبڑا کر بولی۔

''لیکن مجھے تم سے صرف ماضی کی باتیں کرنے میں مزہ آتا ہے، وہ دن جب ہم ساتھ تھے، وہ لمحے اور لمحاتی خوشیاں جو ہم نے شیئر کیں۔ وہ کھیل تماشے جو ہم نے ایک ساتھ انجوائے کیے، وہ موسم اور پہاڑوں پر اترتے رنگ جو ہم نے ساتھ ساتھ دیکھے۔ پہاڑوں پر بادل اور وادی میں دھوپ، وادی میں بارش اور پہاڑوں پر چھایا سکوت، تم نہیں جانتیں علینہ میں نے دنیا کے کئی ملکوں میں رہتے ہوئے بھی اس شہر اور اس شہر کی خوب صورتی کو کتنا یاد کیا ہے۔''

''تم اب بھی آؤ اس شہر میں......'' علینہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری ساری فیسی نیشنز اور چارم ختم نہ ہو جائے تو کہنا۔''

''مت بتاؤ...... مجھے، مت ستاؤ۔'' فہد نے سر ہلایا۔ ''میں تم سے میرال کے شہر چھوڑ جانے اور اس کی گمشدگی پر پہلے ہی ملول ہوں۔''

''ایک بات تو بتاؤ فہد......'' علینہ نے سیدھا سوال کرنے کا ارادہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہیں میرال بہت پسند تھی؟''

''تھی سے کیا مراد ہے تمہاری......؟'' فہد نے تیکھا جواب دیا۔ ''میرال کے لیے میرے دل میں اب بھی پسندیدگی کے وہی جذبات ہیں جو پہلے تھے۔ اب بھی اگر مجھے پتا چلے کہ وہ کہاں ہے تو میں فوراً اس سے ملنا چاہوں گا۔''

''اب بھی......'' علینہ نے چبھتے ہوئے انداز میں سوال کیا۔ ''اب جب کہ تم دنیا بھر کی لڑکیوں سے مل چکے ہو اور بقول تمہارے بہت سی لڑکیوں سے تمہاری دوستی بھی ہے۔''

''ہاں اب بھی......'' فہد نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میرے لیے اس شہر سے متعلق تم دونوں ہی لڑکیاں بہت اہم ہو کیونکہ تم دونوں کے ساتھ میں نے جو وقت گزارا وہ ناقابل فراموش ہے۔''

''چلو ٹھیک ہے، پھر تم اِدھر مت آنا کیونکہ تمہاری فیسی نیشنز کو قائم رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تم اس شہر کو دوبارہ مت دیکھو۔'' علینہ نے اُدیدا کر کہا۔ ''اب نہ جانے میرال اس لڑکے کو ملی یا نہیں جو اسے اور اس کی بوا کو ڈھونڈتا یہاں آیا تھا۔''

"اس لڑکے کی طرف سے کوئی اطلاع آئے تو مجھے ضرور بتانا۔" فہد نے کہا اور پھر ماضی کی یادوں [illegible] حال میں آتے ہوئے علینہ کو کوکنگ شو کے دوران ہونے والی چھوٹی بڑی بدحواسیوں، غلطیوں اور دلچسپ تجربات کی باتیں سنانے لگا۔

"تم کیا سمجھتے ہو، صرف تم ہی ماضی پرست ہو۔" اس رات علینہ نے اپنے پرانے اسکول بیگ سے ایک ڈبا نکالتے ہوئے سوچا۔ "اگر تم درمیان میں میرال کے قصیدے نہ پڑھنے لگ جایا کرو تو میں تمہیں ضرور بتاؤں کہ ماضی سے متعلق اور تم سے وابستہ میں نے کیا کچھ سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔" اس نے ڈبے سے ڈاک ٹکٹ کے پرانے البم کچھ آڈیو کیسٹس اور تتلیوں کے پروں سے سجے البمز نکالتے ہوئے سوچا۔ یہ سب چیزیں فہد ایبٹ آباد سے جاتے ہوئے اسے دے گیا تھا۔

☆☆☆

"مجھے اسی دن شک ہوگیا تھا تم پر جس دن تم مجھے اس چپٹی پھینی چڑیل کے گھر لے گئے تھے۔" آ[illegible] والے مہمانوں کی کراس کوئیچنگ سے نکلنے کے بعد نادر اپنی اماں اور بہنوں کی عدالت میں بیٹھا تھا۔ آپا نے کھٹا کھٹ باقی بہنوں کے فون نمبر گھما کر انہیں بھی اماں کے پاس بلالیا تھا اور اب خوب ہی نادر کے لتے ہو رہے تھے۔

"توبہ، توبہ چپکے چپکے نکاح کرلیا......" ایک بہن نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔"

"اور وہ بھی چوہے اور مینڈک کھانے والی لڑکی سے۔" چھوٹی بہن اپنا گود کا بچہ تھپکتے ہوئے بولی۔

"ناک کٹوا دی نادر تم نے، اب ہمارے......" بڑی آپا نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہم سب کے" انہوں نے باقی بہنوں اور خود کی طرف اشارہ کیا۔ "سسرال والے کیسے کیسے طعنے نہ ماریں گے ہمیں۔" ان [illegible] آنکھوں میں نہ جانے کدھر سے آنسو بھی امڈ آئے۔ "کیوں امی جی، آپ کیوں نہیں بول رہیں۔" خاموش کیوں ہیں؟" انہوں نے لحاف میں سکڑ سمٹ کر بیٹھی امی کی طرف دیکھا۔

"امی تو لگتا ہے صدمے سے گنگ ہوگئیں۔" چھوٹی بہن نے کہا۔ بڑی دونوں بہنیں لپک کر ماں [illegible] پلنگ پر جا بیٹھیں اور ان کے کندھے اور ٹانگیں دبانے لگیں۔

"نادر، غیر مسلم کو پہلے مسلم بھی کیا تھا کہ یونہی جھوٹا موٹا نکاح کرلیا؟" امی نے خلا میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"اوہو امی جی......" آپا نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "یہ ہی تو بتایا ہے کہ وہ منحوس اسی بات کا دعویٰ کر[illegible] نادر کو پٹا گئی کہ وہ مسلمان ہے۔"

"ہیں نادر......؟" امی نے تصدیق کے لیے نادر کی طرف دیکھا۔

"جی......" نادر نے سر جھکا کر کہا۔

"صرف دعویٰ ہی کرتی تھی کہ سچ میں مسلمان تھی۔" امی کی آواز تیز ہوئی۔

"بہت پکی مسلمان ہے امی۔" نادر نے مری ہوئی آواز میں کہا جو کچھ صبح سے وہ دیکھ چکا تھا اس کے بعد کچھ بھی وثوق سے کہنا ناممکن تھا۔

"تیری...... بلکہ تیری کیا میری اگلی نسل چپٹی، پھینی اور چوہی آنکھوں والی پیدا ہوگی۔ ان سے کون بیاہ کرے گا......" لمحے بھر کے لیے نادر کو امی کے کنسرن پر ہنسی آئی لیکن اس نے ہنسنے کے بجائے سر کو مزید جھکا لیا گویا نسل کی شکل بگاڑنے میں سب قصور اس کا تھا۔

"ہائے ہائے امی، آپ کو اگلی نسل کی پڑگئی۔" آپا نے دوپٹا منہ پر رکھتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا۔ "یعنی آپ نے پھینی بہو قبول کرلی۔"

"جو الٹ اس نے کرلیا، اسے واپس موڑ کر سیدھا نہیں کیا جاسکتا۔" امی نے سنجیدگی سے کہا۔ "ہمارے خاندان میں طلاق کا رواج ہے نہ علیحدگی کا جو دستخط ایک بار نکاح نامے پر ہوجاتے ہیں وہ طلاق نامے تک نہیں جاتے، بیویاں بھلے شوہروں کو چھوڑ کر جاتی ہیں تو جاتی پھریں۔"

نادر نے چونک کر امی کی طرف دیکھا، ایک اور غیر متوقع صورتِ حال اس کے سامنے تھی۔ وہ مر کر بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ امی اس سارے قصے کو یوں ٹھنڈے پیٹ ہضم کر جائیں گی۔ اس کا خیال تھا امی عملی طور پر اس کے سر پر جوتے برسا کر اس کا سر گنجا کردیں گی مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ ساری بہنیں انگشت بدنداں بیٹھی تھیں۔

"اور وہ جو سارے سسرال والے ہیں اور وہ جو برادری ہے، ملنے جلنے والے ہیں، ان کے منہ کون بند کرے گا۔" منجھلی بہن نے شاک سے نکلتے ہوئے کہا۔

"جس نے یہ کام کیا ہے، وہ یہ بھی جانتا ہوگا کیسے نمٹنا ہے لوگوں کی باتوں سے۔" امی سیدھی ہوتی ہوئی لحاف اپنے اوپر کھینچ کر لیٹ گئیں اور چہرہ گرم شال سے ڈھک لیا، یہ اس بات کی نشانی تھی کہ اب وہ مزید اس موضوع پر گفتگو نہیں کریں گی۔

"کوئی ضرورت نہیں کسی سے فی الحال اس ساری بات کا ذکر چھیڑنے کا۔" بڑی آپا نے آئندہ کا لائحہ عمل طے کرتے ہوئے کہا۔ "واپس آئے گی بیگم صاحبہ اگر کبھی تو دیکھی جائے گی۔" انہوں نے کن انکھیوں سے نادر کی طرف دیکھا۔

"میں نظروں کے سامنے رہا تو دیکھوں گی ناں تم لوگ۔" نادر نے دل میں اس ایک طوفان کے ٹل جانے پر شکر ادا کرتے ہوئے سوچا۔ "یہاں تو زندہ بچ جانے کے بھی چانسز معدوم نظر آتے ہیں، نہ جانے کب کون اٹھانے آجائے اور میں بھی لاپتا، گمشدہ لوگوں میں شمار ہونے لگوں۔"

☆☆☆

"میں آج آپ کے لیے ایک بہت خاص چیز لائی ہوں۔" بینش نے کلاس کی طرف جاتے ہوئے راستے میں دانیال سے مڈبھیڑ ہونے پر مسکرا کر کہا۔

"ارے، واقعی!" وہ خوش دلی سے بولا۔ "مجھے امید ہے وہ اندرونِ لاہور کا کوئی خاص اور ثقیل کھانا نہیں ہے کیونکہ میں ایسے کھانے کھانا چاہتے ہوئے بھی کھا نہیں سکتا، میرے ڈاکٹر نے مجھے اس سے سختی سے منع کر رکھا ہے۔"

"نہیں!" بینش دانیال کے خیال پر جھینپ کر بولی۔ "وہ ایسی کوئی چیز نہیں ہے صرف ایک اتفاقیہ فائنڈنگ ہے۔"

"اوہ...... پھر تو میں دل سے اسے دیکھنا چاہوں گا۔" وہ مسکرایا۔

"کلاس کے بعد دکھاؤں گی، آپ اس وقت کہاں ہوں گے؟" بینش نے کلاس روم کے دروازے کے درمیان کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"قوی امید ہے کہ میں کیفے ٹیریا میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں گا۔" وہ مسکرا کر بولا اور سر ہلاتا ہوا آگے چلا

گیا۔ ساٹھ منٹ کی وہ کلاس ہنش کو اب تک کی سب سے طویل کلاس محسوس ہوئی تھی۔

☆☆☆

''کیا ضروری ہے کہ میں اپنے گھر کے مسائل پر دماغ کھپانے کے ساتھ ساتھ حمزہ کے مسائل پر بھی ضروری ہی سر کھپاؤں۔'' نگین نے سرف میں بھگوئے دوپٹے ملتے ہوئے سوچا۔ اس کی ساس، نئے سوٹ اور دوپٹے واشنگ مشین میں دھلوانے کی قائل تھیں نہ ہی کپڑے دھونے والی ماسی کے ہاتھ میں دھلائی کے لیے پکڑانے کو پسند کرتی تھیں۔ لہٰذا نئے سوٹ اور دوپٹے نگین کو خود الگ سے دھونے پڑتے تھے۔ اس لیے اس کی جھنجلاہٹ اس روز عروج پر تھی، گزشتہ ایک ہفتے سے وہ لوگ مسلسل ملنے والوں اور رشتے داروں کی شادیوں کے مختلف فنکشنز اٹینڈ کر رہے تھے اور اس روز نتیجتاً نگین کے لیے کپڑوں کا ایک ڈھیر دھونے کو موجود تھا۔

''حمزہ کو بھی تو ایک نئی ہی سوجھی ہے ناں......!'' اس نے سرف میں نئے دوپٹے ڈالتے ہوئے سوچا۔

''ایک ایسی لڑکی کی تلاش جس کا پتا نشان کوئی ہے نہیں جیسے برسوں سے اس نے دیکھا نہیں اپنے سر پر سوار کر لی ہے۔ اس روز جہاں مجھے لے گیا تھا اچھرے کی تنگ گلیوں اور بازاروں سے گزرتا ہوا، وہ کوئی جگہ تھی کسی نارمل انسان کے جانے کی......'' اسے یاد آیا۔ ''اور وہاں جا کر بھی نہ وہ لڑکی ملی نہ اس کا کوئی نام ونشان......'' اس نے سر جھٹکا...... ''سچ تو یہ ہے کہ سب میری مروت سے فائدہ اٹھاتے ہیں، جس کا دل چاہتا ہے مجھے انگلی سے لگا کر چل پڑتا ہے اور میں چلی بھی جاتی ہوں۔'' اس نے منہ بنایا۔ ''کاش کبھی اشعر ہی مجھے سمجھائے اور منع کرے ہر کسی کی بات مان لینے سے...... مگر وہ تو سراہتا ہے میری اس عادت کو کہ میں سب کی مدد کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہوں اور حمزہ کا تو وہ ویسے بھی بڑا فین ہے۔ اس کے ساتھ مل کر اس فلاحی مقصد کی خاطر خوار ہونے کو بھی وہ تیار کھڑا ہے مگر سوال یہ ہے کہ حمزہ اس لڑکی کو ڈھونڈ کر کرے گا کیا...... اس کی اس تلاش کا مقصد کیا ہے؟'' الگنی پر دھلے ہوئے کپڑے ڈالتے ہوئے اسے خیال آیا۔

''اگر تو وہ اس خیال میں ہے کہ وہ اس لڑکی کو ڈھونڈ لینے کے بعد نیکی کی ایک اعلیٰ مثال قائم کرتے ہوئے اس سے شادی کر لے گا تو پھر یہ تو سوچ ہے اس کی کیونکہ مہرین آنٹی اسے کبھی، کسی صورت میں بھی ایسا نہیں کرنے دیں گی، میں نے سنا ہے کہ وہ فیملی اور فیملی سے باہر ایسی لڑکیوں پر حمزہ کے لیے نظریں لگائے بیٹھی ہیں جن کے پاس جمال بھی ہے اور مال بھی ہے۔'' اسے اپنی سوچ پر ہنسی آ گئی ٹب میں بچا باقی پانی سامنے اچھالتے ہوئے وہ ہنس دی اور کپڑے دھونے کا تمام سامان سمیٹنے کے بعد کچن کی طرف چل دی۔

☆☆☆

''دانیال نے ابھی کچھ دیر پہلے پوری آنکھیں کھول کر ہماری طرف دیکھا ممی......'' سکتے، رنج، بے یقینی اور اضطراب کی کیفیت میں اس روز عافیہ جب اسپتال پہنچیں تو ان کے انتظار میں اسپتال کی لابی میں بے چینی سے ٹہلتے ہوئے عاصم نے ان کی طرف دیکھ کر خوشی سے کانپتی آواز میں انہیں بتایا تھا۔

''صوفی صاحب نے کہا تھا عافیہ بیٹی کو میری طرف سے بھی مبارک باد دیجیے گا اور اس سے کہیے گا کہ میں خود اسے مبارک باد نہ دے سکوں گا کیونکہ میری فلائٹ کا وقت ہو گیا ہے۔'' بیگم اکرام اللہ کے الفاظ ایک بار پھر عافیہ کے اردگرد بازگشت کی صورت گونج تھے۔

(جاری ہے)



شامِ شہر یاراں

عنیزہ سید

قسط 6

زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے۔ ۔ ۔ خیر و شر، نیکی او ربدی۔ ۔ ۔ زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت۔ ۔ ۔ ہر برائی پر حاوی ہوجاتی ہے اوراسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سیّد نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

وہ تیسری دنیا کے ایک ایسے ترقی پزیر ملک کی سیاست کے باب پڑھ رہا تھا جس کی ترقی کو اقتصادی تنزّل، کساد بازاری اور مفاد پرستی کے کیڑے جڑوں سے کترنے میں اتنے ہی سالوں سے مصروف رہے جتنے سال اس کے قیام کو ہو چکے تھے۔ اس ملک کی جڑیں کترنے والے چوہوں میں یہاں بسنے والے چند ایسے خاندان بھی شامل تھے جن کی نسلوں کی نسلوں نے یہ فریضہ بخوبی ادا کیا تھا۔ خود اس کے پُرکھے بھی انہی چوہوں میں شامل تھے۔ نسلیں چہرے بدلتے، بدلتے اس تک آ پہنچی تھیں، وہ جو مہرزاد تھا...... جو اس خاندان کی نہ جانے کون سوئیں پیڑھی تھا۔ جسے اس کے باپ نے چیفس کالج میں داخل کروایا تھا اور جو چیفس کالج کے معیار کو اس کے لیے مناسب نہ سمجھتے ہوئے اسے اس وقت اپنے ساتھ انگلینڈ لے گیا تھا جب ابھی وہ پانچویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد اس ملک میں جس کی رگوں میں وہ کمزور خون دوڑتا تھا جس میں سے اپنا حصہ چوس کر اس کا باپ اپنی شان، نام اور شملے کو درجۂ اول میں شمار کراتا تھا، اس کی آمد بھی کبھار کی چھٹیوں ہی میں ہوتی رہی تھی۔ ایسی ہر آمد پر اس کے باپ کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اس نظام کے پیچ وخم اور اتار چڑھاؤ سے مقدور بھر تعارف حاصل کر لے جس کا حصہ بقول اس کے باپ کے اسے ایک نہ ایک دن بننا ہی تھا۔ اس نظام جس کی اوپری سطح پر باپ اسے اپنے ساتھ کھڑا کرتا تھا، کی تہ میں بغیر کسی کے بتائے اسے نہ جانے کیوں گھٹی گھٹی آہیں، سسکیاں اور دم توڑتی سانسیں سنائی دیتی تھیں۔ ہائی اسکول میں پہنچنے تک وہ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنے کے فن سے روشناس ہو چکا تھا اور یہ فنکاری سیکھنے میں بھی وہ اپنا استاد خود بنا تھا۔ ایک دو بار کی نسبتاً طویل چھٹیوں کے دوران اس کی بطورِ خاص تربیت پر خصوصی توجہ دی گئی تھی۔ گھڑسواری، نیزہ بازی، شمشیرزنی، تیراکی، فنِ تقریر، لفاظی، بیان ایسے فنون تھے جن پر مہارت حاصل کرنے کے لیے اس کے باپ نے انگلینڈ میں اس کے لیے بطورِ خاص انہی فنون کے ماہرین کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں لیکن ان سب فنون کے ذریعے اپنے ماحول میں دشمن کو کیسے چت کرتا ہے یہ اسے ان طویل تعطیلات میں سکھائے جانے کی کوشش کی جاتی رہی مگر انہی دنوں اسے محسوس ہوا کہ جتنی دلچسپی اس کا باپ اسے اس نظام کا حصہ بنانے میں لے رہا ہے اتنا ہی اس کا دل اس نظام کے قریب جانے سے بدکتا تھا۔

''تم اپنی ماں کا خون اور میری بوٹی لے کر پیدا ہوئے ہو۔'' کبھی کبھار اس کا باپ ایک ہلکا سا تبصرہ کرتے ہوئے کہہ ہی دیتا اور پھر اپنے زانو پر زوردار ہاتھ مارتا۔ ''سالی پوری ہیئت ترکیبی ہی الٹی ہو گئی۔'' مہرزاد اپنے باپ کے ان الفاظ کو خوب سمجھتا تھا، اسی لیے نگاہیں جھکائے خاموش بیٹھا رہتا۔

''لیکن کوئی نہیں۔'' پھر اس کا باپ جیسے خود کو تسلی دیتا۔ ''شکرے کی اولاد، باز کا بچہ اور عقاب کا لعل ولن، اسی کی فطرت پر جاتا ہے چاہے خون کبوتر کا ہی دوڑتا ہو اس کے اندر۔''

اسے لگتا یہ اس کے باپ کی خود کو دی جانے والی طفل تسلی ہی تھی۔ اس کے باپ کو ایسی تسلیوں کی ضرورت بھی تھی کیونکہ حویلی کے اندر موجود اس کی درجن سے اوپر نکاحی بیویوں اور اَن گنت بے نکاحی عورتوں سے لے کر دارالحکومت میں موجود اس کی بے شمار سہیلیوں اور داشتاؤں میں سے مہرزاد کی ماں کے علاوہ اس کے لیے کوئی بھی عورت اولادِ نرینہ کو جنم نہ دے سکی تھی۔ اگرچہ ملک کے اندر اور ملک کے باہر وہ کسی بھی ایسی عورت کو اپنی جائز قانونی بیوی کی حیثیت دے دینے پر دل و جان سے راضی تھا جو ایک اصل خون، جیتا جاگتا بیٹا اس کے لیے پیدا کر سکتی۔ اس کی یہ کوشش اس وقت تک جاری رہی تھی جب تک وہ صرف نام کا

مرد رہ جانے کی حالت تک نہیں پہنچ گیا۔ اس وقت تک پہنچ کر مہرزاد کی حد تک اس کی آواز پست، خوشامدی اور گھگیائی ہوئی تھی۔

''تمہارا نانا، تمہارے مامے سب ایسے تُخم سے اٹھے ہیں جس میں زنانہ خصوصیات بھاری ہیں لیکن تم مہرزاد خان ہو۔ خان زادہ شہاب الدین خان کے اکلوتے سپوت ایک ایسے خانوادے کے چشم و چراغ ہو تم جس کی نسلیں سپہ گری کی ماہر اور جس کے نمائندے کا گھوڑا جنگ میں بھی اور امن میں بھی ہمیشہ صفوں کے آگے تنہا کھڑا ہوتا تھا۔ we are born leaders Meharzad Khan۔''

اس کے باپ کی آواز بلغم زدہ اور بیٹھی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔ بہترین میڈیکل اسپیشلسٹوں کے بتائے سپلیمنٹس اور طاقت کے کیپسول اور نامور حکما کے کُشتے بھی اس کی اس صحت کو دوبارہ پاؤں پر کھڑا کرنے میں ناکام ثابت ہو رہے تھے۔ جسے اس نے اپنے عالمِ شباب اور ڈھلتی عمر کے چسکوں میں گنوایا تھا مگر اس میں ابھی اتنا دم خم تھا کہ اپنی سلطنت کی رعایا کے سامنے، اسمبلی فلور پر، پریس اور میڈیا کے نمائندوں کے سامنے اتنا ٹھہر ٹھہر کر، ایسا جم کر بولتا تھا کہ سننے والا آپ سے آپ مرعوب ہو کر رہ جاتا۔ یہ تو صرف مہرزاد خان تھا جس پر انحصار کرنے جس پر اکتفا کرنے کے سوا اس کے پاس اس عمر میں کوئی چارہ نہیں رہا تھا اور جس کے سامنے بات کرتے ہوئے وہ آپ سے آپ گھگیانے لگتا تھا۔

''جب صحت کمزور ہونے لگے ناں تو طاقت ور سے طاقت ور انسان کو بھی تازہ اور صحت مند خون کی ضرورت پڑنے لگتی ہے۔'' وہ منّت بھرے انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا۔ ''خون شون کی بو کوئی نہیں ہے۔ تم جنہیں مظلوم گردانتے ہو اور جو ہمارے بچاؤ کے لیے مرتے ہیں وہ ہم سے اس نظام سے محبت اور اس کے دفاع کے لیے مرتے ہیں۔ ان کی نسلوں کی بقا ہمارے ساتھ جُڑے رہنے میں ایک راز کی طرح پوشیدہ ہے یونہی بغیر کسی لالچ کے بغیر کسی وجہ کے بنا کسی مقصد کے کون اپنی جان گنواتا ہے خان اور پھر یہ سوچو فوج کا کون سا ایسا تربیت یافتہ دستہ ہو گا جو حالتِ جنگ میں موت کو سامنے پا کر اپنے ہی جنگجو کو فرار کرانے لگے۔ لڑنے والے کو موت کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر تو دیکھنا ہی ہو گا، سر کاٹنا یا سر کٹانا ایک کام تو کرنا ہی پڑے گا ناں۔''

یہ بات یقیناً اس نے اس مضمون کو پڑھنے کے بعد کہی تھی جسے مہرزاد نے اپنے کالج میگزین کے لیے لکھا تھا اور جس میں جنوبی ایشیا کے فیوڈل سسٹم کے ماحول میں رچ بس جانے والی مظلوم خون کی بو کا خصوصی ذکر کیا گیا ہے۔

مہرزاد اپنے باپ کی صرف سنتا تھا۔ اس نے اپنے باپ سے بحث نہ کرنے اور اس کی کسی بات کا جواب نہ دینے کا فیصلہ نوعمری ہی میں کر لیا تھا۔ جس نظام سے، جس ماحول سے اس کا دل کوسوں دور بھاگ جانے کی ترغیب دیتا تھا۔ اس سے متعلق قصے، کہانیاں اور ہدایات سن کر ان پر بحث مباحثہ کرنے اور تنقیدی نکات اٹھانے کی اسے ضرورت ہی کیا تھی۔ اپنی گریجویشن کا وقت آنے تک وہ لندن کی اونچی سوسائٹی میں ایک پاکستانی امیرزادے جو شکل و صورت میں قابلِ قبول، شخصیت میں شاندار اور اپنی ذاتی زندگی میں مغرور اور لیے دیے رہنے والا کا سا مقام حاصل کر چکا تھا۔ وہ اس معاشرے اور اس کے ادب آداب سے مانوس ہو چکا تھا اور اس کا واپس پاکستان جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس کے باپ کے ایک ایسے دوست جس کا اثر رسوخ قابلِ ذکر اور ناقابلِ تردید تھا نے اس کے لیے ورلڈ بینک میں ایک پرکشش جاب کا انتظام کیا

ہی تھا کہ پیچھے علاقے میں اس کے باپ کو نامعلوم افراد نے دن دیہاڑے سینے پر فائر مار کر قتل کر دیا تھا۔ ایک ایسا واقعہ جس نے نیویارک کی فلائٹ کی سیٹ کینسل کروا کر اسے راتوں رات واپس پاکستان بھجوانے کا بندوبست کر دیا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا ایک ایسا موڑ تھا جو اس کے پلان اے، بی حتیٰ کہ سی کا بھی حصہ نہیں تھا لیکن اس روز پاکستان آنے والی فلائٹ کے انتظار میں ڈیپارچر لاؤنج میں بیٹھے، بیٹھے ہی اس نے زندگی کا ایک نیا پلان ترتیب دے ڈالا تھا جس پر اس کے پہلے والے منصوبوں کا سایہ تک بھی موجود نہیں تھا۔ لندن سے پاکستان تک کی فلائٹ کے دوران اس نے اپنے نئے پلان کے تمام نکات کی ترتیب درست کر لی تھی اور پاکستان پہنچنے پر لوگوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے جو ظالمو جواب دو، خون کا حساب دو۔ رنگ لائے گا شہید کا لہو قسم کے نعرے لگا رہا تھا۔ اس نے ایک دم لائم لائٹ پر آجانے کی گھبراہٹ سے ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ بھی اپنے پلان کی ترتیب کو اوپر نیچے کرنے میں وقت گزارا تھا۔

''وہ انتہا سے زیادہ کمپوزڈ اور اپنی عمر سے زیادہ میچورڈ ہے۔'' اپنے پہلے پہل کے اِکا دُکا پبلک ایکسپوژرز (عوام سے ملاقات کے بعد) اپنے ہی علاقے کے مخالف کیمپ سے اس کے بارے میں اوّلین رائے کا اظہار ہوا۔

''وہ شکاری کی نظر، ماہر جنگ جو کی تڑپ، چالاک چالباز کی سی چال کا مالک مگر خاموش دشمن ہے۔'' دوسری رائے آئی۔

مہرزاد خان نے اپنے مزاج کے برعکس کارزارِ سیاست میں ایک خلافِ توقع انٹری دی تھی۔ وہ ایک جذباتی باپ کا سرد مزاج بیٹا تھا۔ روایتوں سے پیار کرنے والے، صدیوں پرانے نظام کے علم بردار شخص کا غیر روایتی اور صدیوں پرانے نظام کا بڑا مخالف جانشین۔ اس کے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو وہ سر اٹھا کر فتح کا ڈنکا بجانے والا تھا یا بُری طرح پٹ کر میدانِ جنگ سے الٹے قدموں بھاگ جانے والا بھگوڑا کہلانے والا تھا۔ اس کے سلسلے میں یہی دو آرا ملکی سیاست کے ہر کونے سے ابھر رہی تھیں مگر ان آرا کا اظہار کرنے والے بھی اس کے اندر موجود شخص کو ڈھنگ سے نہیں جانتے تھے۔ جب ہی اس کا آگے بڑھنے والا ہر قدم ان کی توقع کے خلاف پڑتا تھا۔ آئے روز اس کے مخالفین اس کے بارے میں اپنی آرا بدلنے پر مجبور ہونے لگے تھے اور کئی ایک تو اسے Unpredictable (ایسا شخص جس کے بارے میں حتمی رائے نہ دی جا سکتی ہو) قرار دے چکے تھے اور ایسا اس وقت تک ہو رہا تھا جب تک اس کے بارے میں کال گرل سے تعلق کی خبر منظرِ عام پر نہیں آئی تھی۔ شطرنج کی جس بساط پر وہ اپنے مہرے انتہائی مہارت سے آگے بڑھا رہا تھا۔ میڈیا پنڈتوں نے اچانک وار کر کے اس کے حفاظتی مہرے پِٹا کر اسے چیک میٹ (شہ مات) کال دے دی تھی۔

یہ ایک ایسا معاملہ تھا جو مہرزاد خان کے کسی بھی منصوبے کا حصہ نہیں تھا۔ امراؤ بیگم کی کوٹھی تک وہ اپنے جیسے ایک تازہ واردِ کوچۂ سیاست کے توسط سے پہنچا تھا اور وہاں ایک ایسی صورتِ حال کا شکار ہو گیا تھا جس پر پیچھے مڑ کر دیکھنے سے پتھر کا ہو جانے کا سا خدشہ لاحق ہو سکتا تھا۔ صنفِ نازک کا ساتھ اور سامنا اس کے لیے کوئی نیا تجربہ نہیں تھا۔ جس نظام سے اس کا تعلق تھا وہاں صنفِ نازک اگرچہ حویلیوں کی غلام گردشوں، ڈیوڑھیوں اور کوٹھریوں میں چھپا کر رکھے جانے والی جنس سمجھی جاتی تھی مگر جس پوشیدگی کے اندر وہ ظاہر ہوتی تھی اس کے تمام راز و نیاز سے وہ واقف تھا گو خود اس کے اپنے ذاتی تجربات میں اس وقت تک یہ تجربہ

شامل نہیں ہوا تھا یورپ اور امریکا کی جن فضاؤں میں وہ اس وقت تک پلا بڑھا اور سیر سپاٹے کرتا رہا تھا وہاں صنفِ نازک کے پیچ و خم ظاہر بلکہ برہنگی کی حد تک عیاں تھے۔ وہاں رہ کر منہ موڑ لینا، مجرّد بن کر رہنا، ناشناسائی کا دعویٰ کرنا سفید جھوٹ کے مترادف تھا۔ اکثر اپنی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے خیال گزرتا کہ صنفِ نازک کے سلسلے میں وہ حُسن، ناز و ادا، لباس، تعلیم، رہن سہن، ماحول اور رنگ ڈھنگ سے زیادہ اس کی ذہانت اور فنِ گفتگو سے متاثر ہوتا تھا۔ باقی تمام اوصاف کی نسبت یہ دو خوبیاں اکثر خواتین میں کم کم ہی پائی جاتی تھیں لہٰذا اس کے قریبی حلقۂ احباب میں صنفِ نازک کی تعداد ہمیشہ بہت مختصر رہی تھی۔ پاکستان واپسی کے بعد زندگی ایک دم اتنی مصروف ہو چکی تھی کہ اسے اس حیثیت میں جو اس کے باپ کے مرنے کے بعد اسے اچانک مل چکی تھی صنفِ نازک کی جس، جس کیٹیگری سے راہ و رسم بڑھانے کے جو مواقع ملے تھے، ان کے متعلق وہ رک کر سوچنے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھا کہ ان میں سے کون اپنے قریبی حلقۂ احباب میں شامل کیے جانے کے قابل تھی۔ وہ اپنے تئیں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا مگر امراؤ بیگم کی کوٹھی جس کے متعلق اس نے سنا تھا کہ یہاں کی چند گائیکائیں فنِ موسیقی پر ایسا ملکہ رکھتی تھیں جسے کلاسیکی کا درجہ دیا جا سکتا تھا۔ وہ برِصغیر پاک و ہند کے ورثۂ موسیقی کا بہت بڑا مدّاح تھا اور مختلف راگوں کے بارے میں سیر حاصل ریسرچ کر چکا تھا۔ امراؤ بیگم کی کوٹھی میں اس نے اسی شوق کے تحت کسی خوش گلو مغنیہ سے راجستھانی گیت، ٹھمری یا کجری سننے کے لیے قدم رنجہ فرمایا تھا مگر یہاں اس کا پاؤں ایک ایسے چوہے دان میں پھنس کر رہ گیا تھا جو اس کے واہمے میں تھا نہ خیال میں۔

زرنگار نے اسے اپنے حسن سے نہیں نہ رکھ رکھاؤ سے، گفتگو سے نہیں سلیقۂ گفتگو سے، عقل سے نہیں بلکہ اپنی ذہانت سے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ وہ جو گھنٹے دو گھنٹے کی فرصت سے یہاں آواز سننے کی خاطر آیا تھا کسی کی ہزار ہا نوں کی قیمت ادا کرنے پر پل بھر میں تیار ہو گیا تھا۔ وہ ایسا غیر محتاط، اتھلا اور جلد باز ہرگز نہیں تھا جیسا زرنگار کے سلسلے میں ثابت ہوا تھا۔ جاننے کی جستجو اور گہرائی تک جانے کا شوق اسے بچپن سے تھا۔ اپنے اکثر قیمتی کھلونے وہ ان کے اندر موجود اس جادوئی طاقت کا نظارہ کرنے کی خاطر توڑ دیا کرتا تھا جو انہیں چلاتی تھی۔ دنیا کے اکثر ایسے تفریحی مقامات تک جن کی سیر کسی مہم جوئی سے کم نہ گردانی جاتی تھی وہ بصد شوق پہنچتا تھا اور پُراسرار غاروں، پہاڑوں کی کھوؤں، گہرے پانیوں کی تہوں، قدیم عمارتوں کے پُرپیچ تنگ راستوں تک رسائی حاصل کر لینے تک چین سے نہیں بیٹھتا تھا۔ اس کے اسٹڈی روم میں World's most mysterious and dangerous sites قسم کے عنوانات جیسی کتابوں کی بھرمار تھی۔ انٹرنیٹ پر بھی اس کی تلاش ایسی ہی جگہوں کے بارے تک محدود رہتی تھی۔ اسرار کو جان لینے کا یہی خبط زرنگار کے سلسلے میں اسے احتیاط، صبر اور سکون جیسے الفاظ بھلا گیا تھا۔ جس کا نتیجہ اخباروں میں اس کے بارے میں مرچ مسالا لگے وہ اسکوپس تھے۔ الیکٹرانک میڈیا پر ٹاک شوز میں ہونے والی وہ گرما گرم بحثیں تھیں جو اس کے باپ کی سیاسی جماعت اور اس کے مخالفین کے نمائندوں کے درمیان ہو رہی تھیں اور جنہوں نے اس ضمنی الیکشن کی مہم پر خاصی منفی اثر ڈالا تھا جو اپنے باپ کی خالی ہو جانے والی نشست پر وہ لڑنے جا رہا تھا۔ اس کے حامی، ووٹرز، قریبی دوست، پارٹی راہ نما، الیکشن کے اسٹیک ہولڈرز، میڈیا پروموٹرز اور پریس اسٹاف سب ہی اس صورتِ حال پر پریشان اور گھبرائے ہوئے تھے۔ ان کے خیال میں قسمت کا گھوڑا اس کے ساتھ ترپ چال چل گیا تھا۔

''ہمیں بخوبی اندازہ ہے کہ غلطیاں کیسے کی جاتی ہیں اور پھر ان غلطیوں کو درست کیسے کیا جاتا

ہے۔'' اس نے اپنے پرسنل اسٹاف سے بات کرتے ہوئے کہا تھا۔

''آپ سب اپنے حواسوں پر قابو پاتے ہوئے ہانپنا بند کریں۔ میں آپ کو نہ صرف یہ الیکشن جی دکھاؤں گا بلکہ اس نشست پر آئندہ آنے والے کئی الیکشنز میں پارٹی کی جیت بھی یقینی بنا کر دکھاؤں گا۔'' اس کے لہجے میں اتنا یقین، اتنی پختگی تھی کہ کئی ایسے اسٹاف ممبرز جن کی گھگی بندھی ہوئی تھی اس شام تک جم کر کرنے کی پوزیشن میں واپس آچکے تھے۔

☆☆☆

اسے زندگی پچھلے کئی سالوں میں اتنی ٹھہری ہوئی اور خشک نہیں لگی تھی۔ کہنے کو وہ اپنے آبائی واپس آچکی تھی۔ جہاں اسے رنگ، نین نقش، نسل، شباہت اور زبان کے سلسلے میں کسی اجنبیت کا نہیں تھا۔ اس کے اردگرد سب لوگ اسی کی طرح کے ہی تھے۔ گوری رنگت، ناٹے، اور بوٹا قد، ناک، چھوٹی آنکھیں وہی زبان بولتے ہوئے جس میں اس کی اپنی زبان بھی رواں تھی مگر وہ اجنبی کے اس احساس کا کیا کرتی جو اس کے لیے حرزِ جاں بنا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی اسے لگتا اس کی آنکھیں، کان بلکہ جسم کا ایک، ایک عضو محوِ انتظار تھا۔ اس ملک سے آنے والی کسی ایسی اطلاع کا انتظار جس کے مطابق اسے اس ملک کے ایک باسی کی بیوی ہونے کی حیثیت سے وہاں کی شہریت اور قیام کا اجازت نامہ وصول ہونے والا تھا۔ اسے لگتا جیسے ہی وہ اجازت نامہ اس کے ہاتھ آنے والا تھا ویسے ہی اس کے پاؤں میں بندھی زنجیریں ٹوٹ جانی تھیں۔ اس کی روح کی بے چینی ختم ہو جانے کا امکان تھا۔ اس ملک کی جو اس کا اپنا تھا لگی بندھی زندگی، محنت، کام اور اپنے کام سے کام رکھنے والے مزاج، سڑکوں پر بلّیوں کی طرح رواں سائیکلیں، کشادہ اور طویل سڑکوں کے کناروں پر کھڑی بلند و بالا عمارتیں، لوگوں کے چہروں پر سجی مخصوص پیشہ ورانہ مسکراہٹیں، اسے اس مخصوص لگی بندھی زندگی سے اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔ اسے رہ رہ کر زندہ دلوں کا وہ شہر یاد آتا تھا جہاں کے لوگوں کی اکثریت کو کسی قانون اور قاعدے کی پروا نہیں تھی۔ ٹریفک بے ہنگم اور بے ترتیب تھی۔ ٹریفک سگنلز کی پروا نہ کرنے والے، انہیں توڑ کر درمیان سے کہیں نکل جانے والے، دکانوں، کھوکھوں، شاپنگ سینٹرز پر مول تول، بھاؤ بحث کرکے خریداری کیے بغیر چلے جانے والے لوگ جن کے پاس یہ سب کرنے کی فرصت ہی فرصت ہوتی، کھانے پینے کے اسٹالز پر کھانا کھاتے ہوئے ملکی سیاست سے لے کر گلی محلوں تک کی سیاست ڈسکس کرنے والے لوگ، آفسز، کالجز اور اسکولز کے ٹرانسپورٹ پوائنٹس پر تاک لگائے کھڑے نوجوان، جن میں سے کئی پریشان حال لوگوں کی مدد کو تیار نظر آتے اور کئی صرف آنکھیں سینکتے کھڑے ہوتے، شور مچاتے، موٹر بائیکس کے سائلنسرز نکال کر سڑکوں پر رواں دواں لوگ جو اپنی فرسٹریشنز، اپنے دکھ، غم قسم کے ہلّوں گلّوں میں اور شور و غوغا بپا کرکے کم کرتے تھے۔ اسے وہ سب لوگ کتنی شدت سے یاد آتے تھے۔ مشکل زندگی گزارنے والے آسان اور بے ضرر لوگ۔ اپنے وطن کے خاموش اور مہذب ماحول میں اکثر صبحوں اور شاموں کو اسے مسجدوں کی بلندیوں پر چمکتے سنہری کلس، سفید اونچے مینار اور سبز گنبد یاد آتے۔ جن میں اٹھتی اذانوں کی آوازیں صبح کے نیم اندھیروں اور شام کے جھٹپٹوں... کا حصہ تھیں اور کتنی مانوس لگتی تھیں۔

''یہاں سب کچھ ہے مگر یہاں بہت کچھ کم ہے۔'' زوئی حسین اکثر بے کل ہو کر سوچتی اور پاکستان

آئی ای میلز کھول کر بیٹھ جاتی۔ اس کے کولیگز، اس کی اِکّا دُکّا پاکستانی دوست اسے اکثر مختصر میلز بھیجتی تھیں اور اس کی خیریت معلوم کرنے کے ساتھ اسے دعاؤں کا تحفہ بھی بھجواتی تھیں۔ وہ ان مختصر میلز کو بار بار پڑھنے کے بعد نادر مراد کی بھیجی میلز کھولتی جو گنتی میں بہت کم تھیں بہ مشکل تین چار مگر ان میلز میں اس کے لیے امید کا پیغام ہوتا تھا۔ جلد اچھی خبر ملنے کی نوید ہوتی تھی اور عنقریب اس سے دوبارہ ملاقات کے ساتھ ساتھ اس سے بحیثیت شریکِ زندگی ملاقات کی بے چینی بھی تحریر ہوتی تھی۔ زوئی حسین کے لیے نادر کی یہ ای میلز اثاثۂ حیات ثابت ہوئی تھیں۔

طویل ہوتے انتظار اور امید و بیم میں ڈولتے انہی دنوں میں وہ ایک مختلف دن تھا۔ جب اسے اپنے موبائل فون پر نادر کا ایک ٹیکسٹ میسج وصول ہوا تھا۔

''وقت ملتے ہی فوراً اسکائپ پر آؤ۔'' اس پیغام کے اندر کیا چھپا تھا۔ کوئی خوش خبری یا پھر مایوسی اور یا پھر مزید انتظار کا جانکاہ پیغام..... اس دوپہر جب اس کا شہر شدید برف باری کی زد میں تھا وہ ڈولتے دل کے ساتھ ایک نیٹ کیفے پہنچی تھی۔ نادر کو اسکائپ پر کال کرنے سے پہلے وہ دل میں یقین کر چکی تھی کہ نادر اس وقت اسے مل بھی سکے گا یا نہیں۔ اس کی توقع کے مطابق نادر چند سیکنڈز میں ہی اس کے سامنے ایل سی ڈی مانیٹر اسکرین پر موجود تھا۔

''السلام علیکم!'' اتنے دنوں بعد ایک مانوس شکل کو سامنے دیکھ کر یقیناً اس کے لہجے میں مسرت کی کھنک گونجی ہوگی اور اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک نظر آئی ہوگی۔

''وعلیکم ۔۔۔'' جواب میں اسے نادر کا لہجہ خشک، کھردرا اور نہ جانے کیوں تحقیر آمیز سا لگا۔ اس نے ان کے سلام کا مکمل جواب کیوں نہیں دیا تھا۔ کیا اسے اس کے مسلمان ہونے پر شک ہونے لگا تھا۔ زوئی حسین نے لمحے کے ہزارویں حصے میں یہ باتیں سوچ لی تھیں۔

''تم کیسے ہو نادر؟ میں تمہیں بہت یاد کرتی ہوں۔'' لیکن پھر بھی اس نے اپنے دل میں اٹھتے وہم جھٹک کر خوش دلی سے پوچھا تھا۔

''میں نے تم پر اعتماد کیا تھا زوئی۔ اس لیے کہ میں تمہیں ایک نیک فطرت اور نیک نیت انسان سمجھتا تھا۔'' جواب میں نادر نے اسی خشک اور کھردرے لہجے میں کہا۔ زوئی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرت سے اسکرین کی طرف دیکھا۔ ''لیکن اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارے ہاں غیر ملکیوں اور غیر مذہب کے پیروکاروں کے بارے میں جو بھی سوچا جاتا ہے بالکل ٹھیک سوچا جاتا ہے۔'' نادر کیا کہہ رہا تھا زوئی کے پلے اب بھی کچھ نہیں پڑا تھا اگرچہ وہ اس کے الفاظ سن سکتی تھی اور سمجھ سکتی تھی۔

''پورے پاکستان میں تمہیں میں ہی ملا تھا اُلّو بنانے کے لیے؟'' اس کے لہجے میں اب غصہ اور رنج اتر آیا تھا۔ ''جبکہ تم جانتی بھی تھیں کہ میرے حالات کتنے پیچیدہ اور میری اپنے گھر میں حیثیت کتنی مشکل ہے۔''

زوئی نے حیرت اور بے یقینی کی انتہا پر پہنچتے ہوئے اپنی محسوس نہ ہونے والی سیاہ پلکیں تیزی سے جھپکائیں۔

''خود تو تم اڑ کر مزے سے اپنے ملک کی آزاد فضاؤں میں پہنچ گئیں اور یہاں تمہارے کرتوتوں کی سزا تو میں ہی بھگتوں گا ناں!'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''اپنی اس حماقت کے سبب جو تم سے ہمدردی کرنے کی خاطر میں کر بیٹھا ہوں۔''

زوئی یقیناً ششدر تھی جب ہی الفاظ اس کے منہ سے نکل ہی نہیں پا رہے تھے۔

''ہاں بھئی، تمہارا کیا جاتا ہے؟ چاہے میں عمر بھر پاکستانی جیلوں کی ہوا کھاتا، سڑتا رہوں۔ مجھ تک نہ اپنے کی رسائی ہو نہ ہی کسی کو کچھ خبر ہو کہ میں ہوں کہاں...... زندہ بھی ہوں یا مر گیا ہوں۔'' وہ منہ بنا نروٹھوں کی طرح بولے چلا جا رہا تھا۔

''نادر!'' زوئی نے بہ مشکل لفظ اپنے منہ سے ادا کیا تھا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو، میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی۔'' اسے لگا جیسے قوتِ گویائی چھن جانے کے بعد وہ پہلی دفعہ بولنے کے قابل ہوئی ہو۔ اس کے الفاظ رک رک کر منہ سے ادا ہوئے تھے اور انہیں ادا کرتے ہوئے اسے اپنا تالو کھنچتا سا محسوس ہوا تھا۔

''معصوم اور انجان بننے سے کیا ہوگا زوئی جبکہ تمہارا پورے کا پورا منصوبہ مکمل طور پر عیاں ہو چکا ہے۔'' نادر کا لہجہ کڑوا ہو گیا۔ زوئی کو اس کے چہرے پر اپنے لیے نفرت بلکہ شدید نفرت کا رنگ نظر آیا۔

''نادر پلیز ایسے مت دیکھو مجھے۔'' زوئی نے بے چینی سے کہا۔

''میں یہاں بیٹھا تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتا زوئی۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ بھی سچ ہے کہ حماقت میری ہی ہے۔ سزا بھی مجھے ملنی چاہیے۔ میں نے ایک بار بھی رک کر یہ کیوں نہیں سوچا کہ آج کے دور میں جبکہ پاکستانی لڑکیاں بھی مجھ ایسے ایوریج لڑکے سے شادی کرنے میں متامل ہو سکتی ہیں تم جہانِ اول کے ایک انتہائی ترقی یافتہ ملک کی اجنبی لڑکی ایک پاکستانی لڑکے اور وہ بھی مجھ ایسے ایوریج پاکستانی لڑکے سے شادی کرنے پر کیوں مُصر تھیں۔''

''ایک منٹ رکو نادر۔'' اب کے زوئی کو احساس ہوا کہ کہیں کچھ بہت زیادہ غلط ہو چکا تھا اسی لیے وہ شاک، حیرت اور بے یقینی کی کیفیت سے فوری طور پر نکلتے ہوئے بولی۔ ''مجھے تفصیل سے بتاؤ ہوا کیا ہے؟ میرے حوالے سے ایسی کیا بات ہو گئی ہے جو تم اتنا غصے میں ہو؟''

''ہونہہ۔'' وہ ایک بے بسی سے تمسخر کے ساتھ ہنسا۔ ''جیسے تم جانتی نہیں ہو کہ جو جرم تم نے کیا اسے نکاح نامے کے ایک کاغذ کے ساتھ میرے متھے لگا کر تم آزاد اور فرار ہو گئیں۔''

''تم کس جرم کی بات کر رہے ہو؟'' زوئی کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔

''کس جرم؟'' جواب میں وہ بھڑک کر بولا۔ ''اب نہ جانے تم کتنے جرم کر کے یہاں سے فرار ہوئی ہو جو تمہیں یہ بھی یاد نہیں آ رہا کہ کس جرم کی بات کر رہا ہوں میں۔''

زوئی نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اپنی سیٹ پر پہلو بدلا اور اس کیفے میں موجود باقی لوگوں پر نظر ڈالی جن میں سے کئی اِدھر اُدھر کھڑے بیٹھے ایک دوسرے سے بات کر رہے تھے اور کچھ اسی کی طرح مانیٹر اسکرین پر نظریں جمائے اسکرین کے اس پار بیٹھے کسی اپنے سے گفتگو میں مشغول تھے۔ اسے لگا وہاں موجود ہر چہرے پر اطمینان تھا، سکون اور بشاشت تھی۔ سب خوشگواری سے ہنس بول رہے تھے۔ سوائے اس کے جس کے چہرے پر یقیناً گھبراہٹ اور پریشانی تھی اور جس کا دل دھڑ دھڑ دھڑک رہا تھا۔

''نادر تم ایسا کرو کچھ دیر کے لیے اپنا غصہ بھلا کر مجھے یہ بتا دو ہُوا کیا ہے۔ اس کے بعد بھلے جتنا مرضی غصہ کرتے رہنا۔'' زوئی نے بے چینی سے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

''اگرچہ مجھے یقین ہے کہ تم سب جانتے ہوئے بھی انجان بن رہی ہو۔'' نادر نے یوں سر جھٹکنے کے بعد کہا جیسے اسے زوئی کی نرم گوئی پر مزید غصہ آ رہا ہو۔ ''لیکن پھر بھی سنو، میں اس قصے کی بات کر رہا ہوں جس

کے مطابق تم شاید سن دو ہزار پانچ کے زلزلے میں رضاکارانہ طور پر زلزلہ زدہ علاقوں میں گئیں اور وہاں سے نہ جانے کتنی معصوم، بے سہارا، لاوارث، زخمی اور خوب صورت لڑکیوں کو اغوا کرنے والے گروہ کا حصہ بن کر ایسے ایسے سیاہ کارنامے انجام دیتی رہیں جن کا ذکر کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔''

''اوہ میرے خدا!'' زوئی نے بے اختیار اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''استغفار توبہ استغفار۔''

''مت اتنی پارسا اور بھولی بننے کی کوشش کرو زوئی۔'' نادر نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں نہیں جانتا تھا میں تو اندازہ تک نہ کر پایا کہ تمہارا تعلق کسی ایسے گروہ سے تھا۔''

''کیا تمہارے پاس وہ شخص آیا تھا جو کئی ماہ پہلے میرے پاس بھی آیا تھا جس کے بارے میں، میں نے تمہیں کہا تھا کہ نیکی کرنے کی سزا ملنا کیسا ہوتا ہے۔'' زوئی نے سر جھٹک کر خود کو سنجیدگی سے بات کرنے کے قابل بناتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو تم اس گھناؤنے جرم کو نیکی قرار دیتی ہو؟'' نادر کے لہجے میں مزید نفرت جھلکی۔

''نہیں، میں اپنی اس نیک نیتی کو نیکی قرار دیتی ہوں نادر جس کے تحت میں نے وہاں سے اغوا کیے جانے والی ایک لڑکی کو اغوا کاروں کے چنگل سے بچانے کے لیے اپنی جان بھی خطرے میں ڈال دی تھی۔ اس لڑکی کو لے کر میں کہاں کہاں بھٹکی کدھر، کدھر چھپی یہ ایک لمبی داستان ہے۔'' زوئی نے پہلی بار پُرسکون لہجے میں کہا۔

''واہ اور اس لمبی کوشش کے بعد تمہارے ہاتھوں ہی وہ لڑکی ایسی غائب ہوئی کہ آج تک اس کا سراغ نہیں ملا؟'' نادر نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''نہیں ایسا نہیں ہے۔'' زوئی نے پوری سچائی سے نادر کی طرف دیکھا۔ ''ہم سیالکوٹ شہر کے قریب ایک گاؤں تک پہنچ گئے تھے کیونکہ اس لڑکی نے مجھے بتایا تھا کہ سیالکوٹ شہر میں اس کی دادی کی کوئی سہیلی رہتی تھیں۔ وہ اغوا کار شکاری کتوں کی طرح ہمارے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ ہم سیالکوٹ شہر کا راستہ پوچھتے، پوچھتے نہ جانے کہاں بھٹک گئے اور اسی راستہ کھونے کے دوران انہوں نے چلتی ویگن رکوا کر اسے شام کے وقت دوبارہ اٹھا لیا۔ میں ویگن سے اتر کر ان کے پیچھے بھاگی مگر انہوں نے میرے ٹخنے پر گولی مار کر مجھے زخمی کر دیا۔ میرے دائیں ٹخنے پر زخم کا نشان اس بات کا گواہ ہے۔ مجھے شوکت صاحب نام کے ایک شخص نے وہاں سے اٹھایا اور اسپتال پہنچایا انہی شوکت صاحب نے سارا قصہ سن کر مجھے مشورہ دیا کہ میں اس واقعے کو ہمیشہ کے لیے بھول جاؤں اور کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کروں۔''

''خوب اچھی کہانی گھڑی ہے تم نے۔'' نادر نے اس کی بات سے ذرہ برابر بھی متاثر نہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم جانتی ہو کہ یہ کیس کس برانچ میں ہے آج کل؟ اور جن کے پاس ہے وہ بات کی کھال کیسے اتارتے ہیں؟''

''میں سچ کہہ رہی ہوں نادر اور میں نے اس شخص کو بھی جو میرے فلیٹ پر آیا تھا یہی روداد سنائی تھی۔'' زوئی نے تیقن سے کہا۔ ''تم سوچو ان کے پاس ثبوت ہوتا تو کیا وہ مجھے اس وقت سے یہاں آنے تک آزاد چھوڑتے۔ کیا میرا نام ان لوگوں میں شامل نہ ہو جاتا جنہیں ان حالات میں پاکستان کی حدود چھوڑنے کی اجازت نہیں ہوتی؟''

''وہ سائے کی طرح ہی تمہارے پیچھے لگے ہوئے تھے زوئی۔ جب ہی تو انہیں اس نکاح کی بھی خبر ہے جو اپنے تئیں ہم نے خوب خفیہ انداز میں کیا تھا۔'' نادر اس کی بات کو سچ سمجھنے میں متامل تھا۔

''تو پھر مجھے ائرپورٹ پر ہی کیوں نہ آن و بوچا انہوں نے؟'' زوئی نے سوال کیا۔ ''میرا تو یہ خیال تھا کہ اگر کوئی غلط فہمی تھی بھی تو اس معمول کی کارروائی کے بعد ختم ہو چکی ہو گی۔ میں جانتی ہوتی کہ بات اتنی گمبھیر ہے تو کیا میں تم سے نکاح کرنے کی خواہش کرتی؟'' زوئی نے کہا۔

''تم یہ باتیں اتنی آسانی سے اس لیے بتا رہی ہو زوئی... کیونکہ تم ان کی پہنچ سے باہر اور محفوظ ہو۔''

''مجھے باتیں بتانے کی کیا ضرورت ہے نادر! میں تو محفوظ ہوں اور ان کی پہنچ سے باہر ہوں۔ تمہارے سامنے صفائی دینے کی بھی مجھے کیا ضرورت ہے؟ تم اتنی دور میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتے ہو۔'' زوئی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''میں یہ صفائی صرف اس لیے دے رہی ہوں نادر کہ مجھے تمہاری پروا ہے اور اس وقت مجھے اتنی شرمندگی محسوس ہو رہی ہے صرف یہ سوچ کر کہ میری وجہ سے تم اتنی پریشانی میں ہو۔'' پہلی بار نادر اس کی بات کے جواب میں کچھ بولنے کے بجائے خاموش رہا۔

''تم صرف اتنا کرو نادر کہ میرے پیپرز جلد از جلد بنوا کر بھیج دو۔ مجھے پاکستان آنے دو، میں اس سارے قصے کا سامنا خود کر لوں گی اور تمہیں اس مسئلے سے نکالنے کے لیے مجھے عمر بھر بھی وہاں کی جیل میں سڑنا پڑے تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔'' زوئی نے جذباتی لہجے میں کہا۔ جواب میں نادر نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا تھا اور اسے زوئی کے چہرے پر سچائی اور عزم نظر آیا تھا۔

☆☆☆

سارا دن بنیش بے چینی سے اس انتظار میں رہی کہ دانیال سے ملاقات ہونے پر وہ اسے اس لڑکی کی تصویر دکھا سکے جو اس نئے سیاست دان کی داشتہ کے طور پر سامنے آئی تھی مگر اس روز اس کی اوپر تلے کلاسز تھیں اور سب کی سب اتنی اہم تھیں کہ ان میں سے ایک بھی چھوڑی نہیں جا سکتی تھی۔ کلاسز کے بعد باہر آنے، لائبریری اور کیفے ٹیریا کے چکر لگا لینے کے بعد جب اسے دانیال کہیں نظر نہیں آیا تو وہ مایوس ہو کر بالائی منزل کی طرف جاتی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

''اس نے کہا تھا وہ کیفے ٹیریا میں میرا انتظار کر رہا ہو گا۔'' وہ سوچ رہی تھی۔ ''لیکن وہ تو کہیں بھی نہیں ہے۔''

''ثمرین کے سب کلاس میٹس ثمرین کی طرف سے دیے گئے لنچ میں شرکت کرنے گئے ہیں۔ آج ثمرین کا برتھ ڈے ہے ناں۔'' جب ہی اس کی کلاس فیلو نے گزرتے گزرتے اسے بتایا۔ ''جبھی کیفے ٹیریا خالی خالی لگ رہا ہے آج۔ یہ سینئرز، افوہ بھئی ہر طرف انہی کا قبضہ رہتا ہے۔'' وہ کہہ رہی تھی۔

''اوہ، جبھی وہ کہیں نہیں ہے۔'' بنیش نے اپنی کلائی میں پڑے کڑے کو گھماتے ہوئے سوچا۔ ''لیکن اس نے کہا تھا کہ وہ کیفے ٹیریا میں میرا انتظار کر رہا ہو گا۔'' اس نے ایک بار پھر خود کو یاد دلایا۔ ''لیکن میرا انتظار ثمرین کے لنچ سے زیادہ اہم تو نہیں ہو سکتا ناں۔'' یہ بات اسے خود کو یاد دلانی نہیں پڑی تھی۔ یہ بات اسے خود سے یاد آ گئی تھی۔ ''آخر کو وہ ہمیشہ سے اچھے دوست ہیں اور کلاس فیلوز بھی۔'' اور ایسا سوچتے ہوئے اس کے دل میں کوئی ملال نہیں تھا۔

☆☆☆

عافیہ کے انداز میں اتنی گھبراہٹ اور بے کلی تھی کہ ان کا بڑا بیٹا عاصم ان کی حالت دیکھ کر پل بھر کو بری طرح گھبرا گیا تھا۔

''ممی آپ ٹھیک تو ہیں؟'' اس نے انہیں دونوں بازوؤں سے تھامتے ہوئے پوچھا۔ جواب میں اس کی

ماں بنے اس کی طرف نیم مُندی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ ائرکنڈیشنڈ لابی میں اچھی خاصی خنکی ہونے کے باوجود ان کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے اور بال بھی پسینے کی نمی سے بھیگے ہوئے تھے۔ دانیال کی حالت پہلے دن سے دیکھنے کے بعد وہ روز بروز کمزور تو ہو ہی رہی تھیں مگر جو حالت ان کی اس وقت تھی وہ عاصم کے لیے بالکل نئی تھی۔

''ممی شاید overwhelmed ہو گئی ہیں۔'' اس نے سوچا۔ ''دانیال کی حالت میں غیر متوقع امپروومنٹ کی خبر سن کر وہ خوشی کے مارے حواس کھو رہی ہیں یا پھر شاید ان کا بی پی ایک دم لو ہو رہا ہے۔'' اس نے عافیہ کو ویٹنگ روم میں بٹھانے کے بعد ایمرجنسی ڈیوٹی روم کا رخ کیا۔

''کم آن مسز جہانگیر، آپ ایک بہادر خاتون ہیں۔'' ڈاکٹر نے ان کا بلڈ پریشر چیک کرنے کے بعد کہا تھا۔ یہاں موجود تقریباً تمام ڈاکٹرز اب تک ان سے زیادہ یا کم کسی نہ کسی حد تک واقف ہو چکے تھے۔ ''آپ میں پچویشنز کو فائٹ کرنے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں پھر آپ کی یہ حالت کم از کم میرے لیے تو ناقابلِ فہم ہے۔'' ڈاکٹر نے ان کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''آپ نے میڈیکل سائنس کے کرشموں کے بارے میں سنا ہوگا۔'' کچھ دیر بعد جب عاصم انہیں مزید چیک اپ کے لیے ایک سینئر ڈاکٹر کے پاس لے آیا تو اس سینئر ڈاکٹر نے شاید ان کا حوصلہ بڑھانے کی خاطر بات کی۔

''آپ نے پہلے شاید سنا ہو اب آپ دیکھیں اور عمر بھر دیکھتی رہیے گا۔ دانیال میڈیکل کے کرشموں میں سے ایک کرشمے کے مانند آپ کی آنکھوں کے سامنے زندگی گزارے گا۔'' وہ کہہ رہے تھے۔

''انسان عمر بھر فزکس کے کرشمے دیکھتا رہتا ہے ڈاکٹر صاحب۔'' عافیہ نے ہاتھ میں پکڑے جوس کے ٹن سے دو گھونٹ جوس پینے کے بعد بدقت کہا۔ ''میں نے ابھی کچھ دیر پہلے یہاں اسپتال پہنچنے سے پہلے میٹا فزکس کا ایک کرشمہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔'' ان کی آنکھوں سے آنسو قطار باندھ کر بہنے لگے۔ ''اور اس کرشمے کو دیکھنے کے بعد مجھے آپ کی میڈیکل سائنس سے دانیال کی صحت مندی کی کوئی یقین دہانی، کوئی ضمانت نہیں چاہیے۔ اب مجھے اس بات کا قوی یقین ہے کہ دانیال نہ صرف واپس زندگی کی طرف آئے گا بلکہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر ایک بھرپور دوڑتی بھاگتی زندگی بھی گزارے گا۔''

''اچھا!'' ڈاکٹر نے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ ''اگر ہم آپ کو یہ یقین نہیں دلا سکے تو پھر آپ کو یہ یقین کس نے دلایا؟''

''صوفی صاحب نے۔'' عافیہ نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''صوفی صاحب نے بیگم اکرام اللہ کے خواب میں یہ اشارہ دیا کہ دانیال ٹھیک ہو جائے گا۔ بالکل ٹھیک اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے دنیا سے چلے جانے کی پیش گوئی بھی کی۔'' عافیہ نے ڈاکٹر کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا جو اُن کی طرف دیکھتے ہوئے یوں مسکرا رہا تھا جیسے کسی مجذوب کی بڑ سن رہا ہو۔

''اور آپ کو معلوم ہے ڈاکٹر صاحب، صوفی صاحب کا آج صبح فجر کی اذان کے وقت وصال ہو گیا۔'' عافیہ کو ڈاکٹر کی مسکراہٹ پر غصہ آنے لگا۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا مسز جہانگیر۔'' ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اور مجھے یقین نہ کرنے پر معاف کر دیجیے گا کہ میرے سامنے جدید ترین صدی کی ایک اچھی خاصی پڑھی لکھی خاتون بیٹھی ہیں اور ایک حادثاتی

صدمے سے گزرنے کے بعد وہ پیرانارمل ایکٹویٹیز اور سُپر نیچرل قوتوں پر یقین کرنے لگی ہیں۔''

''آپ میری بات کو چیلنج مت کیجیے ڈاکٹر صاحب۔'' عافیہ کو ڈاکٹر کے انداز پر غصہ آنے لگا۔ ''جو میں نے دیکھا ہے، جو میں نے دانیال کے حادثے کے بعد محسوس کیا ہے، جس چیز نے مجھے اس حادثے کے بعد اس کا سامنا کرنے، اپنے بیٹے کی حالت کو برداشت کرنے اور اس وقت تک پہنچنے میں مدد دی ہے کہ میرا بیٹا ایک دن نہ صرف اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا بلکہ ایک دوڑتی بھاگتی بھرپور زندگی گزارنے لگے گا اسے پیرانارمل ایکٹویٹی کا حصہ اور سپر نیچرل مخلوقات پر یقین ہو جانا قرار دے کر اس کی توہین کر رہے ہیں آپ۔''

''پھر آپ کے اس مفروضے کو اور کیا نام دیا جائے؟'' ڈاکٹر نے اپنے شانے اچکاتے ہوئے ان کی عقل پر مزید ماتم کیا۔

''یہ سب جو میں کہہ رہی ہوں ڈاکٹر صاحب، یہ ایک سپریم طاقت پر مکمل یقین کا نتیجہ ہے۔'' عافیہ نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔ ''اللہ ہے اور اللہ کے وہ بندے ہیں جن کی عمریں اس کی رضا کے حصول میں ریاضت کرتے گزر جاتی ہیں۔'' ان کی آواز جذبات میں کانپنے لگی تھی۔ ''اس حادثے نے مجھے زندگی میں ایک بار اپنے اللہ سے رجوع کرنے کا موقع دیا اور اللہ کے ان بندوں کی صحبت میں بیٹھنے کا بھی اور میرا یقین، میرا ایمان روز بروز مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا اور آج کا واقعہ تو عقل کے اندھوں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ میری کیا مجال جو اتنی واضح نشانی کو جھٹلاؤں۔'' وہ شدتِ جذبات سے رونے لگیں۔

''آئی ایم سوری مسز جہانگیر۔ شاید میں آپ کے جذبات کو نادانستگی میں ہرٹ کر گیا۔'' ڈاکٹر ان کی حالت پر گھبرا کر بولا۔ ''آپ کا یقین اپنی جگہ درست سہی، میں اسے جھٹلانے کی جرأت ہرگز نہیں کر سکتا لیکن کیا دانیال کی صحت کی بحالی میں آپ ہمارے پیشے ۔۔۔ کو ایک فیصد نمبر بھی نہیں دیں گی؟''

''میں نے ایسا ہرگز نہیں کہا۔'' عافیہ نے عاصم کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ جو اس نے ان کی حالت کے پیشِ نظر گھبرا کر تھام لیا تھا۔ ''اللہ تعالیٰ نے دانیال کی زندگی اور زندگی سے بھرپور زندگی لکھی ہے تو اس کے لیے وسیلہ یقیناً آپ لوگ اور آپ کا پیشہ ہی ہے۔ میں نے یہ دعویٰ تو نہیں کیا کہ صوفی صاحب کے ایک اشارے کے بعد مجھے اس کی زندگی اور بحالیِ صحت کا جو یقین ہو چلا ہے اس پر میں اسے آپ کے پیشنٹ بیڈ سے اٹھا کر تمام لائف سیونگ مشینز اور ادویات سے ہٹا کر گھر لے جاؤں اور وہاں بیٹھ کر اس کی زندگی کی طرف واپسی کا انتظار کروں گی۔ یقیناً دوا میں شفا ہے مگر دعا کے عنصر کو جھٹلانا آپ کی غلطی ہوگی۔'' انہوں نے خود کو کمپوزڈ کرتے ہوئے گہری سانس لی۔

''Mummy is just getting emotional۔'' عاصم نے ڈاکٹر کی طرف معذرت خواہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آپ ان کی حالت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ وہ ایک بڑے جذباتی دور سے گزر رہی ہیں۔''

''یقیناً۔'' ڈاکٹر نے سر ہلایا۔ ''میرے اسٹاف نے انہیں سکون آور دوا کھلا دی ہے۔ مجھے امید ہے کہ چند گھنٹوں میں ان کے اعصاب سکون پذیر ہو جائیں گے۔'' عاصم، عافیہ کو ان کی چیئر سے اٹھا کر بازو کے گھیرے میں لیے دانیال کے کمرے کی طرف چلا تھا۔

''میں شاید تم سب کو کبھی یقین نہ دلا پاؤں کہ میں کس تجربے سے گزر رہی ہوں۔'' عاصم کے ساتھ

آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے عافیہ سوچ رہی تھیں۔ رہ رہ کر ان کی نظروں کے سامنے صوفی صاحب کا چہرہ ابھر رہا تھا۔ ”کتنے پُرسکون رہتے تھے وہ، کتنے خوش امید، کتنا تحمل اور حوصلہ تھا ان میں۔“ وہ سوچ رہی تھیں۔ ”میں نے شاید زندگی میں اتنا صاف، اتنا پاکیزہ اور روشن چہرہ کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔“ دانیال کے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر انہوں نے سوچا اور دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو گئیں۔ پیشنٹ بیڈ تھا، وہی وینٹی لیٹر، وہ دل اور خون کی رفتار جانچنے والی ٹک ٹک کرتی مشین، وہی مریضوں کا سبز لباس پہنے لمبا چوڑا جوان وجود، وہی اسپتال کا مستعد اور فرض شناس عملہ جو معمول کے چیک اپ میں مصروف تھا۔ عافیہ کو دیکھ کر دماغ کے امراض کا ماہر ڈاکٹر مسکرایا اور دانیال سے قدرے فاصلے پر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

”دیکھیے مسٹر دانیال آپ کی مدر آپ کو دیکھنے آئی ہیں۔“ عافیہ تیزی سے چند قدم آگے بڑھیں۔ ان کی آواز کی لینتھ وصول کرتے ہوئے دانیال نے اپنی بائیں آنکھ کھول کر چھت کی طرف دیکھا تھا۔

”آپ نے دیکھا مسز جہانگیر معجزہ ظہور پزیر ہونے کے آغاز میں ہے۔“ ڈاکٹر نے عافیہ کی طرف دیکھ کر خوشگوار انداز میں کہا تھا۔

”عافیہ بیٹی کو بھی میری طرف سے مبارک باد دے دیجیے گا اور اس سے کہیے گا میں خود اسے مبارک باد پیش کر سکوں گا کیونکہ میری فلائٹ کا وقت ہو گیا ہے۔“ الفاظ ایک بار پھر عافیہ کی سماعت سے ٹکرائے تھے۔

☆☆☆

”اماں عرف امراؤ بیگم اس معمول سے بیزار ہیں۔“ زرنگار نے کمرے میں جلنے والی خوابیدہ سی نیم لائٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کس معمول سے؟“ اس کے سامنے بیٹھے مہرزاد نے جو کتنی ہی دیر سے اسے محویت سے دیکھے چلا جا رہا تھا چونکتے ہوئے پوچھا۔

”اسی معمول سے جس میں ان کے بقول میں صرف آپ کی راتوں کی ساتھی بن کر رہ گئی ہوں۔“ زرنگار کو لگا راتوں کی ساتھی کی تشبیہہ سے خود کو منسوب کرنا ایک کاٹ دار عمل تھا جو اس نے انجام دیا تھا۔

”ایک بات بتاؤ گی؟“ مہرزاد نے ایک لمبی سانس لینے کے بعد اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کیا؟“ نرم اور آرام دہ صوفے پر چڑھے ہوئے نفیس کپڑے کے ڈیزائن پر انگلی پھیرتے ہوئے زرنگار نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

”امراؤ بیگم جیسی خاتون کو اماں کہنا تمہیں کیسا لگتا ہے؟“ سوال تیکھا اور انداز ٹٹولنے کا سا تھا۔ زرنگار نے نظر اٹھا کر مہرزاد کی طرف دیکھا۔

”ویسا ہی جیسا ایک مشینی روبوٹ کو کوئی بھی کام کرتے ہوئے لگتا ہوگا۔“

”مشینی روبوٹ کی بات چھوڑو۔ اس کے کوئی محسوسات نہیں ہوتے۔“ مہرزاد نے صوفے سے اٹھ کر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میرے اور اس کے محسوسات میں کوئی فرق نہیں۔“ زرنگار نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ”ہم دونوں ہی خود کو دی گئی کمانڈز کی تقلید کرنے کے پابند ہیں۔“

”تمہیں پتا ہے مجھے کتابی باتیں کچھ زیادہ پسند نہیں، مجھے عملی گفتگو زیادہ اچھی لگتی ہے۔“ مہرزاد زیرِ لب

مسکراتے ہوئے بولا۔

”اور میرا المیہ یہ ہے کہ میں نے کتابوں کے صفحوں میں گم رہتے ہوئے ایک عمر گزار دی، جب ان صفحوں سے نکال کر باہر پھینکی گئی تو پتا چلا کتابیں تو طاق میں رکھی جا چکی ہیں اور ان کے صفحات پر لکھی باتیں کالعدم قرار دی جا چکی ہیں۔“

”چلو امراؤ بیگم کو اماں کہنے والی بات رہنے دیتے ہیں۔“ مہرزاد نے بیڈ پر رکھے تکیوں کو بیڈ کراؤن کے ساتھ ٹکا کر اُن سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ اب وہ اس بیڈ پر نیم دراز ہو چکا تھا۔

”کہانیاں سننا اور کہانیاں سنانا طے ہوا تھا، سوال کرنا اور جواب لینا تو نہیں۔“ زرنگار نے جتانے کے سے انداز میں کہا۔

”یہاں تم ایک غلطی کر گئیں۔“ مہرزاد محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ ”بلیک اینڈ وائٹ میں لانا چاہیے تھا اس معاہدے کو۔“

”گویا آپ اس سے روگردانی کرنے والے ہیں۔ اس کی نہ لکھی گئی شقوں کی خلاف ورزی کا ارادہ ہے؟“ زرنگار نے پوری آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

”ارادہ تو نہیں تھا تم نے خوب دھیان دلایا۔“ وہ مزید محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔

”آپ ایسا کر ہی نہیں سکتے۔“ زرنگار کے لہجے میں تیقن اترا۔

”اتنا یقین؟“ مہرزاد نے اس کی طرف دیکھا۔

”جی اتنا ہی یقین۔“

”اچھا یہ تو بتاؤ کہ بھلا میں تم سے ملاقات کے لیے اتنا تردد کیوں کرتا ہوں؟“ مہرزاد کو زرنگار کے تیقن پر دل میں عجیب سی خوشی محسوس ہوئی اور اسی خوشی کے عالم میں اس نے اس سے یہ سوال پوچھا تھا۔

”کیونکہ آپ کو بدصورتی میں چھپی خوب صورتی دیکھنے کا شوق ہے۔ خاموشی کی زبان سمجھنا اچھا لگتا ہے اور کیچڑ میں کھلے خار دار جھاڑیوں میں اُگے پھول تک رسائی حاصل کرنے کی خواہش ہے۔“ زرنگار نے رسان سے کہا۔

”بہت اچھے۔“ مہرزاد نے داد دینے کے سے انداز میں تالی بجائی۔ ”ذہانت تمہارے در کی لونڈی ہے غالباً۔“

”اور آپ اس لونڈی کے در کے غلام ہیں یقیناً۔“ برجستہ جواب آیا۔ مہرزاد نے ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر ہاتھ سے اپنے چہرے پر سجی ڈاڑھی کے بالوں کو سہلانے لگا۔

”اچھا مزید سوالوں کے جواب نہ سہی اتنا ہی بتا دو کہ کیا تمہیں بھی امراؤ بیگم کی طرح اس معمول سے بیزاری ہونے لگی ہے؟“ پھر اس نے پوچھا۔

”کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایسا ہوگا؟“

”شاید نہیں۔“ مہرزاد نے کہا۔ ”لیکن اگر تمہیں یہ بیزاری نہیں ہے تو اس کی بھی تو کوئی وجہ ہوگی؟“

”سادہ سی وجہ ہے۔“ زرنگار نے ہاتھ میں پکڑے اسمارٹ فون کی اسکرین پر انگلی چلاتے ہوئے کہا۔ ”میں اس معمول میں محفوظ ہوں۔“

”اور میں تمہیں اس سے بھی زیادہ محفوظ بنانا چاہتا ہوں۔“ مہرزاد نے فوری جواب دیا۔ ”کیا ایسا نہیں

ہوسکتا کہ ہم دونوں اپنے، اپنے پتے ایک مرتبہ میز پر رکھ دیں؟''

''آپ کے پاس تو پتے ہیں سردار صاحب، آپ رکھیے اور ضرور رکھیے۔ میں تو خالی ہوں۔'' خلاف توقع جواب آیا۔

''مت بھولو زرنگار کہ میں نے تم سے یہ کہا کہ میں تمہیں اور بھی زیادہ محفوظ بنانا چاہتا ہوں، محفوظ کہ تم کہیں بھی اس تہمت سے بھی بچ جاؤ کہ تم سردار مہرزاد خان کی داشتہ ہو۔'' مہرزاد نے دکھ کے ان الفاظ کو سن کر وہ غیر ارادی طور پر سمٹ کر پرے ہوگئی اگرچہ ان دونوں کے درمیان چند گز کا فاصلہ پہلے سے ہی تھا۔

''ایک چھت کے نیچے ایک دوسرے کے ساتھ رات کیسے گزرتی ہے۔ اس کا گواہ ہم دونوں کے علاوہ صرف خدا ہے۔'' مہرزاد نے اسے حقیقت سے روشناس کروانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے علاوہ کوئی بھی تیسرا جو ہماری ایک چھت کے نیچے موجودگی کو جانتا ہے وہ یہ کبھی نہیں مانے گا کہ ہم اکٹھے ہیں اور حالتِ گناہ میں نہیں ہیں۔''

زرنگار نے اس کی بات سنتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔ مہرزاد نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''اور۔'' اس نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہارا اسٹیٹس نہیں ہے۔''

زرنگار نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ چلو اپنے اپنے کارڈز ایک دوسرے کو دکھا دیتے ہیں۔ کہانیاں کہنے اور کہانیاں سننے کے لیے تو ایک عمر پڑی ہے۔'' مہرزاد نے سر ہلا کر اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس کون سے ایسے کارڈز ہیں جو میں نے چھپا کر رکھے ہوں اور انہیں ظاہر کرنے میں مجھے تامل ہوگا۔'' زرنگار کے چہرے پر دکھ نے رقص کیا۔ ''میرا تو سب کچھ یہیں ایکسپوزڈ ہے، نظروں کے سامنے ہے۔ امراؤ بیگم سے میرا تعلق ہی میرا عریاں تعارف کروانے کے لیے کافی ہے۔ ڈھکے چھپے کا کیا سوال باقی ہوسکتا ہے۔''

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔'' مہرزاد نے تحمل بھرے لہجے میں کہا۔ ''تم پر یہ اسٹیٹس سجتا نہیں، تم یہ تعارف ڈیزرو نہیں کرتیں۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ اگر تم اکیلے ایسا نہیں کرسکتیں تو میری انگلی پکڑ لو۔ آؤ ہم دونوں مل کر تمہاری کھوج لگائیں اور جہاں بھی تمہارا کوئی سرا ملے وہاں سے پکڑ کر تمہیں ڈھونڈ کر لے آئیں۔ مجھے امراؤ بیگم کے ساتھ تمہارا نام جڑا ایک سیکنڈ کے لیے بھی گوارا نہیں۔''

''یوں ہی باتوں سے اور صرف باتوں سے نہ تو کسی کی کھوج لگائی جاسکتی ہے نہ ہی کوئی تلاش کامیاب ہوتی ہے۔ ماضی کے دفینے جہاں ہیں وہاں رہتے دیے جائیں تو بہتر ہوتا ہے۔ اکھاڑ پچھاڑ کر کے بھی اگر مٹی میں خاک ہوئی شبیہوں کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔''

''الفاظ، الفاظ، الفاظ۔'' مہرزاد نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''بڑے بڑے لفظ بولنے کے لیے بھی ایک عمر پڑی ہے۔ جی بھر کے بولتی رہنا لیکن فی الحال جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ ماضی کے دفینوں سے ہم خاک میں خاک ہوئی مورتوں کے بجائے زندہ، جیتی جاگتی اس لڑکی کو باہر نکالیں گے جو حادثاتی طور پر امراؤ بیگم کی اسٹیٹ میں آگئی۔''

''لیکن آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟'' زرنگار نے چونک کر مہرزاد کی طرف دیکھا۔

''بہتر ہوتا اگر تم اس کے بجائے یہ سوال کرتیں کہ آپ ایسا کیونکر کر پائیں گے؟'' مہرزاد نے پُرسکون انداز میں کہا۔

''عمل سے پہلے وجہ کا بیان ضروری ہے۔ کاوش اپنی جگہ کاوش کیوں کی جارہی ہے اس کا بھی تو پتا چلے۔'' زرنگار نے کہا۔

''وجہ میں نے پہلے ہی بتادی۔ میں چاہتا ہوں تم اس اسٹیٹس کے ساتھ زندگی گزارو جو تمہیں سجتا ہے۔ امراؤ بیگم تک تم اپنے شوق سے تو پہنچی نہیں...... نہ میں اس بات پر یقین کرسکتا ہوں کہ امراؤ بیگم سے تمہارا کوئی رشتہ ہے۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ ہم تمہاری کھوج لگائیں اور تمہیں اس پس منظر میں واپس لے جائیں جس کے پیش نظر میں کھڑی تم اجنبی نہ لگو۔''

''جانے دیں سردار صاحب۔'' زرنگار نے سر ہلایا۔ ''آپ کی پوزیشن بڑی نازک ہے۔ آپ کی تاک میں لوگ نہیں شکاری کتے لگے ہوئے ہیں۔ آپ کی ایک، ایک حرکت مانیٹر کی جاتی ہے اور معمول سے ہٹ کر کسی بھی حرکت کو اخباروں کی بڑی خبر اور ٹیلی ویژن پر چلنے والی بریکنگ نیوز بننے میں کوئی وقت نہیں لگتا۔ میں نہیں چاہوں گی کہ آپ میری وجہ سے کسی ایسے جال میں پھنس جائیں جسے کترنے کے لیے دوستوں میں، اپنوں میں کوئی چوہا میسر نہ ہو۔''

''میں نے امراؤ بیگم سے ایک ہزار راتوں کا معاہدہ کیا تھا۔ ایک ہزار راتوں کے ساتھ کم و بیش اتنے ہی دن بھی گزرے ہوں گے۔ میرا خیال تھا کہ اتنے دن واپسی کے میرا مطلب ہے تمہاری واپسی کے لیے کافی ہوں گے۔''

''اور اگر اتنے دنوں میں یہ معمّا حل نہ ہوا تو آپ مایوس ہوکر واپس لوٹ جائیں گے؟'' زرنگار نے سوالیہ انداز میں مہرزاد کی طرف دیکھا۔

''دیکھو زر۔'' مہرزاد اس کا نام لیتے لیتے رک گیا۔ ''آئی ایم سوری، میں تمہیں کبھی بھی اس نام سے پکارنا نہیں چاہوں گا جو تمہارا ہے ہی نہیں۔ ایسا نام جو غیروں کا دیا ہوا ہے اور جس سے ایک خاص قسم کا ماحول ٹپکتا ہے۔'' زرنگار نے سر جھکالیا شاید وہ انگشت بدنداں ہوچکی تھی۔

''میں بھی انسان ہوں۔'' مہرزاد نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے اس ماحول، تنہائی اور دسترس کے باوجود میں جو اتنا کمپوزڈ رہتا ہوں، تم سے صرف گفتگو کرکے رخصت ہوجاتا ہوں تو کیا میں جذباتی طور پر اس مشینی روبوٹ کے مانند ہوں جس سے تم نے خود کو تشبیہ دی۔'' زرنگار نے دیکھا مہرزاد کا سر جھکا ہوا تھا۔ جیسے ان لمحوں میں وہ دانستہ اس سے نظریں چرائے رکھنا چاہتا تھا۔

''نہیں۔'' زرنگار کی طرف سے جواب نہ آنے پر وہ خود ہی سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں وہ روبوٹ نہیں ہوں، میں جذباتی طور پر بھی اتنا ہی انسان ہوں جتنا جسمانی اور ذہنی طور پر ہوں۔ ابلیس، شیطان مجھے بھی ویسے ہی ورغلاتا ہے جیسے میرے جیسے دوسرے انسانوں کو لیکن پتا نہیں کیا وجہ ہے کہ میں آدمیوں کے اس ہجوم کا حصہ نہیں بننا چاہتا جس نے تم جیسی لڑکی کو امراؤ بیگم جیسی عورت کے سر پر سجے تاج کا نگینہ بنادیا۔'' اس کی آواز نیچی ہوتی ہوتی ناقابلِ سماعت ہونے لگی پھر وہ گلا کھنکھار کر دوبارہ گویا ہوا۔

''ابھی تک تو یہ ہوتا ہے کہ تمہارا سامنا کرنے سے پہلے میں اپنے محسوسات و جذبات کو تھپکنے اور سلانے

کی کوشش سرِشام ہی شروع کر دیتا ہوں۔ تمہارے سامنے بیٹھے ہوئے میں خود کو یاد کراتا رہتا ہوں کہ میرے سامنے حُسن کا مرقع کم عمر لڑکی نہیں۔ ایک پوتر عورت بیٹھی ہے جس کے متعلق کوئی بھی شیطانی سوچ مجھے جہنم میں دھکیل دینے کے لیے کافی ہوگی اور یقین جانو مجھے جہنم کی لپلپاتی آگ سے بہت ڈر لگتا ہے کیونکہ جتنی ریسرچ میں نے اس پر کی ہے شاید ہی کسی اور موضوع پر کی ہو۔'' اپنی بات مکمل کر کے اس نے ایک نظر زرنگار پر ڈالی جو ہمہ تن گوش بیٹھی اس کی بات سن رہی تھی۔

''میرے جیسی بدنصیب لڑکیاں تو بہت سی ہیں۔ یہاں وہاں ایک نہیں کتنی ہی امراؤ بیگمیں ایسی بدنصیب لڑکیوں کو اپنی شاطرانہ آغوش میں لیے بیٹھی ہیں پھر آپ کی یہ نظرِ کرم صرف مجھ پر ہی کیوں سردار صاحب؟'' مہرزاد نے سنا زرنگار کہہ رہی تھی۔

''میں ایک انسان ہوں، کُل انسانیت کا صیغۂ واحد ایک انسان اور مجھے اتنا ہی کام کرنا ہے جتنا میری قسمت میں لکھا ہے۔ میری قسمت کہ میرا واسطہ فی الحال صرف تم سے پڑا ہے اور تمہارے پیچھے مجھے وہ ہر منظر نظر آتا ہے جو تم جیسی لڑکی کا ہونا چاہیے۔ ہوسکتا ہے تمہارے ساتھ کوئی ایسی دعا ہو جو میرے دل میں آیا کہ اس لڑکی کو اس گرداب سے نکالنا ہے ورنہ میرے جیسے شخص کی بے نیازی اور سرد مہری کی تو شاید لوگ مثالیں دیتے ہوں۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ میرا خمیر کس ماحول سے اٹھا ہے۔'' مہرزاد نے وضاحت کی۔

''اسی لیے میں کہتا ہوں کہ وقت ضائع کیے بغیر میرا ساتھ دو اور اپنے کارڈز میز پر رکھ دو۔'' زرنگار کو اپنی طرف ششدر رہتے دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ ''مجھے اپنے اندر باہر، دائیں بائیں، آگے پیچھے پھرنے ترغیب دیتے شیطان سے ڈر لگتا ہے۔ اس کا لایا کمزور لمحہ تو کسی پر بھی آسکتا ہے۔'' مہرزاد کی بات سن کر زرنگار نے اپنی آنکھیں میچ لیں۔

''کیا یہ وہ فرشتہ تھا جسے وہ اکثر اپنے خواب میں دیکھتی تھی۔ کیا وہ اس دعا کا جواب تھا جو وہ ہر رات سونے سے پہلے کرتی تھی۔ الم اور حرماں نصیبی سے چند گھنٹوں کے لیے دور لے جانے والا نجات دہندہ۔ کیا یہ واقعی اس اسیری سے رہائی دلانے والا مہم جو ثابت ہونے والا تھا۔'' اس نے سوچا اور یقین کرنے کی کوشش کی۔

''لیکن آپ کی پوزیشن بہت نازک ہے۔'' خیال سے حقیقت کا سفر لمحوں میں طے کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''آپ الیکشن میں جانے والے ہیں، آپ کی الیکشن کمپین اپنے عروج پر ہے۔ اس سیاسی سفر کے آغاز پر آپ کسی بھی ایسی خبر کا حصہ بننے کا رِسک مت لیجیے گا سردار صاحب جو آپ کو کارزارِ سیاست سے ہمیشہ کے لیے نکال باہر کرے۔''

''یہ تمہارا دردِ سر نہیں ہونا چاہیے۔'' مہرزاد نے ایک بار پھر اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''اتفاق سے یا شاید بدقسمتی سے ہی اس ملک کی سیاست کا حصہ دار ہوں جس کی تاریخ سیاست دانوں کے شرمناک اسکینڈلز سے بھری پڑی ہے۔ جس کی تاریخ جتنی زیادہ شرمناک ہے اس کا سیاسی قد اتنا ہی اونچا ہے۔'' وہ تمسخر اڑانے کے سے انداز میں ہنسا۔ ''کیا تم نے کبھی اس ملک کی ہسٹری میں جنسی اسکینڈل پر کسی سیاست داں کو سیاست سے دست بردار ہوتے سنا ہے؟'' اس نے سوالیہ انداز میں زرنگار کو دیکھا۔ ''جنسی اسکینڈل آخری حد ہوتی ہے اسکینڈلز کی۔'' اس نے جتایا۔ ''یہاں کے سیاست دانوں کا نظامِ انہضام اتنا مضبوط ہے کہ وہ اس کو بھی ہضم کر جاتے ہیں۔''

''گویا آپ بھی اپنے نظامِ انہضام کو مضبوط بنانے کی پریکٹس کر رہے ہیں۔'' زرنگار نے سوال کیا۔

''نہیں۔'' اس نے فوری جواب دیا۔ ''اول تو ایسا کوئی اسکینڈل سطح پر آئے گا ہی نہیں۔ آیا بھی بالفرض تو مجھے تو......'' اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''مجھے تو اس دامِ سیاست سے نجات کا کوئی بہانہ چاہیے۔ میں فوراً غلطی تسلیم کرتے ہوئے سیاست سے دست بردار ہو جاؤں گا کیونکہ میرے اندر کوئی گلٹ نہیں ہوگا۔ اسکینڈلز تو بنتے ہی رہیں گے۔ اسکینڈلز حقائق کے خلاف بنیں تو انسان کے اندر کوئی گلٹ تو نہیں ہوتا ناں۔''

''آپ کو اپنے الفاظ کا یقین ہے کیا؟'' زرنگار نے اس کی بات سننے کے بعد کہا۔

''خود اپنے زندہ ہونے سے بھی زیادہ۔'' جواب آیا تھا۔

''چلو آج رات تو خیر ختم ہونے والی ہے۔ باوجود نہ چاہنے کے کہانیاں اور الفاظ کہہ لیے اور خوب کہہ لیے۔ جواب میں الفاظ سن لیے اگرچہ کم سنے۔'' کھڑکی پر برابر ہوتے دبیز پردوں کے پیچھے سے آتی ہوئی سحر کی پہلی، پہلی کرن پردوں سے سر ٹکرانے لگی تھی اور اس کوشش میں کبھی کبھار اپنی جھلک دکھا رہی تھی۔ اس کرن کی کسی ایسی ہی کمزور کوشش کی کامیابی پر نظر پڑتے ہی مہرزاد نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''میں اب چلتا ہوں۔ تم سے جو گفتگو ہوئی اسے ایک بار ذہن میں ریوائز کرنا اور اگر دل کو لگے تو اسی نمبر سے ٹیکسٹ کر دینا جو تمہیں دیا گیا تھا۔'' آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بالوں میں انگلیاں چلا کر انہیں ٹھیک کرتے ہوئے اس نے کہا۔ زرنگار نے دیکھا ایک پوری رات گزارنے کے باوجود اس کے سفید شلوار قمیص پر صرف نیم درازی اور ایک آدھ بار پہلو بدلنے کی شکنیں تھیں۔ اس کے سیاہ سینڈلز اب بھی اس کے پاؤں میں تھے اور ان کے فیتے بند تھے۔

''کیا یہ تارک ہے یا پھر فرشتہ؟'' الفاظ اس کے ذہن کی سلیٹ پر ابھرنے تھے۔

''آپ کی پریس سیکریٹری کو آپ کے کیریئر میں ایک سیاہ دھبا دکھائی دیتی ہوں غالباً۔'' شکوے کی شکل میں الفاظ بے اختیار اس کے منہ سے پھسلے۔

''یہ اس کے خلوص کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے زرنگار کی طرف گھوما۔ ''اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ جو وہ ایک بڑی مدد ثابت ہوتی ہے اکثر۔''

''ہوسکتا ہے۔'' زرنگار کے دل میں ایک عجیب سی بے وقت ٹیس اٹھی۔ ''لیکن بہتر ہوگا آپ مجھ سے براہِ راست رابطہ کیا کریں۔ لوگوں کو واسطہ نہ ہی بنائیں تو مجھے خوشی ہوگی۔''

''جیسے تم کہو۔'' مہرزاد نے سینے پر ہاتھ رکھ کر احتراماً جھکتے ہوئے کہا۔ ''میں اب چلوں گا تمہارا ڈرائیور تمہیں واپس پہنچا دے گا۔'' اس نے اپنا والٹ اور فون میز پر سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟'' زرنگار نے اٹھ کر کھڑکی پر پڑے پردے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''جگہ کوئی بھی ہو تم فکر مت کرنا محفوظ ہی ہوگی۔'' اس نے یقین دلاتے ہوئے کہا اور خدا حافظ کہتا کمرے سے چلا گیا۔ زرنگار نے اس کے چلے جانے کے بعد مڑ کر کمرے پر نظر ڈالی۔

''ایسے تعلقات کے بارے میں جو دنیا کی نظر میں اس کے اور میرے درمیان ہے اور جس کی وجہ سے وہ میرے ساتھ ایک ہزار راتیں گزارنے کی قیمت پیشگی ادا کر سکتا ہے۔ انہی راتوں میں سے ایک رات گزارنے کے بعد جو حالات ان کمروں کے ادیبوں نے اپنی، اپنی تحریروں میں لکھے ہیں جو اس رات کے

گزرنے کے بعد ہوتے ہیں، کیا یہ کمرا ایسی کسی رات کی گزری داستان سنا رہا ہے ؟" اس نے سوچا اور بے اختیار مسکرا دی۔

"شاید کوئی جہاندیدہ، تجربہ کار انسان اس کمرے کو دیکھ کر بھی یقین نہ کرے کہ اس میں کوئی ایسی رات گزری ہے۔" اس نے ایک سرد آہ بھری اور آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اسے اپنے بال سنوارنے تھے جو اپنی جگہ سے ہلے تک نہیں تھے اور اپنا ظاہری حسن سنوارنے کے لیے سرخی غازہ تازہ کرنا تھا۔

☆☆☆

"تم دراصل ذہنی کشمکش کا شکار ہو رہے ہو۔" نگین نے حمزہ سے کہا جو منہ لٹکائے اس کے گھر کے لاؤنج میں بیٹھا تھا۔

"لیکن تمہیں ضرورت کیا ہے خود کو خواہ مخواہ کی خلش میں مبتلا کرنے کی۔" اس نے حمزہ کا شانہ ہلایا۔ "ذہن کو یکسو کر لو یا تو ماماز بوائے بن جاؤ یا گڈ اولڈ گرینیز چائلڈ۔ تم کیا دونوں انتہاؤں کے درمیان پھنسے جان ہلکان کیے دے رہے ہو۔"

"تمہارا مسئلہ یہ ہے نگین کہ تم بولتی ہو اور بہت زیادہ بولتی ہو۔" حمزہ نے سر ہلا کر کہا۔ "اور معاملے کی سنجیدگی کو سمجھے بغیر بولے چلی جاتی ہو۔"

"ہاں میں تو ایسی ہی ہوں۔" اس نے سادگی سے اعتراف کیا۔ "میں سمجھتی ہوں کہ انسان اپنی جان ہلکان کرنے کے بجائے مسئلے کا جو آسان ترین حل ہے وہ سوچ لے..... خود کو بھی آسانی میں رکھے اور دوسروں کو بھی۔"

"تمہارے لیے ایسا کرنا آسان ہو شاید۔" حمزہ نے کہا۔ "جب ہی تم اپنی ایسی جلاد صفت ساس کے ساتھ بھی خوش رہتی ہو۔"

"ہاں تو میں کیا کوئی بھی اب اس عمر میں ان کی عادتیں اور مزاج تو بدلنے سے رہا اس لیے دیواروں سے سر پھوڑنے کے بجائے دل ہی دل میں ان کی ہر بات کا جواب دیتی جاتی ہوں۔ میرا ردِعمل بھی نکل جاتا ہے اور میں بری بھی نہیں بنتی۔" نگین نے بے نیازی سے کہا۔

"لیکن میں ایسا نہیں ہوں۔" حمزہ نے مایوسی سے کہا۔ "جتنا میں خود سے عہد کرتا ہوں کہ ممی کو خود سے مایوس نہیں کروں گا جیسا وہ چاہتی ہیں ویسا ہی بن جاؤں گا؛ اتنا ہی میرا دل میلوں دور بھاگ جانے کو چاہتا ہے۔ تم سمجھتی کیوں نہیں کہ میں کتنی مشکل صورتِ حال سے دوچار ہوں۔"

"ہوں۔" نگین قدرے سنجیدہ ہوئی۔ "اور اوپر سے تم نے اس لڑکی میرال کی گمشدگی کو سر پر سوار کر رکھا ہے۔"

"وہ ایک علیحدہ ایشو ہے، اسے اس بات سے مت ملاؤ۔" حمزہ نے کہا۔

"کیسے نہ ملاؤں ؟" نگین نے تیزی سے کہا۔ "تمہاری الجھن کا تعلق اسی ایشو سے ہی تو ہے۔ میرال نام کی لڑکی کے بارے میں تمہارا کنسرن بی اماں کی وجہ سے ہے اور بی اماں سے تمہاری ممی کا نظریاتی ٹکراؤ..... حمزہ تم اپنی الجھنوں کے سرے اگر خود ڈھونڈنے اور سلجھانے لگو تو تمہیں خود ہی بہت ساری باتیں سمجھ میں آنے لگیں گی لیکن تمہارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ بجائے سلجھانے کے تم ان سے نظریں چراتے ہو اور خود کو یہ سمجھانے کی کوشش میں لگے رہتے ہو کہ آئندہ سے ممی کو خود سے مایوس نہیں کرنا۔"

"اُف، لڑکی، تم کتنے ظالمانہ تجزیے کرتی ہو چیزوں کے۔" حمزہ نے نگین کی صاف گوئی سے گھبرا کر کہا۔

"میں حقیقت پسند ہوں۔" وہ یکایک بے نیاز ہوتے ہوئے بولی۔ "اور میں تو پھر ایسی ہی ہوں۔"

"اچھا بابا۔" حمزہ کو اس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔ "لو میں تمہارے سامنے حاضر ہوں۔ کر لو جتنے تجزیے کرنے ہیں میری شخصیت اور مسائل کے..... ایک ہی بار کر لو لیکن خدارا مجھے کوئی کلیو تو نکال دو کہ حل کیا ہے۔"

"حل تو بڑا سادہ اور آسان سا ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔ " جو میں نے اس گفتگو کے شروع میں تمہیں بتایا ہے۔ اپنے لیے ایک فیصلہ کر کے یکسو ہو جاؤ۔ ماماز بوائے یا گڈ اولڈ گرینیز چائلڈ.....!"

"کیا تم مانو گی کہ میں ان دونوں میں سے ایک بھی نہیں بن پا رہا۔" حمزہ نے بے بسی سے کہا۔ "بی اماں رہیں نہیں لیکن ان کی تربیت کے حصار سے میں نکل نہیں پاتا۔ ممی موجود ہیں اور میرے سامنے ہوتی ہیں لیکن جیسا وہ چاہتی ہیں میں ویسا بن نہیں پاتا۔"

"پھر کوئی درمیانی راستہ نکال لو۔" نگین نے کہا۔ "لیکن اس کے لیے تمہیں تھوڑی مشکل سے گزرنا ہوگا۔ صرف تھوڑے دن کی مشکل پھر تم عادی ہو جاؤ گے۔" گویا اس نے بہترین حل پیش کیا۔

"تم جانتی ہو ممی میرا رشتہ کسی رانیہ سے طے کرنا چاہتی ہیں۔"

"اور تم بی اماں کی تربیت کے زیرِ اثر میرال نامی لڑکی کو ڈھونڈ کر اپنے نکاح میں لینا چاہتے ہو۔" نگین کا جواب اتنا فوری اور قابلِ غور تھا کہ وہ حیران رہ گیا۔

"یہ تم سے کس..... نے کہہ دیا؟" وہ بہ مشکل اتنا ہی کہہ سکا۔

"تمہاری بے چینی اور تمہارے اضطراب نے..... تمہارے اس رویّے نے جو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ تمہیں اپنی ممی کی من منشا شخصیت بن جانے کا صرف ایک بار ارادہ ہی کرنا تھا اور تم ویسے بن جاتے کیونکہ کسی کا دل نہ توڑنے کی نصیحت بھی بی اماں ہی تمہیں کر گئی ہیں۔ تم خواہ خود پر جبر کر کے ہی سہی مگر ایسا کر بھی جاتے اگر یہ میرال والا قصہ درمیان میں نہ ہوتا۔" نگین سانس لینے کو رکی اور اس کی بات بغور سنتے سنتے حمزہ نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"تم نے میرال کی گمشدگی کو دل سے لگا کر اس کی تلاش کو اپنا فریضہ مان لیا ہے۔ میں نہیں جانتی کہ اس کے سلسلے میں بھی بی اماں تمہیں کوئی نصیحت کر گئی ہیں یا نہیں لیکن کچھ ایسا ہے ضرور جو تم اتنا ہاتھ دھو کر اس کی تلاش کے پیچھے پڑ چکے ہو۔" نگین نے کہا۔ "مجھے اشعر نے بتایا تھا کہ اس سلسلے میں تم چند خفیہ ہاتھوں کی طرف بھی مدد کے لیے رجوع کر چکے ہو گویا تمہارے لیے یہ تلاش ایک انتہائی سنجیدہ مسئلہ ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ بالفرض میرال تمہاری کاوشوں کے نتیجے میں مل بھی جاتی ہے تو تم اس کا کیا کرو گے، واپس اسے کہاں ہینڈل کرو گے یقیناً تمہارے ذہن میں اس صورتِ حال کا کوئی خاکہ موجود ہے اور میرے خیال میں یہ خاکہ تمہارے اور تمہاری ممی کے درمیان پانی پت کا میدان بننے کے لیے کافی ثابت ہوگا۔ دراصل یہی ایک نکتہ ہے میرے عزیز بھائی جو تمہیں آج کل الجھن میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔" نگین نے بہت ہی بڑی بڑی باتیں انتہائی آسانی سے کہہ دیں۔

"ادھڑ گئے میری ذات کے سارے بخیے یا ابھی کوئی ٹانکا باقی ہے؟" حمزہ نے اس تجزیے کے نشتر اپنے دل و دماغ پر چلتے محسوس کرتے ہوئے کہا۔

ڈپریشن کیا ہے؟ اور اس کا علاج

1۔ میرا دل کسی کام میں نہیں لگ رہا.....

2۔ دل چاہتا ہے سب کچھ چھوڑ چھاڑ جنگل کی طرف نکل جاؤں.....

3۔ دل چاہتا ہے اپنے آپ کو ختم کرلوں.....

4۔ میرا بس چلے تو سامنے والے کا گلا ہی دبا دوں.....

5۔ میرے ساتھ ہی یہ سب مسئلے کیوں ہوتے ہیں، دوسرے لوگ کتنے آرام سے زندگی گزار رہے ہیں۔

یہ یا اسی طرح کے اور جملے ہم اور آپ یقیناً کبھی نہ کبھی اپنی زبان سے ادا کر ہی ڈالتے ہیں اور اردگرد سے بھی متواتر سنتے ہیں۔

ایسے ہی جملوں اور خیالات کی تکرار کسی انسان کو شدید ڈپریشن، مایوسی، قنوطیت اور غیر اطمینانی کیفیت میں بتدریج لے جاتی ہے اور لوگ اسے ذہنی ونفسیاتی بیماری کا نام دے کر اس کے علاج کی تگ ودو میں لگ جاتے ہیں۔

چند لوگ دماغی معالج کے پاس چلے جاتے ہیں اور چند نام نہاد روحانی معالج کے پاس اور اس سے بھی بڑھ کر چند ضعیف الاعتقاد جعلی پیروں، فقیروں کے چکر میں پڑ جاتے ہیں..... ہم بحیثیت مسلمان قرآن پاک پر مکمل یقین رکھتے ہیں مگر صرف زبانی کلامی..... ہم اللہ تعالیٰ کے ارشادات کو تو ضرور مانتے ہیں یہی عقیدہ ہے مگر اللہ تعالیٰ کی نہیں مانتے ہم اس بات سے قطعی بے خبر ہیں یا یوں کہیے کہ مکمل غفلت کا شکار ہیں کہ گناہوں کی کثرت اور معصیت سے قربت انسان کو ذہنی مریض بنا دیتی ہے، یہی روحانی بیماری بتدریج ذہنی وجسمانی بیماری میں تبدیل ہو جاتی ہے اور انسان ڈپریشن کی آخری حدوں کو چھوتے ہوئے خودکشی جیسے حرام فعل کے قریب جا پہنچتا ہے۔ انسان کبھی مادی وسائل کو پانے کی انتھک جدوجہد میں ذہنی مریض بن جاتا ہے اور کبھی صرف ظاہری نخوت پر اچھا نظر آنے کی تگ ودو میں اصل سے دور ہو جاتا ہے۔ یہ روحانی بیماری کے ابتدائی مراحل ہیں۔ جب ہم روحانی بیماریوں میں مسلسل مبتلا رہتے ہیں ان کے علاج کی طرف توجہ نہیں دیتے تو نتیجتاً ہم جسمانی طور پر بیمار رہنے لگتے ہیں..... دروغ گوئی، چغل خوری، غیبت، حسد یہ سب روحانی بیماریاں ہیں اپنی ذرا سی تسکین کے لیے کسی کی حق تلفی کرنا اور دوسرے کی ناکامی پر دلی راحت محسوس کرنا یہ سب روحانی بیماریوں کی علامات ہیں..... اور جب ہم بدی کرتے ہیں تو ایک طرف احساسِ جرم (guilt) بڑھتا ہے اور دوسری طرف اس گلٹ پر قابو پانے کی سعی اور یہی کشمکش انسان کو ڈپریشن کی طرف لے جاتی ہے جب سب کچھ چھوڑ چھاڑ خودترسی یعنی، خود کو مظلوم، بے چارہ، بے کس اور لاچار سمجھتا یا پھر اس قدر ہائپر ہو جاتا کہ دوسرے پر زبان ودست دراز کرتا، حملے کرتا یعنی زیر کے سامنے زبر ہو جاتا اور زبر کے سامنے خودترسی کی کیفیت یا اپنے حقوق کی پامالی کا رونا کہ ہمارا حق چھین لیا گیا۔

ایسے مریض اختلاجِ قلب اور پھر خودکشی کا شکار ہو جاتے ہیں، ایک اچھا معالج اس کیفیت کی جڑوں کو اکھاڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ڈپریشن دباتا نہیں بلکہ سرے سے مٹاتا ہے۔ ڈپریشن کی جڑیں احساسِ جرم سے جا ملتی ہیں ــــ روحانی معالج جو ایک ولی اللہ بھی ہوسکتا ہے اور ایک عالم باعمل بھی ہوسکتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی نیکیوں کی ترغیب دلا کر قنوطیت (ڈپریشن) کے مریض کو ایک صحت مند انسان بنا سکتا ہے۔ منفی سوچیں اور خیالات کو ختم کر کے امید اور آس کی شمعیں جلا سکتا ہے مگر معالج کے اکیلے کی سعی مریض کو صحت یاب نہیں کرسکتی جب تک وہ خود اس کیفیت سے باہر آنے کی جدوجہد نہ کرے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا عقیدہ اور ایمان یہی ہونا چاہیے کہ بے شک ربِ کریم کا ذکر ہی دلوں کو اطمینان دیتا ہے۔

از: ثنین عباس..... کراچی

''میں کبھی بھی اتنی کھل کر بات نہ کرتی جو تم مجھے نہ کہتے۔'' اتنی بڑی بڑی باتیں سنا لینے کے بعد وہ انجان اور معصوم بن کر اپنی ہتھیلی پر آیا کبھی کا مندمل ہوا زخم سہلانے لگی۔

''چلو فرض کیا جو تم نے کہا وہی سچ ہے۔'' حمزہ کو اس کے انجان بن جانے پر غصے کے بجائے بے اختیار ہنسی آگئی۔ ''پھر تم نے کسی بھی مسئلے کا کوئی ایک حل تو بتایا نہیں۔''

''پہلے تم مان تو لو کہ جو میں نے کہا وہ درست ہے۔ یہ فرض کیا، ورض کیا، کیا ہوتا ہے۔ بندے کی ٹون کو definite ہونا چاہیے...یا تو کچھ ہے یا پھر نہیں ہے۔'' وہ ساری کی ساری مروّت بالائے طاق رکھتے ہوئے بولی۔ جواب میں حمزہ نے اسے بی اماں اور میرال کی دادی کے درمیان ہونے والی خط کتابت کا قصہ سنایا۔

''اُف توبہ!'' یہ قصہ سننے کے بعد وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ ''خطوط میں لکھے ایک غیر واضح اور ہلکے سے اشارے سے تم نے ایک نتیجہ فرض کرلیا اور اس فرض کی ہوئی بات کے پیچھے یوں خوار ہوئے جاتے ہو۔''

''خطوط میں نے بہت بعد میں پڑھے ہیں پاگل لڑکی۔'' حمزہ کو اس کے کانوں کو ہاتھ لگانے پر غصہ آگیا۔ ''اس لڑکی کی تلاش میں نے صرف بی اماں کی سہیلی کی پوتی ہونے کی وجہ سے شروع کی تھی۔''

''چلو مان لیا ایسا ہی ہوا ہوگا مگر خطوط میں دیے اشارے نے کوششیں تیز کروا دیں۔ آفٹر آل وہ تمہاری

غیر اعلانیہ ہی سہی بی اماں اور اس کی دادی کے درمیان ہونے والی کسی خاموش معاہدے کے تحت منگیتر ٹھہری۔'' نگین کے لہجے میں تمسخر تھا حمزہ کو یوں ہی محسوس ہوا تھا وہ مزید چڑ گیا۔

''تمہیں کچھ بتانا اور بات کرنا ہی فضول ہے۔'' وہ ناراض ہو کر بولا۔

''اس لیے کہ مجھ سے بات کر کے تم پھنس جاتے ہو۔'' وہ اس کی ناراضی سے حظ اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''اچھا چلو میں سنجیدہ ہو جاتی ہوں اور سارے قصے کو کچھ یوں لائن اپ کرتے ہیں کہ میرال کی تلاش... بی اماں کی وجہ سے تم نے اپنی ذمے داری سمجھ لی پھر نیک نیتی پر مبنی تلاش شروع ہوگئی۔ اسی دوران تمہیں اتفاقاً بی اماں کے ارادے کی خبر ہوگئی اور تمہاری تلاش میں ذمے داری سے زیادہ عزت، بے عزتی کا عنصر شامل ہوگیا۔ آخر وہ ایک اَن آفیشل منگیتر تھی۔ اب مسئلہ صرف اتنا ہے کہ وہ اَن آفیشل منگیتر بالفرض اگر مل بھی گئی کہیں سے اور تم سرخرو ہوگئے دونوں اولڈ لیڈیز کی روح کے سامنے تو پھر بھی کھڑا اگ کھڑا کردیں گی۔ ایک تابعداری اور فرمانبرداری، دوسری تابعداری اور فرمانبرداری سے ٹکرا جائے گی۔ کیوں ہے ناں یہی بات؟''

نگین نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تائید چاہی۔

''پتا نہیں۔'' وہ اسی الجھے ہوئے ناراض انداز میں بولا۔ ''لیکن یہ حقیقت ہے کہ کچھ ایسا ہے جو مجھے اس سوچ پر بے چین رکھتا ہے کہ وہ بے سہارا، مصیبت زدہ بلکہ آفت زدہ لڑکی آخر غائب کہاں ہوگئی؟''

''ممکن ہے وہ اپنی مرضی سے وہاں سے غائب ہوئی ہو۔'' نگین نے خیال ظاہر کیا۔

''وہ زخمی تھی اور اس بات کے تو وہاں موجود کئی لوگ گواہ ہیں اور وہ اس وقت اس حادثے اور حادثے کے بعد آپڑنے والی آفات کی وجہ سے اپنے حواسوں میں بھی نہیں تھی۔ اپنی مرضی سے فرار ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور......'' حمزہ کی آواز نیچی ہوئی۔ ''سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ ہے کہ اس اتنے بڑے انسانی المیے کے بعد ریسکیو ورک اور ری ہیبلیٹیشن کارروائیوں کے دوران کتنی ہی جوان، خوب صورت، بے آسرا، آفت زدہ لڑکیاں ان کیمپوں سے غائب ہو گئیں جن کا تا حال پتا نہیں چل سکا۔''

''آہ۔'' نگین نے دکھ کے انتہائی گہرے احساس کے ساتھ کہا۔ ''کیا انسان اتنا گھناؤنا اور بدکردار بھی ہو سکتا ہے؟''

''میں ان کہانیوں کو کسی کے سامنے بھی دُہرانا نہیں چاہتا جو میں نے وہاں سنیں کیونکہ وہ اتنی شرم ناک اور الم ناک ہیں کہ انہیں دُہرانے کے لیے زبان ساتھ نہیں دے پاتی مگر یہ سچ ہے کہ امدادی کارروائیوں کے دوران بہت سے ایسے گھناؤنے اور شرم ناک کام انجام دیے گئے ہیں جن کا تذکرہ تمہیں کسی اخبار، کسی کتاب، کسی رپورٹ میں نہیں ملے گا۔ امداد میں ملنے والی خوراک، دواؤں اور بستروں، کمبلوں کے خرد برد ہونے کی خبروں کے سوا تمہیں کوئی گھناؤنی کہانی کسی سطح پر نظر نہیں آئے گی لیکن انسانیت کی مدد کی آڑ میں چند کالی بھیڑوں نے جو کچھ کیا وہ سنو تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور یہ سب سننے کے بعد شاید تمہیں اس لڑکی میرال کے سلسلے میں میرا کنسرن سمجھ آجائے۔ اس لڑکی کا تو اپنی دادی کے سوا کوئی دوسرا رشتہ ہی نہیں تھا دنیا میں.. جو اس آفت میں موقع پر ہی ختم ہو گئیں سو چو اس کی تلاش میں اس کے پیچھے کون گیا ہوگا۔ نہ جانے کیا وجہ ہے، جو خدا نے مجھے اس جستجو میں لگا دیا۔''

''میرے خدا!'' نگین کی آواز دکھ اور خوف سے لرزنے لگی۔ ''مجھے شاید انسانیت سے نفرت ہونے لگے مگر حمزہ...'' اس نے کوئی خیال آنے پر حمزہ کی طرف دیکھا۔ ''خدا جانے وہ زندہ بھی ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کس حال میں ہے، میرا مطلب ہے......'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ ''وہ کسی قابلِ قبول صورت حال میں بھی ہے یا نہیں؟''

''وہ زندہ ہے، یہاں تک کہ کلیوز تو مجھے مل چکے ہیں مگر کس حال میں زندہ ہے یہ ابھی پتا لگانا ہے۔ میرے کچھ ذرائع میری پوری مدد کر رہے ہیں اور امید ہے کہ جلد یا بدیر میں اس تک پہنچ بھی جاؤں گا مگر قابلِ قبول سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' حمزہ نے کہا۔

''میرا جو مطلب ہے وہ تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔ تم کوئی بچے تو نہیں ہو۔'' نگین نے کہا۔

''یہ سب تو بہت بعد میں کرنے اور سوچنے کی باتیں ہیں مگر ایک بات تو طے ہے کہ اگر وہ کہیں، کبھی مل گئی تو میں بی اماں اور میرال کی دادی کی بات نبھانے کو ذہنی طور پر ضرور تیار ہوں گا۔'' حمزہ کے لہجے میں عجیب سی قطعیت تھی۔

''بالفرض، وہ ہی تمہاری ذہنی تیاری کو قبول کرنے سے انکار کر دے تو؟''

''تو پھر کوئی مسئلہ نہیں ہوگا کم از کم میں تو اس کیفیت سے نکل جاؤں گا جو مجھ پر طاری ہے۔'' وہ بے نیازی سے کہہ رہا تھا۔

''پھر ایشو تو وہی ہوا ناں تمہاری ممی والا۔ وہ تو تمہاری تلاش کے نتیجے کے انتظار میں چین سے نہیں

بیٹھیں گی، نہ ہی وہ تلاش کے ماحصل کو کبھی کسی صورت قبول کریں گی۔''

''یہی تو ساری الجھن ہے، بتاؤ کیا، کیا جائے؟''

''گھما پھرا کر بات وہیں آگئی ناں جو میں نے شروع ہی میں کہہ دی تھی۔'' نگین نے دونوں ہاتھ کمر پر ٹکاتے ہوئے کہا۔ جواب میں حمزہ نے بے نیازی سے شانے اچکا دیے۔ ''تم ایسا کرو اپنا ٹرانسفر کہیں اور کروا لو فی الوقت، نہ ممی کے سامنے ہو گے نہ کوئی اصرار ہوگا۔''

''نہیں کرا سکتا، یہاں سے چلا جاؤں تو اسے کیسے ڈھونڈوں گا۔'' حمزہ نے کہا۔

''اچھا چلو پھر کوئی اور حل سوچتے ہیں۔'' نگین نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''ویسے یہ تو بتاؤ جب تم نے آخری بار اسے دیکھا تھا وہ کیسی تھی؟''

''بہت حسین اور بہت ذہین۔'' حمزہ نے جواب دیا تھا۔

☆☆☆

صوفی صاحب کے وصال کی خبر برق رفتاری سے اندرون و بیرونِ ملک ان کے معتقدین اور ارادت مندوں تک پہنچی تھی۔ دانیال کی کھلی آنکھ میں زندگی کی چمک اور شناسائی کی رمق عافیہ کے لیے موت کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے والے وعدے پر بغیر کسی سوال کے مکمل ایمان لے آنے کے مترادف تھا۔ ''جب اللہ پر ایک اَن دیکھے خدا پر دل سے ایمان لے آئیں تو اس کے ساتھ جُڑے تمام ارکان پر ایمان اس ایمان کا حصہ بن جاتا ہے لیکن جب معجزوں کو اپنی آنکھوں سے رونما ہوتے دیکھا جائے تو ایمان پختگی کی طرف ناقابلِ شکست اسٹیج کی طرف بڑھ جاتا ہے۔'' سارا دن دانیال کے سرہانے بیٹھ کر اس کے جسم کی اگلی جنبش کے انتظار میں گزارتے ہوئے عافیہ نے بارہا یہ بات سوچی تھی۔

''شاید یہ صبر آزما اور طویل انتظار ہے۔'' اس شام ان کے شوہر نے اسپتال آکر پورے دن کی روداد سننے کے بعد کہا تھا۔

''لیکن ہمیں کرنا ہوگا۔'' انہوں نے اپنی بات مکمل کی۔

''جہانگیر......وہ صوفی صاحب......'' عافیہ کی آواز گھٹنے لگی۔ جس بات پر صبح سے وہ نہ اپنے بیٹے عاصم نہ ہی کسی ڈاکٹر کو یقین دلا پائی تھیں وہی اپنی زندگی کے ساتھی کے سامنے بیان کرنے لگیں۔

''تم جو محسوس کر رہی ہو عافیہ وہ سو فی صد درست ہے۔'' ان کے روشن خیال، لبرل، اعلیٰ تعلیم یافتہ شوہر نے ان کی توقع کے برعکس ان کی پوری بات سننے کے بعد کہا تھا۔ ''ہم کل صوفی صاحب کے ہاں چلیں گے یقیناً وہ اللہ کے نیک بندے تھے، یقیناً اس کے مقربین میں سے تھے۔''

صوفی صاحب کے ہاں عقیدت مندوں کا ہجوم تھا۔ ان کے کچھ خاص مقلدین بیرونِ ملک سے بھی فوری دستیاب پروازوں کے ذریعے پہنچ چکے تھے۔ عافیہ اور جہانگیر جس وقت صوفی صاحب کے ہاں پہنچے ان کا جنازہ قبرستان لے جانے کے لیے تیار رکھا تھا۔ عافیہ نے دیکھا اتنا بے شمار ہجوم ہونے کے باوجود وہاں موجود لوگوں میں حد سے زیادہ نظم و ضبط تھا۔ صوفی صاحب کا جنازہ ایک ہال نما کمرے کے وسط میں رکھا تھا اور عقیدت مند قطار بنائے ایک، ایک کر کے جنازے کا دیدار کرتے آگے گزرتے چلے جا رہے تھے۔ نہ کوئی دھکم پیل نہ شور و غوغا۔

''کلمہ شریف پڑھتے رہیے، جن حاضرین کو سورۂ یٰسین زبانی یاد ہے وہ اس کی تلاوت زیرِ لب کرتے

رہیں۔'' نہ جانے کس سمت سے لاؤڈ اسپیکر پر بار بار ایک آواز گونجتی۔ ''عزیز بہنوں اور بیٹیوں سے درخواست ہے کہ بلند آواز میں رونے سے پرہیز کریں۔ انسان کی جان اللہ کی امانت ہے۔ ایک امانت اپنے مالک کو واپس پہنچی، مقامِ شکر کہ جان نے اپنے عبودیت کا حق ادا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔'' دوسری آواز ابھری۔

''صوفی صاحب ہجوم پسند نہیں فرماتے تھے۔'' عافیہ کو ڈرائیور کی بات یاد آئی۔ ''اور ان کی شخصیت کا اثر ان کے بعد بھی کیسا باقی ہے۔'' انہوں نے سوچا۔ ''ہجوم تو ہے مگر ہجوم کی کیفیت نہیں ہے۔''

پھر کلمۂ شہادت کی آوازوں کے درمیان جنازہ اٹھایا گیا۔ جہانگیر جنازے کے ساتھ جانے والوں میں شامل ہو گئے۔ عافیہ اپنی نم آنکھوں کو ٹشو پیپر سے پونچھتی خواتین والے حصے میں پہنچ گئیں۔ یہاں بے شمار خواتین فرشی نشستوں پر یہاں وہاں بیٹھی تھیں۔ عافیہ کی نظر ایک کونے میں بیٹھی بیگم اکرام اللہ اور ان کی پوتی پر پڑی۔ وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھیں۔

''آپ کب پہنچیں؟'' ان سے ملتے ہوئے عافیہ نے پوچھا۔

''ابھی پانچ بجے شام کے قریب۔'' بیگم اکرام اللہ نے ان کے لیے اپنے قریب جگہ بنائی۔

''آپ نے دیکھا، آپ کو جو کچھ صوفی صاحب نے خواب میں کہا اس کا کیا مطلب تھا؟'' عافیہ اپنے جذبات پر قابو نہ پاتے ہوئے بری طرح رو دیں۔

''اللہ والوں کے اسرار وہ جانیں یا اللہ جانے۔'' بیگم اکرام اللہ نے آہ بھرتے ہوئے ان کی کمر تھپکی۔

''صوفی صاحب تو ہم جیسوں کے راہنما تھے آنٹی۔ اب ہم راہنمائی کہاں سے حاصل کریں گے۔'' عافیہ نے کہا۔

''راہنما تو وہ عالمگیر کتاب ہے بیٹی جس میں زندگی کے ہر پہلو کے لیے راہنمائی درج ہے۔ صوفی صاحب خود کو محض وضاحت کرنے والا گردانتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے پڑھا، سمجھا اور سیکھا۔ اب مجھ پر فرض ہے کہ خلقِ خدا کو جہاں مشکل پیش آئے انہیں سمجھاؤں اور سکھاؤں۔'' بیگم اکرام اللہ نے کہا۔ ''تم نے دیکھا ہی تھا کہ وہ ہر اس شخص کے لیے حاضر ہوتے تھے جو اُن کی طرف رجوع کرتا تھا۔ اپنی شخصیت کی تشہیر، بلند و بانگ دعوے، اشاعتِ دین کو کاروبار بنانا انہیں سخت ناپسند تھا مگر دیکھ لو کسی تشہیر کے بغیر بھی اُن کی نیک نامی کی خوشبو کیسے چہار دانگ عالم پھیلی، کہاں کہاں سے لوگ آ رہے ہیں اور ابھی مزید آتے رہیں گے۔ سب کی اپنی عقیدت ہے صوفی صاحب کے لیے۔ سب کا اپنا تعلق ہے۔''

''میں یہ سب پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔'' عافیہ نے اعتراف کیا۔ ''میرے لیے یہ سب نیا ہے لیکن میں بہت خوش قسمت ہوں جو صوفی صاحب جیسے بزرگ کے ساتھ میری چند نشستیں رہیں۔ میں ان کے بتائے ہوئے وظائف پڑھتی ہوں۔ ان کی گفتگو نے مجھے دانیال کے لیے ہمیشہ حوصلہ دلایا اور آج صبح والے اس خواب کے بارے میں تو آپ ہی جانتی ہیں۔ جاتے جاتے وہ مجھے کیسی خوش خبری دے گئے۔'' وہ بری طرح رونے لگیں۔

''حوصلہ کرو بیٹی اور صبر و ہمت سے کام لو۔ میں نے کہا ناں اللہ والوں کے اسرار اللہ جانے یا اللہ والے جانیں۔ ہم بندے تو دیکھنے والوں، سوچنے والوں اور سمجھنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل ہیں۔'' بیگم اکرام اللہ نے ایک بار پھر انہیں اپنے ساتھ لگا لیا۔

''صوفی صاحب کا اشارہ بڑا واضح ہے۔ دانیال کی صحت یابی کی خوش خبری مبارک ہو عافیہ۔'' کچھ دیر بعد بیگم اکرام اللہ نے جھک کر اُن کے کان میں سرگوشی کی۔ عافیہ کا دل بری طرح دھڑکا۔

''خود چلے گئے اور جاتے جاتے یہ نوید سنا گئے۔'' انہوں نے نیچی آواز میں کہا۔

''صبر اور حوصلے سے انتظار کرو بس۔'' بیگم اکرام اللہ نے جواب دیا۔ ''یہ میری پوتی ہے اس سے بہت شفقت فرماتے تھے صوفی صاحب۔'' پھر انہوں نے اپنی پوتی کی طرف اشارہ کیا۔ عافیہ نے سر اٹھا کر اس بچی کی طرف دیکھا۔ اٹھارہ، انیس سالہ وہ لڑکی شکل صورت میں انتہائی خوب صورت تھی۔ شاید نظر لگ جانے کی حد تک حسین۔ وہ سادہ کپڑوں میں ملبوس تھی۔ دیکھنے میں معصوم اور کم گو لگتی تھی۔ عافیہ کو یاد آیا پچھلی بار اس بچی سے ان کی ملاقات انتہائی پریشانی کے عالم میں ہوئی تھی لیکن اس وقت بھی وہ اس کے معصوم سے حسن کو نظر انداز نہیں کر پائی تھیں گو اس کے چلے جانے کے بعد وہ انہیں کبھی یاد نہیں آئی تھی لیکن اس روز انہیں ایسا لگ رہا تھا ایک بار اس پر نظر پڑنے کے بعد ان کی نظر اس کے چہرے سے ہٹنے سے انکاری ہو رہی تھی۔

''صوفی صاحب نے اسے بھی ایک بھرپور تسلی دی تھی ایک بار۔'' بیگم اکرام اللہ نے عافیہ کو بتایا۔ ''فرمانے لگے کبھی خود کو تنہا مت سمجھنا بیٹی، تمہارے ساتھ میری دعائیں ہر دم شاملِ حال رہیں گی اور یاد رکھنا دعا میں وہ ڈھال جیسی تاثیر ہے، ایک ایسی ڈھال جو سخت ترین وار سے بھی بچا لیتی ہے انسان کو اور یہ کہ ہم تو شاید یہ دیکھنے کے لیے دنیا میں نہیں ہوں گے مگر تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گی کہ یہ دعا کی ڈھال تمہیں کہاں کہاں اور کیسے، کیسے بچاتی ہے۔''

''یہ تو بہت بڑی بات ہے آنٹی۔'' عافیہ نے چونک کر بیگم اکرام اللہ کو دیکھا۔

''ہاں بہت بڑی بات ہے۔'' انہوں نے سر پر اپنی چادر ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں نے اس بات کا تذکرہ کبھی کسی سے نہیں کیا۔ تم واحد ہو اور پہلی ہو جسے یہ بات سنا رہی ہوں وہ بھی اس لیے کہ تمہیں یقین آ جائے کہ صوفی صاحب کی بات میں ایسی تاثیر تھی کہ انسان خود کو رنج و فکر سے بے نیاز محسوس کرتا۔ یہ چیز اُن کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ جب سے صوفی صاحب نے اس بچی کو یہ تسلی دی ہے میں جو اس بن ماں باپ کی بچی کے بارے میں ہر دم فکر مند رہتی تھی۔ بے فکر اور بے غم ہو کر چین کی نیند سوتی ہوں۔''

''اللہ اسے ہمیشہ ہر طرح اپنی امان میں رکھے۔'' عافیہ نے بیگم اکرام اللہ کی پوتی کی طرف دیکھتے ہوئے بے اختیار دعا کی۔

''لیکن عافیہ بیٹی میرا مشورہ ہے کہ خود کو ثابت قدم رکھنا۔ صوفی صاحب اس دنیا میں نہیں رہے لیکن جو گداز تمہارے دل میں دانیال بیٹے کے اس حادثے نے اور صوفی صاحب کی راہنمائی نے پیدا کیا ہے کوشش کرنا وہ اپنی جگہ موجود رہے۔ دانیال بیٹے کی زندگی اور صحت یابی کی طرف سے مجھے تو کوئی شک نہیں رہا کیونکہ میں اپنی آنکھوں سے اسے اپنے پیروں پر چلتے پھرتے دیکھ چکی ہوں۔ یوں جیسے کبھی کوئی حادثہ اس کے ساتھ گزرا ہی نہ ہو۔''

''آپ کو شاید میں بتا نہ سکوں آنٹی کہ دانیال کے اس حادثے نے مجھے کیسی بے خبری سے نکالا ہے۔ آج میں یاد کرتی ہوں تو خود ہی خوف سے لرز جاتی ہوں کہ میں کیسی بے خبری میں، جہالت میں، اپنی ذات اور اسٹیٹس کے زعم میں مبتلا گناہ گاری اور غفلت کے کیچڑ میں گھٹنوں، گھٹنوں پھنسی عورت تھی۔ میرے اللہ کا مجھ پر

یہ کرم نہیں تو کیا ہے کہ اس نے مجھے اس غفلت کی نیند سے کیسا جھنجوڑ کر نکالا ہے۔ اللہ نہ کرے کہ جو میں کبھی اپنی پہلے والی حالت کی طرف لوٹوں۔'' عافیہ نے جُھرجُھری لیتے ہوئے کہا۔

''اللہ تمہیں ثابت قدم رکھے۔ بعض حادثے انسان کی زندگی میں آتے ہی زندگی کی جہتیں بدلنے کے لیے ہیں شاید۔'' بیگم اکرام اللہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اس رات عافیہ، صوفی صاحب کے گھر سے رخصت ہوتے ہوئے بصد اصرار بیگم اکرام اللہ اور ان کی پوتی کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئی تھیں۔ صوفی صاحب کے سوئم، دسویں اور... اس کے بعد ایک اجتماعی دعا میں شرکت کرنے تک بیگم اکرام اللہ اور ان کی پوتی عافیہ کی مہمان رہیں اور اس دوران عافیہ اور ان کے گھر والے بیگم اکرام اللہ کے ساتھ یوں گھل مل چکے تھے جیسے ہمیشہ سے ساتھ ہی رہتے ہوں۔

☆☆☆

''ہاں اچھے لگتے ہیں جگنو، تتلیاں اور پھول، ستارے لیکن یار اس رومینٹسزم کی عمر بھی انسان کی ٹین ایج جتنی ہی ہونی چاہیے۔ ٹین ایج سے نکل کر بڑھتی عمر کی ذمے داریوں کے جگنو اور تتلیاں آنکھوں کے سامنے آ کر ناچتی ہیں اور مسائل کے ستارے نظروں کو چُندھیانے لگتے ہیں۔ اس عمر سے نکل کر بھی اس عمر کی فینٹسی میں رہنے والوں کو کم از کم میں تو ناقص العقل ہی کہوں گا۔'' فہد کی بات کڑوی تھی اور شاید ناقابلِ ہضم بھی۔ علینہ نے بہ مشکل اسے حلق سے اتارا۔

''بات سنو تم کچھ زیادہ ہی پریکٹیکل مائنڈڈ بلکہ materialistic (مادّہ پرست) نہیں ہو گئے؟'' اس نے بہت کاٹ دار لہجے میں کہا۔

''اچھا!'' وہ ہنسا۔ ''واقعی؟'' وہ اس کے تجزیے پر حیران تھا۔

''اور نہیں تو کیا۔'' علینہ کو اپنا منہ خود ہی پھولا ہوا لگ رہا تھا جبکہ اس کے سامنے کوئی آئینہ بھی نہیں تھا۔ ''یاد کرو تم ہی تو میری انگلی پکڑ کر سب سے پہلے اس فینٹسی ورلڈ میں لے کر گئے تھے۔'' اس نے جتاتے ہوئے کہا۔

''بالکل لے گیا ہوں گا مگر یہ کب کی بات ہے بھلا یاد کرو۔'' فہد نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''جب ہم اسکول میں پڑھتے تھے۔'' علینہ نے اسی ناراض انداز میں جواب دیا۔ جواب میں فہد قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

''پھول اور ستارے پیچھے رہ چکے ہیں۔''

''نہیں فہد۔'' علینہ نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''وہ پیچھے نہیں رہے، وہ یہیں اسی دنیا میں اسی طرح موجود ہیں، ہمیشہ سے موجود تھے اور آنے والے وقتوں میں بھی موجود رہیں گے۔ صرف ہمارے مزاج، ہماری نظر بدل گئی ہے۔ بہت سارا وقت، بہت کم وقت کی ہولناک بندگلی میں پھنس کر رہ گیا ہے۔ تم نے کبھی وہ نظم پڑھی ہے جس کا عنوان Leisure ہے۔

what is this life if full of love
we have no time to stand and stare
no time to stand beneath the boughs
and stare as long as sheep or cows

no time to see when woods we pass
where squirrels hide their nuts in grass"

فہد نے بھی جواب میں وہی نظم آگے بڑھائی۔

" no time to turn at beauty 's glance
and watch her feet how they can dance"

علینہ نے اگلی لائنز سنائیں

" a poor life this if full of care
we have no time to stand and stare"

فہد نے نظم کی آخری لائنیں یاد کیں۔

''اس کا مطلب ہے تمہیں یاد ہے اور خوب یاد ہے۔'' علینہ بولی۔ ''اور تم جانتے ہو یہ کتنا بڑا انسانی المیہ ہے کہ حسنِ فطرت ہے اور اسے دیکھنے کے لیے انسان کے پاس وقت نہیں ہے۔''

''واہ بھئی تم تو بہت بڑی، بڑی باتیں بھی کر لیتی ہو۔'' فہد نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

''تو کیا تم میرا امتحان لے رہے تھے؟'' علینہ ایک بار پھر ناراض ہو گئی۔

''نہیں، یہ اتفاق سے ہو گیا اور اچھا ہوا کہ مجھے پتا چل گیا ورنہ تو میں تمہیں اب بھی شولڈر کٹ بالوں میں ننھی ننھی تتلیوں کی طرز پر بنی پنیں لگائے، چیک والی فراک پہنے اپنی اماں کی ہدایات پر جی جی کرنے والی بچی ہی سمجھ رہا تھا۔''

''اگر تم میرے سامنے ہوتے تو میں تمہیں قتل کر دیتی یقیناً۔'' علینہ نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ میں اب، وقت ماسٹرز کر رہی ہوں۔''

''یاد ہے، یہ بھی یاد ہے اور اس سے بڑھ کر یہ بھی یاد ہے کہ تم یہ ماسٹرز کس کے اُکسانے پر کر رہی ہو۔'' فہد نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

''تم مجھے ہمیشہ پوائنٹ ہی مارتے رہنا۔ شاید تمہیں یاد نہیں کہ چند ماہ پہلے تمہی تھے جس نے یہ بھی کہا تھا کہ مجھ سے محبت کرتے ہو، کتنے بے ایمان ہو تم۔ محبت کرنے کا دعویٰ کرنا تمہاری عادتِ ثانیہ لگتی ہے مجھے۔'' علینہ نے دانت پیسے۔

''ایسا کرو تم پورے آرام و سکون سے بیٹھ کر کبھی غور کرنا جو میں تم سے کرتا ہوں اسے محبت نہیں کہتے کیا؟'' فہد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کی اس بات کے ساتھ ہی علینہ کا فون بند ہو گیا۔ اس نے فون کان سے ہٹا کر دیکھا فون کی بیٹری ختم ہو چکی تھی۔

''جو میں تم سے کرتا ہوں اسے محبت نہیں کہتے کیا۔'' علینہ نے فون سیٹ چارجر سے جوڑ کر میز پر رکھنے کے بعد کھلی کھڑکی سے باہر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے فہد کی بات کو دل میں دُہرایا اور آسمان پر بکھرے ستارے دیکھ کر مسکرا دی۔

''سچ تو یہی ہے کہ جب سے تم واپس میری زندگی میں آئے ہو زندگی کے کئی رخ بدل سے گئے ہیں۔'' اس نے سوچا۔ ''میلوں دور سے آتی تمہاری آواز اور تمہاری باتوں کا ہی تو کرشمہ ہے کہ پہلے زندگی میں جو یکسانیت تھی وہ کہیں دور جا چھپی ہے۔'' اس کے دل نے فہد کی بات کی تائید کی۔

''دنیا میں محبت کے ایک سو ایک رنگ ہیں اور ان میں سے ایک رنگ تو یقیناً ہمارا ہوتا ہے۔'' اس نے کبھی کہیں پڑھی بات یاد کی۔

☆☆☆

وہ دور کہیں بلندیوں پر تھا۔ فضا میں سکوت تھا اور ہوا اس مشینی پرندے کو یکساں رفتار کے ساتھ اُڑائے لیے چلی جا رہی تھی۔ جس کا کنٹرول اس کے ہاتھ میں تھا۔ شوق بڑھتے...... بڑھتے جنون بن چکا تھا اور جنون وہ کر دکھانے کے عزم کو ہوا دیے رہا تھا جو اسے مشینی پرندے اڑانے کی طرف لے آیا تھا۔ اس کی نظر عقاب کی سی صفت اختیار کر رہی تھی اور حسیات چیتے کی طرح برق رفتار ہو رہی تھیں۔ اس نے فضا میں اپنے اس مشینی پرندے کو ایک قلابازی سی کھلائی جس کا مکمل کنٹرول اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے پیچھے دھوئیں کی لکیر نے یقیناً اس لڑکی کی سی شبیہہ پل بھر کو اختیار کی ہوگی جس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔

''ہا...ہا'' وہ مسرت کے ایک بھرپور احساس کے تحت ہنسا تھا اور اپنے ذہن میں بیٹھی اگلی شبیہہ بنانے کی خاطر ایک لمبا چکر کاٹنے کے بعد پرندے کو ایک اور قلابازی دینے کے لیے اسے گھمایا اور اوپر کا حصہ نیچے کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش ہی میں اس کی نظر نے عقاب کی صفت گنوائی اور حسیات کو کچھوے کی رفتار سے الفت ہونے لگی۔ ابھی اسے اس مرد کی تصویر دھوئیں سے نکالنی تھی جو سگریٹ پی رہا تھا مگر پل کے پل میں وہ دھوئیں، تصویر، شوق، جنون اور عزم کی حدوں سے کہیں آگے نکل گیا تھا۔ ہر چیز پر اس کا کنٹرول ختم ہو رہا تھا، ایک بھیانک اندھیرا، ایک جامد خاموشی اسے اپنا مقدر بنتی نظر آنے لگی تھی۔ اس نے اس زمین پر شاید آخری آواز وہی سنی تھی جو اس کے مشینی پرندے کے زمین سے ٹکرانے پر پیدا ہوئی تھی اور آخری روشنی جو اس کے اردگرد آگ کی لپٹوں کی شکل میں اٹھ رہی تھی۔

وہ آخری منظر ایک منٹ کے نصف حصے کے اندر اس کے پردۂ ذہن پر ابھرا تھا اور اس نے ایک بے چین کیفیت کے تحت لرز کر اپنی دونوں آنکھیں ایک ساتھ کھولی تھیں۔ اس کی نظروں کے سامنے دھند سی چھائی ہوئی تھی اور دھند کے اس پار اُسے کچھ ایسے چہرے نظر آئے تھے جو مانوس تھے اور شاید اس کے اپنے تھے۔ دانیال جہانگیر نے کتنے مہینوں کے بعد ایک ساتھ دونوں آنکھیں کھول کر اپنے اردگرد دیکھا تھا۔ اس کے سامنے کھڑی اس کی ماں عافیہ جہانگیر ان کی تعداد انگلیوں پر گن کر بتا سکتی تھی۔ دن، ہفتے، مہینے، لمحے، منٹ اور گھنٹے ایک، ایک پل ان کے سوا شاید کسی نے نہیں گنا ہوگا۔

☆☆☆

بینش یونیورسٹی ٹائم کے بعد اپنے اسٹاپ پر اپنی روٹ بس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ جب ایک سیاہ چمکتی گاڑی اس کے قریب آکر رکی تھی۔

''آئی ایم سوری بینش، میں تمہارے انتظار میں کیفے ٹیریا میں نہیں بیٹھ سکا۔ دراصل مجھے ایک لنچ میں شریک ہونا پڑ گیا تھا۔ اگر تم مائنڈ نہ کرو تو میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں۔ اس دوران میں ہم وہ چیز بھی دیکھ لیں گے جو تم مجھے صبح دکھانا چاہ رہی تھیں۔'' گاڑی کا شیشہ نیچے کرنے کے بعد دانیال نے سر باہر نکال کر اس سے کہا تھا۔

جاری ہے

شامِ شہرِ یاراں

عنیزہ سید

قسط 7



زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے . . . خیر و شر، نیکی اور بدی . . . زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت . . . ہر برائی پر حاوی ہوجاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سیّد نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

محمود درانی اور مہرین کی تیسری اولاد حمزہ، مہرین کی زچگی میں پیچیدگی کے باعث نانی کے پاس ان کے آبائی گھر سیالکوٹ میں پروان چڑھتا ہے۔ جہاں نگین اس کے ماموں کی بیٹی سے اس کی خوب گاڑھی چھنتی ہے۔ بڑے ہونے پر حمزہ کے والدین اسے واپس لانا چاہتے ہیں مگر وہ راضی نہیں ہوتا۔ علینہ کے والدین نادیہ اور سعید کیانی نے کورٹ میرج کی تھی مگر شادی کے تین سال بعد سعید کیانی بیوی کو داغِ مفارقت دے گئے۔ علینہ، فہد کو ٹی وی شو میں ایک شیف کے طور پر دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے فہد جس کے ساتھ اس نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ آکسفورڈ کا پروردہ سردار مہرزاد خان اپنے باپ کے سیاسی قتل کے بعد حادثاتی طور پر سیاست میں شامل ہوا تھا اور زرنگار کے حسین رزہانت کا شکار ہو چلا تھا..... بینش دو بھائیوں کی اکلوتی بہن، اپنی ضد اور صرف بھائیوں کے تعاون سے نیشنل کالج آف آرٹس میں تعلیم حاصل کر رہی تھی جہاں اس کا سینئر ساتھی دانیال اس سے ہر ممکن تعاون کرتا تھا۔ ایک پاکستانی مسلمان مرد اور بدھ مذہب کی پیروکار چینی عورت کی بیٹی زوئی حسین چین سے آکر پاکستان میں فارمیسی کی تعلیم حاصل کرتی ہے یہ سب اس نے دادی کی محبت میں کیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کا دل پاکستان کی سرزمین اور یہاں کے لوگوں سے شدید محبت کرنے لگا تو اس نے ریسرچ ڈیپارٹمنٹ جوائن کرلیا تاکہ اپنے قیام کو بڑھا سکے۔ حمزہ جو اب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے ایک سیمینار کے سلسلے میں ایبٹ آباد جاتا ہے اور وہاں بی اماں کی سہیلی رابعہ کلثوم کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے جو بچپن میں باقاعدگی سے سیالکوٹ آتی تھیں اور حمزہ بھی بی اماں کے ساتھ ایبٹ آباد آیا کرتا تھا مگر 2005ء کے زلزلے کے بعد وہاں سب کچھ بدلا ہوا تھا۔ حمزہ اپنی کزن اور بچپن کی دوست نگین سے بی اماں کی سہیلی اور پوتی (میرال) کے متعلق اپنی تشویش بتاتا ہے کہ رابعہ کلثوم کی وفات اور زلزلے کے بعد پوتی نہ جانے کہاں چلی گئی۔ رابعہ کلثوم بوا جی کے نام سے آرٹ اینڈ کرافٹ سینٹر چلاتی تھیں۔ زرنگار، امراؤ بیگم جو اپنی والدہ زبیدہ خانم کا کوٹھا آباد کیے ہوئے تھیں کی آمدنی کا ذریعہ بن جاتی ہے مگر صرف سردار مہرزاد خان نے اس کی کئی راتوں کے حقوق بھاری معاوضے کے عوض اپنے نام کر لیے تھے۔ دانیال آرٹ کا عشق رکھنے کے ساتھ فلائنگ میں بھی مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے اور ایک دن طیارے کے دھوئیں سے نقش و نگار بنانے کی کوشش میں حادثے کا شکار ہو کر اسپتال میں پٹیوں میں جکڑا (عافیہ) ماں کی ممتا کا شدید امتحان بن جاتا ہے۔ بیٹے کی زندگی کی دعائیں مانگتے مانگتے عافیہ اللہ تعالیٰ کے مقربانِ خاص بندوں میں سے ایک کی درگاہ میں جا پہنچتی ہے۔ زوئی حسین کے ویزے کی مدت ختم ہونے سے دو روز قبل وہ اپنے ایک ساتھی نادر سے نکاح کر لیتی ہے تاکہ پاکستان میں رہنے کا جواز پاسکے۔ 2005ء کے زلزلے میں زوئی حسین نے بھی متاثرین کی مدد کی تھی جو اسے خاصی مہنگی پڑی اور اب نادر بدگمانی کی آخری سیڑھی پر تھا۔

اب آگے پڑھیں

"مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اب جا کر تمہاری وہ جھینپ اور جھجک آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے جو شروع میں تمہاری شخصیت کا حصہ معلوم ہوتی تھی۔" دانیال نے گیئر بدلتے ہوئے اپنے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی بینش سے کہا۔

دانیال کی یہ بات ہی بینش کو بوکھلا دینے کے لیے کافی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ فوری طور پر وہ اندازہ نہیں لگا پائی تھی کہ اسے کس بات پر شرم آئی تھی۔ پہلے والی جھینپ اور جھجک پر یا اب والی اس کیفیت پر جسے دیکھ کر دانیال نے وہ بات کہی تھی۔

"ویسے یہ امتزاج اچھا لگتا ہے۔" وہ سگنل پر رکتا ہوا بولا۔ "ایسٹرن ٹریڈیشنل جھجک اور حد میں رہنے کا احساس اور سوسائٹی کا حصہ بننے والے نت نئے ٹرینڈز کے ساتھ چلنے کی کوشش بھی۔ لڑکیوں کو بولڈ نہیں لیکن کانفیڈنٹ ضرور ہونا چاہیے۔"

"بولڈ اور کانفیڈنٹ ہونے میں کیا فرق ہے؟" بینش نے فطری جھجک کو خود پر طاری ہونے سے روکتے ہوئے پوچھا۔

"بہت فرق ہے۔" وہ مسکرایا۔ "جو بولڈ ہوتے ہیں وہ ہر بات کہہ دیتے ہیں اور جو کانفیڈنٹ ہوتے ہیں وہ ہر وہ بات کہہ ڈالتے ہیں جو کہنے والی ہوتی ہے لیکن فضول گوئی سے پرہیز کرتے ہیں۔" بینش نے اس کی بات سمجھنے میں چند منٹ لگائے۔

شام شہریاراں

"لیکن کانفیڈنٹ اور بولڈ ہونے کے علاوہ لوگوں کی ایک تیسری قسم بھی ہوتی ہے۔" اسے خاموش دیکھ کر دانیال نے کہا۔

"وہ کون سی قسم ہے؟"

"آؤٹ اسپوکن لوگ جنہیں ہماری زبان میں منہ پھٹ کہتے ہیں۔ جو لوگ منہ پھٹ ہوتے ہیں وہ اس بات میں فخر محسوس کرتے ہیں کہ ہم بڑے چھوٹے کا لحاظ کیے بغیر اپنی بات اگلے کے منہ پر مارتے ہیں۔"

"ایسے لوگ اچھے ہوتے یا برے؟" بینش نے اس کی طرف دیکھا۔

"پتا نہیں۔" اس نے سر ہلایا۔ "لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ ایسے لوگ دل کے صاف ہوتے ہیں۔ دل کی بات دل میں نہیں رکھتے۔ اپنا غصہ، رنجش، شکوہ، گلہ بس کہہ ڈالتے ہیں لیکن میری رائے ایسے لوگوں کے بارے میں تھوڑی مختلف ہے، میں آؤٹ اسپوکن ہونے کی آڑ میں کسی کو ہرٹ کرنے کے سخت خلاف ہوں۔ مجھے دوسروں کے جذبات، پسند، ناپسند اور احساسات کا خیال رکھنا اچھا لگتا ہے۔"

بینش نے تحسین آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اور دوسروں کا خیال رکھنے......... کی عادت نے مجھ میں ایک اچھی عادت ڈیولپ کی، اپنا غصہ رنجش، شکوہ، گلہ پی جانے کی عادت۔" وہ مسکرایا۔ "گو یہ بہت مشکل ہے مگر جب یہ عادت ڈیولپ ہو جائے تو انسان خود آسانی پا جاتا ہے۔"

"بالکل صحیح ہے۔" بینش نے سر ہلایا۔ "میرے نانا جی پسرور میں رہتے ہیں، انہیں بھی غصہ نہیں آتا کبھی اور وہ اب ستر برس کی عمر سے بھی چند سال اوپر مگر صحت مند اور خوش باش رہتے ہیں۔"

"ہاہا......" دانیال بے اختیار ہنسا۔ "یار جو لوگ بٹ ہوتے ہیں وہ ویسے بھی صحت مند ہی ہوتے ہیں حالانکہ بنا ہے خاصے لڑاکا ہوتے ہیں۔"

بینش اس کی بات سن کر بری طرح جھینپ گئی۔

"کم آن......" وہ اسے یوں جھینپتے ہوئے دیکھ کر بولا۔ "میں ایک جنرل بات کر رہا ہوں، تمہیں تھوڑی کہہ رہا ہوں۔" وہ مسکرایا۔ "اچھا ایسا ہے کہ اوپر مال سے دھرم پورہ کی طرف مڑیں تو تمہارا گھر نزدیک پڑے گا ہے نا؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"نہیں آزادی چوک کی طرف سے زیادہ نزدیک ہے، آپ غلط سائڈ اور لمبے راستے کی طرف آگئے۔" بینش نے شیشے سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ دانیال کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر کہیں جانے کا احساس ایسا تھا جس نے اسے گرد و پیش کی خبر بھلا دی تھی۔

"میں جانتا ہوں۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "لیکن کیا ہے کہ میرا گھر مال پر ہے اور مجھے گھر سے ایک ضروری فائل پک کرنی ہے، میں اسی لیے اس طرف سے آیا ہوں اگر تم برا نہ مانو تو میں وہ فائل وہاں سے لے لوں اور تم کچھ دیر میری ممی سے مل لینا۔"

بینش نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"لیکن میں......" اس نے کچھ کہنا چاہا اس کی زبان ہکلا گئی۔

"تم مجھ پر اعتماد کر سکتی ہو لڑکی، میری نیت میں کوئی فتور نہیں......" وہ ایک موڑ کاٹتے ہوئے نرمی سے بولا۔ "جو انسان موت کی سرحدوں کو چھو کر واپس زندگی کی طرف لوٹا ہو اسے موت اور زندگی دونوں کے

درمیانی فاصلے کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے اور اسے یہ بھی یاد رہتا ہے کہ موت کو سامنے پاکر زندگی میں کیے ہوئے کیسے کیسے گناہ یاد آنے لگتے ہیں، بھولے بسرے گناہ...... لہٰذا ایسا شخص دوبارہ زندگی ملنے پر دانستہ کچھ غلط کرنے لگے تو اس پر لعنت ہی بھیجنی چاہیے۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں۔'' بینش منمنائی۔

''میں ابھی سمجھاتا ہوں۔'' اس نے گاڑی ایک بڑے سے گیٹ کے سامنے کھڑی کرتے ہوئے کہا اور ہارن بجانے لگا، کچھ لمحوں بعد وہ آہنی گیٹ کھلا اور گاڑی ایک ایسے گھر کے ڈرائیو وے کی طرف بڑھنے لگی جس کا اندرونی منظر لینڈ اسکیپ کا تاثر دے رہا تھا۔

''آؤ۔'' وہ گاڑی سے باہر نکل کر اس کی طرف آکر دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ ''اور اُف......'' اس کی نظر بینش کے چہرے پر پڑی۔ ''پلیز اپنی اس گھبراہٹ اور سفید پڑتے چہرے پر قابو پالو، میری ممی کہیں یہ نہ سمجھنے لگیں کہ میں تمہیں اغوا کرلایا ہوں۔''

بینش کو وہ لمحے اپنی زندگی کے مشکل ترین لمحے لگ رہے تھے۔ ایک طرف وہ خود کو ملامت کررہی تھی جو اتنی بے تکلفی سے دانیال کے ساتھ بیٹھ کر گھر جانے پر راضی ہوگئی۔ اس بے وقوفی کا کیا نتیجہ نکلنے والا تھا۔ اس کے گھر کے بجائے اپنے گھر آنے کی بات دانیال نے اتنی اچانک کی تھی کہ وہ ڈھنگ سے کچھ بول ہی نہیں سکی تھی اور اس کے بعد فوراً وہ اسے اپنے گھر لے بھی آیا تھا۔ دوسری طرف اس گھر کا رقبہ اور اس رقبے پر بنی عمارت اسے مرعوب کیے دے رہی تھی۔ دانیال اپنی ممی کا ذکر کررہا تھا اس خوب صورت، جدید طرزِ تعمیر پر بنے عالیشان گھر کی مالکہ کیا خاتون ہوں گی وہ اندازہ کرسکتی تھی۔ ماڈرن، انگریزی بولنے والی، اس کے حلیے اور انداز پر اسے بالکل بھی خاطر میں نہ لانے والی خاتون، صحیح معنوں میں اس کا دل دھک دھک کررہا تھا۔

''آؤ بھئی، اتنی دیر میں تو بڑے بڑے نامور سپہ سالار لڑنے یا نہ لڑنے کا فیصلہ کرلیا کرتے تھے۔ جتنی دیر تم سوچنے میں لگا رہی ہو۔'' دانیال نے اسے اس قدر تذبذب میں پڑے دیکھ کر کہا۔

''بی کانفیڈنٹ بینش، تمہیں کسی ایک پر تو اعتماد ہونا چاہیے، مجھ پر یا پھر خود پر۔'' وہ نرمی سے بولا۔

بینش نے اپنا دوپٹا سر پر سلیقے سے جمایا اور گاڑی سے باہر آگئی۔ گھر کے رہائشی حصے کی طرف جاتے ہوئے دانیال کی ممی کا ممکنہ حلیہ اور انداز اسے کنفیوز کررہا تھا اور دوسری طرف اندر جانے پر کیا ہوگا، کبھی کی پڑھی کہانیاں بھی اسے دہلا رہی تھیں، قدم قدم پر اس کا دل مڑ کر واپس بھاگ جانے کو چاہ رہا تھا لیکن آگے جانے کی ہمت اور واپسی کے لیے بھاگ جانے کا ارادہ دونوں ہی باری باری کمزور پڑ رہے تھے۔

''السلام علیکم ممی، شکر ہے آپ گھر پر ہیں، میں ڈر رہا تھا کہیں جا نا نہ ہو آپ کو آج۔'' بے دھیانی میں چلتے ہوئے اس کے کان میں دانیال کی آواز پڑی۔ اس نے چونک کر سامنے دیکھا۔ دانیال ایک وسیع کمرے کے وسط میں کھڑا تھا۔ کمرے کا انٹیریئر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ بینش کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ایک سادگی اور سادگی میں ایسا سلیقہ جس کا گھر کی بیرونی عمارت دیکھ کر تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

''ممی یہ بینش ہے۔'' دانیال نے بینش کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور بینش یہ میری ممی ہیں۔'' اس نے بینش کو مخاطب کیا۔ ''بینش بہت گھبرا رہی تھی ہمارے گھر آتے ہوئے۔ اسے لگا شاید میں اسے دھوکے اور زبردستی اِدھر لے آیا ہوں اور میرے ارادے میں کوئی خرابی ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے اپنی ممی کو بتا رہا تھا۔ ''میں بینش کو اس کے گھر چھوڑنے جارہا تھا۔ مجھے یاد آیا عاصم بھائی کی وہ فائل جو ٹریڈ اینڈ انڈسٹری ڈیپارٹمنٹ میں انکل نے

بنے پردیس کرانی ہے وہ میں صبح ساتھ لے جانا بھول گیا تھا، میں نے سوچا گھر سے وہ فائل پکڑلوں اس لیے اِدھر چلا آیا اور بس بینش کا سارا اعتماد ڈول گیا...... مجھ پر سے بھی اور خود پر سے بھی۔'' ماں سے بات کرتے ہوئے وہ اس کی طرف مڑا۔ ''لڑکی یہاں تمہارے اعتماد کا ٹیسٹ بھی ہوگیا اور تم بھی بری طرح فیل بھی ہوگئیں۔'' اب کے وہ بینش سے مخاطب ہوا۔

''وجوہات اور نتیجے ہی سناتے رہوگے یا اسے بیٹھنے کو بھی کہوگے۔'' صوفے پر بیٹھی خاتون اٹھ کر بینش کی طرف آتے ہوئے بولیں۔

''اوہ ہاں......'' دانیال کو جیسے ان کے یاد دلانے پر یاد آیا۔ ''آپ بٹھائیں اسے، دو چار باتیں کریں، میں اوپر سے فائل لے کر ابھی آیا۔'' وہ اسی کمرے کے کونے میں بنی اوپر جاتی سیڑھیاں تیزی سے چڑھتا اوپر چلا گیا۔

''آؤ بیٹی، میرے پاس بیٹھو۔'' اس کے جانے کے بعد دانیال کی ممی بینش سے مخاطب ہوئیں۔ بینش کی توقع کے بالکل برعکس دانیال کی ممی سادہ سے کاٹن کے سوٹ میں ملبوس تھیں، ان کا دبلا پتلا سراپا اور ان کی سفید رنگت پر ہلکے رنگ کا یہ سوٹ جچ رہا تھا۔ انہوں نے سوٹ سے ہم رنگ سوتی دوپٹا سر پر اوڑھ رکھا تھا، دوپٹے سے نیچے ان کے قدرتی بھورے بالوں میں کہیں کہیں سفیدی اپنی جھلک دکھا رہی تھی، بینش کو اتنے بڑے گھر کی وہ مالکن اپنے ہی ماحول میں رہتی سیدھی سادی خواتین جیسی لگیں۔

''دانیال کا مزاج ایسا ہے کہ وہ شاید ہی کسی ساتھ پڑھنے والی لڑکی کو اپنے ساتھ گھر لے آئے۔'' انہوں نے بینش سے اس کا مکمل تعارف حاصل کرنے کے بعد کہا تھا۔ ''یقیناً اس کے لیے تم میں کوئی ایسا ریزن ہوگا جو تمہیں یہاں تک لے آنے میں اسے کوئی مسئلہ نہیں لگا، تم ریلیکس ہوکر بیٹھو، ایسے ہی جیسے تم اپنے گھر میں بیٹھتی ہو۔'' بینش نے کمرے کی دیواروں پر کہیں کہیں سجی قرآنی آیات پر نظر ڈالی جن میں سے کچھ فریمز میں جڑی تھیں اور کچھ اونی نمدوں پر خوب صورت رنگوں میں ابھری ہوئی تھیں۔ ان آیات اور حروفِ مقطعات کے علاوہ کسی بھی قسم کی سجاوٹ ان دیواروں پر موجود نہیں تھی۔ کمرے کا فرنیچر سادہ اگرچہ بیش قیمت تھا۔ فرش پر نصب ٹائلز درمیان میں سادہ مگر شطرنجی نمونے کا حاشیہ بنارہی تھیں۔ فرش پر کہیں کہیں رکھے رگز اور صوفوں کے درمیان رکھی میزوں کے پائے، دیوار کے ساتھ رکھے چیسٹس (chests) اور کنسولز یقیناً بیش قیمت تھے مگر انہیں دیکھتے ہوئے نہ جانے کیوں بینش پر امارت کی دہشت طاری نہیں ہورہی تھی اور یقیناً اس کی سب سے بڑی وجہ دانیال کی ممی کا وہ رویّہ تھا جس کا مظاہرہ وہ بینش سے باتیں کرتے ہوئے کررہی تھیں۔

''اس گھر میں ہم تین لوگ رہتے ہیں۔'' وہ بتارہی تھیں۔ ''میں، دانیال کے ڈیڈی اور دانیال، میرا بڑا بیٹا عاصم اور اس کے بیوی بچے امریکا میں رہتے ہیں، ایک سال پہلے عاصم ایم ایس کرنے میری لینڈ چلا گیا۔ اسے یونیورسٹی آف میری لینڈ سے اسکالرشپ پر ماسٹرز کرنے کی آفر آئی تھی۔ اس کے اور اس کے بچوں کے چلے جانے کے بعد میں خاصی تنہائی محسوس کرتی ہوں۔ اس کی بیوی شاندانہ یہاں تھی تو گھر میں تقریبات اور مہمانوں کی آمد و رفت کا خوب ہنگامہ رہتا تھا۔ اب میں ہوں اور میری دنیا بہت محدود ہے، تعلقات کم ہیں اور میل آنا جانا اس سے بھی کم، دانیال کے ڈیڈی اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں اور دانیال اپنی دلچسپیوں میں اگرچہ ہم ماں بیٹے کے درمیان بڑی مضبوط ذہنی ہم آہنگی موجود ہے۔ ہم دونوں روز رات کو دن بھر کی مصروفیت کی جزئیات تک ایک دوسرے کو سناتے ہیں مگر پھر بھی یہ اس کا وقت ہے جس میں وہ اکیلا اور مصروف ہے، ہر

وقت میرے پاس تو نہیں بیٹھا رہ سکتا ناں۔"

"تو پھر آپ کی کیا مصروفیات ہوتی ہیں سارا دن؟" بینش نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے اپنے لیے ایک لائبریری سیٹ کر رکھی ہے، اس میں کتابیں بھی ہیں اور سی ڈیز بھی، انٹرنیٹ کے ذریعے تحقیق کی سہولت بھی، میں وہاں مصروف رہتی ہوں دن بھر اور میرا وقت بہت اچھا گزر جاتا ہے۔"

"اوہ اچھا۔" بینش کو اُن کا جواب سن کر حیرت ہوئی۔ اسے قطعی توقع نہیں تھی کہ وہ ایسی کسی مصروفیت میں مصروف رہتی ہوں گی۔

"ہم......" انہوں نے بینش کے لیے منگوائی چائے اور اس کے ساتھ کے لوازمات اسے پیش کرتے ہوئے کہا۔ "ہم مطلب میں اور دانیال آج کل ایک کتاب ترتیب دینے کی کوشش میں مصروف ہیں۔"

"اچھا......" بینش نے کیک کا ایک ٹکڑا اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیسی کتاب......؟"

"ہم کوشش کر رہے ہیں کہ دنیا بھر میں جہاں بھی کسی ایسے شخص سے رابطہ ممکن ہو، ضرور رابطہ کریں جو کسی حادثے یا کسی بھی وجہ سے موت کے منہ سے بچ کر نکلا ہو اور اس کے اس معجزے کے بارے میں تاثرات قلمبند کریں۔ آج کل ہم اسی کوشش میں مصروف ہیں۔"

"اچھا۔" بینش کو تجسس محسوس ہوا۔ "ایسی کتاب کیوں ترتیب دینا چاہتی ہیں آپ؟"

"اس لیے کہ دیکھیں جو ہم نے محسوس کیا، کیا وہ ہی سب اُن لوگوں نے بھی محسوس کیا جو اس سرحد سے لوٹ آتے ہوں۔" بینش کو اُن کی بات بہت عجیب لگی۔ وہ ان سے انہی کی بات کی وضاحت کرانا چاہتی تھی مگر اسی وقت دانیال کی آمد ہوئی۔

"سوری بینش مجھے فائل ڈھونڈنے میں تھوڑا وقت لگ گیا پھر کچھ تفصیلات لینے کے لیے بھائی کو کال بھی کرنا پڑی، مجھے امید ہے تمہیں مجھ پر غصہ نہیں آیا ہوگا۔" اس نے نیچے آتے ہی بلند آواز میں کہا۔

"نہیں۔" بینش نے اس کی تسلی کے لیے سر ہلایا اور اس کی ممی کی طرف دیکھا، وہ ان سے ان کی بات کا تفصیل لینا چاہ رہی تھی لیکن دانیال آ کر ان کے قریب بیٹھ گیا اور اس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"اچھا......اب بتاؤ بھلا صبح سے تم مجھے کیا دکھانا چاہ رہی تھیں؟"

"وہ......" بینش کو اچانک مقامی اخبار کا وہ صفحہ یاد آ گیا اور وہ ایک بار پھر جھجک گئی۔ دانیال کی ممی جیسی خاتون کے سامنے ایک فضول سی خبر والا وہ صفحہ وہ کیسے دکھا پائے گی۔

"بتاؤ بھی یار، صبح سے تجسس میں ہوں میں۔" دانیال نے اپنی بات پر اصرار کیا۔

"وہ دراصل......" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

"وہ..." اس نے کن انکھیوں سے دانیال کی ممی کو دیکھا۔ "پھر کبھی دکھاؤں گی۔"

"اوہ کم آن یار۔" دانیال نے اس کی جھجک کو بھانپتے ہوئے کہا۔ "جو بھی ہے دکھا دو، میری ممی بہت فرینڈلی ہیں.. وہ بھی ہمارے ساتھ انجوائے کریں گی......" اس نے اپنی ممی کے گلے میں پیچھے سے بازو ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں، بیٹا...... میں بھی انجوائے کر لوں گی، دکھاؤ تو کیا چیز ہے۔" اس کی ممی نے مسکرا کر کہا۔

"وہ آپ نے ایک روز ایک سیاست داں کی بات کی تھی کہ اس کا افیئر۔" بینش کو دانیال کی ممی کے سامنے یہ

بات دُہراتے ہوئے بھی شرم آ رہی تھی۔

"اوہ ہاں......" شکر ہوا کہ دانیال کو فوری طور پر اپنی بات یاد آ گئی۔

"تو کیا اس کی محبوبہ کہیں دیکھ لی تم نے؟"

"جی، ایک اخبار میں تصویر شائع ہوئی ہے اس کی، میں نے سوچا آپ کو دکھاؤں آپ ایکسائٹڈ ہو رہے تھے اس کا ذکر کرتے ہوئے۔" بینش کو یہ بات کہنے میں بھی مشکل پیش آ رہی تھی۔

"ہاں دکھاؤ، دکھاؤ پلیز......" دانیال کے لیے اگر یہ بات کھودا پہاڑ نکلا چوہا والی بھی ثابت ہوئی تھی تو شاید اس نے بینش کے خیال سے تجسس کا اظہار کیا تھا۔

"وہ......" بینش نے اپنے بیگ سے اخبار کا صفحہ نکالا اور دانیال کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ دانیال نے اس صفحے کی تہیں کھول کر اسے سیدھا کیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے چہرے پر ایسی ہی مسکراہٹ تھی جیسے کسی بچے کے اپنا کارنامہ سنانے کے دوران کسی بڑے کے چہرے پر ہوتی ہے۔

"اچھا تو کون سی ہیں، وہ محترمہ......؟" دانیال نے اپنی ٹھوڑی پر انگلیاں پھیرتے ہوئے اس صفحے پر نظریں دوڑائیں، اخبار کا وہ صفحہ تھیٹر اور سینما کی ہیروئنز اور ایکٹریسز کی تصویروں سے بھرا پڑا تھا۔

"یہ والی۔" بینش نے ذرا سا آگے کھسک کر ایک تصویر پر انگلی رکھی۔

"اوہ......" دانیال نے صفحہ اٹھایا اور پڑھنے لگا، پڑھ لینے کے بعد اس نے وہ صفحہ اپنی ممی کو پکڑا دیا اور اس خبر پر انگلی رکھ کر انہیں اس کے بارے میں بتانے لگا۔

"اوہ میرے خدا......!" لڑکی کی اس تصویر پر نظر پڑتے ہی دانیال کی ممی کے منہ سے بلند الفاظ میں آواز نکلی۔ دانیال اور بینش نے بیک وقت چونک کر اُن کی طرف دیکھا۔ ان کے ہاتھ جن میں اخبار کا صفحہ پکڑا تھا واضح طور پر لرزتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

☆☆☆

پاکستان میں موسم ابر آلود تھا اور فضا میں کچھ دیر پہلے برس کر رکنے والی بارش کا اثر تھا۔ ہوا خوشگوار اور عمارتیں اور راستے بھیگے ہوئے تھے۔

"اس فضا میں اور اس ماحول میں کتنی مانوسیت ہے، یہ ہی بارش جب اُس شہر یا اس ملک کے کسی بھی شہر میں برستی ہے تو اُس مشینی زندگی کے عادی لوگ اسے بھی زندگی کا معمول سمجھ کر اس کے برسنے کے دوران بھی اپنے کاموں میں مگن رہتے ہیں۔" اس نے ائرپورٹ کی عمارت سے باہر نکل کر ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے سوچا جبکہ یہاں..." ائرپورٹ سے باہر جاتی سڑک کے گرداگرد دینی چھوٹی بڑی دکانوں، فلنگ اسٹیشنز اور فٹ پاتھوں کے ساتھ بنے لوکل ٹرانسپورٹ کے مسافروں کے شیڈز کے نیچے کھڑے لوگوں کے چہروں پر بارش دیکھنے کے بعد چھا جانے والی تازگی اور خوشگواری دیکھ کر اسے رشک آنے لگا۔ ذیلی سڑکوں کے ساتھ بنے راستوں میں استعمال ہونے والے ناقص میٹریل کے باعث ایک دو بارشوں کے بعد ہی چھوٹے بڑے گڑھے بن چکے تھے، ان گڑھوں میں بارش کے جمع ہو جانے والے پانی میں بچے چھلانگیں لگا رہے تھے اور ایک دوسرے پر چھینٹے اڑا رہے تھے، ناقص سیوریج سسٹم کے باعث نکاس نہ ہونے کے سبب اکثر راستوں پر پانی کھڑا ہو چکا تھا اور ہر گزرنے والی گاڑی کے پہیے پیدل چلنے والوں پر پانی کے چھینٹے اڑاتے تھے۔ پیدل چلنے والے خود کو اُن چھینٹوں سے بچاتے، رک کر گزرنے والی گاڑیوں کے ڈرائیوروں کو دو چار گالیاں سناتے اور پھر اپنی چھتریاں

بغل میں دبائے اپنے راستوں پر چلتے آگے بڑھ جاتے۔

’’کبھی کبھی کسی قانون قاعدے کا پابند نہ ہونا اور ہر چھوٹی بڑی غلطی پر پکڑے نہ جانے کا احساس بھی کتنا جاندار لگتا ہے۔‘‘ اس نے سوچا اور اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں دوبارہ سے گزرتے راستوں پر گاڑ دیں۔ ’’زندگی میں حظ اٹھانے کو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی کچھ تو موجود ہوتا ہے۔‘‘

اس وقت اس کا ذہن بالکل خالی تھا اور وہ نظر کی حد میں آنے والی ہر چیز کے بارے میں بلاوجہ سوچے چلی جارہی تھی۔ اسے کہاں جانا اور کہاں رہنا تھا وہ اس کا بھی فیصلہ نہیں کر پائی تھی۔ نادر اسے ائرپورٹ پر لینے کے لیے موجود نہیں تھا۔ ائرپورٹ سے اسے فون کرنے کے جواب میں اس کا نمبر بھی بند ملا تھا۔ وہیں ائرپورٹ پر ہی کہیں بیٹھ کر اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کو طے کرنے کے بجائے وہ اسی خالی ذہن کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گئی تھی۔ اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو کیا بتایا تھا کہ اسے کہاں جانا تھا۔ اس وقت اسے یہ بھی یاد نہیں آرہا تھا وہ گزرتے راستوں پر نظریں جمائے اس ملک کے شہریوں کے مانوس چہروں اور ان کی مانوس حرکتوں کو دیکھ اور دل میں ان پر تبصرہ ہی کیے چلی جارہی تھی۔

اجنبی چہرے اور خدوخال والی زوئی حسین، اس مانوس ملک کے مانوس ماحول میں اپنی ہر ممکن کوشش کر لینے کے باوجود بھی تنہا تھی۔ نادر کی بے نیازی نے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں پانی بھر دیا تھا جو دوبارہ سے برسنے کو تیار بادلوں کے ساتھ ہی بہنے کو تیار معلوم ہوتا تھا۔

☆☆☆

’’بعض اوقات ذہن میں زندگی اور اس کی نیرنگیوں کے بارے میں ایسے سوالات آجاتے ہیں جن کا جواب کہیں سے نہیں مل پاتا۔ ان سوالات کے جواب صرف اور صرف زندگی خود ہی دے سکتی ہے، زندگی جوں جوں آگے بڑھتی جاتی ہے ایسے سوالوں کے جواب پیچھے چھوڑتی جاتی ہے اور کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ کچھ سوالوں کے جواب اس وقت جاکر ملتے ہیں جب نہ صرف امتحانی پرچہ دیا جاچکا ہوتا ہے بلکہ اس کا نتیجہ بھی سامنے آچکا ہوتا ہے..... جیسے کہ میری زندگی کے یہ دن، ہفتے اور سال۔‘‘ حمزہ نے بیڈ پر سیدھے لیٹے لیٹے چھت کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

’’ذہن میں اَن گنت سوال ہیں، وقت بہت سے سوال پوچھتا ہے مگر مجال ہے کسی سوال کی کوئی کی (Key) ہاتھ لگ جائے۔‘‘ اس کا سر بھاری ہورہا تھا اور آنکھوں میں ایسی جلن تھی جیسے کئی راتوں سے نہ سونے کے باعث ہونے لگتی ہے۔ ’’شاید نگین ٹھیک کہتی ہے، میں دانستہ ان سوالوں سے نظریں چراتا ہوں جو میرے دل ودماغ میں اٹھتے ہیں۔‘‘ اس نے کروٹ بدلی۔

’’میں کیا اور کیوں کررہا ہوں، تلاش لاحاصل اور اگر یہ تلاش حاصل بھی ہوگئی تو کیا میں جانتا ہوں کہ اس سے آگے کیا ہوگا۔ میں ماضی پرستی کی جس کیفیت میں ہر وقت مبتلا رہتا ہوں کیا اس نے مجھے بالکل تنہا نہیں کردیا، ماں، باپ، بہن بھائیوں کے ہوتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرا کوئی نہیں ہے، میں نے خود کو اُن سے اور اُن کو خود سے محروم کررکھا ہے۔‘‘ وہ مسلسل سوچے جارہا تھا۔

’’کیا مجھے خود کو بدل ڈالنے کی سعی نہیں کرنی چاہیے، بجائے کسی سراب کے پیچھے دوڑنے کے جو موجود ہے اسے اپنی گرفت میں لینے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے؟‘‘ اب کے اس نے خود کلامی کی۔

’’ہاں، شاید مجھے سب کچھ بدل ڈالنا چاہیے مگر اس احساس کا کیا کروں جو بڑی اماں کی یاد دل میں ہر دم

جگائے رکھتا ہے اور اس سے دھیان کہیں اور بٹانے کی کوشش پر اُن کی سوال کرتی نظریں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں، اُن کی نظریں سوال کرتی ہیں، میں نے تمہیں ان خطوط پر تو نہیں اٹھایا جن میں تم نے خود کو ڈھال لیا ہے..... سچ ہے شاید میں کبھی یہ فیصلہ نہ کر پاؤں کہ مجھے ماماز بوائے بننا ہے یا گڈ اولڈ گرینیز سن.....؟ خدا کبھی کسی کو ان دو انتہاؤں میں نہ پھنسائے، انسان نہ خود میں رہتا ہے نہ خود سے باہر نکل پاتا ہے۔‘‘ اس کی آنکھوں کے پپوٹے بھاری ہونے لگے اور انہوں نے کھلی آنکھوں کا بوجھ اٹھانے سے انکار کردیا، اس نے اس انکار کے جواب میں آنکھیں بند کرلیں۔

’’دیکھو بیٹا..... تمہاری لگن اور تلاش نے میری روح کو سکون کی کیفیت میں ڈال دیا تھا۔ شاید کبھی تمہاری تلاش اسے پالے اور میری روح وقتی کیفیت سے دائمی کیفیت میں چلی جائے، میری درخواست ہے تلاش جاری رکھنا، اس کا سلسلہ نہ روکنا، یہ ایک زندگی اور زندگی کی حرمت کا سوال ہے۔‘‘ آنکھیں بند ہونے پر کبھی کا دیکھا اور مانوس چہرہ اس کے سامنے آیا۔ اس نے کبھی اس چہرے کا تصور نہیں کیا تھا مگر وہ اس چہرے کو پہچانتا تھا اور ان لفظوں کے ایک، ایک حرف کو سمجھ سکتا تھا۔

’’گویا طے ہوا کہ زندگی کو اسی رنگ پر چلنا ہے اور دل ودماغ میں اٹھتے سوالوں کے جواب آگے بڑھتی ہوئی زندگی نے ہی دینے ہیں۔‘‘ اس نے سوچنے کا سلسلہ موقوف کرتے ہوئے ایک بار پھر کروٹ بدلی۔

’’میں تلاش سے نہیں ہاروں گا آپ بے فکر ہوجائیں۔‘‘ اس نے اس چہرے کو مخاطب کیا اور اپنے دماغ کو بھی نیند کی کیفیت میں اترنے دیا۔

☆☆☆

قومی اسمبلی کے ایک حلقے اور اس حلقے کے دیہی اور شہری حصوں کے ووٹرز کی کل تعداد، ووٹنگ میں حصہ لینے والوں کی متوقع تعداد اور ووٹوں کا تناسب یشل کے لیے ڈیٹا اکٹھا کرنا ایک کارِ دارد ثابت ہورہا تھا۔ الیکشن کے متوقع نتائج کے حساب کتاب میں صبح سے شام تک اسٹاک مارکیٹ کے بھاؤ کی طرح کئی بار اتار چڑھاؤ آتا اور نئے سرے سے صورتِ حال کا جائزہ لینے کی ضرورت درپیش ہوجاتی....... یہ الیکشن اس کی زندگی کا سب سے انوکھا تجربہ ثابت ہورہا تھا۔ وہ سردار مہرزاد خان کی میڈیا ٹیم کی سربراہ کے طور پر کام کررہی تھی۔ مہرزاد، ان دنوں اپنے حلقے کے لوگوں سے جلسوں، کارنر میٹنگز اور انفرادی ملاقاتوں میں مصروف تھا۔ ان مصروفیات کے دوران اس کی گفتگو کا مکمل ڈرافٹ اسلام آباد سے تیار ہوکر جاتا تھا۔ مہرزاد خان کی گفتگو کی الف ب تک کو کلیئرنس دینا میڈیا ٹیم کا کام تھا۔ اسلام آباد میں بیٹھے اسٹیک ہولڈرز کے جنبشِ ابرو تک پر بھی نظر رکھنے کے لیے ان سب کو چوبیس گھنٹے حاضر دماغی کی حالت میں رہنا تھا۔ اسٹیک ہولڈرز مہرزاد خان کی شخصیت کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے۔ وہ اس سے جی حضوری کی کیا اور کتنی توقع رکھتے تھے، آئندہ آنے والے سالوں کے سیاسی منظرنامے پر وہ اسے کہاں جگہ دے سکتے تھے، اس کا انحصار بھی ان سمجھوتوں پر ہی تھا جو مہرزاد خان ایک سیاسی مہرے کے طور پر اپنی بقا کے لیے اُن سے کرنے والا تھا۔ یشل نے اب تک جتنا کام براہِ راست مہرزاد کی موجودگی میں کیا تھا۔ اس سے اسے مہرزاد کی شخصیت کے بہت سے ایسے پہلوؤں تک رسائی حاصل کرنے کا موقع ملا تھا جو اب تک باقی لوگوں سے مخفی تھے۔ یشل کی ذہانت، قابلیت اور سب سے بڑھ کر شخصیت بینی کی صلاحیت نے بہت جلد اسے یہ اندازہ کرادیا تھا کہ مہرزاد اپنی چالیں اتنی خاموشی سے چلنے کا عادی تھا کہ اس کے ساتھ بساط پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو پتا بھی نہیں چلتا تھا اور چال چل چکی ہوتی تھی۔ میڈیا ٹیم کی مدد تو ایک طرف، وہ

اپنی گفتگو میں الفاظ کا استعمال اتنی احتیاط سے کرتا تھا کہ بعض اوقات وہ اس کی بات سن کر حیران رہ جاتی۔ اردو اور انگریزی زبانوں میں الفاظ کے مترادف اور متضاد لفظوں پر مکمل گرفت حاصل تھی اور مہرزاد کی گفتگو کر ہی اسے اندازہ ہوا تھا کہ الفاظ کے ذخیرے پر عبور حاصل ہونا گفتگو میں کیسا سلیقہ پیدا کر سکتا ہے۔ کبھی اسے ایسا لگتا کہ اپنے باپ کی غیر متوقع موت کے بعد اچانک واپسی پر مجبور ہوتے ہی وہ اپنی آئندہ زندگی لائحہ عمل اتنی کامیابی سے تیار کر چکا تھا کہ اسے پیش آنے والا کوئی بھی واقعہ آؤٹ آف پلان نظر نہیں آتا تھا۔

''لیکن زرنگار سے ٹکراؤ......؟'' مہرزاد کی شخصیت پر غور کرتے کرتے اسے یاد آتا۔ ''یقیناً پہلے سے گئے پلان کا حصہ نہیں تھا۔ جب ہی تو اس چال پر مہرزاد خان کا گھوڑا ذرا سا لڑکھڑایا تھا مگر کتنے کم وقت میں نے اسے سنبھال بھی لیا اور ڈبل چال چلاتا آگے بڑھا دیا۔'' سچ تھا کہ یشل رئیس، سردار مہرزاد خان کی شخصیت کے سحر میں گرفتار ہونے سے خود کو بچا نہیں پا رہی تھی۔ مہرزاد کی شکل میں اسے اس کے علاقے کے روایتی پیچیدہ شخصیت سرداروں کے بجائے نئی روایتوں کا انوکھا علم بردار نظر آتا تھا۔ جو سر جھکانے کے بجائے کٹا دینے کا قائل تھا، اس ملک کے گنجلک سیاسی میدان میں وہ کہاں تک اور کب تک اپنی بقا قائم رکھ سکتا تھا اس کا انحصار الیکشن جیتنے کے بعد اس کی آنے والی منصوبہ بندی پر تھا۔

''وہ کہتا تو ہے کہ اگر روایتوں کی عفریت سے لڑ نہ پایا تو میدان چھوڑ جائے گا لیکن شاید ابھی اسے اندازہ نہیں کہ میدان کے اندر لگنے والے تماشوں کے تماشا گروں کے ہاتھ آکٹوپس کے مانند ہوتے ہیں جو خود جس کو ایک بار جکڑ لیں وہ اُن سے نجات حاصل نہیں کر پاتا، دم گھٹنے سے مر جائے تو وہ الگ بات ہے۔'' ملک کے ایک سینئر اور معتبر سیاسی تجزیہ نگار نے ایک بار یشل سے کہا تھا۔

''کیا وہ اتنا بے خبر ہے کہ اسے خود جکڑے جانے کا علم نہیں ہو پائے گا؟'' یشل نے سوال کیا تھا۔

''میں اس کی ذہانت اور فطانت دونوں کا ہی قائل ہوں، وہ چوکنا اور ہوشیار بھی ہے لیکن تم جانو وہ بھی ذہین، فطین اور ہوشیار کیوں نہ ہو وہ ایک ہے اور نظام ایک کل ہے، یہ نظام اس کے پرداداکے بھی پردادا کی عمر جتنا ہے اور وہ اس کے سامنے کل کا بچہ ہے، اس نظام کے پیچ وخم کو اگر وہ پڑھنے بھی بیٹھے تو ایک نہیں کئی عمریں درکار ہوں گی پھر بھی شاید پوری طرح سمجھ نہ پائے لہٰذا جس سوچ کو وہ ترویج دینا چاہ رہا ہے میں اس کے بارے میں زیادہ پُرامید نہیں ہوں۔'' سیاسی تجزیہ نگار نے اپنا سر ماہرانہ انداز میں ہلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''وہ جتنا دکھائی اور پکڑائی دیتا ہے اس کی ایک خاص حد ہے، اس حد سے آگے وہ اپنی شخصیت کے دروازے سب پر بند کر لیتا ہے اور ان بند دروازوں کے پیچھے کیا کھچڑی پکاتا ہے اس کے لوازمات سے کوئی واقف نہیں۔'' یشل نے ماہرانہ رائے کے جواب میں اپنی عاجزانہ رائے پیش کی تھی، اگرچہ سیاسی تجزیہ نگار صاحب نے اس کی عاجزانہ رائے سے بالکل ہی اتفاق نہیں کیا تھا۔

''وہ اپنے علاقے میں ہے اور وہاں گویا وہ محاذِ جنگ پر اپنی عسکری چالیں چل رہا ہے، ایسے میں اس کو ژاں سے تو اس کا نہ تو کوئی رابطہ ہوگا نہ تعلق، اس حسین ساحرہ کو بھی شاید اندازہ ہو گیا کہ سرداری نظام سے منسلک ایک ابھرتے ہوئے نوجوان سیاست داں کی داشتہ بننا کچھ اتنا آسان تجربہ نہیں۔'' مہرزاد خان کی مخالف لابی سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان مبصر نے دو دن پہلے انتہائی تمسخرانہ انداز میں اس کے بارے میں بات کی تھی۔

''یہ ہی تو......'' یشل نے دل میں سوچا۔ ''یہ ہی تو میں کہتی ہوں بند دروازوں کے پیچھے پکنے والی کھچڑی

کے لوازمات کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کیونکہ میری ذاتی معلومات کے مطابق گزشتہ رات دو بجے کے قریب مہرزاد، زرنگار سے ملنے کسی خفیہ مقام پر پہنچا تھا۔ یقیناً زرنگار اس کے لیے ایک ایسی کمٹ منٹ ہے جسے نبھانا اس کی ترجیحات کی لسٹ میں کم از کم پہلی دس ترجیحات میں تو شامل ہوگا ہی اور زرنگار...... اس کے لیے یہ تجربہ آسان نہیں آسان ترین ثابت ہوا ہوگا کیونکہ اس نے اس شخص کو اپنے سامنے چاروں شانے چت گرا رکھا ہے جو زندگی کے ہر میدان میں سر جھکانے کے بجائے کٹا دینے کے فلسفے پر یقین رکھتا ہے۔'' مہرزاد کے بارے میں اپنے نوٹس کی فائل کو محفوظ کرنے کے بعد اس پر کوڈ لگاتے ہوئے ایشل نے سوچا اور پھر اٹھ کر اپنی وارڈ روب کھول کر اس لباس کا انتخاب کرنے لگی جو ایلکشن سے ایک رات قبل اپنی پریس رپورٹ میں اسے پہننا تھا۔

☆☆☆

وہ معجزاتی رفتار کے ساتھ روبہ صحت ہو رہا تھا۔ عافیہ کو بعض اوقات اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا...... کئی مہینے سے زندہ لاش کی طرح اسپتال کے بیڈ پر پڑا وجود پہلی بار ایک آنکھ کھولنے کے بعد ہر گزرتے دن کے ساتھ اپنے جسم کے اعضا کی جنبش بڑھا رہا تھا۔ اس کے پاؤں کا انگوٹھا متحرک ہوا، اس کے ہاتھوں کی انگلیاں کبھی کبھی ہلتی نظر آئیں اور یہ تو اکثر نظر آنے لگا کہ قدرے بلند آواز کانوں میں پڑنے پر وہ آنکھیں کھول کر کبھی چھت کی طرف اور کبھی گردن کو ہلکا سا موڑ کر دائیں جانب دیکھتا رہا۔ عافیہ گھنٹوں اس کے بیڈ کے قریب کرسی رکھے اس کی ایک ذرا سی جنبش دیکھنے کی منتظر مسلسل اس پر نظریں جمائے رکھتیں۔

''آپ تھک جاتی ہیں اور کمزور ہو رہی ہیں، آپ درمیان میں یہاں سے اٹھا کریں کبھی اِدھر اُدھر چکر لگا کر اپنی ٹانگیں سیدھی کر لیا کریں، کبھی صوفے پر ہی سہی کچھ دیر لیٹ کر کمر ٹکا لیا کریں۔'' دانیال کو دیکھنے کے لیے آنے والے ڈاکٹرز، عزیز، رشتے دار اُن کے اپنے شوہر اور بیٹے ان سے کہتے لیکن وہ اپنے معمول سے باز نہیں آئیں۔

''میں معجزے کو رونما ہوتے دیکھنا چاہتی ہوں، اس کے ایک ایک پل کا مشاہدہ کرنا چاہتی ہوں، میں اپنے اللہ پر اپنا ایمان مضبوط، مضبوط تر اور مضبوط ترین کر لینا چاہتی ہوں، دانیال کے پاس میرا یوں بیٹھنا اور اس کی ہر جنبش کا مشاہدہ کرنا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، میں اس کی پروگریس دیکھتی ہوں تو میرا اپنے اللہ پر ایمان پہلے سے زیادہ مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے۔'' وہ سب کو جواب میں ایک ہی بات کہتیں۔

''آپ کی آنکھیں تھک جاتی ہوں گی، مسز جہانگیر۔'' دانیال کے انسٹرکٹر قیوم کے لیے اُن کا یہ جنون باعثِ حیرت تھا، وہ تقریباً ہر دوسرے روز دانیال کو دیکھنے آتا تھا اور وہ بھی دانیال کی بہتر ہوتی حالت کا گواہ تھا مگر اسے بہتری کی یہ رفتار سست رفتار لگتی تھی۔ اس بہتری کی رفتار جو بھی تھی اس نے ایک امید بہرحال پیدا کر دی تھی کہ وہ زیادہ نہیں تو ایک نہ ایک دن خود سے یا کسی ہلکے سہارے سے اٹھنے بیٹھنے، بات سن لینے اور شاید جواب دینے کے قابل ہو جائے۔

''یہ توقع اور امید بہت زیادہ ہے۔'' دانیال کے ڈاکٹرز عافیہ کی غیر موجودگی میں کبھی اسے بتاتے۔ ''دانیال کے موت کے منہ میں جانے سے بچ جانے کے چانسز مضبوط ہیں اس کی حسیات بھی کسی حد تک کام کرنے لگیں گی لیکن خود سے اٹھنا بیٹھنا، بولنا، جواب دینا، نارمل رسپانسز، چلنا پھرنا بہت ریموٹ چانس ہے۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے کہتے۔ ''ہم دانیال کی مدر کے یقین اور ایمان کی وجہ سے کھل کر یہ بات نہیں کرتے، ایک نیم زندہ انسان سے زیادہ مکمل زندہ انسان کے احساسات کا خیال رکھنا ہم سب کا اولین فرض ہے، ابھی وہ ذرا ذرا

سی جنبش سے پُر امید ہوئی ہیں جب اس سے زیادہ پروگریس نظر نہ آئی تو انہیں خود ہی سمجھ آنے لگے گی، ہم اپنی زبان سے کچھ کہہ کر انہیں مایوسی کی تکلیف کیوں دیں۔''

''آپ کی آنکھیں تھک جاتی ہوں گی مسز جہانگیر، آپ درمیان میں تھوڑا آرام کر لیا کریں۔'' قیوم ان سب آرا کے تناظر میں کبھی کبھی عافیہ سے کہتا۔

''آپ نے دانیال کا جنون دیکھ رکھا ہے ناں قیوم......؟'' ایک دن جواب میں انہوں نے قیوم سے سوال کیا۔ ''اس کی ہمت، عزم اور شوق میں آپ نے کبھی کوئی کمی دیکھی تھی؟''

''نہیں......'' قیوم نے سر ہلایا...... ''میرے بہت سمجھانے کے باوجود بھی نہیں۔''

''بس تو پھر میں اسی دانیال کی ہی ماں ہوں۔'' وہ سر ہلا کر بولیں...... ''میں شوق، ہمت اور عزم کیسے ہار سکتی ہوں، مجھے ہر پل اس معجزے کا انتظار رہتا ہے جب یہ دوبارہ سے مجھے پکارے گا جب یہ مجھے خود بتائے گا کہ اسے کیسا محسوس ہو رہا ہے۔''

''آپ میں اور دانیال میں یہ فرق ہے مسز جہانگیر کہ جب وہ کسی طریقے سے بھی اپنے جنون سے پیچھے ہٹ جانے سے باز آتا نظر نہیں آتا تو پھر میں اسے خدا کا حوالہ دیتا کہ ایسا جنون اسے ناپسند ہے، اس پر وہ قطعی بے نیازی سے کہتا مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ جب کسی طریقے سے بات نہیں بنتی تو درمیان میں اللہ کو لے آتے ہیں، مذہب کے تذکرے چھیڑ دیتے ہیں۔'' قیوم نے کہتے ہی اُن کی طرف دیکھا اُن کے چہرے پر یہ بات سن کر اضطراب اتر آیا تھا۔

''جبکہ آپ کا معاملہ مختلف ہے۔'' اس نے کہا۔ ''آپ کا جنون، شوق، عزم اور ولولہ، خدا پر ایمان سے ہی شروع ہوا ہے اور اسی پر اب تک قائم ہے۔''

''دانیال جو ایسے کہتا تھا اس میں میرا ہی قصور تھا۔'' عافیہ نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا تھا۔ ''دانیال کے حادثے سے پہلے اللہ میرے لیے شاید صرف ایک اسم تھا۔ ایک بڑی طاقت کا نام، مسلمان باپ کی اولاد کی حیثیت میں اللہ اور اس کی کتاب سے میرا تعارف بھی اتنا ہی تھا جتنا ایک مذہبی فریضہ سمجھتے ہوئے لوگ اپنی اولاد کا کراتے ہیں، اللہ کو جاننا اور پہچاننا تو دور کی بات میں بھی کئی کئی دن زندگی کی مصروفیات میں کھو کر اسے دن کے کسی حصے میں یاد کرنا بھی بھول جاتی تھی۔ غفلت کا پردہ اتنا دبیز اور دلکش تھا کہ اسے توڑنے یا ہٹانے کا کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا۔ جب ہی تو میں نے اپنے دونوں بچوں کی تربیت میں اس پہلو پر اتنی توجہ ہی نہیں دی کہ انہیں اندازہ ہوتا۔ اللہ کے بارے میں یوں بے نیازانہ گفتگو کرتے ہوئے وہ ایک سپریم طاقت کو چیلنج کر رہے ہیں اور آپ نے دیکھا اس کی ذات کو چیلنج کرنے کا کیا نتیجہ نکلا......؟'' انہوں نے قیوم کی طرف دیکھا۔ ''صرف دانیال ہی نہیں میں، جہانگیر، عاصم ہم سب جیسے زندہ لاشیں بن کر رہ گئے ہیں۔ چلتی پھرتی زومبیز۔'' ان کے لہجے میں دکھ تھا اور شاید پچھتاوا بھی۔

''آپ دعا کیجیے قیوم، دانیال ایک بار زندگی کی طرف لوٹ آئے۔'' پھر انہوں نے اپنی نم آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

''جب ایسا ہو جائے گا، میں اپنی فیملی کو زندگی کے تمام سبق دوبارہ سے پڑھنے کو کہوں گی، ایسے سبق جو اس عظیم طاقت کو پہچاننے، سمجھنے اور اس کے راستے پر چلتے ہوئے اس تک رسائی حاصل کرنے پر مبنی ہوں۔ ہم زندگی کو ڈھنگ سے گزارنے اور ہر دم اس کی ذات کو یاد رکھنے کا قرینہ سیکھیں گے۔''

"بے شک یہ بہت بڑی بلیسنگ ہوگی۔" قیوم نے کہا۔ "شاید کچھ حادثے انسانوں کی زندگی کی جہت بدل ڈالنے کے لیے ہی ظہور پزیر ہوتے ہیں۔"

"یہ جو دانیال کی اب کنڈیشن ہے ناں۔" عافیہ نے کہا۔ "یا جو حادثے کے فوراً بعد تھی اس سے لے کر اس کی زندگی کے سفر میں دوبارہ شامل ہونے تک کا عرصہ ہمارے لیے مہلت کے طور پر عطا ہوا ہے، ہم اب بھی نہ سمجھیں تو پھر ہماری بدقسمتی ہوگی۔" قیوم نے اُن کی بات سن کر تائید میں سر ہلایا۔

"ورنہ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ حادثے میں دانیال کی جائے حادثہ پر ہی جان چلی جاتی یا پھر معجزاتی طور پر اسے خراش تک نہ آتی۔" عافیہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ان دونوں انتہاؤں کی درمیانی صورت، یہ۔" انہوں نے بیڈ پر پڑے دانیال کی طرف اشارہ کیا۔ "جو دانیال کی اب ہے، یہ صرف اور صرف ایک الارم ہے، وارننگ ہے، آزمائش ہے، امتحان ہے یا تو مجھے پالو یا ہمیشہ کے لیے کھودو...... یہ اللہ کا پیغام ہے اور ہم اب بھی اس پیغام کو نہ بن پائیں تو ہم سا بدقسمت کون ہوگا؟" قیوم نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا۔ عافیہ کی یہ گفتگو اسے کچھ اور ہی قصہ سنا رہی تھی۔ اسے حادثے کے فوراً بعد والی عافیہ جہانگیر یاد آئیں جو اسی اسپتال کی انٹرنس پر اپنے شوہر کے ساتھ لگ کر رو رہی تھیں۔ ان عافیہ جہانگیر اور ان خاتون جو اب اس کے سامنے بیٹھی تھیں کا حلیہ یکسر مختلف تھا۔ ایک الٹرا ماڈرن خاتون سے لے کر عجز و انکساری سے بھرپور ایک ایسی شخصیت جنہیں دیکھ کر سوائے تقدس و احترام کے کوئی دوسرا خیال ذہن میں نہیں آسکتا تھا تک کا سفر عافیہ نے دانیال کے حادثے سے لے کر اب تک یعنی صرف چھ ماہ کے اندر طے کیا تھا۔ ان کے خیالات اور اندازِ گفتگو دونوں یکسر بدل چکے تھے۔ قیوم اس کیفیت کی معجزاتی تبدیلی پر یقیناً حیرت زدہ تھا مگر دل ہی دل میں وہ اس معجزے کو بھی مان رہا تھا جو یقیناً عافیہ کی شخصیت کی تبدیلی کے طور پر ظہور پزیر ہوا تھا۔

"بس کچھ عرصے کی آزمائش اور ہے پھر......" عافیہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "تب تک جب تک ہماری ذاتوں اور شخصیتوں کی کجیاں اور کمیاں مکمل طور پر ختم نہیں ہوجاتیں...... پھر دیکھیے گا دانیال کیسے ٹھیک ہوتا ہے، یوں جیسے اس کے ساتھ کبھی کوئی حادثہ ہوا ہی نہیں تھا۔" ان کے لہجے میں یقین تھا، اتنا یقین جتنا شاید انہیں خود اپنے ہونے پر بھی نہ تھا۔

"یقیناً......" قیوم نے متاثر ہوتے ہوئے سوچا۔ "جو ہم چاہتے ہیں اس کے حصول کے لیے اللہ پر مضبوط یقین ہونا سب سے ضروری ہے، غیر متزلزل یقین......"

اور پھر قیوم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، اگلے آٹھ ماہ کے دوران وہ معجزہ ظہور پزیر ہوا جس سے دانیال کے ڈاکٹرز دبے لفظوں میں مایوسی ظاہر کرتے تھے، دانیال کے جسم کے ہر عضو نے باری باری بعض اوقات دنوں اور بعض اوقات ہفتوں کے وقفے کے بعد حرکت کرنا شروع کی پھر اس کی آنکھوں نے شناسائی کی جھلک دکھانا شروع کی، آہستہ آہستہ وہ جسم کے کچھ حصوں کو اٹھانے موڑنے اور واپس رکھنے میں کامیاب ہوا۔ رفتہ رفتہ وہ اٹھنے بیٹھنے اور بغیر سہارے کے لیٹنے کے قابل ہوا، اس کے حلق سے آواز نکلنے لگی اور وہ منہ کے ذریعے نرم خوراک لینے لگا۔ قیوم انگشت بدنداں یہ سب ہوتے دیکھ رہا تھا۔ عافیہ جہانگیر، ان کے شوہر اور بڑا بیٹا وقتاً فوقتاً آزمائش، وقفۂ انتظار میں تھے۔ بلاشبہ یہ ایک طویل اور صبر آزما انتظار تھا لیکن معجزے یونہی تو رونما نہیں ہوجاتے، عافیہ کا صبر اور حوصلہ دیدنی تھا۔ انہوں نے دانیال کو واپس زندگی تک لانے کے دوران تئیس چوبیس سالہ جوان نہیں بلکہ جیسے نوزائیدہ بچہ دوبارہ سے پالا تھا۔ وہ اس کے جسم کی صفائی کے علاوہ، اسے کھلانے

پلانے، اس کے جسم کی مالش کرنے، اسے بچوں کی طرح پچکار پچکار کر ہمت کرنے اور خود کو واپس زندگی کی طرف لانے کی کوششوں میں مگن رہتیں۔ انہوں نے دانیال کی سماعت، گویائی اور دماغ کو پہچان کے سگنلز دینے والی قوت کو بحال کرانے کے دوران خود ڈاکٹرز سے مل کر، انٹرنیٹ پر تحقیق کر کے خود ایسے مریضوں کے پاس جا کر جو ایسی کیفیتوں میں مبتلا تھے جس محنت اور جانفشانی سے کام لیا وہ ان کے عزم و ہمت کو سب کی نظروں میں لے آئی تھی۔ جس روز دانیال نے قیوم کی نظروں کے سامنے اپنے جوتوں کے تسمے جھک کر خود باندھے اور سیدھے ہو کر اس کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔

"I am once again ready to face the challanges of life Sir"

اس روز قیوم کو معجزوں کے ہونے پر دل و جان سے یقین آگیا تھا۔

☆☆☆

زوئی کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اسے کہاں جانا اور ٹھہرنا تھا۔ نادر کی بے نیازی نے اسے چونکا ہی نہیں رُلا بھی دیا تھا مگر اب اسے فوری طور پر یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اسے کہاں جانا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو شہر کی مختلف سڑکوں پر ٹیکسی دوڑانے کا کہتے کہتے اب وہ اس کے سوالوں سے بھی عاجز ہو رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر نادر کو کال کرنے اور اس کا نمبر بند ملنے پر مریم کو کال کی۔ مریم انہی فلیٹس میں سے ایک میں رہتی تھی جن میں نادر سے نکاح اور واپس چین جانے سے پہلے زوئی رہتی تھی۔ مریم کا شوہر بیرون ملک کام کی غرض سے گیا ہوا تھا اور وہ خود یہاں کسی اسکول میں ٹیچنگ کر رہی تھی۔ فلیٹس کے مکینوں میں سے واحد مریم ہی تھی جو باقیوں کی نسبت اس سے بہتر سلوک روا رکھتی تھی۔ مریم نے زوئی کا فون فوراً اٹینڈ کرلیا اور اسے بتایا تھا کہ وہ اس وقت گھر ہی پر تھی اور زوئی اس کے گھر آسکتی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور کو فلیٹس کا پتا بتانے کے بعد زوئی وقتی طور پر ریلیکس ہوگئی لیکن ٹیکسی کے منزل پر پہنچنے کے بعد اپنے بیگ کا ہینڈل پکڑے اسے پہیوں پر اپنے پیچھے دوڑاتے ہوئے مریم کے فلیٹ تک پہنچنے تک آنسو پھر سے اس کی آنکھوں سے رواں ہونے لگے۔

"دیکھو زوئی تم نے تو بس کسی نہ کسی طرح یہاں اس ملک میں رہتے رہنے کی خواہش کی تھی ناں......" کچھ دیر بعد مریم اپنے فلیٹ کے چھوٹے سے سٹنگ روم میں اس کے قریب بیٹھے اس کے بال سنوارتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ "نادر سے نکاح اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے ایک جواز تھا پھر تم نادر سے بڑی بڑی توقعات کیوں لگانے لگی ہو؟"

"نادر ایسا نہیں تھا۔" زوئی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اب بھی اسی نے سب پیپرز مکمل کرا کے مجھے بھیجے تو ہی میں یہاں آسکی ہوں۔ اسے معلوم تھا کہ مجھے آج یہاں پہنچنا تھا پھر اس نے اپنا فون کیوں بند کرلیا، اس نے ائرپورٹ پر آنے کی زحمت کیوں نہیں کی؟"

"اس لیے کہ تمہارے سلسلے میں اس کا کام بس اتنا ہی تھا اُس نے نکاح کیا، تمہارے مطلوبہ پیپرز بنوائے اور تمہیں یہاں آنے اور رہنے کا جواز دے کر منظر سے ہٹ گیا۔" مریم نے اپنی بات کو صاف اور سیدھے لفظوں میں دُہرایا۔ "اور سچ پوچھو تو اس نے وہ ذمے داری جو تمہارے سامنے لی تھی خوب نبھائی، ورنہ پاکستانی مردوں سے اتنی مستقل مزاجی کی توقع لگانا بیکار ہے۔"

"میرے سلسلے میں ابھی وہ منظر سے ہٹ نہیں سکتا تھا۔ اسے مجھ سے بہت ضروری کام تھا۔" زوئی نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا اور پھر کوئی خیال ذہن میں آنے سے خوفزدہ سی ہوگئی۔

"اوہ میرے خدا.....!" اس نے اسی خیال کے تحت کہا۔ "کہیں میری وجہ سے نادر کسی بڑی مصیبت میں نہ پھنس گیا ہو۔"

"مصیبت.....؟" مریم نے حیرت سے کہا۔ "کیسی مصیبت؟"

"نہیں۔" زوئی نے مریم کو مزید کچھ نہ بتانے کا فیصلہ کیا اور بات بدل ڈالی۔ "کہیں اس کی ماں اور بہنوں نے اسے منع کر دیا ہو ائرپورٹ آنے سے۔"

"ہوسکتا ہے۔" مریم نے شانے اچکائے۔ "لیکن خیر....." پھر اس نے زوئی کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "تم واپس یہاں سیٹل ہونے تک میرے پاس ٹھہرو، اپنی فارماسیوٹیکل کمپنی میں جاؤ ہوسکتا ہے وہ تمہاری گُڈوِل کی وجہ سے تمہیں دوبارہ نوکری پر رکھ لیں، وہاں نہیں تو اس شہر میں بہتیری ایسی کمپنیاں ہیں، تمہیں کہیں بھی جاب مل سکتی ہے، اسی بلڈنگ میں دو تین فلیٹ حال ہی میں خالی ہوئے ہیں، ہم تمہارے لیے کوئی فلیٹ بھی کرائے پر لے لیں گے۔" مریم کا خلوص وقتی تسلی کے لیے کافی سے زیادہ تھا مگر زوئی کے دل میں نادر کی طرف سے ایک عجیب سی کھٹک پیدا ہو چکی تھی۔ جو اسے چین لینے نہیں دے رہی تھی۔

"کل کمپنی پہنچ کر جاب سے زیادہ نادر کا پتا لگانے کی کوشش کرتی ہوں..... " پاکستان میں پاکستانی شہری کی حیثیت سے پہلی رات کو سونے سے پہلے آخری بات اس نے یہی سوچی تھی۔

☆☆☆

"تم نے کبھی قدرتی آفات کے رونما ہونے کے بعد اجتماعی انسانی المیوں کے اندر انسان کی ازلی... بدفطرتی کے مظاہرے دیکھے ہیں؟" نیوز چینل کے ایک معروف نیوز ریڈر جس سے فہد کی اچھی دوستی ہو چکی تھی نے ایک شام اس کے اپارٹمنٹ میں کافی پیتے ہوئے اس سے پوچھا تھا، یہ نیوز ریڈر جس کا نام مجتبیٰ تھا، اس کے ساتھ والے اپارٹمنٹ میں اپنی فیملی کے ساتھ رہتا تھا اور کبھی فرصت کی شام میں فہد کے ساتھ بیٹھ کر اس کی بنائی کافی پیتا اسے بہت پسند تھا۔

"انسانی المیوں کے اندر انسانی بدفطرتی.....؟" فہد نے مجتبیٰ کی بات دُہرانے کے بعد اس کی طرف دیکھا۔ "میں کچھ سمجھا نہیں۔"

"ایک انسانی المیہ تو وہ ہوتا ہے جو قدرتی آفات جیسے سیلاب، زلزلے، طوفان وغیرہ کے نتیجے میں رونما ہوتا ہے۔" مجتبیٰ نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ "اور ایک انسانی المیہ وہ ہوتا ہے جو قدرت کی طرف سے آنے والی تباہی سے نبرد آزما ہونے کے دوران رونما ہوتا ہے۔"

"وہ کیسے.....؟" فہد نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ریلیف ورک کے دوران۔" مجتبیٰ نے کہا۔

"اوہ..... میں سمجھ گیا۔" فہد نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "کچھ اموات جو فوری طور پر ہوتی ہیں اور بہت سی جانیں جو ریلیف دینے کے دوران چلی جاتی ہیں کیونکہ انسان موت، زندگی کے فیصلوں کے سامنے بے بس ہے۔"

"میں نے انسان کی نیک فطرتی نہیں بدفطرتی کا ذکر کیا ہے۔" مجتبیٰ نے کہا۔

"بدفطرتی؟" فہد نے اس لفظ پر غور کرتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں سمجھ سکا۔" پھر اس نے گردن موڑ کر مجتبیٰ کی طرف دیکھا۔ "تم ہی بتاؤ۔"

"میں نے اس بدفطرتی کا مظاہرہ 2005ء کے زلزلے کے دوران دیکھا۔" مجتبیٰ نے کہا۔ "ہم اپنی ٹیم

کے ساتھ زلزلہ زدہ علاقوں میں براہِ راست رپورٹنگ کے لیے پہنچے اور کئی دن ٹھہرے رہے۔"

"بہت بڑا انسانی المیہ تھا وہ۔" فہد نے کہا۔ "اگرچہ ان دنوں میں یہاں نہیں تھا لیکن بیرونِ ملک بیٹھے ہوئے بھی اس المیے کی شدت کا اندازہ کر سکتا تھا۔"

"تم تو بہت دور بیٹھے تھے، جو لوگ اسی ملک میں موجود تھے لیکن اس علاقے سے دور تھے انہیں بھی اندازہ نہیں ہوا کہ اس المیے کے اندر سے کیسے کیسے المیے پھوٹ رہے تھے۔ یاد کرتا ہوں تو اب بھی راتوں کی نیندیں اُڑ جاتی ہیں۔"

"کچھ بتاؤ گے مجھے بھی۔" فہد نے کہا۔

"زخمی مر رہے تھے اور کیمپس سے دوائیں چرائی جا رہی تھیں، کھلے آسمان تلے بیٹھے بچے، بوڑھے، بیمار، جوان بارش اور سردی کے ہاتھوں جانیں گنوا رہے تھے اور امداد کے لیے آنے والے خیمے، کمبل، غذا، خرد برد کر کے مارکیٹ میں بیچی جا رہی تھی۔"

"اوہ....." فہد نے افسوس سے سر ہلایا۔

"یہاں تک ہی بات ختم نہیں ہوئی۔" مجتبیٰ نے کہا۔ "بے سہارا ہو جانے والی مجبور، زخمی، نوجوان لڑکیوں کی حفاظت کرنے والا کوئی نہیں تھا، ان کیمپوں سے ایسی ہی کئی لڑکیاں اغوا کی گئیں اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی کیونکہ اُن کے پیچھے دہائی ڈالنے والا گھر کا کوئی فرد بچا ہی نہیں تھا۔"

"ڈونٹ ٹیل می یار....." فہد جھرجھری لیتا ہوا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"میں عینی شاہد ہوں ایسی وارداتوں کا۔" مجتبیٰ نے سر ہلایا۔ "شاید میں ٹھیک سے بتا نہ سکوں کہ کیسی کیسی تنظیموں کے نام کا پردہ اوڑھے کارکنوں نے یہ گھناؤنی وارداتیں کیں اور پھر اُن لڑکیوں کے ساتھ کیا کیا برا سلوک نہ کیا ہوگا۔"

"تم لوگوں نے اس بات کو رپورٹ نہیں کیا؟" فہد نے کہا۔

"ہمارے اوپر جتنا پریشر ان دنوں تھا اتنا تو کبھی نہیں رہا۔ ہم پر پریشر تھا کہ ہم تصویر کا ایک ہی رخ دکھائیں، ریسکیو اور ریلیف ٹیمیں دن رات کام کر رہی ہیں، حکومت سرپرستی کر رہی ہے اور تاریخ میں اتنے اچھے انتظامات پہلے کبھی کیے ہی نہیں گئے۔ بہت کوشش کے باوجود ہم اس پریشر سے صرف اس حد تک نکل سکے کہ لوگوں کو اتنا بتا دیا جائے کہ دوائیں، کمبل، غذا اور خیمے لوگوں تک پہنچ نہیں پا رہے۔ اس اتنے حساس موضوع پر تو آج بھی، ہم نجی محفلوں میں ہی دبے لفظوں میں ذکر کر پاتے ہیں۔"

"کیا تم نے خود اپنی آنکھوں سے یہ ہوتے دیکھا؟" فہد نے بے یقینی سے مجتبیٰ کی طرف دیکھا۔

"ہم میں سے کتنوں نے دیکھا، رات تک لڑکی کا ذہنی اور جسمانی علاج کیا جا رہا ہوتا، صبح تک وہ لڑکی کیمپ سے غائب ہوتی، تین چار ایسے کیسز میں نے خود دیکھے، ایک، دو کے بارے میں کہا گیا کہ وہ خود کیمپ سے فرار ہوئیں اس لیے کہ وہ وہاں رہنا نہیں چاہتی تھیں مگر ایک لڑکی میرال صلاح الدین کے بارے میں تو میں گواہ ہوں، وہ لڑکی خود سے وہاں سے نہیں گئی تھی اسے اغوا کیا گیا تھا۔"

"کیا.....!" فہد ایک لمحے کے لیے جیسے شاک میں جانے کے بعد بولا تھا۔ "کیا نام لیا تم نے اس لڑکی کا؟"

"میرال صلاح الدین۔" مجتبیٰ نے کہا۔ "اس لڑکی کی صرف دادی زندہ تھیں جو اس زلزلے کا شکار

ہوگئیں، اُن کے بعد لڑکی بالکل بے آسرا تھی۔ وہ بہت زیادہ زخمی نہیں تھی اور اپنے حواسوں میں نظر آتی تھی۔ بہت خوب صورت تھی اور ذہین بھی...... بہت خوب صورت تھی، شاید اسی لیے اسے وہاں سے اٹھالیا گیا۔ مجتبیٰ، فہد کی کیفیت کا اندازہ کیے بغیر، بول رہا تھا اور وہ ششدر بیٹھا سن رہا تھا۔

☆☆☆

"کیا ہوا ممی...... خیریت؟" دانیال نے عافیہ کو یوں لرزتے دیکھ کر سوال کیا۔

"یہ...... یہ لڑکی۔" عافیہ کی زبان لڑکھڑاہٹ کا شکار ہونے لگی۔

"جی ممی...... کیا ہوا اس لڑکی کو......؟" دانیال نے میز پر رکھے اخبار کی طرف دیکھا۔

"یہ تو میرال ہے، آنٹی بلقیس کی پوتی۔" انہوں نے اسی لڑکھڑاتی زبان سے کہا۔

"میں تمہیں آنٹی بلقیس کے بارے میں بتاتی رہتی ہوں ناں۔" انہوں نے دانیال کی طرف دیکھا۔ "جو تمہارے مکمل صحت یاب ہونے کے بارے میں ہمیشہ مجھے تسلی دیتی رہتی تھیں۔"

"ہاں، ہاں بالکل......" دانیال نے تیزی سے سر ہلایا۔

"اور جو تمہارے مکمل صحت یاب ہونے سے پہلے ہی ایک حادثے کا شکار ہو کر دنیا سے چلی گئیں۔"

"جی، مجھے یاد ہے۔" دانیال نے کہا۔

"یہ لڑکی......" انہوں نے اخبار کے صفحے پر چھپی تصویر پر انگلی رکھی۔ "یہ لڑکی ہو بہو میرال ہے۔ آنٹی بلقیس کی پوتی۔"

"لیکن ممی یہ وہ لڑکی کیسے ہو سکتی ہے؟" دانیال نے صفحہ اٹھاتے ہوئے کہا اور غور سے تصویر دیکھنے لگا۔ "یہ کال گرل ٹائپ کوئی لڑکی ہے، جس کی خبر اخبار میں صرف ایک بڑے سیاست دان کے ساتھ وابستہ ہونے کی وجہ سے لگ گئی۔"

"یہی تو......" عافیہ نے کہا۔ "اسی خبر نے تو مجھے لرزا کر رکھ دیا ہے، اگر یہ میرال ہے تو کال گرل کیسے ہو سکتی ہے مگر شکلوں کی اتنی مماثلت نظر کا دھوکا تو نہیں ہو سکتی۔"

"ہوں۔" دانیال نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے وہ حادثاتی طور پر اس طرف آ گئی ہو، آنٹی بلقیس کے علاوہ اس کا کوئی تھا بھی نہیں، آپ نے بتایا تو تھا۔"

"حادثاتی طور پر......!" عافیہ نے دانیال کے الفاظ دُہرائے "لیکن اس کے ساتھ حادثہ کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ صوفی صاحب کی دعاؤں کے حصار میں... اسے تو صوفی صاحب نے اپنی دعاؤں کی حفاظت میں لے رکھا تھا۔" عافیہ جیسے خود کلامی میں محو تھیں۔ دانیال اور بینش حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

"آج میں اپنے کارڈز میز پر رکھتی ہوں۔" مہرزاد کو اس خصوصی نمبر سے پہلا پیغام موصول ہوا تھا۔

"میرا دہ نام جس کے ساتھ پکارتے ہوئے شاید آپ رک نہ جائیں میرال صلاح الدین تھا......

حادثاتی طور پر زر نگار بن گیا۔" دوسرا پیغام اسے ایک پُرہجوم پریس کانفرنس کے دوران موصول ہوا تھا۔ مہرزاد کی الیکشن میں جیت کے بعد پہلی رات اور پہلی پریس کانفرنس تھی۔

(باقی آئندہ)



شامِ شہرِ یاراں

عنیزہ سید

قسط 8

زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے... خیر و شر، نیکی اور بدی... زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت... ہر برائی پر حاوی ہوجاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سیّد نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

محمود درانی اور مہرین کی تیسری اولاد حمزہ، مہرین کی زچگی میں پیچیدگی کے باعث نانی کے پاس ان کے آبائی گھر سیالکوٹ میں پروان چڑھتا ہے۔ جہاں نگین اس کے ماموں کی بیٹی سے اس کی خوب گاڑھی چھنتی ہے۔ بڑے ہونے کے بعد حمزہ کے والدین اسے واپس لانا چاہتے ہیں مگر وہ راضی نہیں ہوتا۔ علینہ کے والدین، نادیہ اور سعید کیانی نے کورٹ میرج کی تھی۔ شادی کے تین سال بعد سعید کیانی بیوی کو داغ مفارقت دے گئے۔ علینہ، فہد کو ٹی وی شو میں ایک شیف کے طور پر دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے فہد جس کے ساتھ اس نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ آکسفورڈ کا پروردہ سردار مہرزاد خان اپنے باپ کے بابا کی موت کے بعد حادثاتی طور پر سیاست میں شامل ہوا تھا اور زرنگار کے حسن و ذہانت کا شکار ہو چلا تھا..... بینش دو بھائیوں کی اکلوتی بہن، اپنی ضد اور صرف بھائیوں کے تعاون سے نیشنل کالج آف آرٹس میں تعلیم حاصل کر رہی تھی جہاں اس کا سینئر دانیال اس سے ہر ممکن تعاون کرتا تھا۔ ایک پاکستانی مسلمان مرد اور بدھ مذہب کی پیروکار چینی عورت کی بیٹی زوئی حسین جو چین سے آ کر پاکستان میں فارسی کی تعلیم حاصل کرتی ہے یہ سب اس نے دادی کی محبت میں کیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ دل پاکستان کی سرزمین اور یہاں کے لوگوں سے شدید محبت کرنے لگا تو اس نے ریسرچ ڈیپارٹمنٹ جوائن کر لیا تاکہ قیام کو بڑھا سکے۔ حمزہ جو اب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے ایک سیمینار کے سلسلے میں ایبٹ آباد جاتا ہے اور وہاں بی اماں کی بیٹی کلثوم کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے جو بچپن میں باقاعدگی سے سیالکوٹ آتی تھیں اور حمزہ بھی بی اماں کے ساتھ ایبٹ آباد جایا کرتا تھا مگر 2005ء کے زلزلے کے بعد وہاں سب کچھ بدلا ہوا تھا۔ حمزہ اپنی کزن اور بچپن کی دوست نگین سے بی اماں کی سہیلی اور پوتی (میرال) کے متعلق اپنی تشویش بتاتا ہے کہ رابعہ کلثوم کی وفات اور زلزلے کے بعد پوتی نہ جانے کہاں گئی۔ رابعہ کلثوم بیواجی کے نام سے آرٹ اینڈ کرافٹ سینٹر چلاتی تھیں۔ امراؤ بیگم جو اپنی والدہ زبیدہ خانم کا کوٹھا آباد کیے ہوئے تھیں کی آمدنی کا ذریعہ زرنگار (میرال) بن جاتی ہے مگر صرف سردار مہرزاد خان نے اس کی کئی راتوں کے حقوق بھاری معاوضے کے عوض اپنے نام کر لیے تھے۔ دانیال آرٹ کا عشق رکھنے کے ساتھ فلائنگ میں بھی مہارت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ایک دن طیارے کے دھویں سے نقش و نگار بنانے کی کوشش میں حادثے کا شکار ہو کر اسپتال میں بیٹیوں میں جکڑا (عافیہ) کی ممتا کا شدید امتحان بن جاتا ہے۔ بیٹے کی زندگی کی دعائیں مانگتے مانگتے عافیہ اللہ تعالیٰ کے مقربانِ خاص بندوں میں سے ایک کی درگاہ میں جا پہنچتی ہیں۔ زوئی حسین کے ویزے کی مدت ختم ہونے سے دو روز قبل وہ اپنے ایک ساتھی نادر سے نکاح کر لیتی ہے تاکہ پاکستان میں رہنے کا جواز پا سکے۔ 2005ء کے زلزلے میں زوئی حسین نے بھی متاثرین کی مدد کی تھی۔ اسے خاصی شہرت ملی، پڑی اور اب نادر بدگمانی کی آخری سیڑھی پر تھا۔ دانیال، بینش کو اپنے گھر لے جاتا ہے بینش اخبار میں چھپی زرنگار کی تصویر دکھاتی ہے تو عافیہ اسے دیکھ کر حیران رہ جاتی ہیں کیونکہ وہ رابعہ کلثوم کی پوتی میرال کی تصویر تھی۔ زوئی پاکستان آتی ہے لیکن نادر اسے ایئرپورٹ لینے نہیں آتا۔ وہ فون کرتی ہے تو اس سے رابطہ نہیں ہو پاتا۔ وہ اپنی پرانی پڑوسن اور سہیلی کے ہاں جانے کا فیصلہ کرتی ہے۔ فہد کو اپنے ایک نیوز ریڈر دوست کے ذریعے سے میرال کی گمشدگی کی خبر ملتی ہے۔ الیکشن کمپین کے دوران ٹیلی رئیس، مہرزاد کی شخصیت کے کچھ ایسے پہلوؤں سے آشنا ہوئی جو اب تک سب سے مخفی تھے۔ مہرزاد کے الیکشن میں جیتنے کے بعد زرنگار اسے بتاتی ہے کہ وہ میرال صلاح الدین ہے۔

اب آگے پڑھیے

”دکتنی خوش قسمت ہے وہ لڑکی جس کے لیے دانیال کی ممی اس قدر پریشان ہو رہی تھیں۔“ اس روز واپس آنے کے بعد بینش نے سوچا۔ اسے رہ رہ کر دانیال کی ممی کا اس کال گرل کی تصویر دیکھ کر سفید پڑ جانا، پریشانی کی حالت میں بار بار ان کا نفی میں سر ہلانا، ان کی آنکھوں میں اس لڑکی کا ذکر کرتے ہوئے آنسو آنا اور دانیال سے ان کا اصرار کہ ہر حال میں اس لڑکی کا پتا لگانا ہے، یاد آ رہا تھا۔

”وہ ایسے ہی ہے جیسے میری اپنی بیٹی ہو، دانیال جس طرح بھی ممکن ہے اس کا پتا لگاؤ..... اگر یہ رابعہ کی پوتی میرال ہی ہے تو پھر اسے ڈھونڈنا اور اس جگہ سے اسے نکالنا جہاں یہ جا پھنسی ہے، ہمارا فرض ہے، ذمے داری ہے۔“ وہ بار بار دانیال سے کہہ رہی تھیں اور وہ سعادت مندی سے سر ہلا رہا تھا۔ وہاں بیٹھے

اسے اس کال گرل پر رشک آ رہا تھا یا اس سے حسد محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا بینش کو اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ لڑکی جو اچانک سے ان دونوں ماں بیٹے کی گفتگو کا مرکز بن بیٹھی تھی اور جس کے تذکرے کے دوران بینش کو اپ اضافی لگنے لگا تھا۔ نہ صرف اضافی بلکہ بے جگہ بھی.....

”ضروری تو نہیں کہ آنٹی جو سمجھ رہی ہیں یہ وہی لڑکی ہو۔“ دانیال سے اس نے یہ بات اس وقت کہی تھی جب وہ اسے گھر چھوڑنے جا رہا تھا۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ دانیال نے ایک ہاتھ سے اپنی پیشانی مسلتے ہوئے کہا تھا۔ ”جو لڑکی ممی کے خیال میں وہ ہے، وہ تو بہت اجلی اور قیمتی تھی۔ صوفی صاحب کے حوالے سے ہر وہ شخص جو انہیں عزیز تھا ہمارے لیے بھی بہت قیمتی ہے۔“

”صوفی صاحب کون ہیں؟“ بینش کو اس انجانی شخصیت کے بار بار تذکرے پر بھی حیرت ہو رہی تھی۔

”ہیں نہیں تھے۔“ دانیال نے موڑ مڑتے ہوئے کہا۔ ”وہ، وہ تھے جو زندگی سے رخصت ہوتے ہوئے میرے لیے زندگی کی نوید دے گئے، وہ جن کی وجہ سے ہم نے ایک نیا راستہ پایا، زندگی کی بھول بھلیوں میں سلامتی کے ساتھ باہر نکلنے کا صاف اور سچا راستہ، صوفی صاحب نے اپنے علم کے دریا میں سے چند قطرے ہماری طرف بڑھائے اور ہم مزید بھٹکنے سے بچ گئے۔“ اس نے گردن موڑ کر بینش کی طرف دیکھا۔ ”شاید میں تمہیں بتا نہ پاؤں صوفی صاحب کیا تھے اور کون تھے۔“

کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی بینش نے سر ہلا دیا۔ اس کے دل میں اب بھی وہ تپش محسوس ہو رہی تھی جو ایک کال گرل کی تصویر دیکھ لینے پر دانیال کی ممی اور بعد میں دانیال کے ردِعمل پر اٹھنا شروع ہوئی تھی۔

”اچھا تو یہاں ہے تمہارا گھر!“ ایک نسبتاً چوڑی اور کشادہ گلی میں گاڑی روکتے ہوئے دانیال نے دلچسپی سے اس علاقے کو دیکھا، بینش کو نہ جانے کیوں عجیب سی خجالت محسوس ہونے لگی، وہ کیا سوچ رہا ہوگا وہ اتنے گنجان آباد اور غیر ترقی یافتہ علاقے میں رہتی تھی۔

”بہت دلچسپ جگہ ہے یہ۔“ وہ آنکھوں سے دھوپ کا چشمہ ہٹا کر باہر دیکھتا ہوا بولا۔ ”ہو سکتا ہے میں اپنی کسی سیریز آف پینٹنگز کے لیے اس ہی علاقے کو موضوع بناؤں، میں تصور کر سکتا ہوں کہ یہاں رہنا کتنا دلچسپ تجربہ ہوگا۔“

”اس کھلی گلی سے آگے تنگ اور پُرپیچ گلیاں ہیں اور ان گلیوں میں سر اٹھا کر کھڑے تنگ ماتھے اور اونچی منزلوں والے پرانے مکان، جن کے باہر گلی کی نالیاں ابلتی ہیں اور جگہ جگہ کوڑا کرکٹ کے ڈھیر لگے رہتے ہیں۔ جہاں کے مکین ایک دوسرے کی انتہائی ذاتی زندگیوں کے بارے میں اتنے ہی متجسس اور متعلق رہتے ہیں جتنے اپنی، اپنی عمومی زندگیوں کے بارے میں، جہاں کی خواتین کا پسندیدہ مشغلہ دوسروں کی شخصیتوں اور مسئلوں کے بخیے ادھیڑنا ہے اور اس کام کے لیے ان کے پاس بے شمار وقت ہے۔“ بینش نے اس کی بات کے جواب میں صرف سوچا اور مسکراتے ہوئے دانیال کا شکریہ ادا کرتے ہوئے گاڑی سے باہر نکل آئی۔

”میں تمہارے گھر جانا اور چائے وغیرہ پینا ضرور پسند کرتا اگر مجھے فوراً واپس نہ جانا ہوتا۔“ بینش خدا حافظ کہنے کے لیے ذرا سا جھکی تو وہ مسکرا کر بولا۔ ”عاصم بھائی کی جو فائل میں نے راستے میں کسی کو دی ہے اسے اسکین کروانے کے بعد فیکس کروانا ہے اسی لیے مجھے واپس جانے کی جلدی ہے، ویسے۔“ وہ ذرا رکا..... اور مسکرایا۔ ”مجھے امید ہے کہ میں غلط فہمی کا شکار نہیں ہوا، تم مجھے یہ ہی روایتی سی دعوت دینا چاہ رہی تھیں ناں کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

آئیں میرے گھر چلیں اور چائے کا ایک کپ پئیں وغیرہ وغیرہ......'' بینش نے بِنا سوچے سمجھے سر ہلا دیا، بات پر شکر کی سانس لینا چاہتی تھی کہ دانیال کو واپسی کی جلدی تھی اور اس کا بھرم رہ گیا تھا۔

''چلو پھر ٹھیک ہے یہ آفر اُدھار رہی۔'' اس نے ہنستے ہوئے سر ہلایا اور دھوپ کا چشمہ آنکھوں پر ... گاڑی ریورس کرنے لگا۔

''توبہ توبہ...... میں کہاں تمہیں اپنے گھر آنے اور چائے پینے کی دعوت دے سکتی تھی۔'' بینش ... کے چلے جانے کے بعد اپنے گھر کی طرف جاتی گلی کا رخ کرتے ہوئے سوچا۔ ''میری اماں تو ذرا سی مروت ... بھی قائل نہیں، وہ تو دروازے پر ہی چلّانا شروع کر دیتیں کہ میرے دیدوں میں سے شرم نکل گئی ہے جو میں ... جوان جہاں لڑکے کو گھر کی دہلیز تک ساتھ لے آئی ہوں۔'' وہ سوچ رہی تھی۔ ''اور پھر کسے خبر کہ ایسا کرنے ... پاداش میں... میری پڑھائی وڑھائی سب ختم کر دی جاتی اور مجھے گھر بٹھا لیا جاتا۔'' اس نے گلی کی اونچی ... اینٹوں میں سے ایک نیچی اینٹ کے بعد اونچی اینٹ پر قدم پڑنے پر لڑکھڑاتے ہوئے سوچا۔

''تم مانو یا نہ مانو...... ہمارے ہاں آج بھی یہ ہی روایتیں چل رہی ہیں، اچھی بھلی پڑھتی پڑھاتی لڑکی ... گھر بٹھا لینے کے لیے صرف ایک یہ وجہ کافی ہے۔'' اس نے دانیال کا تصور کرتے ہوئے اس کے گھر اور گھر ... پُرسکون اور سادے سے ماحول کو یاد کرتے ہوئے سوچا۔ ایسا ماحول جس میں دولت، علم اور دانش وری ... فراوانی کے باوجود ایک لطیف سی عاجزی اور سادگی رچی بسی تھی۔ اسے اس گھر اور گھر کے باسیوں پر رشک آ... تھا۔ ''کتنی نامحسوس، ان کہی، ان سنی مگر مضبوط ذہنی ہم آہنگی ہے وہاں جس کا احساس میرے جیسے اجنبی کو ... وہاں جاتے ہی ہونے لگتا ہے۔'' اس نے سوچا تھا اور گھر پہنچنے کے بعد منہ ہاتھ دھونے، کپڑے بدلنے اور ... چھت پر بیٹھے رہنے کے دوران بھی وہ اس گھر اور اس کے مکینوں کے بارے میں ہی سوچتی رہی تھی۔

''تہذیب اور شائستگی کی وہ جھلک کتنی خوب صورت اور قابلِ رشک لگتی ہے، دل بے اختیار چاہتا ہے ... کاش میں بھی وہیں کی ایک مکین ہوتی۔'' اس نے سوچا اور اسی پل اسے اخبار والی کال گرل کی تصویر یاد آ گئی۔

''کتنی خوش قسمت ہے وہ لڑکی جس کے لیے دانیال کی ممی اس قدر پریشان ہو رہی تھیں۔'' اس کی سو... کے دھارے نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا اور پھر وہ اس نکتے پر سوچے بغیر کہ اگر وہ وہی لڑکی تھی جو دانیال ... اس کی ممی سمجھ رہے تھے تو کیسے برے حالات سے دوچار ہو کر وہ بن گئی تھی جس کی تصویر ایک سستے متا... اخبار نے ایک سیاست داں کی داشتہ کے طور پر شائع کی تھی، صرف اس لڑکی کے لیے رات گئے تک وہ رشک ... یا شاید حسد ہی محسوس کرتی رہی تھی۔ بینش کی دنیا اور تجربہ اتنا محدود تھا کہ وہ اس معاملے کی حساسیت کو سمجھ ... نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

''میں بہت خوش اور تمہارے کارڈز دیکھنے کو بے چین ہوں، اگرچہ عمدہ کھیل میں یہ ڈنڈی نہیں چلتی ... ایک دوسرے کے پتے دیکھ کر بازی آگے بڑھائی جائے مگر کھیل کے اصولوں کے عین مخالف بھی میں یہ ڈنڈی ... مارنے کو بے چین ہوں میر ال صلاح الدین۔'' مہر زاد نے پُرہجوم پریس کانفرنس میں اِدھر اُدھر سے آتے ... تیز و تند، کچھ خوشامدانہ اور کچھ دوستانہ سوالات کے جوابات دینے کے دوران بھی اس خصوصی نمبر سے آ... والے پیغام کا جواب ٹائپ کر کے بھیج دیا تھا۔ اس شام وہ پُرجوش تھا، اپنے مزاج کے برعکس اپنی خوشی کو ظاہر ... ہونے دے رہا تھا اور گفتگو کے دوران ہلکے پھلکے مذاق اور طنز کا استعمال بھی کر رہا تھا۔ اس قدر گہری، نامحسو...

مگر بھرپور مخالفت کے باوجود وہ یہ چوکھی لڑائی جیت چکا تھا جس کی بنیاد پر اس کے آئندہ سیاسی کیریئر کا رخ متعین ہونے والا تھا۔

''یہ ہوا کرتی ہے ایک اچھے گھڑ سوار، ایک اچھے نشانہ باز، ایک اچھے چالباز اور ایک ماہر کھلاڑی کی نشانی۔'' اس رات پارٹی سربراہ کی طرف سے دیے گئے فتح کے جشن کو منانے والے عشائیے کے دوران ولایتی شراب کے سُرور میں ڈوبے اس کے ایک سیاستداں انکل نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا تھا، ان سیاستداں انکل کا تعلق وڈیرا کلچر سے تھا اور وہ اس کے شہید والد کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔

''تم نے میدان مار لیا برخوردار...... ایک ایسا میدان جسے مارنا ناممکنات میں شمار ہونے لگا تھا ان آخری دنوں میں جب اس عیار حسینہ کے دام میں پھنسنے کے چرچے عام ہونے لگے تھے۔'' انہوں نے اپنی والرس جیسی سفید مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

''بھلا ہو تمہارے باپ کی تربیت کا جس نے تمہیں بدترین صورتِ حال سے مکھن میں پھنسے بال کی طرح نکلنا سکھا دیا۔'' انہوں نے اس کے باپ کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

''اب موج کرو...... میدان کھلا ہے اور تمہارے سامنے موجود ہے، جس طرح چاہو اپنے گھوڑے دوڑاؤ، پانچ میں سے ساڑھے چار سال جو باقی رہ گئے ہیں تمہیں کوئی خطرہ نہیں کیونکہ یہ عرصہ آقاؤں نے ہمارے حق میں لکھ دیا ہے۔'' انہوں نے لکھنے کے سے انداز میں اپنی انگلیاں ہوا میں نچائیں۔ ''بے خطر ہو کر اپنی محبوبہ بلکہ محبوباؤں کے ساتھ سرِعام گھومو پھرو، تمہاری شہرت اور نیک نامی کو کچھ فرق نہیں پڑے گا، ہاں بس۔'' انہوں نے رک کر ایک آنکھ بند کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ''بڑے گھر کی حاضری اور وہاں موجود چندے کے بکس میں نذرانہ ڈالنا کبھی نہ بھولنا۔''

ان کی تعریفوں، نصیحتوں اور ترکیبوں پر دل اور دماغ میں اٹھتے غیظ کی ایک بھرپور لہر کے تحت ان پر پل پڑنے اور ان کا حلیہ بگاڑ دینے کی خواہش کو دل اور دماغ ہی میں دباتے ہوئے اس نے ہلکا سا مسکرا کر سر ہلانے ہی پر اکتفا کیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اسے کہاں کیسا ردِعمل ظاہر کرنا تھا، جب ہی اس جشنِ فتح کے رنگ و بو میں موجود مرد و زن کی نظر آتی تمام حرکتوں سے اس نے اپنے باطن کی نظریں چرا رکھی تھیں۔ اس کی ظاہری نظریں دیکھتی تھیں، مسکراتی تھیں، دوستانہ ردِعمل ظاہر کرتی تھیں۔ آج کا دن بظاہر اس کا دن تھا، آج کی رات بظاہر اس کی رات تھی مگر حقیقت میں وہ اس صدیوں پرانے نظام کی فتح کی ایک اور رات تھی جس کی پہلے سے چلی آتی کڑیوں میں حالیہ اضافہ کرتے ہوئے وہ بھی ایک کڑی کی طرح اٹک چکا تھا، اسے اس شباب و شراب کو، عیار شکلوں، مکار آنکھوں، شیطان لہجوں اور شاطر منصوبوں کو دیکھنا، سننا بھی تھا اور برداشت بھی کرنا تھا اور برداشت کے ان بوجھل لمحوں کو گزارتے ہوئے یہ بھی سوچنا تھا کہ وہ اس کل کا حصہ رہتے ہوئے خود کو اس سے الگ کیسے رکھنے والا تھا۔

☆☆☆

اس نے بارش میں بھیگنے کے بعد خشک ہوتی زمین میں گڑے اس کائی زدہ سنگی بینچ پر بیٹھے، بیٹھے افسردگی سے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان صاف اور نکھرا ہوا تھا، دن کی روشنی میں اس کی نیلاہٹ قدرے مدھم پڑ رہی تھی۔ فضا میں ہلکا سا سکوت تھا جسے ارد گرد بکھرے درختوں پر آ بیٹھنے اور پھر اُڑ جانے والے پرندوں کی آوازیں کبھی کبھار توڑ رہی تھیں۔ یہ اس فارماسوٹیکل کمپنی کا عقبی حصہ تھا جس میں وہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد کام کر رہی تھی۔

''اس ماحول کا حصہ اور اس ملک کی مستقل شہری بن جانے کی خواہش کچھ اتنی ناجائز بھی نہیں تھی کہ اس کی پاداش میں مجھے ایک نہ ختم ہونے والی سزا سنا دی جائے۔'' اس نے مینوفیکچرنگ پلانٹ کی عمارت کی عقبی سمت میں گڑے لوہے کے پائپوں سے باہر آتے کیمیکلز ملے گدلے پانی پر نظریں جماتے ہوئے سوچا۔

''کہاں چلے گئے ہو نادر تم...... کدھر غائب ہو گئے ہو؟'' سسکیاں اس کے حلق میں دم توڑنے لگیں۔ یہاں اگرچہ اس وقت کوئی دوسرا شخص موجود نہیں تھا لیکن کسی دم بھی کوئی آ سکتا تھا کیونکہ لنچ بریک کا وقت ہوا چاہتا تھا اور کمپنی کا کیفے اسی حصے میں واقع تھا، یہاں وہ آزادی سے رو سکتی تھی نہ کسی سے اپنا دکھ کہہ سکتی تھی۔ صبح سے کمپنی کے مختلف شعبوں میں پھرتے اور نادر کے متعلق مختلف لوگوں سے سوال کرتے کرتے اس کی ٹانگیں اور ذہن تھکنے لگے تھے۔

''نادر کئی روز سے غیر حاضر ہے زوئی، اس نے چھٹی کی درخواست بھی نہیں بھجوائی۔ میں تو خود اس کے بارے میں متفکر ہوں۔'' پروڈکشن ڈیپارٹمنٹ میں کام کرنے والے نادر کے قریبی دوست ذوالقرنین نے اسے بتایا تھا۔

''کیا تم مجھے نادر کے گھر کا پتا دے سکتے ہو کیونکہ اس کا فون مسلسل بند ہے، میرے پاس اس سے رابطے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔'' زوئی نے روہانسی ہوتے ہوئے ذوالقرنین سے درخواست کرنے کے سے انداز میں کہا تھا۔

''ہاں، یہ تو میں کر سکتا ہوں۔'' ذوالقرنین کو یقیناً اس کی بے چینی پر حیرت ہو رہی تھی لیکن اس نے اس کا اظہار کیے بغیر کہا تھا۔

''لیکن میرا خیال نہیں اس کے گھر کا صرف پتا پا کر تم وہاں تک پہنچ پاؤ گی، تم اس شہر کے تمام راستوں سے واقف نہیں ہو، نادر کا گھر شہر سے تقریباً باہر ایک ایسے علاقے میں ہے جو آبادی بڑھنے کے باعث شہر کا حصہ بن گیا ہے لیکن وہاں پہنچنا ایک اجنبی کے لیے یقیناً مشکل ہوگا۔'' ذوالقرنین نے کہا تھا۔

''پھر بتاؤ میں کیا کروں، کیسے پہنچوں؟'' زوئی بالکل ہی رونے والی ہو رہی تھی۔

''تم ایسا کرو لنچ بریک تک انتظار کرو...... میں کوشش کرتا ہوں کہ مجھے بریک کے بعد آدھی چھٹی مل جائے پھر میں تمہیں خود وہاں تک لے جاؤں گا۔'' ذوالقرنین کو شاید اس کی حالت پر رحم آنے لگا تھا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے، میں اس وقت تک انتظار کر لیتی ہوں۔'' زوئی نے سر ہلاتے ہوئے کہا تھا اور پروڈکشن ڈیپارٹمنٹ سے نکل کر آہستہ قدموں سے چلتی اِدھر آ گئی جہاں اس وقت وہ بیٹھی تھی۔ نادر کے متعلق اس کی پریشانی اور وہم لحہ بہ لحہ بڑھتے جا رہے تھے اور وہ بے چینی سے ذوالقرنین کا انتظار کر رہی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ سورج رخ بدل رہا تھا اور درختوں کے سائے لمبے ہو رہے تھے، اس کے ساتھ ساتھ ہی زوئی کے دل کی وحشت بھی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

☆☆☆

ڈاکٹر نادیہ کی زندگی ایک لگی بندھی روٹین کے ساتھ گزر رہی تھی۔ جس اسپتال میں انہوں نے میڈیکل کالج کے بعد ہاؤس جاب کیا تھا، اب اسی اسپتال میں وہ سینئر میڈیکل اسپیشلسٹ کے طور پر کام کر رہی تھیں۔ ان کا دن اسپتال کی ڈیوٹی میں گزرتا اور شام کے وقت وہ اپنے کلینک پر مریض دیکھتی تھیں۔ اپنے شعبے میں اب تک ان کا اچھا خاصا نام بن چکا تھا اور اس شہر کے مشہور ڈاکٹرز کی فہرست میں ان کا نام بھی درج تھا۔

اس تکی بندھی روٹین سے ہٹ کر اُن کی زندگی میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اپنی بیٹی علینہ کے لیے البتہ اب وہ فکرمند رہا کرتی تھیں۔ علینہ کی شخصیت میں کئی قسم کی کمیاں دیکھ کر اب کبھی کبھار انہیں خیال آنے لگا تھا کہ ان کمیوں اور خامیوں کا سبب خود اُن کی اپنی ذات تھی۔ انہیں اپنی دانستہ مصروف زندگی کے کئی پرانے دن یاد آتے، ایسے دن جن میں اگر وہ چاہتیں تو علینہ کو توجہ اور وقت دے سکتی تھیں، ان کے وقت اور ان کی توجہ کی کمی ہی وہ وجوہات تھیں جو علینہ کی خامیوں کا تجزیہ کرنے پر انہیں نظر آتی تھیں۔ علینہ سوشل تھی، نہ ہی گھریلو کاموں کی کوئی شدبد رکھتی تھی۔ اسے فیشن میں کوئی دلچسپی تھی نہ ہی دنیا کے متعلق اپنی معلومات بڑھانے میں۔ نادیہ، علینہ کی شخصیت کو دیکھتی اور کڑھتی تھیں لیکن اپنے ہاتھوں وہ اسے جن خطوط پر اٹھا چکی تھیں، وہ خطوط پختہ ہوتے نظر آرہے تھے۔ کبھی کبھی وہ اللہ کا شکر ادا کرتیں کہ وقت پر انہیں عقل آگئی تھی جو انہوں نے علینہ کو مزید پڑھنے کی اجازت دے دی تھی اور علینہ کی بدشوقی بھی کم از کم پڑھنے کے معاملے میں شوق میں ڈھل گئی تھی۔

''اب جا کر اگر میں اس کے معاملات میں دلچسپی لینے لگوں، یہ دیکھنے کی کوشش کروں کہ وہ یونیورسٹی سے آنے کے بعد کیا کرتی رہتی ہے تو شاید اسے یہ مداخلت اچھی نہ لگے کیونکہ وہ اس کی عادی ہی نہیں۔'' کبھی انہیں یہ خیال ستاتا۔ ''اس کے بچپن سے اب تک میں نے اس کے ساتھ رعب داب، ڈسپلن پسند ماں کا سا رویہ رکھا، میرے لاشعور میں تو شاید اپنی ناکام زندگی کے اسباب کلبلاتے تھے مگر کبھی میں نے ٹھہر کر یہ کیوں نہیں سوچا کہ ان اسباب میں علینہ کا تو کوئی قصور نہیں تھا بلکہ وہ تو خود بھی میری ناسمجھیوں اور بے عقلی کے فیصلوں کا شکار ہوئی۔ گھر والوں سے بغاوت کر کے شادی کے نتیجے میں وہ وجود میں آگئی پھر اپنے باپ کی بے وقت موت کے بعد میرے روزی روٹی کمانے کی تگ ودو میں وہ سراسر عدم توجہی کا شکار ہوئی اوپر سے میری سخت گیر طبیعت نے اسے پنپنے اور خود اپنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کا عادی ہی نہیں بننے دیا۔'' اس شام بھی وہ اپنے کلینک میں بیٹھی مریضوں کی آمد میں وقفے کے دوران اپنا بے رحمانہ تجزیہ کرنے میں مصروف تھیں۔

''جلنے اور کڑھنے کے بجائے اب بہتر حل یہ ہے کہ کچھ دیر علینہ کو آزادی دے کر خود انحصاری کا عادی بننے دینا چاہیے اور بغور مشاہدہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنے لیے کیا اور کیسے فیصلے کرتی ہے۔'' انہوں نے اپنے طور پر اپنی الجھنوں سے نکلنے کا فیصلہ کرتے ہوئے سوچا۔ اسی وقت ان کے کلینک کے ریسپشنسٹ نے انٹرکام پر انہیں اگلے مریض کی آمد کی اطلاع دی۔

''ہاں، بھیج دو۔'' انہوں نے خود پر پیشہ ورانہ موڈ طاری کرتے ہوئے جواب دیا۔

''جی...... فرمایئے......'' آنے والے مریض سے ریسپشنسٹ کے ہاتھ سے تیار کردہ پیشنٹ فائل لیتے ہوئے انہوں نے آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگاتے ہوئے سوال کیا۔

''السلام علیکم آنٹی...... آئی ایم سوری میں یہاں اپنا معائنہ کرانے نہیں بلکہ آپ سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔'' جواب میں ان کے سامنے بیٹھے نوجوان نے مسکرا کر کہا۔

''آں ہاں......'' ان کے چشمے کے اوپر سے خود کو دیکھنے پر وہ انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''بے فکر رہیے، معائنہ فیس میں نے ریسپشن پر جمع کروادی ہے، آپ کا وقت بلا معاوضہ لینے کی گستاخی نہیں کروں گا میں۔''

''معاف کرنا بیٹا، میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔'' اپنے مزاج کے خلاف وہ نرمی سے بولیں۔

''میرا نام فہد ہے، فہد رضا، مسز ناجیہ رضا کا بیٹا...... وہی جو آپ کے ہمسائے میں رہتی تھیں، کئی سال

پہلے۔'' لڑکے نے اپنا تعارف کروایا۔

''ہاں، ہاں۔'' وہ آنکھوں سے چشمہ اتارتے ہوئے بولیں۔ ''خوب یاد آیا، ارے بھئی تم کہاں رہے اتنے سال اور تمہاری ممی کیسی ہیں؟ کہاں ہیں؟'' انہیں نہ جانے کیوں اس لڑکے کی آمد پر خوشگوار حیرت ہو رہی تھی۔

☆☆☆

نگین نے انتہائی بور ہوتے ہوئے اس کمرے کے درودیوار کو بلا مبالغہ کوئی دسویں بار دیکھا، کمرے میں کسی متوسط گھرانے کے ڈرائنگ روم ہونے کے تمام لوازمات موجود تھے، یہ اور بات کہ اُن کی میزبان خاتون بار بار اس کمرے کو بیٹھک کے نام سے موسوم کر رہی تھیں۔ دو صوفہ سیٹ، تین چار میزیں، کھڑکی کے پردے، دیواروں پر سجی اللہ، محمد ﷺ کے پاک ناموں سے مزین وال ہینگنگز، ایک بڑا پھولدان جس میں مصنوعی آرائشی بیلوں اور پھولوں پر دو مصنوعی چڑیاں بھی بٹھائی گئی تھیں، سستے ڈیکوریشن پیسز کی کسی دکان سے خریدے پلاسٹر آف پیرس اور شفاف شیشے کے چند گڈے گڑیاں، آئل کلرز میں پینٹ کی ہوئی ایک بھدی پینٹنگ جس میں کسی رہٹ کے چلنے اور گاؤں کے کھیتوں کا لینڈ اسکیپ پیش کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ دسویں بار ان چیزوں کو دیکھتے ہوئے وہ واقعی بہت بور ہونے لگی تھی، جمائی لینے کی خواہش اس کے بند ہونٹوں سے ٹکرا کر واپس مڑ رہی تھی، نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں اور جسم پر تھکان سی طاری ہونے لگی تھی۔ اس کی ساس اور میزبان خاتون ایک دوسرے سے اور ایک دوسرے کے خاندانوں سے تفصیلی تعارف حاصل کرنے میں مشغول تھیں۔

''میرے سوہرے (سسرال والے) امرتسر کے خالص کشمیری تھے، پاکستان بننے کے بعد میرے دادے سوہرے نے کپڑے کا کاروبار شروع کیا تھا بھائی میں، اللہ نے بڑی برکت ڈالی، ٹکیم کا پیسہ سارا جھونک دیا کاروبار میں، ریشمی اور زردوزی کے کام والے کپڑے کے خریدار دوسرے شہروں سے اِدھر آتے تھے ہماری دکان سے کپڑا خریدنے۔'' میزبان خاتون فخر سے بتا رہی تھیں۔

''ہمارے سسر تو پارٹیشن سے پہلے ہی لاہور میں سیٹل ہو چکے تھے۔'' اس کی ساس نے ٹشو پیپر سے پسینہ پونچھتے ہوئے نزاکت سے کہا۔ ''آئرن اسٹیل کا کام تھا اُن کے باوا کا، ماشاءاللہ تب سے چلتی برکت میری شادی کے بعد بھی چلی آ رہی تھی، پھر میرے بیٹے تو پڑھنے لکھنے، اونچی اونچی ڈگریاں حاصل کرنے میں لگ گئے، نوکریوں کی طرف چل پڑے، البتہ میرے جیٹھ کے بیٹے اب بھی باپ، دادا والا کام کر رہے ہیں اور لاہور شہر میں ہی ماشاءاللہ چار چار کوٹھیاں ہیں اُن کی۔'' نگین اس وقت اپنی ساس کے لہجے اور آواز کی چاشنی محسوس کر کے غلبہ پاتی نیند بھگانے میں مصروف ہونے لگی۔ یہ لہجہ یہ آواز کبھی کبھار ہی سننے کو ملتا تھا۔

''پیکے (میکے) میرے جموں کے مہاجر تھے۔'' میزبان خاتون نے اس کی ساس کے برعکس کھُردرے لہجے میں کہا۔ ''پہلے سیالکوٹ آئے پھر پسرور شفٹ ہو گئے، پسرور میں ماشاءاللہ میرے بھائیوں کا تھوک پرچون کا کاروبار ہے، شہر کے نام والے تاجروں میں ...شمار ہوتے ہیں وہ، یہ اونچے چوبارے ہیں سب کے دکھروں وکھ......''

''جموں کے مہاجر ......!'' ساس نے جیسے ذرا ناگواری سے دُہرایا۔ ''ہمارے خاندان میں جموں والوں سے رشتہ جوڑنے کا کم ہی رواج ہے۔''

''آئے ہائے تو یہ جو آپ کی نوں رانی ہے۔'' میزبان خاتون نے نگین کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ بھی تو جموں سے سیالکوٹ کی ہے، سیالکوٹ میں کشمیری آسمان سے آ کر تو نہیں ٹنگ گئے تھے۔''

''ارے کمال کرتی ہیں آپ، نگین کے میکے والے کوئی ایسے ویسے کشمیری نہیں ہیں اس کے دادا، پردادا کشمیر سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے تھے......اس کے پردادا والیِ ریاست کے دربار میں اعلیٰ عہدے دار تھے، کئی شکاروں کے مالک، منقش لکڑی کا کاروبار کرنے والے نامور لوگ تھے، ان کے ہاں کے تخ دان اور صندوق ہندوستان کے کونے کونے میں منگوائے جاتے تھے۔'' ساس کی زبان سے اپنے خاندان کے بارے میں ایسی لن ترانیوں نے نگین کی نیند بالکل ہی اُڑا دی۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی، یہ نہیں تھا کہ وہ اس کے خاندان کے بارے میں غلط بیانی کر رہی تھیں لیکن اُن کی حاشیہ آرائی کا کمال تھا جو اس کی نیند یکلخت اُڑ گئی تھی۔

''ہاں جی، اِدھر پاکستان بننے کے بعد تو شاید یہاں خاک ہی اڑتی رہتی جو کشمیری برادری کے ہنرمند اِدھر نہ آتے۔'' میزبان خاتون نے نگین کے خاندان کے بارے میں اس کی ساس کی باتیں سن کر مزید اپنے بارے میں کچھ کہنے کے بجائے بات لپیٹنے کی کوشش کی۔

''آپ یہ پیسٹری کھائیں ناں......اور یہ کیا اسے کہتے ہیں۔'' انہوں نے ایک پلیٹ اس کی ساس کے سامنے رکھی۔ ''پتا نہیں کیا کر کے نام ہے اس کا۔'' انہوں نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''میرے بیٹوں نے گورے والوں سے آرڈر پر تیار کروائی ہے، بیٹا جی بھلا کیا کہتے ہیں اسے؟'' انہوں نے فخریہ نظروں سے نگین کی طرف دیکھا۔

''چکن بریڈ......'' نگین نے نیچی آواز میں کہا۔

''ہاں وہی......'' وہ ہنسیں۔ ''مجھے اتنے اوکھے نام یاد نہیں ہوتے ناں!'' وہ سادگی سے بولیں۔

''آپ کے بیٹے کب آئیں گے؟'' نگین کی ساس نے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

''وہ خیر سے عصر کی نماز پڑھ کر آئیں گے، نماز کے ٹیم (ٹائم) وہ دکان ضرور بند کر دیتے ہیں، نماز کی بڑی پابندی ہے ہمارے گھر میں۔''

''اور آنٹی آپ کی بیٹی کب آئے گی یونیورسٹی سے؟'' نگین نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ جس مقصد کے لیے اس کی ساس اسے یہاں لائی تھیں وہ خاتون کی بیٹی کی آمد پر ہی پورا ہونا تھا۔ ان دنوں اس کی ساس اپنے چھوٹے بیٹے کے لیے لڑکی دیکھنے کی مہم پر تھیں اور لڑکی کو جانچنے پسند کرنے کے سلسلے میں نگین کے دیور نے صرف اور صرف نگین کی پسند پر اعتبار کرنے کا بارود بھرا اعلان کر رکھا تھا، اس کی ساس نے پہلے تو اس بارود بھرے اعلان کو چھیڑنے کی کوشش کی تھی لیکن پھر خطرہ نظر آتے دیکھ کر خاموشی سے اس مہم کے ہر حصے میں نگین کی ہمراہی قبول کر لی تھی۔ یہ تیسری لڑکی تھی جو دو ہفتوں کے اندر دیکھی جا رہی تھی اور اس تیسری لڑکی کی یونیورسٹی سے واپسی، ان دونوں کے اس کے گھر آنے کے ڈیڑھ گھنٹے بعد بھی نہیں ہو رہی تھی۔

''آنے والی ہو گی بس۔'' نگین کے سوال پر میزبان خاتون نے نظریں چرا کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دانت پیس کر زیرِ لب یقیناً اپنی بیٹی کو صلواتیں سنائی تھیں اور پھر نگین کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ''اصل میں اس کی کلاسیں بڑی لمبی ہوتی ہیں، وہ، وہ پڑھ رہی ہے ناں......'' انہوں نے چٹکی میں کوئی نادیدہ چیز پکڑ کر ہوا میں ہاتھ سے لہریں سی بناتے ہوئے کہا۔ ''آرٹشٹ پڑھ رہی ہے کیا اسے کہتے ہیں تصویریں بنانے والے، یہ جو سارے کام کرتے ہیں کاغذوں پر لکیریں کھینچ کھینچ کر۔'' انہیں وضاحت کرنی نہیں آ رہی تھی۔

''جی، جی، وہ تو آنٹی سکینہ نے بتایا تھا، فائن آرٹس پڑھ رہی ہے۔'' نگین نے اُن کی مشکل حل کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں.....'' انہوں نے لفظ کو لمبا کھینچتے ہوئے یوں کہا جیسے اپنی مشکل حل کرنے پر نگین کو شاباش دے رہی ہوں۔ ''نہ صبح ڈھنگ سے ناشتا کر کے جاتی ہے۔'' پھر وہ افسردگی سے نگین کی ساس کو بتانے لگیں۔ ''نہ دوپہر کھانا ٹیم سر (وقت پر) کبھی کھایا، کبھی نہیں کھایا، رات کو بھی تھوڑا سا کھا کے بس، چاول تو کھانے ہی نہیں نا، جیسے قسم کھالی ہے۔'' ان کے لہجے کا دکھ بڑھا۔ ''کہتی ہے وزن بڑھ جاتا ہے چاولوں سے، بھلا بتاؤ وہ کشمیری ہی کیا جو چاول نہ کھائے، جو پائے نہ کھائے، ہریسے اور نہاریاں نہ کھائے، قسم لے لو آپا جی جو اس نے کبھی انگلی سے چھو کر بھی دیکھی ہوں یہ ساری چیزیں، سوکھے توس کھا کر چلی جاتی ہے، دودھ کا گلاس تک نہیں پیتی، شکل پر ہوائیاں اڑ رہی ہوتی ہیں جب واپس آتی ہے، منہ اتنا سا ہو گیا ہے، رنگ کملا گیا ہے۔'' شاید وہ یہ باتیں پیش بندی کے طور پر بتا رہی تھیں تاکہ ان کی بیٹی کو دیکھ کر نگین اور اس کی ساس کو مایوسی نہ ہو۔

''پڑھنے والے بچوں کا آج کل ہر جگہ یہی حال ہے۔'' نگین کی ساس نے انہیں شاید تسلی دی تھی، اسی دم خاتون کے بیٹوں کی آمد پر یہ گفتگو اسی جگہ ختم ہو گئی۔ بیٹوں سے تعارف جاری تھا جب اس لڑکی کی آمد ہوئی جسے دیکھنے اور جس سے ملنے کے لیے وہ دونوں کب سے وہاں بیٹھی تھیں۔

وہ متناسب جسم اور روایتی کشمیری سرخ و سفید رنگت، تیکھے تیکھے نین نقش کی حامل مجموعی طور پر ایک خاصی قبول صورت لڑکی تھی۔ نگین کو پہلی نظر میں وہ لڑکی اچھی لگی تھی۔ اسے حیرت بھی ہو رہی تھی۔ اس گھر، گھر کے باقی مکینوں اور ماحول سے وہ بالکل مختلف نظر آ رہی تھی، اس نے گھر میں آئے مہمان دیکھ کر احتراماً انہیں سلام کیا اور پھر اندر جانے کے لیے مڑ گئی۔ شاید اسے مہمانوں کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا۔

''بیٹھ جاؤ بینش، مہمان تمہارے انتظار میں ہی بیٹھے تھے۔'' اس کی والدہ نے اسے گھرکتے ہوئے کہا تھا۔

''کوئی بات نہیں، وہ تھکی ہوئی ہے اسے فریش ہو لینے دیں۔'' نگین نے اس کی طرف داری کرتے ہوئے کہا اور اپنے دیور کے رشتے کے سلسلے میں اپنا کردار نبھاتے ہوئے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''چلو بینش تمہارے کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں، وہیں تھوڑی گپ شپ بھی ہو جائے گی۔''

بینش مہمان کو یوں اپنے سر پر مسلط ہوتے دیکھ کر جز بز تو ہوئی لیکن مروتاً کچھ بولے بغیر اسے اپنے ساتھ لے آئی، وہ گھر اس علاقے کے روایتی گھروں سے چنداں مختلف نہ تھا، کشادہ صحن، صحن کے چاروں طرف محرابی برآمدہ اور برآمدے کے چاروں طرف کمرے، انہی قطار در قطار کمروں میں سے ایک میں بینش اسے اپنے ساتھ لے آئی، یہ کمرا نئے دور کی ایک مہذب طالبہ کا کمرا ہی لگ رہا تھا۔

''کافی لیٹ فارغ ہوتی ہو تم یونیورسٹی سے، ہے ناں.....؟'' نگین نے بے تکلفی سے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ بینش یقیناً ابھی تک اس کی بے تکلفی کے بارے میں تذبذب میں تھی۔

''نہیں، ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا، آج کل ہم لوگ ایک خاص کمپین تیار کر رہے ہیں اس لیے دیر ہو گئی۔'' اس نے سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا۔

''اچھا!'' نگین مسکرائی۔ ''مجھے بھی بتاؤ گی اپنی کمپین کے بارے میں، مجھے بھی کسی زمانے میں آرٹ سے خاصا لگاؤ ہوا کرتا تھا۔'' وہ اس لڑکی سے ابتدائی تعارف حاصل کر لینا چاہتی تھی تاکہ واپس گھر جا کر اپنے دیور کو رپورٹ دے سکے۔

''نہیں، یہ آرٹ کمپین نہیں ہے۔'' لڑکی اٹھتے ہوئے بولی۔ ''یہ ہم ایک دو اسٹوڈنٹس کی اپنی ذاتی کمپین ہے، کسی گمشدہ کی تلاش کے سلسلے میں۔''

"چلو جی، یہ بھی کسی گمشدہ کی تلاش میں ہیں۔" نگین نے بینش کے کمرے سے جانے کے بعد لمبی سانس لیتے ہوئے سوچا۔ اس کے سامنے بیڈ پر وہ فائلز رکھی تھیں جو کچھ دیر پہلے بینش کے ہاتھ میں تھیں، اس نے بے دھیانی میں اوپر والی فائل کا کور کھول دیا، کور کے اندر ایک سے سائز کے کتنے ہی ایسے کاغذ رکھے تھے جن پر اسکین کی ہوئی تصویر پرنٹ ہوئی تھی اور نیچے موٹے حروف میں ایک عبارت درج تھی۔ "آج کا سوال...... یہ تصویر میرال صلاح الدین نامی لڑکی کی ہے؟ اگر ہے تو کون بتائے گا اس نیک نام، باعزت لڑکی کو اس مقام تک پہنچانے والے ہاتھ کس کے ہیں جہاں آج یہ موجود ہے۔"

"میرال صلاح الدین۔" نگین کے دماغ میں روشنی سی کوندی۔ "یہ نام تو بہت مانوس سا ہے...... میرال صلاح الدین!" اس نے ایک بار پھر ذہن میں دُہرایا۔

"آئی ایم سوری......" اسی اثنا میں بینش ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹرے اٹھائے کمرے میں چلی آئی۔ "میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا اور اس وقت مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔"

"اوہ...... کوئی بات نہیں۔" نگین نے دوستانہ انداز میں کہا۔ "تم بے تکلفی سے بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔"

"آپ لیں گی۔" اس نے چپاتی پر رکھی بھجیا کو چپاتی میں رول کر کے کھانے سے پہلے نگین کو دعوت دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں، میں چائے پی چکی ہوں۔" نگین نے ہاتھ اٹھا کر منع کرتے ہوئے کہا اور دلچسپی سے بینش کو رول چپاتی، چائے کے ساتھ کھاتے ہوئے دیکھنے لگی۔

"ویسے میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" وہ کھانا کھاتے ہوئے بولی۔ "میرا خیال ہے کہ ہم پہلی بار مل رہے ہیں۔"

"یقیناً۔" نگین مسکرا کر بولی۔ "میں اور آنٹی میرا مطلب ہے میری ساس، پہلی بار تمہارے گھر آئے ہیں تم سے اور تمہاری امی سے ملنے۔"

"اچھا......" وہ ہاتھ روکتے ہوئے بولی۔ "خیریت؟"

"ہاں خیریت...... بس یونہی ملنے چلے آئے۔" نگین نے اسے تسلی دینے کی خاطر کہا۔ "میرا خیال ہے آنٹی اور تمہاری امی کی پہلے سے کچھ واقفیت ہے۔"

"اچھا۔" اس نے رک کر غور کرتے ہوئے کہا۔ "ہوسکتا ہے۔" پھر وہ شانے اچکا کر بولی اور دوبارہ کھانے میں مصروف ہوگئی۔

"بینش!" نگین نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "برا مت منانا، میں نے بے دھیانی میں تمہاری یہ فائل کھول کر دیکھ لی۔"

"کون سی۔" وہ ایک بار پھر رک کر بولی۔ "اچھا یہ...... کوئی بات نہیں۔" اس نے فائل پر نظر ڈالنے کے بعد بے نیازی سے کہا۔

"بینش، یہ میرال صلاح الدین کون ہے؟" نگین نے اس کے برا نہ منانے پر شکر کرتے ہوئے اگلا سوال کیا۔

"یہ......" وہ کھانا ختم کر کے اٹھتے ہوئے بولی اور ٹشو پیپر باکس سے ٹشو پیپر نکال کر ہاتھ اور منہ صاف کرتے ہوئے نگین کے سامنے آبیٹھی۔ "یہ ایک گمشدہ لڑکی کا نام ہے۔" اس نے فائل کھول کر ایک کاغذ نکالا اور اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "ہمارا خیال ہے کہ یہ تصویر اس لڑکی کی ہے۔" اس نے تصویر نگین کی نظروں کے سا

کی۔ "لیکن آپ دیکھیں یہ تصویر دیکھ کر کسی شریف لڑکی کا نہیں بلکہ کسی طوائف کا خیال آتا ہے...... آتا ہے نان......؟" اس نے تائید طلب نظروں سے نگین کی طرف دیکھا۔

"ہاں شاید......" نگین نے گھومتے دماغ کے ساتھ سر ہلایا۔

"بس ہم اسی کھوج کی مہم شروع کر رہے ہیں کہ یہ لڑکی اگر میرال صلاح الدین ہی ہے تو پھر اس جگہ کیسے پہنچ گئی۔"

"لیکن میرال صلاح الدین کون ہے آخر......؟" نگین نے گھومتے ہوئے ذہن میں اٹھتے خدشے کو سوال کی شکل میں ڈھالتے ہوئے کہا۔

"میرال صلاح الدین ایک انتہائی شریف اور اعلیٰ نسب خاندان کی لڑکی تھی، اس کا تعلق آزاد کشمیر سے تھا۔ دو ہزار پانچ کے زلزلے کے دوران یہ لڑکی اچانک غائب ہوگئی اور پھر اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ کسی نے اس کا سراغ لگانے کی کوشش اس لیے بھی نہیں کی کہ اس کا کوئی قریبی رشتے دار تھا نہ ہی عزیز...... صرف ایک دادی تھیں جو زلزلے کا شکار ہوگئیں۔" بینش نے رک کر نگین کی طرف دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اس کہانی کا اس پر کیا اثر ہو رہا تھا، اس کی توقع کے برعکس اس کی سامع کے چہرے کا رنگ فق ہو رہا تھا۔

"لوگوں کو...... میک بلیف (make belief) یقین کر لینے والی پچویشن میں لانا کتنا مشکل ہے، اس کا تو ہمیں پچھلے دو دن میں بخوبی اندازہ ہو چکا۔" یہ کہتے ہوئے اسے کیمپس کے در و دیوار اور درخت یاد آرہے تھے جن پر یہ ہینڈ بلز جو دانیال نے بنائے تھے چسپاں تھے اور طلبا نے ان پر درج عبارت کی گہرائی میں جانے کے بجائے ان پر الٹے سیدھے ریمارکس لکھے ہوئے تھے۔ کیوں نے اس تصویر کی شکل بگاڑتے ہوئے اس پر مارکرز سے داڑھی، مونچھیں بناتے ہوئے بے ہودہ شعر لکھ دیے تھے لیکن اس وقت جس لڑکی کو وہ میرال صلاح الدین کی کہانی سنا رہی تھی، اس کے تو لگ رہا تھا کہ دل پر یہ کہانی ویسا ہی اثر کر رہی تھی جیسا پہلی بار یہ تصویر دیکھنے پر دانیال کی ممی پر ہوا تھا۔

"اسی وجہ سے کئی سال تک کسی نے اس کے بارے میں یہ جاننے اور اس کا پیچھا کرنے کی زحمت نہیں کی۔" اس نے نگین کو دوبارہ سے کہانی سنانا شروع کی۔ "لیکن گزشتہ دنوں ایک مقامی اخبار میں اس کی یہ تصویر شائع ہوئی اور اسے ایک نو آموز سیاست داں کی داشتہ قرار دیا گیا۔" یہاں تک اپنی بات سناتے ہوئے بینش کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔ اس کی مخاطب تو لگتا تھا یہ کہانی یہیں تک سن کر بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔

"وہ تصویر اتفاق سے ہمارے ایک کلاس فیلو کی مدر نے دیکھ لی، وہ میرال صلاح الدین کو کسی حوالے سے جانتی تھیں، اس کی تصویر اور اس کا یہ کال گرل والا حوالہ دیکھ کر وہ سخت پریشان ہوئیں، انہوں نے اپنے بیٹے کو اس کی کھوج لگانے کا کہا اور ان کے بیٹے نے اس کھوج کو ایک مہم بنا ڈالا۔ ہم چند لوگ اس مہم کا حصہ بن گئے ہیں اور ابھی تک اس کے بارے میں یہ معلوم ہوا ہے کہ میرال صلاح الدین امدادی کیمپ سے غائب ہوگئی تھی، وہاں سے یہاں تک کا سفر کیسے طے ہوا اور اب یہ لڑکی کن ہاتھوں میں ہے، یہی جاننا ہماری جدوجہد ہے۔" وہ سانس لینے کو رکی۔

"بینش کیا تم چند ہینڈ آؤٹس مجھے بھی دے سکتی ہو؟" اسے نگین کی لرزتی آواز سنائی دی۔ نگین یکا یک بھول گئی تھی کہ وہ اس گھر میں کس مقصد کے لیے آئی تھی، وہ حیران تھی قدرت کے اس اتفاق پر جس کی وجہ سے اسے بینش کی فائل میں رکھے ان ہینڈ آؤٹس تک رسائی ملی اور پھر اس کی تفصیل جاننے کا موقع اور وہ پریشان تھی

اسے کیا سننے کو مل رہا تھا۔ اسے رہ، رہ کر حمزہ کا خیال آرہا تھا۔ جس لڑکی کی تلاش میں وہ مارا، مارا خوار ہو رہا تھا وہ کہاں موجود تھی۔ "کیا کبھی اسے یہ خیال آیا ہوگا؟" کانپتے ہاتھوں سے بینش سے چند ہینڈ آؤٹس جو اس نے اسے بخوشی تھمائے تھے لیتے ہوئے اس کا معمول سے زیادہ تیزی سے دھڑکتا دل سوچ رہا تھا۔

"آپ بھی پلیز اس کھوج کو ایک مہم بنانے میں ہماری مدد کیجیے۔" بینش نے اس سے التجائیہ انداز میں کہا تھا۔

"ضرور......" اس نے بدقت سر ہلایا تھا۔

"تم تو ایسا گئیں لڑکی کے ساتھ کہ واپس آنے کا نام ہی نہیں لیا آخر تک، آخر کیا راز و نیاز ہو رہے تھے ان سے؟" بینش کے گھر سے واپسی کے سفر میں اس کی ساس نے مشکوک ہوتے ہوئے سوال کیا تھا۔ یقیناً انہیں خدشہ تھا کہ اس نے اپنی ممکنہ دیورانی کو ضرور اُن کے مزاج اور عادات کی کہانی سنائی ہوگی اور اسے بچ جاؤ کا بورڈ بھی دکھایا ہوگا۔

"کچھ خاص نہیں۔" اس کے الجھے ہوئے ذہن میں اُن کی بات کے فوری جواب کی ہمت نہیں تھی۔

"صاحبزادے کے دماغ میں ہی خناس بھرا ہے کہ جہاں جایا جائے بھائی کو ساتھ لے کر جایا جائے۔" اس کے مختصر سے جواب پر بھنا کر خود کلامی کے انداز میں بولی تھیں۔ "چاہے بھائی ہر جگہ جا کر معاملہ چوپٹ کرتی پھرے۔" انہوں نے ناگواری سے سر جھٹک کر چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔ لیکن ان کی کسی بات کے جواب میں اپنی صفائی دینے کی پوزیشن میں نہیں تھی، اس کی نظروں کے سامنے رہ، رہ کر حمزہ کی وہ حالت آرہی تھی جو اسے وہ ہینڈ آؤٹ دکھانے کے ردِعمل پر ہونے والی تھی۔

☆☆☆

"تم جانتی ہو کہ مجھے دنیا میں کسی بھی بات سے زیادہ اس بات پر خوشی ہو رہی ہے کہ تم زرنگار نہیں میرال صلاح الدین ہو۔" کمرے کے خاموش ماحول میں مہرزاد کی بھاری آواز گونجی۔

"بہتر نہیں ہوگا کہ اگر آپ میرا حالیہ نام لینا پسند نہیں فرماتے تو یہ نام بھی مت لیں جو ماضی کے گورستان میں دفن ہو چکا۔"

"ہم ماضی کے دفینوں کو ہی تو کھودنے والے ہیں۔" مہرزاد نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے سوال کر رہا ہو کہ کیا وہ ایسا نہیں کرنے والے تھے۔

"میرے ہاتھ میں کھدائی کے اوزار ہیں نہ ہی اب یہ ہاتھ... کھدائی کے قابل رہے ہیں لہٰذا ان دفینوں کو دفن ہی رہنے دیا جائے۔" اس نے نیچی آواز میں کہا۔

"تم نے اپنے کارڈز میز پر رکھنے کا پیغام بھیجا تھا، بھیجا تھا ناں......؟" مہرزاد نے اس سے تصدیق چاہی۔

"اور رہی اوزاروں کی بات......" اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "تو اوزاروں کی فکر مت کرو۔" وہ اس کے بالکل قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میرے ہاتھ تمہارے اوزار ہیں۔" اس نے اس کے گھٹنے کے گرد بندھے ہاتھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ہم ان ہاتھوں سے ماضی کے دفینے کھودیں گے۔"

زرنگار کو مہرزاد کا خود سے اتنا قریب موجود ہونا نئے اندیشوں میں ڈال رہا تھا۔ "کیا آدمیوں کے ہجوم میں شامل ہو کر یہ شخص بھی انسان ہونے کی شناخت کھونے جا رہا ہے؟" اس کا دل رکنے لگا۔ "کیا برسوں بعد قائم ہوتا، بڑھتا، پنپتا، پھولتا اعتماد ایک بار پھر ٹوٹنے والا ہے؟" اس کی آنکھوں میں مرچیں بھر گئیں۔ "کیا ہے میری اوقات؟" اس نے خود سے سوال کیا۔ "ایک تنہا اور بے بس لڑکی جو اس وقت اس چھت کے نیچے، اس کمرے کی تنہائی میں اس طاقت ور مرد کے اختیار میں ہے، اختیار بھی وہ جو پیسے کی طاقت سے خریدا گیا ہے، کیا اب اس وقت دنیا کی کوئی طاقت اس مرد کو اس کے کسی شیطانی ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے روک سکتی ہے؟" اس کا دل خوف کی گہری کھائی میں جا گرنے کو تھا۔

"بس۔" اسی لمحے وہ اس کے قریب سے اٹھ کر کمرے کے دوسرے کونے میں جا کھڑا ہوا۔ "اتنا ہی اعتبار تھا، اتنا ہی اعتماد......" "تو کیا وہ اس کے اعتبار اور اعتماد کی آزمائش کر رہا تھا...... اس کے ذہن میں جھما کا ہوا............ اس نے گردن موڑ کر سردار مہرزاد خان کی طرف دیکھا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں کوئی فرشتہ نہیں ہوں، گوشت پوست کا انسان ہوں، ابلیس میرے پیچھے لگا رہتا ہے...... میں کوئی ولی ہوں نہ اوتار، نفس میرے ساتھ بھی ہے اور نفس کو ہوس کا روپ اختیار کرتے لمحہ بھر کی دیر نہیں لگتی۔" اس آواز بھاری ہونے لگی۔

"اس لیے مت لو میرے نفس کا امتحان...... مجھے ایکسپلور کرنے کا جنون ہے، میرا یہی جنون مجھے تمہیں جان لینے کی راہ پر لے آیا ہے، میں تمہیں تمہاری اس شخصیت کو جو اصل میں تمہاری ہے اور اس ماضی کو جو تمہارا تھا، جان لینے کے جنون کا ہی تو قصور دار ہوں...... پلیز اس قصور کی اتنی کڑی سزا نہ دو مجھے۔" وہ بے بسی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"آپ کو ایکسپلوریشن کا شوق ہے، کیچڑ میں کھلے پھول تک رسائی کا شوق، کیکر کی جھاڑیوں میں اُگے پھول تک رسائی کا شوق، بدصورتی میں چھپی خوب صورتی کو نظر بھر کے دیکھنے کا شوق......" وہ اپنے اعتبار اور یقین کے بچ جانے پر شکر کا کلمہ پڑھتے ہوئے بولی۔

"اس لیے ناں کہ ان سب تک رسائی حاصل کر کے کسی فاتح کی طرح بندوق اٹھائے انہیں اپنے قدموں میں ڈالے، دنیا کو دکھانے کے لیے ایک تصویر بنا سکیں اور اسے بتا سکیں کہ آپ کی فتوحات کا سلسلہ صرف سیاست کے میدان تک ہی محدود نہیں بلکہ آپ انسان، حیوان، چرند، پرند، زمین، خلا، آسمان سب فتح کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔"

"کم آن......" وہ اس کی بات پر برا مناتے ہوئے بولا۔ "مجھے کسی بھی قسم کی فتح کا کوئی شوق نہیں، اگر میرا مقابل مجھ سے زیادہ ماہر جنگجو ہو تو...... مجھے کبھی بھی اس کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے احترام میں اپنے ہتھیار پھینک دینے میں کوئی باک نہیں ہوگا...... ہاں مقابل کو مجھے کنونس کرنا ہوگا کہ وہ ہر فن میں مجھ سے آگے ہے۔"

"پھر......؟" اس نے اپنی گہری آنکھوں کے بھاری پپوٹے اٹھاتے ہوئے سوال کیا۔

"پھر یہ کہ اپنے باقی چھپے کارڈز بھی میز پر رکھ دو، ہم جوکر سے بادشاہ تک ہر کارڈز کو جانچیں گے کچھ اس طرح سے کہ یکے تک بہ آسانی پہنچ سکیں۔"

"جانے دیں سردار صاحب، بغیر کسی جرم کے ہی سہی کسی چہرے پر ایک بار کالک مل دی جائے تو پھر وہ چہرہ مقدس ترین پانیوں سے بھی دھولیں کالک زدہ ہی رہتا ہے، میرا ماضی جو بھی اور جیسا بھی تھا، وہ حالات اور واقعات کی کالک سے رنگا جا چکا ہے، آپ کے سب جتن مل کر بھی اس کالک کو دھو کر اس کا اصل چہرہ نہیں کھوج سکیں گے۔"

"جو میری ذمے داری ہے اسے میری ذمے داری رہنے دو۔" وہ اس کی بات سے ذرا سا بھی ہوئے بغیر بولا۔ "تم وہ کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔"

"کیا آپ جانتے ہیں کہ اس وقت بھی آپ کی یہاں موجودگی کسی کن رس تک رسائی پا گئی تو آپ کا روزہ فتح ایک شرمناک اسکینڈل کے حوض میں غوطے کھانے لگے گی۔"

"مجھے بیرونی اور مفروضوں پر مبنی خطرات سے ڈرانے کی کوشش بیکار ہے میرال صلاح الدین ... کرنے کا فیصلہ کرلیتا ہوں کرکے رہتا ہوں ...... اس سلسلے میں میرا موٹو میرے ماتھے پر لکھا نظر آنا چاہ... تمہیں جو صرف دو الفاظ پر مشتمل ہے who اور dares صرف دو الفاظ پر۔" وہ پُر اعتماد آواز کے ساتھ...

"ایک ہزار راتیں۔" زرنگار کی خاموشی پر اس کی آواز بلند ہوئی۔ "جن میں سے کئی راتیں بیکار گئیں...... بیکار......" اس نے زرنگار کی طرف دیکھا۔ "ایسے بھی بیکار اور ویسے بھی بیکار......" اس کا لہجہ مع... ہوا۔ اب جو باقی رہ گئی ہیں انہیں کارآمد بنانے کی کوشش تو کرنی چاہیے۔ کارآمد۔" اس کی آواز ایک بار... بلند ہوئی۔ "کسی رنگ ہی میں سہی......" وہ دو قدم آگے بڑھا...... زرنگار نے اپنے اور اس کے درمیان مو... فاصلے کو نظروں سے جانچا۔

"میرے اور اس کے درمیان...... "وہ" موجود ہے۔" اس نے خود کو ایک بار یقین دلانا شروع کیا۔

"اور...... "اس" کے ہوتے ہوئے یہ مجھ تک نہیں پہنچ سکتا۔" اس کا یقین ایک بار پھر مضبوطی پکڑ... لگا۔ "ہاں شاید...... "وہ" بھی یہ چاہتا ہے کہ کیچڑ میں کھلے جس پھول تک اس کو رسائی مقصود ہے وہ اسے... چاہیے کیونکہ آزمائش تو اس کی بھی ہو رہی ہے، امتحان تو اس کا بھی لیا جارہا ہے پھر کیوں ناں اسے امتح... گاہ سے جتنا جلد ممکن ہو فارغ کردیا جائے۔" اس نے سر اٹھا کر ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا جو اپنی... پر ساکت کھڑا تھا۔

"میرا تعلق صوبہ سرحد کے شہر ایبٹ آباد سے تھا۔" اس نے کہنا شروع کیا۔ اس کے مخاطب کے کان کُھ... تھے اور کھڑے بھی......

☆☆☆

شہر سے قدرے ہٹ کر ایک نسبتاً نئی اور کھلی آبادی میں نادر کا گھر تھا۔ وہ روٹ وین سے اتر کر پیدل چ... ہوئے ایک کشادہ گلی میں آگئے۔ ذوالقرنین اس سے آگے چل رہا تھا اور زوئی اگرچہ حتی الوسع اپنا... اسکارف سے ڈھکنے کی کوشش کررہی تھی لیکن اسے اندازہ ہورہا تھا کہ قریب سے گزرتے اور راستے میں کھڑ... مرد و خواتین ایک دفعہ رک کر ضرور اس کی طرف دیکھتے تھے۔

"بس یہ ایک منفی عادت نہ ہو یہاں کہ لوگوں میں تو کیا ہی بات ہے، رک کر یوں دیکھتے اور گھورتے... جیسے کوئی عجوبہ ان کے درمیان آگیا ہو۔" اس نے سوچا تھا۔

"یہ بس تین گھر چھوڑ کر آگے نادر کا گھر ہے۔" ایک جگہ رک کر ذوالقرنین نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا......" زوئی نے رک کر اس تیسرے گھر کے گیٹ کی طرف دیکھا۔

"تم جاؤ، بیل دو، جو بھی کوئی باہر آئے اس سے بات کرلینا۔" ذوالقرنین نے پیچھے کی طرف مڑ... ہوئے کہا۔

"تم کہاں جارہے ہو ذوالقرنین؟" زوئی نے حیرت سے ذوالقرنین کی طرف دیکھا۔

"میں آگے نہیں جاؤں گا زوئی۔" ذوالقرنین نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"مجھے نادر کی امی اور بہنوں سے خوف آتا ہے، اُن کے لمبے لمبے سوالوں کے جواب کون دے، اوپر سے نادر بھی غائب ہے، تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر تو وہ یہی سمجھیں گی کہ میں مینڈک اور سانپ کھانے والی قوم کی ایک لڑکی ساتھ لے آیا ہوں اُن کے گھر...... توبہ، توبہ ان کی غضب ناک نظروں کا سامنا میں تو نہیں کرسکتا۔" اس نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "چھوت چھات کے مرض میں مبتلا ہیں وہ، کہیں گی مینڈک اور چوہے کھانے والی کو ہمارے گھر لاکر ہمارے صوفے پر بٹھادیا، مروتاً ہمیں اپنے برتنوں میں اسے چائے شربت پلانا پڑی، بعد میں صوفہ دھونا اور برتن توڑنے پڑیں گے۔" ذوالقرنین زیرِلب مسکراتا واپسی کے لیے آگے بڑھ گیا۔

"ہاں، مینڈک اور چوہے کھانے والی قوم ہے۔" اپنے مزاج کے بالکل برعکس زوئی نے ذوالقرنین کو... بآواز بلند مخاطب کیا۔ "اسی قوم کے بنائے ہوئے برتن استعمال کرتے ہو، تھیلوں اور فٹ پاتھوں سے اسی قوم کے دماغ کے شاہکار خریدتے ہو، اپنے گھر ان چیزوں سے سجاتے ہو، تمہارے گھروں میں تم لوگوں کے اپنے علاوہ ہر طرف چائنا کا مال ہی بھرا ہوتا ہے جانتے ہوئے بھی کہ ہم اس مال پر کوئی گارنٹی نہیں دیتے، خریدے چلے جاتے ہو چائنا کا ریشم، چائنا کا شیفون، جوتے، ہینڈی کرافٹس، ڈیکوریشن پیس تمہاری زندگیوں میں رچ بس چکے ہیں...... اس کا مطلب ہر دوسری چیز پلید ہے تمہارے گھروں میں، چوہے، مینڈک اور سانپ کھانے والی قوم کی بنائی چیز۔" اس نے زور سے پیر زمین پر مارا۔

ذوالقرنین نے اس کے ردِعمل پر دانت نکوستے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر اس گفتگو سے محظوظ ہوتا آگے بڑھ گیا۔ ذوالقرنین سڑک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ زوئی نے سر جھٹکتے ہوئے اپنے اردگرد دیکھا...... دو تین خواتین اسے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

"اوہ......" اسے خجالت محسوس ہونے لگی...... وہ تو بہت ٹھنڈے دماغ کی مالک تھی، اسے سال میں شاید ایک بار ہی کسی بات پر غصہ آتا تھا اور اس طرح کا ردِعمل تو شاید ہی اس نے کبھی ظاہر کیا ہو۔ "بس جو پریشانی سر پر سوار ہے اس نے ایسا کرادیا۔" وہ معذرت خواہانہ نظروں سے ان خواتین کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ اس نے اپنے روایتی انداز میں مسکراتے ہوئے سر ایک طرف بہوڑاتے ہوئے ان خواتین کو اپنے تئیں خدا حافظ کہا اور آگے بڑھ گئی۔

اب وہ نادر کے گھر کے گیٹ کے سامنے کھڑی تھی، گھر کے دو گیٹ تھے، ایک بڑا اور دوسرا اس کے ستون اور بیرونی دیوار کے درمیان گڑا چھوٹا گیٹ جس کے باہر بنی دو، تین سیڑھیاں اس تک پہنچاتی تھیں۔ کال بیل اس گیٹ کے ساتھ لگی تھی۔ اس نے کال بیل کے بٹن کو دبایا اور خود سر اٹھا کر اس گھر کی عمارت کو دیکھنے لگی۔ بیرونی دیوار کو بوگن ویلیا کی بیل نے ڈھک رکھا تھا اور اس میں آتشی اور سفید پھول بکھرے ہوئے تھے۔ چند لمحوں بعد اسے گھر کے اندر سے کسی کے پیر گھسیٹتے چلتے آنے کی آواز سنائی دی۔

"کون ہے؟" ایک زنانہ آواز تھی اور یقیناً کسی بڑی عمر کی خاتون کی آواز تھی۔

"مہربانی سے دروازہ کھولیں۔" زوئی نے اپنی باریک سی آواز میں درخواست کی۔

"ہو کون تم......؟" اندر سے آواز آئی ساتھ ہی گیٹ کا لاک کھلنے کی آواز آئی۔ ایک بڑی عمر کی خاتون نے ذرا سا گیٹ کھول کر باہر جھانکا اور زوئی کو اپنے سامنے پاکر ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگیں۔ زوئی کا دل دھک، دھک کررہا تھا۔

''اچھا.....'' انہوں نے زوئی کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلایا جیسے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں، ان کے چہرے پر انتہا درجے کی سنجیدگی برس رہی تھی۔

''اندر آجاؤ۔'' پھر انہوں نے گیٹ پورا کھولتے ہوئے کہا۔ زوئی اپنی ٹانگوں کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگئی۔

''ٹھہرو..... میں گیٹ بند کرلوں۔'' خاتون نے اپنے سفید ململ کے دوپٹے سے چہرہ پونچھتے ہوئے جھک کر نظریں بالکل ہی لاک کے قریب کرتے ہوئے اس کا کلپ ڈھونڈنا شروع کیا۔ لاک لگانے میں انہیں منٹ لگے، اس دوران زوئی رنگ برنگ پتھر جڑے اس گیٹ وے کو دیکھ رہی تھی جس پر اس وقت وہ کھڑی تھی۔ گیٹ وے کے آخر میں چھوٹا سا ایک گیرج تھا جس میں اس وقت صرف ایک سائیکل کھڑی تھی۔

''ہوں۔'' لاک سے نمٹ کر خاتون زوئی کی طرف مڑیں۔

''یوں نہیں آتے اچانک۔'' انہوں نے اپنی سانس کے زیروبم کو قابو کرتے ہوئے کہا، اتنی سی مشقت میں ان کی سانس پھول رہی تھی۔

زوئی نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

''اطلاع دے کر آتے ہیں۔'' انہوں نے اس کی نظروں کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا اور اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر آگے کی طرف چلیں، زوئی بھی ان کے ساتھ چلنے لگی۔

''مجھے پتا ہوتا تو میں تیل کی شیشی تو پکڑ لیتی ہاتھ میں۔'' وہ آہستہ قدموں سے چلتی کہہ رہی تھیں۔ ''ہمارے گھرانوں میں بہوئیں پہلی بار گھر آئیں تو تیل ڈالتے ہیں دہلیز پر پہلے پھر بہو کو اندر لاتے ہیں۔'' وہ اسے سمجھانا چاہ رہی تھیں۔ ''میں تو گھر میں اکیلی ہوں آج اور تم بغیر بتائے آگئیں، میں نے کیا خاک استقبال کرنا تھا۔'' اُن کے لہجے میں تاسف تھا اور زوئی کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔

''اور یہ کیا.....؟'' پھر وہ اچانک رک کر کھڑی ہوگئیں اور زوئی کی طرف دیکھنے لگیں۔

''گڈی کاٹ کی شلوار کس نے سی دی تجھ انجان بے خبر کو۔'' انہوں نے زوئی کے اہتمام سے پہنی شلوار قمیص پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ دوپٹہ؟'' انہوں نے اس کے اسٹولر کو چٹکی میں پکڑ کر جھٹکا دیا۔ ''بیٹا نہ لباس ہی تو انسان کی شان ہوتا ہے۔'' وہ دوبارہ سے چلنے لگیں۔

''ہمارے گھروں میں ایسی چھوٹی اور تنگ شلواریں قمیصیں نہیں پسند کی جاتیں، دوپٹے بھی بڑے بڑے لیتے ہیں ہم لوگ۔'' وہ اسے اپنے ساتھ لیے برآمدے میں کھلنے والے ایک کمرے کے دروازے سے لے آئیں۔ زوئی نے دیکھا یہ ڈائننگ روم اور ٹی وی لاؤنج نما کمرا تھا، جس کے ایک طرف گول ڈائننگ ٹیبل اور چار کرسیاں رکھی تھیں اور دوسری طرف ایک صوفہ سیٹ، ٹی وی ٹرالی اور ایک بیڈ سجا تھا۔

''بیٹھ جا.....'' انہوں نے ایک ڈائننگ چیئر پر بیٹھتے ہوئے کہا اور اپنی سانس درست کرنے لگیں، زوئی اُن کے سامنے بیٹھ گئی۔

''ایک لحاظ سے اچھا بھی ہوا۔'' پھر وہ سرگوشی کے انداز میں بولیں۔ ''پہلے سے اطلاع کر کے آتیں تو میری بیٹیوں نے سب کام چھوڑ کے چلے آنا تھا اور پھر چل میرے بھائی!'' انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''تیری شامت آجانی تھی۔'' انہوں نے دوپٹا منہ پر رکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔

''میں نادر کی ماں ہوں۔'' پھر وہ دوپٹا منہ سے ہٹا کر بولیں۔ ''جوڑوں کی مریض ہوں، کچھ کام کر

سکتی۔'' انہوں نے اپنے گھٹنوں کی طرف اشارہ کیا۔

''پانی پینا ہے تو خود ہی اٹھ کر پی لو۔'' انہوں نے یوں کہا جیسے کہہ رہی ہوں مجھ سے کوئی توقع نہ رکھنا۔

''لیکن پہلے ٹھہرو.....'' پھر ایک دم اُن کا لہجہ سخت ہوگیا۔ ''نادر تو کہتا تھا کہ پھپنی ہے تو کیا ہوا، گارنٹی مسلمان ہے۔'' انہوں نے سوالیہ انداز میں سر ہلایا۔ زوئی نے جواب میں اثبات میں سر ہلا دیا۔

''مسلمان ہے تو کلمہ تو سنا ذرا.....! پھر ہاتھ لگانے دوں گی کسی چیز کو۔'' زوئی نے کسی فرمانبردار بچے کی طرح سر پر اسٹول رکھ کر بل بل کر کلمہ سنانا شروع کیا۔

''ہوں.....'' کلمہ سن کر انہوں نے امتحان لینے والے استاد کی نظر سے اسے دیکھا۔ ''اور کیا آتا ہے تجھے، چل نماز سنا لیکن ٹھہر نماز نہ سنا الحمد شریف ہی سنا دے۔'' زوئی نے اپنی باریک آواز میں سورۂ فاتحہ سنانا شروع کی۔

''ہاں ٹھیک تو ہے۔'' انہوں نے جیسے اسے کچھ مثبت پوائنٹس دیے..... ''لیکن یہ تو بڑی مصیبت ہے کہ عربی بھی چینی میں سنی پڑ رہی ہے، مارچیاں، پیاں.....'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولیں۔ ''نماز آتی ہے؟'' اگلا سوال آیا۔

''جی الحمدللہ۔'' زوئی نے تیزی سے کہا۔

''چل شکر ہے اتنی عقل تو نادر نے کر لی، نسل تو اس کی پھپنی، چپٹی ہو ہی جانی ہے لیکن مسلمان لڑکی سے نکاح کیا، پھپنی چپٹی ہے تو کیا ہوا۔'' انہوں نے تصدیق کے سرٹیفکیٹ پر گویا مُہر لگاتے ہوئے کہا۔

''اوہ.....'' زوئی کی کب سے رکی سانس بحال ہوئی، نادر کے گھر پر آکر وہ جس قسم کے رویوں کی توقع کر رہی تھی، یہ سب اس کے بالکل برعکس تھا، تشکر کے احساس کے تحت اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

''ماں جی، نادر کہاں ہے؟'' اس نے نادر کی امی کے حوصلہ افزا رویے سے ہمت پکڑتے ہوئے پوچھا۔

''نادر کو پتا نہیں کیا مسئلہ ہے۔'' وہ شکوے بھرے انداز میں بولیں۔ ''مجھے تو کچھ نہیں بتاتے یہ لوگ، صبح نکلتا ہے، شام پڑے گھر واپس آتا ہے، نوکری شوکری پر کوئی نہیں جاتا مجھے پتا ہے۔'' انہوں نے جیسے زوئی سے شکایت لگائی۔

''پتا نہیں کس اور ہی چکر میں ہے، میں نے تو سوچا تھا کہ تیرے پیچھے چین جانے کی تیاری کر رہا ہے، مجھے غم لگتا تھا لو ایک ہی بیٹا تھا وہ بھی گیا مگر تو، تو خود ادھر ہی آگئی ہے، یہ بتا نکاح میں اس نے تجھے کچھ چڑھایا بھی تھا کہ نہیں؟'' وہ بازو میز پر رکھ کر آگے کی طرف جھکیں۔ ''حق مہر کتنا لکھایا تھا پتر نے؟'' انہوں نے ایک اور سوال کیا۔

''شرعی۔'' زوئی نے مختصر جواب دیا۔ ''ماں جی نادر کس وقت گھر آتا ہے؟'' اس نے سوال کیا، اس کا ذہن نادر کی مصروفیت کی تفصیل میں اٹکا ہوا تھا۔

''آجاتا ہے رات پڑے کسی وقت۔'' وہ بے پروائی سے بولیں۔ ''میں تو سوئی ہوتی ہوں اس وقت، اس کے پاس ڈبل چابی ہوتی ہے، آکر پڑ رہتا ہے، میں کون سا اس سے بولتی ہوں۔''

''آپ نادر سے کیوں ناراض ہیں؟'' زوئی نے پوچھا۔

''مجھے بتاتا جو نہیں اسے مسئلہ کیا ہے، میں نے اسے بلانا ہی چھوڑ دیا ہے، خود ہی معافیاں مانگ کر مجھے منائے گا۔'' زوئی کو اُن کی سادگی اور معصومیت پر پیار آگیا۔ اس گھر کے در و دیوار سے سادگی تو ٹپک ہی رہی تھی لیکن ایسا بھی لگتا تھا کہ اس کی صفائی پر کسی کی کوئی خاص توجہ نہیں تھی۔

''یہ ادھر تیسج کے آخر میں جو کمرا ہے وہ نادر کا ہے جا کر کمرا دیکھ لے۔'' پھر انہوں نے زوئی
''میں نے تو کبھی جھانک کر بھی نہیں دیکھا اس کے کمرے میں، سوچتی تھی بہو آئے گی تو اس بے چارے
اس کے کمرے کی سنی جائے گی شاید، بہو نہ ڈھونڈی نہ بارات چڑھانی پڑی، اپنی دو ٹانگوں سے چل
آ پہنچی گھر، اللہ نے میری کمزور ہڈیوں کو رُلنے سے جو بچانا تھا۔'' وہ دوپٹا منہ پر رکھ کر ہنسیں۔ ''گھر
بیٹیاں ہیں نہ بڑی کپتی (لڑاکا) ہیں ساری یہ ہی کہتی ہیں نادر کو میں نے پالا، میں نے پالا، بھلا بتاؤ اس
نے پالا تو میں کیا کھنو (گیند) سے کھیلتی رہی ساری عمر۔'' وہ ہنستے، ہنستے دُہری ہونے لگیں۔ ''انہوں نے
مچاتا ہے تجھے دیکھ کر۔'' پھر وہ رازداری سے زوئی کے قریب جھکتے ہوئے بولیں۔ ''تو بس ایسے کریں،
انہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بس چپ کر کے رہیں، وہ بولتی رہیں، بولتی رہیں
ظاہر کرنا جیسے کچھ سنا ہی نہیں، کہنا مجھے تو اردو سمجھ آتی ہی نہیں، مجھ سے بات کرنی ہے تو جی شنگ ری شنگ کر
ایک بار پھر ہنسنے لگیں۔

''جا، جا کر کمرا دیکھ آ پھر باورچی خانے کی خبر بھی لیتے ہیں کچھ تو دال روٹی تجھے کھلاؤں گی کہ
انہوں نے اپنائیت سے کہا۔ ''پر ایک بات ہے تجھے باورچی خانے کا چارج نہیں دوں گی پورا، خود ہی
کروں گی، تیرا کیا پتا، مرغی کے بجائے مینڈک تل لے، مجھ خاک پٹی کو سمجھ نہیں لگے اور میں کھا جاؤں۔''

''ماں جی میں مسلمان ہوں اور مسلمانوں پر مینڈک حرام ہیں۔'' زوئی نے اس تذکرے پر
ہوتے ہوئے کہا۔

''پتا ہے، پتا ہے تُو مسلمان ہے لیکن رہتی رہی تو، تو اُن کے ساتھ ہی ہے ناں...'' انہوں نے سر ہلایا۔
انہیں دیکھو وہ جو بھارت میں رہتے ہیں، ہیں وہ بھی مسلمان پر سنا ہے راکھیاں، دیوالیاں مناتے ہیں،
کھیلتے ہیں، ساتھ رہنے سے بڑا اثر ہو جاتا ہے بچو۔ جی میں سب جانتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے ماں جی، شاید آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں۔'' زوئی نے اٹھتے ہوئے بے چارگی سے کہا۔ ''میں
دیکھ آؤں؟'' اس نے اجازت طلب کی۔

''ہاں دیکھ لے، دیکھ لے مگر اس کی کوئی چیز اِدھر اُدھر نہ کرنا، بڑا شور مچاتا ہے اگر کوئی چیز نہ ملے اسے اپنی
''اچھا ماں جی۔'' زوئی آہستہ قدموں سے چلتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

''ڈارک ہارس...... سمجھتے ہیں ناں آپ؟'' ایشل نے کولڈ کافی کی اوپری سطح پر تیرتے جھاگ کو اسٹرا
ہلاتے ہوئے مہرزاد سے پوچھا۔

''ایک دم سمجھتا ہوں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''آپ کو نہیں لگتا، آپ وہ ثابت ہوئے ہیں ان الیکشنز میں۔'' ایشل نے کافی کا سپ لینے کے بعد

''وہ کیسے؟'' اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

''وہ ایسے کہ پوری الیکشن کمپین میں آپ کی جیت اور ہار کے بارے میں قیاسے ہی لگتے رہے، نہ
کی پیش گوئی کرنے والے پر یقین تھے نہ ہی ہار کی پیش گوئی کرنے والے پر یقین تھے۔ کبھی کبھار تو مجھے لگا
کہ مقابلہ برابر ہو جائے گا اور آپ کو ایک اضافی اوور کھیلنا پڑے گا۔''

''خیر...... میں ایسا نہیں سمجھتا۔'' مہرزاد نے کہنی میز پر ٹکاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اوّل دن سے یقین

الیکشن کا نتیجہ کیا ہونے والا ہے۔''

''آپ زرنگار والی خبر سے بھی تذبذب میں نہیں پڑے کیا؟'' ایشل نے دائیں آنکھ کا ابرو چڑھاتے
ہوئے تیکھا سوال کرنے کی کوشش کی۔

''نہیں۔'' وہ اتنے ہی اعتماد کے ساتھ بولا جتنے اعتماد کے ساتھ اپنی جیت کے بارے میں بولا کرتا تھا۔
کچھ اسکینڈلز، انسان کو ننانوے کے ہندسے تک پہنچانے والی سیڑھی ثابت ہوتے ہیں۔'' اس نے اپنے گلاس کی
بیرونی سطح پر چمکتے قطروں کو انگلی سے ایک دوسرے میں ضم کرتے ہوئے کہا۔ ''ننانوے کا وہ ہندسہ جہاں کوئی
سانپ نہیں ہوتا۔'' اس نے ایشل کی طرف دیکھا۔ ''بس انسان کو ایک اضافی ہندسے کی ضرورت ہوتی ہے اور
جو لوگ اپنے ڈائس کو مہارت سے پھینکنا جانتے ہیں انہیں اس اکیلے ایک کا حصول دشوار نہیں ہوتا۔''

''اسکینڈل اور ننانوے کا حصہ......؟'' ایشل نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اسکینڈل تو انسان کو سانپ
کے منہ میں ڈال کر واپس زیرو تک پہنچا دیتے ہیں۔''

''یہی تو فرق ہے۔'' وہ محظوظ ہوتا ہوا بولا۔ ''سوچ کا، ردِعمل کا، منصوبہ بندی کا، زخم کھا کر جوابی وار کے
انداز کا۔'' اس نے سر ہلایا۔

''میرے لیے یہ اسکینڈل الیکشن کا ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوا۔ میں جو بزعمِ خود یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ میری
منصوبہ بندی میں کوئی جھول نہیں ہے، اس اسکینڈل والے جھٹکے نے مجھے اپنے منصوبے کے سین قاف کی درستگی
پر مجبور کر دیا، بے خبری میں پڑا ہوا وہ وار جو انسان کی بے احتیاطی اور نالائقی کا نتیجہ ہو، اس سے کیسے سنبھلا جاتا
ہے اور اس کا جواب دینے کا طریقہ کیا ہے، یہ میں نے اسی دوران سیکھا۔ یہ کیا سیکھا سمجھو فاتلی شیر کو درخت پر

چڑھنا بھی آگیا، بلی بے چاری حق دق ہی رہ گئی، وہ کرتب جو اس نے بچا کر رکھا تھا اس کے اپنے ہی اوپر...
کی نذر ہو گیا۔"

"اسکینڈل انسان کو چاروں شانے چت گرا دیتے ہیں، گرا ہوا انسان جوابی وار کیسے کر سکتا ہے؟"
اس کی بات کو سمجھتے ہوئے بھی انجان بن گئی۔ اسے یوں بولتا ہوا سردار مہرزاد خان بہت اچھا لگ رہا تھا...
چاہ رہی تھی کہ وہ یونہی بولتا چلا جائے۔

"تاریخ پڑھنے کے رسیا لوگوں کو بھی شاید چنگیز خان اور منگول فوج والا باب پسند نہ آتا ہو، بربر...
چنگیز خان کے کارناموں کے نتیجے میں ایجاد ہوا تھا شاید...... لیکن میں چنگیز خان کی شخصیت اور منگول فو...
عسکری مہارت کو کسی اور نظر سے پڑھتا رہا ہوں اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ چنگیز خان میں قدرتی...
ایسی کئی خوبیاں تھیں جو اسے اس وقت کے دوسرے تمام عسکری اور سیاسی قائدین سے منفرد بناتی تھیں...
کی فوج کی ایک بہت ہی خاص خوبی یہ تھی کہ وہ گھوڑے پر بیٹھ کر بغیر پیچھے دیکھے کمان کندھے پر رکھ کر...
کھڑے دشمن پر تیر چلانے کی ماہر تھی اور ایسی ماہر کہ نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا تھا۔"

"اوہ!" یشل نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ "جو شخص اپنے اندر خوبیاں تخلیق کرتا ہو چاہے اس کا...
آف انسپائریشن کچھ بھی ہو، وہ کتنا اسمارٹ ہو سکتا ہے، میں شاید اندازہ نہ لگا پاؤں کبھی......" اس نے دل...
سوچا اور اپنے سامنے پہلے اس گالف کورس کو دیکھنے لگی جو مہرزاد کے اس گھر کا حصہ تھا جو اس نے الیکشن جیت...
بعد اسلام آباد میں خریدا تھا جو جدید آرکیٹیکچر کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ الیکشن میں جیت کے بعد یشل سے سردار مہرزاد...
پہلی انفرادی ملاقات تھی۔ مہرزاد نے یشل کو اسمبلی فلور پر اپنی پہلی تقریر کے نکات لکھنے کے لیے بلایا تھا، جو...
تازہ بجٹ پر کرنی تھی۔

"مجھے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے آج مجھے مستقل طور پر خدا حافظ کہنے کے لیے بلایا گیا ہے۔" یشل نے...
نوٹ بک کھولتے ہوئے کہا۔

"کیوں، یہ وہم کیوں آیا تمہیں؟" مہرزاد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیونکہ آج کل میڈیا سپر ہیروز اور چند بے تاج بادشاہ آپ کے آستانے پر دن، رات حاضری دیتے...
چکروں میں رہتے ہیں، ایسے نام ور اور بادشاہ گر میڈیا منیجرز کے سامنے مجھ حقیر، ناچیز، ناتجربہ کار کی کیا...
ہو سکتی ہے، اس لیے میں نے سوچا میرا کام ختم کیونکہ شاید وہ یہیں تک تھا اور میرا بوریا بستر گول ہونے کو ہے۔"

"تمہیں ایک معقول عرصہ تو ہو گیا ہو گا میرے ساتھ کام کرتے ہوئے؟" اس نے سوالیہ انداز میں...
کی طرف دیکھا۔ "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم مجھے اتنا کم سمجھ پائی ہو گی اب تک۔"

"خیر ایسا تو نہیں ہے۔" یشل نے سر جھکا۔ "میں آپ کو اچھا خاصا سمجھ چکی ہوں اور اس کی دلیل یہ...
کہ الیکشن میں آپ کے بارے میں میرا ہر اندازہ درست ثابت ہوا۔ جب کسی کو اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ آپ...
اگلا قدم کیا ہو گا اس وقت مجھے اچھی طرح معلوم ہوتا تھا کہ آپ آئندہ کیا کرنے والے ہیں۔" اس نے...
کی طرف دیکھا۔ "کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ میں آپ کو سمجھنا شروع ہو چکی ہوں۔"

"کسی کام کے شروع ہونے اور ہو جانے میں خاصا فرق ہے۔" وہ اس کی بات سننے کے بعد اس...
کرتے ہوئے بولا۔ "تمہاری بات سے ایسا لگتا ہے جیسے معاملہ ابھی ناپختہ ہے۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"خیر ایسا ہے کہ......" پھر اس نے گلا کھنکھار کر کہنا شروع کیا۔ "میں نو آموز، میری سوچ، میرا...

نو آموز، میں آگے بڑھنے کے عمل میں ہوں اور میرا دل یہ کہتا ہے کہ میری ٹیم کو بھی میرے ساتھ ہی آگے بڑھنا چاہیے، ہم ایک ساتھ سیکھیں اور ایک ساتھ یہ سفر طے کریں تاکہ آئندہ آنے والوں سالوں میں ہم گرگوں کے ایک پورے گروہ کو ری پلیس کر سکیں۔ روایتی ہتھکنڈوں کی جگہ لینے کے لیے ہمیں ایک گروپ کی شکل میں آگے بڑھنا ہوگا، ہمارے اپنے تجربے، اپنی سوچ اور اپنا انداز ہوگا...... ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کے ساتھ ڈنڈی نہیں مار پائے گا۔" وہ یشل کی طرف دیکھنے لگا۔

"لہٰذا یہ وہم دل سے نکال دو کہ تم یا تمہاری ٹیم کا کوئی بھی ممبر فارغ کیا جائے گا، ہاں کوئی اپنی مرضی سے جانا چاہے تو اسے کوئی روکے گا نہیں۔"

"لیکن یہ گرگے آپ کی جان نہیں چھوڑیں گے، یہ آپ کو اپنی خدمات حاصل کرنے کے عوض مستقبل کے سبز باغ کی ایسی تھری ڈی عینک پہنائیں گے کہ آپ گھبرا کر جو بازو پکڑیں گے وہ انہی کا ہوگا۔" یشل نے حقیقت پسندانہ انداز میں کہا۔

"مجھے اب تک نہ جانے کتنی ہی ایسی عینکیں پیش کی جا چکی ہیں یا تو میری نظر ٹیڑھی ہے یا پھر مجھے عینک کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں کوئی عینک لے ہی نہیں سکا ان سے۔ گھبرایا نہ ہی کوئی بازو پکڑ سکا۔" وہ اسے تسلی دینے کی خاطر بولا۔

"جو بھی ہے مجھے آپ کے perception پر اعتماد کرنے میں کوئی تامل نہیں مگر خارزار سیاست میں الجھ کر اس خارزار میں داخل ہونے سے پہلے کے نعرے اور وعدے گنبد کی گونج کے سوا کچھ نہیں رہ جاتے۔"

"چلو دیکھتے ہیں نعرے اور وعدے ایک مثبت انجام کو پہنچتے ہیں کہ گنبدِ بے در کی گونج بن کر رہ جاتے ہیں۔" وہ مسکرایا۔

"آپ بہت مسرور اور پُراعتماد نظر آرہے ہیں کامیابی پر۔" یشل نے کہا۔

"ہاں میں ہوں۔" وہ اٹھ کھڑے ہوتے ہوئے بولا اور آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے کمرے کی مشرقی گلاس وال کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

"کامیابی ہمیشہ میٹریل فارم میں نہیں ملتی، کچھ کامیابیاں immaterial (غیر مادی) بھی ہوتی ہیں، میں ایسی ہی ایک کامیابی پر مسرور ہوں، اتنا مسرور کہ فی الحال اس کے احساس سے باہر نکلنے کو میرا دل نہیں چاہتا۔" اس نے ذرا سا مڑ کر یشل کی طرف دیکھا۔ یشل نے اس کے پاؤں کے چمکتے قیمتی جوتوں کو دیکھا اور پھر اس کی نظر اوپر اٹھنے لگی وہ سیاہ رنگ کا قیمتی ڈیزائنر سوٹ پہنے ہوئے تھا، اس کی شرٹ اور ٹائی اس سیاہ رنگ کے ساتھ مطابقت رکھ کر اس کے اعلیٰ ذوق کی غمازی کر رہی تھی، اس کی کلائی پر قیمتی گھڑی سجی تھی، اس کے بالوں اور داڑھی کا کٹ انتہائی نفاست سے کیا گیا تھا اور یقیناً کسی مہنگے ہیئر ڈریسر کے فن کا نمونہ تھا۔

"کچھ لوگ شخصیت کی پرفیکشن حاصل کرتے ہیں کچھ کے پاس یہ قدرتی طور پر موجود ہوتی ہے، سردار مہرزاد خان کے پاس یقیناً یہ پرفیکشن قدرتی طور پر موجود ہے۔" اس نے سوچا۔

اسی دم انٹرکام کی گھنٹی نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس نے مہرزاد کی طرف دیکھا وہ شاید اسی سے توقع کر رہا تھا کہ وہ یہ کال وصول کر لے۔

"ڈی آئی جی پنجاب کرائمز برانچ از آن لائن سر۔" فون کا چونگا اٹھا کر کان سے لگانے پر اسے ایکسچینج آپریٹر کی آواز سنائی دی۔

☆☆☆

وہ اس دفتر میں پہلی بار آیا تھا۔ یہ سافٹ ویئر بنانے والی ایک ایسی مقامی کمپنی تھی جو کسی غیر ملکی اشتراک سے بنائی گئی تھی۔ اس وسیع کمرشل ٹاور کی دسویں منزل پر اس کا آفس تھا اور اس روز بلڈنگ [کی لفٹ] کام نہیں کر رہی تھی۔ نادر نے سر اٹھا کر آسمان کو چھوتی اس عمارت کو دیکھا اور دسویں منزل کی اونچائی [کا اندازہ] کرتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنا شروع ہوا۔ پچھلے کئی دن کی خواری اور راتوں کی بے خوابی کے باعث [اس کا] جسم دونوں دکھ رہے تھے۔ صبح گھر سے بھی وہ دیر ہو جانے کے باعث افراتفری میں نکلا تھا۔ یہ عمار[ت] کرنے کی خواری اور خالی پیٹ کی دہائیوں نے اسے تقریباً نڈھال کر رکھا تھا۔ اپنی بھاری ہوتی [ہوئی] ٹانگوں کو زبردستی زینہ بہ زینہ اوپر چڑھاتے ہوئے کئی بار اس کا دل اسی عمارت کی سب سے اوپر والی [منزل پر] پہنچ کر وہاں سے چھلانگ لگا دینے کو چاہا۔

''زندگی حرام ہوئے جاتی ہے، موت بھی حرام ہو گی۔'' پھر وہ خود کو سمجھانے کی کوشش کرتا۔

دسویں منزل اسے سراب محسوس ہو رہی تھی اور آٹھ سیڑھیوں کا زینہ چڑھ کر گھوم کر اوپر جاتی [ہوئی] سیڑھیوں کے نیچے رک کر کھڑے ہوتے ہوئے وہ ادھر ادھر دسویں منزل کا ٹیگ ڈھونڈنے کی کوشش کر[تا]۔ دسویں منزل تکنیکی طور پر شاید ابھی دور تھی۔

''مجھے کمپنی کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر مسٹر حمزہ محمود سے ملنا ہے۔'' بالآخر اپنی منزل پر پہنچ کر اس نے [ریسیپشن] ریسیپشن پر بیٹھی لڑکی سے کہا تھا۔ اس وقت اس کا دل قریب ہی کہیں گر جانے کو چاہ رہا تھا۔

''آپ تشریف رکھیں اور اپنا نام اور تعارف بتائیں۔'' ریسپشنسٹ نے اپنے مخصوص پیشہ ورانہ اند[از میں] مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''میرے نام سے شاید وہ واقف نہ ہوں، واقف ہوں بھی تو ان کے ذہن میں نہیں ہو گا، بس آپ بول دیں کہ میں میر ال صلاح الدین کے سلسلے میں ان سے ملنے آیا ہوں۔'' نادر نے کرسی کی سیٹ کو اپ[نے] کے نیچے مخصوص کرتے ہوئے سکون کے لمحاتی احساس پر خوش ہوتے ہوئے کہا۔

اس کی توقع کے مطابق اسے فوراً ہی حمزہ محمود کے آفس میں بلا لیا گیا تھا۔

''کہو نادر کیسے ہو؟'' اس کی غلط فہمی تھی کہ حمزہ محمود اس کے نام سے واقف نہیں ہو گا یا اس کا نام ا[ن کے] ذہن میں نہیں ہو گا۔

''میں بالکل بھی ٹھیک نہیں ہوں سر۔'' نادر نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اوہ آئی سی!'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''لگتا ہے انہوں نے تمہیں بہت تنگ کر رکھا ہے۔''

''بہت ایک چھوٹا سا لفظ ہے سر۔'' نادر نے دکھتے سر کو ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے کہا۔ ''وہ افسر نہیں [پورا] عملہ ہوتا ہے جس کی فائل میں کسی کا نام جانے کی بس دیر ہی ہوتی ہے۔'' پھر اس نے سر اٹھا کر کہا۔

''اٹس ریئلی سیڈ......!'' اس کا چہرہ افسردہ ہوا۔ ''میں تمہیں یا کسی کو بھی بلاوجہ کی اذیت میں نہیں [دیکھنا] چاہتا تھا۔''

''آپ نہیں چاہتے ہوں گے۔'' نادر نے کہا۔ ''لیکن جس محکمے کو آپ نے اپروچ کیا ہے، اس [کے] اہلکاروں کا کام ہی اسی بات سے جانچا جاتا ہے کہ وہ کس کو کتنا ذلیل کرنے میں کامیاب ہوئے۔''

''ویری سیڈ......'' وہ ایک بار پھر بولا۔ ''مگر شاید چیزیں میرے اختیار میں نہیں ہیں، میرے پاس ا[س سے] اپروچ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا، ویسے کرتے کیا ہیں وہ تمہارے ساتھ؟''

''سر وہ میری ایک، ایک موومنٹ پر نظر رکھے ہوئے ہیں، ہر جگہ میرے پیچھے پہنچ جاتے ہیں، انہی کی وجہ سے میں کئی روز سے اپنے آفس نہیں جا سکا، میرا گھر، میرے علاقے کی دکانیں، ہوٹل، ڈھابے، ٹی اسٹال، ڈسپنسری، ٹھیلے والے جس جس سے میرا کسی ضرورت کے لیے تعلق ہے وہ بھی ان سے محفوظ نہیں، وہ ہر کسی کو [پر]یشان کرتے پھرتے ہیں۔''

''چ...... چ......'' وہ ریوالونگ چیئر کو پیچھے کی طرف پش کر کے ریسٹ پوزیشن میں جاتے ہوئے بولا۔ ''اور وہ کہاں ہے، تمہاری وائف......؟''

''مجھے معلوم نہیں ہے سر۔'' نادر نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''وہ پاکستان آ چکی ہے لیکن میرا اس سے رابطہ نہیں، نہ میں اسے ائرپورٹ پر لینے گیا، نہ میں نے اس سے ملاقات کی، میں تو اس ڈر سے اپنا فون بھی بند رکھتا ہوں کہ وہ یقیناً مجھے کال کرے گی اور اس کی کال کو ٹریس کر کے یہ لوگ اس تک جا پہنچیں گے۔''

''تو پہنچنے دو ناں یار۔'' اس کی چیئر سیدھی ہوئی۔ ''اس تک پہنچنا ہی تو مقصود ہے، اس تک پہنچ جائیں تو تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔ اچھا نہیں ہے؟''

''نہیں سر۔'' نادر نے سر ہلایا۔ ''جو سلوک یہ میرے ساتھ کرتے ہیں اسے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ میں مرد ہو کر اپنے اعصاب کھو رہا ہوں وہ تو پھر عورت ذات ہے، اس کا یہ کیا حشر کریں گے۔''

''تمہیں اس سے محبت ہے بہت، ہے ناں؟'' حمزہ محمود نے مسکرا کر کہا۔

''محبت کی بات نہیں ہے سر، احساس کی بات ہے۔'' نادر نے کہا۔ ''وہ مجھے اس اذیت سے اور خواری سے نکالنے کی خاطر واپس آ گئی، اس نے اپنا فرض اور وعدہ نبھانے کی کوشش کی ہے، ہمیں اس کی اس حرکت کو سراہنا چاہیے، اس کا احترام کرنا چاہیے۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ وہ بھی ان کی ان حرکتوں کا شکار ہو جائے۔''

''پھر......؟'' حمزہ نے اس کی طرف سوالیہ انداز سے دیکھا۔

''اسی لیے میں آپ کو ڈھونڈتا یہاں آیا ہوں سر، آپ سے یہ درخواست کرنے کہ ان کے افسروں سے بولیں وہ خود تفتیش کے لیے یہاں آئی ہے ہمارا فرض ہے اس سے باعزت طریقے سے تفتیش کریں مہذب انداز میں۔''

''اور اگر وہ مجرم ثابت ہو گئی تو؟'' حمزہ نے سوال کیا۔

''تو پھر تو جو اس کی سزا بنتی ہے اسے ملنی چاہیے۔'' نادر نے سر جھکا کر کہا۔

''مگر تم تو اس سے محبت کرتے ہو؟'' حمزہ کا انداز تیکھا ہوا۔

''میں نے عرض کی ناں سر...... بات محبت کی نہیں ہے، احترام کی ہے اگر وہ مجرم ہے تو میں کیوں اپنے وطن کی ایک باعزت، بے گناہ بیٹی کی حرمت پامال کرنے والوں کو سزا ملنے پر افسردہ ہوں گا۔''

''تم مجھے دل کے کھرے اور نیت کے نیک انسان معلوم ہوتے ہو، جس جذبے کے تحت تم نے اس سے نکاح کر لیا اور جس احترام کے تحت تم اب بھی اس کے لیے نیک جذبہ رکھتے ہو، میں اس سے متاثر ہوا ہوں۔'' حمزہ نے کہا۔ ''میرا تم سے وعدہ رہا اب وہ تمہیں تنگ نہیں کریں گے اور تمہاری بیوی تک پہنچنے کے بعد بھی وہ اس سے اسی احترام سے بات کریں گے جیسا تم چاہتے ہو، میری دعا ہے کہ تمہاری بیوی کا اس سارے قصے میں کوئی قصور ثابت نہ ہو اور اگر ایسا ہو گیا تو میں خود چل کر تم دونوں کو سیلوٹ کرنے تمہارے گھر پہنچوں گا۔''

''تھینک یو سر......'' نادر کے رویں رویں میں تشکر کا احساس دوڑ گیا۔ ''مجھے آپ سے یہ ہی توقع تھی اور

www.paksociety.com

اسی لیے میں آپ کو تلاش کرتا یہاں تک پہنچا تھا۔"
"شکر ہے میں یہاں تک تمہاری توقع پر پورا اترا۔"
"میری دعا ہے سر کہ آپ جس کی تلاش میں ہیں وہ آپ کو مل جائے۔" نادر نے سکون کے اس
کے تحت دعا دی جو حمزہ کی بات نے اس کے رگ وپے میں اتار دیا تھا۔ اسے یہاں سے اٹھ کر زوئی
کرنا تھا جو اَب تک یقیناً اس کے بارے میں مایوس ہو چکی ہوگی۔

☆☆☆

"اچھا تو تم ٹی وی پر کوکنگ شوز کرتے ہو۔" ڈاکٹر نادیہ نے خود سے ملاقات کے لیے آئے لڑکے
"جب ہی میں سوچ رہی تھی کہ تمہارا چہرہ کچھ دیکھا دیکھا سا لگتا ہے حالانکہ میں کوکنگ شوز وغیرہ نہیں دیکھتی۔"
"ہوسکتا ہے آپ نے کہیں میری تصویر دیکھی ہو، اخبار میں، کسی میگزین میں۔" اس نے جواب
"آنٹی مجھے امید ہے کہ میں آپ کا وقت ضائع نہیں کر رہا ہوں؟" اچانک اسے خیال آیا۔
"اس وقت تک تو یقیناً نہیں جب تک کوئی نیا مریض نہیں آجاتا۔" نادیہ نے نرمی سے کہا۔
"آپ نے اِدھر بازار میں اپنا کلینک کیوں بنایا، وہیں ہل روڈ پر یا اس کے آس پاس کیوں نہیں
پوچھ رہا تھا۔
"یہاں سب لوگوں کی رسائی ممکن ہے اور وہ جگہ تو اب ناقابلِ رسائی ہی ہو چکی..... حساس علاقہ
اب اس لیے وہاں کوئی کمرشل کام نہیں ہوسکتا۔ یہ بتاؤ ٹھہرے کہاں ہوئے ہو؟"
"ہوٹل میں اور کہاں..... اب یہاں تو ہمارا گھر بھی بک چکا کبھی کا۔"
"تم میرے یہاں ٹھہرو جتنے دن ادھر ہو۔" نادیہ کو خود سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ماضی جو انہیں کبھی یاد آیا
جس سے کبھی کوئی لگاؤ محسوس ہوا تھا اس سے متعلق ایک کردار سے ملاقات پر انہیں خوشی کیوں محسوس ہو رہی
"نہیں آنٹی، میں وہاں سیٹ ہوں، آپ کو خواہ مخواہ تردد کرنے.. کی ضرورت نہیں خود آپ تو سارا
مصروف رہتی ہوں گی اور علینہ......" وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔ "ہاں آنٹی، میں پوچھنا ہی بھول گیا
کیسی ہے، کیا کر رہی ہے آج کل؟"
"ہاں علینہ۔" نادیہ کو خیال آیا۔ "اس لڑکے کو دیکھ کر شاید میں علینہ کی وجہ سے ہی خوش ہوں۔ کیوں
ہوں یہ پتا نہیں؟" اس نے سوچا۔
"علینہ ٹھیک ہے، ماسٹرز کر رہی ہے انگلش لینگویج میں۔" انہوں نے جواب دیا۔
"گریٹ۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "خوب بڑی ہو چکی ہوگی اب تو۔"
"ظاہر ہے تم بڑے ہوگئے ہو تو وہ بھی بڑی ہو چکی ہے۔" نادیہ نے کہا اور کلاک پر نظر ڈالی۔
"آٹھ بج رہے ہیں اور میرے خیال میں اب تو مزید کسی مریض کی آمد کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ چلو
چلتے ہیں۔" انہوں نے میز سے اپنا فون اور گاڑی کی چابیاں اٹھاتے ہوئے کہا۔
"واہ آنٹی، اگرچہ وقت نے آپ کی شکل صورت اور شخصیت پر کچھ خاص اثر نہیں چھوڑا لیکن آپ کا
خاصا بدل چکا ہے۔ مجھے یقین نہیں آرہا کہ آپ خود مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دے رہی ہیں۔ میں فہد
جسے اپنے گھر کے پچھلے حصے میں کھیلنے پر آپ ڈانٹ کر بھگا دیتی تھیں اور اسی وجہ سے ہم بچوں نے
کا نام......" وہ یاد کرتے کرتے مسکرایا۔ "خیر رہنے دیں ہر بات کیا کہہ دینی چاہیے بھلا۔"

"مجھے یاد ہے میرا نام "سڑیل آنٹی" رکھا ہوا تھا تم لوگوں نے۔" نادیہ نے کلینک سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔
"اوہ رئیلی آنٹی!" وہ ہنس دیا۔ "آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"
"کان کھلے رکھتی ہوں میں ہر دم۔" وہ مسکرائیں۔
"کیا تبدیلی ہے یار۔" فہد نے دل میں سوچا "یہاں تو واقعی تبدیلی آگئی ہے۔"

☆☆☆

"نہیں بیٹا۔" عافیہ نے اپنے سامنے رکھے ہینڈ بلز پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔
"یہ طریقہ تو بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔ یہ تو عزت بچانے کا نہیں عزت اچھالنے کا باعث بنے گا۔"
"اُفوہ ممی، آپ خود بتائیں اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ کیا ہوسکتا ہے۔" دانیال نے کہا۔ "آپ نے اور ڈیڈی نے کتنے ہائی کمانز کو ٹچ دے کر دیکھ لیا۔ ان لوگوں کا مافیا اتنا اسٹرونگ ہے کہ کوئی ان پر ہاتھ ڈالنے کو تیار نہیں، ہر کوئی بس امید دلا کر ٹال دیتا ہے۔"
"تم جانتے تو ہو وہ کیسے بااثر سیاستداں کے کنٹرول میں ہے۔ ان ہاتھوں سے اسے نکالنا ان ہائی کمانز کے اختیار میں کہاں ہے۔" عافیہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ان کی آواز میں تاسف تھا۔
"تو پھر؟" دانیال نے سوال کیا۔ "اگر ہم اس معاملے کو پبلک میں نہیں چھیڑیں گے، اس تلاش کو مہم نہیں بنائیں گے، ہماری اس تک رسائی ناممکن رہے گی۔"
"دیکھو دانیال تم اچھے بھلے سمجھ دار ہو۔ تم کیوں نہیں سمجھ رہے کہ یوں پبلک میں معاملہ جانے سے کتنے مختلف قسم کے نتائج نکل سکتے ہیں۔ کچھ لوگ ہمدردی میں تمہاری آواز کے ساتھ آواز ملائیں گے، بہت سے اس معاملے کو گندی بسن کی طرح دھونے بیٹھ جائیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جن لوگوں کے قابو میں وہ اس وقت ہے وہ گھبرا کر اسے کوئی نقصان پہنچا بیٹھیں۔ تمہارے ڈیڈی ٹھیک کہتے ہیں معاملہ بے حد ٹیڑھا اور نازک ہے۔ اسے بہت احتیاط سے چھیڑنے کی ضرورت ہے۔"
"ہوں۔" دانیال نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا اور وہ ہینڈ بلز سمیٹنے لگا۔ "ٹھیک ہے پھر میں یہ تصویر عاصم بھائی کو فارورڈ کر رہا ہوں، ان سے کہتا ہوں پاکستانی کمیونٹی میں اور وہاں کی سوشل ویب سائٹس پر یہ معاملہ اٹھائیں۔ پیجز بنائیں اور بات کریں کہیں نہ کہیں تو معاملہ چھیڑنا ہی پڑے گا۔ گھر بیٹھے حل ہونے والی بات تو ہے نہیں۔"
"تم جذباتی ہو رہے ہو دانیال۔ جو اَب تم اکثر نہیں ہوتے۔" عافیہ نے اسے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔
"یہ معاملہ ہی ایسا ہے ممی...... اس پر جذباتی ہوئے بغیر چارہ نہیں۔" دانیال نے کہا۔ "مجھے جب یہ خیال آتا ہے میرا خون کھولتا ہے۔"
"تم ٹھیک کہتے ہو لیکن دعا کی طاقت پر جو یقین ہے اسے متزلزل نہ ہونے دینا۔"
"خیر اس میں تو کوئی شک نہیں ہے لیکن دعا کے ساتھ ساتھ کوشش بھی تو کرنی ہے۔" دانیال نے اٹھتے ہوئے کہا۔
"اپنے ساتھیوں سے بھی کہہ دو کہ ان بلز کو فی الحال اپنے تک رکھیں۔ انہیں تقسیم نہ کریں۔" عافیہ ابھی تک ہینڈ بلز میں الجھی ہوئی تھیں۔
"ہاں، خوب یاد دلایا۔" دانیال نے کہا اور اپنا فون اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔

''ہیلو ہینش کیسی ہو؟'' وہ کہہ رہا تھا۔

''مجھے یہ کہنا تھا کہ ان ہینڈ بلز کو اپنے تک رکھو فی الحال۔ کسی کو دینے کی ضرورت نہیں۔ ہم کچھ اور سوچ رہے ہیں۔''

''آہ۔'' ہینش کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اسے وہ چند ہینڈ بلز یاد آنے لگے جو اس نے نگین کو دیے

☆☆☆

''میری تو اپنی نظروں کے سامنے دنیا گھوم گئی تھی جب میں نے وہ نام اور یہ ہینڈ بل دیکھا۔'' نگین نے حمزہ کو بتایا۔

''ہوں۔'' وہ اس تصویر کو بغور دیکھ رہا تھا۔ ''اس کا مطلب ہے میرا اندیشہ درست تھا۔'' وہ کچھ ہوئے بولا۔

''خیر اس لڑکی کو خود بھی مکمل یقین نہیں تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے۔''

''اتفاقات اتنے عام نہیں ہوتے کہ دنیا کے دو لوگوں کے ساتھ ایک جیسے ہی ہونے لگیں۔'' حمزہ نے کی طرف دیکھا۔

''ہاں یہ بھی ہے۔'' نگین نے کہا۔

''خیر..... تھینک یو نگین۔'' حمزہ نے اس کاغذ کو تہہ کر کے جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اس اتفاق میری اندھیرے میں تلاش کو ایک رخ تو دیا۔ میں ٹامک ٹوئیوں کے فیز سے نکل کر کسی خاص راستے پر چلنے قابل ہوا۔''

''مجھے تو پوری رات نیند نہیں آئی۔ تمہیں فون پر یہ بات بتانے کو دل نہیں چاہا اور تم بھی آج اس آئے ہو۔'' نگین نے کہا۔

''اگر ممکن ہو تو اس لڑکی سے رابطے میں رہنا۔'' حمزہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، میں نے اپنی ساس کی ناراضیوں، گھرکیوں اور گھر میں پیدا ہونے والی ممکنہ بدمزگیوں کو نظرا کرتے ہوئے اس سے فون نمبر بھی لیا اور رابطے میں رہنے کا وعدہ بھی۔''

''اِٹس گریٹ آف یو نگین، میرے دل پر بوجھ بڑھا بھی ہے اور کم بھی ہوا ہے۔'' وہ چلتے چلتے بولا۔

☆☆☆

''یہ میرال صلاح الدین کی تصویر ہے۔ پاکستان کی ایک گم نام اور مظلوم بیٹی۔'' اس نے ایک ویب سائیٹ پر اپنے دوست سے بات کرتے ہوئے کسی پیج کا اشتہار دیکھا اور بے اختیار اس کو کلک کر اس کی حیرت کا باعث بنا وہ صفحہ میرال صلاح الدین کے بارے میں معلومات، تصویر اور تفصیل سے بھر تھا۔ چند روز پہلے بنائے گئے اس صفحے کو پسند کرنے والے لوگوں کی تعداد ہزاروں میں پہنچ رہی تھی اور دنیا ہر کونے سے اس کے بارے میں کمنٹ ہر دوسرے منٹ میں نظروں کے سامنے آ رہے تھے۔

''اس خبر، اس صفحے اور اس کے بنانے والوں کی تفصیل مجھے فوراً مہیا کرو۔'' اس نے اپنے پی اے کو کر کہا۔

سردارزادہ مہرزاد خان کے لیے یہ صفحہ اس ہفتے کا واحد شاک ثابت ہو رہا تھا۔

جاری

شامِ شہریاراں

عنیزہ سیّد

قسط 9

*

زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے . . . خیر و شر، نیکی اور بدی . . . زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت . . . ہر برائی پر حاوی ہوجاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سیّد نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے



www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

محمود درانی اور مہرین کی تیسری اولاد حمزہ، مہرین کی زچگی میں پیچیدگی کے باعث تائی کے پاس ان کے آبائی گھر سیالکوٹ میں پروان چڑھتا ہے۔ جہاں نگین اس کے ماموں کی بیٹی سے اس کی خوب گاڑھی چھنتی ہے۔ بڑے ہونے پر حمزہ کے والدین اسے واپس لانا چاہتے ہیں مگر وہ راضی نہیں ہوتا۔ علینہ کے والدین، نادیہ اور سعید کیانی نے کورٹ میرج کی تھی مگر شادی کے تین سال بعد سعید کیانی بیوی کو داغِ مفارقت دے گئے۔ علینہ، فہد کو ٹی وی شو میں ایک شیف کے طور پر دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے فہد جس کے ساتھ اس نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ آکسفورڈ کا پروردہ سردار مہرزاد خان اپنے باپ کے سیاسی قتل کے بعد حادثاتی طور پر سیاست میں شامل ہوا تھا اور زرنگار کے حسن و ذہانت کا شکار ہو چلا تھا...... بینش دو بھائیوں کی اکلوتی بہن، اپنی ضد اور صرف بھائیوں کے تعاون سے نیشنل کالج آف آرٹس میں تعلیم حاصل کر رہی تھی جہاں اس کا سینئر ساتھی دانیال اس سے ہر ممکن تعاون کرتا تھا۔ ایک پاکستانی مسلمان مرد اور بدھ مذہب کی پیروکار چینی عورت کی بیٹی زوئی حسین چین سے آ کر پاکستان میں فارمیسی کی تعلیم حاصل کرتی ہے یہ سب اس نے دادی کی محبت میں کیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کا دل پاکستان کی سرزمین اور یہاں کے لوگوں سے شدید محبت کرنے لگا تو اس نے ریسرچ ڈیپارٹمنٹ جوائن کر لیا تا کہ اپنے قیام کو بڑھا سکے۔ حمزہ جو اَب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے ایک سیمینار کے سلسلے میں ایبٹ آباد جاتا ہے اور وہاں بی اماں کی سہیلی رابعہ کلثوم کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے جو بچپن میں باقاعدگی سے سیالکوٹ آتی تھیں اور حمزہ بھی بی اماں کے ساتھ ایبٹ آباد آیا کرتا تھا مگر 2005ء کے زلزلے کے بعد وہاں سب کچھ بدلا ہوا تھا۔ حمزہ اپنی کزن اور بچپن کی دوست نگین سے بی اماں کی سہیلی اور پوتی (میرال) کے متعلق اپنی تشویش بتاتا ہے کہ رابعہ کلثوم کی وفات اور زلزلے کے بعد پوتی نہ جانے کہاں چلی گئی۔ رابعہ کلثوم بوا جی کے نام سے آرٹ اینڈ کرافٹ سینٹر چلاتی تھیں۔ امراؤ بیگم جو اپنی والدہ زبیدہ خانم کا کوٹھا آباد کیے ہوئے تھیں کی آمدنی کا ذریعہ زرنگار (میرال) بن جاتی ہے مگر صرف سردار مہرزاد خان نے اس کی کئی راتوں کے حقوق بھاری معاوضے کے عوض اپنے نام کر لیے تھے۔ دانیال آرٹ کا عشق رکھنے کے ساتھ فلائنگ میں بھی مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے اور ایک دن طیارے کے دھوئیں سے نقش و نگار بنانے کی کوشش میں حادثے کا شکار ہو کر اسپتال میں پٹیوں میں جکڑا (عافیہ) ماں کی ممتا کا شدید امتحان بن جاتا ہے۔ بیٹے کی زندگی کی دعائیں مانگتے مانگتے عافیہ اللہ تعالیٰ کے مقربان خاص بندوں میں سے ایک کی درگاہ میں جا پہنچتی ہیں۔ زوئی حسین کے ویزے کی مدت ختم ہونے سے دو روز قبل وہ اپنے ایک ساتھی نادر سے نکاح کر لیتی ہے تا کہ پاکستان میں رہنے کا جواز پا سکے۔ 2005ء کے زلزلے میں زوئی حسین نے بھی متاثرین کی مدد کی تھی جو اسے خاصی مہنگی پڑی اور اب نادر بدگمانی کی آخری سیڑھی پر تھا۔ دانیال، بینش کو اپنے گھر لے جاتا ہے بینش اخبار میں چھپنے والا زرنگار کی تصویر دکھاتی ہے تو عافیہ اسے دیکھ کر حیران رہ جاتی ہیں کیونکہ وہ رابعہ کلثوم کی پوتی میرال کی تصویر تھی۔ زوئی پاکستان آتی ہے لیکن نادر اسے ائرپورٹ لینے نہیں آتا۔ وہ فون کرتی ہے تو اس سے رابطہ نہیں ہو پاتا۔ وہ اپنی پرانی پڑوسن اور سہیلی مریم کے پاس جانے کا فیصلہ کرتی ہے۔ فہد کو اپنے ایک نیوز ریڈر دوست کے ذریعے سے میرال کی گمشدگی کی خبر ملتی ہے۔ پوری الیکشن کمپین کے دوران پیش رہیں، مہرزاد کی شخصیت کے کچھ ایسے پہلوؤں سے آشنا ہوئی جو اَب تک سب سے مخفی تھے۔ مہرزاد کے الیکشن میں جیتنے کے بعد زرنگار اسے بتاتی ہے کہ وہ میرال صلاح الدین ہے۔ بینش سوچتی ہے کتنی خوش قسمت ہے وہ لڑکی جس کے لیے دانیال کی ممی اتنی پریشان ہو رہی تھیں۔ زوئی حسین، نادر سے ملنے کے لیے اس کی کمپنی جاتی ہے لیکن وہاں بھی کئی دنوں سے نہیں آ رہا تھا سو وہ اس کے گھر جانے کا فیصلہ کرتی ہے۔ فہد، ڈاکٹر نادیہ سے، اسپتال میں ملتا ہے تو وہ اسے اپنے گھر لے جاتی ہیں، نگین اپنی ساس کے ساتھ لڑکی دیکھنے جاتی ہے تو اسے بینش بہت پسند آتی ہے، نگین اس کے پاس میرال صلاح الدین کا ایک ہینڈ آؤٹ دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے وہ اس سے ساری معلومات لے کر آ کر حمزہ کو بتاتی ہے۔ زرنگار مہرزاد کو اپنے ماضی کے بارے میں بتاتی ہے، زوئی، نادر کے گھر جاتی ہے تو نادر کی ماں کہتی ہیں کہ اسے بتا کر آنا چاہیے تھا۔ نادر حمزہ سے ملتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ اگر زوئی قصوروار ہوئی تو وہ خود اسے لے کر آئے گا۔ حمزہ کہتا ہے کہ اسے اب تک نہیں کیا جائے گا۔ عافیہ، دانیال سے کہتی ہیں کہ جو طریقہ اس نے میرال کو ڈھونڈنے کا نکالا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔

اب آگے پڑھیے

"دروازے کے کُنڈے میں پکا تالا ڈال کر دونوں پتا نہیں کدھر غائب ہو گئے، اب تو شاید مہینے سے بھی اوپر ہو گیا ہے غائب ہوئے۔" تالاب کے پانی میں ڈوبے کپڑے نکال کر سلور کی پرات میں ایک کپڑا رکھ کر دیسی صابن اس پر رگڑتے ہوئے حمیدہ نے صفیہ کو مخاطب کیا جو تالاب کے دوسرے کنارے پر کھڑی صابن لگے کپڑے پانی میں ڈبو کر اُن کا صابن چھڑانے میں مشغول تھی۔

"کاکا اشفاق بتا رہا تھا شہباز صاحب دفتر سے بھی بغیر چھٹی لیے غائب ہوا ہے، دفتر والے دو دفعہ آ چکے ہیں یہاں اس کی خیر خبر لینے۔" صفیہ نے اپنی معلومات کی تھیلی ہاتھ میں پکڑے کپڑے کے ساتھ جھٹکی۔

"بات کوئی گڑبڑ والی ہی ہے۔" حمیدہ نے کہا اور پھر دائیں بائیں دیکھنے کے بعد سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔ "جس دن وہ دونوں غائب ہوئے ہیں اس سے ایک دن پہلے شام کو میں گئی تھی بہن صدیقہ سے دانے لینے، بھائی شہباز صحن میں چارپائی ڈالے پڑا تھا، چہرہ تریلیوں (پسینے) سے تر تھا، رنگ پھیکا چٹا لٹھے جیسا...... ہائے میرا کلیجا تو دھک سے رہ گیا، میں نے بہن صدیقہ سے پوچھا بھائی شہباز کو کیا ہوا، بولی کچھ نہیں پیٹ خراب ہے، مروڑ پڑتا ہے، دست لگے ہیں۔ میں نے کہا نئے چاولوں کی پیچ (مائع) اتار کر پلا، رات تک ٹھیک ہو جائیں گے لیکن اس نے میری بات مجھے لگتا ہے دھیان سے کوئی نہیں سنی۔ گھڑی گھڑی دروازے کی طرف دیکھتی تھی جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو، فٹافٹ مجھے دانے ناپ کر دیے، ایک کے بجائے دو بالٹیاں ناپ دیں، میں نے کہا۔ ہا ہائے میں نے تو ایک ہی بالٹی لینی ہے تو بولی چل کوئی بات نہیں لے جا، چل اٹھا فٹافٹ، مجھے شک پڑتا ہے اس کا من تھا میں فٹافٹ چلی جاؤں وہاں سے، پتا نہیں کس بات کی گھبراہٹ تھی اسے، میں نے نہیں پوچھا بس دانوں کی بوری اٹھائی اور چلی آئی۔"

"بات جو بھی ہے ناں بڑی گوڑھی (پیچیدہ) ہے" صفیہ نے بھی سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "کاکا اشفاق بتا رہا تھا چوہدری اللہ وسائے نے تو بندے کوٹھے (چھت) پر چڑھا کر اندر اتارے ہیں کہ دیکھ کر آؤ کہیں دونوں کا کوئی اندر ہی نوساہ (گلا) گھونٹ کر یا کاٹ کر تو نہیں پھینک گیا اور ہم اِدھر باہر ہی ڈھونڈتے رہیں۔"

"شاباش ہے چوہدری اللہ وسائے کی عقل پر۔" حمیدہ نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "جو کوئی مار کر پھینک گیا ہوتا تو مہینے بعد اُن کے گھر کے باہر کھڑا ہونا مشکل ہو جاتا تھا، شیدائی (پاگل) ہی ہے اللہ وسایا تو۔"

"دفتر میں جو عملہ ہے ناں وہ کہتا تھا لاہور سے کوئی بڑے افسر آئے تھے تفتیش (تفتیش) کرنے۔" کپڑوں کی پوٹلی اٹھائے تالاب پر انہیں دھونے کی خاطر آئی صدیقہ بھی اس گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے بولی۔ "لوگ کہتے ہیں بھائی شہباز نے ضرور کوئی لمبا ہاتھ مارا تھا۔ دفتر کے پیسے اِدھر سے اُدھر کر دیے ہوں گے اسی لیے تو افسر آئے تھے پوچھ پڑتال کرنے۔"

"ہائے...... ہائے بیچارے شہباز نے لمبا ہاتھ مارا ہوتا تو کوئی چار دن تو ان کے دن بدلے نظر آتے، وہ..... بیچاری کرماں والی تو مونگ کی دال ابالتی اور ساگ تڑکتی ہی وقت پاس کر رہی تھی۔" حمیدہ نے کہا۔

"بڑے کنجوس تھے بھائی شہباز، بینک میں منیجر لگے تھے پر پھر بھی پیسہ خرچ کرنے کا نام نہیں لیتے تھے، نہ کوئی اولاد نہ کوئی آگا پیچھا بندہ پوچھے تم کس کے لیے جوڑ رہے ہو بھئی پیسہ۔" صدیقہ نے سر جھٹکا۔

"ساری باتیں چھوڑو، سوچنے کی بات ہے گئے کدھر دونوں؟" صفیہ پھر سے سوچ میں پڑی۔ "گھر کا سارا سامان اپنی اپنی جگہ امن امان سے پڑا ہے پھر یہ دونوں کدھر گئے؟"

"شام پڑ رہی ہے صفیہ بی بی، شہباز صاحب کا سیاپا چھوڑ کر کپڑے مل لے جلدی جلدی، وہ تو دونوں کہیں سیر سپاٹے کر رہے ہوں، ہمارے سارے کام پیچھے پڑ جاتے ہیں وچار (سوچ) کر کر کے۔" حمیدہ کو کاموں کی یاد آ گئی

اور تینوں شہباز صاحب کا تذکرہ چھوڑ کر تیزی سے ہاتھ چلانے لگیں۔

☆☆☆

”مجھے تو لڑکی کے گھر والے خصوصاً اس کی ماں خاصی رف سی لگ رہی تھی، ماں کا اثر لازمی بیٹی کے مزاج پر بھی ہوتا ہے۔“ نگین کی ساس ڈائننگ ٹیبل پر ناشتا کرنے کے لیے بیٹھے اپنے میاں اور بیٹے کے ساتھ بینش کے گھر والوں کے بارے میں خیالات کا اظہار کر رہی تھیں۔

نگین نے ہاف فرائی انڈے کی پلیٹ اپنے سسر کے سامنے رکھتے ہوئے کن انکھیوں سے اپنے دیور کی طرف دیکھا جو سنجیدہ چہرہ لیے سنجیدگی اور انہماک کے ساتھ ناشتا کرنے میں مشغول تھا۔ اسے چائے کا کپ پکڑاتے ہوئے نگین کی نظریں اس سے چار ہوئیں، اس کی نظروں میں اپنے دیور کے لیے صاف پیغام لکھا تھا۔

”یوں ہی مین میخ نکلتی رہی تو ہو چکا تمہارا رشتہ، لڑکی اچھی ہے، اسٹینڈ لے لو۔“

”امی پورے شہر میں ہماری فیملی جیسا civilized اور refined گھرانا ملنا تو ناممکن سی بات ہے درحقیقت۔“ شجاع (دیور) نے چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے سنجیدہ سا وار کیا۔

”تم سمجھ رہے ہو کہ میں غلط کہہ رہی ہوں۔“ ساس چمک کر بولیں۔ ”پوچھو اس سے۔“ انہوں نے نگین کی طرف اشارہ کیا۔ ”جتنا ٹائم ہم بیٹھے رہے، بھاٹی میں چلتی زردوزی کی دکانوں، جریسوں، سری پائیوں، نہاریوں اور بیٹوں کے دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتے کاروبار کے علاوہ کوئی دوسری بات کی انہوں نے؟“

”بیگم صاحبہ، اندرونِ شہر میں رہنے والی ایک سیدھی سادی تقریباً ناخواندہ خاتون سے اگر آپ یہ توقع کر رہی تھیں کہ وہ آپ سے آغا حشر کے ڈراموں، شیکسپئر کے ناولوں، چغتائی کی مصوری اور علامہ اقبال کی شاعری پر بحث کرے گی تو میں معذرت کے ساتھ کہتا ہوں کہ آپ اس سے بہت بڑی توقع لگا بیٹھی تھیں۔“ نگین کے سسر نے متانت سے کہا۔

”آپ لوگوں کا دل تو یہ چاہتا ہے کہ جہاں بھی لڑکی دیکھنے جاؤں فوراً ہاں کر دوں۔“ ساس اپنے میاں کا تبصرہ سن کر مزید بھڑکیں...... ”وہ لوگ جن کے گھر کے دروازے پر گاڑی تک نہیں جا سکتی، وہ لڑکی جس کی ماں کو بات کرنے کی تمیز نہیں اور خود لڑکی دو لفظ فائن آرٹس کے پڑھ کر خود کو کوئی توپ نما چیز سمجھنے لگی۔ سیدھے منہ بات کرنا جیسے محال تھا، وہاں بیٹا بیاہ دوں جس گھر کے بیٹے سارا دن کپڑے کی دکان پر بیٹھے کپڑے کے تھان کھول کھول کر گاہکوں کے آگے بچھاتے رہتے ہیں۔“ وہ بالکل ہی ہتھے سے اکھڑنے لگیں۔

”بس تو پھر طے ہے آپ اب مزید کسی کے گھر جائیں گی نہ کوئی لڑکی دیکھیں گی۔“ شجاع فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ”جو اور جیسے لوگ وہ ہیں یہ تفصیل تو آپ کو ان کے گھر جانے سے پہلے بھی معلوم تھی۔ گاڑی دروازے تک نہیں جاتی، کپڑے کا کاروبار ہونہہ......“ اس نے سر جھٹکا۔ ”یہ ایک ایسا ایشو ہے جس پر کوئی فیصلہ نہ کرنے کا فیصلہ تو آپ پہلے سے کر چکی ہوتی ہیں۔ بے چاری بھابی کو بھی خواہ مخواہ ساتھ خوار کرتی ہیں، میں کتنے دن سے اسی فیملی کی خامیاں سن رہا ہوں گھر میں، جب اُن میں کوئی خوبی ہے ہی نہیں تو بات ختم کریں بس، یہ کیا روز نئے سرے سے اُن کے بخیے اُدھیڑنے شروع ہو جاتے ہیں ہم لوگ۔“ وہ غصے کی حالت میں تیزی سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

”اس کو کیا ہوا، یہ کیوں ہتھے سے اکھڑ گیا؟“ ساس نے حیرت سے سسر کی طرف دیکھا۔

”جو تماشا یہاں ہر چوتھے دن شروع ہو جاتا ہے اسے دیکھ سن کر یہی کرنے گا اور کیا کرے گا۔“ سسر قدرے ناراضی سے بولے۔ ”اس کی شادی کی عمر ہے، اس کے دوست یار سب بیاہے جا رہے ہیں اور یہاں جو بھی رشتہ دیکھا جاتا ہے مسئلہ کشمیر بن جاتا ہے، میں نہ مانوں کی صاف تفسیر، اسے غصہ تو آئے گا ہی۔“

”میں سب جانتی ہوں یہ آگ لگانے والی ماچس کن ہاتھوں نے پکڑ رکھی ہے۔“ ساس نے دانت پیستے ہوئے نگین کی طرف دیکھا۔ ”تو پھر مت دیکھیے کسی کا آگا پیچھا، رہن سہن، ڈال دیجیے رشتہ کپڑے کے کاروبار والوں کے ہاں، لڑکا ساری عمر جریسوں، نہاریوں کے مسالوں میں بسی دلہن برداشت کرتا رہے گا، میں بتا رہی ہوں۔“

”میں نے آج تک گھر کے کسی معاملے کا فیصلہ کیا ہے جو یہ کروں گا، آپ جانیں آپ کے بیٹے جانیں۔“ سسر صاحب تازہ اخبار پکڑے اس میں منہمک ہو کر ایک دم اٹنگ ہو گئے، نگین نے میز پر رکھے برتن سمیٹ کر کچن میں پناہ لینے میں عافیت سمجھی۔ اس کی ساس کی بڑبڑاہٹ لاؤنج سے کچن میں کتنی دیر تک سنائی دیتی رہی تھی۔

”اب رشتہ چاہے طے ہو نہ ہو، اس لڑکی نے حمزہ کا ایک مسئلہ تو حل کیا۔ کچن میں کام کرتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔ پتا نہیں مسئلہ حل ہوا یا اور بڑھ گیا پھر اسے خیال آیا۔ ”میرال صلاح الدین کا جہاں سے تعلق آج ہے، وہ تعلق حمزہ کے لیے بہت سی مصیبتیں کھڑی کرنے والا ہے میں جانتی ہوں۔ پھپھو تو یہ جان کر ہی کہ حمزہ کن سرگرمیوں میں الجھا ہوا ہے اس کی جان کو آ جائیں گی، مہنگی پڑے گی حمزہ کو ماضی سے، روایات سے اور شاید میرال سے بھی محبت۔“ اس نے سوچا اسی دم کچن سلیب پر دھرا اس کا موبائل فون بجنے لگا۔ یہ بینش کی کال تھی۔

”بے چاری لڑکی......“ فون اٹھاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔ ”اسے پتا چلے کہ صبح سے کیسے بخیے ادھیڑے جا رہے ہیں اس کے خاندان کے اس گھر میں تو کبھی کال نہ کرے......“ اس نے فون آن کر کے کان سے لگایا۔

”ہیلو بینش کیسی ہو تم؟“ اس نے دوستانہ انداز میں کہا۔

”میں اچھی ہوں آپ بتائیں۔“

”میں......“ وہ ہولے سے ہنسی۔ ”میں تو بہت ہی اچھی ہوں۔“

”مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“ وہ سنجیدہ تھی اسی لیے اس کو نگین کی بات پر ہنسی نہیں آئی۔

”ہاں کہو۔“

”اس روز جو ہینڈ آؤٹس آپ نے مجھ سے لیے تھے پلیز انہیں کسی کو آگے مت دیجیے گا۔“

”کیوں...... وہ کیوں بھئی؟“ نگین چونکی۔

”وہ اس لیے کہ اب ہم یہ کمپین ہینڈ آؤٹس کے ذریعے نہیں چلا رہے۔“

”وہ کیوں...... اور اگر اس طرح نہیں چلا رہے تو پھر کس طرح چلاؤ گے؟“

”کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور ہوگی جو سچی بات ہے کہ اس وقت مجھے معلوم نہیں۔“ بینش نے کہا۔ ”اور اب کس طرح چلائیں گے وہ بھی مجھے معلوم نہیں، مجھے تو بس منع کر دیا گیا ہے کہ ہینڈ آؤٹس کسی کو نہ دوں۔“

”اچھا۔“ نگین نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”ویسے منع کس نے کیا ہے؟“ پھر اسے خیال آیا۔

”تم نے اس لڑکے کا ذکر کیا تھا ناں۔ جس کی مدر کسی حوالے سے میرال صلاح الدین کو جانتی ہیں، اسی لڑکے نے منع کیا۔“

”اچھا کیا تم مجھے اس لڑکے یا اس کی مدر کا کانٹیکٹ نمبر دے سکتی ہو؟“ نگین نے کہا۔

”وہ۔“ بینش ٹھٹک گئی۔ ”لیکن آپ کیوں مانگ رہی ہیں؟“

”وہ......“ نگین کو فوری طور پر کوئی وجہ سمجھ نہیں آئی۔ ”ہاں۔“ پھر اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”ایسا ہے کہ تم سے اس مظلوم لڑکی کا احوال سن کر میں بہت اپ سیٹ ہوئی، میرا دل چاہتا ہے کہ اس کی تلاش میں، میں بھی اپنا کوئی حصہ ڈالوں۔“ نگین کو اسے اپنا یہ بہانہ بھونڈا سا لگ رہا تھا مگر اس کے سوا اور کچھ سوجھا ہی نہیں تھا۔

''دراصل میں خود نہیں جانتی کہ ابھی وہ لوگ کیا کرنے والے ہیں اور کسی کا بھی کانٹیکٹ نمبر کسی دوسرے کو اس کی اجازت کے بغیر کیسے دیا جاسکتا ہے۔'' بینش نے کہا۔

''ہاں بھئی یہ بھی ہے۔'' نگین نے اس کی بات کی تائید کی اور دل ہی دل میں اس کی سمجھداری کو سراہا بھی۔

''ٹھیک ہے پھر جو بھی آگے پروگریس ہو، مجھے ضرور بتانا......اس نے کہا۔

''ہاں جی ضرور بتاؤں گی۔'' اب بینش کو نگین کا اس معاملے میں اتنی زیادہ دلچسپی لینا کھٹکنے لگا تھا۔

☆☆☆

''تم تو اتنے مصروف آدمی ہو تم کیسے آگئے یہاں......؟'' علینہ کو فہد کی اچانک ایبٹ آباد آمد پر جتنی خوشی ہو رہی تھی وہ اسے بیان نہیں کر پا رہی تھی۔

''کیوں، مصروف لوگ کہیں آتے جاتے نہیں ہیں کیا......؟'' وہ بے نیازی سے بولا اور پھر نادیہ سے مخاطب ہوا۔

''علینہ ......صرف ہائٹ میں بڑی ہوئی ہے، حرکتیں اب بھی ویسی ہی لگتی ہیں جیسی اس وقت تھیں جب یہ گریڈ ٹو یا تھری میں پڑھا کرتی تھی۔''

''یہی تو......!'' ڈاکٹر نادیہ کے دل کے اندیشے مزید بڑھنے لگے۔ ''میرا دل چاہتا ہے کہ کسی طرح علینہ کی پوری شخصیت کو جادو کی چھڑی سے بدل ڈالوں۔'' وہ سوچ رہی تھیں۔

''تم پہلے بھی مجھ سے جیلس ہوتے تھے اور اب بھی مجھ سے جیلس ہو رہے ہو۔'' ان کی توقع کے برعکس علینہ نے مکمل اعتماد کے ساتھ فہد کو جواب دیا۔ ''پہلے البتہ مجھے پتا نہیں چلتا تھا اب سمجھ آرہا ہے کہ یہ صرف جیلسی ہے۔''

''اوہ......!'' فہد نے منہ بنا کر کہا۔ ''تو تمہیں سمجھ آگیا، میں سمجھا میرا راز، ابھی تک راز ہی ہے۔''

''دیکھا تم خود ابھی تک خود کو سورما ہی سمجھتے ہو، لاکھ تم سیلیبریٹی بن چکے ہو لیکن یہ مت بھولو کہ باقی دنیا بھی لمبا بڑھ کر بڑی ہو چکی ہے۔''

''واہ بھئی ویٹس گریٹ......'' فہد نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔ ''اب تو علینہ مجھے سرپرائز دینے لگی ہے آنٹی۔'' وہ مصنوعی حیرت سے نادیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں تم سے کہہ رہی ہوں فہد......تم یہیں ٹھہرو ہمارے پاس، کہاں ہوٹلز میں خوار ہوتے رہو گے۔'' نادیہ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے ایک بار پھر اصرار کیا۔

''دراصل آنٹی میں ایک سیریس کام کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں، مجھے یہاں سے آگے بالاکوٹ بھی جانا ہے اور شاید ایک سے زیادہ بار جانا پڑے۔ آنے جانے کی دیر سویر میں، میں آپ پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا، ویسے بھی۔'' وہ شرارت سے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تو اب بھی آپ سے ڈر لگ رہا ہے، مجھے یقین نہیں آرہا آپ وہی ڈاکٹر آنٹی ہیں جن سے ہم بچپن میں اتنا ڈرا...کرتے تھے......کیوں علینہ یاد ہے ناں؟'' اس نے علینہ کو مخاطب کیا۔

''بس ابھی ان کا خوشگوار موڈ خراب ہوتا ہے۔'' اس نے سوچا۔ علینہ نے لرز کر نادیہ کی طرف دیکھا۔

''تم فکر نہیں کرو، تمہارے ساتھ میرا موڈ بالکل نہیں بدلے گا کیونکہ تمہیں دیکھ کر مجھے بہت سے پرانے لمحے یاد آگئے اور میں سوچ رہی ہوں کہ جب انسان عمر میں آگے بڑھتا ہے تو اکثر پرانے لمحے خوشگوار محسوس ہونے لگتے ہیں۔'' نادیہ نے مسکرا کر کہا۔ اُن کی بات سن کر فہد اور علینہ نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر علینہ کی نظر فہد کے دائیں ہاتھ کے کھڑے انگوٹھے پر پڑی جس سے وہ ''دیکھ لو کتنا فرق آگیا۔'' کا اشارہ دے رہا تھا۔

''ویسے تمہیں بالاکوٹ کیوں جانا ہے؟'' نادیہ نے پوچھا۔ ''کیا وہاں پہاڑوں پر کوئی کوکنگ شوشوٹ کروگے؟''

''ارے واہ..... یہ خیال آپ کو کیسے آیا؟'' وہ خوش دلی سے مسکرایا۔

''ایسے کہ ایک روز میں ٹی وی پر دیکھ رہی تھی کوئی مشہور شیف تھا جو بتا رہا تھا کہ وہ چاروں صوبوں میں گھوم کر اہم مقامات کے آؤٹ ہکرٹس میں جا کر لوکل کھانے بناتا ہے۔''

''ہاہا.....'' فہد نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔ ''یہ تو بہت اچھا آئیڈیا دیا آپ نے ..... میں بھی اپنی ٹیم کو یہاں بلا لیتا ہوں۔'' پھر وہ سنجیدہ ہوگیا۔ ''آنٹی میں بالاکوٹ جا کر میرال اور رابعہ آنٹی کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔''

اس کی بات سن کر علینہ کے دل نے ایک دھڑکن مس کر دی۔

''میرال اور آنٹی رابعہ.....'' نادیہ نے صوفے کی پشت چھوڑ کر سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔ ''لیکن وہ اب تمہیں وہاں کیسے ملیں گی؟''

''میں نے سنا تھا کہ وہ لوگ یہاں سے شفٹ کر گئے تھے۔'' فہد نے کہا۔

''ہاں لیکن آنٹی رابعہ کا تو انتقال ہو چکا زلزلے میں۔'' نادیہ نے کہا۔ ''اور میرال .....'' انہوں نے فہد کی طرف دیکھا۔ ''زلزلے کے بعد قائم ہونے والے امدادی کیمپوں میں سے غائب ہوگئی تھی اچانک.....''

علینہ نے چونک کر اپنی ماں کی طرف دیکھا، اتنے برسوں میں وہ پہلی بار اس موضوع پر بولی تھیں۔

''آپ کو کیسے معلوم ہے آنٹی کہ وہ غائب ہوگئی؟'' فہد نے پوچھا۔

''یہاں سے بہت سے ڈاکٹرز وہاں گئے تھے جن دنوں زلزلہ آیا، مجھے ہر طرح کی رپورٹس ملتی رہتی تھیں۔''

''توبہ..... یہ کتنی گہری ہیں مجال ہے جو گھر میں کبھی تذکرہ کیا ہو.....'' علینہ نے نادیہ کی بات سن کر دل میں سوچا۔

''آنٹی میں سیریسلی میرال کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کہاں چلی گئی۔'' فہد نے کہا۔ ''ہم لوگوں کی فیملیز جس طرح آپس میں ایک گھر کے افراد کی طرح جڑی ہوئی تھیں کیا اس تعلق کی بنا پر ہمارا فرض نہیں بنتا کہ اس کا پتا لگائیں۔''

''تمہیں اتنے سالوں کے بعد یہ خیال کیسے آیا؟'' نادیہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''کیونکہ مجھے اس صورتِ حال کا پتا ہی ابھی چلا ہے، وہ بھی اتفاق سے۔'' فہد نے کہا۔ ''اور جو خوفناک حقائق میرے سامنے آئے ہیں اُن کو سننے کے بعد میں چین سے بیٹھا رہ نہیں سکا فوراً اِدھر بھاگے چلے آنے کو دل چاہنے لگا۔''

''لیکن یہاں جو لوگ اس وقت موجود تھے اور آنٹی رابعہ کو جانتے تھے ان پر تو کوئی اثر نہیں ہوا، میں نے ایک دو سے تشویش کا اظہار کیا تو بھی کسی نے نوٹس نہیں لیا بلکہ دو تین لوگوں نے تو یہ خبر بھی اڑادی تھی کہ وہ خود اپنی مرضی سے یہاں سے چلی گئی تھی۔ ایک صاحب نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ کسی غیر ملکی امدادی ٹیم کے ساتھ چلی گئی تھی۔''

''نہیں آنٹی، یہ سب افواہیں اور من گھڑت باتیں ہیں۔'' فہد نے سر ہلایا۔ ''جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس اور بھیانک ہے۔''

''کیا تم نے کوئی سوشل ویلفیئر تنظیم جوائن کر لی ہے جو میرال کے ریسکیو کے لیے اِدھر آگئے ہو؟'' علینہ کو معلوم تھا اس کا لہجہ بے تکا ہو رہا تھا لیکن اس نے پھر بھی بلند آواز میں پوچھا۔

''نہیں علینہ، میں نے ایسی کوئی تنظیم جوائن نہیں کی۔'' اس کے برعکس فہد نرمی سے بولا اور پھر اس نے نادیہ کی طرف دیکھا۔

''پتا نہیں آنٹی کیا بات ہے کہ میں میرال کے متعلق یہ خوفناک بات سن کر نہ چین سے سو سکا نہ آرام سے دن گزار سکا، ایک عجیب سی بے چینی میرے دل و دماغ میں گھر کر گئی اور مجھے لگا مجھے فوراً اس کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنی چاہیے۔''

''جیسے اب تو وہ تمہیں مل ہی جائے گی اتنے عرصے کے بعد۔'' علینہ کا لہجہ مزید تلخ ہوا اتنا تلخ کہ نادیہ کو بھی اس کی بات کا نوٹس لے کر اس کی طرف دیکھنا پڑا۔

''تمہاری یہ عادت کب جائے گی کہ تم کسی کے جذبات کو سمجھے بغیر فضول بات کر دیتی ہو۔'' نادیہ نے علینہ کو ڈانٹا...... ''تمہیں معاملے کی intensity کا احساس نہیں ہو رہا یا تم سمجھتی ہو کہ ہر کوئی تمہاری طرح بے حس ہے جو ایسی بات کو بھی ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دے۔'' انہیں علینہ کے لہجے کی تلخی بری طرح کھلی تھی۔

''اٹس او کے آنٹی۔'' فہد نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔'' ایک لحاظ سے علینہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہے، یہ تو یہ غیر منطقی سی بات، مجھے علم ہے کہ وہ بالاکوٹ نہ مظفر آباد کہیں نہیں ہے اور پھر میں اکیلا اتنے بڑے ملک میں اس کا سراغ کیسے لگا سکتا ہوں جبکہ اسے غائب ہوئے اتنا عرصہ گزر گیا اور میں اب جان رہا ہوں۔''

''تمہاری تلاش کا کیا نتیجہ نکلتا ہے کیا نہیں یہ تو بعد میں پتا چلے گا لیکن کسی کو تمہاری سوچ کا مذاق اڑانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔'' نادیہ نے ایک مرتبہ پھر علینہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

فہد، ماں بیٹی کے درمیان ہونے والی اس تلخی پر پریشان ہونے لگا۔

''تم بیٹھو...... میں کھانا لگواتی ہوں۔'' پھر نادیہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ فہد نے سر ہلاتے ہوئے انہیں دیکھا اور ان کے جانے کے بعد علینہ کی طرف دیکھا جس کا موڈ خراب ہو رہا تھا۔

''ایک بات پوچھوں علینہ......'' اس نے کہا۔

علینہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

''میرال کے ذکر پر تمہارا موڈ کیوں خراب ہو جاتا ہے، میں نے پہلے بھی محسوس کیا ہے جب کبھی فون پر اس کا تذکرہ ہوا تمہیں اچھا نہیں لگا۔''

''غلط فہمی ہے تمہاری۔'' علینہ نے سر جھٹکا۔ ''میں کسی ایسے کے لیے اپنا موڈ کیوں خراب کروں گی جو ہے ہی نہیں، جس کا کچھ اتا پتا ہی نہیں۔'' اس نے شانے اچکائے۔

''ویسے ایک اور لڑکا بھی اسے تلاش کرتے اِدھر آیا تھا۔'' اس نے فہد کی طرف دیکھا۔ ''اور اس سے میں نے کہا تھا کہ اگر کبھی میرال کے بارے میں پتا چلے تو مجھے ضرور بتانا لیکن اس کی طرف سے کوئی خبر نہ آنے کا مطلب ہے وہ اسے بھی نہیں ملی۔''

''اسے نہیں ملی تو ضروری تو نہیں کہ مجھے بھی نہیں ملے گی؟'' فہد نے کہا اور اٹھ کر کمرے میں موجود واحد کھڑکی کے قریب آ گیا، کھڑکی پر پردے برابر تھے اور وہ مضبوطی سے بند تھی۔ فہد نے پردے کی ڈوری کھینچ کر اسے ایک طرف ہٹایا، بند کھڑکی سے باہر نومبر میں ایبٹ آباد کا موسم تھا، باہر یقیناً بہت ٹھنڈ تھی جبکہ کمرے کا ماحول پرانی طرز کے بنے آتشدان میں جلتے جدید گیس ہیٹر کی وجہ سے گرم تھا۔ اس نے دلچسپی سے بلند پہاڑوں میں بنے گھروں میں جلتے برقی قمقموں کو دیکھا جو اپنی اونچائی اور نظر سے فاصلے کے سبب آسمان پر ٹنگے ستاروں سے مشابہ تھے۔ وہ ان روشنیوں کو دیکھتے ہوئے یادوں کی گلی میں اتر گیا۔

''میں نے تمہیں مضمون لکھ کر دیا، تم میرے لیے آسمان سے ستارے تو خیر کیا توڑ کر لاؤ گے، جاؤ ان پہاڑوں پہ بنے کسی گھر سے ایک بلب ہی اتار لاؤ......'' اسے برسوں پہلے میرال کی کہی بات یاد آ گئی۔

''یہ مضمون اس نے خود نہیں لکھا فہد بیٹا۔'' میرال کی دادی نے کہا تھا۔ ''ہمارا ایک مہمان آیا تھا بڑی دور سے، ان سے لکھوایا ہے۔ لہٰذا تم اس کا احسان ہرگز نہ ماننا۔''

''تم کتنی mean ہو میرال، مہمانوں کی مہمانداری کرنے کے بجائے ان سے اپنے کام کراتی ہو۔'' اس نے میرال کو چڑایا تھا اور وہ واقعی چڑ بھی گئی تھی۔

''میں نے سوچا شاید تم مجھ سے ملنے اتنی دور آئے ہو۔'' پیچھے سے آتی علینہ کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا۔

''اوہ...... تو یہ وجہ تھی موڈ خراب ہونے کی۔'' اس نے سوچا۔

''مگر نہیں۔'' وہ افسردگی سے بولی۔ ''سلیبریٹیز کسی ایسے کام کے لیے ہی ایسی جگہوں تک آتے ہیں جن میں ان کی تشہیر کا موقع مل سکے۔''

''یار تم اچھی بھلی ٹھیک ہو گئی تھیں پھر سے اتنی نیگیٹو کیوں ہونے لگیں۔'' وہ اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ ''دیکھو تم اور میں بہت اچھے دوست ہیں، ہماری اکثر فون پر بات ہو جاتی ہے، ہم اسکائپ پر ایک دوسرے کو دیکھ بھی لیتے ہیں، فاصلے ہمارے لیے معنی نہیں رکھتے کیونکہ ان سب سہولتوں کی وجہ سے فاصلے سمٹ چکے ہیں لیکن وہ جو نہ جانے کہاں اور کس حال میں ہے اس کا پتا لگانا میں سمجھتا ہوں صرف میری نہیں تمہاری بھی ذمے داری ہے۔''

''ایک بے مقصد تلاش کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، صرف وقت ہی ضائع ہوتا ہے اور کچھ نہیں۔'' وہ سر جھٹکتے ہوئے بولی۔ فہد گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

☆☆☆

انہوں نے اسکرین پر روشن صفحے کو اسکرول کرتے ہوئے نیچے دیکھا۔ ان گنت تبصرے ان کی نظروں کے سامنے تھے۔ دنیا کے مختلف کونوں سے، مختلف زبانوں میں لوگوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہوا تھا۔

''لڑکیاں صرف تیسری دنیا کے ایک غیر ترقی یافتہ ملک ہی میں غائب نہیں کی جاتیں، دنیائے اوّل کے ترقی یافتہ اور مہذب ترین ممالک میں ایسے واقعات کا تناسب کہیں اونچا ہے۔'' انہوں نے ایک تبصرہ پڑھا۔

''تیسری دنیا کا ایک غیر ترقی یافتہ ملک۔'' انہوں نے زیرِ لب یہ الفاظ دُہرائے۔ ''اتنے برسوں بعد ہم اپنے ملک کا یہ امیج دنیا بھر کے لوگوں کے سامنے بنا پائے ہیں۔''

''ایک ایسا ملک جہاں استعمال کے لیے بجلی کم ہے، کھانے کو اناج کم ہے، پہننے کو کپڑا انہیں مل رہا، مذہبی جنون کے نام پر بھائی، بھائی کا گلا کاٹ رہا ہے، جہاں زراعت اور صنعت کا پہیہ جامد کھڑا ہے، جہاں انسان کو اپنی روزمرہ زندگی گزارنے کے لیے سخت جدوجہد کا سامنا ہے، وہاں ایک لڑکی کا غائب ہو جانا کیا اتنی قابلِ غور بات ہے کہ کوئی لمحے بھر کو رک کر اس پر غور ہی کر لے۔'' ایک اور کمنٹ کو پڑھ کر ان کا سر مزید جھک گیا۔

''ہمارے ہاں ڈرگز کی اور انسانوں کی ٹریفکنگ معمولی بات ہے، ہمارا بڑا مسئلہ دہشت گردی ہے جو آئے روز ہمارے پیاروں کی اجتماعی جانیں لے رہی ہے، دنیا والو ہمارا یہ مسئلہ حل کرا دو۔'' کسی نے لکھا تھا۔

''تم لوگوں کا یہ صفحہ ایک ایسا ہائیڈ پارک بن گیا ہے جہاں لوگ اپنے، اپنے ڈپریشنز، ٹینشنز، طنز اور مذاق کی ٹوکریاں جھاڑ رہے ہیں، اصل مسئلے کی طرف تو بہت کم لوگ توجہ دے رہے ہیں۔'' انہوں نے اس شام دانیال سے کہا۔

''ہر اہم مسئلے کو پہلے پہل یہی ٹریٹمنٹ ملتا ہے پھر آہستہ آہستہ وہ عوام کی آواز بنتا جاتا ہے، ہمیں صبر اور تحمل سے

کام لینا ہوگا۔'' دانیال نے انہیں تسلی دی۔

''ایک بچی کی عزت اور آبرو لوگوں کے ہاتھوں تماشا بن رہی ہے اور تم کہتے ہو صبر کروں، کیسے صبر کروں میں؟'' انہوں نے روہانسی ہوتے ہوئے کہا۔

''ممی یہ مسئلہ پرانا ہے، اس کی خبر اب ہمیں لگی ہے، اب تک نہ جانے وہ کن اور کیسے حالات سے گزر چکی ہوگی۔'' دانیال نے تحمل سے کہا۔ ''ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ ہم کیسے اس کو ریسکیو کر سکتے ہیں، یہاں جو لوگ اقتدار اور اختیار کے مالک ہیں وہی تو اس مافیا کے لیڈر ہیں وہ ہی تو اس کو پروٹیکشن دے رہے ہیں، وہ شخص سردار مہرزاد جس کے حوالے سے یہ خبر نکلی وہ صرف ایک سیاستداں سے اسمبلی کا ممبر بن چکا ہے اور نہ صرف ممبر بن چکا ہے بلکہ اسی ہفتے میں وہ وزارت کا حلف لے کر کابینہ کا ممبر بھی بننے جا رہا ہے اور اس کا پورٹ فولیو آپ جانتی ہیں کیا ہوگا......؟'' اس نے عافیہ کی طرف دیکھا۔ ''اطلاعات ونشریات۔'' اس نے الفاظ کو چبا چبا کر ادا کیا۔ ''گویا انفارمیشن اور کمیونیکیشن کے تمام ذرائع پر اس کا قبضہ ہوگا، ہم کتنی اور کہاں تک آواز اٹھائیں گے۔''

''میں نے مسز اظہر کے ذریعے چیف منسٹر صاحب تک رسائی حاصل کرنے کی درخواست دی ہے، تمہارے ڈیڈی نے زیدی صاحب سے بھی بات کی ہے چیف منسٹر کی وائف ان دنوں شکاگو میں ہے ثنا وہاں اس سے ملاقات کرنے کی کوشش کر رہی ہے، عاصم اپنے حلقے میں سرگرم ہے، کچھ نہ کچھ تو نتیجہ نکلے گا ان سب کوششوں کا۔'' عافیہ نے اپنی ڈھارس دوبارہ سے باندھتے ہوئے کہا۔

''ہاں کوشش تو ترک نہیں کرنی، وہ تو ہر حال میں جاری رہے گی۔'' دانیال نے سر ہلایا۔ ''میں تو راستے کی رکاوٹوں کا ذکر کر رہا تھا صرف......''

''راستے کی رکاوٹوں، صبر اور تحمل، برداشت اور انتظار کی کیفیت، امید اور آس کے سمندروں میں ڈولتے رہنے کی کیفیت سے ہم سے زیادہ کون واقف ہوگا بیٹا......'' عافیہ نے دانیال کے جیتے جاگتے، صحت مند، لمبے اونچے وجود کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایمان اور امید کی اس آزمائش میں بھی انشاء اللہ ہم سرخرو ہوں گے، صوفی صاحب اللہ کے نیک بندے تھے، اللہ کے نیک بندے یونہی تو کوئی بات منہ سے نہیں نکال دیتے۔''

''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔'' دانیال مسکرایا۔ ''سو امید اور ایمان کا دامن تھامے رہیے، اللہ تعالیٰ راستے خود بنائے گا۔''

''انشاء اللہ......'' عافیہ نے بے اختیار کہا اور انہیں اپنے دل میں سکون اترتا محسوس ہونے لگا۔



چوہدری رزاق کب سے امراؤ بیگم کے پاس بیٹھا اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہا تھا۔ اس کی بات سنتے ہوئے امراؤ بیگم کے چہرے کے زاویے بن اور بگڑ رہے تھے۔ تاؤ شریف نے ہارمونیم کو اپنے اندر سمیٹے مخملی غلاف کو اتارتے اور پھر نرم کپڑے سے اسے صاف کرتے ہوئے کن انکھیوں سے کئی بار ان دونوں کو دیکھا تھا۔ یقیناً کوئی بہت اہم مسئلہ درپیش تھا۔ چوہدری رزاق نے بہت دن پیچھے ادھر چکر لگایا تھا ورنہ وہ ملتان والی بختو چوہدری کے ڈیرے پر پڑا رہتا تھا۔

''بڈھا ہو رہا ہے اب تو میری طرح۔'' تاؤ شریف نے ہاتھ میں پکڑا چھوٹا پیچ کس دانتوں میں دباتے ہوئے سوچا۔ ''چند سال پہلے پورے جوبن پر تھا، اس کے لائے شکاروں کی دھوم ہوا کرتی تھی، امراؤ بیگم اور بختو کے ڈیروں کی رونقیں اس کی لائی لڑکیوں کے دم سے آباد تھیں۔'' اس نے آنکھ اٹھا کر چوہدری رزاق کی طرف دیکھا۔

''لیکن وہ کہتے ہیں ناں کہ ہاتھی مرا بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ چوہدری رزاق بڈھا ہو گیا مگر نظر چیتے کی سی رکھتا

ہے، اب نہ جانے کون سی سنانی سنانے آیا ہے امراؤ بیگم کو اللہ خیر ہی کرے، یوں جب بھی آتا ہے خیر کی خبر کم ہی لاتا ہے، مانو اس کے منہ سے الفاظ نہیں نحوست کی چھچھوندریں نکلتی ہیں جو اگلے کو نہ اُگلتے بنتی ہیں نہ نگلتے بنتی ہیں۔'' اس نے ایک دفعہ پھر چوہدری رزاق کی طرف دیکھا جو اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوتے بلند آواز میں گلا کھنکھار رہا تھا۔

''لو پھر بی بی جان۔'' وسیع ہال کمرے میں چوہدری رزّاق کی آواز گونجی۔ ''میں نے تمہیں اطلاع دے دی، آگے تفتیش کرنا اور معاملے کو بگڑنے سے پہلے سنبھال لینا تمہاری عقل کا کام ہے۔'' اس نے گلے میں بندھا اُونی مفلر کھول کر دوبارہ اس کی گرہ باندھتے ہوئے کہا اور کمر کے پیچھے ہاتھ باندھ کر سیانوں کی طرح کھڑا ہوگیا۔

''ارے تو جاتے کدھر کو ہو اب؟'' امراؤ بیگم کے چہرے پر ہلکی سی تشویش کے آثار تھے۔

''چلتا ہوں اب...... واپس ملتان پہنچتے، پہنچتے رات پڑ جاتی ہے۔'' وہ ایک پاؤں پر وزن ڈال کر تھوڑا ترچھا ہو کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

''کدھر...... تم ملتان جاتے ہو، ابھی پڑے رہو یہیں...... میں معاملے کا کچھ کر تو لوں......'' امراؤ بیگم بلند آواز میں بولی تھی۔

''کوٹھی تیار ہے، اس کی چابی تم تک پہنچ جانی ہے ایک آدھ دن تک۔ سردار وزیر بننے والا ہے امراؤ بیگم، لڑکی پر سے تمہارا سارا اختیار ختم ہونے کو ہے، کما لیا جتنا تم نے اس سے کما لیا، اب نہ سود ملے گا نہ بیاج...... اس طرف سارے انتظام مکمل ہیں، میں نے تمہیں ساری صورتِ حال بتا تو دی ہے، تم نے اب معاملے کا آگے سے کرنا بھی کیا ہے۔'' چوہدری رزاق سامنے دیوار پر لگے آئینے کے قریب جا کر اس میں جھانک کر اپنے بال ہاتھ سے سیدھے کرتے ہوئے بولا۔

''ارے بیڑا غرق ہو جائے تیرا کم بخت، عین موقع پر آ کر بتا رہا ہے۔'' امراؤ بیگم دانت پیستے ہوئے بولی۔

''لو جی، مجھے تو پہلے ہی پتا تھا یہ بندہ خیر کی خبر نہیں لا سکتا۔'' تاؤ شریف نے سوچا۔

''جب پتا چلا فوراً ہی تو آ دھمکا ہوں، سفر میں جو وقت لگا سو لگا اور کیا کرتا، یہ بات فون پر کرنے کی تھی نہیں، تمہیں پتا نہیں ہے امراؤ بیگم اِدھر فون کی کالیں بھی ٹریس ہوتی ہیں۔'' چوہدری رزاق اکڑ کر بولا۔

''پھر بیٹھ جا اِدھر، سر جوڑ میرے ساتھ اور کوئی ترکیب نکال، لڑکی کا معاملہ سیدھا نہیں ہے، اوپر سے تو بتا رہا ہے بیٹی والوں کی بھی شامت آئی کھڑی ہے۔'' امراؤ بیگم بولی۔

''میں بتا رہا ہوں بی بی جان......'' چوہدری رزاق اپنی اہمیت بنتے دیکھ کر شان سے امراؤ بیگم کے سامنے رکھے ٹیبز لانگ پر ٹِک گیا۔

''یہ جو سردار ہے ناں یہ امرتی کی طرح سیدھا بندہ ہے، اس کے تو اپنے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی ہوگی کہ اگلا قدم دھرنے والا ہے، اس کی اپنی پارٹی کے لوگ بھی اتنی سی دیر میں عاجز آ گئے ہیں اس سے، تم لڑکی کدھر پھنسا بیٹھی ہو۔''

''میں تو لاکھ جان چھڑاتی رہی، کئی بار کہا مجھے نہیں چاہیے ہزار راتوں کی بے منت یکمشت، لڑکی کو کھونٹے سے باندھ دوں تو سمجھو اپنے ہاتھ باندھ لیے مگر وہ رقم بڑھاتا گیا، تحفے تحائف آنے لگے، یہ جو باہر شان سے کھڑی چمکتی گاڑی دیکھ رہے ہو ناں جس پر اسٹیشن سے بیٹھ کر یہاں تک آئے ہو، یہ بھی اسی نے مجھے دلوائی ہے، لڑکی کے لیے الگ گاڑی، شوفر، اس کے لباس، جوتے، زیور سب اُدھر سے آتے ہیں، امپورٹڈ اور قیمتی ترین...... بیچ میں میرے تیرے بھی ہاتھ مار لیتے ہیں۔'' امراؤ بیگم نے گھبرائے ہوئے انداز میں جتایا۔

''دلدل ہے ناں دلدل...... روپے پیسے کی دلدل، مایا کا جال، بس سب پھنس جاتے ہیں، تم بھی پھنس گئیں کوئی بات نہیں، ہوتا ہے...... ہوتا ہے۔'' چوہدری رزاق نے کتھے چونے کے کھائے ہوئے اپنے ادھورے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

''نہ ہنس کم بخت نہ ہنس۔'' امراؤ بیگم ڈپٹ کر بولی۔ ''کچھ سوچ اب کرنا کیا ہے۔''

''اس شہزادے نے ہائی الرٹ کیا ہوا ہے بیٹی والوں کو، معاملے کی چھان بین جاری ہے، اِدھر اس نے حلف لیا، اُدھر منسٹری سے پہلا آرڈر اسی کا ہونا ہے، لڑکی اِدھر پہنچی کیسے، نہ تمہاری جان بچنی ہے نہ بختو کی، میں تو بھائی کب کا ریٹائر ہو چکا، میری بلا جانے لڑکی کدھر سے کہاں پہنچی، یہ تو جانیں ملتان اور لاہور شہر کی وڈی (بڑی) ڈیرے داریاں۔'' چوہدری رزاق اٹنک ہوا۔

''وہ جو بڑا صاحب ہے، اس کا بیٹا بھی تو اسی در کا مرید ہے، نازو کے حسن کا دیوانہ پھر بھی کئی بار مجھ سے کہہ چکا ہے اور امراؤ بیگم ہیرا تو تم نے بہت کم قیمت میں سردار کی جھولی میں ڈال رکھا ہے، ذرا مجھے بھی چہرہ تو کراؤ، میں اسی سے بات کرتی ہوں۔'' امراؤ بیگم کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''اسے کہنا تھا ہیرا معمولی نہیں کوہِ نور ہیرا ہے جو بہت قیمتی تو ہے مگر راس کسی کو نہیں آتا۔'' چوہدری رزاق زور سے ہنسا۔

''خیال سے بات کرنا بڑے صاحب کے بیٹے سے...... پارٹی ایک ہی ہے، پارٹی کے اندر ٹکراؤ ہو گیا تو پارٹی نے ترجیح سردار کو ہی دینی ہے، بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا چکا ہے، پارٹی کو بھی اس تازے خون کی ضرورت ہے، بڑا صاحب پرانا ہو چکا کب کا۔'' چوہدری رزاق نے کہا۔

''تو کوئی ملتان شلتان نہیں جا رہا، بیٹھا رہ اِدھر ہی، میں اپنی سی کرلوں پھر دیکھتے ہیں۔'' امراؤ بیگم نے چوہدری رزاق کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا اور سامنے دیکھتے ہوئے سر ہلا ہلا کر کچھ سوچنے میں مصروف ہوئی۔

تاؤ شریف نے صفائی والا کپڑا تیل کی بوتل اور اپنے اوزار اپنے تھیلے میں ڈالے اور صاف ستھرے، چمکتے ہارمونیم کو واپس مخملی غلاف سے ڈھک دیا۔

☆☆☆

الیکشن میں فتح کے بعد اسے اپنے علاقے میں ایک بار تقریباً ایک ہفتہ تو گزارنا ہی تھا۔ علاقے کے وہ بادشاہ گر جن کے رزق اور عیاشیاں آنے والے ساڑھے چار سال میں اس کے دم سے چلنی تھیں۔ اسے علاقے کے ووٹر کو اپنی مٹھی میں مزید دبا لینے کے مشورے دے رہے تھے۔ وہ مخالف جو یقیناً اس کے باپ کے خون کے مجرم بھی تھے اور چند روز پہلے تک بندوقیں اٹھا کر اس کے خلاف نعرے لگاتے پھر رہے تھے، ان میں سے بھی کئی رات کے اندھیروں میں اس کے ڈیرے تک آنے اور ملاقاتیں کرنے لگے تھے، وہ خود کو گالیاں دینے والوں کے منہ سے اپنی تعریفیں سنتا اور دل میں مسکراتا۔

''اقتدار بھی کیا چیز ہے، بندے کو شاہ اور مخلوق کو گدا بنا دیتی ہے۔'' وہ سوچتا۔ ''لیکن اس اقتدار کا ہما سر سے اُڑ جائے تو شاہ کو گدا بننے میں چند لمحے بھی نہیں لگتے۔''

''سردار صاحب، زنان خانے سے آپ کے لیے پیغام آیا ہے، بڑی بی بی ملاقات کرنا چاہتی ہیں۔'' ایک ملازم نے اسے اطلاع دی تھی۔

''دوپہر میں آتا ہوں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

باپ کے مرنے کے بعد پاکستان واپس آنے کے بعد اپنی ماں سے یہ اس کی تیسری ملاقات تھی۔ اپنے باپ

کا جانشین قرار دیے جانے کے بعد ہونے والی ملاقات میں اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی ماں کو غور سے سنا اور جانا تھا، اس کے بعد الیکشن مہم شروع کرنے سے پہلے وہ ان سے ملنے بطورِ خاص گھر آیا تھا۔ وہ ایک مختصر ملاقات تھی جو عجلت میں ہوئی اور اب وہ تیسری بار اُن سے ملنے آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ان کے چہرے پر اسے اپنے بیٹے کی کامیابی کی خوشی اور فخر کی جھلک دیکھنے کو ملے گی لیکن اس کی توقع کے برعکس اُن کے چہرے پر تشویش تھی اور پریشانی بھی۔ •

''راستہ پہلے سے زیادہ پُر خار ہو گیا ہے مہر......'' انہوں نے اس کے سامنے بیٹھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

''مجھے پہلو بچا کر چلنے کا حوصلہ دیں۔'' اس نے نرمی سے جواب دیا۔

''تمہارے خاندان کی تاریخ میں پہلو بچا کر چلنے کی کوئی روایت موجود ہی نہیں تو تم کیا بچا پاؤ گے۔'' انہوں نے افسردگی سے کہا۔ ''تم لوگوں کو پُر خار کو گلزار بنانے کا جنون ہو جاتا ہے، ان خارزاروں میں تمہارے شملے اٹکیں چاہیں کانٹوں میں الجھ کر جا بجا اُن پر سوراخ نمودار ہو جائیں۔ تمہاری جبلت میں اس کی پرواشامل نہیں۔'' ان کا لہجہ قدرے سخت ہوا۔

''میں آپ کی بات سمجھ نہیں پایا ہوں۔'' وہ اٹکا...... ''آپ نے سنا نہیں لوگ آپ کے بیٹے کو سرداروں کا ایک نیا روپ قرار دے رہے ہیں، روایت شکن سمجھ رہے ہیں، آپ نے ان چند دنوں میں علاقے میں ہونے والی.. سرگرمیوں میں ایک واضح تبدیلی کی خبر نہیں سنی کیا اب تک؟''

''میں نہیں مانتی کہ تم میری بات نہیں سمجھ پا رہے ہو۔'' ان کا لہجہ مزید سخت ہوا۔ ''میں علاقے میں تمہاری.. سرگرمیوں کی خبر نہیں لوں گی نہ میں نے تمہارے باپ کی ایسی سرگرمیوں کی خبر لی تھی۔''

''پھر......؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے اُن کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر اسے نہ جانے کیا نظر آیا تھا جو وہ ان سے نظریں ہٹا کر کسی دوسری جانب دیکھنے لگا تھا۔

''نظریں کیوں چرا گئے؟'' انہوں نے تیزی سے کہا۔ ''میری طرف دیکھو اور میرے چہرے پر لکھے سوال کا جواب دو۔'' ان کا لہجہ کاٹ دار ہونے لگا۔ ''تم نے اپنے بارے میں کیا دعویٰ کیا تھا یاد ہے؟''

مہرزاد نے ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے سر جھکا لیا۔

''چند مہینے۔'' وہ بولیں۔ ''فقط چند مہینے بھی تم اپنے دعوے پر قائم نہیں رہ سکے اور باپ دادا کے قدموں کے نشانوں پر پاؤں جما جما کر چلتے انہی گلیوں انہی بھول بھلیوں میں جا پھنسے جہاں جا پھنسنے نے اس خانوادے کے خون کو ہمیشہ آلودہ کیا ہے کوئی عزت کبھی نہیں بخشی۔''

''آپ......؟'' مہرزاد نے کچھ کہنا چاہا۔

''مان جاؤ مہرزاد خان کہ جبلت کبھی بدل نہیں سکتی۔'' ان کی آواز مزید بلند ہوئی۔ ''یونہی تمہارا باپ تمہیں ماں کی عادات لے لینے کے طعنے دیتا تھا آج اگر وہ دیکھ رہا ہے تو اس کی تو روح کا بھی سر فخر سے بلند ہو گیا ہو گا۔ بیٹے نے پہلا قدم ہی ایسا رکھا کہ اس کے تخم کی لاج رہ گئی۔''

''آپ غلط سمجھ رہی ہیں، اس کا تعلق ان گلیوں، ان بازاروں اور ان چوباروں سے نہیں ہے۔'' وہ ساری دنیا کے سامنے خود کو ایک کامیاب orator (مقرر) منوانے میں کامیاب ہو چکا تھا مگر اپنی ماں کے سامنے جواب دہ ہوتے ہوئے اس کی آواز حلق میں پھنسنے لگی تھی۔

''اس کا تعلق ایک نجیب الطرفین اور بلند نسب خاندان سے ہے، اس کی رگوں میں پاک خون دوڑتا ہے، شاید

مجھ سے اور آپ سے بھی زیادہ پاکیزہ خون......''

''ہونہہ......!'' انہوں نے اس کے بیان پر سر جھٹکا۔ ''جہاں سے اٹھا کر اسے اپنی خواب گاہ میں لا بٹھاتے ہو، تمہارا یہ اتنا سا عمل آغاز سے اختتام تک ہی پاکیزگی کی گواہی دینے کو کافی ہے، تمہاری بھی......'' انہوں نے سرد نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ ''اور اس کی بھی۔''

''آپ......'' وہ ان کے لہجے اور گفتگو کے سامنے بے بس ہوتا ہوا بولا۔ ''کاش میں آپ کو سمجھا سکتا۔''

''مہرزاد خان، وہ جیسے بھی خاندان سے تعلق رکھتی تھی جہاں آ کر وہ بیٹھ چکی ہے، وہاں کی ہواؤں کی آلودگی اب پاکیزہ ترین پانی میں دُھل کر بھی صاف نہیں ہو سکتی۔'' انہوں نے کہا۔ ''اور تمہارے بارے میں میرا پہلا مان یہ تھا کہ مہرزاد خان سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے چاہے کوئی بھی راہ اختیار کرے، ذاتی زندگی میں وہ اپنے بڑوں اور ساتھ والوں کی اس قبیح جبلت کا ساتھی ہونے کا مظاہرہ ہرگز نہیں کرے گا اور میری بدقسمتی۔'' ان کا لہجہ پہلی بار کمزور ہوا۔ ''کہ مہرزاد خان اپنے پہلے قدم پر ہی یہ آزمائش ہار گیا۔''

''مت کہیں ایسا۔'' وہ ان کی کاٹ دار گفتگو اور اس جذباتی انداز کو دیکھ کر خود پر قابو پاتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''آپ کے مخبر چاہے وہ جو بھی ہوں آپ کو میرے ظاہری فعل کی خبر ضرور دے سکتے ہیں، میرے اندر کیا ہے، اس فعل کے پیچھے میری نیت کیا ہے، اس کی خبر تو اُن کے فرشتے بھی آپ کو نہیں دے سکتے۔'' اس کی آواز نہ چاہتے ہوئے بھی بلند ہونے لگی۔ ''میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں کیا کر رہا ہوں۔'' اس نے ان کی طرف دیکھا۔ ''میں نے اپنے بارے میں فرشتہ ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا، میں ایک انسان ہوں اور خدا نے جس خاندان میں مجھے پیدا کیا میں اسی کا ایک فرد ہوں، جبلتیں اچھی ہیں یا خبیث، مجھے بھی ورثے اور جہیز میں ملی ہیں، میں لاکھ پہلو بچا کر چلنے کا دعویٰ کروں یہ اپنی خباثت سمیت ہمیشہ میرے سامنے آ کر کھڑی ہوتی رہیں گی، کبھی میں ان کو پچھاڑوں گا...... کبھی یہ مجھے پچھاڑ لیں گی، اس لیے کہ میں فرشتہ ہرگز نہیں ہوں۔'' اس نے جتانے کے سے انداز میں اپنی ماں کو دیکھا۔

''لیکن اس معاملے کو۔'' وہ ان کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھتا ہوا بولا۔ ''اس معاملے کو جبلت کی خباثت سے مت جوڑیں نہ میں آپ کو وضاحت دے سکتا ہوں، نہ آپ میری وضاحت کو ماننے پر تیار ہوں گی۔ اس لیے اس معاملے میں مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے پلیز...... ان کی اور سب باتیں سن لیا کریں جو صبح عالمِ مدہوشی میں آنکھ کھولتے ہیں اور ہر رات جن کی کسی نئے چہرے کے پہلو میں گزرتی ہے لیکن اس معاملے میں ان کی ہر بات پر اپنے کان بند کر لیا کیجیے۔'' وہ ملتجیانہ انداز میں بولا۔

''ہرگز نہیں۔'' وہ ایک بار پھر مضبوط لہجے میں قطعیت سے بولیں۔ ''دنیا کا ہر معاملہ جیسے چاہو اپنی مرضی سے نمٹا لو مگر میری اگلی نسل کی نیو (بنیاد) گناہ کی آلودگی سے پاک کرو مہرزاد خان' میری خاطر اپنے خاندان کی تاریخ میں یہ پہلا قدم تم اٹھا لو، حرام سے بچ جاؤ، حلال کو برتو، حلال سے نسل آگے بڑھاؤ، تمہارا یہ پہلا قدم ہو سکتا ہے اس خاندان کی اگلی تاریخ بدل ڈالے۔''

ان کی اس بات نے جیسے اسے دم بخود کر دیا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر کہہ نہیں پا رہا تھا۔

''اور اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو مجھے اپنی ماں کہنا اور سمجھنا چھوڑ دو، میں بدقسمت اپنی زندگی کی واحد خواہش دل میں لیے دنیا سے کنارہ کر جاؤں گی، تمہاری شکل نہیں دیکھوں گی، اگر میں نے ایسا نہ کیا تو جب، جب تمہیں دیکھوں گی میری خواہش ایک کسک بن کر میرے دل میں کانٹے کی طرح چبھے گی اور میں اس چبھن کو سہار نہیں پاؤں گی۔''

''میرا ایسا کڑا امتحان مت لیں۔'' مہرزاد نے آنکھیں بند کرنے کے بعد کھولتے ہوئے کہا۔ ''میں

نے کہا ناں اس کو اب تک کسی غیر مرد نے چھوا نہیں ہے، اس کو اسی عذاب سے بچانے کی خاطر ہی تو میں خود پر پڑنے والے کیچڑ کے چھینٹوں کی پروا نہیں کرتا۔ خدا کے واسطے میری نیت کو میرے عمل کو شک کی نظر سے مت دیکھیں۔"

"مہرزاد خان اگر مجھے اپنی ماں سمجھتے ہو تو جان لو میں نے فوری طور پر تمہارا رشتہ خان اکبر کے گھر ڈالنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ منظور ہو تو آج نہیں کل، کل نہیں تو پرسوں تک مجھے بتا دینا، تمہاری ہاں کی صورت میں، میں اسی ہفتے ملتان روانہ ہو جاؤں گی۔" اس کی ماں نے اس کی بات سے ذرا برابر بھی متاثر نہ ہوتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا اور اٹھ کر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ وہ اس سجے سجائے کمرے کے درمیان اکیلا بیٹھا رہ گیا۔ اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا تھا اور دل کو جیسے کسی نے بند مٹھی میں دبوچ لیا تھا۔ پوری دنیا کو طرح دے کر اپنے پیچھے بھگانے والے کی اپنی سگی ماں نے اس کے سامنے ایسی بساط بچھا دی تھی جس کے ہر مہرے کا کنٹرول وہ اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی تھیں۔ ایک بھی مہرہ چلنے سے پہلے وہ اسے چیک میٹ دے گئی تھیں۔ وہ آگے چلتا یا دائیں، بائیں چلتا یا پیچھے، اس معاملے میں اسے یا تو شہ مات تسلیم کرنی تھی یا ماں کے لیے اپنے جذبات کو قربان کرتے ہوئے اس کا بادشاہ جا گرانا تھا۔

"how smart of you Meharzad khan." اس نے خود کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"منگولوں کے فنِ تیر اندازی کے مدّاح، کیا تم نے کبھی یہ بھی سیکھنا چاہا کہ اگر سامنے والا کندھے پر تیر رکھے اپنے عقب میں کھڑے تم پر بغیر دیکھے نشانہ باندھے تو اس نشانے سے تم نے کیسے بچنا ہے۔" وہ خود سے سوال کر رہا تھا۔

☆☆☆

وہ ویگن سے نیچے اترا اور سامنے اپنے، اپنے ٹھیلوں کا سامان بند کرتے ٹھیلے والوں کو دیکھنے لگا۔ شام کی نیم تاریکی پر تیزی سے رات کے اندھیرے غلبہ پا رہے تھے اور اب اپنے، اپنے روزگار کمانے کا سامان اٹھا کر دکان لگانے والوں کو دکان بڑھا کر اپنے گھروں کو جانے کی جلدی تھی۔

"نادر بھائی برگر کھائیں گے، انڈا برگر اسپیشل والا؟" اس کے گھر کو جاتی ذیلی سڑک کے کنارے برگر اور چپس کا ٹھیلا لگائے کھڑے سرور نے آواز لگائی، سرور کا کام رات کو شروع ہوتا تھا۔

"رہنے دو بھائی، میں ایک برگر کھانے کے لیے تمہاری جان عذاب میں پھنسا دوں گا، تمہیں پتا نہیں میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں وہ لوگ۔" نادر نے بیزاری سے کہا۔

"ہی...... ہی......" سرور نے دانت نکوسے۔ "آج بھی آئے تھے اُن کے دو۔" اس نے ہاتھ کی دو انگلیاں اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دو بندے تھے کبھی رمضان کی دکان پر کھڑے ہوتے کبھی معراج کے ٹھیلے کے پاس، معراج بتا رہا تھا پھر اُن کو فون آیا کسی کا لیس سر، لیس سر کر رہے تھے فون کرنے والے کو اور پھر فون بند کر کے دونوں فوراً سے یہاں سے چلتے بنے۔ اس کے بعد سے ابھی تک تو نظر نہیں آئے وہ، نہ ہی ان کے بھائی بند۔"

"اچھا جب ہی مجھے خود سے آفر کر رہے ہو برگر کھانے کی۔" نادر ٹھٹکا اور پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"ہاں تو اور کیا......" سرور نے سر ہلایا۔ "کہو پھر لگاؤں فریش اینڈ ٹیسٹی برگر؟" اس نے نادر کی طرف دیکھا۔

"ایسا کرو پیک کر دو، میں گھر جا کر کھا لوں گا چائے کے ساتھ۔" نادر نے کہا۔ اس کا خالی معدہ بھوک کی دہائی دے رہا تھا اور سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ سرور سے برگر کا پیکٹ لے کر وہ گھر کی طرف جانے والے راستے پر چلنے لگا۔

"امی تو گیٹ دروازے بند کیے کب کی پڑ کر سو چکی ہوں گی، کیا ہے یار گھر پہنچ کر گیٹ، دروازے بھی خود ہی کھولو، کچن میں جا کر چائے بھی خود ہی بناؤ۔" وہ چلتے چلتے سوچ رہا تھا۔ "اور صبح سے اب تک امی نے جو برتن استعمال کر کر کے سنک میں رکھ چھوڑے ہوں گے انہیں بھی دھونا ہوگا۔" اس کا دماغ گھوم رہا تھا۔ "اوپر سے یہ۔" اس کا دھیان بائیں ہاتھ میں پکڑے سیل فون کی طرف گیا۔ "یہ بھی کوئی جواب نہیں دے رہا، کب سے کال کر رہا ہوں۔" حمزہ سے ملاقات کے بعد سے لے کر اب تک وہ کئی بار زوئی کے نمبر پر کال کر چکا تھا مگر اسے زوئی کا نمبر بند مل رہا تھا اور اس کے نہ ملنے نے اس کا ذہن اور بھی خراب کر رکھا تھا۔ "پہلے میرا نمبر اسے بند ملتا ہوگا اور اب اس کا نمبر بند ہے۔" اس نے سوچا۔ "یہ کیسا اتفاق ہے؟" اسے زوئی کے متعلق طرح، طرح کے وہم آ رہے تھے۔ "کس عذاب میں پڑ کر رہ گئی ہے زندگی۔" ایک گھر کے گیٹ کے پیچھے سے جھانکتے کتے نے اس کے قدموں کی آہٹ سن کر بھونکنا شروع کر دیا، مارے طیش کے اس نے سڑک کے کنارے پڑا ایک پتھر اٹھا کر کتے والے سیاہ گیٹ پر دے مارا۔ "تُو تو چپ کر جا، انسان کم ہیں مجھ پر بھونکنے والے جو تُو بھی شروع ہو گیا۔" اس نے دانت پیسے۔

"کیا کرتے ہو بیٹا، حکیم صاحب کے گیٹ میں ڈینٹ پڑ جائے گا۔" رات کے کھانے کے بعد سیر کی غرض سے نکلی بے فکر خواتین کے گروپ میں سے ایک نے ہنستے ہوئے اس سے کہا۔ وہ شرمندہ ہوتا ہوا تیزی سے آگے نکل گیا۔

"سب غلط ہو رہا ہے، میرا ہر کام الٹا پڑ رہا ہے، نہ جانے اس سارے قصے کا انجام کیا ہوگا۔" سارے دن کی خواری، زوئی کی طرف سے جواب نہ ملنے، گھر کے بند دروازے کھولنے، پیٹ کی بھوک، سب نے مل کر اس پر بیزاری اور کوفت کی ایک ایسی کیفیت طاری کر رکھی تھی کہ اس کا دل سب کچھ اُڑا دینے کو چاہ رہا تھا۔ اسی بیزاری اور کوفت کی کیفیت میں اس نے اپنے گھر کے گیٹ کے تالے میں چابی ڈال کر گھمائی، گیٹ کھلنے پر اسے زور سے دھکا دیا، گیٹ کا پٹ کھل کر پیچھے جاتے ہوئے گھر کی اندرونی دیوار سے جا ٹکرایا۔ اڑوس پڑوس کے چند اور کتے چوکنے ہو کر بھونکنے لگے۔ اس نے گھر کے اندر داخل ہو کر مزید بیزار ہوتے ہوئے گیٹ لاک کیا اور مڑ کر گھر کی اندرونی عمارت کو دیکھنے لگا جو گیرج میں روشن بلب کی زرد روشنی میں ایک ہیولے کی طرح نظروں کے سامنے کھڑی تھی۔ برآمدے میں پہنچ کر اس نے اندرونی دروازے کا لاک کھولا، لاؤنج میں بھی ایک انرجی سیور روشن تھا، اس کی بھاری بل سے ڈرنے والی اماں غالباً نیند کے غلبے کے مارے یہ بلب بجھانا بھول گئی تھیں۔ جیب سے والٹ، فون اور چابیاں نکال کر میز پر رکھتے ہوئے اس نے کچن کے دروازے کی طرف دیکھا اور اسے لگا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو، وہ بدک کر پیچھے ہٹا اور تیزی سے لپک کر لاؤنج کی ٹیوب لائٹ کا بٹن دبایا اور پھر مڑ کر کچن کے دروازے کی طرف دیکھا، جس کے بیچوں بیچ چپٹی ناک، چھوٹی آنکھوں اور سیاہ سیدھے بالوں والی زوئی حسین، دونوں بازو سینے پر باندھے کھڑی تھی، اس کے دبلے پتلے، کوتاہ قامت سراپے کو اس کے واقعی موجود ہونے پر یقین کرنے کے لیے دیکھتے ہوئے نادر کی نظریں اس کے پیروں تک پہنچیں اور بے ساختہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی، چھوٹے چھوٹے سفید پیروں میں نادر کے دس نمبر کے سیاہ سلیپرز تھے اور انتہائی مضحکہ خیز لگ رہے تھے۔

☆☆☆

"میں دیکھ رہی ہوں لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ تم اس لڑکی سے گاڑھی دوستی کر چکے ہو، جس کے پاس کچھ ایسا نہیں جو تم سے دوستی کے معیار پر پورا اتر سکے۔" دانیال نے اپنے ساتھ بیٹھی ثمرین کی بات سنی اور دھیان اپنے چائے کے کپ میں چینی ڈال کر چمچ سے اسے حل کرنے کی طرف مبذول کرلیا۔

"ہوں۔" چینی حل کر لینے کے بعد اس نے چمچ ایک خالی پلیٹ میں رکھ کر ثمرین کی طرف دیکھا۔

''اور مجھ سے دوستی کا معیار کیا ہے بھلا؟''

''ایک سا سوشل اسٹیٹس، ایک سی گرومنگ، ایک سے انٹرسٹس۔'' ثمرین نے شانے اچکاتے ہوئے سر ہلایا۔ ''کچھ تو کامن ہونا چاہیے دو لوگوں میں دوستی کے لیے۔''

''ورنہ؟'' دانیال نے چائے کا گھونٹ حلق سے اتارنے سے پہلے کہا۔ ''دوستی نہیں ہو سکتی؟'' چائے کا گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''ظاہر ہے، کیسے ہو سکتی ہے؟'' ثمرین نے ایک بار پھر شانے اچکائے۔ ''کبھی شیر کو چوہے سے دوستی کرتے نہیں دیکھا ہوگا کسی نے۔''

''اگرچہ تم نے واضح نہیں کیا کہ اس دوستی میں شیر کون ہے اور چوہا کون لیکن مائی ڈیر لیڈی تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ جب شیر، شکاری کے جال میں پھنستا ہے تو صرف اور صرف چوہے کی دوستی ہی اس کے کام آسکتی ہے۔''

''اوہ..... تو تمہاری یہ دوستی کسی مطلب پرستی کا نتیجہ ہے۔'' ثمرین یقیناً اس کی مثال کو کوئی اور مطلب دے رہی تھی۔

''مطلب پرستی!'' دانیال مسکرایا۔ ''بھلا بتاؤ بینش سے دوستی میں میری کیا غرض شامل ہوگی۔''

''یہ تو میں نہیں جانتی لیکن مجھے اس اَن میچڈ دوستی پر حیرت بھی ہے اور اعتراض بھی۔'' ثمرین کسی مان کے تحت بولی۔

''تمہاری حیرت اور اعتراض پر میں معذرت خواہ ہوں۔'' دانیال نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں دوستی، سوشل اسٹیٹس، گرومنگ، لائف اسٹائل، زبان، ٹیلنٹ اور انٹرسٹ دیکھ کر نہیں کیا کرتا بلکہ اپنا کمفرٹ لیول اور کمپیٹیبلٹی دیکھ کر کرتا ہوں۔''

''پھر مجھے تمہارے کمفرٹ لیول اور کمپیٹیبلٹی پر افسوس ہے اور مجھے ایسے لگتا ہے میں اسے اسٹینڈ نہیں کر سکتی۔'' ثمرین طیش میں آکر اٹھ کھڑی ہوگئی۔

''ایزی ثمرین ایزی۔'' دانیال نے نرمی سے کہا۔ ''تم نے کب سے دوستیوں اور دوستوں کا موازنہ کرنا شروع کر دیا ہے۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے ثمرین کو بیٹھ جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ثمرین اسی بگڑے ہوئے موڈ کے ساتھ دوبارہ بیٹھ گئی۔

''دیکھو میرے لیے کسی بھی چیز سے زیادہ انسان اہم ہے۔'' دانیال نے اسے نرمی سے سمجھایا۔

''ہم سب یہاں پڑھنے اور سیکھنے کے لیے آئے ہیں، کون کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے، اس کا معیارِ زندگی کیا ہے، وہ کون سی زبان بولتا ہے، کہاں سے پڑھ کر آیا ہے، کیا یہ ساری باتیں ثانوی نہیں ہیں؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے ثمرین کو دیکھا۔ ''اصل بات تو صرف یہ ہے کہ یہاں سب ایک سے ہیں، ایک خاندان کے افراد کی طرح ہیں، کم از کم میں ایسی ہی نظر سے دیکھتا ہوں۔''

''آئی ایم سوری دانیال، میری ترجیحات مختلف ہیں۔'' ثمرین نے میں نہ مانوں کے سے انداز میں کہا۔ ''اس کے ساتھ مل کر ایک ایسی لڑکی کے لیے کوئی کمپین بھی تو چلا رہے تھے، جس کی شناخت خاصی مشکوک سی ہے؟'' اس کے لہجے میں چبھن تھی۔

''بہتر تو یہ ہے کہ ان ساری باتوں میں الجھے بغیر ہم اپنی دوستی کو اسی طرح جاری رکھیں جیسے وہ ہمیشہ سے تھی۔'' دانیال نے اب کے اس کی بات کا برا مانتے ہوئے کہا۔ ''دوسری صورت میں جیسے تم چاہو کرو۔''

''واٹ!'' ثمرین کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ ''تم اس معمولی سی لڑکی کی دوستی کو مجھ سے دوستی پر

ترجیح دے رہے ہو۔'' وہ ایک بار پھر طیش کے عالم میں اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ''ٹھیک ہے پھر بھول جاؤ کہ ہم کبھی دوست تھے۔''

دانیال نے تاسف سے ثمرین کی طرف دیکھا اور شانے اُچکا دیے۔ ثمرین پیر پٹختے ہوئے ٹیبل کے پیچھے سے نکل کر کینٹین سے باہر جانے والے راستے پر چل دی۔ سامنے سے آتی بینش کو دیکھ کر اس نے نخوت سے سر جھٹک کر اس پر ایک نظر ڈالی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ بینش نے حیرت سے ثمرین کے بگڑے تیوروں کی طرف دیکھا اور پھر سامنے بیٹھے دانیال پر نظر ڈالی جو اس کی طرف دیکھ کر دوستانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔

☆☆☆

''اتفاق کی بات ہے سر، اسی لڑکی میرال صلاح الدین کے بارے میں جاننے کے لیے کتنی ہی فائلز کسی اور کے اشارے پر بھی کھلی رکھی ہیں۔'' حمزہ نے یہ بات سنانے والے کی طرف چونک کر دیکھا۔

''کس کے اشارے پر؟'' اس نے پوچھا۔

''ہے ایک بڑی شخصیت۔'' اس کے سامنے بیٹھے شخص نے کہا۔ ''نام صیغۂ راز میں رکھا جانا ضروری ہے کہ سخت آرڈر ہے اور میرال صلاح الدین اس کا ذاتی معاملہ ہے، اگرچہ اب اس لڑکی کا نام یہ نہیں ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ آج کل اس لڑکی کی صورتِ حال کیا ہے لیکن اس تک رسائی مشکل ہی نہیں ناممکن ہے کیونکہ ان لوگوں کے سر پر جن، جن کا سایہ ہے وہ اثر رسوخ بھی رکھتے ہیں اور ان کے معاملات میں ذاتی دلچسپی بھی۔'' حمزہ نے کہا۔ ''لیکن اس حصار کا کوئی زاویہ تو کمزور ہوگا ہی جہاں سینت لگائی جا سکے۔''

''آپ کی سوچ ہے سر۔'' اس کے مخاطب نے کہا۔ ''یہ ایک ایسا مافیا ہے جس کے حصار میں سینت کوئی ایسا ہی لگا سکتا ہے جو خود اس کا حصہ ہو، ہم تو حکم کے غلام ہیں، ہمیں کہیں سے حکم ملے تو آج ہی بلکہ ایک گھنٹے میں ہی یہ قلعہ مسمار ہو جائے مگر آرڈر دے گا کون، وہ تو ہرگز نہ دیں گے جو وہاں ہر طرف لہراتی زلفوں میں سے کسی نہ کسی ایک کے اسیر ہیں۔''

''یار کیا، کیا جائے پھر اور کیسے کیا جائے؟'' وہ بے بسی سے بولا تھا۔

''دعا کی جائے سر، دعا تو کوئی بھی معجزہ دکھا سکتی ہے۔'' وہ شخص بولا۔

''اچھا یہ بتاؤ اس بے چارے نادر کی جان بھی چھوڑی تم نے کہ نہیں۔''

''چھوڑ دی سر، اسی وقت چھوڑ دی تھی جس وقت آپ نے آرڈر کروایا تھا مگر اس کی بیوی جانتی ضرور ہے سب۔''

''نادر نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہر طرح تعاون کرے گا۔''

''اس کی بیوی اگر اس بینک کے منیجر تک پہنچا دے سر جو راتوں رات اپنے گھر سے غائب ہو گیا ہے تو ہم اندر تک مل سکتے ہیں۔''

''ہوائی تیر چلاتے ہو بس تم لوگ..... اگر یہ ہو جائے، اگر وہ ہو جائے، اگر فلاں جو ہے وہ فلاں کے سلسلے میں ایسا کر دے اور کوئی اور کسی اور کے سلسلے میں ویسا کر دے تو پھر تم لوگ معاملے کی تہ تک پہنچ جاؤ گے۔'' حمزہ زِچ ہو کر بولا۔ ''کیا سسٹم ہے یہ اور کیسے محافظ ہو تم لوگ؟''

''سسٹم کی بات مت کریں سر، سسٹم ٹھیک ہوتا تو لڑکی کیمپ سے غائب ہی کیوں ہوتی۔''

''کچھ کرو یار، بہت ہو چکی، میں نے تمہیں بتایا تو ہے کہ درمیان کے ڈانڈوں کو چھوڑ کر اب اُدھر کی فکر کرو جہاں کے بارے میں پتا چلا ہے کہ وہ اب موجود ہے۔''

''وہیں کی تو بات کر رہا ہوں سر، فائلیں کُھل چکی ہیں اگر تو آرڈر آ جاتا ہے تو ممکن ہے معاملہ ویسے ہی کلیئر ہو جائے۔''

''فائلیں اقتدار والوں کے لیے کُھلی ہیں، ہم عوام ہیں یار، ایسا نہ ہو کہ معاملہ کھل کر ختم بھی ہو جائے اور ہمیں خبر تک نہ ہو۔''

''کیسی باتیں کرتے ہیں بادشاہو۔'' اس کا مخاطب دانت نکالتے ہوئے بولا۔ ''ہم جو موجود ہیں آپ کو پل، پل کی خبر دینے کو، کوئی ایکشن تو ہو نہیں' دیکھیے گا کیسے کھٹ سے آپ تک خبر پہنچتی ہے۔''

''اچھا یار، تمہاری بڑی مہربانی ہوگی جو تم ایسا کر دو، میں اب چلتا ہوں۔'' حمزہ اٹھ کر باہر آ گیا۔ یہاں آنے کے بعد اس کا ذہن پہلے سے زیادہ پراگندہ ہو چکا تھا۔ منتشر سوچیں اس کے ذہن کو گھمائے دے رہی تھیں۔ معاملے کی نوعیت جتنی کھل کر سامنے آئی تھی اتنی ہی اس کی مایوسی بڑھتی جاتی تھی۔ یوں جیسے وہ کسی سراب کے پیچھے بھاگ رہا ہو اور سراب ہر گام پر آگے ہی آگے بڑھ جاتا تھا۔

☆☆☆

''کیا تم سچ مچ اماں جان کی بات مان کر خاندان کی پاکیزہ ترین نسل کی بنیاد رکھنے والے ہو مہرزاد خان؟'' نیلوفر عرف گڈی نے استہزائیہ لہجے میں اس سے سوال کیا۔ نیلوفر، اس کی سوتیلی بہن تھی جو اس کے باپ کے چچیرے بھائی کے سالے سے بیاہی ہوئی تھی، نیلوفر کا شوہر میدانِ سیاست کا پرانا کھلاڑی تھا اور نسلاً بلوچ سردار تھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے میں ایسا کرنے والا ہوں؟'' مہرزاد نے الٹا نیلوفر سے سوال کیا۔

''پتا نہیں۔'' وہ صوفے کی بیک سے سر ٹکاتے ہوئے ذرا آگے کو کھسکی۔ ''میں تو تمہیں یہ بتانے آئی ہوں کہ اگر تم ایسا کرنے والے ہو تو تم سے بڑا احمق میں نے دنیا میں نہیں دیکھا ہوگا۔''

مہرزاد نے اپنی اس الٹرا ماڈرن بہن کی طرف دیکھا جو متعدد بار ایک وزیر کی بیوی کی حیثیت سے زندگی گزار چکی تھی، جس کے اپنے نام زمین، جائداد، روپے پیسے کی بہتات تھی جو اپنے علاقے میں بڑی، بڑی روایتی چادروں میں لپٹی پائی جاتی تھی مگر اسلام آباد میں جس کی جون ہی کچھ اور ہوا کرتی تھی۔ جم، سیلونز، ڈیزائنر ڈریسز، بیش قیمت جیولری، امپورٹڈ جوتوں اور بیگز جس کی شخصیت کو ایک دم فِٹ رکھنے کے سب سے بڑے سہارے تھے اور جو اپنی تمام تر آزاد مزاجی کے باوجود اپنی پانچ سوتیلی بہنوں میں سے اسے ہمیشہ سے زیادہ پیاری تھی۔

''کیوں؟'' مہرزاد نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''تم چاہتی ہو کہ اس خاندان میں تمہارے شوہر، دیوروں اور ان کے کزنز، کزنز کے کزنز سے مختلف کوئی دوسرا نہ ہو، سب ایک ہی جیسے حمام کے ننگے بنے رہیں اور کوئی کسی دوسرے پر انگلی اٹھا کر یہ نہ کہہ سکے کہ دیکھو وہ تو ننگا ہے اور میں ڈھکا ہوا ہوں۔''

''خیر پارسائی کا دعویٰ تو تم اب بھی نہیں کر سکتے۔'' گڈی نے مسکرا کر کہا۔ ''کہو تو تمہارے معاملات کی تفصیل سنا دوں۔''

''نہیں، مجھے اس لیے مت سناؤ کہ مجھے خود سب یاد ہے۔'' مہرزاد نے تحمل سے کہا۔

''پھر حمام میں بھی اتر جاؤ، اس سے کیا بچنا، وہاں تمہارے ہی جیسے پہلے سے موجود ہیں۔'' گڈی کی مسکراہٹ نے خبیثانہ رنگ اختیار کیا۔ مہرزاد نے ایک نظر اس کے سڈول بازوؤں پر ڈالی جو سلیولیس قمیص سے باہر جھانک رہے تھے۔ دوپٹے کے بغیر، گہرے گلے کی قمیص کے ساتھ وہ ٹخنوں سے اوپر سیدھا پاجامہ پہنے ہوئے تھی۔

''کہاں سے پتا چلتا ہے کہ یہ خاتون سینئر کیمبرج میں پڑھتی بچی کی ماں ہے۔'' اس نے سوچا۔

''تمہارے مشورے کی جب ضرورت پڑی ضرور مانگوں گا۔'' اس نے دھیان دوسری طرف مبذول کیا۔

''اماں جانؒ خان اکبر کے گھر رشتہ ڈالنا چاہ رہی ہیں مہرزاد خان......'' گڈی اٹھ کر اس کی نظروں کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ ''تم جانتے ہو خان اکبر کی بہو بن کر میں نے زندگی کے اتنے سال کس اذیت میں گزارے ہیں۔'' وہ بیش قیمت ڈائمنڈز جڑی انگوٹھیوں والا ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے بولی۔

''جانتا ہوں۔'' مہرزاد نے بے نیازی سے کہا۔

''تم جانتے ہو اویس خان کی بیوی ہونا کتنی بڑی اذیت ہے؟'' اس نے مہرزاد کی بے نیازی سے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

''اویس خان سے کون پوچھے گا کہ نیلوفر عرف گڈی کا شوہر ہونا اذیت ہے یا راحت......؟'' مہرزاد نے طنزیہ انداز میں سوال کیا۔

''بڑے وسیع مشاہدے کے مالک ہو ناں تم؟'' وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔ ''یہ موٹی، موٹی کتابوں سے بھری لائبریری کے مالک، دنیا جہان کا علم پڑھ لینے والے، کامیاب انسان کے سارے گُر سیکھ لینے والے۔'' گڈی نے مہرزاد کا شانہ جھنجوڑا۔ ''لیکن تم ایک عورت کا دکھ نہیں سمجھ سکتے اور عورت بھی وہ جو تمہاری اپنی بہن ہے۔'' اس کی سُتواں ناک سکڑی، مہرزاد اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ ایک دم کیا خوب سسکنے لگی تھی۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا تم مجھ سے کہنا کیا چاہ رہی ہو، تم مجھ سے دراصل چاہ کیا رہی ہو؟'' وہ سر جھٹکتے ہوئے بولا۔

''میں تم سے صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ خان اکبر کے گھر رشتہ جاتا ہے تو اسے جانے دو، منع مت کرنا۔''

''مائی گاڈ......!'' مہرزاد کا لہجہ تلخ ہوا۔ ''کب سے پہاڑ کھود رہی ہو یہ والا چوہا نکالنے کے لیے۔''

''میری بات غور سے سنو مہر زاد خان......'' گڈی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''خان اکبر تمہارا رشتہ لپک کر قبول کرے گا، اسے اور کیا چاہیے۔'' اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''وہ جانتا ہے تمہارا مستقبل روشن ہے، تمہاری کامیابیوں کو فوری طور پر نہیں سے بھی کوئی خطرہ نہیں ستانے والا، وہ ایک لحظہ بھی نہیں لگائے گا اور اپنی ولایت پلٹ، بلی آنکھوں والی چڑیل بیٹی کے لیے تمہارا رشتہ قبول کرلے گا۔''

''اسے اپنے منہ سے چڑیل کہہ رہی ہو اور رشتہ بھی ڈلوانا چاہتی ہو۔'' مہر زاد نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''سن تو لو پوری بات......'' گڈی نے اس کا بازو دبایا۔ ''اصل کہانی تو اس سے آگے شروع ہوگی۔''

''اچھا......'' مہر زاد ہنسا۔ ''یہ فیک اسٹارٹ تھا کہانی کا۔''

''ہاں بالکل!'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''اگر میرے بھائی اور اپنے باپ کے بیٹے ہو تو اس شادی کی اگلی ہی رات اس لڑکی سے نکاح کرلینا جس کے چوبارے کی طرف جانے سے اماں جان تمہیں روک رہی ہیں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' مہر زاد کو عجیب سا شاک لگا۔

''ہاں۔'' وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اگر تمہاری بہن اویس خان کا ہر دوسرے ہفتے ایک نیا تعلق اور سال بھر میں دو نئے نکاح برداشت کرسکتی ہے تو اویس خان کی بہن کے لیے بھی یہ کوئی اچنبھے والا تجربہ نہیں ہونا چاہیے۔''

''نان سینس......'' مہر زاد نے جھلا کر اس کو دیکھا۔

''تم نے اس چوبارے والی حسینہ سے نکاح تو کرنا ہی ہے ناں مہر زاد۔'' گڈی نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''یونہی تو تم اس کے پیچھے اپنا نام اور شہرت لٹا دینے کو تیار نہیں ہوگئے تھے...... وہ ایک بار پھر عیارانہ انداز میں مسکرائی۔ ''اور یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ تم اماں جان کی بات کو ریجیکٹ کردو، بس پھر جو میں کہہ رہی ہوں ویسے ہی کرنا، بڑی اچھی گیم شروع ہوگی خان اکبر کے خاندان کے ساتھ جیسا انہوں نے مجھے اب تک رلایا اور کلسایا ہے، جیسے خان اویس میرے کلیجے میں ہر دوسرے مہینے نئی چنگی بھرتا ہے ویسا ہی سلوک تم اس کی بہن کے ساتھ کروگے تو میرے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جائے گی پھر تم اپنی معشوقہ کے ساتھ من چاہی زندگی گزارتے رہنا، اس ملک کے سیاسی منظر نامے پر اس کو تو سیاستداں ہی مانا نہیں جاتا، جس کے ساتھ دس اسکینڈل نہ ہوں، تمہیں اس تجربے سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔''

''آہ میرے خدا......'' مہر زاد نے اس کی بات سن کر سر صوفے کی پشت سے ٹکالیا۔ ''میں سیاست کے میدان میں نئی روایت شروع کرنے کا اعلان کرتا پھرتا ہوں، یہاں مجھے فیملی کے فرنٹ پر انہی فرسودہ داؤ پیچ میں الجھایا جارہا ہے جن کا تصور کرکے ہی مجھے الٹی آتی ہے۔'' اس نے نیلوفر کی طرف دیکھا...... یہ اس کی وہ بہن تھی جو سال میں دس بار سیر اور شاپنگ کی غرض سے اپنے من چاہے روٹ کا ٹرپ بنا کر کبھی یورپ، امریکا اور کبھی مڈل ایسٹ کے چکر لگاتی تھی۔ جس کی اپنی بے راہ روی اور غیر مردوں سے دوستیوں کے چکر اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ اور سن رکھے تھے، چاہے یہ بے راہ روی اس نے اویس خان کی عیاشیوں کے ردعمل کے طور پر اپنائی تھی مگر حقیقت یہ ہی تھی کہ اس کے مزاج اور حرکتوں کے آگے اب اویس خان کا کوئی بس نہیں چلتا تھا، دونوں نے اپنے اپنے طرزِ زندگی سے کمپرومائز کررکھا تھا۔ اس کی یہ ہی بہن، اپنے جیسی ہی اپنی کسی نند کے لیے اسے مشورہ دینے آئی تھی کہ اسے اپنے نکاح میں لے کر اس لڑکی کو بھی اسی جہنم میں دھکیل دے، جس کی آگ میں تپ کر وہ خود کندن بنی اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

''کتنا اور کہاں تک فرار حاصل کروگے مہر زاد خان، یہ زندگی تمہارے اعصاب کا امتحان بنتی چلی جائے گی، تم کس، کس محاذ پر اگلی صفوں میں جاکر لڑوگے۔'' اس نے خود سے سوال کیا۔

''وہاں تک اور تب تک، جہاں تک اعصاب ساتھ دیں گے۔'' اگلے لمحے ہی اس نے فیصلہ کیا۔

''تم واپس چلی جاؤ گڈی اور مجھے میرے فیصلے خود کرنے دو۔'' اگلے لمحے وہ اپنی بہن سے کہہ رہا تھا۔ ''اس خاندان کے مردوں نے جس سے میرا اور تمہارا تعلق ہے کبھی عورتوں سے بھی ڈکٹیشن لی ہے...... جو تم اور اماں جان مجھے ڈکٹیٹ کرانے پر تل گئی ہو کہ مجھے کیا کرنا ہے۔'' ایسا کہتے ہوئے اسے خود محسوس ہورہا تھا کہ اس کے لہجے میں وہ نہیں اس کے خاندان کا ایک روایتی مرد بول رہا تھا جو من مانی کرنے کا عادی اور عورت کے احترام کو اپنی توہین سمجھتا تھا۔

☆☆☆

''تم نے ہمت کا مظاہرہ کیا جو یہاں تک پہنچ گئیں اور اس سے بھی زیادہ بہادری یہ دکھائی جو میری ہی کوفیس کرلیا۔'' نادر بیان نہیں کرسکتا تھا کہ زوئی کو یوں اپنے گھر میں موجود دیکھ کر اس کی کوفت، بیزاری، تھکن اور بھوک کا احساس کیسے ہوا ہوگیا تھا، وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ دن بھر جس کا فون بند مل رہا تھا وہ یوں من چاہی بہو بنی اس کے گھر میں بیٹھی ہوگی۔

''مجھے تمہیں تلاش کرنے کے لیے یہاں آنا پڑا نادر۔'' زوئی کا رویہ معذرت خواہانہ تھا۔ ''حالانکہ مجھے پتا تھا کہ نکاح والی بات تم نے اپنے گھر والوں سے چھپا رکھی تھی لیکن پاکستان پہنچ کر تمہاری کوئی خبر نہ ملنے پر میں جتنی پریشان تھی، اس کی وجہ سے مجھے یہاں آنا پڑا، مجھے خوف آرہا تھا کہیں میری وجہ سے تم کسی بہت بڑی مصیبت میں نہ پھنس گئے ہو۔''

''جو بھی ہوا شاید اچھا ہوا۔'' نادر کے کندھوں سے زوئی کی وجہ سے ماں کی ناراضی کا بوجھ اترا تو اسے لگا اس کا ذہن ہلکا ہوگیا ہو۔ ''میں تمہیں اپنے گھر میں خوش آمدید کہتا ہوں۔''

''نہیں نادر۔'' زوئی نے سر ہلایا۔ ''تم اتنی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ مت کرو، تم میری وجہ سے بہت مصیبت جھیل چکے ہو، میں یہاں تمہیں اس مصیبت سے نکالنے کے لیے آئی ہوں، تمہیں اس مسئلے سے نکالنے کے بعد اگر ان لوگوں نے سمجھا کہ میرا اس سارے معاملے میں کوئی قصور نہیں تو میں واپس چلی جاؤں گی، تم اپنی اور اپنی امی اور بہنوں کی خوشی سے اپنی شادی کرلینا۔ مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا اپنی خوشی کے لیے تمہاری زندگی مشکل بنادوں۔''

نادر نے حیرت سے اس کوتاہ قامت، سفید رنگت، چپٹی ناک اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والی لڑکی کو دیکھا جس کے چہرے پر آزردگی تھی اور سنجیدگی بھی...... اس کے بولے لفظوں میں سچائی تھی اور خلوص تھا۔

''کیا یہ مخلص اور صاف گو لڑکی ان ہزاروں لڑکیوں سے بہتر نہیں ہوگی جو میری بہنیں میرے لیے دیکھیں گی اور جن کو کسی نہ کسی وجہ سے مسترد کردیں گی۔'' اس نے سوچا۔ ''اور کون جانے کہ جس کو بھی وہ میرے لیے بالآخر منتخب کرلیں...... وہ میرے لیے کیسی ثابت ہو، اس میں ایسی سچائی اور اتنا خلوص ہو بھی یا نہیں۔''

''میں بہت شرمندہ ہوں زوئی، میں تم سے تلخ کلام ہوا......'' اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''دراصل میں اس اچانک پڑ جانے والی افتاد پر اتنا حواس باختہ تھا کہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔'' اس نے سر ہلایا۔

''میں سمجھتی ہوں......'' زوئی نے سر جھکا کر کہا۔

''شاید تم نہیں جانتیں کہ اس ملک کی روایت ہی کچھ ایسی ہے، جس کا نام ایک بار مشتبہ افراد کی فہرست میں آجاتا ہے، اس کی نسلوں کو بھی معاف نہیں کیا جاتا......'' نادر بے بسی سے بولا۔ ''پچھلے کچھ عرصے سے جو ذہنی اذیت مجھے ونسنے رہے ہیں میرے جیسے عام اور انجان انسان کے حواس ختم کرنے کو اتنی ہی کافی ہے، میں حیران ہوتا

ہوں جس کو وہ واقعی مجرم سمجھتے ہوں گے اس کا کیا حشر کرتے ہوں گے۔''

''اس معاملے میں تم اپنے ملک کی روایتوں کو مت کوسو نادر، دنیا میں ہر جگہ یہی ہو رہا ہے۔'' زوئی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔'' یہ جو اتنے بڑے، بڑے مہذب ملک ہیں ناں وہاں بھی جرائم اور مجرموں کی شرح اسی طرح ہے، وہاں بھی اپنے نشانے کو اذیتیں پہنچانے کے ایسے ہی بھیانک طریقے رائج ہیں۔ اپنا مہذب چہرہ انہوں نے دنیا کو دکھانے کے لیے رکھا ہوا ہے، اس مہذب چہرے کے پیچھے کیسے مکروہ عزائم اور مکروہ اصول رائج ہیں تم ان سے بھی انجان ہو...... ابھی جو حالیہ اذیتوں کی خبریں پریس میں آ رہی ہیں ان کو نہیں پڑھتے تم؟ انسانوں کو جانوروں کی طرح پنجروں میں قید رکھنے کی خبریں، ان کے ساتھ شرمناک سلوک کرنے کی خبریں......'' اس نے نادر کی طرف دیکھا۔'' تو یہ ابھی ایک چھوٹا اور ترقی پذیر ملک ہے، اسے کیوں کوستے ہو۔''

''یہ لڑکی کتنی خوش گمان ہے، یہ کسی سے بدظن نہیں ہوتی، ہر برائی کا محرک بھی منطقی قرار دے دیتی ہے۔'' نادر کتنے ہی دن بعد مسکرایا تھا۔'' اور میں جو اسے اپنے سامنے پا کر ایک ساتھی، ایک رفیق کے موجود ہونے کے احساس سے دوچار ہوا ہوں، یہ اعتراف کیوں نہ کرلوں کہ مجھے اس سے کیسی انسیت محسوس ہو رہی ہے، جیسے یہ بنی ہی صرف میرے لیے ہے۔''

''ہا...... ہائے......'' وہ دونوں ایک دوسرے کو غور سے دیکھنے میں مگن تھے جب نادر کی امی نے ان دونوں کی محویت کو توڑتے ہوئے بلند الفاظ میں کہا۔ دونوں نے چونک کر امی کو دیکھا جو نیند بھری آنکھوں اور منتشر بالوں کے ساتھ سامنے کھڑی تھیں۔

''کب سے سن رہی ہوں دونوں باتیں کیے جا رہے ہیں، باتیں ہی نہیں ختم ہو رہیں، صبح کا بھوکا پیاسا گیا اتنی دیر سے گھر واپس آیا ہے، کیسی بیوی ہو تم نہ اسے کھانے کا پوچھا نہ پینے کا......'' انہوں نے نیند بھری آنکھوں کو انگلیوں سے مسلتے ہوئے زوئی سے کہا۔

''فریج میں سالن پڑا ہے ناں...... آٹا بھی ہے، سالن گرم کرکے روٹیاں ڈال دے اس شیدائی کو......'' انہوں نے ہدایت جاری کی اور پھر نادر کی طرف دیکھا۔'' میں نے سارا دن خوب سوال کرلیے اس سے، مجھے پکا پتا چل گیا ہے اصلی مسلمان ہے۔'' انہوں نے فخر سے اپنا کارنامہ بیان کیا۔'' اتنی سورتیں اور چھ کے چھ کلمے تو تیری بہنوں کو بھی نہیں آتے جو منہ بنا، بنا کر کہتی تھیں مینڈک اور چھپکلیاں کھانے والی سے نکاح کرلیا نادر نے۔'' انہوں نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔'' بس اپنی تسلی کرلی ہے میں نے، اسی لیے کچن کا چارج اسے دے دیا ہے، ان پاکستانی لڑکیوں سے اچھی ہی رہے گی جو سارا دن کان کو فون لگا کر سوہروں (سسرال والوں) کی باتیں پیکے (میکے والوں) کو سنا کر اور اِدھر اُدھر لڑائیاں ڈلواتی رہتی ہیں، نہ خود چین سے رہتی ہیں نہ اپنے خصم (شوہر) کو چین سے رہنے دیتی ہیں۔'' انہوں نے شانے پر لٹکتا دوپٹا منہ میں ٹھونس کر ہنسنا شروع کردیا۔ نادر کے پورے وجود میں خوشی سے سرشاری کی ایک بھرپور لہر دوڑ گئی۔ اس لمحے بہت دنوں پیچھے اسے محسوس ہوا اسے نہ کوئی غم تھا نہ فکر تھی۔

☆☆☆

''ثمرین کو کیا ہوا، وہ اتنے غصے میں کیوں تھی؟'' بینش نے دانیال سے سوال کیا۔

''تم یہ بتاؤ کہ تم نے وہ ہینڈ آؤٹس سنبھال لیے ناں...... کسی کو دیے تو نہیں؟'' جواب میں دانیال نے اس سے سوال کیا۔

''ثمرین کو کیا ہوا، یہ تو بتائیں؟'' بینش نے اپنا سوال دُہرایا۔

''اُفوہ...... بینش کیا ہمارے پاس اتنا فالتو ٹائم ہوتا ہے کہ ہم ایسی فضول باتوں کے بارے میں سوال

جواب کریں۔'' دانیال نے کہا۔

بینش شرمندہ سی ہوگئی۔

''کم آن بینش......'' دانیال کو اپنے لہجے کی سختی کا احساس ہونے لگا۔'' اچھا پتا ہے کیا؟'' بینش کے چہرے پر چھائی شرمندگی دیکھ کر اس نے کہا۔'' ثمرین مجھے بیویوں کے سے استحقاق کے ساتھ بتانا چاہ رہی تھی کہ میری ترجیحات کیا ہونی چاہئیں، اسی بات پر ہمارا جھگڑا ہوگیا اور وہ ناراض ہوکر چلی گئی۔''

''بیویوں کے سے استحقاق کے ساتھ......؟'' بینش کی آنکھیں پھیلیں۔

''ہاں......'' دانیال نے سر جھکا کر کہا اور پھر سر اٹھا کر مسکرا دیا۔'' کم از کم مجھے تو ایسے ہی محسوس ہوا کیونکہ دوست کبھی پر اپنی مرضی ٹھونسنے کی کوشش نہیں کرتے، وہ صرف معاملات کو ڈسکس کرتے ہیں۔''

''ثمرین سے آپ کی دوستی ہے بھی تو بہت زیادہ۔'' بینش نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

''ہاں......'' دانیال نے سر ہلایا۔'' ہماری فیملیز کے ہمیشہ سے تعلقات بہت اچھے رہے ہیں، ثمرین نے اور میں نے بہت سی گروپ پینٹنگز اور پروجیکٹس پر اکٹھے کام کیا ہے، لیول آف انڈر اسٹینڈنگ خاصا بلند ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم ایک دوسرے کو ڈائریکشن اور ڈکٹیشن دینے لگ جائیں۔''

''ہوسکتا ہے وہ ایسا سمجھتی ہو کہ آپ کوئی غلطی کر رہے ہیں، اسی لیے آپ کو ڈائریکشن دینا چاہتی ہو۔'' بینش نے کہا۔

''جانتی ہو اس کے خیال میں، میں کیا غلطی کر رہا ہوں۔'' دانیال نے مسکرا کر کہا۔

''نہیں جانتی، بتائیں۔''

''چلو چھوڑو، رہنے دو۔'' وہ مزید مسکرایا۔'' تم یہ بتاؤ تمہارے کولاجز کا کیا بنا؟''

''اُف نہ پوچھیں......'' بینش نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔'' دماغ گھوم گیا۔''

''اچھا چلو میں اپنی آخری کلاس کے بعد اسٹوڈیو آؤں گا، وہاں بیٹھ کر تمہارے کولاجز پر کام کریں گے، فکر نہیں کرو، یوں ہو جائیں گے یوں۔'' اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا اور جانے کے لیے کھڑا ہوگیا۔

''ہینڈ آؤٹس کیوں نہیں دینے تھے؟'' بینش نے پوچھا۔

''وہ بھی تب ہی بتاؤں گا، ابھی کلاس شروع ہونے والی ہے۔'' وہ تیزی سے بولا اور ہاتھ ہلاتا ہوا چلا گیا۔

☆☆☆

''میں نے آپ سے کہا تھا ناں ماضی کے دفینوں کو دفن رہنے دیں، ان کو کھود کر کچھ چہرے شناخت کرنے کی کوشش مشکل میں ڈال دے گی آپ کو اور دیکھا میرا کہا سچ نکلا، آپ اس روز کے بعد سے غائب ہیں، نہ کوئی فون کال، نہ ٹیکسٹ میسج نہ ملاقات۔''

اس نے خصوصی نمبر سے آنے والا یہ میسج پڑھا اور سامنے دیکھنے لگا، اس کی آنکھوں کی پتلیاں سامنے دیکھتے ہوئے سکڑ گئی تھیں اور چہرے پر گہری سوچ کا تاثر تھا اس شام وہ وزارت کا قلمدان سنبھالنے والا تھا اور اس کے بارے میں صبح کے اخبار اپنے فرنٹ پیجز پر خبریں سجائے ہوئے تھے، حلف اٹھانے کے بعد اسے ایک نامور نیوز چینل پر ٹاک شو میں شرکت کرنا تھی، اس کا میڈیا ایڈوائزری عملہ صبح سے دن بھر کی مصروفیت سے متعلق نوٹس بنانے اور پوائنٹس فارورڈ کرنے میں مشغول تھا۔

''کچھ کامیابیاں میٹریل ہوتی ہیں اور کچھ immaterial۔'' اسے دو ہفتے پہلے اسی کمرے میں کھڑے ہوکر کہی اپنی بات یاد آئی۔ زندگی ہر نئے دن کے ساتھ اس کے سامنے اپنی ایک نئی حقیقت افشا کر رہی تھی، جن میں

سے اکثر متوقع تھیں اور چند ایک غیر متوقع بھی تھیں لیکن اپنے مزاج کو ہر غیر متوقع صورتِ حال کے مطابق ڈھال لینے کی جو صلاحیت وہ ایک بار خود میں ڈیولپ کر چکا تھا...... وہ ہر غیر متوقع صورتِ حال میں اس کے لیے ڈھال بن جاتی تھی لیکن وہ immaterial (غیر مادی) کامیابی جس کے حصول پر وہ خوشی سے سرشار تھا، ایک نامحسوس سی گرد کے پیچھے غائب ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

''آپ کے پورٹ فولیو سے متعلق ایک اہم پریس کانفرنس سے پہلے کے نوٹس سر، پلیز ایک دفعہ ان پر نظر ڈال لیجیے......'' یشل رئیس نے اس کے سامنے چند پرنٹڈ کاغذات پر مشتمل فائل رکھی...... ''اور ایک نیوز چینل آپ کے ایک exclusive انٹرویو کے لیے پچھلے دو دن سے وقت مانگ رہا ہے، آپ نے اس پر کوئی رسپانس نہیں دیا۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، یہ انٹرویو دینا ضروری ہے کیا......؟'' اس نے فائل میں رکھے کاغذات پڑھتے ہوئے کہا، ان کاغذات میں نیوز کانفرنس کے متوقع سوالات کی فہرست لکھی تھی۔

''سر، وہ جو آپ کی شکل میں نیا خون سامنے لا رہے ہیں، ان کی ہدایت ہے کہ یہ انٹرویو دیا جائے، اس انٹرویو کی ڈیل دو ماہ پہلے ہی طے ہو چکی تھی۔'' یشل نے متانت سے جواب دیا۔

''دو ماہ پہلے......'' مہرزاد کی ہنسی میں تمسخر تھا...... ''اور اگر الیکشن رزلٹ توقع کے خلاف ہوتا تو اس ڈیل کا کیا ہوتا؟''

''سر ڈیل ہو جانے کا مطلب الیکشن میں کامیابی ہی تھی، آپ جانتے ہیں......'' یشل نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اگر ہر چیز پری پلینڈ (پہلے سے طے) ہے اور ہر وہ ڈراما جو ہر نئے دن عوام کی نظروں کے سامنے رچایا جاتا ہے وہ پری اسکرپٹڈ (پہلے سے لکھا جا چکا) ہے تو انسان کیوں روبوٹس اور کٹھ پتلیاں کیوں نہیں خرید لی جاتیں ان پر ایکٹ (اداکاری) کرنے کے لیے......'' مہرزاد نے ہاتھ میں پکڑی فائل میز پر پھینکتے ہوئے کہا۔ یشل نے مہرزاد خان کے اس عمل اور اس کے چہرے پر چھائی تلخی پر ایک نظر ڈالی۔

''آپ یہ بھی خوب جانتے ہیں سر کہ انسان ہی کو کٹھ پتلی بنا دیا جا چکا ہے اور یہ کٹھ پتلیاں ہی کٹھ پتلیوں کی ڈوریاں ہلا رہی ہیں، ہر چھوٹی کٹھ پتلی کے لیے ایک بڑی کٹھ پتلی، اس بڑی کٹھ پتلی کے لیے اس سے بڑی کٹھ پتلی اینڈ سو آن اینڈ سو فورتھ...... so on and so forth''

''تم جانتی ہو میرا امزاج یہ نہیں ہے۔'' مہرزاد نے جھلا کر کہا۔ ''میں نے الیکشن جیتا ہے مگر ان کے ڈیزائنز پر نہیں جیتا۔'' اس نے دانت پیسے...... ''تمہیں یاد ہوگا کہ میری ہر موو پر یہ...... (گالی) ایک نئی تشویش میں مبتلا ہو جاتے تھے کہ اب الیکشن ہاتھ سے نکلا کہ اب نکلا...... مجھے کتنی وارننگز ملتی رہیں، کتنی ہدایات کتنی ڈکٹیشنز مگر میں نے کسی ایک پر بھی عمل نہیں کیا اور......'' اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہ ہی اب کروں گا......'' اس کا لہجہ فیصلہ کن ہوا۔ ''لہٰذا، دو ماہ پہلے کی ڈیل کے تحت کوئی انٹرویو نہیں ہوگا، میں خود فیصلہ کروں گا کہ مجھے کب اور کہاں اور کسے انٹرویو دینا ہے۔'' اس کی بات غور سے اور شاید حیرت کے ساتھ سنتی یشل نے بات ختم ہونے پر سینے میں دبی ہوئی سانس خارج کی۔

''I bet you are keeping your image at stake'' (میں شرط لگا کر کہہ رہی ہوں کہ آپ اپنا امیج جوئے پر لگا رہے ہیں) اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''پروا نہیں'' مہرزاد نے بے نیازی سے کہا۔ ''میں نے پہلی پارٹی میٹنگ میں یہ بات واضح لفظوں میں کہہ دی تھی کہ میں بریفنگز نہیں سنوں گا۔''

''پھر بھی۔'' یشل نے کہا۔ ''میرا مشورہ ہے کہ آپ تھوڑا آہستہ چلیں۔''

''تم دیکھو گی میرا ہر قدم well calculated ہوگا۔'' مہرزاد نے اسے یقین دلایا۔ ''لیکن میں اشاروں پر بھی نہیں ناچوں گا کیونکہ مجھے رقص میں بھی اپنے قدم خود اٹھانے آتے ہیں۔''

''it will become a pressure game for you'' یشل نے اسے ایک مرتبہ پھر تنبیہ کرنے کی کوشش کی۔

''دیکھتے ہیں مجھ میں پریشر برداشت کرنے کی کتنی سکت ہے، میں اپنی سکت خود بھی آزمانا چاہتا ہوں یا میں جیت جاؤں گا یا کھیل چھوڑ جاؤں گا...... دونوں میں سے جو بھی صورتِ حال ہوگی تم خود دیکھ لوگی......'' مہرزاد خان ایک بار پھر یشل کی توقع پر پورا اتر رہا تھا۔ الیکشن سے پہلے اور الیکشن کے بعد والے مہرزاد خان کے بارے میں اس کی توقع ہمیشہ حالات و واقعات کے برعکس ہوتی تھی اور مہرزاد ہمیشہ اس کی توقع پر پورا اترا تھا۔ اسے خوشی محسوس ہونے لگی۔ ''تیسری دنیا کے ایک سیاستداں کے سیاسی سفر'' نامی وہ کتاب جس کو لکھنے کے لیے وہ ان دنوں نوٹس بنا رہی تھی، میں آج کی رات اچھا اضافہ ہونے کی توقع تھی۔

''سر وہ پیج شکاگو میں رہنے والے پاکستانیوں کے ایک گروپ نے بنایا ہے، جس میں سے چند افراد کے نام یہ ہیں۔'' مہرزاد کے پرسنل سیکریٹری نے ایک ٹیب مہرزاد کی نظروں کے سامنے رکھا۔ ''اور یہ دیکھیں سر۔'' اس نے ٹیب اسکرین کو سوائپ کیا۔ ''اس ایشو پر بہت سے ٹوئیٹس بھی سامنے آئے ہیں۔''

''ہوں'' مہرزاد کی آنکھوں کی پتلیاں ایک مرتبہ پھر سکڑیں...... ''یہ شخص جس کا نام عاصم جہانگیر ہے، اس کے بارے میں انفارمیشن لو۔''

''وہ میں لے چکا ہوں سر۔ اس کا تعلق لاہور کی ایک اربن انڈسٹریلسٹ فیملی سے ہے اور یہ کسی کورس کے سلسلے میں امریکا میں مقیم ہے۔''

''اور یہ دوسرا نام طلحہ جمال الدین کا ہے، کیا یہ شخص پاکستانی ہے؟''

''سوفی صد سر، یہ لڑکا بنیادی طور پر پشتون ہے اور اس کا تعلق کوئٹہ سے ہے۔''

''ٹھیک ہے، فی الحال تم ان دونوں کو مارک کرو اور ان کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ یہ ایشو انہوں نے کیوں اور کیسے اٹھایا ہے؟'' مہرزاد نے کہا۔

''رائٹ سر......'' سیکریٹری نے ٹیب مہرزاد سے واپس لیتے ہوئے کہا۔ ''اور سر شیخ صاحب کافی دیر سے ملاقات کے انتظار میں بیٹھے ہیں......'' جاتے جاتے وہ واپس مڑا۔

''انہیں انتظار کرنے دو۔'' مہرزاد نے بیزاری سے کہا۔ ''تم رفیق کو آفس میں بھیجو، میں ادھر ہی جا رہا ہوں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

''سجاد بات سنو......'' مہرزاد خان کے جانے کے بعد یشل نے اس کے سیکریٹری سے کہا۔ ''یہ ٹیب مجھے دو ذرا، کیا معاملہ ہے؟''

''کسی صورت بھی نہیں۔'' سجاد نے ٹیب والا ہاتھ کمر کے پیچھے چھپاتے ہوئے کہا۔ ''سختی سے منع ہے۔''

''احمق ہو تم۔'' یشل نے کہا۔ ''اگر مجھ سے اس معاملے کا پردہ ہوتا تو سردار صاحب میرے سامنے یہ معاملہ تمہیں کبھی نہ ڈسکس کرنے دیتے۔''

''وائز لیڈی......'' سجاد نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔ اور ٹیب آن کر کے اس کے سامنے رکھا...... ''اس پیج کی تفصیلات پڑھ لیں، سردار صاحب کو اس پر انفو چاہیے۔'' وہ جھک کر اسے اسکرین دکھاتے ہوئے بولا۔ ''کچھ سمجھ آ جائے تو مجھے بھی بتائیے گا، لیں میں چلا۔'' وہ اپنا سر درد یشل کے حوالے کر کے کسی مشہور انگریزی گانے کی

ڈھن پر سیٹی بجاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

''میرال صلاح الدین۔'' یشل نے اس پیج کا ٹائٹل پڑھا اور اس پر موجود ایک ہی تصویر کو مختلف پوسٹس کے ساتھ اپ لوڈ ہوتے دیکھا۔

''اوہ......'' اس پیج کی تفصیل پڑھنے اور ٹوئٹر پر اس کے متعلق کیے جانے والے ٹوئیٹس پر نظر ڈالنے کے بعد اس نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ ''یہ شخص ایک وقت میں کتنے معاملات ساتھ ساتھ نمٹا رہا ہوتا ہے۔'' اس نے سوچا اور پھر اس کی انگلیاں تیزی سے اسی ٹیب کی اسکرین پر حرکت کرنے لگیں، وہ اپنے لیے اس سوشل ویب سائٹ پر ایک نئی فیک آئی ڈی بنانے میں مصروف تھی۔

☆☆☆

''اس کا وہ اسپیشل نمبر بند ہے اور اس کی جانب سے کوئی جواب کسی بھی شکل میں نہیں آیا۔'' زرنگار اپنے کمرے میں بیڈ پر بیٹھی اَن گنت الجھنوں کا شکار تھی۔

''شاید وہ سیاست میں اپنی نئی صورتِ حال میں الجھا ہوا ہے اور اس کا مجھ سے رابطہ کرنا ناممکن ہے۔'' اس نے خود کو تسلی دیتے ہوئے سوچا۔

''لیکن اگر ایسا تھا تو وہ مجھے اطلاع دے سکتا تھا کہ کچھ عرصے تک رابطہ نہیں ہوگا۔'' ایک نئی سوچ نے سر اٹھایا۔

''یقیناً میرال صلاح الدین سے زرنگار تک کے سفر کی تفصیل نے اس کے قلب پر کسی نئی واردات کی شکل میں اثر کیا ہے، ورنہ وہ دل تو وہی تھا جس کو وہ میرا مفتوحہ قلعہ قرار دیتا تھا......'' اس نے اس نئی سوچ کے ردِعمل میں دل میں اٹھتی ٹیس کی شدت دبانے کے لیے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبائے۔

''وہ روزن جو میری تاریک ہوتی زندگی میں روشنی کی لکیر کا ذریعہ بنا کیا وہ صرف چند روزہ نظر کا دھوکا ثابت ہونے والا ہے، اس چار دیواری کے درمیان اپنی عزت اور آبرو کی بقا کے لیے سر پٹخ پٹخ کر جان پر کھیل جانا کیا اب کے سچ مچ میرا مقدر بننے والا ہے؟'' اس نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے سوچا۔

''نہ جانے کب کس کے ہاتھوں ہوئی کوئی نیکی، کسی کے دل سے نکلی کوئی دعا، روٹی کا ٹکڑا بن کر میرے وجود کی زندہ لاش کو زمانے کے سانپوں کے پھن سے ہمیشہ بچاتی رہی، میں ہر اس وقت جب میں اپنی عزت کی بقا کے بارے میں بالکل ناامید ہو چکی تھی کسی نہ کسی غیبی امداد کے پہنچ جانے پر حیران رہ جاتی رہی...... اور میرے دل کا یقین بڑھتا جاتا رہا کہ اللہ کو میری حفاظت منظور ہے مگر جب مجھے تقدیر امراؤ بیگم کے ہاں لے آئی، میرا یقین ڈول گیا۔ یہیں اب میرے بچاؤ کا کوئی راستہ ممکن نہیں، میں نے سوچا، یہ جگہ جہاں ہر شام نئے سرے سے منڈی سجتی اور بولیاں لگتی ہیں۔ یہاں میرا بچاؤ کیسے ممکن ہے، میں نے سوچا اور بس یہ ہی سوچ لیا کہ دعا کی یا نیکی کی تاثیر ایکسپائر ہو چکی اب مجھے باقی کی عمر اپنے مقدر کی پامالی پر رونا ہی ہے لیکن پھر آپ آ گئے۔'' اسے یاد آیا سردار مہرزاد خان کو اپنی داستان سناتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ ''لیکن پھر آپ آ گئے۔'' اس کے الفاظ، آواز اور لہجے میں کتنا یقین تھا۔ وہ جو آ گیا تھا اب غائب ہو گیا ہے، امید، بیم میں تبدیل ہوتی جاتی ہے، یا اللہ تو رحم کر ہمیشہ کی طرح تو رحم کر۔'' وہ سوچ رہی تھی اور عین اسی گھر کی چھت تلے جہاں وہ بیٹھی یہ سب سوچ رہی تھی امراؤ بیگم کے پاس اقتدار کے ایوانوں سے ایک صاحبِ اقتدار شخصیت ملاقات کرنے کے لیے پہنچی تھی اور اس شخصیت کو سردار مہرزاد خان سے پرانے پوائنٹس برابر کرنا تھے۔

(جاری ہے)



شامِ شہرِ یاراں

عنیزہ سیّد

قسط 10



زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے . . . خیر و شر، نیکی اور بدی . . . زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت . . . ہر برائی پر حاوی ہوجاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سیّد نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

www.paksociety.com

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

محمود درانی اور ثمرین کی تیسری اولاد حمزہ، ثمرین کی زچگی میں پیچیدگی کے باعث نانی کے پاس ان کے آبائی گھر سیالکوٹ میں پروان چڑھتا ہے۔ جہاں نگین اس کے ماموں کی بیٹی سے اس کی خوب گاڑھی چھنتی ہے۔ بڑے ہونے پر حمزہ کے والدین اسے واپس لانا چاہتے ہیں مگر وہ راضی نہیں ہوتا۔ علینہ کے والدین، نادیہ اور سعید کیانی نے کورٹ میرج کی تھی مگر شادی کے تین سال بعد سعید کیانی بیوی کو داغ مفارقت دے گئے۔ علینہ، فہد کو ٹی وی شو میں ایک شیف کے طور پر دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے فہد جس کے ساتھ اس نے بچپن گزارا تھا۔ آکسفورڈ کا پروردہ سردار مہرزاد خان اپنے باپ کے سیاسی قتل کے بعد حادثاتی طور پر سیاست میں شامل ہوا تھا اور زرنگار کے حسن و ذہانت کا شکار ہو چلا تھا...... بینش دو بھائیوں کی اکلوتی بہن، اپنی ضد اور صرف بھائیوں کے تعاون سے نیشنل کالج آف آرٹس میں تعلیم حاصل کر رہی تھی جہاں اس کا سینئر ساتھی دانیال اس سے ہر ممکن تعاون کرتا تھا۔ ایک پاکستانی مسلمان مرد اور بدھ مذہب کی پیروکار چینی عورت کی بیٹی زوئی حسین چین سے آکر پاکستان میں فارمیسی کی تعلیم حاصل کرتی ہے یہ سب اس نے دادی کی محبت میں کیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کا دل پاکستان کی سرزمین اور یہاں کے لوگوں سے شدید محبت کرنے لگا تو اس نے ریلیف ڈیپارٹمنٹ جوائن کرلیا تاکہ اپنے قیام کو بڑھا سکے۔ حمزہ اپنی کزن اور بچپن کی دوست نگین سے بی اماں کی سہیلی اور پوتی (میرال) کے متعلق اپنی تشویش بتاتا ہے کہ رابعہ کلثوم کی وفات اور زلزلے کے بعد پوتی نہ جانے کہاں چلی گئی۔ رابعہ کلثوم بوا جی کے نام سے آرٹ اینڈ کرافٹ سینٹر چلاتی تھیں۔ امراؤ بیگم جو اپنی والدہ زبیدہ خانم کا کوٹھا آباد کیے ہوئے تھیں کی آمدنی کا ذریعہ زرنگار (میرال) بن چلی ہے مگر صرف سردار مہرزاد خان نے اس کی کئی راتوں کے حقوق بھاری معاوضے کے عوض اپنے نام کرلیے تھے۔ دانیال آرٹ کا شوق رکھنے کے ساتھ فلائنگ میں بھی مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے اور ایک دن طیارے کے دھوئیں سے نقش و نگار بنانے کی کوشش میں حادثے کا شکار ہوکر اسپتال میں پٹیوں میں جکڑا (عافیہ) ماں کی ممتا کا شدید امتحان بن جاتا ہے۔ بیٹے کی زندگی کی دعائیں مانگتے مانگتے عافیہ اللہ تعالیٰ کے مقربانِ خاص بندوں میں سے ایک کی درگاہ میں جا پہنچتی ہیں۔ زوئی حسین کے ویزے کی مدت ختم ہونے سے دو روز قبل وہ اپنے ایک ساتھی نادر سے نکاح کرلیتی ہے تاکہ پاکستان میں رہنے کا جواز پاسکے۔ 2005ء کے زلزلے میں زوئی حسین نے بھی متاثرین کی مدد کی تھی جو اسے خاصی مہنگی پڑی اور اب نادر بدگمانی کی آخری سیڑھی پر تھا۔ دانیال، بینش کو اپنے گھر لے جاتا ہے۔ بینش اخبار میں چھپنے والی زرنگار کی تصویر دکھاتی ہے تو عافیہ اسے دیکھ کر حیران رہ جاتی ہیں کیونکہ وہ رابعہ کلثوم کی پوتی میرال کی تصویر تھی۔ زوئی پاکستان آتی ہے لیکن نادر اسے ائرپورٹ لینے نہیں آتا۔ وہ فون کرتی ہے تو اس سے رابطہ نہیں ہو پاتا۔ وہ اپنی پرانی پڑوسن اور سہیلی مریم کے پاس جانے کا فیصلہ کرتی ہے۔ فہد کو اپنے ایک نیوز ریڈر دوست کے ذریعے سے میرال کی گمشدگی کی خبر ملتی ہے۔ الیکشن کمپین کے دوران نیشل ریئس، مہرزاد کی شخصیت کے کچھ ایسے پہلوؤں سے آشنا ہوئی جو اب تک سب سے مخفی تھے۔ مہرزاد کے الیکشن میں جیتنے کے بعد زرنگار اسے بتاتی ہے کہ وہ میرال صلاح الدین ہے۔ بینش سوچتی ہے کتنی خوش قسمت ہے وہ لڑکی جس کے لیے دانیال کی ممی اتنی پریشان ہو رہی تھیں۔ زوئی حسین، نادر سے ملنے کے لیے اس کی کمپنی جاتی ہے لیکن وہ وہاں بھی کئی دنوں سے نہیں آیا تھا سو وہ اس کے گھر جانے کا فیصلہ کرتی ہے، فہد، ڈاکٹر نادیہ سے، اسپتال میں ملتا ہے تو وہ اسے اپنے گھر لے جاتی ہیں، نگین اپنی ماں کے ساتھ لڑکی دیکھنے جاتی ہے تو اسے بینش بہت پسند آتی ہے، نگین اس کے پاس میرال صلاح الدین کا ایک ہینڈ آؤٹ دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے وہ اس سے ساری معلومات لے کر آکر حمزہ کو بتاتی ہے۔ زرنگار، مہرزاد کو اپنے ماضی کے بارے میں بتاتی ہے، زوئی، نادر کے گھر جاتی ہے تو نادر کی ماں کہتی ہیں کہ اسے بتا کر آنا چاہیے تھا۔ نادر، حمزہ سے ملتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ اگر زوئی قصوروار ہوئی تو وہ خود اسے لے کر آئے گا۔ حمزہ کہتا ہے کہ اسے اب تنگ نہیں کیا جائے گا۔ عافیہ، دانیال سے کہتی ہیں کہ جو طریقہ اس نے میرال کو ڈھونڈ نکالنے کا نکالا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ علینہ اچانک فہد کی آمد سے بہت خوش ہوتی ہے لیکن جب وہ یہ سنتی ہے کہ وہ میرال کی تلاش میں آیا ہے تو اسے اچھا نہیں لگتا۔ چوہدری رزاق، امراؤ بیگم کو خبردار کرتا ہے کہ زرنگار کی وجہ سے وہ اب کسی آفت میں پھنس سکتی ہے۔ مہرزاد کی ماں اس سے کہتی ہے کہ انہوں نے اس کا رشتہ خان اکبر کے گھر ڈالنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ نادر اپنے گھر میں زوئی کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ ثمرین، دانیال سے کہتی ہے کہ بینش اس کی دوستی کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔ زرنگار، مہرزاد کو میسج کرتی ہے کیونکہ وہ تقریباً چند دن سے رابطے میں نہیں تھا۔ نیشل، مہرزاد کو سنبھل کر چلنے کا مشورہ دیتی ہے۔

اب آگے پڑھیے

''میں ہفتوں اور مہینوں کی گنتی میں نہیں سالوں بے حس و حرکت پڑا رہا۔ میرے اپنوں کے لیے میری زندگی کی آس صرف میری سانس کی ڈوروں کے ذریعے بندھی تھی۔ اس بے ہوشی بلکہ کوما کی حالت میں، میں نہ دیکھ سکتا تھا نہ محسوس کرسکتا تھا کہ میری ماں کے دل کی دھڑکنیں میرے جسم کے ساتھ منسلک ان مشینوں کی اسکرینز پر چلنے والی ریڈ نگنز کے ساتھ جڑی تھیں جو میرے جسم کے نظام اور مختلف اعضا کے کام کرنے کی صلاحیت کی رپورٹ دیتی تھیں۔ کیا تم ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کرسکتی ہو بینش؟'' اسٹوڈیو کے فرش پر کینوس سامنے رکھے آلتی پالتی مار کے بیٹھے دانیال نے کہا۔ بینش جس کی نظریں اس کے مہارت سے کام کرتے ہاتھوں پر ٹکی تھیں اور کان اس کی بات سن رہے تھے، اس کی زندگی کے معجزے کی تفصیل سنتے ہوئے اس کے سوال پر خود پر چھائی ہیبت سے چونک کر باہر نکلی۔

''میں تصور کرسکتی ہوں کہ وہ کس کرب سے گزر رہی ہوں گی۔'' اس نے کہا۔

''اس کیفیت کو محض کرب جیسے لفظ کے ذریعے بیان نہیں کیا جاسکتا بینش، وہ کیفیت ایسی تھی جیسے انسان روز جیتا اور روز مرتا ہو۔'' دانیال نے مختلف اخباروں کے تراشیدہ حصے آپس میں جوڑ کر کینوس کے وسط میں چپکاتے ہوئے کہا۔ بینش نے دیکھا یہ وہ کولاج تھا جو وہ گزشتہ کئی ہفتوں کی ان تھک کوششوں کے باوجود نہیں بنا سکی تھی۔ دانیال کو اس تھیم پر کام کرنے میں صرف آدھا گھنٹا لگا تھا اور اب کینوس پر اس کے ہاتھ اسے حتمی شکل دے رہے تھے۔ بینش پر دانیال کے ٹیلنٹ اور مہارت کا سحر طاری ہونے لگا۔

''جب میں اس دنیا میں واپس آیا اور میں نے آنکھ کھول کر اپنے اردگرد دیکھا تو یہ وقت بھی ویسا ہی تھا جیسے وہ وقت...... جب میں ایک نوزائیدہ بچے کی شکل میں دنیا میں آیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ دوسری مرتبہ، میں پہلی مرتبہ سے زیادہ جلدی سننے، سمجھنے اور بتانے کے قابل ہوتا گیا۔ یوں جیسے میرا ذہن اور کچھ سمجھنے کے قابل ہوا ہو یا نہ ہو پر یہ ضرور سمجھ لیتا تھا کہ یہ وہ دنیا ہے اور زندگی وہ کیفیت ہے جو مجھ پر پہلے بھی گزر چکی ہے، یہ سب میں نے کہیں پہلے بھی دیکھا اور سنا ہے۔ ایک خواب اور پھر خواب سے جاگ جانے کی سی کیفیت......'' وہ سامنے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا یوں جیسے اس کی نظروں کے سامنے وہ سارے منظر فلم کی طرح چل رہے ہوں۔

''اور اس پورے تجربے میں ایک چیز پوری طرح میری سمجھ میں آئی۔ جانتی ہو وہ کیا ہے؟'' اس نے بینش کی طرف دیکھا۔

''کیا......؟'' بینش نے اسی مبہوت انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''یہ کہ خدا نے اپنے بندے کی تخلیق کی اور اس نے اسے دنیا میں لانے کا ذریعہ ہمیشہ ماں کو ہی بنایا۔ تخلیق کو وجود میں لانے کا کرب، اذیت اور بوجھ صرف ایک ماں ہی سہہ سکتی ہے کیونکہ اس کے اندر اللہ نے ممتا رکھ دی ہے، ممتا جو اپنے بچے کے لیے جنگ لڑتے ہوئے کبھی ہارتی نہیں، وہ آخری لمحے تک لڑتی ہے، آخری لمحے تک کوشش کرتی ہے۔''

''ہوں۔'' بینش نے جھرجھری سی لی۔ دانیال اسے زندگی کی ایک اتنی بڑی حقیقت کے بارے میں بتا رہا تھا جس پر اس نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔

''مجھے یقین ہے۔'' اس نے اپنی توجہ دوبارہ کینوس پر مبذول کرتے ہوئے کہا۔ ''میں وہیں اسپتال کے اس بیڈ پر کوما کی حالت میں ہی ختم ہوجاتا اگر میرے پیچھے میری ماں کی دعا کی طاقت اور میری زندگی بچانے کے لیے ان کی لگن شامل نہ ہوتی بینش۔'' اس نے ایک بار پھر بینش کی طرف دیکھا۔

''میری اس کیفیت نے میری ماں کو سرتاپا بدل کر رکھ دیا۔ ان کا لائف اسٹائل، ان کے نظریے، ان کی سوچ، ان کا عمل سب بدل گئے۔ انگریزی زبان کا ایک لفظ ہے، transformation میری ماما اس لفظ کی عملی تفسیر ہیں اور انگریزی زبان کا ہی ایک لفظ ہے reconstruction جو لفظ rebirth اور remake سے بہت مختلف ہے۔ اس کا مطلب ہے تشکیلِ جدید۔ یعنی نئی شکل دینا۔ میری ماں نے اپنا transformation کے بعد مجھے reconstruct کیا۔ اپنے گھر، اپنے ماحول، اپنے سے متعلق تمام رشتوں کی ''تشکیلِ جدید'' کی۔ مجھے دوبارہ زندگی مل جانا شاید اتنا بڑا معجزہ نہیں ہے بینش، جتنا بڑا معجزہ یہ ٹرانسفارمیشن اور تشکیلِ جدید ہے ہمارے خدا نے جیسے خود اپنا آپ ہمیں دکھایا اور معجزہ یہ ہے کہ ہم نے اسے دیکھ لیا۔ دیکھ تو لیا اب پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک' میں، میری ماں، میرا باپ، میرا بھائی اور میری بھابی، ہم ہر لمحہ اس خوف میں مبتلا رہتے ہیں کہ کسی انجانی لغزش کے سبب یہ معجزہ ہم سے چھن نہ جائے۔ زندگی اور موت تو ایسی حقیقتیں ہیں کہ ان کا انکار اور ان سے فرار ممکن نہیں۔ اسی لیے ایک دفعہ موت کے پنجے میں جا کر اس سے نکل آنے کے بعد بھی میں مرنے سے نہیں ڈرتا حالانکہ میں اس کی دہشت ناک شکل دیکھ چکا ہوں اور اس کی دہشت ناک شکل دیکھ لینے کے بعد مجھے دنیا میں کسی بھی اور چیز سے ڈر نہیں لگتا، میں ڈرتا ہوں تو صرف اس چیز سے کہ جو مجھے اس معجزے کی صورت میں ملی، کہیں میں اسے گنوا نہ دوں۔''

بینش نے بے دھیانی میں اپنے چہرے پر دوپٹے کا پلو پھیرا، دانیال کی باتیں سن کر دسمبر کی سردی میں بھی اسے پسینہ آ گیا تھا۔ اس کے دل پر ایک عجیب سا خوف اور ہیبت طاری ہو گئی تھی۔

''موت بھی شاید اتنی دہشت ناک نہ ہوتی ہو۔'' دانیال نے اپنے ہاتھ میں پکڑی colour palette میں برش چلا کر چند رنگوں کو آپس میں ملاتے ہوئے کہا۔

''لیکن وہ میری بداعمالیاں اور بےعملیاں تھیں جو موت کو اچانک سامنے پا کر مجھے یاد آنے لگی تھیں۔ یہ بھی بڑی عجیب سی بات ہے کہ جہاز پر کنٹرول کھو دینے کے بعد اس کے زمین پر گر کر آگ پکڑنے اور اپنے مکمل طور پر ہوش و خرد سے بیگانہ ہو جانے تک کے جتنے محسوسات تھے اور جو منظر تھا وہ مجھے بلاکم و کاست یاد ہے۔ میں جانتا تھا کہ جس بلندی سے میں گرا تھا' وہاں سے گرنے کے بعد میں زندہ بچ نہیں پاؤں گا۔ بلندی سے گرنے اور زمین تک پہنچنے کے وقفے کے دوران میں نے دیکھا جیسے میرے دائیں بائیں دو ایسی طاقتیں ہیں جن میں سے ایک کے ہاتھ میں چرخی پر چڑھی ایک ڈور ہے جسے وہ لپیٹتی جاتی تھی اور دوسری اپنے ہاتھ پاؤں چلاتی اس لپٹی ڈور کو کھولنے کی کوشش کرتی تھی۔ میں نے اس لمحوں کے وقفے میں اپنے سامنے موت کو مسکرا مسکرا کر مجھے اپنی طرف بلاتے دیکھا، وہ کس شکل میں تھی مجھے بتانا نہیں آئے گا مگر وہ شکل بری نہیں تھی جو بانہیں پھیلائے میری طرف لپکی آتی تھی۔ مجھے وہ اس لیے بھیانک لگی کہ میرا لاشعور جانتا تھا کہ وہ موت تھی جس کے سامنے میں التجائیں کر رہا تھا کہ میرے نامۂ اعمال میں تو کچھ بھی ایسا نہیں جس پر میں بخشے جانے کی درخواست کر سکوں، میں بلبلاتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا کہ وہ مجھے چھوڑ دے، مجھے نہ لے جائے، مجھے ایک موقع اور دے دے میرے بجائے کسی اور کی طرف چل دے لیکن وہ تھی کہ جیسے اسے میری ہی طلب تھی۔ اسے اس وقت صرف میں ہی چاہیے تھا۔ میں روتا اور گڑگڑاتا رہا، میں نے اپنے آنسو خود بہتے محسوس کیے تھے۔ ڈور لپیٹنے اور کھولنے والی طاقتیں اپنے کام میں مصروف تھیں۔ میں بلبلاتا، چلاتا، گڑگڑاتا نیچے اور نیچے گرا چلا جا رہا تھا۔ فضا میں بھی موت کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا اور دور دور تک تاریکی ہی تاریکی تھی۔ پھر میرا جسم کسی سخت سطح سے جا ٹکرایا۔

میں نے اپنے ماؤف ہوتے دماغ اور بند ہوتی آنکھوں کو جگانے کی کوشش کرتے ہوئے یاد کیا۔ وہ سطح کون سی ہو سکتی تھی اور مجھے خیال آیا وہ سطح زمین تھی۔ زمین جس پر جیتے جاگتے ہم اکڑتے پھرتے ہیں، زمین جو ہمارے کر و فر، جاہ و حشم، ظلم و ستم، جبر و زیادتی، نعمتوں، راحتوں، رحمتوں کی ناشکری کا بوجھ اپنے سینے پر اٹھائے رکھتی ہے۔ میں موت اور زندگی کی سرحد کے درمیان کھڑا زمین پر آ گرا تھا۔ میرے گرنے کے چند لمحوں بعد میرا جہاز وہ آہنی پرندہ جس پر کنٹرول حاصل کیے میں قیوم صاحب سے کہتا تھا میں ناممکن کو ممکن کر دکھاؤں گا اور وہ مجھے کہتے تھے ہمارے مذہب میں اس قسم کے ایڈونچرز کی گنجائش نہیں اور میں کہتا تھا کہ جہاں کہیں کوئی اور دلیل کام نہیں آتی ہم مذہب کو درمیان میں گھسا کر اپنی بات پر زور دینے لگتے ہیں۔ میرا وہی جہاز لوہے کے ایک بالکل حقیر ٹکڑے کے مانند آ کر زمین سے ٹکرایا اور پاش، پاش ہو گیا پھر اس میں آگ پھوٹ پڑی، اس آگ کی حدت سے لوہا سیال کی طرح بہنے لگا، نہ وہ اپنی شکل قائم رکھ پایا ہوگا نہ ہی ہیئت اور میں زمین پر چلنے والی مغرور جنس کا ایک نمائندہ' وہ جنس جسے انسان کہتے ہیں ٹوٹی ہڈیوں اور بکھرے خون کا ایک لوتھڑا بنا پڑا تھا۔ عبرت اور صرف عبرت کا مقام ہوگا وہ منظر جو دیکھنے والے نے سمجھا اور سوچا ہوگا۔'' دانیال کی آواز کپکپانے لگی۔ بینش دم بخود بیٹھی تھی زندگی کی اصل حقیقت اس روز اس پر آشکار ہو رہی تھی، ورنہ تو وہ بھی انسانوں کے قبیلے سے تعلق رکھتی تھی جو کائنات مسخر کرنے کا دعویٰ کرتا تھا۔

''پھر مجھے معلوم نہیں کیا ہوا۔'' دانیال نے اپنی آواز کی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بعد کتنے دن، کتنے مہینے اور سال گزرے مجھے پتا نہیں۔ اس کے بعد مجھے یاد ہے تو وہ آواز جو میرے سوئے دماغ کے کسی جاگتے خلیے کو وصول ہوتی تھی، میں نے اس آواز کے سگنل پکڑنے شروع کیے، صرف آواز کے' الفاظ کے نہیں۔'' اس نے بینش کی طرف دیکھا۔ ''پھر ایسا ہوا کہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں کسی ایک یا دو لمحے کے لیے الفاظ کیچ ہونے لگے پھر الفاظ کا مفہوم کیچ ہونے لگا۔ الفاظ کی شناسائی یاد آنے لگی۔ الفاظ جو کہتے تھے اللہ ہے، اللہ ہے، اور وہ آواز میری ماں کی آواز تھی۔ جس نے موت سے زندگی کی طرف میرے ساتھ سفر کیا تھا۔ اس کے بعد کی کہانی دنوں کی نہیں لمحوں کی ہے، لمحہ لمحہ سوتے سے جاگنے کی کیفیت، دنیا میں واپس لوٹ آنے کا سفر، معجزہ..... جس کے متعلق سنا ہی تھا اس پر یقین نا پختہ تھا۔ معجزہ، رونما ہونے لگا تھا اور ہم سب کو اس پر یقین کرنا تھا۔''

''مجھے ایسے لگ رہا ہے جیسے میری سانس بند ہونے لگی ہے۔'' بینش نے بے اختیار کہا۔

''میں جانتا ہوں تمہیں ایسا ہی لگ رہا ہوگا۔'' دانیال نے سر ہلایا۔ ''اسی لیے میں کسی کو یہ بات تفصیل سے نہیں سناتا جو نہیں جانتے انہیں تو بالکل بتاتا ہی نہیں ہوں کہ ایسا کچھ گزر چکا ہے، جو جانتے ہیں انہیں مسکرا کر کہہ دیتا ہوں بس اللہ کا شکر ہے جو اس نے دوبارہ زندگی دے دی...... میں جانتا ہوں بہت سے ایسے ہوں گے جو میری بات بے دھیانی سے سنیں گے، بہت سے یقین نہیں کریں گے اور چند ایک ایسے بھی ہوں گے جو تاب نہیں لا سکیں گے۔ تم تیسری کیٹیگری میں آتی ہو۔'' وہ مسکرایا۔ ''گھبراؤ مت، یہ اس زندگی کی حقیقت ہے جس پر ہمیں بہت گھمنڈ ہوتا ہے، میں بھی بہت کرتا تھا، تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ اس پر غور کرنے کی عادت ڈالو، اصل میں تو اس زندگی کی بساط بس اتنی سی ہی ہے۔'' بینش کا جسم کانپنے لگا تھا اس نے اس لرزش پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے سر ہلایا۔

''جب میں مکمل طور پر صحت یاب ہوا اور ماما نے مجھے لمحے' لمحے کی وہ داستان سنائی تو سمجھو میں پہلی بار اس

روز ایمان لایا، پیدا گو میں مسلمان گھرانے میں ہی ہوا تھا۔'' وہ مسکرایا۔ ''صوفی صاحب نے ماما سے کہا تھا کہ روز سورۂ کہف پڑھیں، انہیں موت کے بعد زندگی کی حقیقت اور اس کی سچائی پر یقین آجائے گا۔ ماما نے مجھ سے بھی یہی کہا تھا کہ سورۂ کہف پڑھا کرو، موت کے بعد جی اٹھنے کی حقیقت بیان ہے اس میں، اب یہ سورہ مجھے زبانی یاد ہے۔ تم بھی آج گھر جا کر یاد سے پڑھنا۔''

بینش نے سر ہلایا۔ وہ بظاہر ماڈرن، بے پروا، ست امیر زادہ، سینے میں کیسی کیسی چیزیں چھپائے ہوئے تھا۔

''دوبارہ زندگی ملنے کے بعد زندگی کی سب آسائشوں کی وقعت میری نظروں میں نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ گو میں کفرانِ نعمت اور ناشکری سے ہر ممکن بچتا ہوں مگر یہ ہیں تب بھی یہ نہ ہوں تب بھی کیا فرق پڑتا ہے۔ میں لوگوں کو مزید سے مزید حاصل کرنے کی جستجو میں لگے دیکھتا ہوں۔ بڑے، بڑے بحث ومباحثے اور تکرار میں پڑتے دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں یہ سب کس لیے ہے، اس سب نے تو اسی وقت ختم ہو جانا ہے۔ جب اس بظاہر دلفریب مگر حقیقت میں بھیانک شے نے آن دبوچنا ہے لیکن پھر سوچتا ہوں شاید اس سب کے لیے تو زندگی عطا ہوئی ہے، چلتی جاتی ہے اپنی تمام خوب صورتیوں اور ہنگاموں سمیت...... کائنات کی گھما گھمی قائم رکھتے ہوئے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔'' دانیال نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''آپ کسی کو نہیں سناتے، پھر مجھے کیوں......؟'' اس شام اسٹوڈیو سے باہر نکل کر بس اسٹاپ کی طرف جاتے ہوئے بینش نے کہا۔

''تمہیں اس لیے کہ تم میں مجھے مارجن نظر آتا ہے سننے کا بھی اور سمجھنے کا بھی، اسی لیے تم مجھے بہت عزیز ہو۔'' دانیال نے زندگی سے بھرپور الفاظ اس کی سماعت کے سپرد کیے تھے۔

☆☆☆

''ہم سب معصوم اور انجان ہیں نادر، ملک شہباز، اس کی بیوی، میں، خود میرال بھی یعنی وہی وہ لڑکی تھی۔'' زوئی نے نادر کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں میرال کو دوا دیتی تھی کیمپ میں، میری ڈیوٹی اسی کیمپ میں تھی جس میں اسے لایا گیا تھا۔''

''اور تم نے کہا تھا کہ تم زلزلہ زدگان کے مددگاروں میں شامل نہیں تھیں۔'' نادر نے کہا۔ زوئی نے سر جھکا لیا۔

''وہ میں نے غلط کہا تھا۔'' اس کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

''تم تو جھوٹ نہیں بولتیں زوئی......؟'' نادر کے انداز میں شکوہ تھا۔

''نادر......'' زوئی نے سر اٹھا کر کہا۔ ''میں نہیں جانتی تھی کہ ایک چھوٹے سے انسانی عمل کی وجہ سے مجرم ٹھہرا دی جاؤں گی۔ میں گھبرا گئی تھی اسی لیے کہا کہ میں وہاں نہیں گئی تھی کہ شاید ایسا کہہ دینے سے ہی جان چھوٹ جائے۔''

''یہاں صرف ایسا کہہ دینے سے جان نہیں چھوٹا کرتی زوئی...... بلکہ اگر ایک دفعہ جان پھنس گئی ہو تو آپ کا دور، دور سے بھی اس بات سے واسطہ نہ ہو جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔''

''میں سمجھ چکی ہوں نادر اور میں خود پر جھیل لینے کے لیے واپس آئی ہوں، میری وجہ سے تم مصیبت میں پھنسو میں برداشت نہیں کر سکتی۔'' زوئی نے سچائی اور خلوص کے ساتھ کہا۔

''کیا کوئی اوورسیز پاکستانی لڑکی اتنا خلوص دکھا سکتی ہے؟'' نادر نے زوئی کے چہرے پر پھیلی معصومیت اور سچائی کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ ''جس کی جان دوسرے کسی ملک میں جا کر چھوٹ چکی ہو اور وہ محض ایک

کاغذی رشتے کو نبھانے واپس آ کر اپنی جان دوبارہ پھنسا لے۔''

''پھر کیا ہوا تھا، دوا لیتے لیتے اس لڑکی کو وہاں سے بھاگنا کیوں پڑا تھا؟'' نادر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ بھاگی نہیں تھی، ایک نام نہاد سماجی تنظیم کے کارکن اسے رات کے وقت بے ہوش کرنے کی دوا سونگھا کر اٹھا لے چلے تھے۔'' زوئی نے کہا۔

''اوہ......!'' نادر بری طرح چونکا۔ ''کیا یہ سچ ہے؟''

''ہاں، یہ بہت کڑوا مگر سچا سچ ہے۔'' زوئی نے دکھ سے کہا۔ ''اور صرف میرال ہی کو نہیں بلکہ وہاں موجود کئی اور لڑکیوں کو جو بے سہارا ہو چکی تھیں یوں ہی اٹھا لیا گیا تھا۔ وہاں جو قیامت آئی ہوئی تھی اس میں تو بہت سے لوگوں کو معلوم بھی نہیں ہوا کہ ادھر ہو کیا رہا تھا۔''

''اوہ میرے خدا......!'' نادر نے پلکیں جھپکیں۔ ''اور پاکستانی آج تک قیامِ پاکستان کے وقت ہونے والے مرگِ انبوہ کے اندر کے جنم لینے والی اس قسم کی سچائیوں پر مضامین اور کتابیں لکھ رہے ہیں۔''

''میں حسبِ معمول اس کیمپ کے پناہ گزینوں کو دوا دینے اور ان کی حالت دیکھنے کے لیے وہاں گئی تھی اور مجھے لگا وہاں کچھ غیر معمولی ہو رہا تھا بہت غیر معمولی۔'' اس نے تھوڑا سا توقف کیا۔ ''نام نہاد امدادی کارکنوں کے ایک گروپ نے میرے پوچھنے پر کہا کہ زیادہ زخمیوں کو وہ کسی اسپتال میں شفٹ کرنے کے لیے لے جا رہے تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اس لڑکی میرال کو اٹھایا اور دور کھڑی ایک گاڑی میں ڈال دیا۔ وہاں اتنی افراتفری اور سراسیمگی کا عالم تھا کہ باہر نکل کر میں نے جس سے بھی پوچھا کیا زخمیوں کو کہیں شفٹ کیا جا رہا ہے تو مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا، یوں تو روزانہ ایمبولینسز اور ہیلی کاپٹرز آتے تھے اور زیادہ تر لکھا پڑھی کے بعد زخمی شفٹ ہوتے تھے مگر رات کے اندھیرے میں یوں اس لڑکی کو لے جانا اور پھر اس سے زیادہ زخمیوں کو چھوڑ جانا عجیب سی بات تھی۔ میں نے جب دیکھا کہ کوئی بھی میری بات دھیان سے نہیں سن رہا تو میں اپنی ٹیم کے لیڈر کے پاس گئی۔ انہوں نے میری بات سن کر کہا کہ اگر وہ فلاں تنظیم کے کارکن تھے تو ہاں وہ لے جا سکتے تھے۔ میری تسلی پھر بھی نہیں ہوئی...... میں نے ایک مرتبہ پھر اس گاڑی کے قریب جا کر دیکھا۔ وہ ایک چھوٹی گاڑی تھی جس کی پچھلی نشست پر انہوں نے میرال کو ڈالا ہوا تھا۔ اس وقت میرے دماغ میں اور تو کچھ نہیں آیا میں بے سوچے سمجھے اس گاڑی کی کھلی ڈگی میں گھس گئی اور ڈگی کا ڈھکن بند کر لیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد گاڑی چل پڑی۔

اُف!'' زوئی نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ ایک قابلِ رحم تجربہ تھا۔ بند ڈگی میں سانس لینی دشوار تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔ ایک دو گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد کہیں گاڑی رکی اور کچھ دیر رکی ہی رہی۔ میں نے سوچا میں ڈگی کا ڈھکن کیسے کھولوں گی لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ کیسے لیکن اس کا کلچ جہاں آ کر وہ بند ہوتا تھا میرے ایک ہاتھ لگانے سے ہی اوپر اٹھ گیا۔ میں نے ڈھکن ذرا سا اوپر اٹھایا اور تازہ ہوا میں سانس لی۔ میرے سکڑے پھیپھڑوں میں ہوا پہنچی تو مجھے لگا میں فوری مرنے سے بچ گئی لیکن آگے کیا ہوگا یقین جانو نادر ڈگی میں بند رہنے کا تجربہ اتنا بھیانک تھا کہ میں اس میں سے صرف اپنی جان بچانے کے لیے نکلی تھی۔ مجھے نیکی اور اس لڑکی کی مدد وغیرہ کا خیال سب بھول چکا تھا۔ لیکن جیسے ہی میں ڈگی سے باہر کودی میں نے دیکھا گاڑی کے ڈرائیور اردگرد کوئی بھی موجود نہیں تھا میں نے تیزی سے پچھلی نشست کے قریب جا کر دیکھا لڑکی درد سے کراہ رہی تھی۔ ہر طرف رات کی تاریکی پھیلی تھی اور کوئی دوسرا انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہ جانے کہاں سے اچانک ایک

جیپ میرے قریب آ کر رکی۔ جیپ میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص نے مجھ سے پوچھا کہ اگر میری گاڑی خراب ہوگئی ہے تو وہ میری مدد کر سکتا ہے۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے اسے بتایا کہ میں ایک زخمی لڑکی کو اسپتال لے کر جارہی تھی اور گاڑی خراب ہوگئی۔ اس نے جیپ سے اتر کر لڑکی کو اس گاڑی سے نکال کر جیپ میں ڈالا۔ میں بھی لڑکی کے ساتھ ہی بیٹھ گئی اور جیپ آگے چل دی۔ وہ کوئی پروفیشنل ڈرائیور تھا جو پہاڑوں پر جیپ چلاتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ سڑک مظفر آباد جارہی تھی۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ خود راول پنڈی جارہا تھا۔ میں نے اس کی منت کی کہ وہ ہمیں بھی راول پنڈی لے جائے۔ اس نے کہا کہ راستہ بہت خطرناک ہو چکا ہے۔ جگہ جگہ ملبے کے ڈھیر اور پتھروں کی رکاوٹیں ہیں۔ راول پنڈی پہنچنے میں بہت وقت لگ سکتا تھا۔ لڑکی کو مظفر آباد کے کسی امدادی کیمپ میں لے جانا چاہیے لیکن میری منت اور شاید میرے غیر ملکی ہونے کے رعب میں آ کر وہ جیسے تیسے ہمیں راول پنڈی پہنچانے پر آمادہ ہوگیا۔ میں نے تم سے کہا تھا ناں نادر سب انسان سارے پاکستانی ہی برے نہیں ہوتے، ان میں چند فرشتہ صفت بھی ہوتے ہیں۔'' زوئی نے رک کر کہا۔ نادر، زوئی کی کہانی محویت سے سن رہا تھا اس نے بغیر پلکیں جھپکے سر ہلا دیا۔ وہ فوراً آگے کی کہانی سننے کا متمنی تھا۔

''میں نہیں جانتی بلکہ اب تک بہت غور کرنے کے باوجود نہیں سمجھ سکی کہ وہ جیپ والا اس سنسان سڑک پر اچانک کہاں سے آ نکلا تھا اور وہ ہمیں اتنی شرافت اور خلوص کے ساتھ راول پنڈی تک کیسے لے گیا تھا۔ میرے اور میری امدادی ٹیم کے کارکنوں کے گلے میں ہر وقت ایک بیگ لٹکا رہتا تھا۔ جس میں کچھ پیسے، شناخت کا وہ کارڈ جو ٹیم کے ہر ممبر کو جاری کیا گیا تھا، موبائل فون اور بسکٹ وغیرہ رکھتے رہتے تھے۔ راول پنڈی جانے کے اس دشوار سفر میں مجھے اس بیگ کا خیال آیا۔ بدقسمتی سے میں اپنا موبائل فون اپنی ایک ساتھی کے پاس چھوڑ آئی تھی۔ رقم، کارڈ اور کچھ خشک راشن البتہ موجود تھے۔ لڑکی کو درد ہو رہا تھا اور اسے کوئی دوا نہیں مل پا رہی تھی، وہ درد کی شدت سے بے ہوش ہوگئی تھی۔ میں نے راستے میں ایک جگہ جیپ رکوا کر اس کے لیے جوس خریدا اور درد کی دوا بھی نہ جانے کتنے ہی گھنٹوں کے تھکا دینے والے سفر کے بعد ہم راول پنڈی شہر میں داخل ہوئے۔ وہ شخص جو جیپ چلا رہا تھا مسلسل ڈرائیونگ کی وجہ سے تھکان سے نڈھال ہو رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

''مس آپ سمجھیں یہاں تک صحیح سلامت پہنچ جانا ایک معجزہ ہے، ورنہ جس قدر دشوار گزار وہ راستہ ہو چکا ہے اور جتنی مشکل یہ ڈرائیو تھی مجھے بالکل بھی یقین نہیں تھا کہ ہم اتنے کم وقت میں یہاں تک پہنچ جائیں گے۔ مجھے تو یہ سب کسی معجزے سے کم نہیں لگ رہا، نہ میرے راستے میں کوئی پتھر آیا نہ کٹا پھٹا راستہ، مجھے لگا میں گاڑی ہواؤں میں چلا رہا تھا۔''

''یقین جانو نادر میں خود بھی حیران تھی۔ وہ خواب جیسا سفر میری زندگی کا ناقابلِ فراموش ترین سفر تھا۔ اس ڈرائیور نے ہمیں راول پنڈی کے جنرل اسپتال تک پہنچایا اور رخصت ہوگیا۔ اب میں تھی، میری ٹوٹی پھوٹی اردو اور اجنبی لوگ...... خیر اسپتال کے ایمرجنسی عملے نے لڑکی کو ٹریٹمنٹ تو دیا مگر وہ بہت زیادہ پروا نہیں کر رہے تھے۔ میں نے انہیں بتایا بھی کہ ہم کہاں سے آئے تھے لیکن ان کے پاس اپنے بھی بہت سے ایسے مریض تھے۔ میں نے سوچا اسپتال سے باہر نکل کر کسی سے مدد مانگوں لیکن اسی کوشش کے دوران میری نظر اسپتال میں پھرتے انہی امدادی کارکنوں پر پڑ گئی۔ وہ وہاں اس طرح پھر رہے تھے جیسے کسی کو تلاش کر رہے تھے۔ میرے اوسان خطا ہوگئے۔ ایک بار پھر میں بنا سوچے سمجھے لڑکی کو باہر لے کر اسپتال سے نکل پڑی۔ میں اس سے پوچھ رہی تھی کہ کہیں قریب کوئی اس کے رشتے دار رہتے ہوں تو بتائے، وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں

سیالکوٹ، سیالکوٹ... کہتی رہی۔ میں نے چند لوگوں سے سیالکوٹ کے بارے میں پوچھا اور کسی کی مدد سے سیالکوٹ جانے والی ایک کوچ میں بیٹھ گئی۔ میرا ذہن اتنا خراب ہو چکا تھا کہ میں خوف و دہشت میں جکڑ گئی۔ راول پنڈی میرے لیے اجنبی شہر تھا۔ زبان سے میں زیادہ واقف نہیں تھی کسی ساتھی یا دوست کا نمبر زبانی یاد نہیں تھا۔ مجھے پتا نہیں کیوں لگ رہا تھا وہ لوگ اس لڑکی کے پیچھے لگے ہوئے ہیں جو ہر جگہ پہنچ جائیں گے اور وہی ہوا، سیالکوٹ جانے والے راستے میں ایک جگہ میں نے کوچ کی کھڑکی سے باہر دیکھا وہ ایک گاڑی میں بیٹھے اسی راستے پر جارہے تھے۔ وہ گاڑی کوچ سے آگے نکل گئی اسی حواس باختگی میں، میں نے کوچ رکوائی اور ایک ایسی جگہ لڑکی کو لے کر اتر گئی جس کے بارے میں کچھ علم نہ تھا کہ کون سی جگہ تھی۔ سڑک کے کنارے میں زخمی لڑکی کو لیے پریشان حال کھڑی تھی جب سڑک کے کنارے پر کسی گاؤں کو جانے والے راستے کی طرف جاتے ایک ادھیڑ عمر شخص ہمارے قریب رک گئے۔ انہیں دیکھ کر میں ڈر گئی اور ان کے پوچھنے پر بتایا کہ ہم غلطی سے سیالکوٹ سے پہلے ہی اتر گئے۔ وہ صاحب نیک دل اور خدا ترس تھے۔ رات کا اندھیرا پھیلتا دیکھ کر ہمیں اپنے گھر لے گئے۔ اُن کی بیوی نے بھی ہماری بہت خدمت کی۔ لڑکی کو یخنی بنا کر پلائی اور اپنے گھر میں پلا مرغ ذبح کر کے پکا کے ہمیں کھانے کو دیا۔ وہ میری زندگی کی یادگار ترین رات تھی۔ وہ بے لوث محبت کرنے والے لوگوں کے درمیان گزری رات...... اگلے روز شہباز صاحب نے ہمیں سیالکوٹ جانے والی ویگن پر بٹھا دیا ابھی وہ ویگن سیالکوٹ بھی نہیں پہنچ پائی تھی کہ ان کار سواروں نے اسے آلیا اور سب مسافروں کے اور میرے چیخنے چلانے کے باوجود میرال کو گاڑی میں ڈال کر لے گئے۔ میری دو دن کی محنت، خواری اور ہمدردی اکارت گئی۔ کوئی بھی شخص ان کے اسلحے کے سامنے نہیں ٹھہر سکا۔ میں پریشان، دل شکستہ اور خوفزدہ وہاں سے واپس لاہور آگئی۔ میں اس واقعے سے اتنی دل برداشتہ ہوئی کہ پھر کسی کے سامنے اس کا ذکر ہی نہیں کیا۔ ہاں اس لڑکی میرال کا خیال بار بار آتا رہا۔ وہ کس حال میں ہوگی اس کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہوگا۔''

''ہوں......'' نادر نے پوری بات سن کر کہا۔ ''لیکن تمہارا کیا خیال ہے وہ کون لوگ ہوں گے۔ جو اس لڑکی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے۔''

''میں نہیں جانتی۔'' زوئی نے سر ہلایا۔ ''میں نے تو جو اصل بات تھی تمہیں بلاکم و کاست سنا دی، اب تم ہی بتاؤ کہ اس لڑکی کے غائب ہونے میں میرا کیا ہاتھ تھا؟''

''بس یہی تو المیہ ہے زوئی حسین کہ یہاں کسی غیر معمولی واقعے کے نادانستگی میں بھی قریب سے گزر جانے والے دھر لیے جاتے ہیں۔ تم نے مجھے تو اپنی بات سنا دی۔ میں نے مان بھی لی لیکن حقائق اور دلیل کے ساتھ اسے ثابت کرنا مشکل کام ہے، پوچھنے والے تو بہت کچھ پوچھیں گے۔'' نادر نے کہا۔

''مثلاً؟'' زوئی نے سوالیہ انداز میں نادر کی طرف دیکھا۔

''مثلاً یہ کہ تم خاص طور سے اس لڑکی کی مدد کے لیے ہی کیوں رسک لے کر چل پڑیں۔ تم نے وہاں واویلا کیوں نہ مچایا کہ لڑکی کو یوں بغیر اطلاع ویسے لے جایا جارہا تھا...... اور پھر آگے کی کہانی ڈگی سے نکلنا، جیپ کا آجانا اور اس وقت جو راستوں کے حالات تھے ان میں جیپ کا راول پنڈی پہنچ جانا، راول پنڈی پہنچ کر بھی تمہارا کسی اتھارٹی کسی سمجھدار انسان سے رابطہ کرنے کے بجائے نیم بے ہوش لڑکی کو کوچ میں بٹھا کر سیالکوٹ لے جانے کی کوشش، یہ سب جادو کی کہانی لگتی ہے، ہوا میں اڑتے اڑن قالین جیسی فیری ٹیل...... مشکل ہی ہے جو وہ اس پر یقین کریں تاوقتیکہ کوئی ٹھوس ثبوت ساتھ شامل نہ ہو۔''

''میں نے تم سے کہا ناں نادر خود میرے لیے وہ سفر، ایسے ہی تھا جیسے میں کوئی پریوں کی کہانی پڑھ رہی ہوں جیسے آپ سے آپ ہی سب کچھ ممکن ہوا جا رہا ہو۔ وہ سب جو ویسے دیکھنے پر ناممکن لگتا ہے۔'' زوئی نے کہا۔

''چلو فرض کر لیا کوئی غیبی طاقت تمہاری مدد کر رہی تھی۔'' نادر نے کہا۔ ''پھر تو اس لڑکی کو کسی محفوظ مقام پہنچا کر تمہاری واپسی ہونی چاہیے تھی، غیبی طاقت نے اسے راستے ہی میں سے دوبارہ کیوں اغوا کرا لیا؟''

''یہ بھی بالکل سوچنے کی بات ہے۔'' زوئی نے کہا۔ ''مجھے یاد ہے وہ لوگ اتنے غصے میں تھے کہ انہوں نے مجھے اپنی بندوقوں کے بٹ مارتے ہوئے کہا۔ ''ہمارا راستہ کھوٹا کر دیا تو نے کتیا..... آج ہم شارجہ بیٹھے ہوتے۔'' وہ تو شاید مجھے مار ڈالتے مگر جلدی میں تھے اس لیے لڑکی کو لے کر فرار ہو گئے۔''

''یہ بھی ایک پوائنٹ ہے کہ انہوں نے تمہیں یوں کیسے چھوڑ دیا۔ تم تو عینی گواہ تھیں اور ان کا راستہ بھی تم ہی نے کھوٹا کر دیا تھا؟'' نادر کا دھیان اس طرف چلا گیا۔

''پوائنٹس تو بہت سے ہیں نادر.....'' زوئی نے ایک لمبی سانس لی۔ ''لیکن جو اصل بات تھی میں نے بتا دی۔ اب اگر ایک ناکردہ جرم کی سزا مجھے مل ہی کر رہنی ہے تو اس سے فرار کیسے ممکن ہے۔''

''میں ایک بالکل عام سا انسان ہوں زوئی۔'' نادر سب کچھ بھلا کر خلوص سے بولا۔ ''لیکن میرا تم سے وعدہ ہے میں بساط بھر ہر جگہ تمہارا ساتھ دوں گا اور تمہاری بے گناہی ثابت کر دا کر ہی دم لوں گا۔''

''میری وجہ سے خود کو مشکل میں مت ڈالو نادر، مجھے میری حماقت کا سامنا کرنے دو، تم اپنی زندگی گزارو۔'' زوئی اس کے خلوص سے متاثر ہوتے ہوئے بولی۔

''ایسے کیسے؟'' نادر مسکرایا۔ ''میری اماں کو تم نے آتے ہی اپنے قابو میں کر لیا۔ اب تم باقاعدہ ان کی بہو قبول ہو چکی ہو گویا تم میری بیوی ڈکلیئر ہو گئیں۔ اب تو میں تمہارا ساتھ کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا۔ ہم مل کر اس کیس کا سامنا کریں گے اور جب تم انشاء اللہ اس میں بے گناہ ثابت ہو جاؤ گی پھر باقاعدہ اپنی زندگی کا آغاز کریں گے۔''

زوئی حسین کے لیے اس سے بڑا دلاسا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

"I sardar Meharzad khan do solemnly swear that I am a muslim and believe in the unity and oneness of Almighty Allah" گلاس وال سے پار باہر کا منظر دیکھتے ہوئے اس نے یاد کیا۔ "thats I will bear faith and true allegiance to Pakistan" اس کے چہرے پر ایک طنز بھری مسکراہٹ پھیلی۔

"that I will not allow my personal interest to influence my official conduct or my official decisions" طنز بھری مسکراہٹ گہری ہونے لگی۔

"that in all circumstances I will do right to all manner of people ,according to law without fear of favour, affection or ill well" مزید گہری پڑتی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اس نے سر جھٹکا اور باہر دیکھنے لگا۔ وہ وفاقی کابینہ میں شامل ہونے کے لیے اپنی حلف برداری کی تقریب سے واپس آیا تھا۔ ایوانِ صدر سے نکل کر اپنے گھر اور گھر ہی میں واقع اپنے دفتر تک پہنچتے پہنچتے اس کے تازہ، لیے حلف کے مندرجات کی دھجیاں اڑا دینے والے

گیدڑ اور بھیڑیے جگہ، جگہ اس کا راستہ روکے کھڑے تھے۔ وہ جیسے تیسے ان سے جان چھڑا کر اپنے دفتر تک پہنچا تھا۔ اسے فوری طور پر کچھ وقت کی تنہائی درکار تھی...... اور اس وقت وہ اس لمحاتی تنہائی میں شیشے کی دیوار کے قریب کھڑا اپنے حلف کے الفاظ یاد کر رہا تھا، اس کے ایک ہاتھ میں کافی کی پیالی تھی اور دوسرا ہاتھ اس کی پینٹ کی جیب میں رکھے ایک کاغذ پر تھا۔ اس کے دفتر کے باہر انتظار گاہ میں ان گنت لوگ بیٹھے تھے۔ وہ جن کو فوری سفارشی پرچیاں درکار تھیں، وہ جو اپنے خزانوں کے منہ کھولے اس کے پاس آئے تھے اور جنہیں لمبے عرصے کے فائدے کی تمنا تھی۔ وہ جو اس کے پہلے حکم کے منتظر تھے، وہ جو "ہم تمہارے دوست ہیں" کے لیبل چہروں پر سجائے اسے مبارک باد دینے آئے تھے۔ آنے والوں اور ملاقات کے تمنائیوں کی کیٹیگریز کی کوئی حد نہ تھی۔ وہ بھی تھے جو اس کی وزارت سے متعلق انتہائی اندرونی اور انتہائی بیرونی رازوں کی خبر رکھتے تھے اور اس کے کانوں میں انہیں انڈیلنا چاہتے تھے۔ "and that I will not directly or indircetly communicate or reveal to any person which shall be brought under my consideration or shall become known to me" اس نے حلف کی اختتامی شق یاد کی اور باہر بیٹھے گیدڑوں اور بھیڑیوں کا تصور کیا۔ وہ گیدڑ اور بھیڑیے جو نظام کا حصہ نہیں خود میں مکمل نظام تھے۔

"may Allah help me and guide me" حلف کی آخری لائن اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"may Allah help me and guide me" اس نے زیرِ لب دہرایا۔

یہ وہ حلف تھا جو اس کے باپ نے کئی بار لیا، اس کے چچاؤں، ماموؤں، کزنز، بہنوئیوں اور کئی رشتے داروں نے لیا اور آئندہ بھی لینے والے تھے۔ حلف کے الفاظ میں تاثیر باقی رہی تھی نہ نیاپن، وہ محض الفاظ تھے کھوکھلے اور بے جان جن کا پڑھنا اور دُہرایا جانا محض ایک ریاستی مجبوری تھی۔ اللہ، اللہ کی کتابوں، قرآن پاک بطور اللہ کی آخری کتاب، حضرت محمد ﷺ جو اللہ کے آخری نبیؐ تھے اور جن کے بعد کوئی نبی نہیں آنے والا تھا۔ اس نے سر جھٹکا۔ "کیا ان سب حلف اٹھانے والوں کو حلف کے یہ الفاظ ایک رسمی تقریب میں پڑھنے کے بعد یاد بھی رہتے ہوں گے؟ اگلے حلف تک انہیں کبھی خیال بھی آیا ہوگا کہ انہوں نے حلف برداری کی تقریب میں کیا الفاظ دُہرائے تھے۔"

"میں اپنے ذاتی مفادات کو اپنے کارہائے منصبی پر حاوی نہیں ہونے دوں گا۔" اس کی نظروں کے سامنے اس مملکتِ خداداد کا نقشہ ابھرا، جس کی لکیریں شکستہ ہو رہی تھیں اور سرحدیں لاغر، جس میں نشاندہی کیے گئے ملک کے ڈھانچے کی ہڈیاں تک نچوڑی جا رہی تھیں۔ ہر بار ایک ہی جگہ پر ایک ہی چھت کے نیچے ایک حلف اٹھانے کے بعد وہ لوگ بھوکے شیروں کی طرح اس ملک کے نظام پر پل پڑتے تھے۔ جس کی شریانوں میں دوڑتے خون نے ان کو یہاں تک پہنچنے کا موقع دیا تھا اور آج وہ خود بھی اس حلف کا امین بن چکا تھا، حلف جس کا ایک، ایک لفظ ایک، ایک سطر اسے بلاکسی ہیلیشی زبانی یاد تھی...... اور وہ ذرا سی تنہائی ڈھونڈ کر ان لفظوں اور سطروں پر غور کرنا چاہتا تھا جبکہ اس کے دفتر سے باہر انتظار گاہ میں اس کے منتظر لوگوں کی قطاریں بندھی تھیں، نوچ کھائے ہوئے ڈھانچے اور نچڑی ہوئی ہڈیوں پر نئے عزم کے ساتھ پل پڑنے والے بھوکے شیروں، گیدڑوں اور بھیڑیوں کی قطاریں......

"may Allah help me and guide me may Allah help me and

guid me" اس نے کئی بار زیرِ لب دُہرایا اور اپنی دفتری میز کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

"سبین کی سسرال والے شادی کی تاریخ مانگ رہے ہیں، میں اور تمہارے ڈیڈی چاہتے ہیں کہ سبین کی شادی تک تمہارا رشتہ بھی کہیں طے کر دیں تاکہ دونوں شادیاں اکٹھی ہو جائیں۔" مہرین نے تازہ خبریں سنانے والی کسی نیوز ریڈر کی طرح بات حمزہ کے گوش گزار کی۔

"اوہ...... پھر وہی قصہ......" وہ دل ہی دل میں جھلّا اٹھا۔

"سبین کی شادی سے میری شادی کا کیا تعلق ہے؟" اس نے اسی جھلّائے ہوئے انداز میں کہا۔ "آپ اس کی شادی کی تاریخ دے دیں اس کی سسرال والوں کو، میرے پاس توفی الحال اس کام کے لیے وقت نہیں ہے۔"

"کیا مطلب وقت نہیں ہے؟" وہ طیش میں آنے کے لیے غصے کے رن وے پر دوڑنے لگیں۔ "آپ سن رہے ہیں ناں......؟" انہوں نے قریب بیٹھے محمود درانی کو مخاطب کیا۔ "آپ کے سامنے بیٹھا ہے، سن لیں، اپنے کانوں سے سن لیں تاکہ بعد میں یہ نہ کہیں کہ تمہیں سننے میں غلطی ہوئی ہوگی۔"

"دیکھیں بابا، میں کیریئر کے آغاز پر کھڑا ہوں۔" حمزہ نے باپ کے استفسار سے پہلے ہی کہنا شروع کیا۔ "مجھے ابھی بہت لمبا سفر طے کرنا ہے، میں چاہتا ہوں کہ میں اس قابل ہو جاؤں کہ معاشی طور پر اپنا اور ایک فیملی کا بوجھ اٹھا سکوں لیکن ممی......" اس نے ماں کی طرف دیکھا۔ "انہیں نہ جانے کیوں جلدی ہے۔"

"بات تمہاری ایک طرح سے تو ٹھیک ہے۔" محمود درانی نے نرمی سے کہا۔ "لیکن تمہیں فوری طور پر تو کوئی معاشی مسئلہ لاحق نہیں ہے، معاشی لحاظ سے تمہارا فیملی بیک گراؤنڈ مضبوط ہے، تمہاری جاب بہت اچھی ہے اور اسے کوئی خطرہ بھی لاحق نہیں ہے پھر تم کیوں منع کرتے ہو ماں کو۔"

"نہیں بابا۔" اس نے سر جھٹکا۔ "میں صرف فیملی بیک گراؤنڈ کے بل پر نہیں جینا چاہتا، میں چاہتا ہوں کہ میرا اپنا تعارف اتنا مضبوط اور جاندار ہو کہ لوگ میرے تعارف سے میری فیملی کو جاننے کی کوشش کریں۔"

"دیکھا آپ نے؟" وہ ایک مرتبہ پھر بھڑکتے ہوئے بولیں۔ "یہ اس کے اندر سے اماں بول رہی ہیں، یہ نہیں بول رہا، اپنا تعارف، معاشی طاقت، ہونہہ۔" انہوں نے جھنجلا کر کہا۔

"میں جان گئی ہوں حمزہ...... میں نے تمہیں اسی دن کھو دیا تھا جب اپنی مجبوری کے ہاتھوں اپنی گود سے نکال کر تمہیں اماں کی گود میں ڈال دیا تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ اماں اپنی بوسیدہ اور گھن کھائی تربیت کے ذریعے تمہارے اندر بھی اپنی بوڑھی روح حلول کر جائیں گی، اب تمہیں بھی میری بات سمجھ آسکتی ہے نہ آئے گی۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں اور پیر پٹختے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئیں۔ حمزہ نے انہیں کمرے سے باہر جاتے بڑی بے بسی سے دیکھا اور پھر اسی بے بسی سے باپ کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں تمہارے مسئلے کو کسی حد تک سمجھتا ہوں۔" محمود درانی نے اس کی بے بسی دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں ڈر ہے کہ تمہاری ممی تمہارے لیے ایسی لڑکی پسند کریں گی جس سے تمہارا مزاج نہیں ملتا ہوگا؟"

"شاید یہ بات بھی ہے۔" حمزہ نے جواب دیا۔

"یہ بات بھی ہے۔" محمود درانی نے اس کے الفاظ دُہرائے۔ "گویا کوئی اور بات بھی ہے؟" حمزہ نے سر جھکا لیا۔

"اچھا.....!" محمود درانی نے معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ "کوئی لڑکی پسند کرلی خود سے اور ممی کو بتانے کا حوصلہ نہیں ہے۔"

"ایسی بات ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔" حمزہ نے مبہم سے انداز میں کہا۔ "بات صرف اتنی سی ہے بابا کہ واقعی مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں آپ لوگوں سے خصوصاً ممی سے ہزاروں میل کے ذہنی فاصلے پر کھڑا ہوں، جس انداز سے آپ لوگ زندگی کے بارے میں سوچتے ہیں میں ویسے نہیں سوچتا، چاہے یہ بڑی اماں کی تربیت کا اثر سمجھ لیں یا میرا اپنا مزاج ہی ایسا ہے، میں جس طرح روایات، اخلاقیات اور رشتوں کے احترام پر یقین رکھتا ہوں، مجھے میری ہی طرح کی کوئی لڑکی سمجھ سکتی ہے اور ایسی لڑکی آپ لوگوں کی اس ماڈرن سوسائٹی میں نہیں ملے گی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" محمود درانی نے اس سے اتفاق کیا۔

"اور اگر میں کوئی ایسی لڑکی ڈھونڈ لوں تو ممی کے لیے وہ اپنے بیک گراؤنڈ سمیت کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں ہوگی، وہ کس طرح ایسی لڑکی کا تعارف اپنے حلقۂ احباب میں اپنی بہو کے طور پر کرا سکتی ہیں۔"

"ہوں۔" باپ نے اس کی بات پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"اس لیے میں چاہتا ہوں کہ مجھ سے اس سلسلے میں اصرار نہ کیا جائے، مجھے اسی طرح رہنے دیا جائے۔"

"لیکن بیٹا یہ تو مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے۔" انہوں نے بات کو سمجھتے ہوئے کہا۔ "ہم دونوں انتہاؤں کے درمیان توازن پیدا کرنے والا کوئی حل بھی تو سوچ سکتے ہیں ناں۔"

"نہیں بابا، ان دونوں انتہاؤں کے درمیان توازن پیدا ہونا ناممکن ہے، بہتر ہے کہ ہم اس موضوع پر بات ہی نہ کریں، میرا مزاج جس سانچے میں ڈھل کر پختہ ہو چکا ہے اسے ری مولڈ کرنا میرے لیے بھی بہت مشکل ہے۔"

"کیا تم سمجھتے ہو ہم نے تمہارے ساتھ زیادتی کی اور اب تمہیں جگہ سے بے جگہ کرنے کے بعد واپس اسی جگہ پر فٹ کرنے کی کوشش کرکے مزید زیادتی کر رہے ہیں؟" انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"جو ہو چکا اسے واپس پھیرنا بھی ناممکن ہے بابا، میں نے آپ لوگوں کی اس مجبوری کو کبھی زیادتی نہیں سمجھا کیونکہ بڑی اماں کے ساتھ میں، میں نے وہ سیکھا جو یہاں صدیوں بھی رہ لیتا تو نہ سیکھ پاتا۔" حمزہ نے کہا۔ "لیکن اب جو اینٹ جہاں لگ چکی اسے وہاں سے کھسکانے کی کوشش میں عمارت گرا دینے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آنے والا۔"

"ٹھیک ہے، میں تمہاری ممی کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔" محمود درانی نے کہا۔ "اگر جو ان کی سمجھ میں میری بات آجائے لیکن تمہیں بھی یہ مشورہ دے دوں گا کہ زندگی تن تنہا نہیں گزرتی...... آج نہیں تو کل تمہیں ایک ساتھی کی ضرورت ضرور محسوس ہوگی۔"

"میں فطرت کے تقاضوں سے انکاری نہیں ہوں لیکن کسی کو ساتھی بنا کر مزاج نہ ملنے کے سبب چھوڑ دینے والی صورتِ حال میں بھی پھنسنا نہیں چاہتا۔" حمزہ نے نرمی سے کہا۔

"چلو دیکھ لینا، جب تمہیں محسوس ہو کہ تمہیں ایسی کوئی لڑکی مل گئی ہے جو تمہارے ساتھ اور تمہارے مزاج کے ساتھ کمپرومائز کرلے گی تو مجھے بتا دینا، میں یہ بھی کوشش کروں گا تمہاری چوائس کو گلیمر کی چکا چوند کی چادر اوڑھا کر تمہاری ممی سے اپرووَل حاصل کرلوں۔" بابا نے مسکرا کر کہا۔ وقت کے ساتھ ساتھ انہیں اپنا یہ بیٹا

باقی بچوں کی نسبت زیادہ پیارا لگنے لگا تھا اور وہ نامحسوس طریقے سے اس کے قریب آنا چاہتے تھے۔

"آپ وعدہ کر رہے ہیں ناں کہ آپ ایسا کریں گے؟" حمزہ کو پہلی بار اپنا باپ اپنے دل کے بہت قریب محسوس ہوا تھا۔

"وعدہ نہیں، کوشش کرنے کا کہہ رہا ہوں۔" انہوں نے کہا۔ حمزہ اُن کی طرف حیرت اور محبت سے دیکھ رہا تھا۔

"اور کچھ......؟" انہوں نے اسے یوں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایک بات اور......؟" حمزہ نے سر ہلایا۔

"ہاں کہو۔"

"مجھے کچھ رقم بطور قرض چاہیے، میں ایک خاص مدت کے بعد آپ کو لوٹا دوں گا۔ پہلے میں بینک سے قرض لینے کا سوچ رہا تھا۔ اب سوچا آپ سے ہی کیوں نہ لے لوں، آپ بینک کی نسبت نرم شرائط پر دے دیں شاید۔"

"باپ سے رقم قرض لینے کا تو میں نے اب تک نہیں سنا۔" محمود درانی نے کہا۔ "یہ بتاؤ کتنی رقم چاہیے اور کیوں چاہیے؟"

"مجھے ماموں سے بڑی اماں والا گھر خرید کر اسے رینوویٹ کرنا ہے۔"

"vintage" محمود نے بے ساختہ کہا۔

"ہاں یہ ہی سمجھ لیں۔"

"ضرور کرو، تمہارے حصے کی رقم جو ہمیں تمہاری تعلیم اور دوسرے معاملات پر خرچ کرنا تھی امانتاً ہمارے پاس رکھی ہے، تم اس سے بڑی اماں کا قرض اتار سکتے ہو، نو پرافٹ نو لاس۔" بابا نے اُس کے ذہن پر پڑا ایک بڑا بوجھ آسانی سے اتارتے ہوئے کہا تھا۔

☆☆☆

"دل خوش کر دیا آپ نے چھوٹے صاحب، ہماری تو مانیں گلے میں پھنسی ہڈی حلق سے نکال دی۔" امراؤ بیگم نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔

"ہم تو بہت پہلے ہی تمہارا دل خوش کرنے کے چکر میں تھے امراؤ بیگم، تم ہی نے وہ نایاب ہیرا سردار زادے کی تحویل میں دے رکھا تھا اوپر سے اس سے ڈرتی ایسے تھیں جیسے بند گلی میں پھنسا کتا اپنے شکاری سے ڈرتا ہے۔"

"کتوں کو کون شکار کرتا ہے چھوٹے صاحب، کتے تو اپنی موت آپ مرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں، شکار تو نایاب جانوروں کا کیا جاتا ہے۔" امراؤ بیگم اتنی خوش تھی کہ خود کو کتا کہے جانے پر بھی برا نہ مناتے ہوئے برجستہ بولی۔

"جس کتے کی زبان شیر کا خون چاٹ لے اس کے کئی شکاری اِدھر اُدھر سے آدھمکتے ہیں امراؤ بیگم، تمہارا تو شکاری بھی ایک کایاں آدمی ہے...... اگر ہمارا ہاتھ سر پر نہ ہوا تو تمہیں چوں کرنے کی بھی مہلت نہیں ملے گی، ایک بند گلی میں جا پھنسی ہو لڑکی سمیت۔"

"آپ کا کہا سر آنکھوں پر سرکار لیکن اب بتائیں جو آپ نے بتایا ہے، اس منصوبے پر عمل درآمد کب ہوگا؟" امراؤ بیگم ایک مرتبہ پھر برا نہ مناتے ہوئے خوش دلی سے بولی۔

"وقت کم ہے امراؤ بیگم اور مقابلہ سخت ہے، اب تک وہ حلف اٹھا چکا ہوگا کنفرمڈ، اس کا پہلا آرڈر آیا ہی

چاہتا ہے، ٹکٹ تمہارے حوالے کر دیا ہے، جتنی جلدی ہو سکتا ہے اسے یہاں سے نکالو، ہاں وہ ہاٹ لائن جو دونوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہے اس پر وہ پیغام جا چکا ہے، وہ تمہاری بات بغیر کسی بحث کے مان جائے گی۔''

''اس کے ساتھ کون جائے گا؟'' امراؤ بیگم نے پوچھا۔

''تم تو ہرگز نہیں جاؤ گی۔'' فوراً جواب آیا۔ ''بلکہ کوئی بھی ایسا بندہ نہیں جائے گا جس سے کسی نقل و حرکت کی خبر کہیں پہنچ سکے۔ لڑکی کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو گی لیکن کوئی ایسا ضرور ساتھ ہو گا جو اس پر نظر رکھ سکے اور وہ کون ہو گا یہ تمہیں بھی نہیں بتایا جائے گا۔''

''چھوٹے صاحب، آپ ساتھ کیوں نہیں جائیں گے، اتنا خرچہ کر کے بہار وہاں بھیج دیں گے خود خزاں میں بیٹھے رہیں گے کیا؟''

''مجھے شطرنج کی بساط کا ادنیٰ کھلاڑی سمجھتی ہو تم غالباً، تو آموز اور غیر مشاق، میری عقل گھاس چرجائے تب بھی یوں سیدھا ہو کر سردارزادے کے سامنے نہ آؤں، ہاں تھوڑا وقت گزر جائے پھر بہار ہو گی اور ہم ہوں گے......''

''واہ واہ چھوٹے صاحب، قربان جاؤں میں آپ کی عقل اور ذہانت کے، آپ کے داؤ کے بھی اور آپ کے پیچ کے بھی، کیا کمال کا دماغ پایا ہے آپ نے۔'' امراؤ بیگم لہکتے ہوئے خوشامدانہ انداز میں بولی۔

''میں نے کہاں ناں امراؤ بیگم تم نے خود ہی دیر کر دی بندہ پہچاننے میں، ایک ہزار راتوں کی ایڈوانس پیمنٹ کے وعدے پر لڑکی پھنسا دی، ارے ہم تو ہیں ہی یاروں کے یار...... اس موقع پر تمہارے کام ہم نہیں آتے تو اور کون آتا بھلا بولو۔''

''کوئی بھی نہیں میرے سرکار...... مولا خوش رکھے آپ کو جی، سدا جیوندے تھیویں' امراؤ بیگم تو چھچھوندر کی طرح کڑکی (چوہے دان) میں پھنسی باریک آواز میں چیخیں مارتی رہ جاتی جو آپ ادھر قدم نہ دھر لیتے بروقت تو۔'' چوہدری رزاق نے اپنی بلغمی آواز میں چھوٹے صاحب کی مدح سرائی کرتے ہوئے کہا۔

''یہ بھی ان امراؤ بیگموں کی خوش قسمتی ہوتی ہے جو تم جیسے چوہدری رزاق ان کے پیچھے بیٹے رہتے ہیں ورنہ یہ جنس اب مارکیٹ میں آؤٹ ڈیٹڈ ہو چکی ہے، اب تو فرفر انگریزی بولنے والی آنٹیوں کا زمانہ ہے، بلائیں لینے والی، بیگمیں اور خانمیں گئے زمانے کا قصہ بن چکیں۔ امراؤ بیگم اب تمہیں بھی چاہیے کہ اللہ، اللہ کیا کرو، بہت ہنڈورتالی (استعمال کر لی) تم نے زندگی اب آگے کی فکر کرو۔''

''جی چھوٹے صاحب کرتی ہوں انتظام مکے، مدینے کی زیارت کا، بس ایک دفعہ اس سردار سے جان چھوٹ جائے، تسلی ہو جائے اس طرف سے تو فوراً انتظام کرتی ہوں...... اور اس چوہدری رزاق کی تو کچھ نہ پوچھیں، اس لڑکی والی مصیبت میں بھی اسی نے پھنسایا ہے ہمیں، یہی لایا تھا کم بخت اس لڑکی کو بختو کے پاس۔'' امراؤ بیگم نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

''جانتی ہو تاں کہاں سے لایا تھا؟''

''جانتی ہوں، خوب اچھی طرح جانتی ہوں۔'' امراؤ بیگم نے نفرت آمیز نظروں سے چوہدری رزاق کی طرف دیکھا۔ ''وہاں سے اٹھایا اور منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی ہاتھ سے نکال بھی دی۔''

''وہ تو سو میں سے جو ایک بار ہوتا ہے وہ ہو گیا ورنہ لڑکی اور ہاتھ سے نکل جائے؟'' چوہدری رزاق نے آنکھیں چرا کر کھسیاتے ہوئے کہا۔

''اچھا یہ تو بتاؤ چوہدری رزاق، لڑکی کو پہلی بار اٹھایا کس کے کہنے پر تھا؟''

''ایک لڑکی نہیں جی کئی اٹھائی تھیں وزیر فلاں کے کہنے پر۔'' چوہدری رزاق نے زیرِ لب وزیر کا محکمہ بولتے ہوئے کہا۔

''ٹھہرو ذرا مجھے یاد کرنے دو...... اس وقت اس محکمے کا وزیر کون تھا؟''

''پتا نہیں سرکار...... ہمیں تو اوپر سے حکم ملا تھا امدادی کارکن بن کر جاگھسو اور چیدہ، چیدہ لڑکیاں اٹھا لاؤ، ہم نے کئی اٹھائیں یہ بھی انہی میں شامل تھی، اسے اس ڈاکٹرنی نے فرار کرا لیا۔ اس کو تو وہاں سے اٹھا کر سیدھا شارجہ پہنچانا تھا جب اس کے فرار کی خبر ملی تو وزیر صاحب کے آرڈر آ گئے جیسے بھی فوراً ڈھونڈ کر لاؤ۔ ہم کتوں کی طرح بو سونگھتے سیالکوٹ جا پہنچے جی، لڑکی قابو کر لی تو وزیر صاحب کا آرڈر آ گیا، اب یہ لڑکی انہیں نہیں چاہیے تھی، وزیر صاحب تو اکڑ گئے ہم اپنی جان کہاں چھپاتے، جو کچھ نہ سوجھا تو جا بختو کے ڈیرے پر دم لیا۔ وہ بے چاری باسی شکلیں آغوش میں لیے بیٹھی تھی۔ ایسی ماہتاب صورت لڑکی نظر آئی تو باچھیں کھل اٹھیں اس کی...... کہنے لگی ایسے اسے سامنے نہیں لاؤں گی پہلے سکھاؤں گی، پڑھاؤں گی پھر سامنے لاؤں گی۔ لڑکی کی تربیت جاری تھی کہ بختو کے پاس لڑکیوں کی ایک کھیپ اور پہنچ گئی۔ ادھر یہ امراؤ بیگم روزی روٹی سے عاری بیٹھی کھیاں مار رہی تھی۔ بختو کو جو اس پر ترس آیا تو لڑکی کو اس کے ہاں بھیج دیا۔ لڑکی یہاں کیا آئی مانو امراؤ بیگم کے بھاگ کھل گئے۔ چھپر پھاڑ کر دولت مہربان ہوئی، سردار مہر زاد نے ایک ہزار راتوں کے ایڈوانس پکڑا دیے۔ گاڑیاں میسر آ گئیں، علاقے میں نام اڑ گیا، وارے نیارے ہو گئے لیکن پھر ہزار راتوں کے ایڈوانس کا جادو سر چڑھ کر جو بولا تو آج کی صورتِ حال آپ کے سامنے ہے، ایک آرڈر اسلام آباد سے آنے کی دیر ہے بس۔'' چوہدری رزاق نے تمسخر اڑانے کے سے انداز میں امراؤ بیگم کی طرف دیکھا۔

''لو جی، پھر ایک فیکٹ مجھ سے بھی سن لو، میں نے ابھی گوگل پر سرچ کیا ہے اور پتا کیا چلا ہے جناب کہ اس وقت اس محکمے کے وزیر اسی سردار موصوف کے والد صاحب تھے، قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے اور لڑکیاں اٹھوانے کا شوق پھر بھی قائم تھا۔''

''اوہو ہو...... یہ خبر تو نہ ہوئی ناں جی یہ تو اسکوپ ہو گیا اسکوپ۔'' چھوٹے صاحب کے والد کے پریس انفارمیشن کے ایک کارندے نے اپنی بتیسی نکالتے ہوئے کہا۔

''جب ہی سردارزادہ اتنی چندا بنا کر رکھتا ہے بچی کو۔'' امراؤ بیگم نے اس خبر پر غور کرتے ہوئے کہا۔

''اونہیں...... اونہیں......'' چھوٹے صاحب نے فوری طور پر سامنے آنے والے تمام ردِ عملوں کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ ''بڑے وزیر صاحب اس وقت اس محکمے کے وزیر تھے پھر پارٹی ہیڈ کوارٹر سے انہیں ہدایات ملی وزارت چھوڑ کر اپوزیشن میں بیٹھ جائیں کیونکہ اگلی بار ویسے ہی ہماری تھی۔ والد صاحب اپوزیشن میں بیٹھ گئے۔ جب ہی تو چوہدری رزاق کو آرڈر ملا اب اس لڑکی کو کہیں نہیں پہنچانا۔ چھ ماہ سے کچھ زیادہ عرصہ والد صاحب اپوزیشن میں رہے اور اسی لیے چوہدری رزاق کو اس کے بارے میں مزید کوئی ہدایت لڑکی کے بارے میں جاری نہیں ہوئی اور یہ جہاں سینگ سمائے بنورانی کو چھوڑ آئے۔''

''پھر اس سردار کے بچے کو کیسے خبر ہو گئی اس لڑکی کے اِدھر موجود ہونے کی؟'' امراؤ بیگم نے مزید غور کرنے کی کوشش کی۔

''ہاں یہ البتہ ابھی پتا نہیں چل سکا، یہ تو باپ کے قتل پر واپس آیا تھا۔ پارٹی کو ایک شہید کی ضرورت تھی، وہ اس

کے باپ کے قتل نے پوری کردی، محترم نے اپنے جھنڈے کے ساتھ بھی پارٹی کے جھنڈے گاڑنے شروع کردیے، نتیجہ دیکھ لو آج وہ پارٹی ہائی کمان سے عام کارکن تک کی آنکھ کا تارہ بنا ہوا ہے۔'' چھوٹے صاحب نے کہا۔

''اوئے اسی لیے تو کہہ رہا ہوں احتیاط سے...... بڑی احتیاط سے آگے چلو، کسی کا نام نہ آنے پائے۔ فی الحال، پارٹی کے اندر ہی جو ٹانگ کھینچنے والے ہیں ان کے وار چلنے تک احتیاط سے چلنا ہے۔''

''رات ڈھائی بجے کی فلائٹ ہے سرکار، وقت کیسے جلدی گزر سکتا ہے کوئی سمجھ نہیں آرہی۔'' امراؤ بیگم نے کہا۔

''فکر نہیں کرو، آج کی رات تو وہاں جشن منایا جائے گا، وزیر صاحب نے رات دس بجے ایک لائیو۔ انٹرویو بھی دینا ہے، اس وقت وہ ایک پریس کانفرنس سے خطاب بھی فرمارہے ہوں گے، ان کو پورٹ فولیو ہی ایسا ملا ہے، آگے پریس پیچھے الیکٹرانک میڈیا، دائیں صحافی، بائیں مبصر اُن سے نمٹ لیں گے تو جانِ جاناں کی خبر لیں گے ناں۔'' چھوٹے صاحب نے ہنستے ہوئے کہا، ان کی تقلید میں کمرے میں موجود ہر شخص ہنسنے لگا تھا۔

☆☆☆

''میری جان کو اپنے عاشقِ نامدار کی طرف سے سلامِ فتح قبول ہو۔'' زرنگار نے اس خصوصی فون پر خصوصی نمبر سے آنے والے، پیغام کے الفاظ کو بار بار بغور پڑھا...... نہ پیغام مانوس لگتا تھا نہ ہی طرزِ تخاطب...... مگر جس نمبر سے وہ پیغام آیا تھا اس پر یقین نہ کرنے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا۔

''آج رات ڈھائی بجے کی فلائٹ سے دبئی روانگی شیڈولڈ ہے، میری جان کا ٹکٹ امراؤ بیگم تک پہنچ چکا ہے، وصول پاتے ہی جناب اپنی تیاری مکمل کرلیں، چند روز میدانِ سیاست سے دور، حسین جگہوں پر ساتھ گزارنے کا موقع ملے گا۔ چند روز جو یقیناً بہت خوب صورت ہوں گے، چند راتیں جو یقیناً بہت یادگار ہوں گی۔''

اس نے کئی بار یہ دوسرا پیغام پڑھا۔''سردار زادہ مہرزاد خان اور اتنا عامیانہ طرزِ گفتگو'' اس نے کئی بار سوچا۔''جیت کی ترنگ اور وزارت کا خمار۔'' اسے خیال آیا۔''کیا وہ بھی عام انسانوں کی طرح کھل کھیلنے لگا ہے۔'' ذہن و دل ماننے سے انکاری تھے مگر نہ ماننے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا۔ اسی دوران امراؤ بیگم بھورے رنگ کا ایک بھاری سا لفافہ لیے چلی آئیں۔

''لو میری چندا...... تمہارے لیے تو سیر و تفریح کا ٹکٹ آیا ہے۔ سردار صاحب نے اپنی جیت اور وزارت کی خوشی میں تمہارے ساتھ دبئی کی سیر کا پروگرام بنایا ہے۔'' وہ کہہ رہی تھی شک اور بے یقینی کی مزید گنجائش ختم ہوگئی۔

''کیا معلوم یہ ٹکٹ نہیں پروانۂ آزادی ہو!'' پھر اس نے مثبت خطوط پر سوچنا شروع کیا۔''اسے مجھے زندگی میں واپس عزت کا مقام دلوانے ہی کا تو خبط ہے ناں، شاید منصبی مجبوریاں یہاں اس ملک میں یہ خبط پورا کرنے کی اجازت نہ دے پارہی ہوں اور وہ مجھے کسی بہانے یہاں سے دور لے جانے کا پروگرام بنائے بیٹھا ہو۔ ورنہ اتنی افراتفری کی تو کوئی تُک نہیں بنتی۔ منصب سنبھالتے ہی پہلی رات وہ پروگرام اور بیرونِ ملک روانگی، معاملہ کیسا الجھا ہوا سا لگ رہا ہے۔'' وہ سوچتے، سوچتے تھکنے لگی۔ ان دو پیغامات کے بعد فون پر کوئی پیغام وصول نہیں ہوا تھا۔ اس کے بھیجے پیغام منزل پر پہنچنے میں ناکام ہورہے تھے اور امراؤ بیگم اپنی خاص ملازمہ کے سر پر کھڑی اس کا سامان پیک کروا رہی تھی۔ بارہا اس کا دل چاہا امراؤ بیگم سے کہہ دے۔

''اماں میں نہیں جارہی کہیں''، لیکن ایسا کہہ دینے سے ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے اس سنہری پنجرے میں بند،

جانے کا بھی خدشہ تھا۔ وہ سمجھ نہیں پارہی تھی کہ پھر وہ ایک عجیب سے خلجان میں کیوں مبتلا تھی۔

☆☆☆

''وزارتِ اطلاعات و نشریات پر گزشتہ ایک عرصے سے ایک خاص مافیا کا قبضہ ہے، کیا آپ ملک کے وسیع مفاد میں اس قبضے سے اپنی وزارت کی جان چھڑوا پائیں گے؟''

''وسیع مفاد!'' سوال کے جواب میں اس نے اپنے مخصوص انداز میں سوال کرنے والے کے سوال کا ایک اہم لفظ دُہرایا۔''کیا آپ مجھے بتائیں گے ملک کا وسیع مفاد کیا ہے، وہ کیا چیز ہے جسے larger interest کا نام دیا جاتا ہے؟''

''سر آپ......'' سوال کرنے والے نے کہنا چاہا۔

''آپ بیٹھیں، میں آپ کو بتاتا ہوں لارجر انٹرسٹ سے آپ کی کیا مراد ہے؟'' اس نے ہاتھ ہلا کر سوال کرنے والے کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کی مراد یہ ہے کہ ایک مخصوص مافیا کے قبضے سے اس شعبے کی جان چھڑوا کر دوسرے مخصوص مافیا کے گلے میں ہار کی طرح ڈال دیا جائے تاکہ جس بہتی گنگا میں پہلے وہ ہاتھ دھو رہے تھے اب دوسرا دھونے لگے۔''

''آپ ایسے مافیاز کو بے نقاب کریں گے کیا......؟'' اسی شخص نے دوسرا سوال کیا تھا۔

''بے نقاب۔'' وہ مسکرایا۔''کیا وہ کوئی نقاب پہنے اپنا کام کرتے ہیں، کیا میں ان سے واقف نہیں ہوں یا آپ ان سے واقف نہیں ہیں؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے سوال کرنے والے کی طرف دیکھا۔

''میرے بھائی وہ نقاب پوش نہیں بلکہ ہم ہیں جنہوں نے اپنی نظریں دانستہ بند کر رکھی ہیں۔'' اس کی بات کے جواب میں یک دم خاموشی چھا گئی تھی۔

''سردار زادہ صاحب آپ پرنٹ میڈیا پر عائد ٹیکسز کے بارے میں کیا پالیسی اختیار کرنے والے ہیں؟'' کسی اور طرف سے سوال آیا۔ اس سوال کا جواب اس نے قدرے تفصیل سے دیا۔ ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا وہ سوالوں کے جواب دیے چلا جارہا تھا اور کمال کی بات یہ تھی کہ وہ کہیں اٹکا نہیں تھا۔ گویا اس نے اس پریس کانفرنس کے لیے اپنے نوٹس مکمل طور پر پڑھ کر رکھے تھے اس کا ہوم ورک مکمل تھا۔

یشل نے ٹی وی اسکرین پر چھائے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا، اس چہرے پر اعتماد کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ جوش، عزم، خوشی، سرشاری وہ اس قسم کے کسی تاثر کو اس کے چہرے پر تلاش کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر اسے اپنے اندر کے محسوسات کے تاثرات چھپانے میں کمال حاصل تھا۔ اس پریس کانفرنس کے دوران اس نے چند لطیفے بھی سنائے، کچھ چٹکلے بھی چھوڑے، سنجیدہ باتیں بھی کی تھیں اور عمدہ مثالیں بھی تھیں۔ اس کی گفتگو میں فوری طور پر کوئی بہت امید افزا بات تھی نہ کوئی بلند و بانگ دعویٰ اور وعدہ...... اس نے معاملات کو خود دیکھنے اور سمجھ لینے کے بعد کوئی بات کرنے پر زور دیا تھا۔ مجموعی طور پر اس پریس کانفرنس کے بعد اس کی شخصیت کا اچھا تاثر پہلے سے زیادہ بڑھا تھا۔

''اس کی بہترین صلاحیت مجمع کو اپنے جادو اثر بیان اور سحر انگیز شخصیت کی کشش میں جکڑ لیتا ہے۔ پارٹی کو برسوں بعد ایسا چارمنگ بندہ میسر آیا ہے جس میں پارٹی کو لیڈ کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔'' ایک سیاسی تجزیہ نگار کسی چینل پر بیٹھا مہرزاد خان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے مہرزاد خان کی ایک جنبشِ قلم سے جن کی چاندی ہونے کی امید تھی۔ پرچی، پلاٹ، لفافہ مافیا سے وہ سب کسی نہ کسی

www.paksociety.com

رنگ میں منسلک تھے۔ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی کا ایجنٹ تھا اور یشل کے خیال میں سردار مہرزاد خان جیسے لوگوں کے لیے سب سے بڑا خطرہ وہی لوگ تھے۔ آکٹوپس کی طرح ہر نئے آنے والے کو اپنی گرفت میں جکڑ لینے والے لوگ، اُن کی گرفت سے اس وقت تک تو کوئی نہیں بچا تھا سردار مہرزاد کو یا تو مثال بن جانا تھا یا مثال ہو جانا تھا۔ یشل نے سوچا اور اپنی اسٹڈی ٹیبل کی کرسی پر آ بیٹھی۔ کمرے کی مرکزی لائٹ بند کر کے اس نے ٹیبل لیمپ جلایا اور اپنے لیپ ٹاپ پر نوٹس بنانے لگی۔

''دنیا کی آسائشات اور مفت ہاتھ لگنے والی چیزوں میں اتنی کشش ہے کہ انسان کتنا بھی پرہیزگار رہے ان کے سامنے چند لمحوں کے لیے تو اپنے نفس کو بے بس ضرور محسوس کرتا ہے۔'' اس نے لکھا تھا۔ ''آج سردار زادہ مہرزاد خان نے وزارت کا حلف اٹھایا اور آج ہی ایوانِ صدر سے لے کر اس کے گھر کے راستے تک چلنے والے ٹریفک میں کتنی ہی ایسی گاڑیاں تھیں جنہیں اس کے گھر کی پارکنگ میں رکنا تھا اور ان گاڑیوں میں سے ایسے لوگوں کو برآمد ہونا تھا جن کے ہاتھوں، جیبوں اور زبانوں میں پُرکشش پیشکشیں پوشیدہ تھیں۔ بیش قیمت ولاز، سالیٹئر ہیرے، مہنگی ترین گاڑیاں، مہنگے ترین ریزورٹس پر چھٹی منانے کی آفرز، نسلوں تک کو سونے میں تول دینے کی پیشکش، یہ وہ لوگ تھے جو سامنے تھے، بے شمار ایسے بھی ہیں جو بیرونِ ملک ہاٹ لائنز پر بیٹھے ہیں، ویڈیو لنکس کے ذریعے منسلک ہیں، لاتعداد فون کالز، لاتعداد فیکس، لاتعداد پیغامات، پورا دن ایک بھرپور گہما گہمی میں گزرا۔ سردار مہرزاد خان تو روشنی کے نیچے کھڑا ہے، ہم اس کے عملے کے لوگ ہیں، ہم میں سے ہر کسی کے سامنے پیشکشوں کے ڈھیر لگے ہیں۔ کیا یہ ثقافت صرف تیسری دنیا کے ملکوں میں ہی رچ بس چکی ہے؟ دنیائے اوّل کے تہذیب یافتہ، ترقی یافتہ ملک بھی اس کی گرفت میں ہیں۔ میرے خیال میں طریقۂ واردات کوئی سا بھی ہو واردات ایک سی ہی ہوتی ہے۔ جو بھی ہے میرے سامنے ایک بڑا سوالیہ نشان کھڑا مسکرا رہا ہے۔ کیا سردار مہرزاد خان اس ثقافت کی گرفت سے بچ پائے گا۔ کیا وہ کوئی نئی تاریخ رقم کر پائے گا۔ اس سوالیہ نشان کو آنے والا وقت ہی مٹا سکتا ہے جو بھی ہے میری ساری نیک تمنائیں سردار زادہ مہرزاد خان کے ساتھ ہیں۔'' اس نے لکھنے کے بعد لیپ ٹاپ شٹ ڈاؤن کیا اور ٹیبل لیمپ کا بٹن آف کر دیا۔

☆☆☆

''تم نے اس کو کیوں یہاں انوائٹ نہیں کیا، آج کی رات تو وہ کوئن آف نائٹ بن کر یہاں اپنی پہلی جھلک دکھا سکتی تھی۔'' گڈی نے اس تقریب کے دوران مہرزاد کو جا لیا جو اس کے بہت قریبی تعلق داروں کے لیے وزارت کا عہدہ ملنے کی خوشی میں بپا کی گئی تھی۔ گڈی، سردار اویس خان کی نصفِ بہتر ہونے کی حیثیت سے اس تقریب میں شریک تھی۔

''گڈی تم نے زیادہ پی لی ہے۔ تمہارے حواس قابو میں نہیں ہیں۔'' جواب میں وہ نرمی سے بولا تھا۔

''میں جتنی بھی پی لوں مجھے اب نشہ نہیں ہوتا۔ کیا پانی اور کیا یہ......'' اس نے ہاتھ میں پکڑے گلاس کو نظروں کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''پھر بھی تمہارے دماغ پر خمار چڑھ رہا ہے، میرا خیال ہے کہ اب تمہیں گھر چلے جانا چاہیے......'' اس نے متانت سے کہا تھا، اس کی نظریں سردار اویس پر جمی تھی جو خود بھی نشے میں دُھت اپنی تازہ ترین گرل فرینڈ کو بغل میں دبائے کھڑا قہقہے لگا رہا تھا۔

''چلو پھر ایسا کرتے کہ اسے نہ سہی رشنا اکبر کو ہی انوائٹ کر لیتے، سنا ہے اماں جان ملتان جا رہی ہیں گو

آہ! ریشماں......

صحرا کا نغمہ خلاؤں کی وسعتوں میں کھو گیا

جاتا سال ہمیں ریشماں سے بھی جدا کر گیا۔ (اس سے قبل ماضی قریب ہی میں گلوکارہ مہناز، اقبال بانو اور زبیدہ خانم بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئی تھیں) یوں تو ریشماں عرصہ دراز سے علیل تھیں اور سرطان جیسے موذی مرض کا شکار تھیں لیکن جب تک سانس تب تک آس کے مصداق امید تھی کہ ریشماں شاید تادیر ہمارے درمیان موجود رہیں پر الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا (اناللہ وانا الیہ راجعون) ''لمبی جدائی'' جیسا نغمہ گانے والی لمبی جدائی دے گئی۔

ریشماں ہندوستان کی ریاست بیکانیر میں 1947ء میں پیدا ہوئیں اور اپنے آبا و اجداد کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان میں آ بسیں۔ ابتدائی عمر ہی سے گانے کا شوق تھا۔ محض بارہ برس کی عمر میں لال شہباز قلندرؒ کے مزار مبارک پہ دھمال گاتے ہوئے ریڈیو کے پروڈیوسر سلیم صاحب کی نظروں میں آ گئیں اور یوں ریڈیو پاکستان سے انہوں نے بے شمار نغمے گائے جو ہمیشہ ان کے مداحوں کے کانوں میں رس گھولتے رہیں گے۔ ٹیلی ویژن کے آغاز پر یہاں سے بھی گانے لگیں اور بہت جلد ان کا شمار مقبول فنکاروں میں ہونے لگا۔ انہوں نے موسیقی کی باقاعدہ تربیت حاصل نہ کی تھی مگر قدرت نے انہیں ایسی خوب صورت، منفرد اور سُریلی آواز سے نوازا تھا کہ جو سنتا داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں لوک موسیقی کی ملکہ تھیں۔ ان کے فن کی خوشبو بہت جلد پڑوسی ملک میں بھی پھیل گئی اور انہیں وہاں بھی مقبول عام کی سند حاصل ہوئی۔ ہندوستان کی سابق وزیراعظم اندرا گاندھی بھی ان کے پرستاروں میں شامل تھیں انہوں نے ریشماں کو ہندوستان میں سکونت اختیار کرنے کی دعوت دی لیکن ریشماں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ان کو ساری شہرت اور عزت پاکستان نے دی ہے وہ اسے نہیں چھوڑ سکتیں۔ ریشماں کے چند مشہور گانے درج ذیل ہیں۔

1۔ وے میں تیرے نال چوری چوری لالیاں اکھاں وے...... 2۔ لمبی جدائی...... 3۔ ہائے او رباّ نئیں اوں لگدا دل میرا...... 4۔ میری ہم جولیاں کچھ یہاں کچھ وہاں...... 5۔ اکثر شبِ تنہائی میں...... 6۔ ناں دل دیندی بے دردی نوں

ایسے اور بہت سے نغمے ہمیں ہمیشہ ریشماں کی یاد دلاتے رہیں گے۔ ان کی خدمات کے صلے میں انہیں پرائڈ آف پرفارمنس سے بھی نوازا گیا۔ سادہ سی ریشماں اپنے فن اور منفرد انداز کے باعث مداحوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

تحریر: عالیہ بشیر، اسلام آباد

تم نے انہیں ہرا سگنل دے دیا ہے۔'' وہ ہچکی کو دباتے ہوئے بولی۔

''میرا خیال ہے گڈی تم واقعی اپنے حواسوں میں نہیں ہو، رکو میں تمہاری واپسی کا انتظام کرتا ہوں۔'' مہرزاد نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا اور گڈی کے قریب سے ہٹ گیا۔

''سر...... بہت اہم خبر ہے۔'' اسی وقت اس کا اسسٹنٹ گھبرایا ہوا اس کے قریب آیا اور اس کے کان میں کچھ معلومات انڈیلنے لگا۔

''ہوں......'' اس نے پوری بات سننے کے بعد کہا اور چند لمحوں کے توقف کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''فوری طور پر اس کا نام ای سی ایل میں ڈلواؤ، ایک لمحے بھر کی بھی دیر نہیں کرو گے تم۔''

☆☆☆

''مسز کی ایم نے میری بات پوری توجہ اور دھیان سے سنی ہے مجھی اور میں بہت پُرامید ہوں کہ ہماری مہم کو

کچھ کامیابی ضرور ملنے والی ہے۔'' ثنا نے عافیہ کو بتایا۔ ''یہ دیکھیں اس یادداشت کا پرنٹ جو ہم نے مسز کی ایم پیش کیا۔'' اس نے ایک کاغذ ان کے سامنے کھولتے ہوئے کہا۔

''جیتی رہو بیٹا...... مل جل کر جو بھی کوشش کریں گے...... وہ کہیں تو پہنچائے گی۔'' عافیہ نے ممنونیت سے ثنا کی طرف دیکھا۔

''ممی ہمارے پیج کے لائکس میں دنوں میں ریکارڈ اضافہ ہوا ہے، امید ہے وائس آف امریکا کی ار سروس کے کسی پروگرام میں اس پیج کا ذکر کیا جائے گا، ایسا ہو گیا تو بہت تقویت ملے گی ہماری کوششوں کو۔''

''چیف منسٹر کے پریس سیکرٹری تک ہم نے بات پہنچا دی ہے۔ جہانگیر اور تمہارے ڈیڈی کو شاید اسی ہفتے ملاقات کا وقت مل جائے۔'' عافیہ نے کہا۔

''آپ فکر مت کریں ممی، جلد ہی ہمیں کوئی اچھی خبر ملے گی۔'' ثنا نے انہیں تسلی دی۔

''اللہ تمہاری زبان مبارک کرے ثنا، مجھے تو ایسا لگتا ہے میں ایک بار پھر اسی صورت حال کا سامنا کر رہی ہوں جو دانیال کے کوما میں چلے جانے کے دوران ہم پر گزری تھی...... لمحے، لمحے کا انتظار ہے جو ایک بار پھر زندگی کا حصہ بن کر رہ گیا ہے۔ ایک بار پھر مجھے لگتا ہے میں روز جینے اور روز مرنے والی کیفیت میں مبتلا ہوں۔''

''ممی اگر آپ کو صوفی صاحب کی بات اور اس بات کے توسط سے خدا پر مکمل یقین ہے تو ضرور وہ ہماری مدد کرنے والا ہے، آپ فکر کیوں کرتی ہیں۔'' ثنا نے کہا اس کے ساتھ ہی اچانک ثنا اسکرین سے آؤٹ ہو گئی۔ وائی فائی موڈیم کا رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ عافیہ اپنی جگہ پر بیٹھی اب بھی اپنے ہاتھ میں پکڑے ٹیب کی اسکرین دیکھ رہی تھیں۔ امید وبیم کی کیفیت نے ان کو اس وقت بھی اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

☆☆☆

''تمہیں کیسا لگتا ہے، جب لوگ تمہیں پہچان لیتے ہیں اور تم سے بات کرنے کے لیے تمہاری طرف لپکتے ہیں، جب وہ تم سے تمہارا آٹوگراف مانگتے ہیں۔'' اس روز شہر کے ایک بڑے شاپنگ مال میں شاپنگ کے دوران علینہ نے فہد سے پوچھا۔

فہد، ڈاکٹر نادیہ کو مختلف کھانوں میں استعمال ہونے والے خاص لوازمات خریدنے کے لیے رہنمائی کرنے ان کے ساتھ آیا تھا اور نادیہ اور علینہ نے دیکھا تھا کہ وہاں خریداری کرتے کئی لوگ اسے پہچان کر اس کی طرف بڑھے تھے۔ اس سے بات کر کے ہاتھ ملا کر وہ فخر محسوس کر رہے تھے، کئی اسے ان کھانوں اور اس کے پروگرامز کی یاد دلا رہے تھے جو انہوں نے دیکھ رکھے تھے۔ کھڑے کھڑے کئی لوگوں نے اسے اپنے گھروں میں آنے کی دعوت بھی دے دی...... ایک خاتون جو کسی سول لیڈیز کلب اور ایک آرمی لیڈیز کلب کی ممبر تھیں نے اس کے لیے اپنے کلبز میں خصوصی کوکنگ شو کرانے کا اعلان بھی کر دیا۔ علینہ اس شہرت کی بلندی کو محسوس کر رہی تھی جو فہد کو حاصل تھی اور خود فہد ہر کسی سے بہت خلوص اور محبت سے مل رہا تھا بلکہ اکثر لوگوں کو وہ یہ بھی بتا رہا تھا کہ وہ تو ان کا اپنا تھا کیونکہ بنیادی طور پر وہ اسی شہر کا رہنے والا تھا۔

''شروع میں بہت اچھا اور کبھی بہت عجیب محسوس ہوتا تھا۔'' فہد نے جواب دیا تھا۔ ''لیکن اب عادت ہو گئی ہے، اب یہ سب نارمل لگتا ہے کیونکہ ایسی پبلک پلیسز پر جانے سے پہلے ہی مجھے پتا ہوتا ہے کہ وہاں ایسا ہوگا۔ لوگوں کا ردِعمل، ان کی گفتگو، پُرشوق چہرے، ایسے ہی ہوتے ہیں ہر جگہ ایک جیسے۔''

''تمہارے اتنے زیادہ پیجز بھی تو بنے ہوئے ہیں سوشل ویب سائٹس پر، لوگ تمہیں فالو کرتے ہیں،

ناں.....'' علینہ بھی لوگوں کا ردِعمل دیکھ کر پُرجوش ہونے لگی تھی۔
''ہاں، میں بھی دیکھتا ہوں وہ پیجیز......'' وہ انکساری سے بولا۔
''تم تو واقعی سلیبریٹی بن چکے ہو، میں مذاق ہی کرتی رہ گئی۔'' علینہ مسکرائی۔ ''میری کالج فرینڈز کو ابھی تک پتا نہیں چلا تمہارا ورنہ سب ہمارے گھر آئی ہوتیں روزانہ۔''
''بتانا بھی نہ پلیز...... کیونکہ میں تو کل صبح دوبارہ بالاکوٹ جا رہا ہوں۔'' فہد نے جواب دیا۔ وہ ہی منحوس ابدی حقیقت...... وہ میرال کی کھوج میں وہاں آیا تھا۔ علینہ کا سارا جوش اور خوشی ایک بار پھر جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ اس نے ناراض نظروں سے فہد کی طرف دیکھا جو تا دیہ کو کسی ایسے ٹن پیک کو کونسٹ ملک کے بارے میں بتا رہا تھا جو کئی کھانوں کا ذائقہ دوبالا کر سکتا تھا۔
''میں صرف پندرہ دن کا سالانہ آف لے کر آیا ہوں علینہ۔'' شاپنگ مال سے باہر نکلتے ہوئے فہد نے کہا۔ وہ علینہ کے رویے سے سمجھ چکا تھا کہ کیوں اس کا موڈ آف ہو چکا تھا۔
''دیکھو میری تو ایک کوشش ہی ہے ناں...... مجھے کوئی یقین تو نہیں کہ میں اس کا پتا چلا سکوں گا۔ دراصل میں اس المناک کہانی کو سننے کے بعد سے اتنا بے چین ہوں کہ میرا بس نہیں چلتا کہ میں کہیں سے اسے ڈھونڈ لاؤں۔''
''کیا تم جانتے ہو کہ تم جیسے سلیبریٹی کی طرح ایک سوشل ویب سائٹ پر میرال صلاح الدین کے نام سے بھی ایک صفحہ موجود ہے؟'' بات بلا ارادہ علینہ کے منہ سے پھسل گئی تھی اور یہ وہ بات تھی جو فہد سے ان دنوں میں، چار ملاقاتوں کے دوران اس نے اپنے منہ میں زبردستی روک رکھی تھی۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ اپنے ہلکے پیٹ میں اتنی سنبھال کر رکھی بات اس نے یوں اتنی آسانی سے فہد کو کیسے سنا دی تھی۔
''کیا واقعی......؟'' فہد نے پورا گھوم کر اس کی طرف دیکھا تھا...... ''تم نے مجھے ابھی تک بتایا کیوں نہیں؟''
''وہ اس لیے کہ میں نے اس صفحے کا کہیں نام ہی پڑھا تھا، اس کی تفصیل نہیں دیکھی، اس لیے مجھے یقین نہیں تھا کہ اس میں اسی میرال صلاح الدین کا ذکر ہوگا۔ ابھی تمہارے بارے میں لوگوں کا جوش دیکھ کر مجھے خیال آیا، ہوسکتا ہے میرال بھی ایک سلیبریٹی بن چکی ہو...... اور اس کے بھی ایسے پیجیز ہوں جن میں سے ایک کی پبلسٹی پر اتفاق سے میری نظر پڑ گئی۔'' اب علینہ کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ فہد کو کیسے یقین دلائے جو اس نے دیکھا تھا وہ دراصل کچھ اور تھا وہ کچھ اور بھی ہوتا تو فہد اب اسے دیکھے اور تلاش کیے بغیر نہیں رہنے والا تھا۔

☆☆☆

''میں نے ماسی عارفہ سے کہہ دیا ہے ناں' بہن ہم نے اتنے دماغ والے لوگوں میں اپنی بیٹی نہیں دینی، ہم نہیں جانتے ان کے گھر لڑکا دیکھنے۔'' اس روز بینش یونیورسٹی سے گھر واپس پہنچی اس نے دیکھا اس کی اماں، بڑے والے بھائی سے بلند آواز میں گفتگو کر رہی تھیں۔
''بڑے علاقوں میں پانچ، سات مربعوں پر کوٹھیاں ڈال کر کھڈوں (بلوں) جیسے کمروں میں رہنے...... کسی چار فٹ کے کمرے میں ٹانگیں لگا کر ایک صوفہ، چار کرسیاں سجا کر یہ لوگ خود کو اونچے لوگ سمجھنے لگتے ہیں اور آکڑ، آکڑ (اکڑ اکڑ) کر کہتے پھرتے ہیں ہم تو جی جدی پشتی رئیس ہیں، امبر سر (امرتسر) سے آئے تھے ہمارے اگلے...... ہم تو جی جموں کے مہاجروں سے رشتے نہیں جوڑتے لو دس بھلا (بتاؤ بھلا) جموں کے مہاجروں میں کیڑے پڑ گئے تھے بارڈر کراس کرتے ہوئے، چھوٹی اوقات کے وڈے لوگ نہ ہوں تو......''
بینش کو معلوم تھا اماں اکثر چھوٹی سی بات پر بھی ناراض ہو کر ایسی پُرجوش گفتگو کیا کرتی تھیں لیکن یہ گفتگو کس

کے بارے میں تھی یہ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا۔

''کیا ہوگیا ہے، اماں، اتنا کیوں بول رہی تھیں؟'' اسے دیکھ کر جب اماں کچن میں اسے کھانا دینے آئیں تو اس نے مسکرا کر پوچھا۔ جب سے اس نے دانیال کی گفتگو سنی تھی اسے اپنی ماں میں ایک نیا روپ نظر آنے لگا تھا۔ ایک ایسا روپ جس سے پہلے وہ واقف نہیں تھی، اسے ان پر بے طرح پیار آنے لگا تھا اور وہ اکثر ان کے ہاتھ نہایت احترام سے چوما کرتی تھی۔ اماں اس کے اس نئے انداز پر حیران ہوتیں لیکن انہوں نے اس تبدیلی کے بارے میں کچھ پوچھا نہیں تھا ہاں وہ اس بات پر بہت خوش تھیں کہ بینش اب ان کے بنائے ہوئے کسی کھانے پر اعتراض کیے بغیر چپ چاپ کھالیا کرتی تھی۔

''ارے وہی جو اس روز بیگم صاحبہ اور ان کی بہو نہیں آئی تھیں تجھے دیکھنے، اپنے بیٹے کے لیے۔'' اماں نے اتنے دنوں سے سنبھالا راز غصے کے مارے اگل دیا۔ ''وہ جن کی بہو تیرے کمرے میں بیٹھی رہی تھی کتنی دیر۔''

''ہاں اماں، وہ اس لیے آئی تھیں؟'' بینش نے ہاتھ میں پکڑا اچج پلیٹ میں رکھ دیا۔

''اور نہیں تو کیا......'' اماں نے سر جھکایا۔ ''جواب دے دیا ہے میں نے ماسی عارفہ کو، کہہ رہی تھی بتول اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ جا کر ان کے گھر، گھرانے پر نظر مار آ...... میں نے کہا نہ جی جو ابھی سے دماغ دِکھا رہے ہیں ان سے ہم نے ناتا نہیں جوڑنا۔''

''اماں پلیز مجھے ابھی دھیان سے پڑھنے دیں، میرے لیے اس قسم کے کسی چکر میں نہ پڑیں۔ آپ دونوں بھائیوں کی شادیاں کریں پہلے......'' بینش نے سنجیدگی سے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔

''شکر ہے مجھے پتا چل گیا ورنہ اماں کا کیا پتا تھا چپکے سے کہیں میرا رشتہ طے کر دیتیں اور مجھے بعد میں پتا چلتا۔'' اس شام اسے کئی بار خیال آیا اور پھر ایک اور خیال آنے پر اس نے تمکین کا نمبر ملایا۔

''ہیلو بینش کیسی ہو؟'' تمکین نے فون اٹینڈ کرتے ہوئے نرمی اور محبت سے کہا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں، مجھے آپ سے پوچھنا تھا کہ آپ نے وہ ہینڈ آؤٹس کسی کو دیے تو نہیں؟'' بینش نے پوچھا۔

''میں تم سے غلط بیانی نہیں کروں گی بینش۔'' تمکین نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ''میرے ایک بھائی حمزہ کو اس لڑکی کی تلاش ہے، وہ بے چارہ کب سے اسے ڈھونڈ رہا ہے۔ اس کو ہیلپ آؤٹ کرنے کے لیے اسے ضرور دیے ہیں۔''

''آپ کے بھائی کو تلاش ہے؟'' بینش نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''ہاں میرے بھائی کو...... وہ اس لڑکی میرال کو اپنے بچپن سے جانتا ہے۔''

''پلیز آپ اپنے بھائی سے کہیں کہ جو نمبر میں آپ کو دینے لگی ہوں فوراً اس پر رابطہ کریں۔'' بینش نے تیزی سے کہا تھا۔

☆☆☆

زدلی کی دوست چی آن کو اس رات چین سے پاکستان پہنچنا تھا۔ چی آن بھی فارمیسی کی طالبہ تھی اور چھٹیاں گزار کے وطن سے واپس پاکستان آرہی تھی۔ زدلی، چی آن کو لینے نادر کے ساتھ ائرپورٹ پہنچی تھی۔ چی آن کو زدلی کا کچھ سامان بھی ساتھ لانا تھا۔ نادر اور زدلی جس وقت ٹیکسی پر ائرپورٹ پہنچے تھے۔ اسی وقت ایک قیمتی گاڑی، ائرپورٹ کی حدود میں داخل ہوئی تھی اور اس گاڑی سے جو شخصیت باہر نکلی تھی، زدلی نے اگرچہ اسے بہت سالوں کے بعد دیکھا تھا مگر وہ اسے بہت اچھی طرح پہچانتی تھی۔

(جاری ہے)



شامِ شہرِ یاراں

عنیزہ سیّد

قسط 11

زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے . . . خیر و شر، نیکی اور بدی . . . زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت . . . ہر برائی پر حاوی ہوجاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سیّد نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

محمود درانی اور مہرین کی تیسری اولاد حمزہ، مہرین کی زچگی میں پیچیدگی کے باعث نانی کے پاس ان کے آبائی گھر سیالکوٹ میں پروان چڑھتا ہے۔ جہاں نگین اس کے ماموں کی بیٹی سے اس کی خوب گاڑھی چھنتی ہے۔ بڑے ہونے پر حمزہ کے والدین اسے واپس لانا چاہتے ہیں مگر وہ راضی نہیں ہوتا۔ علینہ کے والدین، نادیہ اور سعید کیانی نے کورٹ میرج کی تھی مگر شادی کے تین سال بعد سعید کیانی بیوی کو داغِ مفارقت دے گئے۔ علینہ، فہد کو ٹی وی شو میں ایک شیف کے طور پر دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے فہد جس کے ساتھ اس نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ آکسفورڈ کا پروردہ سردار مہرزاد خان اپنے باپ کے سیاسی قتل کے بعد حادثاتی طور پر سیاست میں شامل ہوا تھا اور زرنگار کے حسن و ذہانت کا شکار ہو چلا تھا...... بینش دو بھائیوں کی اکلوتی بہن، اپنی ضد اور صرف بھائیوں کے تعاون سے نیشنل کالج آف آرٹس میں تعلیم حاصل کر رہی تھی جہاں اس کا سینئر ساتھی دانیال اس سے ہر ممکن تعاون کرتا تھا۔ ایک پاکستانی مسلمان مرد اور بدھ مذہب کی پیروکار چینی عورت کی بیٹی زوئی حسین چین سے آکر پاکستان میں فارمیسی کی تعلیم حاصل کرتی ہے۔ حمزہ اپنی کزن اور بچپن کی دوست نگین سے بی اماں کی سہیلی اور پوتی (میرال) کے متعلق اپنی تشویش بتاتا ہے کہ رابعہ کلثوم کی وفات اور زلزلے کے بعد پوتی نہ جانے کہاں چلی گئی۔ دانیال آرٹ کا عشق رکھنے کے ساتھ فلائنگ میں بھی مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے اور ایک دن طیارے کے دھویں سے نقش و نگار بنانے کی کوشش میں حادثے کا شکار ہو کر اسپتال میں پٹیوں میں جکڑا (عافیہ) ماں کی ممتا کا شدید امتحان بن جاتا ہے۔ بیٹے کی زندگی کی دعائیں مانگتے مانگتے عافیہ اللہ تعالیٰ کے مقربان خاص بندوں میں سے ایک کی درگاہ میں جا پہنچتی ہیں۔ زوئی حسین کے ویزے کی مدت ختم ہونے سے دو روز قبل وہ اپنے ایک ساتھی نادر سے نکاح کر لیتی ہے تاکہ پاکستان میں رہنے کا جواز پاسکے۔ 2005ء کے زلزلے میں زوئی حسین نے بھی متاثرین کی مدد کی تھی جو اسے خاصی مہنگی پڑی اور اب نادر بدگمانی کی آخری سیڑھی پر تھا۔ فہد کو اپنے ایک نیوز ریڈر دوست کے ذریعے سے میرال کی گمشدگی کی خبر ملتی ہے بینش ہوچتی ہے کتنی خوش قسمت ہے وہ لڑکی جس کے لیے دانیال کی ممی اتنی پریشان ہو رہی تھیں۔ فہد، ڈاکٹر نادیہ سے، اسپتال میں ملتا ہے تو وہ اسے اپنے گھر لے جاتی ہیں، نگین اپنی ساس کے ساتھ لڑکی دیکھنے جاتی ہے تو اسے بینش بہت پسند آتی ہے، نگین اس کے پاس میرال صلاح الدین کا ایک ہینڈ آؤٹ دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے وہ اس سے ساری معلومات لے کر آکر حمزہ کو بتاتی ہے۔ زرنگار، مہرزاد کو اپنے ماضی کے بارے میں بتاتی ہے، زوئی، نادر کے گھر جاتی ہے تو نادر کی ماں کہتی ہیں کہ اسے بتا کر آنا چاہیے تھا۔ نادر، حمزہ سے ملتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ اگر زوئی قصوروار ہوئی تو وہ خود اسے لے کر آئے گا۔ حمزہ کہتا ہے کہ اسے اب تنگ نہیں کیا جائے گا۔ عافیہ، دانیال سے کہتی ہیں کہ جو طریقہ اس نے میرال کو ڈھونڈنے کا نکالا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ علینہ اچانک فہد کی آمد سے بہت خوش ہوتی ہے لیکن جب وہ یہ سنتی ہے کہ وہ میرال کی تلاش میں آیا ہے تو یہ اسے اچھا نہیں لگتا۔ چوہدری رزاق، امراؤ بیگم کو خبردار کرتا ہے کہ زرنگار کی وجہ سے وہ اب کسی آفت میں پھنس سکتی ہے۔ مہرزاد کی ماں اس سے کہتی ہے کہ انہوں نے اس کا رشتہ خان اکبر کے گھر ڈالنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ نادر اپنے گھر میں زوئی کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ ثمرین، دانیال سے کہتی ہے کہ بینش اس کی دوستی کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔ زرنگار، مہرزاد کو میسج کرتی ہے کیونکہ وہ تقریباً پندرہ دن سے رابطے میں نہیں تھا۔ بینش، مہرزاد کو سنبھل کر چلنے کا مشورہ دیتی ہے۔ دانیال، بینش کو اپنے ایکسیڈنٹ اور صحت یابی کے بارے میں بتاتا ہے تو وہ حیران رہ جاتی ہے۔ زوئی، نادر کو بتاتی ہے کہ اس نے نادر سے غلط بیانی کی تھی کہ وہ زلزلہ زدگان کے مددگاروں میں شامل نہیں تھی۔ وہ بتاتی ہے کہ کس طرح وہ میرال کو ان لوگوں سے بچاتی رہی لیکن وہ لوگ اسلحے کے زور پر اسے زبردستی اپنے ساتھ لے گئے۔ مہرزاد حلف اٹھانے کے بعد سوچ رہا تھا کہ حلف اٹھانے والوں کو حلف کے الفاظ یاد بھی رہتے ہوں گے کہ وہ ان پر عمل کر سکیں۔ مہرین، حمزہ پر شادی کے لیے زور ڈالتی ہے لیکن وہ پس و پیش سے کام لیتا ہے تو محمود درانی کہتے ہیں کہ وہ کوشش کریں گے کہ وہ اس کی جوائس کو اپروول دلا دیں۔ امراؤ بیگم چھوٹے صاحب کے ساتھ زرنگار کو بھیجنے پر تیار ہو جاتی ہیں۔ زرنگار کو اس خصوصی نمبر سے دبئی روانگی کا پیغام ملتا ہے اور پھر امراؤ بیگم کہتی ہے کہ سردار صاحب نے ٹکٹ بھیجا ہے۔ گُڈی، مہرزاد سے کہتی ہے کہ اسے وزارت کا عہدہ ملنے کی خوشی میں برپا کی گئی تقریب میں زرنگار کو بلانا چاہیے تھا۔ علینہ، فہد کو بتاتی ہے کہ ایک سوشل ویب سائٹ پر میرال صلاح الدین کے نام کا صفحہ موجود ہے۔ فہد اس کی بات سن کر حیران رہ جاتا ہے۔ بینش، نگین کو فون کرتی ہے تو نگین بتاتی ہے کہ اس کا بھائی حمزہ کب سے اسے ڈھونڈ رہا ہے۔ بینش اسے ایک نمبر دیتی ہے اور کہتی ہے کہ وہ فوراً اس پر رابطہ کرے۔ زوئی ائرپورٹ اپنی دوست جی آن کو لینے جاتی ہے تو اس شخصیت کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے جو ایک گاڑی سے باہر نکلی تھی۔

اب آگے پڑھیں

زوئی نے غیر ارادی طور پر نادر کی طرف دیکھا۔ ''یہ وہی ہے، وہی۔'' اس کے منہ سے الفاظ سرسراتے ہوئے نکلے۔

''کون وہی؟'' نادر نے بھی چونک کر اس... طرف دیکھا جدھر زوئی دیکھ رہی تھی۔

''وہ جو اندر گئی ہے ابھی۔'' زوئی نے تیز قدموں سے ڈیپارچر لاؤنج کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ نادر اس کے پیچھے دوڑتے قدموں سے چل رہا تھا۔ اگرچہ اسے زوئی کی بات کی سمجھ نہیں آئی تھی لیکن اسے اندازہ تھا کہ اس کی بات میں کچھ خاص ضرور تھا۔

ڈیپارچر لاؤنج میں گہما گہمی، شور اور روشنیاں تھیں۔ زوئی کی متلاشی نظریں آتے جاتے، گھومتے پھرتے لوگوں میں گھومتی کسی ایک چہرے کو تلاش کر رہی تھیں۔ دبئی جانے والی فلائٹ کے بارے میں اناؤنسمنٹ جاری تھی اور لوگ باگ اپنا سامان ہاتھ میں اٹھائے کچھ ٹرالیز پر لوڈ کروائے تیزی سے اندر جا رہے تھے مگر وہاں اسے وہ چہرہ کہیں نظر آیا تھا جس کے پل کی پل کو نظر آنے نے اس کے دل کی دھڑکن کی رفتار تیز کر دی تھی۔ اس کے جسم کا سارا خون شرشر کرتا جیسے اس کے چہرے میں سمٹ کر اسے تمتمانے لگا تھا۔

''کون نظر آ گیا تمہیں؟'' اس کے عقب میں کھڑے نادر نے پوچھا۔

''وہی......'' زوئی نے اپنے گالوں کی حدت کو ہاتھوں سے دبا کر کم کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''وہی کون؟'' نادر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ زوئی کی حالت اس کے لیے ناقابلِ فہم ثابت ہو رہی تھی۔

''وہی لڑکی میرال۔'' زوئی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ابھی جو لینڈ کروزر سیدھی ائرپورٹ بلڈنگ کے اندر تک بغیر کسی رکاوٹ کے چلی گئی تھی اسی میں سے میرال باہر نکلی تھی۔''

''یہ کیسے ممکن ہے بھلا، وہ گاڑی تو وی آئی پی موومنٹ پر تھی۔ اسی لیے تو اسے کہیں روکا نہیں گیا۔ میں اسے پچھلے کئی سگنلز سے دیکھ رہا تھا۔'' نادر نے کہا۔

''وی آئی پی موومنٹ؟'' زوئی نے بے یقینی سے نادر کی طرف دیکھا۔ ''میرال اور وی آئی پی موومنٹ......؟'' وہ حیرت زدہ تھی۔

''جس گاڑی کا ذکر تم کر رہی ہو وہ تو بہرحال کسی وی آئی پی کی گاڑی تھی۔'' نادر نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''اب مجھے علم نہیں کہ اس میں وہ لڑکی بیٹھی تھی یا کوئی اور اہم شخصیت۔''

''حیرت ہے۔'' زوئی نے سر جھٹکا۔ ''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میرال کسی ایسی گاڑی سے نکل سکتی ہے۔''

''ہوسکتا ہے تمہاری نظر دھوکا کھا گئی ہو اور وہ میرال نہ ہو۔'' نادر نے کہا۔

''ہوسکتا ہے۔'' زوئی نے اوپری دل سے کہا جبکہ وہ جانتی تھی بلکہ اسے یقین تھا کہ اس کی نظر نے دھوکا نہیں کھایا تھا۔

''چلیں...... پھر کہیں تمہاری دوست انتظار کر کے چلی نہ جائے۔'' نادر نے کہا اور ڈیپارچر لاؤنج سے باہر نکلنے کے لیے قدم بڑھا دیے۔

''چہرہ ڈھانپ لو بی بی۔'' زوئی، نادر کے پیچھے جانے کے لیے قدم بڑھانے ہی والی تھی جب اس کے کان میں کسی کے سرگوشی میں کہے الفاظ پڑے۔ اس نے چونک کر دائیں طرف دیکھا۔ دو مردوں کے درمیان

ایک لڑکی چہرے پر دوپٹے سے نقاب کیے ڈیپارچر لاؤنج سے باہر جانے والے راستے پر چل رہی تھی۔

''یہ وہی لڑکی ہے جسے میں نے کچھ دیر پہلے دیکھا تھا۔'' زوئی کے دل نے چلّا کر کہا۔ وہ کپڑوں کے اس رنگ کو خوب پہچانتی تھی جو لینڈ کروزر سے باہر نکلنے والی لڑکی نے پہن رکھے تھے۔

''میرال۔'' زوئی نے بے اختیار بلند آواز میں کہا۔ تیز قدموں سے ڈیپارچر لاؤنج سے باہر جاتی لڑکی کے قدم دو سیکنڈز کے لیے رکے اور نقاب سے اوپر ان آنکھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا یقیناً وہ آواز لگانے والی کی سمت کا اندازہ کر رہی تھی۔

''میرال۔'' زوئی ایک بار پھر چلّائی لیکن اس بار اس کے اور لڑکی کے درمیان دو قوی ہیکل امریکی حائل ہو گئے اور جیسے ہی وہ دونوں درمیان سے ہٹے میرال لاؤنج سے باہر جا چکی تھی۔ زوئی نے اپنے شانے سے لٹکتے پاؤچ پر ہاتھ رکھا اور تیز قدموں سے چلتی اس لاؤنج سے باہر نکلی۔ نادر باہر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''سنگاپور سے آنے والی فلائٹ کب کی آچکی زوئی۔'' نادر کہہ رہا تھا اسی دم نہ جانے کس سمت سے وہی لینڈ کروزر نکل کر ان دونوں کے قریب سے گزر گئی۔

''اس فلائٹ کو چھوڑو نادر، فوراً باہر نکل کر ٹیکسی پکڑو۔ ہمیں اس لینڈ کروزر کے پیچھے جانا ہے۔'' زوئی نے نادر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے کہا۔

''مگر تمہاری دوست......'' الفاظ نادر کے منہ میں ہی رہ گئے۔ زوئی اسے اپنے ساتھ گھسیٹتی ہوئی... ائرپورٹ کی اندرونی حدود سے باہر لے آئی تھی۔ باہر بے شمار ٹیکسیاں تھیں جن میں سے ایک انہیں فوراً مل گئی تھی۔ زوئی ہی نے ٹیکسی ڈرائیور کو بتایا تھا کہ انہیں کہاں جانا تھا۔

☆☆☆

''سوری میم آپ اس فلائٹ سے دبئی نہیں جاسکتیں۔'' نہ جانے کس سرکاری محکمے کا یونیفارم پہنے وہ شخص اسے ایک ایسی بات بتا رہا تھا جس کے الفاظ سیدھے تھے اور ان کے معنی صاف سمجھ میں آنے والے تھے لیکن اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ الفاظ کسی اجنبی زبان میں کہے گئے ہوں جب ہی تو انہیں سمجھنے میں اسے دقت ہو رہی تھی۔

''کیا مطلب...... میں کچھ سمجھی نہیں؟'' اس نے سر ہلا کر پوچھا تھا۔ اس شخص نے جو پاسپورٹ اور ٹکٹ اس کے ہاتھ میں واپس پکڑائے تھے ان کے مندرجات میں کچھ غلطی تھی یا وہ سرے سے جعلی تھے۔ اس کا ذہن گھومنے لگا تھا۔

''مطلب میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔'' وہ شخص یقیناً اس کی سراسیمگی کو بھانپ چکا تھا۔ اسی لیے نرمی سے بولا تھا پھر اس نے ایک دفتر نما کمرے میں بٹھا کر اسے تفصیل سے سمجھایا تھا۔ اس وقت وہ دبئی چھوڑ کسی بھی دوسرے ملک نہیں جاسکتی تھی اگرچہ اس کے کاغذات میں کوئی غلطی اور خرابی نہیں تھی مگر اس کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل تھا۔

''ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں ان لوگوں کے نام شامل ہوتے ہیں میم جن کی بیرون ملک روانگی پر اس وقت تک پابندی ہوتی ہے جب تک ان کا نام اس لسٹ سے خارج نہیں ہو جاتا۔'' وہ افسر تفصیل سے اسے وہ بات سمجھا رہا تھا جو اسے خود سے بھی معلوم تھی۔

''لیکن میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟'' اس نے حیرت زدہ نظروں سے اس افسر کو دیکھا تھا۔ ''میرے خلاف کوئی جرم ثابت ہوا ہے یا میں کسی offensive act میں ملوث ہوں؟''

''وجہ تو خیر میں آپ کو نہیں بتاسکتا۔'' اس شخص نے سر ہلایا۔ ''لیکن اتنا بتاتا چلوں کہ آپ کا نام ایک بہت اہم جگہ سے فوری آرڈر کے ذریعے اس لسٹ میں ڈلوایا گیا ہے۔ آج شام تک اس لسٹ میں آپ کا نام شامل نہیں تھا۔''

''لیکن میں تو ایک عام سی پاکستانی شہری ہوں۔ میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟'' وہ روہانسی ہونے لگی تھی۔ یہ صورتِ حال انتہائی غیر متوقع اور ذلت آمیز تھی۔

''آپ ایک عام پاکستانی شہری نہیں ہیں میم۔'' وہ افسر زیر لب مسکراتا ہوا بولا۔ ''آپ ایک وی آئی پی وہیکل (گاڑی) کے ذریعے ائرپورٹ پہنچی ہیں اور ایک وی آئی پی اتھارٹی کے آرڈر پر آپ کا نام ایمرجنسی میں اس لسٹ میں ڈلوایا گیا ہے۔ آپ کیسے خود کو عام پاکستانی شہری کے طور پر متعارف کرواسکتی ہیں؟''

''میری سمجھ سے یہ صورتِ حال بالاتر ہے۔'' اس نے بے بسی سے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا آئی فون، اس کا رابطہ اس نمبر پر کروانے میں ناکام ثابت ہو رہا تھا جو وہ مسلسل ملانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''آپ کو جو لوگ ائرپورٹ چھوڑنے آئے تھے انہیں یہیں روک لیا گیا تھا تاکہ آپ کو واپسی میں آسانی ہو۔ اب تک وہ لوگ بھی صورتِ حال سے واقف ہو گئے ہوں گے۔'' اس آفیسر نے اپنے پیشہ ورانہ انداز میں متانت سے بتایا۔ ''آپ کیا لیں گی میم، چائے، کافی یا کوئی کولڈ ڈرنک؟''

''کچھ بھی نہیں، بہت شکریہ۔'' وہ تپے ہوئے انداز میں بولی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ''میں اس حُسنِ سلوک پر آپ کی ہمیشہ مشکور رہوں گی۔'' اس نے اپنا ہینڈ بیگ ہاتھ میں دبوچا اور تیزی سے چلتی ہوئی اس دفتر سے باہر نکل گئی۔

''اس سائڈ پر میم۔'' آفیسر نے تیزی سے باہر نکل کر اسے لاؤنج سے باہر نکلنے کا ایک مختلف راستہ دکھایا۔

''بہت شکریہ۔'' وہ رکھائی سے بولی اور اسی راستے پر چل دی جس سے اندر آئی تھی۔

''میم آپ وی آئی پی ایگزٹ سے باہر جائیں گی۔ ایک وی آئی پی وہیکل (گاڑی) وہاں آپ کی منتظر ہے۔ مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے۔'' آفیسر اس کے پیچھے چلتے ہوئے تیزی سے کہہ رہا تھا۔

''بہت شکریہ۔'' ذلت اور شرمندگی کا احساس اسے اس افسر کی کوئی بات سننے نہیں دے رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس وقت ڈیپارچر لاؤنج میں موجود ہر شخص اس پر دانت نکالے ہنسے چلا جا رہا تھا۔

''میم، آئی ایم سوری لیکن یہ بھی سخت قسم کے آرڈرز ہیں۔'' وہ شخص اس کا پیچھا چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔

''شٹ اپ اینڈ گیٹ لاسٹ۔'' اس نے رک کر چلّاتی آواز میں اس افسر سے کہا تھا اور اپنی ہائی ہیلز پر ٹھک، ٹھک کرکے چلتی باہر نکل گئی۔

''چلیں بی بی، فوراً نکلیں۔'' وہ دو شخص جو اسے ائرپورٹ تک لے کر آئے تھے بے چینی سے اس کے منتظر کھڑے تھے۔ اسے دیکھتے ہی ان کے زرد پڑتے چہروں پر جیسے رونق آ گئی تھی۔ وہ ان دونوں کے درمیان چلتی لاؤنج سے باہر نکل رہی تھی۔

''میرال۔'' اس پُرشور لاؤنج میں اس کے کانوں میں اپنا نام لیتی ایک آواز پڑی۔ اس کے چلتے قدم لاشعوری طور پر رکے تھے اور اس نے پلٹ کر عقب میں موجود لوگوں پر نظر ڈالی تھی۔ وہ ان گنت لوگ تھے۔ ان گنت چہرے، مختلف قومیتوں سے تعلق رکھنے والے چہرے بھی اور اس کے ملک سے تعلق رکھنے والے چہرے

بھی۔ ان میں سے ایسا کون ہوسکتا تھا جو اس کا نام جانتا تھا۔ اس کی متلاشی نظریں کسی ایسے چہرے کو ڈھونڈنے کی کوشش کررہی تھیں۔

''جلدی بی بی جلدی۔'' اس کے دائیں بائیں چلتے مردوں میں سے ایک نے کہا اور اس نے اپنا دھیان سامنے کرتے ہوئے قدم تیز کردیے تھے۔

''میرال۔'' اسے لگا اس پُرشور جگہ کے کسی کونے سے اسے ایک مرتبہ پھر پکارا گیا تھا لیکن اس بار اس نے اسے اپنی سماعت کا ڈھوکا قرار دے کر پیچھے مڑ کر دیکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔

وہی لینڈ کروزر جو اسے لے کر یہاں آئی تھی۔ ان تینوں کے نظر آتے ہی تیزی سے چلتی ان کے قریب آکر رک گئی تھی اور پل کے پل میں وہ تینوں اس پر سوار ہوکر ائرپورٹ کی حدود سے باہر نکل رہے تھے۔

اس کے ساتھ موجود دو مردوں کے خیال میں وہ ائرپورٹ سے صاف اور بروقت نکل آئے تھے۔ ان دونوں کو یہ گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ دو مختلف حیثیتوں کی گاڑیاں عین اسی وقت ان کی گاڑی کے پیچھے ائرپورٹ کی حدود سے باہر نکلی تھیں اور ان کے روٹ پر ان کا تعاقب کرنے میں مصروف تھیں۔

☆☆☆

''میرا نام حمزہ محمود ہے، میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔'' دانیال نے فون کال کے دوسری جانب سے آنے والی آواز سنی اور اسے یاد کرنے میں دقت محسوس ہوئی کہ کیا وہ اس نام کے کسی شخص کو پہلے سے جانتا تھا یا نہیں۔

''میرا ریفرنس، میرال صلاح الدین والا کیس ہے۔ میں اسی سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔'' دوسری جانب سے اس کی مشکل خود ہی حل کردی گئی۔

''جی ضرور۔'' دانیال نے فون دوسرے ہاتھ میں منتقل کرکے دوسرے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''فرمائیں آپ اس سلسلے میں کیوں ملنا چاہتے ہیں اور اس ریفرنس سے آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟''

''عجیب سا ہی اتفاق ہے۔ میری ایک کزن سے آپ کی ایک کلاس فیلو کی اتفاقاً ملاقات میں یہ معاملہ ڈسکس ہوا اور اسی ذریعے سے مجھ تک بھی پہنچا۔''

''ہم......مم م......'' دانیال نے کچھ سوچتے ہوئے ہونٹ دبائے اور اپنے ہاتھ بالوں میں چلاتے ہوئے اپنے مخاطب کی بات پر غور کرنے لگا۔

''ایسا ہے کہ آپ کسی بھی شام میرے گھر آکر مجھ سے مل سکتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''میں نہیں جانتا کہ اس معاملے میں آپ کی دلچسپی کس اینگل سے ہے لیکن ظاہر ہے دلچسپی ہے جبھی آپ نے مجھے کال کی ہے ناں اس لیے میرا خیال ہے کہ مجھے آپ سے مل لینا چاہیے۔''

''بہت شکریہ!'' حمزہ نے کہا۔ ''میں آج کل ہی میں آپ سے ملتا ہوں۔''

''ماما کے منع کرنے کے باوجود بینش کے ذریعے یہ خبر لوگوں تک پہنچ گئی۔'' فون بند ہونے کے بعد دانیال نے سوچا۔ ''Ahh this woman lot خواتین جتنی بھی کوشش کرلیں باتیں ان کے پیٹ میں ٹھہر ہی نہیں سکتیں۔'' اسے یہ بات سوچتے ہوئے ہنسی بھی آرہی تھی اور جھلاہٹ بھی محسوس ہورہی تھی۔

☆☆☆

''تمہارے ذریعے سے اگر وہ ہینڈ آؤٹ کسی تک پہنچ گیا تھا تو تمہیں اس کا ذکر مجھ سے کرنا چاہیے تھا

بینش۔'' اس سے اگلے روز یونیورسٹی کیفے میں بیٹھے ہوئے دانیال نے بینش سے کہہ ہی ڈالا۔ وہ خفگی کا اظہار کررہا تھا یا شکوہ کررہا تھا اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔

''تمہارے منع کرنے سے پہلے ہی وہ ہینڈ آؤٹ ایک مہمان کے ہاتھ لگ گیا تھا اور کیونکہ پہلے کا لائحہ عمل ذرا مختلف تھا اس لیے میں نے انہیں اس کی تفصیل بھی بتادی تھی۔'' بینش کو عجیب سا احساسِ شرمندگی ہوا۔

''ٹھیک ہے مگر مجھے بتادینے میں کوئی حرج تو نہیں تھا۔''

''بس ایسے ہی۔'' بینش کو سمجھ نہیں آیا کہ اس بات کا کیا جواب دے۔ ''میری غلطی ہی سمجھ لو کہ میں نے دانستہ ذکر نہیں کیا۔''

''میں یہ بات صرف اس لیے کہہ رہا ہوں کہ انسان کو زندگی کے معمولی سے معمولی معاملے میں بھی fair and honest ہونا چاہیے۔'' دانیال نے نرمی سے کہا۔ ''چاہے دوسرے کو اس معاملے میں ہماری ایمانداری کا احساس نہ بھی ہو پھر بھی ضمیر مطمئن رہتا ہے۔''

''مجھے بہت افسوس ہے کہ......'' بینش بری طرح شرمندہ ہوگئی۔

''یہ جو چھوٹی، چھوٹی باتیں ہوتی ہیں ناں چھوٹے، چھوٹے معمولات...... نیک نیتی انہی سے شروع کرنی چاہیے۔ جب ان معمولات میں عادت پختہ ہوجاتی ہے تو زندگی کا ہر معاملہ سچا اور کھرا ہوتا چلا جاتا ہے اور ایسا ہوجائے تو زندگی سہل ہوجاتی ہے۔ ایمان مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے اور پھر روزمرہ کے معمولات سے لے کر بڑے، بڑے معاملات میں بھی انسان اپنا ذہن و دل مضبوط محسوس کرتے ہوئے ثابت قدم رہنے لگتا ہے۔ لغزش اور گھبراہٹ اسے چھو کر بھی نہیں گزرتی۔'' بینش نے حیرت سے دانیال کو دیکھا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' دانیال نے سر ہلا کر گویا اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ ''یہ میرا ذاتی تجربہ ہے جسے عقل کی بات کی طرح تمہیں سنا رہا ہوں۔ یہ کلیہ گرہ سے باندھ کر تو دیکھو میری بات کی سچائی پر یقین نہ آگیا تو جو چور کی سزا وہی میری سزا۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''نہیں، میں بے یقینی کا شکار نہیں ہوں۔'' بینش نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''البتہ میں حیران ضرور رہ جاتی ہوں جب تم ایسی باتیں کرتے ہو۔'' اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ''تمہارا عموی رویہ بہت ایزی گوئنگ قسم کا ہوتا ہے۔ ایسے شخص سے علم و حکمت کی باتوں کی توقع کرنا عجیب سی بات لگتی ہے۔ میں تمہاری شخصیت کے ان دونوں بالکل متضاد رُخوں کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہوں۔''

''میرا وہ رخ عام دوستوں کے لیے ہے اور یہ رخ شاید صرف تمہارے لیے ہے۔'' وہ بھی بے پروائی سے بولا مگر اس کے لہجے میں سچائی بھی تھی۔ ''کم از کم اس ڈیپارٹمنٹ میں صرف تمہارے لیے۔''

''میرے لیے؟'' بینش کو حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ ''میں تو ایک بالکل عام سی لڑکی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''اتنی عام کہ اکثر مجھے بڑی، بڑی باتوں کی سمجھ بھی نہیں آتی اور ان کو نہ سمجھ پاتے ہوئے میں سوچتی ہوں کہ میں یہاں پڑھنے آئی ہوں۔ ایسی بڑی، بڑی باتوں کو سمجھنے کے لیے مغز ماری کرنے نہیں آئی اسی لیے ان پر غور کرنا تو درکنار انہیں دھیان سے سنتی بھی نہیں۔''

''نہیں بینش تم عام سی لڑکی نہیں ہو۔'' دانیال نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم بہت خاص ہو۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ ''اور تم کیوں خاص ہو یہ میں وقت آنے پر تمہیں بتاؤں گا۔''

یہ ایسی غیر واضح اور مبہم بات تھی کہ بینش اس کا فوری نہ بعد میں کوئی مطلب نکال پائی تھی لیکن پھر بھی نہ

جانے کیوں اس بات میں ایک عجیب سی خوشی اور سکون کا احساس تھا جب ہی وہ اس کے حصار سے نکل نہیں پائی تھی۔

☆☆☆

وہ شہر کی ایک جانی پہچانی معروف شاہراہ تھی جو اپنے دونوں جانب جا بجا نصب برقی قمقموں کی روشنی میں رات کی تاریکی میں بھی اتنی واضح پہچانی جاتی تھی جتنی دن کی روشنی میں۔ وہ اس شاہراہ کو خوب پہچانتی تھی، وہ اس کا راستہ نہیں تھی۔

''یہ ہم کدھر جا رہے ہیں؟'' اس نے گھبرا کر بلند آواز میں پوچھا تھا۔ اس کا مخاطب گاڑی چلانے والا شخص تھا یا وہ دو مرد جو اسے ائرپورٹ سے نکال کر لائے تھے یہ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔

''خاموش رہو بی بی، ہمیں خوب معلوم ہے کہ ہمیں کدھر جانا ہے۔'' ان دونوں مردوں میں سے ایک بولا۔

''نہیں...... مجھے کچھ عجیب سا احساس ہو رہا ہے۔'' اس نے کہا اور ہاتھ میں پکڑے فون کی طرف دیکھا۔ اس کے فون کے سگنلز بند تھے۔ اس جگہ پر اس وقت بغیر کسی خاص دن یا وجہ کے سگنلز بند ہو جانا ایک اور عجیب بات تھی۔

''گاڑی روکو، واپس موڑو...... مجھے میرے گھر چھوڑ کر آؤ۔'' اس نے اپنی آواز کی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔

''تمہارا گھر!'' دوسرا مرد زوردار قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ ''کون سا گھر؟'' اس نے مارے ہنسی کے اپنی آنکھوں میں اتری نمی کو انگلی کی پور سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''امراؤ بیگم کا ٹھکانا یا سردار زادے کا محل، کس گھر کی بات کر رہی ہو زرنگار؟''

خطرے کا ایک شدید احساس برقی کرنٹ کی طرح اس کے پورے جسم میں دوڑا۔

''کہاں لے جا رہے ہو تم مجھے؟'' اس نے کڑک کر پوچھا۔

''لے کر نہیں جا رہے، لے آئے ہیں۔'' ان میں سے ایک بولا۔ گاڑی اس معروف شاہراہ پر واقع میل ہا میل پر پھیلی ایک معروف عمارت کے نہ جانے کون سے گیٹ کے سامنے رکی اور گیٹ کے فوراً کھل جانے پر اندر داخل ہو گئی تھی۔

''سرکاری عمارت ہے بی بی، پُرسکون ہو جاؤ۔ ہوسکتا ہے تمہارے خوابوں کا سوداگر آج کی رات تمہارے ساتھ یہیں گزارنا چاہتا ہو۔'' وہ شخص جو اس پر استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا گاڑی سے اترتے ہوئے بولا اور اترنے کے بعد اس نے پچھلا دروازہ اس کے لیے کھول دیا۔

اس کے ساتھ پچھلے چند دنوں سے کیا ہو رہا تھا۔ اس نے واقعات کے انہونے پن پر غور کیوں نہیں کیا تھا۔ مہرزاد کہاں تھا اور اس نے اسے اس عجیب و غریب صورتِ حال کا شکار کیوں ہونے دیا تھا۔ اگر وہ یہیں کہیں تھا اور اسی کے کہنے پر اس کے ساتھ وہ سب کچھ ہوا تھا جس کا اس نے اس ایک گھنٹے میں سامنا کیا تھا تو پھر اس نے اس سے براہِ راست رابطہ کیوں منقطع کر رکھا تھا جبکہ اس کے فون کے سگنلز ابھی تک بند تھے۔

''میں نہیں اتروں گی۔'' اس نے گاڑی سے اترنے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں ایمرجنسی میں اِدھر لانا پڑا۔ مجھے افسوس ہے کہ ہم تمہارے استقبال کے لیے یہاں ریڈ کارپٹ

نہیں بچھا سکے۔'' وہی شخص مزید استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''ہاں اگر دبئی چلے جاتے تو چاروں طرف تمہارے راستے پر ریڈ کارپٹس اور گرین سگنلز ہی بچھے ہوتے۔''

''بکواس مت کرو۔'' وہ غرّا کر بولی۔ ''گاڑی یہاں سے واپس نکالو اور مجھے امراؤ بیگم کے ٹھکانے پر چھوڑ آؤ۔''

''امراؤ بیگم اور اس کا ٹھکانا تو بہت پیچھے رہ گیا بی بی۔ اب آگے کی طرف دیکھو۔ بدلے ہوئے نقشے پر نظر ڈالو۔'' وہ شخص دانت نکوستے ہوئے بولا۔ ''لیکن پہلے یہاں قدم تو رنجہ فرماؤ۔''

''ہرگز نہیں۔'' وہ بلند آواز میں بولی۔

''اوئے اللہ داد، اُدھر سے دو گارڈ اِدھر بلوالو، لگتا ہے شہزادی کو اڑن قالین سے اتارنے کے لیے زبردستی کرنا پڑے گی۔'' اس شخص نے خود کوئی کوشش نہ کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنے ساتھی کو آواز دے کر کہا۔

''حکم سرکار!'' اس شخص کی آواز آئی اور اسی کے اشارے پر سرکاری وردی میں ملبوس دو نچلے درجے کے اہلکار زرنگار کو گاڑی سے باہر نکالنے کے لیے گاڑی کے قریب آئے تھے۔

☆☆☆

''بہت بڑی گڑبڑ ہے صاحب، وہ لوگ اسے بڑے گھر لے آئے ہیں۔''

''تم لوگ......'' اپنے مزاج کے خلاف مہرزاد کے منہ سے ایک بہت بڑی گالی نکلی۔ ''سب تمہاری غفلت اور حماقت کا نتیجہ ہے۔''

''صاحب ہم وہاں چوکنے کھڑے تھے۔ بی بی نے وی آئی پی ایگزٹ سے باہر آنے سے انکار کر دیا تھا۔ ہم سیکورٹی آفیسر کا پیغام سن کر فوراً گاڑی باہر نکال کر عام راستے پر لے آئے تھے لیکن ہمارے اشارے سے پہلے ہی بی بی دوسری گاڑی میں بیٹھ چکی تھیں۔''

''تم جانتے ہو جو کچھ ہوا اس کے نتیجے میں، میں تم لوگوں کے ساتھ کیا کرنے والا ہوں۔'' مہرزاد کی آواز بلند ہوئی۔

''جی صاحب۔''

''اپنی آوازیں کم کرو۔'' وہ غصے میں تقریباً پاگل ہونے لگا تھا۔ اس کی جیت کی پہلی ہی رات پارٹی کے اندر سے ہی اسے ایک ایسے محاذ پر چیلنج کر دیا گیا تھا۔ جس کا تعلق اس کی انتہائی ذاتی زندگی سے تھا۔ وہ منصوبہ اتنی ہوشیاری سے بنایا گیا تھا اور اتنا پرفیکٹ تھا کہ اس کی ناکامی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ زرنگار کا نام ای سی ایل میں ڈلوا کر اس نے اپنے تئیں اس منصوبے کو فوری طور پر ناکام بنا دینے کی ایک سعی تو کی تھی مگر منصوبہ بنانے والوں نے یقیناً اپنا پلان بی بھی اتنا ہی منظم بنا رکھا تھا جتنا کہ پلان اے...... اس کا زرنگار سے رابطہ مسلسل منقطع تھا یقیناً جس گاڑی میں وہ اسے بٹھا کر لے گئے تھے اس کے سسٹم میں جیمرز بھی موجود تھے اور جہاں وہ اسے لے گئے تھے وہاں ان کا اپنا راج تھا۔ وہ بیک وقت کئی چیلنجز کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ مخالفین کو چت کرنے کے سارے گُر اسے ازبر تھے مگر دوستی کا نقاب پہنے اپنوں کو ایکسپوز کر کے ان سے ٹکر لینے کے لیے بہت سے سبق پہلے پڑھنے کی ضرورت تھی۔ پارٹی کی عزت بچانا اور اس کی صفوں میں اتحاد کا تاثر دیتے ہوئے ان نئے محاذوں پر لڑنے کے ساتھ ساتھ اپنے کارہائے منصبی کو بہترین صلاحیتوں کے ساتھ انجام دینا سب ہی کچھ اکٹھا اس کے کندھوں پر آن پڑا تھا۔ وہ کیا کرنے والا تھا، اسے کیا کرنا چاہیے تھا، اس بار

دوسروں کی طرح اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔

☆☆☆

''اوہ میرے خدا!'' زوئی نے ٹیکسی سے باہر نکل کر ایک ہاتھ دروازے پر رکھتے ہوئے دوسرا اپنے سر پر پھیرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو ایک بڑی سرکاری عمارت ہے، ہے ناں نادر؟'' اس نے ٹیکسی میں بیٹھے نادر سے کہا۔

نادر کی نظریں مسلسل ٹیکسی کے میٹر پر جمی تھیں۔ کتنے کلومیٹر کا فاصلہ وہ طے کر چکے تھے اور انہیں ٹیکسی والے کا کیا حساب چکانا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی جیب میں اتنے پیسے تھے بھی کہ نہیں جن سے وہ زوئی کے اس ایڈونچر کا خرچہ پورا کر سکتا تھا۔

''نادر یہ کون سی جگہ ہے، کیا یہ ایک سرکاری رہائش گاہ ہے؟'' زوئی نے ایک بار پھر پوچھا۔

''جی مس، یہ یقیناً ایک سرکاری رہائش گاہ ہے۔'' نادر کے بجائے ٹیکسی والے نے جواب دیا جو ایک چینی لڑکی کو اردو بولتے سن کر یقیناً محظوظ ہو رہا تھا۔

''ہم اس کے اندر نہیں جا سکتے کیا؟'' زوئی نے گویا معصومیت سے پوچھا۔

''اس کے اندر جانے کے لیے تو خصوصی اجازت نامہ لینا پڑتا ہے مس۔'' ٹیکسی والے نے کہا۔

''زوئی تم یہ بتاؤ کہ تمہیں اب یہاں رکنا ہے یا گھر جانا ہے؟'' نادر کی نظریں ٹیکسی کے میٹر سے ہٹ نہیں پا رہی تھیں جو مسلسل چلے جا رہا تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا وہ اس عمارت کے اندر کیا کر رہی ہے۔'' زوئی کا ذہن مسلسل سوچ رہا تھا۔

''زوئی تمہیں فوری طور پر سمجھ میں آئے گا بھی نہیں۔ میرا خیال ہے ہمیں اب گھر چلنا چاہیے۔ بہت رات بیت چکی، اماں پریشان ہو رہی ہوں گی۔'' نادر نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

''غالباً ہماری طرح وہ گاڑی بھی اس گاڑی کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچی تھی۔'' ڈرائیور نے ایک گاڑی کی طرف اشارہ کیا جو کہیں سے ریورس ہو کر سیدھی سڑک پر چڑھ رہی تھی۔

''میں نے نوٹ کیا ہے یہ گاڑی بھی اندر گئے بغیر ہی واپس مڑی ہے۔ یہ کبھی ہم سے آگے کبھی پیچھے رہتی رہی ہے سارا راستہ۔ اس میں سے کوئی شخص بھی اتر کر اندر نہیں گیا۔'' ٹیکسی والا ذہین اور قیافہ شناس لگ رہا تھا۔

''ہم اس ملک کے عام شہری ہیں زوئی، ہم پر اس عمارت کے دروازے نہیں کھل سکتے، پلیز واپس گاڑی میں آ جاؤ ہمیں اب گھر جانا چاہیے۔'' نادر نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

''لیکن نادر۔'' زوئی نے بے بسی سے اس عمارت کی فلک بوس دیواروں، ان دیواروں میں بنی چوکس گاہوں اور ان چوکس گاہوں میں مستعد کھڑے باوردی اہلکاروں کو دیکھا اور اسی بے بسی کے ساتھ گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔

''اگر وہ مجھے دیکھ لیتی تو مجھے یقین ہے پہچان بھی لیتی اور اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ اس کی وجہ سے ہم لوگ کس مصیبت میں پھنس چکے ہیں تو یقیناً ہماری مدد کرتی۔'' گھر واپسی کے راستے میں زوئی بار بار اسی قسم کی بات کرتی رہی تھی جبکہ نادر خاموش تھا۔ اس نے زوئی کی کسی بھی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

گھر پہنچ کر اپنی جیب اور زوئی کے چھوٹے سے بٹوے میں موجود ایک بڑے نوٹ سے لے کر چھوٹے، چھوٹے نوٹوں اور سکوں تک کی گنتی کر کے ٹیکسی ڈرائیور کو بطور کرایہ پکڑانے کے بعد نادر، زوئی کے ساتھ مرے

قدموں سے چلتا گھر کے اندر داخل ہوا تو اسے محسوس ہوا کہ بھوک کے مارے اس کے پیٹ میں چوہے ناچ رہے تھے۔

''بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے نادر لیکن نہ جانے کیوں میرا کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔'' زوئی نے کچن میں گھستے ہوئے کہا۔

''ٹیکسی والے کو دیکھو ہم پر ترس بھی نہیں آیا، سکے تک لے گیا۔'' نادر نے جوتے کی ٹھوکر سے کچن میں رکھی نیچی پیڑھی کو اپنے راستے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''ٹیکسی والے نے ہم پر کوئی ڈاکا نہیں ڈالا نادر، اس نے اپنا کرایہ وصول کیا صرف، گھر سے ائرپورٹ کا کرایہ تو معلوم تھا۔ ائرپورٹ سے اس ٹیکسی کو رننگ روڈ پر ہم نے چڑھایا تھا۔ تم جانتے ہوناں وہ فاصلہ کتنا تھا اور اس روڈ سے یہاں واپسی تک کا راستہ میٹر کے ساتھ ساتھ چلیں تو کتنا ہے۔ اس نے اپنا وہی کرایہ لیا ہے جو بنتا تھا۔'' زوئی نے حسبِ عادت ٹیکسی والے کی طرف داری کی۔

''اس کا میٹر بہت تیز تھا اور دماغ اس سے بھی زیادہ تیز۔'' نادر نے برتنوں والے ریک سے ایک پلیٹ نکالتے ہوئے کہا۔ ''کیسا تمہیں مشورہ دے رہا تھا کہ ایسی عمارتوں تک جانے والی مشکوک گاڑیوں کا تعاقب کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ یہاں تو بے گناہ بندہ سب سے پہلے دھر لیا جاتا ہے۔''

''بس نادر......'' زوئی کی چھوٹی، چھوٹی آنکھوں میں افسردگی جھانکنے لگی۔ ''مجھے رات بھر اس افسوس کے مارے نیند نہیں آئے گی کہ وہ مجھے نظر بھی آئی اور میں اس سے مل نہیں پائی۔''

''نہیں زوئی۔'' نادر نے چولھے پر رکھے فرائنگ پین میں آلو قیمے کا سالن ڈال کر چیچ سے اسے الٹتے پلٹتے ہوئے کہا۔ ''ٹیکسی ڈرائیور ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ہمیں اس گاڑی کا تعاقب ہی نہیں کرنا چاہیے تھا اور تمہیں بھی اب تک جان لینا چاہیے کہ جس لڑکی کی تم نے مدد کرنے کی کوشش کی اور جو اس کوشش کے دوران دوبارہ اغوا ہوگئی......اب وہ عام سی لڑکی نہیں رہی۔'' اس نے گرم آلو قیمہ پلیٹ میں نکالتے ہوئے زوئی کی طرف دیکھا۔ ''اس لڑکی کی ہوا اونچی ہوچکی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے ساتھ کوئی خوش قسمتی رہی ہے یا بدقسمتی ہے لیکن اس کا تعلق اب صاحبِ اختیار لوگوں کے ساتھ بن چکا ہے۔ اب اسے دیکھ کر شناسائی کا دعویٰ کرنا تمہارے لیے اور تمہارے توسط سے میرے لیے خاصا خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔''

''میں نے...شناسائی کا دعویٰ کر کے اس سے کیا لینا ہے نادر، میں تو صرف ایک ثبوت ایک گواہی کے لیے اس کے پیچھے گئی تھی۔ اگر وہ گواہی ہمیں مل جاتی تو اس مسلسل تفتیش سے ہماری جان چھوٹ جاتی۔'' زوئی نے ٹوسٹر سے ٹوسٹ نکالتے ہوئے مایوسی سے کہا۔

''ہوں۔'' نادر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آج والے واقعے کے بعد جو مجھے نظر آرہا ہے وہ کوئی خاص حوصلہ افزا نہیں ہے زوئی۔'' اس نے زوئی کی طرف دیکھا۔ ''وہ لڑکی یا تو اپنی مرضی سے یا حالات کے جبر کا شکار ہوکر بہت بڑے ہاتھوں میں چلی گئی ہے۔ اس کا ہم عام لوگوں کے ہاتھ لگنا ناممکن نظر آتا ہے۔ اب اللہ ہی ہے جو مدد کرے اور ہم اس بند گلی سے باہر نکل آئیں۔''

''مجھے بہت شرمندگی محسوس ہوتی ہے نادر۔'' زوئی کی آنکھوں میں ایک مرتبہ پھر افسردگی کی لہر دوڑی۔ ''میری وجہ سے تم کس مصیبت میں پھنس گئے ہو۔''

''ایک تو تم......'' نادر نے کھانا کھاتے ہوئے ہاتھ روک کر زوئی کو مصنوعی غصے سے گھورا۔ ''خدا کے

واسطے اس طرح افسردہ ہونے کی کوشش نہ کیا کرو۔ اس ایکسپریشن کے ساتھ تمہاری ناک اور بھی چپٹی نظر آنے لگتی ہے اور آنکھیں مزید سکڑ کر بالکل چُنیاں ہو جاتی ہیں۔''

زوئی نے اس مذاق پر ناراض ہو کر نادر کی طرف دیکھا۔ ایک دوسرے سے نظریں ملنے پر وہ دونوں بیک وقت ہنس دیے۔ ہنسی جس کی اس تناؤ کی گھڑی میں ان دونوں کو ہی بہت سخت ضرورت تھی۔

☆☆☆

''میں جانتا ہوں در پردہ مجھے اس کارنر سے چیلنج کیا گیا ہے......لیکن اچھا ہوتا یہ چیلنج سیاسی نوعیت کا ہوتا نجی نوعیت کا نہیں۔''

''کم آن مہرزاد، تم ایک فضول سے ایشو کو نجی نوعیت مت بناؤ یار۔''

''آپ نہیں جانتے سر، میرے لیے یہ ایشو کتنا اہم ہے۔''

''ریڈ لائٹ ایریا کی ایک معمولی سی کال گرل کو ذاتی ایشو بنانا تم جیسے سرداروں کا شیوہ نہیں۔''

''آئی ایم سوری سر، میں بہت مشکور رہوں گا اگر آپ اس لڑکی کا اس بیک گراؤنڈ کے ساتھ تذکرہ نہ کریں تو...... یہ میری prestige اور honour کا معاملہ ہے اور میں بتاتا چلوں کہ میں اس پر کمپرومائز نہیں کروں گا۔ آپ کے پاس صرف اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ اسے پارٹی کا معاملہ سمجھ کر اگر پارٹی کے ٹیبل پر حل کر لیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا ورنہ آپ بھی جانتے ہیں کہ میرے پاس اس کے حل کے لیے بے شمار آپشن موجود ہیں۔''

''ہوں......لیکن تم یہ بھی جانتے ہو کہ یہ صوبائی معاملہ ہے، وفاق کا اس سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں بنتا۔''

''سر کس کو بتا رہے ہیں آپ، نمبر ایک وہ وفاق کا نمائندہ ہے نمبر دو پارٹی کا ممبر ہے، نمبر تین آپ کا ذاتی دوست ہے اور اس سے آپ کے تعلقات کی نوعیت کو میں خوب جانتا ہوں، نمبر چار آپ پارٹی کے سربراہ ہیں، آپ کے ایک نوٹس سے سارا معاملہ حل ہوسکتا ہے۔ نمبر پانچ اگرچہ میرا اور آپ کا ساتھ بہت لمبا نہیں لیکن اب تک آپ میرے مزاج سے خاصے واقف ہوچکے ہوں گے۔ اگر نہیں تو آپ کے پاس آپ کے خاص لوگوں کی جو personality assessment فائلز پہنچتی ہیں ان میں میرا پروفائل دیکھ لیجیے گا۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ میں اس معاملے پر کس حد تک ایکٹ اور ری ایکٹ کرسکتا ہوں۔''

''کم آن مہرزاد، ابھی تم ایموشنل ہو رہے ہو اس معاملے کو تھوڑا اور وقت دو۔ ایک معمولی سی لڑکی کے لیے چائے کی پیالی میں طوفان کا ہے کو اٹھاتے ہو بابا۔ تم ماشاء اللہ سے جوان ہو کیا پرسنیلٹی ہے تمہاری، ایک سے ایک لڑکی پٹ سے تمہاری گود میں گرنے کو تیار ہوگی پھر اس ایک لڑکی کے لیے......ہُہ''

''پلیز سر میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں اور دل سے کرتا ہوں۔ اس لڑکی کے لیے ایسے الفاظ استعمال کر کے مجھے کسی گستاخی پر مجبور نہ کیجیے، پلیز یہ میری آپ سے ریکوئسٹ ہے۔''

''اوہ......اس کا مطلب ہے کہ وہ لڑکی کوئی خاصے کی چیز ہے۔ دیکھنا پڑے گا پھر تو اسے۔''

''نہیں سر اسے کوئی نہیں دیکھے گا اور صبح تک اسے اس عمارت سے محفوظ و مامون باہر ہونا چاہیے۔''

''your tone is quite demanding''

''I know it is sir لیکن ایسا ہی ہے اور اگر میری ڈیمانڈ ریجیکٹ ہوتی ہے تو پھر میرا استعفیٰ کل

دوپہر بارہ بجے تک آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔ وزارت، اسمبلی، ممبرشپ اور پارٹی رکنیت ہر چیز سے...... کیونکہ ایسا کرنے کے بعد ہی پھر میں ذاتی حیثیت میں براہِ راست اپنے آپشنز استعمال کرنے کی پوزیشن میں آسکتا ہوں۔''

''ارے بابا کیا مصیبت ہے، رٹو طوطے کی طرح گردان کرتے ہیں سب لوگ پارٹی کو جوان خون کی ضرورت ہے۔ نہیں جانتا کوئی کہ جوان خون کیسا گرم اور نان کمپرومائزنگ ہوتا ہے۔ ارے بابا میرا سوہنا سائیں تم میرے کو بیچ میں مت ڈالو تو کیا ہی اچھا ہوگا۔ ایسا کرو کہ پرائم منسٹر ہاؤس سے رابطہ کرو۔ وہ لوگ آپس میں نمٹا و مٹالیں گے معاملہ۔''

''سر مجھے ٹالیں مت، میں بالکل بھی پرائم منسٹر ہاؤس نہیں جارہا۔ میں آپ کے پاس آیا ہوں اور مجھے یہاں ہی سے حکم جاری کروانا ہے۔''

''تم جانتے ہو مہرزاد خان تمہاری ٹون اتنی ڈیمانڈنگ کیوں ہے۔ یہاں جس جگہ شیر بھی ہلکی سی آواز نکالتے ہوئے کانپتے ہیں تم اتنی بلند آواز اور اتنے اعتماد کے ساتھ بات کررہے ہو۔''

''میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں سر۔''

''تم اپنی حیثیت، اپنے بیک گراؤنڈ، اس سیاسی نقشے پر اپنے مضبوط مہروں کے بل پر سر اٹھائے بیٹھے ہو لیکن مجھے کہنے دو کہ تم ان سب کو stake پر لگا رہے ہو۔''

''میں جانتا ہوں سر۔''

''ایک لڑکی کے پیچھے کشتیاں جلانے والا سردارزادہ پہلی بار دیکھ رہا ہوں میں۔''

''آئندہ بھی دوبارہ کبھی نہیں دیکھیں گے سر لیکن ابھی تو آپ کو دیکھنا اور ماننا پڑے گا۔''

''اچھا چھری تلے دم تو لو سائیں، ابھی تو وہ اگلے مسئلے سے باہر نہیں نکلا اس کے خلاف فتوے دے رہے ہیں مولوی لوگ۔''

''میں نے اسے مشورہ نہیں دیا تھا بے تکان بولنے کا سر...... وہ اس کا ہیڈک ہے، فی الحال تو آپ میرا ہیڈک دور کریں۔''

''ارے بابا سویا پڑا ہوگا ابھی تو...... جگاؤں کیا اس وقت اسے؟''

''وہ اس وقت نہیں سوتا سر، یہ تو اس کے جاگنے اور رت جگا منانے کا وقت ہے...... ہاں دن میں جاگتا نہیں ملے گا وہ آپ کو۔''

''تم تو بھئی مہرزاد خان بچوں جیسی ضد کرنے بیٹھ گئے۔ اُدھر کے حالات معلوم ہیں ناں تمہیں، وہ چھوٹا صاحب تاک لگا کر بیٹھا رہتا ہے اِدھر یہ ڈگمگائے گا اُدھر اس کا داخلے والا لعن طعن شروع کردے گا۔''

''مت الجھائیں سر، مت الجھائیں۔ I need action اگر نہیں ہوسکتا تو بھی بتائیں اور اجازت دیں میرے پاس وقت بہت کم ہے۔''

''اچھا بابا...... رکو، رحیم داد ملاؤ ذرا بڑے صاحب کو۔''

''تھینک یو سر۔''

☆☆☆

''میری تو سمجھیں شامت آچکی ہے چھوٹے صاحب۔ ساری کی ساری وزارتِ اطلاعات ونشریات

ڈنڈا لے کر اس غریب خانے کے پیچھے پڑ گئی ہے۔''

''جھگتنا تو پڑے گا امراؤ بیگم۔ تمہارے ہاں سے اس کی معشوقہ غائب ہوئی ہے، وہ زخمی شیر چین سے تھوڑی بیٹھے گا۔ تم سے تو پوچھے گا ہی پوچھے گا۔''

''ارے شکر ہے خود نہیں آگیا پوچھنے، میری تو اس کو دیکھ کر عام حالات میں ٹانگیں کانپنے لگتی ہیں۔ زخمی ہوکر تو وہ اور بھی خونخوار ہو چکا ہوگا۔''

''ہاہاہا...... بے چارے کے ستارے بلند ہوتے ہی گردش میں آگئے۔ وزارت کا پریشر اسے اپنے ذاتی مسئلے کی طرف دھیان دینے دے گا نہ وہ اس مسئلے سے دھیان ہٹا سکے گا۔ وزارت اور امارت دونوں ہی اس کے پیر کی زنجیر بن کر رہ جائیں گی۔ والد صاحب وزیر تھے تو اس کے ثمر لوٹنا اور بات...... خود وزارت کا قلمدان تھامنا اور بات۔ اس کا تو نشہ ہی الگ ہے، دونوں میں سے ایک نشے کا انتخاب کرنا پڑے گا تو وزارت اس کے پاؤں کی زنجیر نہ بن کر رہ جائے تو نام بدل دینا میرا۔ رہی تم...... تو تم اس سردارزادے سے جان چھوٹ جانے کا کچھ تاوان بھر لو چند دن پھر نہ سردارزادہ تمہاری راہ میں آئے گا نہ ہی اس کی معشوقہ۔''

''ارے میں قربان جاؤں آپ کے حضور، آپ سے بات کرکے دل کا بوجھ قدرے کم ہوگیا ورنہ کل سے تو مانو جان ہلکان ہوئے جارہی تھی، سب لڑکیاں الگ پنجرے میں بند کررکھی ہیں گویا کاروبار مندا پڑا ہے۔ دے وردی والے پر وردی والا ریڈ کیے جارہا ہے، وفاق ہی نہیں صوبہ بھی بڑا سرگرم ہے حضور والا۔''

''ارے ان صوبے والوں (گالی) کی تو دوڑیں لگتی ہی رہنی چاہئیں۔ سنتی نہیں قبلہ والد صاحب کے بارے میں کیسی کیسی موشگافیوں پر کمر باندھ رکھی ہے منحوسوں نے۔''

''سب نے نہیں حضور والا، آپ سب پر تو ایک ہی بھاری ہے وہی بس آپ سمجھ جائیں......''

''بس پھر دوڑیں بھی تو اسی کی لگی ہوئی ہیں۔ سردارزادے کے ماموں جان ہاٹ لائن پر بیٹھے ہیں۔ اُدھر صوبے والا چھوٹا صاحب خود مانیٹر کررہا ہے سارے معاملے کو بس نہیں چل رہا میرا کہ یہ خبر پریس تک پہنچا ڈالوں مگر پریس کم بخت سب کا سب اس کی وزارت کے انڈر آتا ہے۔''

''وہ سب چھوڑیں، یہ بتائیں لڑکی کی خیریت سے...... دبئی پہنچ گئی ناں؟''

''ہاں وہ تو پہنچ گئی کب کی۔ برج خلیفہ کے نظارے کررہی ہوگی اس وقت کہیں بیٹھی۔ اس کی فکر مت کرو بس تم اور تمہارے بندے اپنے پیروں سے نہ ہلنا۔ یاد رکھنا تمہارے سر پر ہم موجود ہیں، ہمارے ہوتے ہوئے تمہاری آنٹیوں اور باجیوں کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔''

''ارے میں صدقے جاؤں حضور۔ میرے دل کو تو ٹھنڈ پڑ گئی آپ کی بات سن کر، یونہی ہاتھ تلے رکھیے گا ہم معصوموں کو۔''

''فکر ہی مت کرو آنٹی امراؤ بیگم، ہم غلام، ہم خادم۔''

☆☆☆

''میرے پاس ایک اہم خبر ہے سر، اگر کہیں تو گوش گزار کردوں؟'' نادر نے حمزہ محمود کے آفس میں اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ہاں کہو پلیز۔'' حمزہ نے اس کی طرف دیکھا۔ ''لیکن ایک بات یاد رکھنا تمہاری بیوی کے لیے......

فی الحال اس سے زیادہ ریلیف میں دلوا نہیں پاؤں گا۔"

"میں اس کی بات کرنے نہیں آیا، خبر دینے آیا ہوں سر۔" نادر نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور پھر گزشتہ رات ائرپورٹ پر پیش آنے والے واقعے کی آغاز سے آخر تک کی تفصیل حمزہ کو سنانے لگا۔

"کیا تمہاری بیوی کو یقین ہے کہ وہ وہی لڑکی تھی؟" حمزہ نے پوری بات سننے کے بعد کہا۔

"اسے سو فی صد یقین ہے سر، کل رات اس لڑکی کا نام لے کر پکارنے پر وہ لڑکی مڑ کر پکارنے والے کو تلاش کرتی نظروں سے دیکھتی بھی رہی لیکن شور، ہجوم اور شاید خود بھی جلدی میں ہونے کی وجہ سے وہ اسے اسپاٹ نہیں کر سکی۔" نادر نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"ہوں۔" حمزہ نے کہنیاں اپنی کرسی کے بازوؤں پر ٹکا کر چہرہ دونوں ہاتھوں کی آپس میں پیوست انگلیوں پر ٹکاتے ہوئے کہا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے اسے وہاں زبردستی لے جایا گیا ہوگا، یا وہ اپنی مرضی سے گئی؟"

"مجھے تو ایسا وہم نہیں ہوا کہ اسے زبردستی لے جایا گیا ہوگا وہ آزاد اور اپنی مرضی کی مختار نظر آرہی تھی۔" نادر نے یقین سے کہا۔

"اچھا۔" حمزہ نے سر ہلایا اور پھر نادر کی طرف دیکھنے لگا۔ "تھینک یو فار دی انفارمیشن۔" اور پھر اس نے پرسکون نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھتے ہیں کہ اب اس سلسلے میں کیا ہو سکتا ہے۔"

"لڑکی کل رات تو یقیناً اس عمارت کے اندر تھی اب کا مجھے معلوم نہیں ہے سر لیکن صورتِ حال واقعی ایسی ہے تو ہم غریبوں کا اس منظر میں کیا کام رہ جاتا ہے۔" نادر نے پوری بات میں سے اپنا مدعا بیان کرنے کی کمزور سی کوشش کی۔

"نہیں نادر۔" حمزہ نے سر ہلایا۔ "جب تک معاملہ پوری طرح کھل نہیں جاتا کسی کو بھی کلیئرنس سگنل نہیں دیا جا سکتا۔"

"ٹھیک ہے سر۔" نادر اپنی پوزیشن فوراً ہی سمجھ گیا تھا۔ "اب میں چلتا ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"اوکے، اینڈ ونس اگین تھینک یو۔" حمزہ نے کہا اور اپنے سامنے رکھی فائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆

"میرال صلاح الدین میری بچپن کی دوست تھی۔ میں ہر صورت میں اس کی موجودہ صورتِ حال کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہوں۔" میرال صلاح الدین کے بارے میں سوشل ویب سائٹ پر بنائے گئے صفحے کے ان باکس میں میسجز میں یہ پیغام پڑھتے ہوئے عافیہ چونکی تھیں۔ انہوں نے پیغام بھیجنے والی کی آئی ڈی کلک کی اور اس کا مکمل پروفائل ان کے سامنے تھا۔ وہ ایک معروف شخص تھا۔ وہ اسے ٹیلی ویژن اسکرین پر مختلف کوکنگ شوز میں دیکھ چکی تھیں۔

"اگر یہ لڑکا سچ کہہ رہا ہے تو یہ بہت ایفیکٹو ثابت ہو سکتا ہے۔" انہوں نے دانیال سے کہا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ ان باکس تو ایسے کئی میسجز سے بھرا پڑا ہے جو اس سے شناسائی کے دعویدار ہیں۔" دانیال نے جواب دیا۔

"لیکن یہ ایک جانا پہچانا فگر ہے۔ یہ غلط بیانی نہیں کر سکتا۔" عافیہ نے کہا۔

"جانے پہچانے فگرز کی بھی کئی فیک آئی ڈیز ہوتی ہیں ما ماجو در اصل ان کی نہیں ہوتیں۔ عام لوگ ان کے

نام سے بنا لیتے ہیں۔"

"جو بھی ہے، میں اس کے پیغام کو جواب دیتے ہوئے اس سے اس کا پرسنل کانٹیکٹ نمبر مانگنے لگی ہوں۔ دیکھو کیا جواب آتا ہے۔" عافیہ نے اس پیغام کا جواب ٹائپ کرتے ہوئے کہا۔

"آج شام شاید وہ لڑکا حمزہ محمود بھی ہم سے ملنے آئے، وہی جو میرال کو اس کے بقول کب سے ڈھونڈ رہا ہے۔" دانیال نے بتایا۔

"آنے دو، ہر اس شخص کو آنے دو جو اس سلسلے میں کچھ جانتا ہے۔ یونہی انسانوں کی زنجیر بنتی جائے گی پھر وہ سردارزادہ جو اَب منسٹر بن چکا ہے کہاں تک resist کرے گا۔" عافیہ کا ذہن ایک اور ہی تصویر بنا رہا تھا۔

☆☆☆

اس نے اپنے سامنے قطار در قطار صوفوں پر بیٹھے لوگوں کے چہروں کو دیکھا۔ یہ سب اس کے جانے پہچانے چہرے تھے۔ ان میں سے دو اس کی ماں کے ماں جائے تھے، دو باپ کے۔ ایک ماں کا ماموں، تین باپ کے کزنز، دو اس کے اپنے بہنوئی، چند کزنز، اس کی ماں کے اعلان کے مطابق اس کا متوقع سسر، دو سالے، دو ہم زلف بھی انہی چہروں میں موجود تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو ایک خاندان، ایک قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور مشترکہ مفادات کی محبت نے انہیں ایک مٹھی میں باندھ رکھا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو صرف ایک رات قبل اس کی وزارت کے نشے میں مدہوش ایک اور فتح کا جشن مناتے ہوئے فائرنگ، ڈھول تاشے، رقص و سرود کے ذریعے اس احساسِ فتح کا اعلان کرتے پھر رہے تھے لیکن اس وقت ان سب کے چہرے لٹکے ہوئے اور زبانیں ہکلاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

"اوئے خاناں، جوانی کے اتھرے گھوڑے کو لگام دینی کیوں نہیں سیکھی تو نے اب تک؟" اس کی ماں کی ماں کا ماں جایا جو اس خاندان اور قبیلے کا معتبر ترین شخص گردانا جاتا تھا بڑھاپے کی کھوکھلی آواز میں اپنے تئیں اسے تنبیہہ کرتے ہوئے بولا تھا۔

"مہرزاد خان، ایک لڑکی کی خاطر تو بڑے گھر جا کر ایسی دبنگ بولی بول آیا۔ اوئے خان، اوئے خاناں اپنے بڑوں کی بیٹھک بٹھا کر مشورہ تو کیا ہوتا۔ اس قسم کے مسئلے یوں جذبات کے ذریعے حل نہیں کیے جاتے، ہم سے پوچھا تو ہوتا آدھی صدی جتنا پرانا تجربہ ہے اس تیرے چچا کو۔ کیوں کی کرائی پر مٹی ڈالنے پر تلا ہوا ہے۔" ایک اور بڑھاپا زدہ آواز آئی۔

"مجھ سے کہا ہوتا۔" متوقع سسر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں حالات کا جائزہ لے کر خود بات کر لیتا۔" وہ اپنی محبت اور تعلق کے اظہار کے طور پر اس کے شانے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "بڑے صاحب کی پوزیشن جانتے ہو تم، اِدھر تم ہو اور تمہارے پیچھے ہم سب۔ اُدھر وہ ہے اور اس کے پیچھے اندر کے بہت سے معاملات کا علم نہ اِدھر پیر رکھتے بنتی ہے نہ اُدھر پیر رکھتے بنتی ہے۔ بڑے صاحب کو ڈالے بغیر براہ راست بات کر کے بھی تو بات بن سکتی تھی۔"

"آپ کا مطلب ہے اس شخص سے میں کوئی ایسی ڈیل کر لیتا جس میں کچھ دو اور کچھ لو کا اصول چل رہا ہوتا؟" اس نے مضبوط آواز میں کہا۔ "ہرگز نہیں۔" اس کے لہجے میں اپنے خاندان اور قبیلے کا روایتی ضدی، انا پرست سردار بول رہا تھا۔ "اس نے اَن فیئر گیم کھیلی ہے۔ میں اسے فیس ٹو فیس جواب دوں گا، مجھے پشت سے آئے وار کا مقابلہ کرنا آتا ہے۔ میں پیٹھ سہلانے تک وقفہ کرنے کا بھی قائل نہیں۔"

''تم پارٹی میں اپنی موجودہ پوزیشن کی illusion (خودفریبی) کا شکار ہورہے ہو مہرزاد خان۔'' اویس خان جواس کا بہنوئی اور متوقع سالا تھا رسان سے بولا۔ ''بے شک اس وقت پارٹی کو تمہاری شدید ضرورت ہے لیکن پارٹی ٹینشن وائر کے دوسرے سرے پر موجود حقیقت کو بھی فراموش نہیں کر سکتی۔ پارٹی ہیڈ کو کوئی ایسا فیصلہ کرنے پر مجبور کیوں کرتے ہو جو دونوں کا گھونٹ بھر جائے۔''

''مجھے نہ دلیل چاہیے، نہ مصلحت کے سبق۔'' اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''مجھے نہ فیکٹس سننے ہیں نہ ہی فگرز۔ میں اعصاب کی جنگ لڑنے کے لیے ایک دم تیار ہوں۔ آپ سب کو میرا ایک ہی جواب ہے۔'' اس نے ان سب پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''نو کمپرومائز۔'' اس نے ان سب کے چہروں کے ردِعمل کو جانچا۔ ''آپ کی مرضی ہے میرا ساتھ دیں، آپ کی مرضی ہے میرا ساتھ چھوڑ جائیں۔ ہر دو صورتوں میں، میں آپ کا ممنون ہی رہوں گا۔''

''ایک معمولی سی لڑکی کے لیے اتنا بڑا فساد مہرزاد خان؟'' اس کا ایک ماموں زاد مارے اضطراب کے اپنی جگہ سے اٹھ کر چلاتے ہوئے بولا۔ ''تم حکم کرو ہم ہیروں اور نگینوں جیسی لڑکیاں تمہارے لیے حاضر کردیں گے مگر خدا کے واسطے اس معمولی لڑکی کی خاطر اتنی محنت سے کمائی وزارت کو داؤ پر مت لگاؤ۔''

''ہمارے خاندان کے مردوں کو لڑکیوں کی کچھ کمی ہے کیا خاناں ؟'' بزرگوار کھوکھلی آوز میں بولے۔ ''ہم سب اپنے، اپنے وقت اپنی، اپنی گرل فرینڈز کے لیے جذباتی تو ہوتے ہی تھے مگر سیاسی مفادات میں گرل فرینڈز ایکسچینج کر لینا بھی ہماری روایت رہی ہے۔''

''نانا جان میں کوئی گستاخی نہیں کرنا چاہتا۔'' مہرزاد نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ بزرگوار کی بات سن کر اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔ ''برائے مہربانی آپ لوگ اپنا یہ اجلاس کلوز کردیں۔ میں خوب جانتا ہوں مجھے کیا کرنا ہے۔''

''تم آگ سے کھیلنے کی کوشش کررہے ہو مہرزاد خان۔'' ایک اور ماموں زاد اس کے قریب آکر بولا۔ ''ہم تمہارے جلتے ہوئے ہاتھ دیکھنے کی تاب نہیں رکھتے۔ میری اطلاع کے مطابق تمہارے بندے ان سے بھی رابطہ کررہے ہیں جو شمال کے پہاڑوں میں چھپے بیٹھے ہیں۔ دیکھ بھال کے خاناں ایک گولی اُدھر جاسکتی ہے تو کسی گولی کا رخ اِدھر بھی ہوسکتا ہے۔''

''میں نے کہا ناں میں اعصاب کی یہ جنگ لڑنے کے لیے پوری طرح تیار ہوں۔ آپ لوگ میری سپاہ بننے سے پہلے ہی بصد شوق اپنے ہتھیار لپیٹ سکتے ہیں۔'' اس نے بازو کمر کے پیچھے باندھتے ہوئے کہا۔

''یہ ہو نہیں سکتا ناں۔'' متوقع سسر اس کے برابر کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔ ''ہم تو ایک بار تمہیں نتائج وعواقب سے آگاہ کرنا چاہتے تھے لیکن اگر جنگ ہی لڑنی ہے تو پھر لڑنی ہے۔ ہماری روایت میں اعلان جنگ کے بعد retreat کرلینے کی کوئی مثال تو ہے ہی نہیں ماموں جان۔'' پھر انہوں نے بزرگوار کی طرف دیکھا۔ ''بڑے گھر تک یہ پیغام پہنچ جانا چاہیے کہ قبیلہ، برادری، خاندان سب مہرزاد خان کے پیچھے کھڑا ہے۔ بات ایک معمولی لڑکی کی نہیں، بات ان فیئر گیم کی ہے۔ لڑکی کو شام تک کی تاخیر کیے بغیر مہرزاد کے پاس ہونا چاہیے۔''

''ہاتھ ہولا رکھ خان...... ہاتھ ہولا رکھ۔'' بزرگوار نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ اس وقت ان کا چہرہ ایک ایسے بوڑھے باز کے جیسا لگ رہا تھا جو اپنے شکار پر حملہ کرنے سے پہلے عمر بھر کے تجربوں کا نچوڑ حاصل کرنے

WWW.PAKISTAN.WEB.PK

پر غور کرتا ہے۔

''وہ اور اس کا بیٹا اس وقت فیڈرل کیپیٹل میں ہی موجود ہیں اور اس وقت ان کی گاڑی بڑے گھر کی طرف جارہی ہے۔'' اویس خان نے اپنا بلیک بیری چیک کرتے ہوئے اطلاع پہنچائی۔

''ہوں۔'' بزرگوار نے سر ہلادیا۔ ''گویا وہ طلب کرلیے گئے ہیں۔ مبارک ہو مہرزاد خان۔'' پھر انہوں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہاری ڈیمانڈ میں رس محسوس کرلیا گیا ہے۔''

☆☆☆

اسے معلوم تھا کہ وہ کس جگہ لے آئی گئی تھی لیکن اسے اب تک یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ وہ کس کے کہنے پر اور کیوں وہاں لائی گئی تھی۔ وہ تین کمروں کا ایک چھوٹا سوئٹ تھا جہاں اسے رکھا گیا تھا اور سوئٹ کے اردگرد اونچے، اونچے درخت اور گھنے پودے اس طرح کھڑے تھے کہ ان کے پار کچھ دیکھنا ناممکن تھا۔

''گڑ بڑ ہے اور بہت بڑی گڑ بڑ ہے۔'' اس کا دل بار بار کہتا تھا۔ ''لیکن اس گڑ بڑ کا کوئی فوری نتیجہ سامنے کیوں نہیں آرہا۔'' پھر اسے خیال آتا امراؤ بیگم کے ہاں اس کے فون پر آنے والے اس خصوصی نمبر کے میسج سے لے کر اب تک جو کچھ بھی ہورہا تھا وہ سردارزادہ مہرزاد خان کے مزاج کا عکاس نہیں تھا لیکن اسے یقین نہیں آتا تھا کہ ایک خصوصی نمبر کو ہیک کرکے اسے کہیں اور سے کسی اور کی طرف سے میسج کرکے الو بنالیا گیا تھا۔ یقین نہ آنے کے باوجود وہ رہ، رہ کر سوچتی اور سوچ، سوچ کر پچھتاتی تھی۔ امراؤ بیگم کا ایسے نہال ہوکر اسے دبئی جانے کا مژدہ سنانا۔ ائرپورٹ پر ہونے والا واقعہ اور اس واقعے سے آگے کا قصہ۔ پھر اس کا دل اپنی عقل پر ماتم کرنے کو چاہتا۔ وہ سیکیورٹی آفیسر اسے بار بار وی آئی پی ایگزٹ سے باہر نکلنے کو کہہ رہا تھا لیکن اس نے اس کے برعکس اپنی عقل کی تقلید کی تھی اور ایک ایسی جگہ پہنچ گئی تھی جہاں کے بارے میں اسے کچھ علم نہیں تھا اسے یہاں کس لیے لایا گیا تھا۔

''دیکھو، جس کسی کے بھی کہنے پر تم لوگ مجھے یہاں لائے ہو مجھے اس سے ملوا تو دو۔'' اس نے اس بیڈروم کے بیڈ کی شیٹس بدلنے والی لڑکی سے کہا جو اس صبح اس کے لیے ناشتا لے کر آئی تھی۔

''مجھے معلوم ہوتو ملواؤں ناں۔'' لڑکی نے مختصر جواب دیا تھا۔

''اس عمارت کا جو بھی بگ باس ہے اسے تو تم جانتی ہوگی؟'' اس نے اپنی آواز میں اعتماد پیدا کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''اس کو میں بھی جانتی ہوں، میں نے ٹی وی پر اس کی شکل دیکھ رکھی ہے یقیناً اسی کے کہنے پر ہی مجھے یہاں لایا گیا ہوگا۔''

''اس عمارت کے بگ باسز کے چہرے تو بدلتے ہی رہتے ہیں۔'' وہ لڑکی ذرا سا مسکرا کر بولی۔ ''اور اس عمارت کا کیا ہے، اتنی بڑی عمارت ہے یہ کہ اس کے مختلف حصوں میں کہاں، کس کے مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں یہ بگ باس کو تو کیا شاید اس کے سیکیورٹی اسٹاف کو بھی علم نہ ہو۔''

''لیکن کوئی بھی ہے، ہے تو سہی...... کہاں ہے؟ مجھے اس سے ملنا ہے۔'' وہ دل کے سارے اندیشے پسِ پشت ڈال کر بولی۔

جواب میں وہ لڑکی مسکرائی اور بیڈ سے اتاری شیٹس کا گولا بنا کر بغل میں دبائے وہاں سے چلی گئی۔

''یا اللہ!'' اس نے اوپر دیکھا۔ ''یہ اتنے سالوں سے مسلسل میرے ساتھ کیا ہورہا ہے۔ مصیبت میں ہوں مگر مصیبت آچکتی ہے نہ مصیبت سے جان چھٹتی ہے۔ قید خانے کا وہ روزن جس سے چھن کر روشنی کی لکیر اندر

آنے لگی تھی وہ بھی نہ جانے کدھر اپنی سمت بدل گئی ہے۔ اب جو آس پاس نظر دوڑاتی ہوں تو روشنی تو ہے مگر کہاں سے آرہی ہے کچھ پتا نہیں چلتا۔'' اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپاتے ہوئے سوچا۔

''اب یہ عمارت ہے۔'' اس نے دائیں بائیں نظر دوڑائی۔ ''کہ اک طلسم ہوش ربا ہے یا ایلس کا ونڈر لینڈ...... نہیں۔'' پھر اس نے سر ہلا کر اپنی تصحیح کرنے کی کوشش کی۔ ''یہ تو وہ مینار ہے جو بے دریچہ اور بے در ہے جہاں سے میری آواز کسی سمت بھی نہیں جاسکتی۔'' اس کا سوچ، سوچ کر ماؤف ہوتا ذہن الٹی سیدھی باتیں سوچے چلا جارہا تھا۔

''لیکن وہ کدھر ہے؟'' پھر اسے اس کا خیال آیا جو روشنی کی لکیر بن کر قید خانے سے اندر آیا تھا۔ ''سردار زادہ مہر زاد خان جس کا دل میرا مفتوحہ قلعہ بن چکا تھا اور جو میرے بارے میں ہر سوچ کو ایک پھول سے تشبیہ دیتا سوچوں اور خیالوں سے اپنا باغ سجا رہا تھا...... آہ سردار مہر زاد صاحب، میں نے کہا تھا ناں کہ کیچڑ میں کھلے پھول تک رسائی حاصل کرنے کے لیے آپ کو کیچڑ میں اترنا پڑے گا۔ بدصورتی میں چھپی خوب صورتی کو دیکھنے کے لیے پہلے اپنی نظروں کو بدصورتی دیکھنے کا عادی بنانا پڑے گا۔'' اس نے تصور ہی میں مہر زاد خان کو مخاطب کیا۔ ''لیکن میں بھول گئی مجھے آپ کو یہ باتیں بتانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ آپ تو ان تلخ حقیقتوں کو خود ہی جان چکے تھے جب ہی تو بار بار مجھے یاد دلاتے تھے کہ آپ فرشتہ نہیں انسان ہیں اور میرے پاس آنے سے پہلے آپ کو اپنے نفس کو کیسے تھپک، تھپک کر سلانا پڑتا ہے...... پھر خوب دیکھے آپ نے میرے کارڈز، ہارے ہوئے تاش کے پتے اور ان پتوں سے سجائے زمیں بوس محل یقیناً حقائق کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنی موجودہ حیثیت کا وقار قائم رکھنے کی خاطر آپ نے میری ٹیبل سے اپنے پتے اٹھا لیے جب ہی تو آج میں یہاں ہوں، وہاں جہاں نہ میزبان نظر آتا ہے نہ اس کی میزبانی۔''

''انسانوں کے متعلق سوچے چلی جاؤ گی تو سوچ کے دریا بہتے ہی چلے جائیں گے، کیوں اس کے بارے میں نہیں سوچتیں جو دریاؤں کے آگے بند باندھتا ہے۔'' اسی دم جیسے اچانک کوئی اس کے بہت قریب سے بولا تھا۔ اس نے چونک کر اس سمت دیکھا جدھر سے وہ آواز آئی تھی۔ اس سمت کوئی ذی روح موجود نہیں تھا پھر اس نے اس آواز کی شناخت کرنا چاہی جو مانوس سی لگتی تھی مگر اس نے اس پر غور کرنا چھوڑ دیا تھا۔

''دعا جیسی عظیم طاقت دنیا میں کوئی دوسری نہیں، جس نے دعا کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا راستے اس کے لیے دشوار ہوتے چلے گئے اور تم تو میری بچی، میری دعا کے حصار میں ہو۔ دیکھنے کے لیے میں نہیں رہوں گا مگر تم دیکھو گی کہ اپنے اللہ کے حضور تمہارے لیے مانگی میری دعا کہاں، کہاں تمہارا حصار بنتی ہے۔'' غور کرنے اور دھیان دینے پر اسے اس بات کا حرف، حرف یاد آگیا جسے سننے کے بعد بوا جی نے کہا تھا کہ اس روز انہیں یوں لگا جیسے موت کا خوف اُن کے دل سے زائل ہو گیا تھا۔

''میں صرف تمہاری وجہ سے ہی تو مرنے سے ڈرتی تھی۔'' ایک بار بعد میں انہوں نے اسے کہا تھا۔ ''صوفی صاحب نے تمہیں وہ دعا دے کر مرنے کا ڈر میرے دل سے نکال دیا۔''

''چاہے آپ سے پہلے مجھے موت آجائے۔'' وہ جو ایبٹ آباد سے نکلنے اور ایک اجنبی جگہ پر سیٹل ہو جانے کی وجہ سے بوا جی سے دل بھر کر ناراض تھی پٹاخ سے بولی تھی۔

''اللہ نہ کرے جو تمہیں ابھی سے موت آجائے۔'' انہوں نے اسے غصے سے گھورتے ہوئے کہا تھا۔

''بھلا موت آئے کیوں نہیں؟'' وہ منہ بنا کر بولی تھی۔ ''پڑھائی چھوٹ گئی، شہر چھوٹ گیا، سہیلیاں

چھوٹ گئیں، آپ لے آئیں مجھے دست کاری اسکول میں سوئیوں اور دھاگوں سے آنکھیں پھوڑنے کے لیے...... اس سے بہتر نہیں بندہ مر ہی جائے۔ اچھا ہے جوانی کی موت آجائے بہتیرے گناہوں سے بچ جاؤں گی۔''

''پڑھائی چھوٹ گئی، شہر چھوٹ گیا، سہیلیاں چھوٹ گئیں۔ ایک نہ چھوٹا تو تمہارا منہ بھر کر ہر بات بول دینا نہ چھوٹا۔'' انہوں نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

''کوئی دوسرا اپنے جیسا بدقسمت دیکھوں تو نہ بولوں ناں۔'' وہ منہ پھلا کر بولی تھی۔ ''جب چاروں طرف نظر ڈالنے پر خود سے بڑھ کر بدقسمت کوئی دوسرا نظر نہیں آتا تو خود ہی کو کوسوں گی ناں، اپنی قسمت ہی کو تو کوسوں گی ناں۔''

''یا اللہ، اسے معاف کر دینا۔'' بوا جی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہوئے بہ آواز بلند کہا تھا۔ ''یہ نہیں جانتی خوش قسمتی کیا ہوتی ہے اور بدقسمتی کیا شے ہے۔ الٰہی اسے اتنے رنگ لگا کہ کم از کم خوش قسمتی سے تو واقفیت حاصل کر ہی لے۔ جب وہ واقفیت حاصل ہو جائے گی تو بدقسمتی کی سمجھ بھی آپ سے آپ آجائے گی۔''

''ارے جائیں، آپ کا تو کام ہی عمر بھر ہاتھ اٹھا، اٹھا کر دعا کرنا ہی ٹھہر گیا ہے۔ کوئی نہیں ہوتیں دعائیں قبول، بڑے اللہ والے بنتے ہیں صوفی صاحب وہ بے چاری آنٹی جن کا بیٹا کوما میں پڑا ہے، ہڈی پسلی تک جس کی ٹوٹ چکی ہے انہیں بھی دعا کی ہی تسلیاں دیے چلے جاتے ہیں...... ''بیٹی ماں کی دعا میں بڑی طاقت ہے۔'' اس نے صوفی صاحب کے لہجے میں کہا۔ ''اتنی ہی طاقت ہوتی دعا میں تو وہ بے چاری تو دعائیں کر کر کے دیکھ نہیں کیا حال ہو گیا ہے ان کا۔ اب تک ان کا بیٹا اٹھ کر بیٹھ نہ چکا ہوتا۔ صوفی صاحب نے ان آنٹی کو ٹرک کی بتی کے پیچھے لگایا ہوا ہے۔ جس دن ان کا بیٹا ختم ہو جائے گا اور ان کی آس کا خاتمہ ہو گا تو سر ہلاتے ہوئے کہہ دیں گے بیٹی اللہ کی یہی رضا تھی اور اس کی رضا کے سامنے کون دم مار سکتا ہے۔''

''بولے جاؤ بولے جاؤ، بغیر وقفے کے بولے جاؤ۔'' بوا جی اس کی تقریروں پر سہم جاتی تھیں۔ ''جب اپنے بول کی فصل کاٹنی پڑی تب سمجھ آئے گی تمہیں کہ کیسے کفر کے کلمے پڑھتی تھیں تم اور اللہ نہ کرے جو عافیہ بیٹی کا بیٹا یوں ختم ہو جائے۔ صوفی صاحب نے اسے دعا کے لیے کہا ہے ناں تو دیکھ لینا انشاء اللہ وہ اسی دعا کی برکت سے نہ صرف اٹھ کر بیٹھے گا بلکہ ایک نارمل اور چلتا پھرتا انسان بنے گا پھر سے۔''

''نارمل انسان تو نہیں frankenstein بن جائے تو کچھ کہا نہیں جاسکتے۔ جتنے تجربے ڈاکٹروں سمیت صوفی صاحب اس پر کر رہے ہیں، امکان تو یہی ہے کہ وہ فرینکنسٹین بن جائے گا اس دور کا۔''

''ہماری، ہم سب کی گناہ گار آنکھیں دیکھیں گی اسے زندہ اور چلتے پھرتے انشاء اللہ۔ تم بھی اِدھر ہی ہو اور میں بھی اِدھر ہی ہوں، دیکھ لینا تم، ہم سب دیکھیں گے۔'' بوا جی نے طیش میں آکر گویا اسے چیلنج کیا تھا۔

اور آنے والے دنوں میں ہی بوا جی کو صوفی صاحب خواب میں مل کر عافیہ آنٹی کے بیٹے کے ساتھ خیریت کے زندگی کی نوید سنا گئے تھے۔ صوفی صاحب کے وصال پر اس نے پُریقین عافیہ آنٹی کو دیکھا تھا اور وہ دل میں کئی بار تمسخرانہ ہنسی بھی ہنسی تھی۔

''انسان کی ضعیف الاعتقادی کی کوئی حد بھی ہے۔'' اس نے سوچا تھا اور ایک بار پھر بوا جی کے سامنے ان کے، صوفی صاحب کے اور عافیہ آنٹی کے یقین کا مذاق اڑاتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

''ہاں یہ اچھی بات ہے کہ مکمل نراش سے پہلے آس کی ڈور ہلتی رہے ورنہ انسان کے دن کیسے گزریں،

ورنہ میں آپ کو یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اِدھر ڈاکٹرز وینٹی لیٹر سے ہٹائیں گے اُدھر عافیہ آنٹی کے بیٹے کی مصنوعی زندگی رک جائے گی۔''

''ہم بھی اِدھر ہی ہوں گے تم بھی اِدھر ہی ہوگی اور ہم سب صوفی صاحب کی طرف سے دی گئی نوید کو حقیقت میں ڈھلتا دیکھیں گے۔'' لیکن بوا جی اپنے دعوے کی تکرار کرتی رہ گئیں اور وہ خوف ناک منظر پیش آ گیا جس نے ان کی اپنی زندگی کی بنیادیں جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔

''اُف!'' وہ جھرجھری لے کر حال کی دنیا میں واپس آئی۔ لرزتی، ہلتی، کانپتی زمین، آن کی آن میں زمیں بوس ہوتی عمارتیں، ریت، پتھر، سیمنٹ، کنکریٹ ریزہ ریزہ ہوکر آپس میں مدغم ہوتے جابجا تاحدِ نظر زمین پر بکھر گئے تھے اور ان کے منوں ٹنوں وزن کے نیچے دبے گرم، نرم بچے، جوان، بوڑھے جسم سسکیاں لیتے زندگی کو پکار رہے تھے، گوشت اور خون کے لوتھڑے جسموں کے اعضا ایک چھت کے نیچے ایک ساتھ ختم ہوتی کئی انسانی زندگیاں، ملبے، لاشیں، ٹوٹے، بکھرے اعضا، فلک بوس عمارتیں، مکانات زمین کے اندر کئی کئی فٹ نیچے گر چکے گھر جن میں محبوس نہ جانے کتنی زندگیاں آخری سانسیں لے رہی تھیں اور کتنی ہی ایسی زندگیاں بھی ہوں گی جنہیں یہ سوچنے کا موقع بھی نہ ملا ہوگا کہ وہ آخری سانس تھی جو انہوں نے لمحہ بھر پہلے لی تھی۔

خاک اور خون کا وہ منظر جس میں وہ اپنے زخمی جسم، زخمی ہاتھوں کے ساتھ پتھر کی ان شگافتہ وشکستہ دیواروں کو دیوانہ وار ڈھانے کی کوشش کر رہی تھی جن کے اندر بوا جی دب گئی تھیں۔ بوا جی، ان کے دست کاری اسکول کا اسٹاف، بچیاں سب کی سب ایک ساتھ دنیا چھوڑ گئی تھیں اور وہ برہنہ پا، پتھروں سنگریزوں اور دھول پر اِدھر سے اُدھر بھاگتی پھرتی تھی۔

''کوئی ہے جو اُن سب کو بچا لے، کوئی ہے جو اُن دیواروں کو گرا دے جو اپنی جگہ پر کھڑی کھڑی ہی جیسے پاتال میں جا گری تھیں۔''

''بات سنو، بات سنو بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ۔ دیکھو ایک اور زلزلہ آ رہا ہے۔ بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ، کلمہ بہ آواز بلند کلمہ پڑھو سب کے سب۔'' مقامی اور قومی زبان میں کہے الفاظ اس کے کانوں میں پڑتے تھے مگر اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ وہ دیوانہ وار بھاگ رہی تھی اور شاید بھاگتے، بھاگتے ہی گر گئی تھی۔

اس کے بعد جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک ایسے کیمپ میں لیٹے پایا جس میں اسی کی طرح کے اور بھی کئی زخمی پڑے تھے اور کئی مہربان چہرے ان پر جھکے ہوئے تھے۔ بوا جی کے بقول اپنے بولے کی فصل کاٹنے کا وقت آ چکا تھا۔ وہ جسے آج سے پہلے ہر دوسرا انسان خوش قسمت اور اپنا آپ ہمیشہ بدقسمت لگا کرتا تھا اس کا قسمتوں کا حساب لگانے کا اصل امتحان اب شروع ہونے والا تھا۔ وہ نیم بے ہوشی و ہوش میں بوا جی کو آوازیں دیتی تھی شاید اس لیے... بھی کہ عمر بھر ان کے علاوہ کوئی دوسرا رشتہ اس نے دیکھا ہی نہیں تھا۔

بدقسمتی بوا جی کا یوں دنیا سے چلا جانا تھا یا اس کا اکیلے دنیا میں زندہ رہ جانا۔ خوش قسمتی اس کی زندگی تھی یا بوا جی کا اسے یوں بے یارومددگار دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہ جانا تھا۔ آنے والے سال، دن اور مہینے اس کو ایک، ایک چیز کی تفصیل اور حقیقت بتانے والے تھے اور وہ اس امدادی کیمپ میں سر، ہاتھ اور پاؤں بستر پر پٹختی چلاتی تھی۔ وہی نہیں اس کے اردگرد اس المناک واقعے کے بعد زندہ بچ جانے والا ہر شخص روتا تھا، چلاتا تھا اور پکارتا پھرتا تھا۔

''یہ علاقہ میدانِ حشر ہے اور یہاں موجود ہر شخص اپنی، اپنی قبر سے نکل کر وحشت ناک نظروں سے

WWW.PAKISTAN.WEB.PK

سامنے کا منظر دیکھتا ہے۔'' امدادی کیمپ میں زخمیوں کی عیادت کے لیے آنے والے ایک مشہور اسکالر نے کہا تھا۔

وہ کتنے دن وہاں یونہی پڑی رہی تھی اسے یاد نہیں تھا۔ اس کے ڈاکٹر کہتے تھے وہ جسمانی سے زیادہ ذہنی طور پر مجروح ہے اور اسے نارمل ہونے کے لیے بہت سا وقت چاہیے مگر اپنے ''بولوں'' کی فصل کاٹنے کا وقت آن پڑنے پر وہ امتحان در امتحان سے گزرنے کے عمل میں داخل ہو چکی تھی۔ جب ہی تو امدادی کیمپ کی طبی امداد اس کے لیے ناکافی قرار دے کر اسے کسی بہتر اسپتال میں لے جانے کا کہہ کر اٹھانے والے لوگ وہاں گھس آئے تھے۔ اس امدادی کیمپ سے باہر دنیا کے حالات کیا تھے، اس قیامتِ صغریٰ نے علاقے کا کیا حال بنا رکھا تھا، اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ معلوم تو صرف اتنا تھا کہ وہ وہاں سے شفٹ کی جا رہی تھی۔ رات کے اندھیرے میں شفٹ کیے جانے سے آگے جو کچھ ہوا تھا اس نے قیامتِ صغریٰ سے ماؤف ذہن کے سوتے حیرت انگیز طور پر کھول دیے تھے۔ وہ ایک سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے اور پھر اس سے اگلے سے اگلے ہاتھ میں منتقل ہوئی۔ اس روز اس عمارت کے نہ جانے کون سے پوشیدہ کونے میں مقید تھی۔ ہاتھ در ہاتھ منتقل ہو جانے کا یہ زمانہ اور سفر وحشت ناک تھا، اس کی آنکھوں نے دنیا کے کئی رنگ دیکھ ڈالے تھے اور ذہن ہزار ہا تجربوں سے گزر چکا تھا۔

''مصیبت سے جان چھٹتی تھی نہ مصیبت آ چکتی تھی۔'' وہ امراؤ بیگم کے گیسٹ ہاؤس کی مقیم تھی مگر گیسٹ ہاؤس کے نگینوں کے مخصوص تجربوں سے محفوظ بھی تھی' اس کی مخصوص تربیت مکمل کرنے کے بعد جب امراؤ بیگم اسے اپنے مہرے کے طور پر متعارف کروانے کا آغاز ہی کر رہی تھی۔ اس کے گیسٹ ہاؤس میں سردار مہر زاد خان نے قدم رکھ دیا تھا اور اس کی نظر نے، زرنگار کے روپ میں چھپی میرال صلاح الدین کو تاڑ لیا تھا۔

''مصیبت آئی تھی نہ مصیبت سے جان چھٹتی تھی۔'' مہر زاد خان نے ایک ہزار راتوں کا معاوضہ امراؤ بیگم کو پیشگی پکڑا کر مصیبت کو آنے سے بظاہر تو روک دیا تھا مگر مصیبت سے جان چھوٹنے کا کوئی امکان بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ وعدے، یقین اور تسلی دلاتا رہا تھا اور وہ اس کے گمان میں پھنسی نہ جانے کدھر آ پھنسی تھی جہاں میزبان نظر آتا تھا نہ مہمانداری کا کوئی سبب۔

''وہ بھی تو منسٹر بن چکا ہے، ہوسکتا ہے یہاں بھی اسی کے اشارے پر لائی گئی ہوں۔'' سوچتے سوچتے اسے خیال آیا۔ ''لیکن اگر ایسا ہے تو وہ خود کہاں ہے، وہ ای سی ایل کیا ہے اور فون سگنلز کیوں غائب ہیں؟'' وہ خطرے میں تھی، خطرے سے باہر تھی یا خود کسی کے لیے خطرہ تھی؟ اس بلند چار دیواری والی وسیع و عریض عمارت کے کسی خفیہ گوشے میں مقید اسے کچھ معلوم نہ تھا۔

☆☆☆

ایسا کیا تھا جو معمول سے مختلف محسوس ہو رہا تھا۔ یشل نے پلازمہ اسکرین پر مہر زاد خان کی وہ میٹنگ یا بریفنگ براہِ راست دیکھتے ہوئے سوچا تھا جو الیکٹرانک میڈیا کے معروف ٹاک شوز اور نیوز اینکرز کے ساتھ خصوصی طور پر منعقد کی گئی تھی۔ بظاہر مہر زاد خان ہر سوال کا فوری اور برجستہ جواب دے رہا تھا اور اس کا ہر جواب نپا تلا اور برموقع معلوم ہو رہا تھا مگر کچھ ایسا ضرور تھا جو یشل کو غیر معمولی لگ رہا تھا۔

''اس اعتماد کے اندر ایک عجیب سا کنفیوژن نظر آ رہا ہے اور اس ٹھہراؤ کے پیچھے ایک عجیب سی عجلت محسوس ہو رہی ہے جیسے وہ سب کے درمیان موجود سب کے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے بھی وہاں موجود نہیں ہے، جیسے اس کا دل چاہ رہا ہے کہ یہ سب جلدی سے ختم ہو جائے۔'' یشل نے تیزی سے انگلیاں چلاتے ہوئے اپنے

آئی فون پر مختصر یادداشت لکھی۔ ''کچھ ایسا ضرور ہے جو اس کے ساتھ کسی گڑبڑ کی نشان دہی کر رہا ہے۔''

''اگرچہ یہ بہت اندر کی خبر ہے اور ابھی تک بوجوہ منظرِ عام پر نہیں آسکی لیکن کیا یہ سچ ہے کہ وزارت کا حلف اٹھانے کے بعد ایک رات کے اندر ہی اندر آپ کے کسی معاملے پر پارٹی ہائی کمان سے اختلاف پیدا ہو چکے ہیں جنہیں حل کرنے کے لیے پارٹی کے متقدر رہنما اس وقت حرکت میں ہیں؟'' ایک بڑے نیوز چینل کے مقبولِ عام ٹاک شو کے مشہور اینکر نے اچانک مہرزاد خان سے سوال پوچھا۔ سوال تیکھا تھا اور غیر متوقع بھی۔ الیکٹرانک میڈیا سے متعلق حکومت کی تازہ پالیسیز پر بات کرتے، کرتے اس اینکر نے یہ سوال اچانک کیا تھا یقیناً اسے اپنے پاس موجود رابطے کے کسی ذریعے پر اچانک ہی کوئی پیغام موصول ہوا تھا۔

''آپ لوگوں کو اختلافات کی خبروں میں صلح صفائی کی خبروں کی نسبت کہیں زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔'' مہرزاد خان نے اس غیر متوقع سوال پر چونکے بغیر مسکرا کر جواب دیا تھا۔ یشل نے دیکھا اس کی نظریں ایک مخصوص جگہ پر رکی ہوئی تھیں یقیناً اس اینکر کے ہاتھ میں کوئی مواصلاتی آلہ موجود تھا اور وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔

''بھائی میں تو ابھی تازہ واردانِ وزارت میں سے ہوں۔ اختلافات کی بات کر کے کیوں میری دال میں کنکر ڈھونڈتے ہو۔'' اس نے بات اڑاتے ہوئے کہا اور چہرے کا رخ کسی دوسرے اینکر کی طرف موڑ لیا۔

''آپ پارٹی کے لیے امید کا نشان ثابت ہو رہے ہیں۔ پارٹی کی عوام میں روز بروز کم ہوتی مقبولیت اور گرتی ہوئی ساکھ کو بڑھانے اور سہارا دینے کے لیے پارٹی کی ہائی کمان کی نظریں آپ پر جمی ہوئی ہیں، ایسے میں آپ کے ہائی کمان سے اچانک کسی مسئلے پر اختلاف کی خبر خاصی تعجب خیز ہے۔'' دوسرے اینکر نے پہلے والے سے کیو لیتے ہوئے اپنی تشویش داغی۔

''خیر کے کلمے منہ سے نکالنا سیکھیں سائیں، اختلافات نہ تو اوور نائٹ پیدا ہوئے ہیں نہ ہی اوور نائٹ ختم ہو جاتے ہیں اور میں نے تو ابھی کل ہی آپ سب کے سامنے وزارت کا حلف لیا ہے۔ جہاں اختلاف ہوتے ہیں وہاں حلف نہیں ہوتے، اتنا تو معلوم ہی ہوگا آپ لوگوں کو۔'' اس نے اس بار بھی رسان سے جواب دیا تھا۔

''وہ خود سے سوال کرنے ...... والوں کو تو ٹال گیا لیکن یہ سچ ہے کہ اس بحر کی موجوں میں کہیں نہ کہیں تلاطم ضرور موجود ہے اور اس چیز کا خطرہ مجھے بہت پہلے سے محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا مزاج، اس کی سیلف ٹریننگ، اس کے نظریات، راست گوئی اور نان کمپرومائزنگ رویہ خود اس کے لیے بہت سے مسائل کھڑا کر سکتا ہے اور مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ یہ سب مل کر راتوں رات ہی اس کے لیے مسائل کھڑے کر چکے ہیں۔ مسائل کی نوعیت کیا ہے، یہ میں نہیں جانتی لیکن میری دعا ہے کہ اس کا تعلق زرنگار سے نہ ہو۔'' یشل نے اس دن کا فائل نوٹ لکھا اور اپنی فائل میں محفوظ کر لیا۔

☆☆☆

''میرا نام حمزہ محمود ہے۔''

''اور میں فہد ہوں۔''

''آپ دونوں سے مل کر بہت خوش ہوئی، میں دانیال جہانگیر ہوں اور یہ میری والدہ مسز عافیہ جہانگیر ہیں۔''

جاری ہے



شامِ شہرِ یاراں

عنیزہ سیّد

قسط 12

زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے... خیر و شر، نیکی اور بدی... زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت... ہر برائی پر حاوی ہوجاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سیّد نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

محمود درانی اور مہرین کی تیسری اولاد حمزہ، مہرین کی زچگی میں پیچیدگی کے باعث نانی کے پاس ان کے آبائی گھر سیالکوٹ میں پروان چڑھتا ہے۔ جہاں نگین اس کے ماموں کی بیٹی سے اس کی خوب گاڑھی چھنتی ہے۔ بڑے ہونے پر حمزہ کے والدین اسے واپس لانا چاہتے ہیں مگر وہ راضی نہیں ہوتا۔ علینہ کے والدین، نادیہ اور سعید کیانی نے کورٹ میرج کی تھی مگر شادی کے تین سال بعد سعید کیانی بیوی کو داغِ مفارقت دے گئے۔ آکسفورڈ کا پروردہ سردار مہرزاد خان اپنے باپ کے سیاسی قتل کے بعد حادثاتی طور پر سیاست میں شامل ہوا تھا اور زرنگار کے حسن و ذہانت کا شکار ہو چلا تھا..... بینش دو بھائیوں کی اکلوتی بہن، اپنی ضد اور صرف بھائیوں کے تعاون سے نیشنل کالج آف آرٹس میں تعلیم حاصل کر رہی تھی جہاں اس کا سینئر ساتھی دانیال اس سے ہر ممکن تعاون کرتا تھا۔ ایک پاکستانی مسلمان مرد اور بدھ مذہب کی پیروکار چینی عورت کی بیٹی زوئی حسین چین سے آکر پاکستان میں فارمیسی کی تعلیم حاصل کرتی ہے۔ دانیال آرٹ کا عشق رکھنے کے ساتھ فلائنگ میں بھی مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے اور ایک دن طیارے کے دھوئیں سے نقش و نگار بنانے کی کوشش میں حادثے کا شکار ہو کر اسپتال میں پٹیوں میں جکڑا (عافیہ) ماں کی ممتا کا شدید امتحان بن جاتا ہے۔ فہد کو اپنے ایک نیوز ریڈر دوست کے ذریعے سے میرال کی گمشدگی کی خبر ملتی ہے۔ زرنگار، مہرزاد کو اپنے ماضی کے بارے میں بتاتی ہے، زوئی، نادر کے گھر جاتی ہے تو نادر کی ماں کہتی ہیں کہ اسے بتا کر آنا چاہیے تھا۔ نادر، حمزہ سے ملتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ اگر زوئی قصوروار ہوئی تو وہ خود اسے لے کر آئے گا۔ حمزہ کہتا ہے کہ اسے اب تنگ نہیں کیا جائے گا۔ عافیہ، دانیال سے کہتی ہیں کہ جو طریقہ اس نے میرال کو ڈھونڈنے کا نکالا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ علینہ اچانک فہد کی آمد سے بہت خوش ہوتی ہے لیکن جب وہ یہ سنتی ہے کہ وہ میرال کی تلاش میں آیا ہے تو یہ اسے اچھا نہیں لگتا۔ چوہدری رزاق، امراؤ بیگم کو خبردار کرتا ہے کہ زرنگار کی وجہ سے وہ اب کسی آفت میں پھنس سکتی ہے۔ مہرزاد کی ماں اس سے کہتی ہے کہ انہوں نے اس کا رشتہ خان اکبر کے گھر ڈالنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ نادر اپنے گھر میں زوئی کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ ثمرین، دانیال سے کہتی ہے کہ بینش اس کی دوستی کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔ زرنگار، مہرزاد کو میسج کرتی ہے کیونکہ وہ تقریباً پندرہ دن سے رابطے میں نہیں تھا۔ بینش، مہرزاد کو سنبھل کر چلنے کا مشورہ دیتی ہے۔ دانیال، بینش کو اپنے ایکسیڈنٹ اور صحت یابی کے بارے میں بتاتا ہے تو وہ حیران رہ جاتی ہے۔ زوئی، نادر کو بتاتی ہے کہ اس نے نادر سے غلط بیانی کی تھی کہ وہ زلزلہ زدگان کے مددگاروں میں شامل نہیں تھی۔ وہ بتاتی ہے کہ کس طرح وہ میرال کو ان لوگوں سے بچاتی رہی لیکن وہ لوگ اسلحے کے زور پر اسے زبردستی اپنے ساتھ لے گئے۔ مہرزاد حلف اٹھانے کے بعد سوچ رہا تھا کہ حلف اٹھانے والوں کو حلف کے الفاظ یاد بھی رہتے ہوں گے کہ وہ ان پر عمل کر سکیں۔ مہرین، حمزہ پر شادی کے لیے زور ڈالتی ہے لیکن وہ پس و پیش سے کام لیتا ہے تو محمود درانی کہتے ہیں کہ وہ کوشش کریں گے کہ وہ اس کی چوائس کو اپروول دلا دیں۔ امراؤ بیگم چھوٹے صاحب کے ساتھ زرنگار کو بھیجنے پر تیار ہو جاتی ہیں۔ زرنگار کو اس خصوصی نمبر سے وہی روانگی کا پیغام ملتا ہے اور پھر امراؤ بیگم کہتی ہے کہ سردار صاحب نے ٹکٹ بھیجا ہے۔ گڈی، مہرزاد سے کہتی ہے کہ اسے وزارت کا عہدہ ملنے کی خوشی میں بپا کی گئی تقریب میں زرنگار کو بلانا چاہیے تھا۔ علینہ، فہد کو بتاتی ہے کہ ایک سوشل ویب سائٹ پر میرال صلاح الدین کے نام کا صفحہ موجود ہے۔ فہد اس کی بات سن کر حیران رہ جاتا ہے۔ بینش، نگین کو فون کرتی ہے تو اسے بتاتی ہے کہ اس کا بھائی حمزہ کب سے اسے ڈھونڈ رہا ہے۔ بینش اسے ایک نمبر دیتی ہے اور کہتی ہے کہ وہ فوراً اس پر رابطہ کرے۔ زوئی ائرپورٹ اپنی دوست چی آن کو لینے جاتی ہے تو اس شخصیت کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے جو ایک گاڑی سے باہر نکلی تھی۔ زوئی، میرال کو پہچان لیتی ہے وہ نادر کو بتاتی ہے۔ میرال کو بتایا جاتا ہے کہ اس کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل ہے اس لیے وہ وہیں نہیں جا سکتی۔ میرال حیران ہوتی ہے کہ وہ لوگ اسے کہاں لے کر جا رہے ہیں۔ مہرزاد کے آدمی اسے بتاتے ہیں کہ میرال کو بڑے گھر لایا گیا ہے۔ مہرزاد فون کرنا چاہتا ہے لیکن میرال سے رابطہ ممکن نہیں ہوتا۔ زوئی ٹیکسی کر کے میرال کی گاڑی کا پیچھا کرتی ہے۔ نادر، حمزہ محمود کو میرال کے بارے میں بتاتا ہے..... عافیہ ویب سائٹ پر فہد کا میسج پڑھ کر اس سے رابطہ کرنے کا سوچتی ہیں۔ مہرزاد خان اپنی برادری کے لوگوں پر میرال کے سلسلے میں دباؤ ڈالتا ہے۔ ییشل، مہرزاد خان کی نیوز اینکر کے ساتھ منعقد کی گئی میٹنگ دیکھتی ہے تو اسے کچھ غیر معمولی محسوس ہوتا ہے۔ فہد اور حمزہ، دانیال اور عافیہ سے ملنے آتے ہیں۔

اب آگے پڑھیں

علینہ نے برآمدے میں رکھی کرسی پر ہی بیٹھے، بیٹھے سامنے کے منظر کو دیکھا۔ وہ سہ پہر سے اس جگہ پر بیٹھی تھی اور اب شام کے سائے اترنا شروع ہو چکے تھے۔ اس نے وہیں بیٹھے اپنی کمزور روشنی پھیلاتے، بادلوں سے نبرد آزما سورج کو دیکھا تھا اور پھر وہ بادلوں سے ہار کر اپنے وقت سے پہلے ہی غروب ہو چلا تھا۔ اس کے غروب ہونے کے دوران آسمان پر ایک ہلکی سی شفق کا رنگ نمایاں ہوا اور پھر وادی میں اچانک سردی کی ایک واضح لہر پھیل جانے کا احساس ہونے لگا۔ اس شہر کی شامیں ہمیشہ سے ہر موسم میں اپنا رنگ بدل جاتی تھیں۔ سرما کی اس پھیلتی شام نے علینہ کے دل کو پہلے سے زیادہ اداس کر دیا تھا۔ نادیہ اسپتال سے فارغ ہو کر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد کلینک جا چکی تھیں اور سرما کی طویل چھٹیوں میں گھر بیٹھ کر بور ہوتی علینہ ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد پھر گھر میں اکیلی رہ گئی تھی۔

”جتنے دن فہد یہاں رہا، زندگی میں ایک الگ سی گہما گہمی اور چہل پہل کا احساس پیدا ہونے لگا تھا۔ وہ اکیلا ہی بہت سارے لوگوں سے زیادہ مجلسی ہے، اس کے یہاں ہونے نے زندگی کا کتنا خوشگوار احساس پیدا کر دیا۔ کتنے لوگ اس کی ہمارے گھر آمد و رفت کا سن کر ہمارے گھر آئے۔ کیسی لمبی، لمبی نشستیں ہوتی رہیں..... وہ گفتگو کا فن جانتا ہے۔ باتوں، باتوں میں کھانے پکانے کی ترکیبیں بتاتا، لنچ اور ڈنر ٹیبل سیٹ کرنے کے طریقے بتاتا، مختلف ملکوں کے لوگوں کی کھانا کھانے کی عادات کے قصے سناتا وہ اپنے مخاطبین کو اپنی گفتگو میں کتنا محو رکھ سکتا ہے، دل کرتا ہے بس اس کی باتیں سنتے چلے جاؤ، اس کے تجربوں کی پٹاری اتنی بڑی اور اتنی گہری ہے کہ وہ اس میں ہاتھ ڈال کر جتنے چاہے قصے نکال کر سناتا چلا جائے پٹاری کبھی خالی نہیں ہوگی..... مگر.....“ سوچتے سوچتے اسے اپنے دل میں ایک تکلیف دہ چبھن کا احساس ہوا..... ”مجھ سے اور ماما سے گفتگو کے دوران وہ کم از کم چار پانچ مرتبہ میرال کا ذکر کرنا نہیں بھولتا تھا۔“ اس نے اس تکلیف دہ چبھن کے احساس سے گھبرا کر پہلو بدلا۔ ”ایسا لگتا ہے جیسے اس شہر کے ماحول، موسم، ہر موڈ، ہر رنگ، ہر عکس میں اسے میرال سے وابستہ کوئی یاد نظر آنے لگتی اور وہ اس کا ذکر کرنا نہیں بھولتا تھا۔ اُف میرے خدا!“ علینہ نے اس تکلیف دہ چبھن کے احساس سے نکلنے کے لیے لاشعوری طور پر سر جھٹکا۔ ”کچھ لوگ کیسے خوش قسمت ہوتے ہیں، بنا خواہش کیے اچھے، اچھے احساسات پا جاتے ہیں جیسے میرال اور اس کے لیے فہد کی فیلنگز۔“ تکلیف دہ چبھن اپنی پوری شدت کے ساتھ دل میں ایک بار پھر ابھری۔ ”خود تو وہ نہ جانے کہاں اور کس حال میں ہے لیکن فہد اس کے لیے کتنا بے چین اور اسے ڈھونڈ نکالنے کو کیسا بے تاب نظر آتا ہے۔ یوں تو شاید کوئی اپنے سامنے موجود انسان کے لیے بھی بے چین اور بے تاب نہ ہو۔ اس کے بارے میں خبر لانے کی خاطر وہ کتنی بار بالاکوٹ گیا اور یہاں شہر میں اس نے کتنے ہی ایسے لوگ تلاش کر مارے جو میرال اور آنٹی کلثوم کے بارے میں کچھ جانتے تھے۔ بھلا ایسی تلاش کا کیا فائدہ جس کے بے سود رہ جانے کے چانسز سامنے نظر آ رہے ہوں۔“ اس نے خفگی کے ساتھ سر جھٹکا۔

”اور میں.....“ پھر اسے یاد آیا۔ ”میں کتنی احمق ہوں جو اس سے اس صفحے کا ذکر کر بیٹھی جو مقبول ترین سوشل ویب سائٹ پر میرال صلاح الدین کے نام سے بنایا گیا ہے۔ مجھ سے اس کا تذکرہ سننے کے بعد تو جیسے اس کی ساری تلاش کا رخ ہی مڑ گیا اور پھر جیسے سال کے باقی دن ختم ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گئے اور وہ آناً فاناً لاہور چلا گیا..... کیا ہے یار.....“ اس نے فہد کے چلے جانے کا خیال آتے ہی اکتا کر سوچا۔ ”ہم بھی تو انسان

ہیں اور ہم میں کیا کمی ہے جو لوگ ہمارے لیے اس طرح نہیں سوچتے۔'' اس نے اپنے لیے جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے سوچا تھا اور لوگ سے اس کی مراد یقیناً فہد تھا۔ فہد جو عین اترتی شام کے ان لمحوں میں سیکڑوں کلو میٹر دور لاہور میں دانیال جہانگیر کے گھر اس سے ملاقات کرنے پہنچ چکا تھا۔

☆☆☆

''لڑکی جس بھی حال میں ہے، ہے اُسی منسٹر کے پاس قید.....'' عافیہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑی فیکٹس اور فگرز کی فائل سے وہ تفصیل فہد اور حمزہ کو سنانے کے بعد کہا جو انہوں نے اپنی یادداشت کے لیے بنا رکھی تھی۔

''اور منسٹر اتنا پاورفل ہے کہ کسی طرح پکڑائی نہیں دیتا۔'' حمزہ کے لہجے میں تلخی تھی۔ ''میں نے اسے ڈھونڈ نکالنے کی جتنی بھی کوششیں کیں، وہ آپ لوگوں کی کوششوں سے تو کم اور کمزور ہی ہوں گی۔'' اس نے عافیہ اور دانیال پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''مگر میری ہر کوشش بھی کسی ہائی آفس کے دروازے پر جا کر دم توڑ دیتی رہی اور یقیناً اس کی وجہ یہ منسٹر ہی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' فہد نے کچھ سوچتے ہوئے حمزہ کی طرف دیکھا۔ ''لیکن ابھی جس ڈویلپمنٹ کا ذکر تم نے کیا۔'' اس نے سوالیہ نظروں سے حمزہ کو دیکھنے کے بعد عافیہ اور دانیال کی طرف دیکھا۔ ''اس چائنیز لڑکی اور اس کے شوہر نے میرال کو جس عمارت کے اندر جاتے دیکھا اس کا آفس تو اس منسٹر کے پاس نہیں ہے ناں۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' دانیال نے کہا..... ''وہ بلڈنگ وفاق کے نمائندے کی سرکاری رہائش گاہ ہے اور وفاق کا یہ نمائندہ اسی پارٹی کا ایک لیڈر ہے، جس کے یہ صاحب منسٹر ہیں، یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں لڑکی کو اس عمارت میں رکھنا تو اسے اور بھی نظروں سے دور رکھنے کے مترادف ہے، اپنے پیج اور بلاگرز کے ذریعے جو ڈوری ہم آہستہ، آہستہ وقتاً فوقتاً ہلا رہے ہیں، اس کی کچھ خبر تو اس منسٹر کے بچے کو پہنچ ہی چکی ہوگی، چیف منسٹر کی بیوی سے میری بھابی کی ملاقات بھی مانیٹر ہو چکی ہوگی، یہ لوگ اپنے مخالفوں کی ہر، ہر موومنٹ پر گہری نظر رکھتے ہیں، یقیناً اسے ایک ایسی گڑبڑ کا اندازہ ہو چکا ہے جو چند ہی دنوں میں اس کے خلاف سامنے آنے والی ہے، اس نے خود کو مزید محفوظ کر لیا ہوگا۔''

''افوہ!'' عافیہ نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ ان کا تصور انہیں میرال کی کئی ممکنہ تکلیف دہ صورتِ احوال دِکھاتا رہتا تھا۔ ''ہمیں اب بغیر کسی تاخیر کے اپنی آواز اور احتجاج بلند کر لینا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ وہ خود کو مزید محفوظ کرنے کے لیے لڑکی کو سرے سے ہی غائب کر دے۔''

''ہم.....'' فہد نے اپنا فون نکالتے ہوئے پُرسوچ انداز میں سر ہلایا۔ ''مجھے مکمل صورتِ حال کا اندازہ تو آج ہوا ہے، مجھے بھی اپنے کچھ کانٹیکٹس آزما لینے دیں، شاید کچھ فائدہ ہو جائے۔'' اس نے اپنے فون میں محفوظ ایک نمبر ملاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

''مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ نے کل کے پیدا ہوئے ایک لڑکے کو خوب ہی سر پر چڑھا رکھا ہے۔ یعنی کہ وہ کسی اور سے رابطہ کیے بغیر سیدھا آپ تک ہی پہنچ گیا۔ کمال ہے بھئی کمال ہے، مجھے کال کرنے سے پہلے ذرا اس جرأت پر غور تو کیا ہوتا صاحب۔''

''باتیں بنانے کے لیے تو نہیں بلایا تمہیں سائیں، بات کرنے کے لیے بلایا ہے، بھلا اب غور کرنے کی ہی بات ہے تو تم نے بھی تو غور کیا ہوتا کہ باتیں کرنے کا دل چاہے تو فون کال کر کے بھی کی جا سکتی ہیں ناں بابا، ایک نمبر ہاٹ لائن سے جُڑا ہے، بٹن دباؤ بات کر لو، تمہیں سفر کر کے صاحبزادے سمیت یہاں چلے آنے کو کیوں کہا، باتیں بنانے کے لیے تو ہرگز نہیں کہا ہوگا بابا!''

''میں سب سمجھتا ہوں صاحب، یہاں بلانے کا مقصد اس کو یقین دلانا ہے کہ اس کی بات سن بھی لی گئی اور اس پر غور کرنے کے بعد ایکشن لینے کا موڈ بھی ہے، کمال ہے صاحب کمال ہے، ہماری عمریں گل سڑ گئیں پارٹی کے کاز کو آگے بڑھانے میں، وہ ابھی کل ممبر بنتا ہے، ایلیکٹ ہوتا ہے، اسے سب سے اہم وزارت بھی دے دی جاتی ہے اور پھر اس کی چاند سے کھیلنے کی ضدیں بھی پوری کرنے چل پڑتے ہیں آپ، کیا آپ کو خبر ہے کہ جس سے زبردستی استعفیٰ لے کر اس کی منسٹری اس کے حوالے کی ہے آپ نے، اس کے کیمپ میں کیا چل رہا ہے۔''

''بابا..... بابا..... تم کیا سمجھتے ہو، ہماری آنکھیں بند اور کانوں میں سیسہ ڈلا ہوا ہے کیا.....! ارے سائیں، مردِ درویش ضرور ہوں مگر نظر ہر موومنٹ پر ہے، چاہے وہ موومنٹ اپنوں کی ہو یا مخالفوں کی۔''

''سب جانتا ہوں صاحب، ایک عمر سے آپ کے ساتھ ہوں۔''

''نہ بھئی نہ..... یہ ساتھ ہونے کے دعوے مت کرو، اِدھر ہم ایک جیل سے دوسری جیل کی سیر کر رہے تھے اُدھر تم لندن اور نیویارک کے نائٹ کلبز کے مزے لُوٹتے پھر رہے تھے، یہ تو ہماری وضع داری کا کرم سمجھو جو آج تم ہمارے نمائندے کی حیثیت سے اس چھوٹے صاحب کے گلے کی ہڈی بنے بیٹھے ہو۔''

''وضع داری کا کرم نہیں صاحب گٹس کی کمائی ہے یہ نمائندگی، آپ کی پارٹی میں ہے کوئی ایسا دوسرا جی دار جو اس کی دہاڑ پر ہاتھ رکھ سکے، یہ گٹس تو صرف اسی ناچیز میں تھے اور آپ جانتے بھی تھے جب ہی قرعۂ فال اس مسکین کے نام نکلا۔''

''مسکین مت بولو خود کو بابا، تمہارے لیے یہ لفظ سن کر تو مجھ کو بھی شرم آتی ہے۔''

''کیا بات کرتے ہیں صاحب، آپ نہیں جانتے کیا کہ اہلِ علم کے خاندان کا چشم و چراغ ہوں، ہماری تو نسلوں کی کتابیں پڑھنے اور کتابیں پڑھانے میں عمریں گزر گئیں، والد محترم کی استادی کا زمانہ قائل ہے، یہ حقیر پُرتقصیر بھی کتابیں پڑھ پڑھ کر ہی یہاں تک پہنچا ہے۔ اہلِ علم، آغازِ کاروبارِ دنیا سے ہی مسکین ٹھہرے صاحب، جب ہی تو آج اُس کل کے لونڈے کی ایک پکار پر آپ نے میرے ہی کان دابنے کا فیصلہ کر لیا۔ نہ میری عمر کا خیال کیا گیا، نہ علم کا نہ ہی پارٹی سے وابستگی اور اس کے لیے انجام دی گئیں خدمات کا۔''

''ارے بابا، ہمیں کتابی علم سے کیا واسطہ، ہم تو صوفیا کی دھرتی سے اٹھ کر آئے ہیں، ہمیں کتاب کے علم کی نظر عطا ہی نہیں ہوئی ہم تو جو دیکھتے ہیں دل کی نظر سے دیکھتے ہیں اور دل کی نظر کہتی ہے اس معاملے میں تم (culprit) قصوروار ہو بابا، تمہارا بیٹا بھی قصوروار ہے۔ مان لو سائیں دل کی نظر ٹھیک کہتی ہے۔''

''اب میں کیا کہہ سکتا ہوں، گھونٹ پانی کے پیوں یا خون کے، سمجھ نہیں آ رہا۔''

''یہ بھی کوئی سوچنے کی بات ہے بابا، اسی شے کے گھونٹ پیو جس کے پینے کے تم عادی ہو، اسی کے دو گھونٹ تمہارے دماغ کو سوچنے کی صلاحیت بھی عطا کر دے گا اور سمجھنے کی بھی۔''

''ایک معمولی سے معاملے کو پکڑ کر آپ مجھے بے نقط سنا رہے ہیں صاحب، یہ یاد رکھنے کی بات ہوگی۔''

''معاملے، معمولی یا غیر معمولی نہیں ہوتے سائیں، ٹائمنگ معمولی یا غیر معمولی ہوتی ہے۔ تمہارا لڑکا ابھی عمر میں چھوٹا اور ناتجربے کار ہے۔ اس نے معاملہ چھیڑنے کے لیے غلط ٹائمنگ کا انتخاب کیا...... ارے بابا، وہ جو ڈور ہلا رہا ہے اُس کی عمر پر نہ جاؤ اس کے وژن پر غور کرو، اس کی پرسنیلٹی کا جائزہ لو اس کی ٹائمنگ پر نظر رکھو۔ وہ ان میں سے ہے جو پہلے جان ہتھیلی پر رکھتے ہیں پھر آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہیں۔ ایسے لوگ کھیلنے کو چاند مانگیں تو معمولی بات ہے، ایسے لوگ تو کھیلنے کو سورج بھی مانگ لیتے ہیں کیونکہ انہیں ہتھیلیاں جل جانے کا کوئی خوف نہیں ہوتا، وہ تو بس ضد پر آجاتے ہیں اور اَڑ جاتے ہیں۔''

''یہ تو سراسر بلیک میلنگ ہے۔''

''تم مت بولو بیچ میں چھوٹا سائیں، جب میں اور تمہارا باپ آپس میں بات کر رہے ہوں تو بیچ میں بولنے کی ضرورت نہیں، بس سنتے جایا کرو جو ہم بات کرتے ہیں۔''

''گویا میں سمجھوں آپ مجھے حکم دے رہے ہیں؟''

''حکم سمجھو، درخواست سمجھو، التجا سمجھو، جو سمجھ رہے ہو اس پر عمل کر ڈالو، لڑکی کو اُدھر سے نکالو بابا۔''

''واہ صاحب، ایک وہ چھوکرا اور اس کا قبیلہ آپ کو بلیک میل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔''

''اس کا قبیلہ اور وہ نہیں ''وقت'' بلیک میل کرنے میں کامیاب ہو گیا سمجھو، ابھی پارٹی کے سمندر میں طوفان اٹھانے کی گنجائش نہیں ہے بابا، جو الزامات پہلے سے لگ رہے ہیں وہ تمہارے سامنے ہیں، پارٹی کی پوزیشن کمزور پڑ رہی ہے۔ ایسے میں اسے یوں چیلنج دے کر کھلا چھوڑ دیا گیا تو بڑا مسئلہ ہو سکتا ہے، میں نے کہا ناں وہ جان کو ہتھیلی پر پہلے رکھتا ہے، آنکھوں میں آنکھیں بعد میں ڈالتا ہے۔''

''آپ تو دراڑیں پیدا کرنے کے ماسٹر ہیں صاحب، اس کے قبیلے میں اس کی برادری میں ڈالیں نان شگاف چند عدد۔''

''تم کیا سمجھتے ہو...... ہمارا دماغ نہیں سوچتا یا کام کرنا چھوڑ گیا ہے، اس برادری، اس خاندان کی تاریخ پر غور کیا ہے کبھی...... کہاں، کہاں تک گرہوں پر گرہیں ڈال رکھی ہیں۔ رشتوں ناتوں کی اس خاندان کے گرگوں نے، کیا اسٹیٹ، کیا بیوروکریسی، کیا ٹیکنوکریسی ہر جگہ ان کے بندے بیٹھے ہیں اور آپس میں کمال کا اتحاد ہے ان کا۔ جب ہی تو بولتا ہوں ان پر ہاتھ مت ڈالو، ٹائمنگ غلط ہے، ابھی تو اِدھر سے بھی ہاٹ لائن پر پریشر پڑنے لگا ہے اس کے واسطے بابا، مجھے اپنے قدم اس ولدل میں ڈالنے پر مت مجبور کرو۔''

''وہ ہر جگہ حاوی ہیں اور ہم جیسے کتے تو شاید کہیں موجود ہی نہیں ہیں جیسے، پارٹی کی خاطر کہاں، کہاں اور کیسے، کیسے پنگے نہیں لے رکھے ہیں میں نے، ابھی تو مولویوں کے فتوے ختم ہونے میں نہیں آرہے، جان ہتھیلی پر تو میں بھی لیے پھرتا ہوں اس کی قدر نہیں آپ کو۔''

''وہ تو خیر تمہاری اپنی غلطی ہے بابا تمہیں اپنا big mouth کھولتے ہوئے آگے پیچھے کی فکر رکھنی چاہیے تھی کہاں کھڑے ہو کر بڑے، بڑے بول رہے ہو، اس سے تو خیر تمہیں خود نمٹنا ہوگا لیکن لڑکی کے معاملے میں retreat (واپس اپنی جگہ پر آنا) کر جاؤ بابا، ان کی ڈیڈ لائن ختم ہونے والی ہے۔''

''ایسا ہے تو پھر لڑکی رہے گی نہ اس کا نام ونشان۔ پھر کہاں سے برآمد کرے گا اور کیسے، لڑکی ایک گھنٹے کے اندر ختم ہو کر ایک ایسی مٹی میں دفن ہو جائے گی جس کا نشان بھی نہیں ملے گا، چیلنج ہے تو پھر چیلنج ہے۔''

''واہ ڈیڈی، کیا کمال کا خیال ہے۔''

''شٹ اپ بابا، شٹ اپ بوتھ آف یو۔'' غراہٹ کی آواز ابھری۔

''ابھی تک تو میں پیار محبت کی زبان میں بات کر رہا تھا۔ بات کرتے ہیں چیلنج کی، ٹیڑھی کھیر کو سیدھے ہاتھوں سے نکالنے کا فن ہم سے زیادہ کون جانتا ہوگا، تم تو ابھی اس عمارت کے صدر دروازے تک بھی نہیں پہنچو گے اور لڑکی دارالخلافہ کی طرف روانہ بھی ہو چکی ہوگی، اس عمارت کی بھول بھلیوں سے تو تم بھی اتنے واقف نہ ہو گے جتنا یہاں بیٹھے ہم...... بات کرتے ہیں چیلنج فیس کرنے کی۔''

''آپ ساری کی ساری چڑھائی ہم باپ بیٹوں ہی پر کیے جا رہے ہیں صاحب۔''

''ہم چڑھائی نہیں کر رہے صرف تم کو سمجھا رہے ہیں، وقت کے تقاضے کو سمجھو، ابھی وقت نہیں ہے لیکن وقت آئے گا ضرور، تم کیا سمجھتے ہو ہم یوں بلیک میلنگ کو ٹھنڈے پیٹ ہضم کر جائیں گے، نہیں ایسا نہیں ہوگا لیکن ابھی وقت نہیں ہے، وقت آنے دو پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔''

''لڑکی کو یوں چھوڑ دینے سے بہت سے بکس کُھل جائیں گے صاحب۔''

''بیٹا تمہارا دیکھو، کیسے تلملا کر پہلو بدل رہا ہے، اس کا بس نہیں چل رہا تم کو بھی گولی مار دے اور ہم کو بھی...... ارے بابا اس کو سمجھاؤ وقت کے تقاضوں کو سمجھنا سیکھے۔ ابھی اگر وقت مہرزاد خان کے ہاتھ میں ہے تو کبھی اِس کے ہاتھ میں بھی ہوگا، کبھی طاقت صرف سفید فاموں کے اپنی بیک پر ہونے میں نہیں چلتی، لوکل حقائق بھی کاؤنٹ کرتے ہیں مائی ڈارلنگ بھتیجے، جاؤ شاباش میرا بچہ، اپنے بندوں سے بولو لڑکی کو ان بھول بھلیوں سے نکال کر اسی جگہ پہنچا دیں جو بتائی گئی ہے، آگے مہرزاد خان جانے اور اس کا کام۔''

''this is extremely unfair انکل، ہم تو آپ کے بھروسے پر رسک لینے والے لوگ ہیں۔''

''شوق سے لیا کرو بابا، منع کس نے کیا ہے رسک لینے سے مگر اپنے ہی بندوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے سے بچو، یہ جو پارٹی کے اندر کھاتے کی کشمکشیں ہیں ناں، یہ surface پر آنے میں ذرا بھی وقت نہیں لگتا۔ آج کل میڈیا کو جو چھوٹ دے گئے ہیں ناں ہم سے پچھلے، اس چھوٹ کو لگام ڈالنا ہمارے لیے سب سے زیادہ چیلنجنگ ثابت ہو رہا ہے۔''

''اوپر سے اسی میڈیا کی پوری لگام آپ نے اسی مہرزاد خان کے ہاتھ میں پکڑا دی۔''

''ارے بابا، اپنے تئیں بہترین فیصلہ کیا تھا ہم نے، وہ اس منسٹری کے لیے سب سے زیادہ موزوں امیدوار تھا اور اس نے یہ کوہِ عظیم سر کر بھی جاتا ہے مگر ہمیں کیا پتا تھا اُدھر وہ حلف لیتا ہے اِدھر تم اسی کے ساتھ کیڑی کاڑا کھیلنے لگ جاتے ہو۔ ہمیں تو خود تم نے الجھن میں ڈال دیا۔ اُدھر تم نے اس کی عورت اٹھائی، اِدھر وہ ہم سے پوچھنے پہنچ گیا کہ بول میری مچھلی کتنا پانی!''

''انکل اسی کے باپ نے یہ لڑکی اٹھوائی تھی پہلی بار۔''

''اس قصے کو گول کرو بابا، باپ نے اٹھوائی تھی یا چاچا نے، ابھی تو وہ باپ بنا ہمارے سر پر بیٹھا ہے، تم ویسا کرو جیسا تم کو بولا ہے اور تم بڑا صاحب مولویوں کے فتوے نمٹا لو جلدی سے، کل تک تمہارا کوئی واضح بیان پریس میں آجانا چاہیے نہ اتنے محاذ اکٹھے کھولا کرو بابا کہ ہمیں فیس کرنے مشکل ہو جائیں۔'' وہ اپنے تئیں بات مکمل کر چکے تھے۔

''چلو شاباش، ابھی ایک سفیر صاحب سے ملاقات کا وقت ہو رہا ہے پھر ملتے ہیں کسی دن جب ہم آتے

ہیں صوبائی دارالحکومت، وہاں اس بار ذرا ڈنرز یادہ شاندار ہونا چاہیے۔''

''ارے بابا، منہ لٹکا کر مت جاؤ، شاباش منہ سنبھال کر نکلو، اسٹاف کے بندے تو سیکنڈوں میں منہ کے زاویوں سے اندر کی بات سمجھ جاتے ہیں..... ہاں یوں بہتر ہے، شاباش، شاباش.....''

☆☆☆

مہرزاد خان کے انداز میں ایک غیر معمولی تبدیلی یشل کے لیے حیران کن تھی اگرچہ یہ غیر معمولی تبدیلی اتنی نامحسوس سی تھی کہ مہرزاد کے پرسنل اسٹاف میں سے کسی اور نے اس کا ذکر نہیں کیا تھا، گویا کسی اور کو وہ محسوس بھی نہیں ہوئی تھی مگر وہ یشل رئیس تھی جو اپنی پیشہ ورانہ خدمات بجالانے اور اس کے عوض بھاری معاوضہ بطور تنخواہ حاصل کرنے کے علاوہ بھی ایک خاص دلچسپی کی وجہ سے مہرزاد خان کے پرسنل اسٹاف کا حصہ تھی۔ یقیناً یہ خاص دلچسپی مہرزاد کی شخصیت کی اس کشش کی وجہ سے ہی تھی جس بنا پر نیوز چینلز پر صبح سے رات گئے تک جتنے بھی نیوز بلیٹن نشر ہوتے تھے ان میں ایک آدھ خبر مہرزاد خان کے بارے میں ضرور ہوتی تھی۔ اپنی وزارت کے حوالے سے خبروں میں رہنا بھی اگرچہ معمول کا حصہ تھا لیکن یقیناً اس کی شخصیت میں کچھ ایسا سحر بھی تھا جو وہ خبروں کا حصہ بنا رہتا تھا۔

''آپ پریشان ہیں، آپ کو کوئی نہ کوئی بات ضرور ہانٹ کر رہی ہے۔'' اس دوپہر لنچ کے دوران اسی شام کو ہونے والی پریس کانفرنس کے نوٹس پر بات کرنے کے بعد یشل نے اپنا قلم ڈائری کے ایک صفحے پر اٹکا کر ڈائری بند کرتے ہوئے اچانک پوچھا۔

''اور تمہیں یہ سوچ ہانٹ کر رہی ہے کہ مجھے کیا بات ہانٹ کر رہی ہے؟'' مہرزاد نے ہاتھ میں پکڑا کانٹا پلیٹ میں رکھتے ہوئے اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

''میں نے سنا ہے کہ آپ کا رابطہ حال ہی میں اُن سے ہوا ہے جن سے رابطہ ہونے کی خبر نشر ہونا آپ کی شامت لا سکتی ہے۔'' یشل کے لہجے میں اعتماد تھا اور یقین بھی۔

''اچھا.....!'' اس نے متاثر ہو جانے کے سے انداز میں سر ہلایا۔ ''پھر تو تم خوب باخبر ہو۔''

''اگرچہ مجھے ایسا کہنے کا کوئی حق نہیں لیکن میری دلی خواہش ہے کہ ان رابطوں کا اور آپ کے ہانٹ ہونے کا تعلق زرنگار سے نہ ہو۔'' یشل اسی پُراعتماد انداز میں بولی اور پھر اس نے لمحے بھر کا توقف کرتے ہوئے اپنی بات پر مہرزاد کے ردِعمل کا اندازہ کرنے کے لیے اس کی طرف دیکھا۔ ''زرنگار جو دراصل میرال صلاح الدین ہے۔''

یشل کی بات کے ردِعمل میں مہرزاد خان نے چند ثانیوں کے لیے آنکھیں بند کرلیں اور پھر آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''اور اگر حقیقت تمہاری دلی خواہش کے برعکس ہو تو؟.....'' اس نے سوال کیا۔

''تو.....'' یشل نے ٹیبل کی سطح پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا..... ''تو.....'' پھر اس نے مہرزاد کی طرف دیکھا۔ ''تو مجھے یقیناً بہت افسوس ہوگا۔''

''وہ کیوں.....؟'' وہ بدستور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''وہ اس لیے کہ معاف کیجیے گا اتنی قد آور شخصیت پر ایسا چھوٹا اور گھٹیا سا الزام لگا اچھا نہیں لگتا۔'' یشل نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''آپ سماجی ویب سائٹس پر ہونے والے کمنٹس اور ٹوئیٹس کو فالو نہیں

کر رہے غالباً، زرنگار یا میرال جو کوئی بھی وہ ہے اس کے حوالے سے آپ پر الزام لگائے جا رہے ہیں۔ کیچڑ اچھالی جا رہی ہے کہا جا رہا ہے کہ آپ نے اسے اغوا کر رکھا ہے، آپ نے اسے اپنی داشتہ بنا رکھا ہے۔ وہ دن قریب نظر آ رہا ہے جب مخالفین اسی بات کو لے کر آپ کے خلاف تقریریں کریں گے اور نعرے لگائیں گے۔'' تیزی سے اپنی بات مکمل کرنے کے بعد یشل کو محسوس ہوا اس کی سانس معمول سے زیادہ تیزی سے چل رہی تھی۔ مہرزاد خان کے سامنے اتنے بڑے سچ کو بغیر کسی ڈھکے چھپے رنگ میں کہنے کے بجائے صاف، صاف کہہ دینا بہت ہمت کی بات تھی اور یہ جرأت وہ کر چکی تھی۔

''اور اگر میں یہ کہوں یہ الزام مجھے اعزاز محسوس ہوتے ہیں، یہ کیچڑ پھولوں کی طرح اچھلتی اور مجھ پر برس جاتی ہے تو تمہیں کیسا لگے گا؟'' وہ نیپکن سے منہ صاف کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے یقین نہیں آئے گا۔'' یشل نے سر ہلایا۔

''اور مجھے تمہاری بے یقینی پر افسوس ہوگا'' وہ ہلکا سا مسکرایا اور نیپکن واپس پلیٹ میں رکھتے ہوئے بولا۔ ''کسی بات کے کھل جانے اور اس پر ہونے والی چہ گوئیوں سے اسی وقت تک ڈر لگتا ہے جب تک وہ ڈھکی چھپی ہوں، ایک زبان زد عام راز پر سرگوشیاں کرتے ہوئے لوگ کن انکھیوں سے آپ کی طرف دیکھیں اور ان کی لرزتی انگلیاں وقفے، وقفے سے آپ کی طرف اشارہ کریں تو آپ کو بے اختیار ہنس دینا چاہیے کیونکہ اس کے سوا آپ فوری طور پر کچھ کر ہی نہیں سکتے۔''

''آپ.....!'' یشل نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ کو معلوم ہے یہ صرف الزام ہی نہیں اسکینڈل ہے، اسکینڈل..... اسکینڈل جو بڑے، بڑے بادشاہوں کے تخت تک الٹا دیتے ہیں۔''

"اوّل تو میں کسی تخت کا نشین ہوں ہی نہیں، اگر ہوتا تو کیا تم سمجھتی ہو کہ اس کے الٹ جانے کا خوف مجھے حقیقت سے منہ موڑنے پر مجبور کر سکتا تھا؟" مہر زاد نے یشل سے سوال کیا۔

"پتا نہیں......" یشل نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس معاملے کے ifs اور buts سے کیا غرض ہو سکتی ہے لیکن جو میری دلی خواہش ہے اس کا ذکر میں نے اس گفتگو کے آغاز ہی میں کر دیا تھا۔"

مہر زاد خان کچھ دیر تک دلچسپی سے یشل کی طرف دیکھتا رہا اور پھر مسکرا دیا۔

"تم فکر مت کرو کیونکہ تم سے زیادہ کسے معلوم ہوگا کہ میں جانتا ہوں اپنے غلط کو صحیح کیسے کیا جاتا ہے۔"

"میری دعا ہے کہ آپ وقت پر ہی ایسا کر لیں۔" یشل نے بھی اس کی طرف دیکھا۔

"تم فکر مت کرو۔" اس نے ایک مرتبہ پھر کہا اور یشل کے بنائے نوٹس پڑھنے لگا۔

☆☆☆

"ابھی تک تو میں نے تیری بہنوں کو اِدھر آنے سے روک رکھا تھا نادر...... لیکن اگلے دن وہ... جو بھاگی بھاگی آئی تھی ناں شمع، اس نے جا کر مہناز سے جڑ دیا ہے کہ تو چینی چپٹی کو گھر لے آیا ہے، ابھی مہناز نے مجھے فون کر کے پوچھا ہے، میں ہوں یا ہاں کر کے ٹالتی تو رہی ہوں پر دیکھ لینا ابھی فوجیں پوری تیاری کے ساتھ اِدھر حملہ کرنے آ دھمکیں گی۔" نادر کی اماں نے ٹرے میں بکھری خشخاش صاف کرتے ہوئے نادر کو خبر دی۔

"میں لے آیا ہوں اسے گھر؟" نادر اس صاف الزام پر حیرت سے بولا۔ "آپ بھول گئیں، اسے آپ نے گھر میں آنے اور رہنے کی اجازت دی تھی، اپنی خوشی اور اپنی مرضی سے۔"

"ہاں، ہاں......!" اماں نے سر ہلاتے ہوئے اقرار کیا۔ "مگر تو مجھے بیچ میں نہ ڈالنا، مجھے رہنے دینا، وہ ساری پوچھیں گی تو کہہ دینا تو خود لے آیا تھا، ماں بے چاری کیا کہتی...... چپ ہو گئی۔" وہ صاف پہلو بچانے کے چکر میں تھیں۔

"نہیں، نہیں، یہ نہیں ہو سکتا، آپ مجھے پھنسا کر خود کو نہیں بچا سکتیں۔" نادر نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ اسے اپنی بہنوں کے مزاج اور واویلے کی خوب خبر تھی اور اس تصور ہی سے وہ کانپ اٹھا تھا کہ وہ ساری اکٹھی ہو کر اِدھر آ رہی تھیں۔

"میں تو گھر واپس آیا تھا اس روز تو آپ کو اس سے شیر و شکر ہوئے دیکھ کر خود بھی حیران رہ گیا تھا، مجھ پر الزام کیوں دھر رہی ہیں۔" اس نے احتجاج کیا۔

"یہ بتا جب سے یہ آئی ہے گھر میں تجھے گھر، گھر نہیں لگنے لگا؟" اماں نے خشخاش چھوڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"لگنے لگا ہے......" نادر نے ان کے سوال کی وجہ جاننے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

"وقت پر کھانا، کپڑے، جوتے، سب تیار نہیں ملتا؟" انہوں نے دوسرا سوال کیا۔

"ملتا ہے۔" نادر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

"تو پھر کیا ہے جو اس سکھ چین کے لیے ہی تو تھوڑی دیر بہنوں کی چیں چیں سن لے گا۔" ماں نے سر پر دوپٹا رکھتے ہوئے کہا اور اس کا کنارہ منہ میں دبا کر ہنسنے لگیں۔ "مجھے ایک طرف ہی رہنے دینا، انہیں خوش کرنے کے لیے میں بھی ان کے ساتھ دو گھڑی ہوں، ہوں، ہاں، ہاں کر لوں گی اپنی ہنسی روکتے ہوئے انہوں نے کہا۔" ان بے چاریوں نے کر کیا لینا ہے، بول بال کر اپنے، اپنے گھروں کو واپس چلی جائیں گی پھر

تینوں ہوں گے اور ہمارا سکھ چین۔" وہ ایک بار پھر ہنسنے لگیں۔

"خدا کا واسطہ ہے اماں، مجھے ان کے سامنے یوں تنہا مت چھوڑیے گا، میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔" نادر نے بوکھلا کر کہا۔

"ہائے...... گھڑی دو گھڑی کی ہی تو بات ہوگی، انہوں نے تجھے کوئی گولی تو نہیں مار دینی۔" ان کے نزدیک یہ معمولی کام تھا۔

"ٹھیک ہے۔" نادر ماں کی بے نیازی اور خود کو... بہنوں کی گولا باری سے محفوظ رکھنے کے منصوبے پر ناراض ہوتے ہوئے بولا۔ "میں ایسا کرتا ہوں زوئی سے کہتا ہوں وہ یہاں سے چلی جائے کیونکہ آپ جنہوں نے اسے گھر میں داخل کیا تھا آپ ہی اس سے لاتعلقی کا اعلان کر رہی ہیں۔"

"ہائے، ہائے، میں نے یہ کب کہا؟" وہ گھبرا گئیں۔

"نہیں ایسا ہی ہوگا اب......" نادر نے سر ہلایا۔ "بہنوں کے آنے سے پہلے، پہلے زوئی کو بھیجتا ہوں میں یہاں سے۔" وہ اپنے کمرے کی طرف جانے کے لیے اٹھا۔

"ہاہائے نادر تو، تو سیریس ہی ہو گیا۔" اماں ٹرے چھوڑ اس کے پیچھے آ گئیں۔

"میں نے کوئی سچ مچ تھوڑی ایسا کرنا تھا، میں تو مذاق کر رہی تھی۔" وہ اس کا بازو پکڑ کر اسے پیچھے کھینچتی ہوئی بولیں۔

"چھوڑیں اماں۔" نادر نے اپنا بازو چھڑوانے کی ہلکی سی کوشش کی۔ "ایسے سکھ چین کا کیا فائدہ جس کے بدلے بہنیں ناراض ہو جائیں اور ماں بے نیاز۔"

"نہیں ہوتی ماں بے نیاز۔" وہ اس کا بازو پکڑے واپس وہیں لے آئیں جہاں سے وہ اٹھا تھا۔ "میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ یہ دیکھ کر کہ تیری، میری دونوں کی صلاح سے وہ گھر میں داخل ہوئی ہے کہیں اِدھر آنا ہی نہ چھوڑ جائیں وہ ساری کی ساری تو، ہم دونوں کچھ عقل کرتے ہیں تھوڑی دیر کے لیے اپنا، اپنا گروپ بنا لیتے ہیں۔" نادر نے...... ان کی بات سن کر ایک مرتبہ پھر ناراضی سے سر جھٹکا۔

"اس بے چاری کو کاہے کو پریشان کرنے چلا تھا تو۔" انہوں نے لہجہ بدلا۔ "وہ تو دیس سے پردیسی ہوئی بیٹھی ہے پہلے ہی، کیا پاکستان کی بہوئیں ہوں گی جو وہ ہے، پیار، محبت، خدمت والی۔" ان کے لہجے میں زوئی کے لیے پیار امڈا۔ "بس ناک اس کی بڑی پھینی ہے، کبھی کبھی مجھے تیرے بچوں کا خیال آ جاتا ہے تو وہم کرنے لگتی ہوں، محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلنے جائیں گے تو وہ بھی کہیں گے، وہ دیکھو پھینے آئے ہیں کھیلنے...... بے چارے کیا محسوس کریں گے۔" وہ اداس ہوتے ہوئے بولیں۔ نادر کو اماں کی یہ اداس شکل دیکھ کر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اسے دیکھ کر اماں بھی ہنس دیں۔

"اس کو کہہ اپنی زبان میں کوئی کوفتے، پلاؤ پکا لے تیری بہنوں کے لیے۔" وہ ہنستے ہوئے بولیں۔ "اس کے ہاتھ کا پکا کھانا کھا کر ہی شاید تیری بہنوں کی زبانوں کا تیل ختم ہو جائے، ان کے دلوں میں ٹھنڈ پڑ جائے۔" انہوں نے نادر کے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں زوئی بیٹھی تھی۔

"وہ پہلے ہی کسی مسئلے کی وجہ سے پریشان ہے اماں۔" نادر، زوئی کی طرف دھیان جانے پر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "دعا کریں اس کا مسئلہ حل ہو جائے۔ پھر چاہے آپ اور آپا لوگ اسے کوئی بھی کام کہیں وہ منع نہیں کرے گی نہ ہی برا منائے گی۔"

"پتا ہے مجھے یہ پاکستانی اسے اِدھر پاکستان میں رہنے نہیں دے رہے، اجازت نہیں مل رہی ہے اسی لیے پہلے وہ تفتیشوں والے آتے تھے ناں۔" اماں سنجیدہ ہوتے ہوئے بولیں۔

"بس جو بھی ہے آپ دعا کریں اس کے لیے۔" نادر ان کی غلط فہمی کو درست کیے بغیر بولا۔

"تو نے بھی چوروں کی طرح اس سے نکاح کر کے غلط کیا، جو کرنا ہی تھا نکاح تو سینہ تان کر کرتا، ڈرنے والی کیا بات تھی۔" وہ اپنی دُھن میں اسے ڈانٹنے لگیں۔ "اب کوئی آیا ناں اس سے تفتیش کرنے تو میں نے ڈنڈا لے کر کھڑے ہو جانا ہے کہ کیا ہے نکاح میرے بیٹے نے، پکا کاغذ ہے نکاح کا ہمارے پاس، دیکھتی ہوں کیسے کوئی نکالتا ہے اسے پاکستان سے۔"

"پاکستان کی چھوڑیں، ابھی فی الحال تو اس گھر کی بات کریں، جہاں سے اسے آپ کی بیٹیاں نکالنے آرہی ہیں۔"

"واہ جی واہ...... کیسے نکالنے آرہی ہیں۔" اماں کے جذبات ایک دم زوئی کی محبت میں ڈوب چکے تھے۔ "آنے دے، تو بس خاموش رہنا، میں خود ہی نمٹ لوں گی ان سے؟" انہوں نے چیلنج قبول کرنے کے سے انداز میں کہا۔ نادر بے اختیار مسکرادیا۔ سادہ لوح اماں باتوں ہی باتوں میں یوٹرن لے گئی تھیں۔

☆☆☆

"میں آپ کو بتا رہا ہوں ڈیڈی، یہ میں نہیں ہونے دوں گا۔"

"آرام سے، آرام سے مائی ڈیر سن، جہاں اتنی باتیں سمجھ لی ہیں وہاں یہ بھی سمجھ لو کہ کبھی، کبھی بھری میز سے خالی پیٹ بھی اٹھ جانا پڑتا ہے۔"

"جی نہیں، میں ایسی باتیں سیکھنے کے موڈ میں ہرگز نہیں ہوں۔"

"پیٹ بھر لینے کے بعد چاہے پیچھے سے آئی بندوق کی گولی بھی کیوں نہ کھانی پڑ جائے۔"

"نہ کریں ڈیڈی، ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ کیا میں نہیں جانتا کہ آپ تو خالی میز سے بھی پیٹ بھر کے اٹھنے والوں میں سے ہیں۔"

"ڈونٹ بی سو لاؤڈ مائی سن، ٹھنڈی کر کے کھانے کی عادت ڈالو، ٹھنڈی کر کے۔"

"مجھے یہ سب نہیں سننا ڈیڈی، میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ میں اس الو کے...... کے لیے لڑکی کو نہیں چھوڑوں گا۔"

"اس طرح کرو گے تو میرے لیے سوائے مشکلات کھڑی ہونے کے اور کچھ نہیں ہونے والا، لڑکی بھی ہاتھ سے دینی پڑے گی اور یہ عہدہ بھی جائے گا۔"

"میں جیسے جانتا نہیں کہ آپ کو اپنا نیچے والا ہاتھ اوپر کرنے کا فن کیا خوب آتا ہے۔ لیسنت والا ایشو بھولا تو نہیں میں، تب بھی سب دھمکیوں کے باوجود بڑے صاحب نے آپ کو ہی بیک کیا تھا۔"

"تم ابھی کچھ بھی نہیں جانتے مائنڈ یو؟"

"مجھے تو وہ وقت بھی نہیں بھولا جب آپ کی ضد پر پورے صوبے کی کمان آپ کے ہاتھ میں دے دی گئی تھی۔ چھوٹا صاحب کو خلاص کر کے، میں کیا نہیں جانتا ڈیڈی...... بڑا صاحب تو خود آپ کا مرید ہے، آپ جو دانہ اسے ڈالتے ہیں اس کے پیچھے دم ہلاتا آتا ہے۔"

"تم نے اس کی بات نہیں سنی تھی، ٹائمنگ کی بات کر رہا تھا وہ، ٹائمنگ مائی سن، ٹائمنگ غلط ہو جائے تو

سارا کھیل بگڑ جاتا ہے۔"

"آپ اسے وہی دانہ ڈالیں ایک بار پھر، اس کو غلط ٹائمنگ بھی صحیح نظر آنے لگے گی اور اس سردار زادے بجے کی دم پر بھی پیر پڑ جائے گا۔"

"نہ نہ...... مائی ڈیئر سن، اس بار دانہ کام آئے گا نہ ڈنکا، اس بار تو بھری میز سے خالی پیٹ اٹھنا ہی پڑے گا، مجید سے بولو، لڑکی کو وہاں پہنچا دے جہاں کہا گیا ہے۔"

"ڈیڈی پلیز، my prestige is at stake"

"this time you will have to sacrifice your prestige"

"نیور...... نیور ایور۔"

"مجید جو کام تمہیں ٹیکسٹ کروایا تھا ہوا یا نہیں؟"

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ، ڈیڈی، آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔"

"go ahead Majeed، تم پہلے ہی لیٹ ہو چکے ہو۔"

"رکیں ڈیڈی، فون مجھے......"

"go to hell you along with your mother"

"میری مدر کی بات مت کریں ڈیڈی، وہ جہنم میں چلی گئیں تو آپ کا دانہ بھی ختم ہو جائے گا اور ڈنکا بھی، رہا میں تو لیس آئی ایم گوئنگ، اس بار مجھے آپ کو بائی پاس کرنا ہی پڑے گا۔"

"go to hell, I said go to the hell"

☆☆☆

"اس لڑکی کے سلسلے میں مزید کچھ پتا چلا؟" بینش نے دوپہر میں ہونے والی پروجیکٹ کرٹ (crit) کے لیے تیاری کی غرض سے اپنے پروجیکٹ سے متعلق دانیال کے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے اچانک پوچھا۔

"ایکسٹرنل تم سے یہ سوال تو کبھی نہیں پوچھے گا۔" دانیال مسکرایا۔

"یہ سوال تو میں تم سے کر رہی ہوں۔" بینش نے جواب دیا۔

"ایکسٹرنل سے سوال نہیں کرتے، بس اس کے سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔" دانیال نے نرمی سے کہا۔

"میں نے اسی سوشل ویب سائٹ پر سردار زادہ مہر زاد خان کے خلاف ایک پیج بنا دیکھا ہے، جس میں اسے گالیاں دی جاتی ہیں، اس کے کارٹونز بنا کر لگائے جاتے ہیں، اسی پیج پر اس کے زرنگار سے تعلق کا بھی ذکر کیا جاتا ہے، اس لیے پوچھا۔" بینش نے سادگی سے کہا۔

"یہ تو ایک ٹرینڈ ہے۔" دانیال نے ہاتھ میں پکڑے کاغذ میز پر پھینکتے ہوئے کہا۔ "جو بھی بندہ لائم لائٹ میں آجاتا ہے، اس کے ساتھ یہ ہی سلوک کیا جاتا ہے۔"

"لیکن سردار زادہ تو اس سلوک کا مستحق ہے۔" بینش نے جوش سے کہا۔

"وہ تو ہے لیکن میں اس طرح کی کردار کشی کے خلاف ہوں۔" دانیال آہستہ قدموں سے چلتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

''جب عوام کو اپنا غصہ نکالنے کا کہیں اور مناسب موقع نہیں ملے گا تو وہ یہی کچھ کریں گے ناں'' بینش کے پیچھے آئی۔

''غصہ نکالنے کا موقع؟'' دانیال نے مڑ کر بینش کی طرف دیکھا۔ ''تم جانتی ہو میں نے مہرزاد خان کی شخصیت کے بارے میں خاصی ریسرچ کی ہے اور مجھے ایسا محسوس ہوا ہے کہ وہ آج کل کے باقی سیاست دانوں سے بہتر شخص ہے۔''

''وہ کیسے؟'' بینش کو حیرت ہوئی۔

''پتا نہیں..... '' دانیال نے شانے اچکاتے ہوئے کہا اور گردن سیدھی کرتے ہوئے سامنے دیکھنے لگا۔ ''میں اس کی شخصیت میں ابھی تک کوئی بڑا فالٹ پکڑ نہیں پایا ہوں، وہ ذہین ہے اور واقعی کچھ کر گزرنا چاہتا ہے۔''

''ہو سکتا ہے۔'' بینش نے بھی اسی سمت دیکھتے ہوئے کہا جدھر دانیال دیکھ رہا تھا..... ''مجھے ان چیزوں کا زیادہ سمجھ نہیں، میں نہیں جانتی کہ ایسی ریسرچ کیسے کی جاتی ہے جس سے کسی شخصیت کے اچھے یا برے ہونے کا پتا چل سکے۔''

''اچھی بات ہے کہ تم نہیں جانتیں۔'' دانیال نے کہا۔ ''نہ جاننا بھی ایک نعمت ہے۔''

''تم اب میرا مذاق اڑا رہے ہو۔'' بینش نے بے اختیار کہا۔

''ہرگز نہیں.....'' دانیال نے سر ہلایا۔ ''مجھے تمہاری یہ کوالٹی ہی سب سے زیادہ پسند ہے، تم خواہ مخواہ بہت کچھ جان لینے کے پیچھے نہیں پڑ جاتیں۔''

''یہ کوالٹی ہے؟'' بینش نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''بہت بڑی کوالٹی ہے۔'' وہ مسکرایا۔ ''اچھا یہ بتاؤ، کیا تم نے سوچا ہے کہ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد تم نے کیا کرنا ہے؟''

''نہیں.....'' بینش نے فوراً سر ہلایا۔

''کیوں.....؟''

''یہاں آنے سے پہلے بھی میں نے نہیں سوچا تھا کہ میں یہاں کیا کرنے آئی ہوں، میں اپنے تئیں یہاں پوٹری سیکھنے آئی تھی۔ مجھے اگر میری ایک دوست کورس لائن کے متعلق گائڈ نہ کرتی تو شاید میں ایک آدھ مہینے کے بعد ہی ڈیپارٹمنٹ چھوڑ چکی ہوتی۔''

''کیوں تمہارے گھر میں، تمہارے اردگرد تمہیں گائڈ کرنے والا کوئی نہیں تھا کیا؟''

''نہیں.....'' بینش نے سر ہلایا۔ ''میرے گھر میں میری اماں ہیں جنہوں نے اسکول کی شاید صرف چند جماعتیں ہی پڑھ رکھی ہیں، میرے دو بھائی ہیں جو ایف اے سے آگے پڑھ نہیں سکے اور میرے اردگرد ... جیسے لوگ رہتے ہوں گے ان کا اندازہ تمہیں وہ علاقہ دیکھ کر ہو ہی چکا ہوگا جہاں میں رہتی ہوں۔'' اتنے عرصے میں پہلی بار بینش میں دانیال کے سامنے اپنے پس منظر کے بارے میں سب کچھ درست بتا دینے کا اعتماد پیدا ہوا تھا۔

''میں جانتا ہوں.....'' دانیال کے جواب نے اسے حیران کر دیا۔ ''اور تمہاری اسی سادگی اور purity کی وجہ سے ہی تو تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔'' بینش نے حیرت سے دانیال کی طرف دیکھا۔ ''اور اسی وجہ سے آج کل میں جس اینگل سے تمہارے بارے میں سوچنے لگا ہوں وہ میں تمہیں بتا دوں تو شاید تمہیں یقین نہ آئے۔''

اس نے ایک ایسی بات اتنی آسانی اور سہولت سے کہہ دی جو بینش کے لیے بہت بڑی تھی۔

''کس اینگل سے؟'' بینش نے اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے معلوم نہیں کہ تمہارے گھر والے مجھے accept کریں گے یا نہیں..... میرے اور تمہارے لائف اسٹائل میں بہت فرق ہے اس لیے مجھے یقین نہیں کہ وہ ایسا کر سکیں لیکن میں ایک بار ضرور تمہارے گھر جا کر تمہارے گھر والوں سے تمہیں اپنے لیے مانگنا چاہتا ہوں۔''

بینش کی نظروں کے سامنے ڈیپارٹمنٹ کے اندر داخل ہونے کا راستہ تھا، طالب علموں کے چھوٹے بڑے گروپ تھے جو ادھر اُدھر گھوم رہے تھے یا جہاں جگہ ملی بیٹھے ہوئے تھے، پیڑ، درخت اور پودے تھے، کچھ دیر پہلے یہ منظر اسے صاف اور واضح نظر آ رہا تھا لیکن دانیال کی بات سن کر اس کی نظروں کے سامنے کا یہ منظر دھندلا ہونے لگا تھا۔ سب رنگ آپس میں مل کر غیر واضح ہونے لگے تھے۔

''میں معذرت خواہ ہوں بینش، شاید میری بات نے تمہیں پریشان کر دیا لیکن حقیقت میں، میں جو چاہتا ہوں وہ تم سے کہہ دیا، اگر تمہیں برا لگا تو میں شرمندہ ہوں۔'' دانیال نے اس کے چہرے پر صاف نظر آتی بے یقینی دیکھ کر کہا..... بینش کے الفاظ اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے وہ چاہنے کے باوجود کچھ کہہ نہیں پا رہی تھی۔

''اوہ تمہاری کرٹ (crit) کا وقت ہوا چاہتا ہے۔'' پھر دانیال کو خیال آیا۔ ''جاؤ دیر نہ ہو جائے ہمت اور اعتماد سے جواب دینا اللہ کرے سب اچھا ہو جائے۔''

بینش کچھ کہے بغیر اندر کی طرف مڑ گئی۔ ''اور سنو!'' عقب سے دانیال نے کہا۔ ''میری خواہش کو ریجیکٹ کر دینے کا تمہیں پورا اختیار حاصل ہے، اس سے ہماری دوستی پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

اس روز بینش نے اس وقت تک کی بہترین کرٹ (crit) دی تھی۔

☆☆☆

''چلیں بی بی آپ کو یہاں سے لے کر جانا ہے۔'' اس کے سامنے کھڑا شخص اس سے مخاطب تھا۔

''کہاں لے کر جانا ہے؟'' اس نے اٹکتے ہوئے سوال کیا تھا۔

''جہاں لے جانے کا حکم آیا ہے۔'' وہ پہلا شخص تھا جو اسے نہ گھور کر دیکھ رہا تھا اور نہ اس کی نظریں اس کے سراپے کو ٹٹول رہی تھیں۔

''نہ جانے کتنے عرصے سے لے جانے کے حکم ہی آ رہے ہیں، کب تک اور کہاں، کہاں لے جائی جاؤں گی میں؟'' دو دن کی مسلسل قیدِ تنہائی اور اپنے کہیں موجود ہونے کا کوئی سرا ہاتھ نہ آنے نے اس کے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ ان دو دنوں میں وہ سب سے زیادہ مہرزاد خان سے بدگمان ہوئی تھی اور شاید اب زندگی میں اس کا نام بھی سننا نہیں چاہتی تھی۔

''یہ تو میں نہیں جانتا کہ آپ کو آگے کہاں لے جانے کا حکم آئے گا اور پیچھے کیا حکم آتے رہے ہیں، میں تو صرف ابھی موصول ہونے والے حکم کو بجا لانے کا پابند ہوں بی بی!'' اس شخص نے بغیر اس کی طرف دیکھے کہا۔

''جب تک مجھے بتایا نہیں جائے گا، میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی، بہتر ہے کہ مجھے بتا دو یا پھر مجھے گولی مار دو۔'' زرنگار نے اپنی آواز کو مضبوط رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اس کے اس جواب پر اس شخص نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دو دن سے سوئی تھی، نہ ہی اس نے کچھ کھایا تھا، اس نے کپڑے تبدیل کیے تھے نہ ہی بالوں میں برش کیا تھا۔ شکنوں سے بھرپور لباس، بکھرے بالوں اور چہرے پر شدید اضطراب کا

تاثر لیے وہ لڑکی ان حالات اور اس حلیے میں بھی کتنی حسین لگ رہی تھی۔ وہ کوئی اچھا انسان نہیں تھا، نہ ہی
یت تھا لیکن اس حسن کو دیکھ کر نہ جانے کیوں اس کے دل میں کوئی برا خیال نہ آیا تھا نہ ہی بدنیتی نے
نا بغیر کسی وجہ کے اس نے احتراماً اس کے سامنے سر جھکا لیا اور ہاتھ باندھ کر بولا۔

"میں ایسا کوئی کام نہیں کر سکتا بی بی، جس کا مجھے حکم نہ ملا ہو، بہتر تو یہ ہی ہے کہ آپ مجھے حکم بجا لانے کا موقع دیں کیونکہ اس کے سوا میرے پاس کوئی اور چارہ نہیں۔"

"دیکھو میں یوں نہیں جاؤں گی، پہلے بتاؤ کہ مجھے کہاں اور کس کے کہنے پر لے جا رہے ہو؟" وہ سختی سے بولی اب وہ اس کھیل سے بری طرح تنگ آ چکی تھی۔ اب مصیبت کو آ جانا تھا یا ہمیشہ کے لیے ٹل جانا تھا، دونوں صورتوں میں موت یقینی تھی، ایک میں روح کی موت دوسری میں جسم کی موت...... مگر اسے اس کھیل سے نجات حاصل کرنا ہی تھی۔

"مجھے آپ مجبور نہ کریں کہ میں زبردستی کروں کیونکہ یہ مجھے اچھا نہیں لگے گا۔" وہ شخص سر جھکائے ہی بولا۔

"تمہیں یہ تو پتا ہوگا کہ کس نے تمہیں یہ حکم بھجوایا ہے؟" وہ وحشت زدہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"آپ بڑے لوگوں کا "گیم" ہیں بی بی اور میں ایک ادنیٰ سا آدمی ہوں، حکم کہاں سے آتے ہیں اور کون جاری کرتا ہے یہ تو وہی جانیں جو جاری کرتا ہے۔"

"میں، "گیم" ہوں؟" زرنگار نے زیرِ لب دُہرایا۔

"گیم ہوں یا ایم (aim) ہوں بی بی، بات تو ایک ہی ہے، میں بہت زیادہ باتیں تو نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جو ایک بار ان کے گیمز اور aims میں پھنس جاتا ہے اس کا اس سے نکلنا مشکل ہی ہوتا ہے۔"

"ناممکن تو نہیں ہوتا ناں......" زرنگار جیسے ٹرانس کی کیفیت میں بولی۔ "تم مجھے اس زندگی سے نجات نہیں دلا سکتے؟ زندگی سے تو نجات دلا سکتے ہو ناں، زندگی سے نجات کا مطلب جانتے ہو ناں......؟" اس نے اس شخص کی طرف دیکھا۔

"بہت اچھی طرح......" وہ سر ہلا کر بولا۔ "لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ زندگی سے نجات اپنی مرضی سے نہیں ملا کرتی۔ اگر آپ اس زندگی سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہوتیں تو کر چکی ہوتیں، موت ویسے تو بس ایک قدم کے فاصلے پر کھڑی رہتی ہے مگر قدم اس کی طرف بڑھے تو ناں......"

"دیکھو تم مجھے بہت سوں سے مختلف اور اچھے انسان لگ رہے ہو۔" زرنگار نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ "خدا کے واسطے مجھے اس چکر سے نجات دلا دو۔" اس نے منت بھرے انداز میں کہا۔ "میں جانتی ہوں تمہارا اختیار کسی اور کے ہاتھ میں ہے مگر اس وقت میں تمہارے اختیار میں، تمہارے رحم و کرم پر ہوں، مجھے نجات دلا دو، ان سے جو تمہیں حکم دیتے ہیں کہہ دینا کہ میں نے خود کو خود ہی ختم کر لیا۔" زرنگار کو خود بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ان اعصاب شکن حالات میں وہ کیا کہہ رہی تھی اور کیا کر رہی تھی۔

"مجھے کیوں گناہ گار کرنا چاہ رہی ہیں بی بی؟" وہ شخص گھبرا کر بولا۔ "اور میں آپ کی خاطر اگر یہ گناہ کر بھی ڈالوں تو بھی ان کے عتاب سے کیسے بچوں گا جن کا آپ "گیم" ہیں...... میرے تو گھر کا بچہ بچہ کولہو میں پڑا

جائے گا۔"

"نہیں ہوں میں اتنی اہم...... میرا یقین کرو، میں بالکل غیر اہم اور عام سی انسان ہوں، کوئی بھی مجھے مارنے پر تمہاری اتنی سی بھی سرزنش نہیں کرے گا جتنی کسی مکھی کو مار دینے پر بھی کبھی، کبھی کر دی جاتی ہے۔" زرنگار بے بس تھی اور بدحواس بھی۔

"کیا بات کر رہی ہیں بی بی، آپ غیر اہم اور عام سی انسان ہوتیں تو یوں اس عمارت کی مہمان کیسے بنتیں اور اگر ایسا ہوتا تو مجھے جو حکم ملا ہے وہ کیسے ملتا، آپ کو جہاں پہنچانے کا حکم مجھے ملا وہاں عام انسان تو پر بھی نہیں مار سکتا۔"

"ہائے میں کیا کروں، کیسے تمہیں سمجھاؤں؟" زرنگار نے دونوں ہاتھوں میں سر پکڑتے ہوئے کہا۔ اسی دم اس شخص کے فون کی اسکرین روشن ہونے لگی، اس نے فون سائیلنٹ پر رکھا ہوا تھا جب ہی وہ بجا نہیں۔

"جی صاحب، وہی کر رہا ہوں، بس حکم صاحب!" وہ کال کرنے والے سے کہہ رہا تھا۔

"نہیں صاحب انہوں نے مجھے کوئی حکم نہیں دیا مگر میں الرٹ ہوں۔" اس نے دوسری طرف سے کوئی بات سن کر جواب دیا تھا۔

"فکر مت کریں صاحب، مجید خان خوب جانتا ہے کہ اسے کب، کیا اور کیسے کرنا ہے۔"

"حکم صاحب، حکم......" وہ سر ہلا کر بولا اور فون بند کر کے زرنگار کی طرف دیکھنے لگا۔

"چلیں بی بی، میری پہلی کھنچائی ہو چکی ہے، میں اپنے کام میں وقت کی پابندی کرنے والوں میں شمار کیا جاتا ہوں۔"

"بات سنو......" زرنگار نے ایک اور کوشش کرنے کی خاطر کہا۔ جواب میں اس نے اسے ہاتھ کے اشارے سے خاموش کرا دیا۔

"مزید بات مت سنائیں بی بی...... کوئی فائدہ نہیں، جانا تو ہے ہی۔"

"میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ، بس تم اتنا کرنا کہ مجھے چلتی گاڑی سے دھکا دے دینا۔"

"بچوں والی موو ہے بی بی۔" وہ اس ساری گفتگو میں پہلی بار ہنسا۔ "جس گاڑی میں آپ لے جائی جائیں گی اس میں بیٹھ کر ایسی کوئی حرکت نہیں کی جا سکتی، لگتا ہے آپ فلمیں شوق سے دیکھتی ہیں۔" وہ ایک بار پھر ہنسا۔ "فلمیں دیکھنے کا شوق رکھنے والی لڑکیاں ہی اکثر اس حال کو پہنچتی ہیں۔" اب اس کے لہجے میں تمسخر اپنی جھلک دکھانے لگا تھا۔

زرنگار بے بسی اور حسرت سے اسے دیکھتی رہ گئی، وہ اسے بتاتی...... چاہتی تھی کہ وہ فلمیں دیکھنے کی نہیں کتابیں پڑھنے کی شوقین تھی اور جن دنوں وہ کتابیں پڑھا کرتی تھی اور جس قسم کی کتابیں پڑھتی تھی ان کے کرداروں کو اپنے بڑے بولوں کی ایسی فصل نہیں کاٹنی پڑتی تھی۔ جب ہی تو وہ مصیبتوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے چلتی گاڑیوں سے چھلانگیں لگا کر موت سے بھی بچ جاتے تھے اور اپنی بے ضرر مصیبتوں سے بھی...... لیکن وہ یہ بات چاہنے کے باوجود اس شخص کو نہیں بتا سکتی تھی جس نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنی جگہ سے اٹھانے کے بجائے نظروں کے اشارے سے اٹھ جانے کو کہا تھا اور وہ ایک روبوٹ کی طرح اٹھ کر اس کے پیچھے چل بھی دی تھی۔

☆☆☆

''میرا خیال ہے کہ تمہیں ابھی تک اطلاع مل چکی ہوگی کہ وہ گاڑی فیڈرل کیپٹل کی حدود میں داخل ہو چکی ہے اور اسے یہاں تک پہنچنے میں صرف ڈیڑھ گھنٹا لگا ہے، یہ ایک وی آئی پی موومنٹ تھی۔''

''جی نانا جان......!'' مہرزاد نے احترام بھرے لہجے میں جواب دیا۔''میں اس فیور پر ہر اس شخص کا ممنون ہوں جس نے مجھے یہ فیور دیا۔''

''تمہیں ہونا بھی چاہیے۔'' بلغم زدہ کھوکھلی آواز فون کے ائرپیس پر ابھری۔'' میرا خیال ہے کہ اب زینت فاطمہ کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میرا خیال کیا بلکہ مجھے امید ہے۔''

''میں اس موضوع پر آپ سے پھر بات کروں گا نانا جان، بالمشافہ گفتگو کے دوران۔'' مہرزاد کے لہجے میں تحمل تھا۔

''ہمیں بہلاتے ہو۔'' دوسری طرف سے جواب آیا۔''تمہاری ناپسندیدگی اس جملے میں ہی ظاہر ہو رہی ہے۔ لیکن یاد رکھنا اب بھی تمہیں اس تجویز سے اتفاق نہ ہوا تو حمایتیں، مخالفتوں میں بدلتے گھڑی بھی نہیں لگے گی۔ تمہاری ماں خاندانی بہو لانا چاہتی ہے تو اس کی خواہش کا احترام کرنا تمہارا فرض ہے، یہ لڑکی خاندانی ہے اور دیکھی بھالی بھی۔''

''میری ماں خاندانی ماں، باپ کی جائز اولاد کو بہو بنانا چاہتی ہے نانا جان اور دونوں صورتوں میں فرق ہے، خاندانی اور جائز...... آپ سمجھتے ہیں ناں......'' مہرزاد کے لہجے میں ضد ظاہر ہونے لگی۔

''سمجھتا ہوں برخوردار خوب سمجھتا ہوں، جب ہی تو تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اپنے راستے میں رکھی بھس کی ہر ڈھیری میں آگ لگانے کی کوشش مت کرو، گاڑی فیڈرل کیپٹل تو پہنچ چکی ہے لیکن اپنی منزل تک ابھی نہیں پہنچی۔''

''گویا اب مجھے اپنوں کی طرف سے وارن کیا جا رہا ہے؟''

''اپنوں، غیروں کی تمیز میں مت پڑو خاناں، سب تعلق مفاد سے جڑے ہیں، جس، جس کا مفاد جب تک تم سے جڑا ہے، وہ تمہارا اپنا ہے، جس دن مفاد ختم ہوا اپنا، غیر بن گیا، یونہی تو بڑے گھر سے تم سرخرو نہیں نکلے تھے، وہ تم، تمہارا arrogance، تمہارا چارم نہیں ان سب سے جڑا مفاد تھا جس نے تمہیں گلے لگایا۔ وفاق کے اس نمائندے کو اس کے بیٹے سمیت گلے سے جھٹک دیا۔ تم سے جڑا مفاد اتنا اسٹرونگ تھا کہ وفاق کے نمائندے کے گھر میں رکھا تعویذ بھی اس بار اس کے کام نہیں آسکا۔ پارٹی اور وزارت میں تمہاری موجودگی حکومت کو تین سال مزید گھسیٹ سکتی ہے اور تمہیں اپنا pillar(ستون) بڑے صاحب نے نہیں گردانا۔ اس طرف اشارہ ''گوری انگلی'' نے کیا ہے کہ مہرہ مضبوط ہے، اسے اپنی چالیں چلنے کے لیے استعمال کرو، بازی پوری ہو جائے گی۔'' کھڑکھڑاتی آواز مہرزاد کے کانوں سے ٹکرائی۔

''ہیل وِد۔'' وہ تلملا کر بولا۔''آپ جانتے ہیں کہ مجھے توقعات کا خون کرنے میں کمال حاصل ہے۔''

''ان کی توقعات کا خون...... خود تمہارے اپنے وجود کو خون میں نہلا دینے کے مترادف ہوگا۔ میرے بیٹے...... حالات کا وہ رخ دیکھتے ہوئے نہ کوئی اپنا فیور کرنے آگے بڑھے گا نہ کوئی غیر...... قبیلے کو اپنا اور پارٹی کو اپنا نیا شہید حاصل ہو جائے گا، بات ختم۔''

''پروا نہیں۔'' وہ غرایا۔''آپ یاد رکھیے گا نانا جان، میں مر جاؤں گا مگر خود کو استعمال نہیں ہونے دوں گا۔''

"جانے دو خاناں، ایسے دعوے مت کرو، ابھی تو تم ہماری جان ہو، آنکھوں کی ٹھنڈک، دل کا سرور ہو، اسی لیے سب تمہارے ناز اٹھا رہے ہیں، تم چاند کی تمنا کرتے ہو..... تو چاند کے ساتھ ستارے بھی حاضر کر دیے جاتے ہیں لیکن اگر تم یوں ہی ضد اور انا کے جال میں خود کو لپیٹتے چلے گئے تو نخرے اٹھانے والے ہاتھ ہی بندوقیں پکڑ لیں گے۔"

"شوق سے پکڑیں، گولی تو وہ ایک ہی ہوگی جس کو مجھے موت کی نیند سلانا ہے، ان سب کو اپنے شوق پورے کر لینے دیں، مجھے کسی سے نہ ہی ڈرائیں۔"

"میری نصیحت ہے خاناں اپنی ٹون بدلو، اپنے باپ کا طرزِ عمل یاد کرو، جہاں اکڑتا تھا خوب اکڑتا تھا مگر جہاں جھکنا پڑتا پیروں تک جھک جاتا تھا۔"

"میرا باپ......!" مہرزاد کے لہجے میں طنز ابھرا۔ "اس کی بوئی ہوئی فصل کاٹنے کو تو مجھے اپنا وہ وقت اور انرجی ایسے کاموں میں استعمال کرنا پڑ رہی ہے جو مجھے اپنے کاز اور نعرے کو ثابت کرنے میں لگانی تھی۔"

"چلو فی الحال تو موج کرو، تمہارے باپ کی اٹھائی تمہارے اشارے اور فرمائش پر منزل تک پہنچ چکی ہے، جاؤ میرے چکورا اپنے چاند کی آب و تاب جانچ کر تسلی کر لو روشنی اب بھی پوری دیتا ہے کہیں کسی نے ذرا سی روشنی چرا تو نہیں لی راستے میں، تم اپنے دل کی خوشی پوری کر لو۔ چند دن...... پھر تم سے اور زینت فاطمہ سے بات ہوگی...... اسی طرح اسی جگہ جہاں تم نے خاندان اکٹھا کیا تھا۔" بلغمی آواز نے کہا اور فون بند کر دیا۔

"گویا ایک محاذ کے بعد اگلا بھی تیار ہے......" مہرزاد نے کان سے فون ہٹا کر اسے نظروں کے سامنے لا کے دیکھتے ہوئے سوچا۔ "اور میں نے حلف لیا تھا کہ میں اپنے ذاتی مفاد کو اپنے فرائضِ منصبی پر کبھی حاوی

نہیں ہونے دوں گا......'' اس کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑیں۔

''جس روز سے حلف لیا ہے فرائض منصبی صرف بھگت رہے ہیں اور ذاتی مفاد انجام دیے جارہے ہیں'' اسے خیال آیا۔ ''میں ہجوم کا حصہ بن رہا ہوں، مجھے ہجوم کا حصہ بنایا جارہا ہے۔'' اس نے اپنی ریوالونگ چیئر کا رخ موڑا۔ ''مجھ سے پہلے نہ جانے کتنے ہی ایسے ہوں گے جو ہجوم کا حصہ بنے ہوں گے، جنہیں ہجوم کا حصہ بنایا گیا ہوگا اور اب تاریخ انہیں ہجوم کی قطار میں کھڑا کر کے ان کے پول کھول رہی ہے، کالمز، کتابیں، بحث مباحثے، فلاں سن میں فلاں ابن فلاں نے استحصال کی روایت رقم کی اور میں......'' وہ کرسی کی بیک چھوڑ کر میز پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے آگے کو جھکا۔

''میں بھی اسی راستے کی طرف لے جایا جارہا ہوں، اسی راستے کی طرف چلایا جارہا ہوں۔'' اس نے اپنی آنکھوں کو انگلیوں کی پوروں سے دبایا۔

"oh Allah please help me and guide me" اس نے حلف کی آخری لائن کو تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ دل میں دہرایا۔

"may Allah help me and guide me" اس کے دل نے دعا کی۔

☆☆☆

''ہماری صوبائی حکومت تک بھی کسی نہ کسی طرح میری رسائی ہو چکی ہے۔'' فہد نے عافیہ کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے انہیں بتایا۔ ''میری اطلاع کے مطابق، جس عمارت میں اس رات میرال کو لے جایا گیا، جس کے بارے میں اس چائنیز لڑکی کے شوہر نے حمزہ کو اطلاع دی تھی اس موومنٹ کا محرک مہرزاد خان نہیں تھا۔''

''کیا مطلب......؟'' عافیہ اور حمزہ کے منہ سے بیک وقت ایک سے الفاظ نکلے...... فہد اسی شام کراچی سے لاہور پہنچا تھا اور اسی نے حمزہ کو بھی عافیہ کے گھر پہنچنے کو کہا تھا۔

''جی ہاں، ہمارے صوبے کی انٹیریر منسٹری کے مطابق میرال اس وقت مہرزاد خان کے قبضے میں نہیں بلکہ اسی سرکاری عمارت کے رہائشی کے قبضے میں ہے، ہمیں اپنی سرگرمیوں کا رخ موڑنے کی ضرورت ہے۔''

''عجیب سی بات ہے۔'' حمزہ نے کہا۔ ''یہ سب لوگ تو ایک سے نقشے ایک سے جال پھیلائے ہوئے ہیں، ہم کتنی بھی کوشش کر لیں، کتنی بھی چھلانگیں ماریں، ان شاطروں کی بساط تک رسائی کیسے ممکن ہے۔''

''وہ بھی یوں کہ ہمیں لڑکی کی پرائیویسی بھی چاہیے۔'' عافیہ نے کہا۔ ''پہلے ہی میں اس سوشل میڈیا کی خبروں، ریمارکس اور کمنٹس پر پریشان ہوں، بے چاری کیسی نظروں میں آرہی ہے۔''

''اگر اس کو وہاں سے نکالنا ہے تو پرائیویسی کے خبط سے تو نکلنا ہی ہوگا ممی......'' دانیال نے ماں کی طرف دیکھا...... ''اس بے چاری پر تو اب تک نہ جانے کیا، کیا قیامتیں ڈھے چکی ہوں گی۔'' اس نے فہد اور حمزہ پر نظر دوڑائی۔ حمزہ کو اس کے الفاظ برچھی کی طرح اپنے دل میں اترتے محسوس ہوئے وہ جس حقیقت کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا، وہ اتنی مضبوط اور تلخ تھی کہ اس کا ذکر کیے بغیر میرال کے معاملے پر بات ہونا ناممکن تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ اس حوالے کے اس تلخ اور اٹل پہلو سے نظریں بچائے رکھنا چاہتا تھا اس حقیقت کے تذکرے پر اس کی نظروں کے سامنے بی اماں اور ان کی سہیلی بلقیس کلثوم کا چہرہ گھومنے لگتا تھا اس لڑکی میرال کے ساتھ ہونے والے سانحے پر ان دونوں کی روحیں کیسے تڑپتی ہوں گی، وہ تصور کر سکتا تھا...... دانیال نے حمزہ کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثر کو غور سے دیکھا اور پھر شانے اچکاتے ہوئے بولا۔

''اس حقیقت کو تو ہمیں بہر حال فیس کرنا ہی ہوگا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اگر وقت نے ہمیں یہ موقع دیا ہے کہ یہ جو اوپر بیٹھے ہم پر حکومت کر رہے ہیں ان کے چہروں کو بے نقاب کر سکیں تو کیوں نہ کریں۔ شاید ہماری اس کوشش سے آئندہ اقتدار کے ایوان ان لوگوں کی رسائی سے دور ہو جائیں۔''

''یہ نہ ہوں گے ان جیسا کوئی اور ہوگا۔'' فہد نے بے اختیار کہا۔

''ضروری تو نہیں۔'' دانیال کے لہجے میں جوش بڑھا...... ''ابھی گزشتہ چند سالوں کے اندر ہی کئی ایسے ملکوں کی تاریخیں ایسے ہی واقعات کی وجہ سے بدلی ہیں جو پہلے ایسے ہی حکمرانوں کے تسلط میں تھے جیسے حکمران ہمارے سر پر مسلط ہیں۔'' اس نے اپنے سامنے بیٹھے تینوں افراد کی طرف باری باری دیکھا۔

''یہ تو ہمارا ذاتی المیہ ہے دانیال، ہم اس ذاتی المیے کو بنیاد بنا کر انقلاب لانے نکلیں گے کیا؟'' عافیہ نے ایک مرتبہ پھر اسے روکنا چاہا۔

''ہر جگہ انقلاب کی وجہ کسی نہ کسی کا ذاتی المیہ ہی ہوتی ہے ممی، کسی ایک کا ذاتی المیہ بعض اوقات قوموں کی تقدیر بدل کر رکھ دیتا ہے، آپ اس پرائیویسی کے چکر سے نکل آئیں، اب ایسے بات نہیں بننے والی، حمزہ بھائی آپ اور فہد، میں اور ممی، ڈیڈی اور عاصم بھائی ہم سب اپنے، اپنے سورسز استعمال کر کے اپنے، اپنے حصے کی چھلانگیں ضرور لگائیں گے نتیجہ چاہے کچھ بھی ہو۔'' اس نے پورے عزم کے ساتھ کہا۔

''یقیناً......'' فہد اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔

حمزہ اور عافیہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، دانیال کی بات میں منطق تھی اور استدلال تھا...... دانیال کی باتوں سے منہ موڑنا اور اس کی تجویز سے انکار دونوں کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

''ہماری برادری میں، خاندان میں چار چفیرے (چاروں اطراف) کوئی لڑکی اتنی زیادہ جماعتیں نہیں پڑھی بینش، میری مان لے اب بس کر دے پڑھائی، میں تیرے لیے، تیری شادی کے لیے بڑی ہی فکر مند ہوگئی ہوں، جہاں پتا کرواتی ہوں یا تو کم پڑھا لکھا ہوتا ہے یا پھر شکل صورت سے کسی طرح بھی کشمیری نہیں لگتا۔'' بینش نے ناگواری سے اپنی اماں کی بات سنی اور جھنجلا کر بولی۔

''اماں کیا اس موضوع کے علاوہ کوئی دوسری بات نہیں رہ گئی آپس میں کرنے کو؟''

''دیکھ لے، تعلیم اولاد کو خود سر اور گستاخ بنا دیتی ہے، میں کبھی، کبھی تجھے یوں بولتے دیکھتی ہوں تو میری فکر اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ تُو، تو میرے بھی منہ کو آنے لگتی ہے، اگلے گھر جا کر ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گی......'' اماں نے معصومیت سے کہا۔ بینش ایک دم شرمندہ ہوگئی۔ اسے ماں کی عظمت اور حیثیت سے متعلق دانیال کی گفتگو یاد آگئی۔ اس نے اماں کے دونوں ہاتھ نرمی سے اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بالکل ہی مختلف لہجے میں کہا۔

''اگر آپ کی دعائیں میرے ساتھ ہیں اماں تو میرے لیے سب اچھا ہی ہوگا، آپ کے تصور سے بھی زیادہ اچھا۔''

بینش کے اس انداز پر اماں لمحے بھر کے لیے حق دق بیٹھی رہیں۔

''میری دعاؤں کی کیا بات کرتی ہے، میں تو دعاؤں میں نہ جانے کس کس ملک کا شہزادہ تیرے لیے خدا سے مانگتی ہوں۔''

''شہزادے کا برادری اور خاندان سے تعلق ہونا ضروری ہے کیا......؟'' ہینش نے ڈرتے، ڈرتے کیا۔ اماں نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''آخر سب ہی ملکوں پر کشمیری بادشاہوں کی تو حکومت نہیں ہوگی ناں اماں، تو شہزادہ تو کسی بھی برادری اور خاندان سے ہوسکتا ہے۔'' ہینش نے کہا۔

''لے پھر میں دعا ہی بدل لیتی ہوں، کشمیری نہ ہوا اور شہزادہ بھی نہ ہوا تو کیا فائدہ......؟'' اماں نے ... کر کہا۔

''اماں سچ تو یہ ہے کہ مجھے شہزادہ ہی چاہیے، چاہے وہ کسی بھی ملک کے بادشاہ کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو'' ہینش نے اپنے دل کی بات کو مبہم سے الفاظ میں ڈھالا۔

''حق تو تیرا بھی ہے کہ کوئی انوکھا، دنیا بھر کے انسانوں سے مختلف شہزادہ تجھے بیاہنے آئے مگر ہمارے ایسے مقدر کہاں۔'' اماں اس کی خواہش پر نثار بھی ہوئیں اور اپنی قسمت سے شکوہ کناں بھی۔

''تھوڑے دن انتظار کرلیں اماں پھر میں آپ کو ایک کہانی سناؤں گی، انوکھے اور دنیا کے انسانوں سے مختلف شہزادے کی کہانی۔'' ہینش نے کہا۔ ''مگر کہانی سننے کی شرط یہ ہے کہ آپ کو نہ اس کے ملک پر اعتراض ہو نہ ہی اس بات پر کہ وہ کس بادشاہ کی اولاد ہے؟''

''تو کہانی سنا بس...... مجھے کہانیاں سننے کا بہت شوق ہے، میں کوئی اعتراض نہیں کروں گی۔'' اماں نے بھولپن سے کہا۔

''چند دن انتظار کرلیں، ابھی شہزادہ اپنی کہانی خود سنا رہا ہے، مکمل ہوجانے دیں اس کی کہانی پھر وہ کہانی میں آپ کو سناؤں گی۔'' ہینش نے مسکرا کر کہا۔

☆☆☆

''میں نے اس شخص سے بہت مرتبہ پوچھا تھا، وہ مجھے کس کے حکم پر یہاں لا رہا ہے، محکوم انسان تھا نا اس کی زبان نے ساتھ نہیں دیا، اسی لیے وہ میرے سامنے آپ کا نام نہ لے سکا۔ بتا دیتا تو یقیناً میں اس وقت آپ کے سامنے موجود نہ ہوتی......''

مہرزاد نے اسے کتنے دنوں بعد دیکھا تھا، وہ دن تھے، مہینے تھے یا سال، اسے یہ درمیانی وقت اتنا بھاری اور طویل محسوس ہو رہا تھا جیسے سالوں گزر چکے ہوں...... وہ اسے خاموشی سے دیکھتے رہنا چاہتا تھا حالانکہ اس کا پُرشکن لباس، بے ترتیب بال اور مضطرب چہرہ اسے الجھا اور چونکا گیا تھا۔

''میرے سامنے موجود نہ ہوتیں تو کیا کرتیں؟'' وہ اس کے لہجے کی تلخی کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔

''زہر کھا لیتی، اُس کمرے کی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر خود کو ختم کر لیتی، جس میں آپ کے کہنے پر مجھے محبوس رکھا گیا تھا۔'' وہ پھنکاری۔

''اتنی نفرت ہوگئی تمہیں مجھ سے؟''

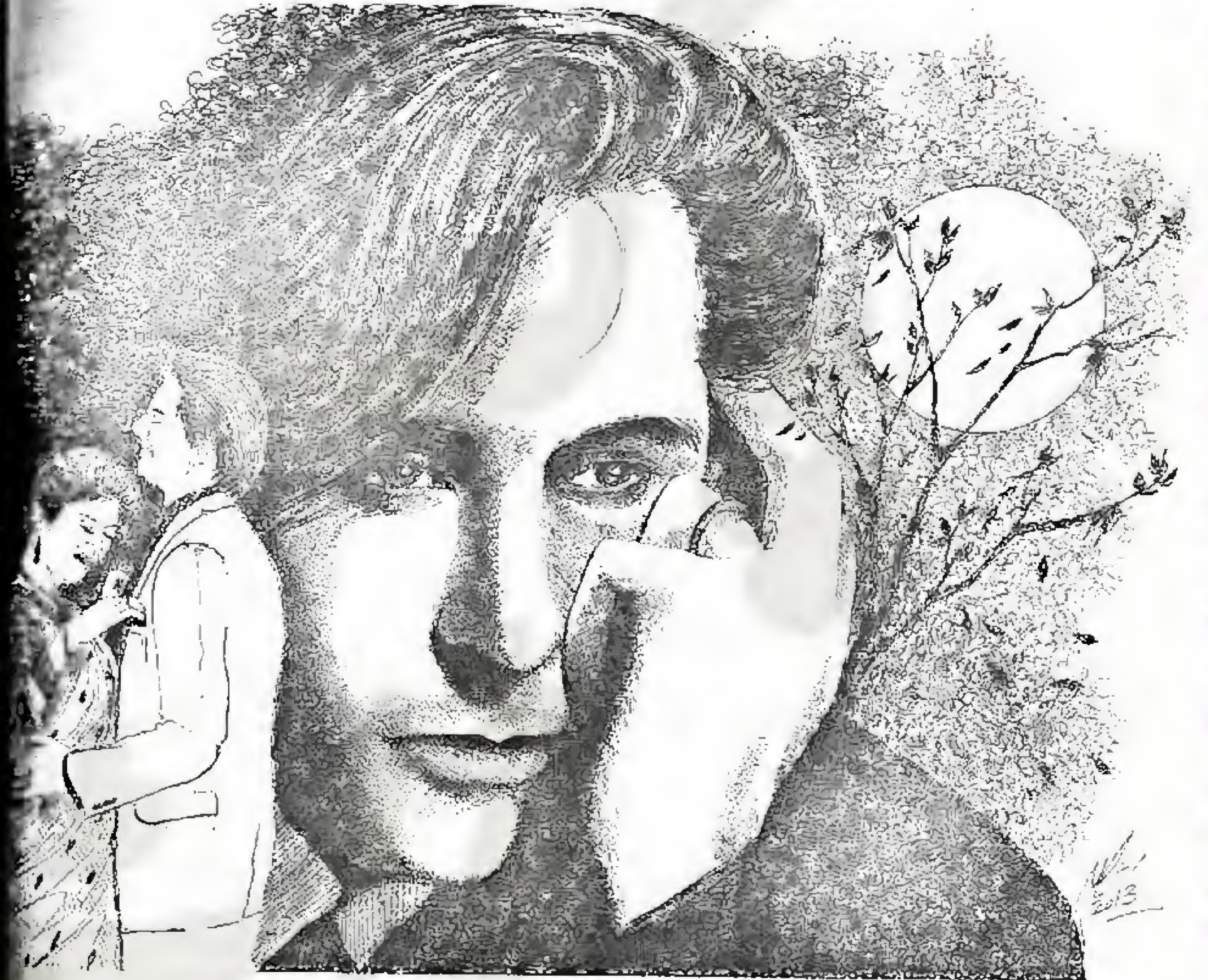
''اس سے بھی زیادہ، اتنی زیادہ کہ میں آپ کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی...... سردارزادہ صاحب......'' اس نے اپنے لہجے کا زہر مہرزاد کے دل میں اتارتے ہوئے کہا تھا۔

جاری ہے

شامِ شہرِ یاراں

عنیزہ سید

قسط 13



زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے . . . خیر و شر، نیکی اور بدی . . . زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت . . . ہر برائی پر حاوی ہو جاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سیّد نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

محمود دُرّانی اور مہرین کی تیسری اولاد حمزہ، مہرین کی زچگی میں پیچیدگی کے باعث نانی کے پاس ان کے آبائی گھر سیالکوٹ میں پروان چڑھتا ہے۔ جہاں تمکین اس کے ماموں کی بیٹی سے اس کی خوب گاڑھی چھنتی ہے۔ علینہ کے والدین، نادیہ اور سعید کیانی نے کورٹ میرج کی تھی مگر شادی کے تین سال بعد سعید کیانی بیوی کو داغِ مفارقت دے گئے۔ آکسفورڈ کا پروردہ سردار مہرزاد خان اپنے باپ کے سیاسی قتل کے بعد حادثاتی طور پر سیاست میں شامل ہوا تھا اور زرنگار کے حسن و ذہانت کا شکار ہو چلا تھا..... بینش دو بھائیوں کی اکلوتی بہن، اپنی ضد اور صرف بھائیوں کے تعاون سے نیشنل کالج آف آرٹس میں تعلیم حاصل کر رہی تھی جہاں اس کا سینئر ساتھی دانیال اس سے ہر ممکن تعاون کرتا تھا۔ ایک پاکستانی مسلمان مرد اور بدھ مذہب کی پیروکار چینی عورت کی بیٹی زوئی حسین چین سے آکر پاکستان میں فارمیسی کی تعلیم حاصل کرتی ہے۔ دانیال آرٹ کا عشق رکھنے کے ساتھ فلائنگ میں بھی مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے اور ایک دن طیارے کے دعویں سے نقش و نگار بنانے کی کوشش میں حادثے کا شکار ہو جاتا ہے۔ فہد کو اپنے ایک نیوز ریڈر دوست کے ذریعے سے میرال کی گمشدگی کی خبر ملتی ہے۔ زرنگار، مہرزاد کو اپنے ماضی کے بارے میں بتاتی ہے۔ نادر، حمزہ سے ملتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ اگر زوئی قصوروار ہوئی تو وہ خود اسے لے کر آئے گا۔ حمزہ کہتا ہے کہ اسے اب تنگ نہیں کیا جائے گا۔ علینہ اچانک فہد کی آمد سے بہت خوش ہوتی ہے لیکن جب وہ یہ سنتی ہے کہ وہ میرال کی تلاش میں آیا ہے تو یہ اسے اچھا نہیں لگتا۔ چوہدری رزاق، امراؤ بیگم کو خبردار کرتا ہے کہ زرنگار کی وجہ سے وہ اب کسی آفت میں پھنس سکتی ہے۔ مہرزاد کی ماں اس سے کہتی ہے کہ انہوں نے اس کا رشتہ خان اکبر کے گھر ڈالنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ نادر اپنے گھر میں زوئی کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ بینش، مہرزاد کو سنبھل کر چلنے کا مشورہ دیتی ہے۔ دانیال، بینش کو اپنے ایکسیڈنٹ اور صحت یابی کے بارے میں بتاتا ہے تو وہ حیران رہ جاتی ہے۔ زوئی، نادر کو بتاتی ہے کہ کس طرح وہ میرال کو ان لوگوں سے بچاتی رہی لیکن وہ لوگ اسلحے کے زور پر اسے زبردستی اپنے ساتھ لے گئے۔ مہرزاد حلف اٹھانے کے بعد سوچ رہا تھا کہ حلف اٹھانے والوں کو حلف کے الفاظ یاد بھی رہتے ہوں گے کہ وہ ان پر عمل کرسکیں۔ مہرین، حمزہ پر شادی کے لیے زور ڈالتی ہے لیکن وہ پس و پیش سے کام لیتا ہے تو محمود درانی کہتے ہیں کہ وہ کوشش کریں گے کہ وہ اس کی چوائس کو اپروول دلا دیں۔ زرنگار کو اس خصوصی نمبر سے دبئی روانگی کا پیغام ملتا ہے اور پھر امراؤ بیگم کہتی ہے کہ سردار صاحب نے ٹکٹ بھیجا ہے۔ گڈی، مہرزاد سے کہتی ہے کہ اسے وزارت کا عہدہ ملنے کی خوشی میں بپا کی گئی تقریب میں زرنگار کو بلانا چاہیے تھا۔ علینہ، فہد کو بتاتی ہے کہ ایک سوشل ویب سائٹ پر میرال صلاح الدین کے نام کا صفحہ موجود ہے۔ زوئی ائرپورٹ اپنی دوست جی آن کو لینے جاتی ہے تو اس شخصیت کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے جو ایک گاڑی سے باہر نکلی تھی۔ زوئی، میرال کو پہچان لیتی ہے وہ نادر کو بتاتی ہے۔ میرال کو بتایا جاتا ہے کہ اس کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل ہے اس لیے وہ دبئی نہیں جاسکتی۔ میرال حیران ہوتی ہے کہ وہ لوگ اسے کہاں لے کر جارہے ہیں۔ مہرزاد کے آدمی اسے بتاتے ہیں کہ میرال کو بڑے گھر لایا گیا ہے۔ مہرزاد فون کرنا چاہتا ہے لیکن میرال سے رابطہ ممکن نہیں ہوتا۔ زوئی ٹیکسی کر کے میرال کی گاڑی کا پیچھا کرتی ہے۔ نادر، حمزہ محمود کو میرال کے بارے میں بتاتا ہے..... عافیہ ویب سائٹ پر فہد کا میسج پڑھ کر اس سے رابطہ کرنے کا سوچتی ہیں۔ مہرزاد خان اپنی برادری کے لوگوں پر میرال کے سلسلے میں دباؤ ڈالتا ہے۔ ریشل، مہرزاد خان کی نیوز اینکر کے ساتھ منعقد کی گئی میٹنگ دیکھتی ہے تو اسے کچھ غیر معمولی محسوس ہوتا ہے۔ فہد اور حمزہ، دانیال اور عافیہ سے ملنے آتے ہیں۔ علینہ، فہد کے جانے کے بعد سوچتی ہے کہ اس کے ہونے سے کتنی رونق ہوگئی تھی۔ فہد، دانیال، عافیہ اور حمزہ سے کہتا ہے کہ اسے اپنے کچھ کانٹیکس آزما لینے دیں۔ مہرزاد کے انداز میں غیر معمولی تبدیلی پر ریشل حیران ہوتی ہے۔ نادر کی ماں اسے کہتی ہے کہ اس کی بہنیں آرہی ہیں، وہ دونوں اپنا اپنا گروپ بنالیتے ہیں۔ دانیال، بینش سے کہتا ہے کہ وہ اسے پروپوز کرنا چاہتا ہے۔ زرنگار کو ایک شخص لینے آتا ہے تو وہ اسے کہتی ہے کہ وہ اس پر یہ احسان کرے کہ اس کی زندگی ختم کردے لیکن وہ ایسا کرنے سے انکار کردیتا ہے۔ مہرزاد کے پاس اس کے نانا کا فون آتا ہے کہ زرنگار جلد ہی اس تک پہنچنے والی ہے اور اب اسے اپنی ماں کی خواہش کا احترام کرنا ہوگا..... مہرزاد خان سے کہتے ہیں کہ وہ اپنی ٹون بدلے..... فہد، عافیہ اور حمزہ کو بتاتا ہے کہ میرال کو اس رات جس عمارت میں لے جایا گیا اس کا محرک مہرزاد نہیں ہے۔ دانیال کہتا ہے کہ لڑکی کو اگر وہاں سے نکالنا ہے تو پرائیویسی کو چھوڑنا ہوگا جس پر حمزہ، فہد اور عافیہ سب ہی خاموش رہتے ہیں۔ بینش کی ماں اس سے کہتی ہے کہ اب پڑھائی چھوڑ کر شادی کی فکر کرے۔ بینش ماں سے کہتی ہے کہ وہ تھوڑا انتظار کرے۔ زرنگار، مہرزاد سے کہتی ہے کہ اگر اسے پتا ہوتا کہ اسے مہرزاد کے سامنے لایا جارہا ہے تو وہ یہاں نہ آتی اپنی زندگی ختم کرلیتی۔

اب آگے پڑھیں

''نہ جانے کیوں مجھے تمہاری نفرت بھی اپنے سر آنکھوں پر چھائی محسوس ہورہی ہے، تم سے متعلق ہر احساس اتنا لطیف ہے کہ اسے محسوس کرتے ہوئے میرے جسم کو اور میری روح کو عجیب سی تازگی محسوس ہوتی ہے۔'' وہ مہرزاد خان تھا جو اس کی طرف یوں دیکھتے ہوئے بول رہا تھا جیسے کسی طلسم کے زیرِ اثر ہو۔ زرنگار نے چند ثانیوں کے لیے اس کے الفاظ اور انداز پر رک کر غور کیا اور پھر اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔ سانس اس کے سینے سے یوں خارج ہورہی تھی جیسے خود میں سموئی ہوئی نفرت سے چہار طرف آگ لگا دے گی۔

''شاید یہ کاروبارِ سیاست کے نئے موڑ سے سیکھا اور ایک نیا انداز ہے سردار زادہ صاحب۔'' اس نے اپنے سامنے موجود دیوار پر لگے منقش چنیوٹی جھروکے کے چھوٹے بڑے آئینوں میں نظر آتے مہرزاد خان کے عکس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ''آپ صاحبِ کمال تو پہلے ہی تھے اب صاحبِ اختیار بھی ہوگئے۔ اختیار رکھنے والوں کے دل بھی عجیب کروٹیں بدلتے ہیں، محصور کو کبھی کسی پنجرے میں قید دیکھنا پسند فرماتے ہیں کبھی کسی اور قسم کے زنداں میں دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''لعنت تو اس محصور پر بھیجنی چاہیے جو پٹ سے مرجانے کے بجائے امید بھری نظروں سے اسی طرف دیکھتا رہا جس طرف سے عہد شکنی کے تیر اس کی سمت آنے کو تیار رہتے۔''

''ہوں.....'' دلچسپی سے اسے اس طرح سنتے ہوئے اس کی بات ختم ہونے پر مہرزاد بے اختیار مسکرا دیا۔ ''اُدھر بیٹھ کر الفاظ کے ذخیرے جمع کرتی رہی ہو لگتا ہے۔''

''نفرت کے بیج بوتی رہی ہوں دل میں، یہ اسی کی سر اٹھاتی فصل سے پھوٹتی کونپلیں ہیں جنہیں آپ کے سر پر سے وار رہی ہوں تاکہ صدقہ نکل جائے آپ کی وزارت کا۔'' وہ بدستور آئینے میں اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''لگتا ہے تمہیں مجھ سے نہیں، میری وزارت سے بہت سی شکایتیں ہوگئی ہیں۔'' مہرزاد کو اس کا یہ انداز اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ مسکراہٹ خود بخود اس کے چہرے پر پھیلتی جارہی تھی۔

''مجھے آپ کی وزارت سے شکایتیں کیوں ہوں گی۔'' وہ تنک کر بولی۔ ''میں تو اسے سلیوٹ کرنا چاہوں گی، اس ملک کی حکومت کی وزارتوں کی لوٹ سیل میں سے جو وزارت آپ کے ہاتھ آئی ڈراما بھی اس کے ماتحت ہے اور ڈرامے بازیاں بھی، آپ نے جو ڈراما میرے ساتھ کیا، اس کے اسکرپٹ پر آپ کے ہاتھ کی گرفت بہت خوب رہی، وزارت ملے زیادہ دن نہیں ہوئے مگر آپ نے فنکار بننے اور فنکاریاں سیکھنے میں زیادہ عرصہ نہیں لگایا، سلیوٹ!'' اس نے ماتھے پر سلیوٹ کرنے کے سے انداز میں ہاتھ رکھا۔ ''سردار زادہ صاحب، سلیوٹ آپ کی مہارتوں کو..... لیکن اب یہ بھی فرما دیجیے کہ بندی کے لیے تازہ فرمان کیا ہے، ڈرامے کے اگلے ایکٹ میں اس ناچیز کو کس سیناریو میں داخل ہونے کا حکم فرمانے والے ہیں آپ۔''

''ارے کہیں تم اس (گالی) کی کمپنی میں کچھ وقت تو نہیں گزار آئیں۔'' الفاظ بے اختیار مہرزاد کے منہ سے پھسلے تھے۔ ''وہی ایسی نوٹنکیاں سجانے کا ماہر ہے اور اس قسم کے الفاظ بھی اسی کے ہاں بولے جاتے ہیں۔'' اس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے سامنے دیکھا۔ اس کے چہرے پر غصہ بھی تھا اور رعب بھی۔ ''اگر ایسا ہے تو میں اسے مزید نہیں بخشوں گا، بخشنے والا تو خیر میں پہلے بھی نہیں تھا۔''

''چلیں.....'' وہ گھوم کر سیدھی ہوئی اب وہ براہِ راست مہرزاد خان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''ڈرامے کا ایک نیا ایکٹ شروع ہوا۔ اب آپ اپنا گناہ کسی اور کے سر پر تھوپنے والا کارنامہ انجام دینے

کو پر تو لنے لگے۔"

"نہیں، میں ایسا ہر گز نہیں کرنے والا۔" مہرزاد نے بازو کمر کے پیچھے لے جا کر باندھتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے گناہوں کا خود ذمے دار بننا پسند کرتا ہوں اور کبھی یہ ماننے میں تامل نہیں کیا کرتا کہ کون سا گناہ میرا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ میں ایسا فراخ دل بھی نہیں ہوں کہ دوسروں کے گناہ اپنے سر لیتا پھروں۔"

"کسی اور کے بارے میں تو میں نہیں جانتی لیکن خود میں کسی کا وہ گناہ ہوں جسے آپ نے آگے بڑھ کر اپنے ذمے لیا تھا، مجھے تو اپنے بڑے بولوں کی پکڑ میں آنا ہی تھا۔ پکڑ کی مٹھی آپ بن گئے، آزمائش میری تھی یا آپ کی...... میں نہیں جانتی لیکن اتنا خوب معلوم ہے کہ اس پر پورا ابھی تک کوئی بھی نہیں اترا۔" وہ سر جھٹک کر بولی۔ "میں اس لیے نہیں کہ میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا، آپ اس لیے کہ آپ کے اختیار میں سب کچھ تھا۔ حالات، وقت، قلم حتیٰ کہ ابلیس بھی آپ کا ساتھی تھا، جب ہی تو ایک مجبور اور بے اختیار کے ساتھ آپ مسلسل ایک شیطانی ڈراما کھیل رہے ہیں۔ کبھی نیک دل فرشتہ بن کر کیچڑ میں کھلے کنول کو کیچڑ سے نکال لینے کا دعویٰ کر کے اور کبھی اعتماد کی ڈور کو عقب اور راہزنی کی قینچی سے کاٹ کر، میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو یہ سب کرنے کی ضرورت کیا تھی آخر...... ہزار راتوں کا معاوضہ امراؤ بیگم کو ادا کرنے کے بعد میں خود بخود آپ کے اختیار میں آ تو چکی تھی...... پھر اپنے نفس پر قابو پانے کے جتن کرنے کی کہانیاں سنا کر، مجھ سے مجھ پر بیتی سننے کا چسکا لے کر اور میرے دل کو وہم کی اوٹ میں چھپی امید کی ایک موہوم کرن تھمانے کی کیا ضرورت تھی۔ مقصد تو میرے جسم اور روح کو اپنے پیروں تلے روند کر دونوں کو دن رات نئی موت اور ہر موت کے بعد ملی ہوئی نئی زندگی سے ہی دوچار کرنا تھا ناں۔ تو پھر آپ اس دل سے کیوں کھیلے...... جو برسوں پہلے پڑھی اُن کہانیوں کی دنیا میں دھڑکتا تھا، جو انسانوں میں چھپے فرشتوں کا پتا بتاتی تھیں، جو بدصورتی کے درودیوار میں سنیت لگاتی خوب صورتی کی تصویریں دکھاتی تھیں، آپ نے شروع میں ہی اس دل کو اس جن کے حوالے کیوں نہیں کر دیا جو آنِ واحد میں اسے بھون کر کھا جانے کا خواہش مند تھا اور جس کی کہانی سے وہ دل نظریں چراتا پھرتا تھا......" بولتے بولتے وہ رک گئی۔

"کیوں کیا آپ نے ایسا، کیوں آخر......؟" اس نے مہرزاد کی طرف دیکھا۔ "آپ کا مقصد تو وزارت کا جشن مناتے ہوئے میری روح، جسم اور عصمت کی پامالی ہی تھا ناں تو اس جشن کو منانے کے لیے اتنے venues بدلنے کی کیا ضرورت تھی، دبئی، لاہور اور اب یہ جگہ، جس کے بارے میں مجھے معلوم ہی نہیں کہ ہے کہاں واقع، نہ جانے یہاں لائے جاتے ہوئے اب کی بار میری آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھنے کا حکم آپ نے کیوں جاری کر دیا۔ قیدی بلبل کو کیا فرق پڑتا ہے کہ صیاد نے پنجرہ کدھر ٹانگنا ہے، کسی فلک بوس شجر کی شاخ پر یا گھر کی دیوار میں گڑھی میخ پر......"

"واہ، میری بلبل زبان کی دھار تو خوب تیز کر کے آئی ہو۔" مہرزاد کو اس کی، گری اور غصے پر ہنسی آنے لگی۔ "تمہارا بھی کوئی قصور نہیں، جہاں تم یہ دو، تین دن گزار آئی ہو وہاں کی سان اسی تیزی کے لیے مشہور ہے۔" اس کے اس انداز پر زرنگار نے غصے کے مارے سر جھٹکا اور چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"شاید میں ساری رات تمہارے سامنے بیٹھ کر تمہاری یہ جلی کٹی سنتا رہتا اور اسے خوب ہی انجوائے کرتا مگر کیونکہ اس وقت میں یہاں اتنا ہی وقت لے کر آیا تھا کہ خود اپنی آنکھوں سے تمہیں یہاں موجود دیکھ لوں اور اپنے دل کی تسلی کر لوں کہ اس خبیث کی قید میں تم پر کچھ ایسی تو نہیں گزری کہ مجھے خود اپنے ہاتھوں سے اس کا قتل

کرنا پڑے...... اس لیے مجھے واپسی کی جلدی ہے۔" مہرزاد نے دو تین قدم چل کر زرنگار کی نظروں کے سامنے آ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "مجھے بتاؤ میرال اور سچ، سچ بتاؤ وہ جس نیت سے تمہیں وہاں لے کر گیا تھا، کہیں اس نے اپنی ناپاک نیت کو پورا کرنے کے لیے تم سے کوئی زیادتی تو نہیں کی، اگرچہ میرے پاس مصدقہ اطلاعات ہیں کہ ایسا کچھ نہیں ہوا لیکن پھر بھی میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں، تم سے سننا چاہتا ہوں۔" اس کے لہجے میں اضطراب جھلکنے لگا۔

"وہ......؟" زرنگار نے اپنی بھاری پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، اس کی مسحور کُن خوابیدہ آنکھوں میں سرخی تیر رہی تھی...... الجھن اور بے یقینی کا رنگ نمایاں تھا۔

"کون وہ؟" اس نے پوچھا۔ "کس کا سر ہے وہ جس پر آپ اپنا گناہ تھوپنا چاہتے ہیں۔" اس نے دُرشت لہجے میں کہا۔ "جس کے بھی سر پر تھوپ دیں۔" وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ "سردار زادہ صاحب خود آپ اب چاہے کتنے ہی مقدس ترین پانیوں سے بھی دھل آئیں مجھے آپ کے چہار طرف کیچڑ اور گندگی ہی نظر آتی رہے گی، میرے دل میں موجود آپ کو دیکھتے ہی وہ زخم ہرے ہو جائیں گے جو اُسی پل وہاں نمودار ہو گئے تھے جب آپ اپنے الفاظ کا پاس کرنے میں ناکام ہو گئے، جب آپ کی شہوت مجھے دھوکے سے اٹھا کر... ائرپورٹ لے گئی اور وہاں سے واپس اس جگہ جہاں صرف آپ ہی کے پر جلے بغیر داخل ہو سکتے ہیں۔"

"ہوں......" مہرزاد نے اس کے بے ترتیب حلیے پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا اور اس کے کاٹ دار لہجے کو دل پر محسوس کیا۔ "بدگمانی اور شک اتنا زیادہ ہے کہ اسے دور کرنے کے لیے بہت وقت چاہیے لیکن فی الحال تو میرا یہ اطمینان مجھے کافی ہے کہ تم ان بدفطرت ہاتھوں سے نکل کر یہاں موجود ہو، میری پناہ میں ہو، محفوظ ہو اور مامون بھی...... اگر ابھی مجھے فوری طور پر کہیں جانا اور کسی سے ملنا نہ ہوتا تو میں تمہیں تفصیل سے بتاتا کہ اپنے الفاظ کا پاس رکھنے کے لیے مجھے کن کانٹوں میں الجھنا پڑا اور میرا راستہ کیسا خاردار رہا، اگرچہ تمہاری عزت و عصمت کی حفاظت کے لیے یہ سودا بالکل بھی برا نہیں...... نہ ہی کبھی مجھے گراں گزرے گا۔"

زرنگار نے اس کی بات سن کر بے یقینی سے اسے دیکھا، اسے محسوس ہوا مہرزاد خان کی آواز بھاری ہو رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں بھی نمی بھی تھی۔

"quiteunlike Meharzad khan" اس کے دل نے کہا۔

"میں اب چلوں گا۔" مہرزاد نے اس کی طرف دیکھا۔ "یقین کرو یہاں تم محفوظ ہو، امراؤ بیگم اس کے حواریوں اور اس کے سرپرستوں کی پہنچ سے بہت دور اور بہت محفوظ......" اس نے اسے یقین دلانے کے سے انداز میں سر ہلایا۔ "میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہاری آزمائش اور مشکل کا دور بس یہاں تک تھا، اس سے آگے تمہارے لیے آسانیاں ہی آسانیاں ہیں، خوشیاں ہیں اور اطمینان۔ تم بے فکری سے یہاں رہو، آنے والا وقت بس اب آیا ہی چاہتا ہے، صرف دو قدم دور ہے صرف دو قدم دور۔" اس نے آخری جملہ دوبارہ دُہراتے ہوئے کہا اور تیز قدموں سے... چلتا ہوا اس کے کمرے سے باہر چلا گیا۔

زرنگار نے حیرت زدہ نظروں سے مہرزاد کو کمرے سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا، اس کا ذہن سپاٹ ہونے لگا تھا اور فہم جواب دے رہا تھا۔ ایک بار پھر مصیبت آ کر بھی نہیں آئی تھی، ایک بار پھر آزمائش کی انتہا اپنی جھلک دکھا کر غائب ہو گئی تھی مگر راستہ اب بھی دُھندلا تھا، منظر اب بھی غیر واضح اور مبہم تھا۔ کسی سوال کا جواب تھا نہ گمان کی قید سے آزادی ملتی تھی۔

"یا اللہ میری زندگی کا مقصد کیا ہے؟" اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ "میں کن لوگوں کے درمیان رولنگ بال بنی ہوئی ہوں، اس کھیل کا مقصد کیا ہے، یہ کب ختم ہوگا......" اس کے دل سے اٹھتے سوال ہی سجی سجائی دیواروں اور منقش چھت سے ٹکرا کر واپس اس کی طرف لوٹ آئے تھے۔

"اگر زندگی کا خاتمہ موت ہی کو کرنا ہے تو کیوں خاتمہ ہو نہیں جاتا۔" ایک سوال اور ذہن میں آیا۔

"دو قدم دور کھڑی موت بھی انسان کی اپنی خواہش پر اس کے قریب نہیں آتی۔" اسے اس شخص کا جواب یاد آیا جو اسے یہاں چھوڑ کر گیا تھا اور جو یہاں تک پہنچانے کے سفر کے دوران اپنے فون پر نہ جانے کہاں سے آئی کالز سے ہدایات لیتا رہا تھا۔

"کتنی ہی بار وہ مقام تبدیل کر دیا گیا ہے اس مختصر وقت میں جہاں اس بی بی کو پہنچانا ہے۔" اس نے سنا وہ شخص کسی سے کہہ رہا تھا۔

"خیر یہ تو شروع سے اب تک نہیں پتا کہ کس کے لیے، کس کے پاس پہنچانا ہے۔" اس شخص جس کا نام مجید خان تھا۔ نے جواب دیا تھا۔

"تم مجھے کہاں لے کر جا رہے ہو؟" وہ مارے اضطراب کے ایک بار پھر چیخی تھی۔

"دیکھو، میں چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دوں گی۔" ایک بے بس سی دھمکی بھی دی تھی۔

"کوشش کر کے دیکھ لو بی بی، اگر گاڑی بنانے والوں کے دعوے غلط ثابت ہو جائیں اور تمہاری کوشش سے کوئی دروازہ کھل جائے تو اچھا ہے ہماری بھی جان چھوٹ جائے۔ آہ...... ہا، ایک عمر گزر گئی لوگوں کو اسی طرح خفیہ خفیہ اِدھر سے اُدھر موو کراتے، نہ ڈیوٹی بدلتی ہے نہ اس چاکری۔ سے جان چھوٹتی ہے۔" اجنبی آواز نے کہا تھا۔

"بڑے بڑوں کو موو کرایا ہے جگر۔ مگر ایسی خطرناک مومنٹ تو کم ہی کرائی ہوگی۔" مجید خان کی آواز آئی تھی۔ "ایک اسپیشل نمبر سے حکم ملتا ہے خبردار جو موو ہوئے، دوسرے گولڈن نمبر سے حکم ملتا ہے تاخیر کیوں ہو رہی ہے، موو کیوں نہیں کیے ابھی تک؟"

"دونوں احکامات میں سے ایک پر سر جھکانے کا فیصلہ تم نے کیسے کیا، اکڑ بکڑ بمبے بو کر کے یا سکہ اچھال کر؟" اجنبی آواز کا سوال تھا۔

"گولی کی ساخت کا تصور کر کے۔" مجید خان نے کہا۔ "یہ سوچ کر کہ اِدھر سے آئی گولی کہاں بنی ہے، اُدھر کی کہاں بنی ہو سکتی ہے، یارا موت تو دونوں قسم کی گولیوں سے آنی ہے مگر کم تکلیف دہ موت پر سر جھکا لیا بس میں نے۔" مجید خان نے یہ بات یوں کی تھی جیسے اس کے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہ ہو۔

"آ آ آ...... ہا......" اجنبی آواز نے کہا۔ "عمر گزر گئی گولیوں کی بوچھار سے بچنے کے لیے گتکا کھیلتے ہوئے۔"

"ہم گتکا کھیلتے ہیں اور ہمارے بیوی بچے گتکے کے معاوضے پر عیش کرتے ہیں کسی گولی سے مر بھی گئے تو بیوی بچے نقصان میں پھر بھی نہیں رہیں گے، ان کو سرکار اور پارٹی کی طرف سے تگڑی رقم بہرحال مل جائے گی۔"

"گولی ہمارے جیسوں کے مقدر ہی میں کیوں لکھی ہے مجید خان؟" اجنبی آواز نے کہا۔ "یہ جن کی حفاظت پر ہم مامور ہیں یہ کیوں نہیں گولی کی موت پر مرتے؟"

"یہ......" مجید خان کا قہقہہ سنائی دیا۔ "یہ مر جائیں تو پارٹیوں کو شہید مل جاتے ہیں، یہ تو مر کر بھی سوا لاکھ کے ہوتے ہیں، ان کی اموات کی تحقیق کا مطالبہ پریشر والس بن کر پارٹی کے خزانے بھرتا ہے، ہونٹوں پر انگلیاں رکھ کر شی، شی، چپ، چپ کے اشاروں کے پیچھے بریف کیس اِدھر سے اُدھر منتقل ہوتے ہیں۔ ان کی موتوں کے فیصلے بڑی سوچ سمجھ کر کیے جاتے ہیں، ان کی طرف گولی، نفع نقصان کے تعین کے بعد ہی آتی ہے جب ہی تو اکثر یہ بچ جاتے ہیں اور ہم مر جاتے ہیں۔"

"ہوں......" اجنبی آواز پُرسوچ انداز میں بولی۔ "تُو نے مفتی صاحب کی بات سنی تھی ناں کل مجید خان، سنا تھا وہ کیا فرما رہے تھے؟"

"ایک مفتی صاحب اکیلے نہیں، چاروں طرف علما اور مولوی صاحبان یہ ہی فرما رہے ہیں جو کل سنا...... مگر ہم کیا جانیں، علمائے دین جانیں اور وہ جانیں جنہوں نے گستاخی کی ہے، دیکھ لینا ایک روز جلد ہی یہ قصہ بھی بریف کیسوں کی آڑ میں چھپ جائے گا۔" مجید خان بولا تھا۔

"نہیں مجید خان، اس بار صرف بریف کیس چلتے دکھائی نہیں دیتے، اسی طرح سب کے سامنے آ کر معافی مانگنی ہوگی اور توبہ بھی کرنی پڑے گی جیسے وہ گستاخانہ بات کی گئی تھی۔ خون کھول رہے ہیں اور تن بدنوں میں آگ سی لگتی محسوس ہو رہی ہے۔" اجنبی آواز میں نہ جانے کیا تھا جو زرنگار کو بھی اپنا دل ڈولتا محسوس ہوا، اگرچہ ...اس کی سمجھ میں اس پوری گفتگو کا ایک بھی حصہ نہیں آیا تھا لیکن اسے خود اپنا آپ ایک خوفناک سمندر میں تیرتا محسوس ہونے لگا تھا، ایسا سمندر جس میں ہر طرف خوفناک جبڑے کھولے مگر مچھ اس کی طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے۔

"اور اب یہ مہرزاد خان۔" اس نے سفر کے دوران سنی گفتگو کی یاد سے باہر نکلتے ہوئے سوچا تھا۔ "یہ جس "کسی اور" کی بات سنا رہے ہیں، وہ کون ہے جو میں اس کے بارے میں سوچ رہی ہوں اگر وہ صحیح ہے تو پھر اب تو میں مکمل طور پر اُسی کے اختیار میں ہوں، اس نے مجھے ہاتھ تک بھی کیوں نہیں لگایا، کیا یہ مجھ پر کچھ ثابت کرنا چاہتا ہے یا اس کے ذہن میں کوئی اور بات ہے۔" وہ سوچ، سوچ کر ایک بار پھر پاگل ہونے لگی تھی۔

"مس، پلیز آپ اپنا لباس تبدیل کر لیں اور اپنے لیے آیا ہوا کھانا کھا لیں۔" اسی دم دروازے پر دستک دینے کے بعد اندر داخل ہونے والی ایک ادھیڑ عمر خاتون نے اسے کہا تھا۔ "سردارزادہ صاحب کا سختی سے حکم ہے کہ یہاں آپ کا بہت زیادہ خیال رکھا جائے، آپ کے لیے جو خصوصی شاپنگ کی گئی ہے۔ اس کے بیگز یہاں پہنچ چکے ہیں۔ آپ مجھ سے کوآپریٹ کریں تاکہ میں اپنا کام سکون سے کر سکوں۔" کسی روبوٹ کی طرح یہ جملے اس سے کہے گئے تھے۔

پھر کپڑوں جوتوں اور سامانِ آرائش سے بھرے شاپنگ بیگز کمرے میں لائے گئے۔ ادھیڑ عمر خاتون نے ایک کے بعد ایک لباس نکال کر اسے دکھانا شروع کیا۔ موسم کی مناسبت سے بنے کپڑے، سادہ اور دیدہ زیب ڈیزائن سے مزین شلوار قمیصوں کے ساتھ بڑے چادر نما دوپٹوں والے سوٹ اس کے سامنے رکھے تھے، کسی ایک بھی قمیص کی آستینیں چھوٹی تھیں نہ گلا گہرا تھا، زرنگار کا سر ایک مرتبہ پھر چکرانے لگا تھا۔

"چلیں مس، مجھے بتائیں، آپ ان میں سے کس لباس کا انتخاب کریں گی۔" ادھیڑ عمر خاتون پوچھ رہی تھی۔ کسی معمول کی طرح زرنگار نے اپنے سامنے رکھے جوڑوں میں سے ایک جوڑا مع چادر نما دوپٹے کے اٹھایا اور واش روم کی طرف چل دی۔ اچھی طرح طویل غسل لینے اور وہ کپڑے پہن لینے کے بعد اس نے

ڈریسنگ روم کی دیوار میں جڑے آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر وہ چادر نما دوپٹا سر پر اوڑھا تھا۔ زرنگار کے اندر سے اچانک کہیں میرال صلاح الدین آکر اس کے سراپے پر چھانے لگی۔ اس نے اس سراپے پر میرال صلاح الدین کو نہ جانے کتنے عرصے بعد دیکھا تھا، اس کا دل چاہا وہ آئینے کی طرف دیکھتی چلی جائے۔ کیسا احساس تھا جو اچانک در آیا تھا اور جلتے جسم، آبلہ پا روح کو سکون پہنچانے لگا تھا۔

''مس کیا آپ شاور لے چکیں؟'' دروازے پر پڑتی دستک کے دوران آتی آواز نے اسے اس سکون بخش احساس سے نکالا تھا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر گردن موڑ کر ایک بار پھر آئینے میں دیکھنے لگی۔

''تم نے دیکھا، تم مر کر بھی نہیں مریں، تم نے دیکھا مارنے والے سے بچانے والا طاقت ور ثابت ہوا۔'' اس کے کان میں جیسے کسی نے سرگوشی کی تھی۔ اس نے چونک کر چاروں طرف دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا۔

''مس پلیز میری بات کا جواب دیجیے۔'' باہر سے آواز آئی۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

''اوہ...... تو آپ شاور لے چکیں۔'' ادھیڑ عمر خاتون کے سینے میں دبی سانس خارج ہوئی۔ شاید وہ اس کے جواب نہ دینے پر کسی خیال کے تحت ڈر گئی تھی۔

''آپ پہلے کھانا کھالیں...... پھر میں آپ کے بال سنوارتی ہوں۔'' اس نے کہا تھا۔ ''ارے آپ نے گیلے بالوں پر ہی دوپٹا اوڑھ لیا۔'' پھر اس کے ہاتھ اس کے دوپٹے کی طرف بڑھے۔

''نہیں......'' اس نے دوپٹے کو گردن کے اوپر دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے جکڑتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ نہیں اتاروں گی۔''

''اوکے...... اوکے......'' وہ سر ہلا کر بولی۔ ''آئیں اب کھانا کھالیجیے۔'' اس نے ایک بڑی میز پر سجے کھانے پر نظر ڈالی۔ قسم ہا قسم کے پکوان مکمل سجاوٹ کے ساتھ اس کے سامنے رکھے تھے۔

''تمہیں بھوک لگ رہی ہے، نہ جانے کب سے تو تم نے کھانا نہیں کھایا، چلو اطمینان سے بیٹھ کر اپنی بھوک مٹالو، ایسا دسترخوان اور ایسا کھانا تمہیں کہاں ملے گا۔'' وہی سرگوشی ایک بار پھر اس کی سماعت میں اتری اور وہ ایک بار کسی معمول کی طرح کھانے کی میز کی طرف بڑھی تھی۔

اس روز نہ جانے کتنے سالوں بعد زرنگار کے وجود سے باہر نکل کر میرال صلاح الدین نے کھانا کھایا تھا ایک ایسا کھانا جس کے ہر، ہر لقمے نے جیسے اس کے اندر اتر کر اپنے رزقِ حلال ہونے کی خود گواہی دی تھی۔

☆☆☆

تاؤ شریف نے سر اٹھا کر اپنے اردگرد بکھری ویرانی پر نظر ڈالی، اس کمرے میں جہاں وہ بیٹھا اب بھی ہمیشہ کی طرح ہارمونیم کی صفائی میں مشغول تھا ہر چیز پر سوگواری چھائی ہوئی تھی اور اجاڑ کا سا سماں تھا۔ ہر طرف جیسے ہُو کا عالم سا طاری تھا، آوازیں، ہنسی مذاق قہقہے، چوڑیوں کی جل ترنگ، پائلوں کی چھن، چھن کچھ بھی سنائی نہیں دیتا تھا، یہ سکوت خوف کی علامت تھا یا ویرانی کی، اسے دونوں میں فرق جانچنا نہیں آرہا تھا۔ گزشتہ شب امراؤ بیگم کے اس سجے سجائے گیسٹ روم کے ساتھ انہونی گزر گئی تھی۔ صوبائی پولیس نے اس بنگلے پر اچانک ریڈ کرتے ہوئے اندر داخل ہونے کی جرأت کرلی تھی۔ امراؤ بیگم اپنے مہمانوں اور ان کے لیے تیار کی میز بانوں سمیت اس جرأت پر ششدر رہ گئی تھی۔ پولیس کی اس ریڈ کی انتہا یہ تھی کہ اسے ٹالنے کے لیے کوئی رابطہ کام آیا نہ ہی پیسے...... پولیس بڑے پکے پیروں کے ساتھ امراؤ بیگم کے ساتھ دو، دو ہاتھ کرنے وہاں

آئی تھی۔ وہ بڑے صاحب جو اپنے چھوٹے صاحبزادوں سمیت امراؤ بیگم کو تا مرگ کُھل کھیلنے کے پرمٹ دکھاتے تھے ان کے نمبر بھی امراؤ بیگم کی کالیں سنتے ہی بند ہوگئے اور کوئی ریڈ کو کمانڈ کرنے والے کے پیٹ میں لات مارنے کی جرأت بھی نہیں کرسکا تھا۔

''ہائے ککھ نہ رہے ان جنم جلوں کا...... وستو آسے پاسے کی کوٹھیاں انہیں نظر نہ آئیں۔ سیدھے مجھ غریب ہی کے ٹھکانے پر آپہنچے......'' امراؤ بیگم رابطے کرنے میں ناکام ہوتی ہاتھ ملتی اِدھر سے اُدھر دوڑتی پھرتی کہہ رہی تھی۔ امراؤ بیگم کے وہ مہمان جن کے چہرے اور حیثیتیں پولیس پہچانتی تھی، انہیں وہاں سے رخصت کرکے ان کی گاڑیوں میں بٹھا کر بھگا دیا گیا تھا اور وہ سب بھی امراؤ بیگم کی عزت پر چار حرف بھیج کر اپنی عزتیں بچاتے، اکڑتے، مسکراتے وہاں سے نکل گئے تھے...... امراؤ بیگم بے بس نظروں سے انہیں جاتے دیکھ کر رہ گئی تھی، پولیس نے باعزت لوگوں کی عزتیں، محفوظ کرنے کے بعد امراؤ بیگم اور اس کی لڑکیوں کا رخ کیا تھا، وہ کیسے اپنی، اپنی چھڑیوں سے ہنکاتے سب کو لائن میں لگا کر گاڑیوں میں بٹھا کر لے گئے تھے، تاؤ شریف نے یاد کیا۔

''بے چاری امراؤ بیگم......'' اس نے سر ہلاتے ہوئے سوچا۔ ''جب تک اس محلے کے کوٹھے پر اپنا لاؤ لشکر لے کر بیٹھی تھی اپنے سر پر تھی۔ پولیس کی مجال نہیں تھی دروازوں اور دریچوں سے ڈنڈے کھڑکا کر اپنا حصہ وصول کرلینے سے آگے قدم بڑھا سکے لیکن اس جدید بالاخانے میں وہ بڑے لوگوں پر تکیہ کیے بیٹھی تھی اور انہی بڑے لوگوں کے گٹھ جوڑ یا پھر چوکھی کا شکار ہوگئی تھی۔''

''بڑی دفعہ سمجھانے کی کوشش کی تھی امراؤ بیگم اپنی حد سے آگے مت بڑھو۔'' تاؤ شریف نے اداس

ہوتے ہوئے سوچا۔ ''کوٹھوں میں چوبارے والے آن بسیں تو انہیں...... نئے سرے سے آداب کاروبار بھی سیکھنے پڑتے ہیں مگر تم ایسے ہو جیسے راج ہنسوں...... کی دنیا میں بطخ آن بیٹھی ہو، نہ قیں قیں چھوٹتی ہے نہ گردن سیدھی ہوتی ہے پھر بھی ضد ہے کہ میرا درجہ بھی بلند ہو گیا، میں بھی راج ہنسوں کی قوم قبیلے کی فرد بن گئی ہوں۔ اب یہ کیسے پتا چلے کہ جن راج ہنسوں نے بطخ کو گلے لگا لیا وہ کب اور کیسے اپنی اوقات سے مجبور ہو کر بطخ کو اپنے پنجوں تلے لے کر اس کی چھوٹی سی سری کچل ڈالیں، اب بھگتو۔'' اس نے تصور میں امراؤ بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے سوچا۔ ''اگر گزشتہ رات سارے فون بند ملنے لگے تھے تو اتنی جلدی کدھر کھلیں گے، اب تو وہ وردی والے تمہاری چھوٹی بطخوں کا نذرانہ بھی قبول کر لیں گے اور حوالات کے تالے بھی بند رکھیں گے اور اِدھر یہ جو ڈیرا تم نے سجایا تھا اس پر وحشتیں آن بسیرا کر لیں گی۔ وہ بینک اکاؤنٹس اور لاکرز جو نہ جانے کن، کن معصوموں کی چیخوں اور آہوں کو دبا کر تم نے بھرے تھے شاید عمر بھر نہ کھلیں اور ان میں موجود ذخیرے سرکار کے کار ہی چلانے کے کام آیا کریں گے۔'' تاؤ شریف کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھری اور اس نے اپنا سفید جھک بالوں سے سجا سر جھٹکا۔ ''خیر ہوئی جو اُن وردی والوں نے مجھ غریب کو ساتھ نہیں دھر لیا، بڈھا سمجھ کر ناکارہ اور بیکار مال کہہ کر یہیں پھینک گئے ورنہ اس عمر میں میری بھی ہڈیاں سینکی الگ جاتیں اور زخموں پر مرہم لگانے کو بھی بھیک الگ مانگنا پڑتی۔''

''سارا فساد اس ناس پیٹے سردار زادے کا اٹھایا ہوا ہے۔'' اس ویرانی کے کسی گوشے سے جندو باہر نکل کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ''اس نے لڑکی بھی یہاں سے نکال لی اور اِدھر چھاپا بھی پڑوا دیا۔ کتنا کہا تھا ملتان والی نے امراؤ بیگم سے کہ نہ سودے کر ہزار راتوں کے، نوٹوں کی گڈیاں اکٹھی دیکھ کر تیری آنکھوں پر چربی چڑھ گئی ہے، اندھی ہو گئی ہے تو، دیکھ لینا ایک روز تیری دُم ہو گی اور اس سردار زادے کا پیر ہو گا...... دیکھا......؟'' وہ غصے بھری نظروں سے تاؤ شریف کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''ملتان والی نے عمر گزاری ہے، وہ سب کے تیور جانتی ہے، امراؤ بیگم تو باؤلی ہے باؤلی...... لالچ میں اندھی ہو کر خود تو پھنس ہی گئی ہے، ہم غریبوں کو بھی لاوارث کر گئی۔''

''اب اس لکیر کو پیٹنے کا کوئی فائدہ وائدہ نہیں جندو......'' تاؤ شریف نے ہارمونیم پر مخملی غلاف چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اپنا سامان باندھ اور چل نکل اِدھر سے۔''

''ایسے ہی چل نکلوں؟'' جندو نے سر جھٹکا...... ''ملتان والی اپنے داؤ چلا رہی ہے، اس نے اِدھر اُدھر رابطے چلا رکھے ہیں، ایک آدھ دن میں وہ اِدھر پہنچ جائے گی، سارے معاملے وہ سنبھال لے گی، امراؤ بیگم نہ بھی نکلے تو مٹی ڈال کر اس کے معاملے پر وہ اپنے معاملے لاہور میں شروع کر لے گی تو دیکھنا تو سہی اُسے کیسی عقل والی عورت ہے وہ۔''

''اوہ...... واہ بھئی جندو۔'' تاؤ شریف نے ہارمونیم کا غلاف ایک جھٹکے میں اتارتے ہوئے کہا۔ ''تیری تو تیسری آنکھ بھی کھلی ہے، صدقے بھئی تیری عقل کے۔'' اس کے دل پر چھائی اداسی اور ویرانی ایک دم ہوا ہوئی۔ ''میرا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا۔ بھگتے اب امراؤ بیگم اپنے کرتوتوں کی سزا، ہم غریبوں کا کیا لینا دینا اس کے سودوں اور سودے بازیوں سے، ہم تو فنکار لوگ ہیں، امراؤ بیگم نہ سہی ملتان والی کے لیے باجا بجائیں گے، رزق روٹی بھی تو کمانی ہے، کون اس عمر میں نئے سرے سے ٹھکانے تلاش کرتا پھرے۔''

کمرے کی مشرقی دیوار پر سجے وال کلاک نے اُسی دم بارہ کا گھنٹا بجایا تھا، اس کا پنڈولم دائیں، بائیں

حرکت کر رہا تھا، وقت اپنی ستم ظریفی پر ہولے سے مسکرانے لگا تھا۔

☆☆☆

''پارلیمنٹ کے ایوانوں میں، پارلیمنٹ لاجز میں، پریس کلبز میں کل سے ایک ہی خبر گرم ہے سردار زادہ صاحب اور اس خبر کا تعلق آپ سے ہے۔'' نیوز چینل کے رات آٹھ بجے والے ٹاک شو کے معروف و مقبول اینکر نے سوال کیا تھا، یہ سوال کرتے وقت اس کے چہرے پر ایک غیر معمولی مسکراہٹ تھی۔ ایسی مسکراہٹ جو بہت کچھ جتا رہی تھی۔

''ویسے تو آج کل ہر گرم خبر کا تعلق اس ناچیز سے ہی جوڑ دیا جاتا ہے۔'' مہرزاد خان نے جواب میں اپنی مخصوص نرم مسکراہٹ چہرے پر بکھیرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن پھر بھی جس خبر کا ذکر آپ کر رہے ہیں اسے جب تک آپ elaborate نہیں کریں گے میں اس کا جواب کیسے دے سکتا ہوں۔''

''اچھا......؟'' اینکر اس کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں بولا۔ ''کیا وجہ ہے کہ ہر گرم خبر کا تعلق آپ ہی سے جوڑ دیا جاتا ہے اور بھی تو بہت سے منسٹر صاحبان، پارٹی ہائی اپس اور ممبرانِ اسمبلی ہیں، گرم خبریں ان میں سے کسی سے کیوں نہیں جوڑی جاتیں؟''

''اس لیے کہ اس ناچیز کو وزارت ہی ایسی عطا ہوئی جس کے تحت خبروں کی گردش کے سوا اور کوئی کام نہیں ہوتا۔'' وہ بدستور اسی طرح مسکراتے ہوئے بولا۔

''خیر آپ کی وزارت کے لیے تو اور بھی بہت دکھ ہیں محبت کے سوا، راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا۔'' معنی خیز بات اینکر کے منہ سے نکلی۔

''محبت کے سوا جو دکھ ملا وہ بھی کیا دکھ ہوگا اور وصل کی راحت سے کسی اور راحت کا کیا مقابلہ......!'' اُتنا ہی معنی خیز جواب مہرزاد خان کی طرف سے آیا۔

''تو کیا گزشتہ روز جو وی آئی پی موومنٹ لاہور سے دارالحکومت کی طرف ہوئی اس کا تعلق محبت اور راحت سے ہے؟'' ڈھکا چھپا سوال آیا۔

''کون سی وی آئی پی موومنٹ کی بات کر رہے ہیں آپ...... لاہور سے اس شہر تک تو درجنوں وی آئی پی موومنٹس ہوتی ہیں روزانہ...... آپ کسی ایک کو ان سب میں سے سنگل آؤٹ کر سکتے ہیں کیا......؟''

''میں اُسی موومنٹ کی بات کر رہا ہوں خانزادہ صاحب جس نے اقتدار کے ایوانوں میں اپنے پیچھے بہت سی چہ مگوئیوں کو جنم دے دیا ہے۔''

''چہ مگوئیوں کا تعلق بھی ہمیشہ مجھ ہی سے کیوں جوڑ دیا جاتا ہے، میں سمجھنے سے قاصر ہوں، ارے بابا، مجھے کام کرنے دیں، میں کام کرنے آیا ہوں، چہ مگوئیاں سے دل نہیں بھرا اب تک آپ لوگوں کا ہمیہ اقتدار کا آخری سال ہے جب میں اس وزارت میں آیا، مجھ سے پیچھے تین وزرا بدلے جا چکے ہیں اس وزارت میں، چہ مگوئیاں ان کے دور میں بہت ہو چکیں اب میرا وقت ہے بابا مجھے کام کر لینے دیں، اگلے الیکشن میں جا کر ووٹ مانگنے جتنا کام تو کر لینے دو آپ لوگ......''

''دیکھ لیں سردار زادہ صاحب......'' اینکر نے ایک بار پھر معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''بات ٹال رہے ہیں آپ۔''

''ارے مجھ سے پوچھیں آپ، ان کا تو کام ہی باتیں بنانا ہے۔'' پروگرام میں شریک مخالف پارٹی کا ممبر

اسمبلی بولا۔ ”مجھ سے پوچھیں ان کی وزارت نے ان کے حلف کے دن سے لے کراب تک کتنے کام کیے ہیں، میں انگلیوں پر گن کر بتا تا ہوں آپ کو۔“

”ان سے آپ ذرا یہ پوچھیں کہ کوئٹہ کے حالات پر جس روز وزارتِ اطلاعات ونشریات کے سیکرٹری صاحب...... پریس کانفرنس کررہے تھے، اس وقت یہ موصوف خود کدھر تھے؟“ پروگرام کا تیسرا شریک بولنا شروع ہوا۔

”آپ ان کی مومنٹس پر مٹی ڈالیں صاحب...... آپ ان سے پوچھیں ذرا کہ ڈپٹی اسپیکر صاحب کے حلقے میں استعمال ہونے والے فنڈز کے غلط استعمال کی خبر درست یا غلط ہونے کے بارے میں ان کی وزارت نے اب تک چپ کیوں سادھ رکھی ہے؟“ کراچی اسٹوڈیو میں بیٹھا شریک چلّایا۔

”چائنا کے سفیر نے وزارتِ مذہبی امور کے مشیر سے جو خصوصی ملاقات کی، اس کی تفصیل کیوں روکی گئی، آج میں آپ کو بتانا چاہوں گی کہ جب سے سردارزادہ صاحب نے وزارت سنبھالی ہے، خبریں، اداریے، کالمز سب بھاری لفافوں کی ترسیل کے ذریعے رکوائی اور جاری کروائی جارہی ہیں۔“

”آپ ثبوت پیش کریں بی بی! خالی الزام مت لگائیں آپ ثبوت پیش کریں، میں ابھی اور اسی وقت وزارت سے استعفیٰ دینے کو تیار ہوں اگر آپ کا الزام سچ ثابت ہوجائے تو۔“ مہرزاد نے پیالی میں جوش کا طوفان اٹھانے کی خاطر کہا۔ آنِ واحد میں ٹی وی اسکرینز، مچھلی مارکیٹ کا منظر پیش کرنے لگیں۔ انگلیاں ایک دوسرے پر اٹھنے لگیں اور آوازیں بلند ہوتی چلی گئیں۔ میزبان اور مہرزاد خان ٹاک شو کی میز کے نیچے آپس میں ٹیکسٹ میسجز کا تبادلہ کرنے میں مصروف تھے۔ اس کے بعد اس پروگرام میں کسی گرم خبر کا ذکر نہیں کیا گیا۔

☆☆☆

فہد کو چیف منسٹر کی طرف سے ملاقات کا وقت ملنے کا پیغام اس وقت ملا جب وہ اپنے اُس دوست سے مایوس ہوکر کسی دوسرے رابطے کی طرف متوجہ ہونے کا ارادہ کررہا تھا جس نے یہ ملاقات کرانے کا وعدہ کیا تھا۔ چیف منسٹر سے ملاقات کے لیے جاتے ہوئے وہ اپنے دل میں زیادہ پُرامید نہیں تھا کہ وہاں سے اسے اپنے معاملے پر کوئی مدد مل جائے گی لیکن چیف منسٹر سے ملاقات کے دوران وہ جو تھوڑی بہت امید اس کے دل میں تھی وہ بھی ختم ہوگئی۔ جو شخص چیف منسٹر کی شکل میں اس کے سامنے بیٹھا تھا اسے فہد کی بات سننے کے بجائے اس کے کوکنگ شوز پر خود کو دی گئی بریفنگ کے مطابق معلومات جھاڑنے کا خبط سوار تھا۔

”سائیں اِدھر ہمارے جو کک ہیں ناں بابا، ان کو بھی کوئی ٹپ بتا جاؤ ناں آپ...... ان لوگوں کو سیال مانی، سائی بھاجی، فوتو وارو تیوان، سیال پالو والو، کچھ نہیں بنانا آتا سائیں...... آپ ہمارا کچن کو رونق بخش دیو سائیں تو ایک ڈنر کا رونق ڈبل ہوسکتا ہے۔“ فہد کو محسوس ہوا وہ شخص ہوش میں نہیں تھا شاید اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

”ضرور سر۔“ اس نے پھر بھی اپنی حیرت اور غصے پر قابو پاتے ہوئے تحمل کے ساتھ کہا۔ ”لیکن میں ممنون ہوں گا اگر آپ میری درخواست پر بھی غور فرمالیں۔“

”درخواست......؟“ اس شخص نے اپنے سیاہ رنگ رنگے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوالیہ انداز میں فہد کی طرف دیکھا اور پھر نیم مُندی آنکھوں سے اپنے سیکرٹری کی طرف دیکھنے لگا۔ سیکرٹری نے جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کے انداز میں کچھ کہا۔

”ہاں......“ سیکرٹری کی بات سننے کے بعد اس شخص جو چیف منسٹر تھا۔ نے سر پر شیشے جڑی ٹوپی رکھتے ہوئے سر ہلایا۔ ”مجھ کو پتا ہے کہ تم نے کیا درخواست کی مگر سائیں۔“ ٹوپی پہنتے ہاتھ لمحے بھر کو رکے...... ”دیکھو ناں یہ وفاق اور دوسرے صوبے کا معاملہ ہے، میں اس میں کدھر ٹانگ اَڑاتا پھروں بابا، ہمیں تو وہ ایسے معاملوں میں دخل نہیں دینے دیں گے ناں سائیں۔“

”سر...... وفاق اور صوبے کا نہیں، پارٹی کا اندرونی معاملہ ہے جناب......“ فہد کو اس شخص کی بے نیازی پر طیش آنے لگا تھا۔ ”پارٹی کے فرنٹ پر تو بات کرسکتے ہیں ناں آپ......“

”ارے بابا صوبہ اپنا، اپنا، معاملہ اپنا، اپنا......“ اس شخص نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے مزید لاتعلقی ظاہر کی۔ ”اِدھر اپنی، اپنی پڑی ہے سبھی کو...... اُدھر ہم لوگ جو اوپر والوں کو بولیں بھی منسٹر صاحب کے ہاتھ میں لڑکی کا معاملہ ہے، اِدھر دوسرے صوبے میں وہ لڑکی کہیں بند کر کے رکھی ہوئی ہے، ہمارا مطالبہ ہے لڑکی کو باہر نکالو اس کے اگلوں، پچھلوں کے حوالے کردو تو آپ خود دیکھو ناں سائیں۔“ وہ خوشامدی سی شکل بنا کر فہد کی طرف دیکھنے لگا۔ ”بات بنتی نہیں ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”وہ تو سیدھے سیدھے مجھی کو کِک آؤٹ کردے گا بڑا صاحب...... بولے گا شاہ جی، آپ اپنے معاملے چلاؤ اِدھر اُدھر کی ہوا میں لاٹھیاں چلانے کی کوشش نہ کرو...... ارے بابا......“ اس نے فہد کے سامنے ہاتھ جوڑے...... ”معاملے نمٹانے کو اِدھر اپنی عوام تھوڑی ہے جس کے معاملے نمٹانے کو ہم اِدھر بیٹھے ہیں، مجھ کو کیوں بڑی گلیوں کے معاملوں میں گھسیٹتے ہو سائیں۔“

فہد نے تلملا کر پہلو بدلا، اسی اوٹ پٹانگ گفتگو کے دوران ایک صوبائی وزیر بھی کمرے میں آکر چیف منسٹر کے سامنے والے صوفے پر براجمان ہوچکا تھا...... فہد نے دیکھا مکار لومڑ جیسی شکل کا وہ شخص گفتگو کو دھیان سے سن اور سمجھ رہا تھا۔ وہ چیف منسٹر کو بات سمجھانے کا گُر بھی جانتا تھا۔

”سائیں یہ میڈیا والے لوگ ہیں، ان کی خاطر خدمت ہمارا فرض ہے۔“ اس نے گفتگو میں کودتے ہوئے چیف منسٹر کو مخاطب کیا۔ ”ہم ان کی بات نہیں سنیں گے تو یہ بھلے لوگ کیا اس کو بولتے ہیں سلور اسکرین پر اپنا مدعا بیان کرنے لگیں گے، عوام کے سامنے ڈائریکٹ اپنا کیس رکھ دیں گے۔ اِدھر آپ کے پاس آکر بھی اب فہد سائیں کی بات نہ سنی جائے گی تو پھر تو بابا یہ مجبور ہوجائیں گے؟ دوسرا راستہ پکڑنے پر...... آپ سائیں فکر نہ کرو چیف منسٹر صاحب ڈور ضرور ہلائیں گے۔ اِدھر سے بھی پریشر پڑنے لگے گا تو وہ جو اُدھر بیٹھے ہیں معاملے کا نوٹس لینے پر مجبور ہوجائیں گے۔ کیوں سائیں!“ اس نے چیف منسٹر کی طرف دیکھا، اس کی نظروں میں نہ جانے کیا پیغام تھا جسے پڑھتے ہی چیف منسٹر کے دماغ پر چھایا سُرور کچھ زائل ہوتا نظر آیا۔

”ابھی شام کے سوا سات ہی بجے ہیں سائیں۔“ چیف منسٹر نے اپنے لہجے کو بدلتے ہوئے فہد کی طرف دیکھا۔ ”آج اِدھر بڑا ڈنر رکھا ہے ہم نے، آپ اس میں کیا بولتے اس کو۔“ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”انوائٹڈ۔“ اس نے فہد کی طرف دیکھا۔ ”وہاں انوائٹڈ ہو آپ اس میں اُدھر وہ سردارزادہ صاحب بھی آنے والا ہے اور وہ کچھ اور کام کے لوگ بھی۔“ اس نے فہد کو آنکھ مارتے ہوئے کہا اور باچھیں پھیلا کر ہنس دیا۔ ”آپ انجوائے کروگے ڈنر اور موقع پا کر اس کو بھی پکڑ لینا بابا، وہ جو آپ کو مطلوب ہے، اس سے دو گھڑی بات بھی ہوجائے گی آپ کی۔“

”ارے یہ تو بہت اچھا ہے۔“ فہد نے چیف منسٹر کی طرف سے ملی ساری کلفت بھلا کر خوش ہوتے ہوئے سوچا۔ ”اگر براہِ راست میں اس تک پہنچ جاؤں تو شاید اس کا منہ نوچنے کا ہی موقع مل جائے۔“ اس نے ا۔

جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک بات سوچی اور اس پر خود ہی ہنس دیا۔

لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اگلے چند گھنٹے اس کی زندگی کے سب سے طویل اور صبر آزما گھنٹے ثابت ہونے والے تھے۔ چیف منسٹر کے ڈنر میں سردارزادہ مہرزاد خان صوبے میں اپنی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے شامل نہیں ہو سکا تھا لیکن اس ڈنر میں بہت سے ایسے لوگ شریک تھے جن میں سے اکثر کو فہد اپنی ذاتی حیثیت میں جانتا تھا اکثر کو چہروں اور نام سے پہچانتا تھا اور چند کے صرف نام سن رکھے تھے۔ سیاستدان، صحافی، شوبز سے تعلق رکھنے والے بڑے، بڑے نام، فیشن ڈیزائنرز، نامور مصور، کھلاڑی، اہلِ قلم، دانشور، مفکر وہ سب جو خبروں میں ٹاک شوز میں، مارننگ شوز میں خود پر لکھے یا لکھوائے گئے کالمز میں، مہذب، معقول، شریف، معصوم، علم والے، عقل والے اور فکر والے دکھائی دیتے تھے۔ چیف منسٹر کے اس عالیشان حمام میں سب ہی صاف عریاں دکھائی دیتے تھے..... اس جگہ پر وہ سب اپنے، اپنے ہنر اور وجۂ شہرت سے بے نیاز ایک جیسے دکھائی دے رہے تھے۔ فہد نے دنیا کے بیشتر ممالک دیکھ رکھے تھے۔ ترقی یافتہ، ترقی پزیر اور غیر ترقی یافتہ بھی، وہ ہر طرح کی اقوام کی سائیکی سے واقف تھا لیکن اس رات جو منظر اس نے اس ڈنر میں دیکھے تھے انہیں دیکھنے کے بعد اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس سے پہلے وہ کچھ نہیں جانتا تھا، اس نے کچھ دیکھ نہیں رکھا تھا۔ عام انسانوں سے تہذیب سے گری حرکتوں کی توقع کی جا سکتی تھی مگر وہ لوگ جو اپنے، اپنے پیشوں اور ناموری کے لحاظ سے طبقۂ خاص میں شمار ہوتے تھے ان سے...... homo erectus (پری ہسٹورک انسانوں کی نسل) کی سی غیر مہذب...... اخلاق باختہ حرکتوں کی توقع کم از کم وہ کبھی نہیں کر سکتا تھا، اس رات فہد کو پہلی بار خود کے انسان کہلائے جانے سے نفرت محسوس ہوئی اور اس کا دل ایک نہ ختم ہونے والے دکھ میں مبتلا ہونے لگا۔

''یہ وہ ملک ہے جہاں عوام کے نمائندے نشے میں دُھت ہو کر عوام کی درخواستوں کے لفافے کھول کر دیکھتے ہوں، جہاں اہلِ علم، اہلِ فن، قلم کار، دانشور، پالیسی ساز اور قانون دان شراب کے سمندر میں تیرتے ہوئے کھلم کھلا انسانیت کے اصولوں کی دھجیاں اُڑانے میں مشغول رہتے ہوں۔ ایسے کسی بھی ملک میں دن کے چوبیس گھنٹوں میں ہر آدھے گھنٹے کے بعد کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی میرال صلاح الدین کا اغوا اور اس کی عصمت کا گلا گھونٹے جانے کے سے واقعات پر تعجب کرنے اور ان پر بے قرار ہونے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ دنیا کے ایسے خطوں میں اس قسم کے واقعات معمول کا حصہ بن جاتے ہیں اور ان پر نصیحت، حماقت کے سوا کچھ نہیں......'' اس نے سوشل ویب سائٹ پر میرال صلاح الدین نامی صفحے پر اپنی رائے پوسٹ کرتے ہوئے لکھا تھا۔

☆☆☆

''تم تو شاید مجھے بھول ہی گئے ہو، اتنے مصروف ہو کہ نہ رشتہ یاد رہا نہ دوستی۔'' اس روز نگین کو اپنی پھوپی کے گھر پر بہت دن بعد حمزہ نظر آیا اور اس نے اس سے شکوہ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

''مصروفیت کی حد تک تمہاری بات ٹھیک ہے مگر بھول جانے والی بات ٹھیک نہیں۔'' وہ ہلکا سا مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ نگین کو وہ پژمردہ اور تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اداسی تھی اور چہرے پر بے سکونی بھی...... لیکن وہ خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کیا بات ہے کیا تم کسی بات پر پریشان ہو......؟'' نگین اپنا شکوہ بھول گئی۔

''کیا میں پریشان نظر آ رہا ہوں......؟'' جواب میں حمزہ نے سوال کیا۔

''یقیناً...... جب ہی تو پوچھ رہی ہوں۔''

''پتا نہیں......'' وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا...... ''پتا نہیں میں پریشان ہوں یا کوئی اور بات ہے...... لیکن سچ ہے کہ میں خوش نہیں ہوں......'' اس نے نگین کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی بات کی تصدیق کی۔

''وہی میرال والی بات پر......'' نگین نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ جواب میں حمزہ نے سر جھکا دیا۔

''تمہیں پتا ہے نگین......'' کچھ دیر بعد وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا...... ''میرال کے بارے میں جو معلومات تم نے مجھے دی تھیں اُن سے اس کی تلاش کی ساری جہت ہی بدل گئی۔''

''ہاں، میں نے بھی ایک ویب سائٹ پر وہ پیج دیکھا ہے۔'' نگین نے سر ہلایا۔ ''اس لڑکی نینش سے مراد کا رشتہ تو نہیں ہو سکا مگر میری اس سے اچھی دوستی ضرور ہو گئی، اس نے مجھے اس صفحے کے بارے میں بتایا تھا۔''

''وہ صفحہ تو چند لوگوں کا ہائیڈ پارک بن کر رہ گیا مگر فیکٹس خاصے گھناؤنے ہیں۔'' حمزہ نے نگین کو معاملے کی سنگینی کا احساس دلانے کے سے انداز میں کہا۔

''میں اندازہ کر سکتی ہوں۔'' نگین نے سر ہلایا۔

''ایسے میں، میرے ذہن میں کبھی، کبھی یہ بات بھی آتی ہے کہ بالفرض ہم کسی طرح اس تک پہنچ بھی گئے اور اس نے ہمیں پہچاننے سے انکار کر دیا۔ ہماری کوششوں پر لات مار دی تو کیا ہوگا؟''

''تمہیں یہ خیال کیوں آتا ہے؟'' نگین نے حیرت سے پوچھا۔

''تم جانتی ہو کہ کن وی آئی پیز کے ساتھ اس کا رابطہ ہے، وہ کیسی جگہوں پر ٹھہرتی ہے، کیسی گاڑیوں میں مووکرتی ہے؟'' حمزہ نے اسے نادر سے سنی بات مختصراً سناتے ہوئے کہا۔

''یہ سچ ہے نگین کہ برائی کی دلدل اس وقت بہت بری لگتی ہے جب انسان پہلی بار اس میں پیر پھنسا بیٹھتا ہے۔ اس وقت وہ اس سے باہر نکلنے کے لیے ہاتھ پیر بھی مارتا ہے لیکن جوں جوں دلدل اسے اپنے اندر کھینچے لیے جاتی ہے اس سے نجات کے راستے ختم ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس وقت بے بس انسان جان جاتا ہے کہ دلدل سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا بے سود ہیں۔ اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں...... تب وہ خود کو اس کے حوالے کر دیتا ہے، ہاتھ چھوڑ دیتا ہے اور دھیرے، دھیرے دلدل کا عادی ہو جاتا ہے۔ مجھے ڈر ہے ایسا ہی کہیں میرال کے ساتھ بھی نہ ہوا ہو...... میرال جو اَب میرال نہیں رہی زرنگار کے نام سے جانی جاتی ہے۔ وہ ایک منسٹر کے ساتھ اٹیچڈ ہے۔ اس کی وی آئی پی موومنٹ کے بارے میں، میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد اب تک وہ اس زندگی کی عادی ہو چکی ہو اور اس سے باہر نکلنا ہی نہ چاہتی ہو۔''

''اوہ......!'' نگین نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ ''تصویر کے اس رخ کی طرف میرا تو دھیان ہی نہیں گیا کبھی۔''

''بس یہ ہی سوچ کر میں بے یقین ہو جاتا ہوں اور پریشان بھی۔'' حمزہ نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہم سب، میں، دانیال، دانیال کی والدہ اور فہد ایک سراب کے پیچھے تو نہیں بھاگ رہے؟''

''مگر وہ تمہارے خواب؟'' نگین نے کہا۔ ''یاد کرو وہ خواب جو تم نے مجھے سنائے تھے، میرال کی دادی اور پھر بی اماں والے خواب......''

''ہاں......!'' حمزہ نے سر ہلایا۔''دوسری طرف وہ خواب بھی ہیں جو ایک فیلنگ آف رسپانسبلٹی دیتے ہیں۔ یوں جیسے کسی اور کی نہ بھی ہو تو میری تو ہر حال میں یہ ذمے داری بنتی ہے کہ اسے اس دلدل سے نکال لاؤں......''

''اور وہ جو باقی لوگ ہیں جن کا ذکر تم نے کیا، وہ کیوں میرال کو ڈھونڈ نکالنا چاہتے ہیں؟'' نگین نے پوچھا۔

''وہ بھی کسی نہ کسی حوالے سے اس سے متعلق ہیں، اس اتفاق پر بھی میں حیران ہوتا ہوں، بظاہر وہ ایک لاوارث لڑکی ہے مگر اس کی جستجو کتنوں کو ہے اور اتنی ہے کہ ہر کوئی ہر حال میں اسے اس دلدل سے نکالنے پر تُلا ہوا ہے۔ اس حقیقت کو دیکھ کر میرے اندر نئے سرے سے ایک اسپرٹ ابھرتی ہے۔ مجھے یہ کام کرنا ہی ہے، ہر حال میں، ہر قیمت پر......'' حمزہ نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''تم جانتے ہو، تمہاری ممی کو اس صورتِ حال کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ کتنا طوفان اٹھائیں گی؟'' نگین نے کہا۔

''جانتا ہوں۔'' اس نے ٹراوزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے سر اٹھا کر چھت کی طرف دیکھا...... ''میں نے ڈیڈی کو کانفیڈنس میں لیا ہے، اگرچہ کھل کر ان سے بات نہیں ہوئی مگر انہیں اندازہ ہے۔''

''میری دعا ہے کہ انکل ہی تمہاری سچویشن کو سمجھ پائیں......'' نگین نے کہا۔ ''ہاں، سنا ہے تم سیالکوٹ والے گھر کو رینوویٹ کرا رہے ہو۔''

''ہاں......!'' حمزہ نے سر ہلایا۔ ''میں نے وہ گھر ماموؤں سے خرید لیا ہے، آج کل اسی کا کام کروا رہا ہوں، صبح لاہور میں ہوتا ہوں تو شام کو سیالکوٹ، یہی تو میری مصروفیت ہے۔''

''اسے کیوں رینوویٹ کروا رہے ہو، بی اماں کی خاطر ناں؟'' نگین نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہوں......'' وہ سوچتے ہوئے بولا ''شاید......'' اس نے نگین کی طرف دیکھا۔

''یا شاید نہیں......'' یہ مبہم سی بات تھی۔

''کبھی وقت آیا تو تمہیں بتاؤں گا۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''تمہیں تو ضرور ہی بتاؤں گا۔''

''تم نہ بھی بتاؤ تو شاید میں جانتی ہوں۔'' نگین نے یہ بات سوچی تھی مگر حمزہ سے کہی نہیں...... وہ حمزہ کے انٹروورٹ مزاج سے بہت اچھی طرح واقف تھی۔ وہ مزاجاً گہرا تھا یا ویسے ہی اسے کسی سے اپنے دل کی بات شیئر کرنے کی عادت نہیں تھی۔ جو بھی تھا نگین جانتی تھی وہ اس وقت تک کسی سے کوئی بات شیئر نہیں کرتا تھا جب تک اس کا دل نہیں چاہتا تھا۔ میرال والے قصے کے بارے میں اب تک اس کے دل میں اصل خیال کیا تھا...... نگین اندازہ لگانے کی کوشش کرنے سے آگے شاید کچھ نہیں جان پائی تھی۔

☆☆☆

''میں خود سے یہاں نہیں آئی۔ مجھے بابا جان نے کہا تھا کہ ویک اینڈ اِدھر گزاروں، تمہارے ساتھ......''

مہرزاد نے دل میں الجھتے ہوئے کوفت اور بیزاری کے عالم میں مہ جبیں کی بات سنی تھی۔ یہ وہ لڑکی تھی جس کا انتخاب اس کی ماں نے اس کے لیے کیا تھا۔ اویس خان کی بہن، گڈی کی نند، مہرزاد خان کے خاندان کے ایک تگڑے مرد کی دختر نیک اختر......

''نیک اختر......'' مہرزاد کا منہ کڑوا ہو گیا...... ''دختر کی حد تک ہی بات ٹھیک ہے۔'' اس نے سوچا اور... مہ جبیں کی طرف دیکھا۔ ٹخنوں سے اونچا ٹراوزر، بے بازو کی کُرتی پہنے وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی، ہائی ہیلز میں مقید پیروں کے لمبے ناخنوں پر گہری سرخ نیل پالش نظر آ رہی تھی، یہ ہی سرخ رنگ اس کے ہونٹوں پر بھی سجا تھا۔ آنکھوں میں لائنر تھا، بالوں میں ایک سے زیادہ رنگوں کی لہریں نظر آ رہی تھیں۔

''خاندانی لڑکی، نیک ماں باپ کی جائز اولاد......'' اس کے چہرے پر طنز نے جھلک دکھائی۔

''میری ماں کے اطمینان کا پیمانہ کیا ہے، جس پر یہ لڑکی پوری اتر آئی ہے'' اسے خیال آیا۔

''لیکن میں تو ویک اینڈ پر یہاں نہیں ہوں گا۔'' اس نے دل میں اٹھتے ابال پر قابو پاتے ہوئے... بے نیازی سے کہا۔

''تم کہاں ہو گے؟'' وہ اٹھ کر اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔

''پرائم منسٹر کے ساتھ دبئی جانے والے وفد میں شامل ہوں میں، آفیشل ڈیوٹی پر ہوں میں اس ویک اینڈ پر۔''

''تو کیا ہوا......'' اس نے اس کے بالکل ہی نزدیک آ کر اس کی گردن کے گرد بازو جما دیے۔ ''میں بھی تمہارے ساتھ چلی چلتی ہوں۔''

''آئی ایم سوری......'' مہرزاد نے اس کے بازوؤں سے خود کو چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''یہ ممکن نہیں، وفد کے شرکا فائنل ہو چکے۔''

''تمہارے لیے کیا ناممکن ہے مہرزاد خان؟'' وہ مسکراتے ہوئے اس کے سامنے آ گئی۔ ''بلکہ اس ملک میں تم جیسوں کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں۔''

''بہتر ہے تم زین خان کی طرف چلی جاؤ، تمہارا ویک اینڈ اچھا گزر جائے گا۔'' مہرزاد نے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک ایسی بات کہہ دی جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ تیر کی طرح جا کر مہ جبیں کے سینے میں اتر جائے گی۔

''تاکہ تم آرام سے اپنی اس داشتہ کو اپنے ساتھ دبئی لے جاؤ، جس کو ایک (گالی) کے پہلو سے اٹھا کر اپنے پہلو میں بٹھانے کے لیے تم نے کون، کون سے پاپڑ نہیں بیلے۔'' وہ حسبِ توقع تلملا کر بولی۔

مہرزاد نے محظوظ ہوتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تمہاری عمر ابھی بہت کم ہے بے بی، اتنی بڑی بڑی باتیں تمہارے منہ پر سوٹ نہیں کرتیں۔'' اس نے اسی محظوظ ہو جانے والے انداز میں مسکراتی نظروں سے مہ جبیں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میری عمر کم بھی ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' اس نے اپنے شانوں پر پڑے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مہرزاد کی طرف دیکھا۔ ''اپنے خاندان کے مردوں کے معاملات پر مجھ سے زیادہ اچھی ''ایکسپرٹ معلومات'' کسی دوسرے کے پاس نہیں ہوں گی۔''

''لیول آف انٹرسٹ کی بات ہے۔'' مہرزاد نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ ''تمہیں جس بات میں... انٹرسٹ ہو گا، معلومات بھی اسی کے بارے میں اکٹھی کرو گی ناں......''

''کہو تو تمہاری سب گرل فرینڈز کے نام اور بیک گراؤنڈز بتا دوں بشمول اس انفارمیشن کے کہ تم نے کون سا دن کس کے ساتھ گزارا اور تمہاری کون سی رات میں کون سی والی تمہارے ساتھ تھی۔'' وہ چیلنج لینے کے انداز

میں بولی۔ ''تم بھی مہر زاد خان، گنگا نہائے ہوئے تو ہرگز نہیں ہو۔'' اس کے چہرے پر تمسخر پھیلا۔ ''بس [illegible] ماچو مین بننے کا کریز ہے اور خود کو above any thing ثابت کرنے کا بھی۔''

''اچھا......!'' مہر زاد نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا جیسے اسے مہ جبیں کی معلومات پر شدید حیرت [illegible] ہو۔ ''اتنا کچھ جانتی ہو پھر بھی مجھ سے شادی کرنے کی خواہش مند ہو؟''

''ہاں......'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''کیونکہ میرے پاس کوئی اور چوائس نہیں ہے فی الحال اور کیونکہ اس سیناریو میں جس میں ہم لوگ رہتے ہیں، مجھے بھی ایک قانونی شناخت حاصل کرنی ہے اور کیونکہ اسٹیٹس، عہدہ اور مراعات میرا خاندانی مراق ہے اور، اور......'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی اسے مہر زاد سے شادی کرنے کی [illegible] وجوہات بیان کرنی تھیں۔ ''اور کیونکہ آج کل تم in ہو، ہواؤں میں اڑ رہے ہو اور تمہاری ہوا خاصی تیز ہے تو

"out of a bunch of available idiots you are not a bad choice"

''مجھے تم سے اسی جواب کی امید تھی۔'' مہر زاد نے ایک بار پھر توصیفی انداز میں سر ہلایا۔

''تو...'' وہ شانے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''اپنے خاندان کی ہر دوسری لڑکی کی طرح مجھے بھی اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا کہ اس کا ہونے والا شوہر ہر رات کسی نئی لڑکی کے پہلو میں گزارتا ہے کیونکہ اپنے خاندان کی ہر لڑکی کی طرح میں بھی اس سین کی عادی ہوں۔''

''تم بہت عقل مند لڑکی ہو......'' مہر زاد نے تالی بجا کر اسے داد دیتے ہوئے کہا۔ ''مگر شاید تم یہ نہیں جانتیں کہ جس bunch of idiots میں سے تم نے یہ odd one out والی چوائس قبول کی ہے، وہ شخص احمق ضرور ہے مگر بے غیرت ہرگز نہیں، تمہیں تو شاید میری کسی بھی ایکٹویٹی سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہو مگر مجھے تمہاری ہر اُس ایکٹویٹی سے فرق پڑتا ہے جس کے بارے میں تمہاری طرح میری معلومات بھی خاصی زرخیز ہیں، اس معاملے میں میرا اور تمہارا لیول آف انٹرسٹ ایک ہی سا ہے۔''

''غیرت اور بے غیرتی......؟'' اس نے حیرت سے مہر زاد کی طرف دیکھا۔ ''ہمارے خاندان کے لیے اس کا کوئی پیمانہ ہے کیا......؟''

''میں خاندان کی نہیں ایک فرد کی بات کر رہا ہوں۔'' مہر زاد نے لفظ چبا، چبا کر ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''اور وہ فرد میں ہوں۔''

''so weird'' وہ ناک سکیڑتے ہوئے بولی۔ ''لیکن چلے گا...... پھر بھی چلے گا۔'' وہ ایک بار پھر مہر زاد کے نزدیک آکر بولی۔ ''قصہ یہ ہے کہ۔'' اس نے مہر زاد کی ٹائی کی ناٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا جسے مہر زاد نے ڈھیلا کر کے اپنی جگہ سے نیچے لٹکا رکھا تھا۔

''تم available lot میں سے بیسٹ چوائس ہو، اسی لیے مجھے تمہاری بات بری نہیں لگی، میں نے تم سے شادی کرنے کا تہیہ کر لیا ہے، تم بھی کر لو......'' اس نے ٹائی کو کھینچ کر اس کی گرہ کو مہر زاد کے کالر کے نیچے کستے ہوئے کہا۔

''ہوں......'' مہر زاد کا چہرہ کھنچ گیا۔ اس کے جبڑے اور رخسار کی ہڈیاں تناؤ کا شکار ہوئیں۔ ''اپنا یہ بیہودہ لباس اتار کر مکمل لباس پہننے اور چادر اوڑھنے کی عادت ڈال لو سب سے پہلے...... پھر سوچوں گا۔''

''میل شاؤنزم......'' وہ اس کا جواب سن کر اس کے قریب سے ہٹ گئی۔ ''پکے میل شاؤنسٹ ہو تم، [illegible] عورت پردے میں بیٹھا کر باہر کھل کھیلنے والے مردوں کی قسم میں سے ایک مرد۔''

''ہاں میں میل شاؤنسٹ ہوں۔'' مہرزاد نے اس کی بات کی تائید کی۔ ''میرا رویہ ڈکٹیٹر والا ہوگا، میں تمہیں ساتھ پردوں میں بند کر کے رکھوں گا، کہیں آنے جانے کی آزادی ہوگی نہ میری اجازت کے بغیر کسی سے ملنے کی...... تمہیں خود کو سرتاپا بدلنا ہوگا...... بدل لوگی تو پچھلی تمام ایکٹوٹیز بھی بھول جاؤں گا، بولو میری شرائط منظور ہیں؟''

''انکار تو سیدھا، سیدھا بھی ہوسکتا تھا، مہرزاد خان۔'' وہ اس کے لہجے... پر پیچ پا ہوتے ہوئے بولی۔

''اتنا لپیٹ کر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔''

''میں بات کو لپیٹ کر کرنے کا عادی جو ہوں۔''

''انکار کا نتیجہ جانتے ہو؟'' وہ پھنکار کر بولی۔

''مجھے نتیجے سنانا چاہتی ہو۔'' مہرزاد نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''سنانا نہیں یاد دلانا چاہتی ہوں۔''

''میں نتیجوں کی پروا کرنے کا عادی نہیں ہوں، بس عمل کرنا جانتا ہوں۔''

''گڈی گھر بیٹھ جائے گی سب سے پہلے تو......'' وہ تنبیہہ کرنے کے انداز میں بولی۔

''گڈی کا گھر بٹھایا جانا، میرے لیے کوئی بلیک میلنگ پوائنٹ نہیں ہے، وہ ابھی جو زندگی گزار رہی ہے اس سے گھر بیٹھنا زیادہ بہتر صورت حال ہوگی۔'' مہرزاد نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''اس کے علاوہ جانتے ہو؟'' وہ اس کے متاثر نہ ہونے پر بھڑکتے ہوئے بولی۔

''مت سناؤ مجھے، گیدڑ بھبکیوں سے ویسے ہی مجھے نفرت ہے۔''

"ٹھیک ہے......" اس نے شانے جھٹکے۔ "آج سے میں ان کی سائڈ پر ہوں جو تمہاری داشتہ کو اٹھا لے گئے تھے۔"

"شوق سے۔" مہرزاد نے بے نیازی سے کہا۔

"میں بابا جان کو انفارم کر دیتی ہوں۔"

"ضرور......" وہ اسی بے نیازی سے بولا۔

مہ جبیں نے چند لمحوں کے لیے رک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر اپنی ہائی ہیلز پر ٹک، ٹک کرتی تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

"ایک ہفتے کے اندر، اندر یہ تیسرا یا شاید چوتھا محاذ کُھلا تھا۔" اس کے جانے کے بعد مہرزاد نے سوچا۔ "خیر گولی تو وہ ایک ہی ہوگی جسے مجھے موت کی نیند سلانا ہے، ہاں اس بات کا تعین باقی ہے کہ وہ کس محاذ کی طرف سے آنے والی ہے۔"

☆☆☆

"آپ منہ کھول کر دیکھتے رہ گئے ڈیڈی اور وہ آپ کی ناک کے نیچے سے لڑکی نکال لے گیا۔"

"میں نہیں، تم منہ کھول کر دیکھتے رہ گئے مائی سن، میرا منہ کیوں کھلتا جبکہ مجھے تو ہونی کا علم تھا۔"

"یہ کسی بھی قسم کی شکست کی انتہا ہے۔"

"غصے میں اِدھر اُدھر لوٹیں لگانے کا کوئی فائدہ نہیں صاحبزادے، اپنے وقت کا انتظار کرو۔"

"میرے سے نہیں ہوگا انتظار...... میں نے سوچ لیا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔"

"اس نے بھی سوچ رکھا ہوگا کہ اسے کیا کرنا ہے جب تم اپنی کرنی پر اتر آؤ گے تو تم اسے کیا "چھنّا کاکا" سمجھتے ہو جانتے نہیں وہ کس (گالی) باپ کی اولاد ہے۔"

"وہ (گالی) باپ کی اولاد ہے تو میرا باپ بھی کوئی ایسا حلال کا جنا نہیں ہے، جوڑ تو خوب پڑے گا، اس نے لڑکی اٹھائی اور اس بے چاری آنٹی امراؤ بیگم کا ڈیرا بھی اجاڑ دیا، وہ حوالات میں پڑی سڑتی ہے روز و کر مجھے اپروچ کرنے کی کوشش کرتی ہے، بتائیں میں کیا کروں، اُدھر اس چھوٹے صاحب نے ذاتی دلچسپی لیتے ہوئے امراؤ بیگم اور اس کے حالی موالیوں کو...... شریعہ کورٹ کے حوالے کر دیا ہے، میری عزت خاک میں مل رہی ہے اس بے بسی پر۔"

"جو میدانِ سیاست میں ریس جیتنا چاہتے ہو ناں صاحبزادے تو عزت نام کی چیز کو بھول جاؤ۔"

"جی اور آپ کی طرح یوٹرن لینا سیکھ جاؤں ابھی جو مولویوں سے پیچ اپ کرنے کے لیے آپ نے پینترا بدلا ہے...... اس نے تو مجھے بھی ششدر کر دیا، چھوٹے صاحب کو بیچ میں ڈال لیا مائی گاڈ مجھے یقین نہیں آیا۔"

"یقین کر لو...... کیونکہ اسے بیچ میں ڈالنے کا نتیجہ تو دیکھو، فتوے اگلنے والی مشین گنیں کیسی خاموش ہو گئیں، اب سب کلیئر کا سگنل مل گیا ناں!"

"دیکھ رہا ہوں، دیکھ رہا ہوں اب بھول کر بھی اقلیتوں کی بستی کا رخ نہیں کریں گے آپ آنے والے وقتوں میں۔"

"میری توبہ، کانوں کو ہاتھ لگا لیے۔"

"اپنے الو تو سیدھے کر لیے آپ نے، مجھے کچھ نہیں بتاتے اس سردار زادے کا کیا کروں جو میری آنکھ کا شہتیر بنا ہوا ہے۔"

"اپنے وقت کا انتظار کرو...... جسے آنا ہی آنا ہے۔"

"جب سوچتا ہوں کہ اس لڑکی کے ساتھ دن رات گزارتا ہوگا... تو بری طرح تلملا جاتا ہوں، خون کھولتا ہے میرا۔"

"میری اطلاع کے مطابق تو ایسا نہیں ہو رہا، وہ تو صبح کراچی، شام کوئٹہ، رات لاہور قسم کا گھن چکر بنا ہوا ہے، جتنے مخالف اور پریشر گروپس ہیں ان سے جوڑ توڑ میں مصروف ہے۔ ہر دوسری شام کسی ٹاک شو میں بیٹھا ہوتا ہے، اس کے پرسنل اسٹاف کا حجم ہر روز بڑھ رہا ہے۔ اس کے نوٹس اور پلانز تشکیل دینے کے لیے، جس روز سے لڑکی یہاں سے گئی ہے وہ صرف ایک مرتبہ اس سے ملا ہے، اس کے بعد لڑکی کو کہیں اور منتقل کر دیا گیا ہے اور وہ اس کی طرف نہیں گیا۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہے؟"

"مجھے ایسے معلوم ہے کہ میں بھی کوئی "چھنّا کاکا" نہیں ہوں، جو احمقانہ دشمنی تم نے مول لی ہے اسے نبھانے کے لیے مجھے اس پر نظر رکھنی ہی رکھنی ہے۔"

"لڑکی کدھر منتقل کی ہے اس نے؟"

"نا معلوم مقام پر...... اور اس کے بارے میں مزید کوئی سوال نہیں پوچھو گے تم، اس کے علاوہ اپنی سوچ کو ان امراؤ بیگموں اور مجید خانوں کے لیول سے اوپر اٹھانا سیکھو، یہ چھوٹے پیادے صرف گیم کو آگے بڑھانے کے لیے بساط پر سجائے جاتے ہیں، دیکھا نہیں کیسے پٹاپٹ گرتے ہیں جب شاہ کو خطرہ ہو تو لیکن شاہ مات ان پیادوں کو ملتے دیکھی ہے کبھی...... شاہ مات تو صرف شاہ کو ملتی ہے، تمہارا کام شاہ مات دینا یا شاہ مات سے بچنا ہے، پیادے کیسے اپنا دفاع کرتے ہیں، کون سی چال چلتے ہیں، بچتے ہیں یا مرتے ہیں، یہ تمہارا ہیڈک نہیں ہونا چاہیے۔"

"خیر مجید خان کو تو میں نہیں بخشوں گا، سنا ہے آج کل وہ اس سردار زادے کا پرسنل محافظ بنا ہوا ہے۔"

"پھر وہی بات...... پھر الجھے تم مجید خانوں اور امراؤ بیگموں میں، مرنے دو انہیں، بچتے ہیں تو ان کی قسمت، مرتے ہیں تو ان کی قسمت، تم ان چیزوں سے بہت اوپر کے آدمی ہو یار جسٹ چینج یور ایمز اینڈ گولز۔"

"مہرزاد خان سے نمٹنے کے بعد آپ کی بات پر غور کروں گا۔"

"میں تمہارے لیے دعائے خیر ہی کر سکتا ہوں، تمہاری عقل، تمہاری ماں کی طرح ٹخنوں میں ہی پھنسی رہ گئی ہے۔"

"میری ماں کی بات نہ کریں، میری ماں کے ٹخنوں نے ہی آپ کو آج چھوٹے صاحب کے گلے کی ہڈی بنایا ہوا ہے۔"

"اس کے ٹخنوں نے نہیں، میری سپریم بے غیرتی نے، گٹس کی بات ہے صاحبزادے گٹس کی۔"

"جو بھی نام دے لیں اسے، بات تو ایک ہی ہے، کہانی کا عنوان بدل لیں تو بھی کہانی تو نہیں بدلے گی ناں......"

☆☆☆

بینش کی اماں باورچی خانے کی چوکی پر گھٹنوں پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھی، اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں اور چہرے پر بے یقینی کا تاثر تھا۔ اس کے سامنے رکھی چوکی پر بینش بیٹھی تھی جو تِکوں سے بھرا نان چائے میں ڈبو کر کھا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بے نیازی تھی اور بے پروائی بھی۔ کچھ دیر پہلے جو بات اس نے اماں کو سنائی تھی وہ اس کے نزدیک اتنی عام سی بات تھی کہ اپنی اماں پر اس کے آفٹر ایفکٹس دیکھنے کی بھی زحمت اس نے نہیں کی تھی۔

"اندر سے ختم ہوگئے تھے اماں......؟" نان ختم کرنے کے بعد اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے ان کی طرف دیکھا تھا۔

"تجھے پتا ہے بینش تو نے مجھے کیسی بات سنائی ہے۔" اماں اس کا جواب دینے کے بجائے جیسے خواب میں بولی تھی۔

"کیا بہت انہونی بات ہے؟" بینش نے ان کے چہرے کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"تو نہیں جانتی کیا......؟ بہت ہی انہونی، ہم ذات کے کشمیری اور تو بتا رہی ہے کہ وہ مغلوں کے خاندان سے ہیں۔"

"تو......؟" بینش نے ماں کی بات کا مطلب جانتے ہوئے بھی انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"تو تیرا کیا خیال ہے، یہ چھوٹی سی بات ہے؟" اماں کا دل چاہا اس کی اس بے نیازی پر چولھے کے پاس رکھا روٹی پلٹنے کا چمٹا بینش کو دے ماریں۔

"میں نے آپ سے کہا تھا اماں ضروری تو نہیں شہزادہ اسی ملک کے بادشاہ کا بیٹا ہو جس ملک کا ہم چاہتے ہیں، بات تو صرف شہزادہ ہونے کی ہو رہی تھی۔" بینش اتنے دن تک اپنے اندر سے اماں کے ردِعمل کا ڈر خوف نکالنے ہی کی کوشش کرتی رہی تھی۔

"لکھ لعنت تیرے پر۔" اماں غصے میں آتے ہوئے بولیں۔ "ساری عمر جس گوت کو لے کر سونے کی مہر کی طرح اس کی حفاظت کرتے رہے، اسے تیرے شہزادے کی شہزادگی پر وار دیں کیا؟"

"کیا حرج ہے، شہزادوں پر تو لوگ جانیں بھی وار دیتے ہیں۔" بینش خود کو ڈھیٹ بنائے رکھنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

"نہیں ہوسکتا۔" اماں نے زور سے سر جھٹکا۔ "کبھی نہیں ہوسکتا، کان کھول کر سن لے تو، ایک تو میں ذات برادری کی کھے (خاک) اپنے سر میں ڈالوں دوسرا سارے ٹبّر کے جوتے الگ کھاؤں کہ تو پڑھنے گئی اُدھر اپنے لیے لڑکا خود پسند کر کے بیٹھ گئی۔ نہیں ہوسکتا ہے بینش کان کھول کر سن لے یہ نہیں ہوسکتا۔"

"اماں ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرنا میری بات پر...... پھر فیصلہ کرنا۔" بینش نے تحمل سے کہا۔ "میں اس کے ساتھ گھر سے نہیں بھاگ رہی، نہ ہی آپ سے بغاوت کر رہی ہوں۔ وہ ایسا ہے کہ مجھے یہ سب کرنے بھی نہیں دے گا، ایک بات تھی آپ سے کہہ دی، اس پر غصے سے پاگل ہو جانے کے بجائے ٹھنڈے دل سے غور کریں، دل نہ مانے تو بتا دیں۔ بات ختم ہو جائے گی۔"

"بات تو ابھی اور اسی وقت ختم ہوگئی۔" اماں نے حتمی انداز میں کہا۔ "میرا دل نہیں مانتا تھا، میں سوچتی تھی کہ میرے بھائیوں کے بیٹے زیادہ پڑھے لکھے نہیں، میں بات منہ سے نہ نکالوں مگر اب میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ آج ہی تیرے مامے ممتاز کو فون کرتی ہوں اپنے تیسرے بیٹے کا رشتہ لے کر میرے پاس

آئے...... میرا بھتیجا زیادہ پڑھا لکھا نہیں تو چٹا ان پڑھ بھی نہیں، بی اے میں کمپارٹ آگئی تو دل اٹھ گیا اس کا پڑھائی سے۔ اپنا کاروبار شروع کرلیا اس نے گرل جالی کا، اتنا بڑھ گیا ہے آج اس کا کام کہ لاکھوں میں کھیلتا ہے، پورے پسرور شہر اور آسے پاسے کے سارے علاقے میں لوگ گھر بنانے سے پہلے اسے سائی (بیعانہ) پکڑا جاتے ہیں گھروں میں لوہے جالی کا کام کروانے کے لیے اتنا بڑا کاریگر ہے وہ۔ آج ہی ممتاز کو فون کرتی ہوں، رشتہ ڈال نکاح کر، لڑکی رخصت کرالے، تیری پڑھائی کی بھی ٹانگیں چیرتی ہوں میں۔" اماں آپے سے باہر ہونے لگی تھیں۔ بینش نے کچھ دیر انہیں یونہی غصے میں لال لال ہوتے دیکھا، پھر خاموشی سے اٹھ کر باورچی خانے سے باہر نکل آئی۔ وہ بے قدموں سیڑھیاں چڑھ کر وہ چھت پر چلی گئی۔ دھوپ ڈھل رہی تھی اور ڈھلتے، ڈھلتے چھتوں کی منڈیروں، اونچی کھڑکیوں کے چھجوں اور مسجدوں کے گنبدوں تک آ کر ٹھہری ہوئی تھی۔ اس نے اپنے گھر کی چھت کی منڈیر سے کمر ٹکاتے ہوئے سامنے دیکھا۔ تا حدِ نظر اونچے نیچے مکانوں کی چھتیں نظر آرہی تھیں۔ چھتوں پر چڑھتے، اترتے، بیٹھے لوگ، وہ مخصوص منظر جو وہ اپنے بچپن سے دیکھتی چلی آرہی تھی۔

"سب کچھ ویسے کا ویسا ہی ہے ایک میرے اندازِ فکر کے سوا۔" اس نے سوچا۔

"اس مختصر عرصے میں جب سے میں نے یونیورسٹی جانا شروع کیا ہے میری سوچ میں کیسا انقلاب آیا ہے یوں جیسے ارتقا کے کئی مدارج میں نے ایک ہی جست میں طے کر لیے ہوں۔" اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی۔ "اور ایسا ان سب کی وجہ سے نہیں ہوا جن سے میں ہر روز یونیورسٹی میں ملتی ہوں یا جن سے پڑھتی ہوں۔ ایسا صرف ایک شخص کی وجہ سے ہوا، جس نے میرا اندازِ فکر بدل کر رکھ دیا۔" اس نے ایک بار پھر سامنے دیکھا، دھوپ اب منڈیروں، چھجوں اور میناروں سے اوپر اٹھتی نظر کے سامنے سے غائب ہو رہی تھی۔ اس نے آسمان پر اڑتے پرندوں کی ڈاروں کو یکساں پرواز کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹنے کا سفر کرتے دیکھا۔

"جو تم ہو، جس فیملی سے تمہارا تعلق ہے، جو تمہارا لائف اسٹائل ہے، میں تو ان میں سے کسی سے ذرا سا بھی میچ نہیں کرتی پھر تمہاری بات میری سمجھ میں کیسے آئے، مجھے تو شاید اس پر یقین بھی نہیں آرہا ابھی تک۔"

اس نے یاد کیا اس نے دانیال سے کہا تھا۔

"اب تک جو کچھ میں نے اپنے بارے میں تمہیں بتایا، اس میں کہیں بھی ذرا سی بھی غلط بیانی نہیں کی، اسی لیے تو جو میں ہوں، جس فیملی سے میرا تعلق ہے اور جو میرا لائف اسٹائل ہے اس میں صرف تمہاری ہی تو گنجائش ہے، میرا دل اس دنیا میں ہر طرف نظر آتی impurities سے بھر چکا ہے، میرے لیے ان میں کوئی کشش باقی نہیں، میں اپنے لیے، اپنی زندگی کے سکون کے لیے purity کی تلاش میں تھا، کسی ایسی خالص لڑکی کی تلاش میں جس کے خمیر میں تصنع، ریا، جھوٹ، غلط بیانی کی آمیزش نہ ہو، تم سے پہلے مجھے ایسی لڑکی ملی نہیں......" اس نے پوری سچائی کے ساتھ کہا تھا۔ "اگر تم نہ ملتیں تو شاید میں عمر بھر یونہی اکیلے رہنے کو ترجیح دیتا کیونکہ میں جس تجربے سے گزر چکا ہوں اس کے بعد میری زندگی میں تصنع، ریا، جھوٹ، دھوکے بازی کی کوئی گنجائش نہیں رہی، اگر میں یونہی randomly کسی لڑکی کا خود کے لیے انتخاب کرلوں تو مجھے اس کے ساتھ اس کی ذات کی ہر خوبی اور خامی کو قبول کرنا ہوگا۔ لائف پارٹنر سے آپ یہ ڈیمانڈ نہیں کر سکتے کہ وہ خالص آپ کے رنگ میں رنگ جائے اگر کچھ چیزیں وہ میری مرضی کی اڈاپٹ کرے گی تو کچھ چیزیں مجھے اس سے اڈاپٹ کرنا پڑیں گی...... نہ

چاہتے ہوئے بھی۔'' اس نے بینش کو سمجھانے کے سے انداز میں دیکھا تھا۔ ''اور جب میں ایسا کرلوں گا تو میں پھر سے انہی راستوں میں الجھنے لگوں گا جن سے تقریباً مرنے کے بعد، زندگی ملنے کے بعد سے اب تک بچتا آیا ہوں، میں کسی ایسے تجربے میں پڑنا نہیں چاہتا۔'' اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

''میری کیا گارنٹی ہے؟'' بینش نے اس کی طویل بات سن کر سوال کیا تھا۔ ''جس عمر تک میں پہنچ چکی ہوں، اس عمر تک پہنچتے، پہنچتے مجھ میں کتنی ہی خامیاں ڈیولپ ہوچکی ہوں، ان سے کمپرومائز کیسے ہوگا۔''

''نہیں۔'' دانیال نے سر ہلایا۔ میں نے تم کو خوب پرکھا ہے، بہت اچھی طرح جانچا ہے۔ تم ابھی خام ہو، تمہارا وجود ابھی un moulded ہے کیونکہ تم خود ابھی ایکسپلور کرنے اور اڈاپٹ کرلینے کے دور سے گزر رہی ہو.... مجھے یقین ہے کہ جتنی تم ریزن ایبل ہو، تم اپنی پیورٹی کو کسی پیور سانچے میں ڈھالنا ہی پسند کروگی، میں نے اسی لیے تمہیں پرپوز کیا کیونکہ مجھے اپنے لیے تمہارے ہی جیسی لڑکی چاہیے تھی۔''

''یہ تو آپ کی مجبوری ہوئی لائکنگ والی بات تو نہیں ہے اس میں.....'' بینش کو معلوم نہیں ہوسکا کہ اس نے یہ بات کیوں کی تھی۔

''اس معاملے میں مجبوری تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔'' وہ بے اختیار مسکرا دیا...... ''لائکنگ نہ ہوتی تو میں تم سے یہ بات کرتا ہی کیوں...... میرا تو یہ حال ہے کہ سوتے، جاگتے، اٹھتے، بیٹھتے، اپنے اردگرد مجھے تم ہی تم نظر آتی ہو۔'' بینش کا دل دھڑکتے دھڑکتے ایک لمحے کے لیے جیسے رک گیا۔

''لوگوں سے مایوس انسان ہوں میں بینش۔'' اس نے بینش کو یقین دلانے کے لیے کہا تھا۔ ''ایک مایوس انسان کو اگر اندھیرے میں کہیں روشنی کی کرن نظر آجائے تو کیا وہ خوشی کے مارے اس کی طرف لپکے گا نہیں، اسے پکڑنے اور پالینے کی کوشش نہیں کرے گا کیا.....؟'' اس نے اس سے سوال کیا۔ ''اور اگر وہ اس کرن کو پالے تو وہ تو خوشی کے مارے پاگل ہی ہوجائے گا...... ہے ناں.....!'' وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ بینش کے ارد گرد پھول ہی پھول بکھر گئے۔

''لیکن میرا لائف اسٹائل، میرا بیک گراؤنڈ، میرے گھر کے حالات میرے گھر والوں کی سوچ۔'' پھر اسے حقائق یاد آگئے، وہ زمین یاد آگئی تھی جس پر وہ کھڑی تھی۔ ''سب بہت مختلف بہت...... rigid ہے۔ اس نے دانیال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ''وہ کبھی نہیں مانیں گے، میرے گھر والے، میرے بھائی۔'' اس نے اٹکتے ہوئے اسے سمجھانا چاہا تھا...... ''وہ بہت ضدی ہیں۔''

''ارے پیاری لڑکی، تم تو مان جاؤ پہلے، میں ان کو بھی منالوں گا......'' وہ پھر بھی مسکرا رہا تھا۔ ''ایک ایسا انسان جو اتنے بڑے حادثے سے گزر چکا ہے، جس کی زندگی کو نہ جانے کس، کس طریقے سے سانسوں سے جوڑا گیا، نہ جانے کن، کن مرحلوں سے گزار کر جس کے جسم کو چلنے پھرنے کے قابل بنایا گیا، اس کی کیا گارنٹی ہے، مشینوں کی کارکردگی کب اس کے اندر الٹ پلٹ ہوجائے۔ ایک ایسا انسان تمہیں بھی قبول ہے یا نہیں؟''

''ایک ایسا انسان......'' بینش نے اس کے خوب صورت سراپے کو دیکھا۔ ''میرے لیے اس سے بڑا

اعزاز اور کیا ہوگا کہ جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا چلتا پھرتا نمونہ بنادیا، جو ایک معجزے کی صورت ہمارے درمیان موجود ہے، اس نے اتنی ساری لڑکیوں میں میرا انتخاب کیا...... میرے لیے یہ ایک ایسا اعزاز ہے کہ جب سے اس کے بارے میں سنا ہے نہ نیند آتی ہے نہ سوسکتی ہوں، نہ بھوک لگتی ہے، نہ کھا سکتی ہوں شاید۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر اس کی طرف دیکھا۔ ''شاید میں کچھ بھی نہیں کر پارہی سوائے تمہاری کسی بات کو یاد کرنے اور دل میں دُہرانے کے۔''

''تو بس تو پھر بات ختم......'' وہ کھل کر ہنس دیا، اس کی خوشی اس کی آنکھوں میں نظر آرہی تھی...... ''باقی تم فکر نہیں کرو، اللہ بہت بہتر کرے گا۔''

''ہاں، اللہ بہتر کرے گا......'' بینش نے ایک بار پھر اپنے سامنے موجود منظر پر نظر دوڑائی...... دھوپ مکمل طور پر ڈھل چکی تھی۔ آسمان پر نیم تاریکی چھا رہی تھی۔ چھتوں پر موجود لوگ گھروں کی نچلی منزلوں کی طرف جا چکے تھے، فضا پر سکوت چھا رہا تھا اور مسجدوں سے مغرب کی اذان کی آوازیں آنے لگی تھیں، اس نے دوپٹا سر پر اوڑھا اور نماز کے لیے نیچے آگئی۔

☆☆☆

''اس روز ٹاک شو میں آپ تقریباً پکڑے ہی دکھائی دیتے تھے۔'' نیشل نے اپنے ٹیب کو آف کرتے ہوئے مہرزاد خان سے کہا تھا۔

''میں تو ہر روز ہی پکڑا جاتا ہوں، لاک لگتا ہے پھر 'جُل' کامیاب ہوجاتا ہے...... اور میں کسی نئی قینچی کے لیے سانس بحال کرنے میں مشغول ہوجاتا ہوں۔'' مہرزاد نے مسکرا کر کہا...... ''جس طرح ٹیکنالوجی کے میدان میں حالیہ برسوں میں انقلابی تبدیلیاں آئی ہیں، ویسے ہی انسانی رویوں نے بھی جیسے ہڑبڑا کر pace پکڑلی ہے، ہر کوئی جیسے اپنی بات کہنے، وار کرنے، وار سے بچنے وغیرہ وغیرہ کی جلدی میں نظر آنے لگا ہے، یوں جیسے اگلی جنبش میں لمحاتی تاخیر بھی سارا کھیل بگاڑ کر رکھ دے گی...... اب سوچ سمجھ کر، گھنٹوں بلکہ دنوں کے غور و خوض کے بعد اپنی چال چلنے والے دن تو خواب ہوتے نظر آرہے ہیں۔ لگتا ہے انسان کے بعد یہ دنیا بھی اپنے خاتمہ بالخیر کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہے...... جب ہی تو دنیا کے سارے کام اتنی برق رفتاری سے اتنی عجلت میں نمٹائے جارہے ہیں۔''

''یہ self annihilation ہے یا mass annihilation۔'' نیشل نے سوال کیا۔

''یہ total destruction ہے مکمل تباہی، اس میں فرد اور قوم کی تفریق نہیں کی جاسکتی۔''

''جب ہی آپ بھی خاصی عجلت میں دکھائی دیتے ہیں۔'' نیشل نے گہری سانس لیتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اس روز اس کی مہرزاد خان سے بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی تھی۔ اس شام ہونے والی اہم پریس کانفرنس کے نوٹس کے لیے مہرزاد نے اسے خصوصی طور پر اپنے فارم ہاؤس پر بلوایا تھا اور اس وقت وہ دونوں فارم ہاؤس کے سن روم میں بیٹھے پریس کانفرنس کے منٹس پر تفصیلی بات کرنے کے بعد فارغ ہوئے تھے۔

''نہیں......'' مہرزاد نے سر ہلایا۔ ''میں تو تاریخ کے سبق پڑھنے والا ماضی کے عظیم سپہ سالاروں کی حربی چالوں کا مدّاح، کلاسیکل سیاستدانوں کی سیاست کا پرستار انسان ہوں، مجھے تو خود اس ماڈرن ورلڈ کی برق رفتاری نے اپنے خون آشام پنجوں میں دبوچ رکھا ہے۔ میں اپنے سروائیول کے لیے عجلت میں مبتلا ہونے پر

مجبور ہوں۔"

"جب ہی آپ نے وی آئی پی موومنٹ کے سوال کی توپ کا رخ rotate کرنے میں لمحے بھر کی تاخیر بھی نہیں کی۔"

"وہ conversation" مہرزاد کو یشل کے سوال کا رخ اب سمجھ میں آیا تھا۔"ہیل ودراٹ" اس نے یشل کی طرف دیکھا۔" جب سنجیدہ گفتگو کا آغاز اور اختتام clowns کرنے لگیں، جب سیاسی dummies اٹھ کر ایک دوسرے پر گالی گلوچ اور نازیبا الفاظ کی گولا باری کرنے میں مصروف ہو جائیں اور ایسے بدتہذیب منظرنامے، کو rating لے لینے جیسا کارنامہ سمجھا جانے لگے تو مجھ ایسوں کو بھی مسخروں کا سا ٹوپ اور جگلرز کا سا لباس پہننا پڑتا ہے، میں نے بتایا ناں کہ میں اپنے سروائیول کے لیے یہ سب کرنے پر مجبور ہوں۔"

"جب آپ جیسے انسان بھی خود کو مجبور ڈکلیئر کردیں تو پھر تو اس احمقانہ منظر سے باہر نکلنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں نظر آتی۔" یشل نے مایوسی سے اپنے سامنے رکھے کاغذات کو دیکھتے ہوئے کہا۔ شیشے کی دیوار سے گزر کر اندر آتی دھوپ، شیشے کی دیوار سے باہر کھڑے پیڑ، پودوں کے پتوں کا عکس ان کاغذات پر نمایاں کررہی تھی۔ اس نے پتوں کے عکس پر انگلی پھیری۔

"شاید میں زیادہ دیر survive نہ کرسکوں۔" مہرزاد نے اس کی مایوسی کو دُگنا کرتے ہوئے کہا۔" میں نے کہا تھا ناں یہ میری صرف ایک کوشش ہے کیونکہ میں act کیے بغیر ہی ہتھیار ڈال دینے والوں میں شمار نہیں ہونا چاہتا، میں نے ایک بار تم سے کہا تھا۔ کوشش ضرور کروں گا، چانس بنتا نظر نہ آیا تو ہاتھ اٹھادوں گا۔"

"تاریخ تو رقم ہونے سے رہ گئی ناں پھر....." یشل نے جیسے اسے چیلنج کرنے کی کوشش کی۔

"تاریخ تو ہر حال میں رقم ہوتی رہے گی۔" وہ مسکرایا۔"چاہے واقعات اور حالات کے تسلسل کی، کی جائے، تاریخ کے رقم ہونے کو تو کوئی روک نہیں سکتا۔"

"ایک صرف زرنگار کی خاطر آپ ہاتھ اٹھادینے تک پر تیار ہیں، وہ بھی اتنی جلدی....." یشل نے چیلنج کا زاویہ بدلا۔

"ایک صرف.....!" مہرزاد خان نے یشل کی بات کا ایک حصہ دُہرایا اور ہنس دیا۔" وہ ایک صرف نہیں ہے یشل، وہ سب کچھ ہے۔"

یشل کے سامنے دھرے کاغذات پر پڑتا پتوں کا عکس گڈمڈ ہونے لگا۔" دنیا بھر میں قابل ترین انسان نے ہمیشہ عورت کی وجہ سے مات کھائی۔" اسے تاریخ یاد آنے لگی اور جغرافیہ بھی۔

"انسانوں سے ان کے قد سے اونچی توقعات نہیں باندھ لینی چاہیے، کوئی انسان کتنا ہی دراز قامت کیوں نہ ہو، اس کا قد آسمان جتنا اونچا تو کیا آسمان تک بھی نہیں جاسکتا۔" مہرزاد خان، یشل کی مایوسی کو آبزرو کررہا تھا۔" larger than life characters صرف فیری ٹیلو میں ملتے ہیں اور میں یہاں پریوں کی کسی کہانی یا دیومالائی قصوں کا ہیرو بننے نہیں آیا تھا۔"

"مگر آپ نے خود اپنی کوشش سے اپنا جو امیج بنایا وہ "لارجر دین لائف" ہی تھا....." یشل نے تلخی سے کہا۔

"وہ امیج "لارجر دین لائف....." "نہیں تھا۔" مہرزاد نے اس کی بات کی تصحیح کرتے ہوئے کہا..... "تم نے اسے، جس فریم میں جڑنے کی کوشش کی صرف وہ اس فریم سے بڑا تھا۔ جب ہی وہ اس سے آؤٹ ہوگیا۔"

"اب آپ ہمیں ہی الزام دیں گے۔" یشل نے کاغذات سمیٹتے ہوئے کہا۔"اسی لیے میں نے دعا کی تھی کہ آپ کے اردگرد کبھی جو جال بُنا جائے، اس کی گرہوں کو "زرنگار" کے ہاتھوں نے نہ کسا ہو۔"

"تمہاری دعاؤں کے برعکس اب تو ایسا ہوگیا، کیا کریں....." مہرزاد جیسے اس کی مایوسی سے محظوظ ہورہا تھا۔

"اب کیا ہونے والا ہے....." یشل نے سر اٹھا کر مہرزاد کی طرف دیکھا۔"اس جال میں پھنس کر آپ چاروں شانے چت ہونے والے ہیں یا کسی کو..... sos کال دینے والے ہیں؟"

"lets see" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔" May Allah guide me and help me "

اس نے وہ جملہ یشل کے سامنے دُہرایا جس کی تکرار وہ ہر وقت اپنے دل میں کیے رکھتا تھا۔

"Allah never guides those who do not follow His guidance " یشل نے تیزی سے کہا۔

"Allah always guides those who seek His guidance" مہرزاد خان کی طرف سے فوری جواب آیا تھا۔ اس ملاقات کے بعد مہرزاد سے رخصت ہوتے ہوئے یشل کا دل خاصا بھاری ہورہا تھا۔



اسے اس جگہ سے جہاں مجید خان نے اسے چھوڑا تھا اور جہاں مہرزاد خان نے اس سے ملاقات کی تھی نکال کر کسی اور جگہ منتقل کردیا گیا تھا..... یہ نئی جگہ بھی پہلے کی طرح نامعلوم تھی اور اجنبی بھی..... مگر یہاں آنے کے بعد وہ پہلے والی جگہ سے بھی زیادہ سکون محسوس کررہی تھی۔ یہاں وہ ایک کمرے میں بند نہیں کی گئی تھی۔ یہاں بھی ایک کمرے کی وارڈروب اُس کے لیے اس قسم کے ملبوسات سے بھری پڑی تھیں جیسے لباس اس سے پہلے والے ٹھکانے پر اسے مہیا کیے گئے تھے۔ اس گھر کے ایک کمرے میں ایک چھوٹی سی لائبریری تھی۔ جہاں اس نے سالوں بعد کتابیں دیکھی تھیں، ادب، تاریخ، تحقیق، مذہب، سائنس، ٹیکنالوجی پر لکھی گئی کتابیں، ان گنت اور بے شمار کتابیں اس گھر کا ایک کمرا پریئر روم تھا۔ جس میں مخملیں جانماز، قرآن پاک کے نسخے، تسبیحاں اور مختلف مسائل کے لیے پڑھی جانے والی دعاؤں کے مجموعے موجود تھے..... کچن کے لیے مکمل اسٹاف موجود تھا، جو صبح شام اس کی پسند پوچھ کر کھانا تیار کرنے میں مصروف رہتا۔ یوں لگتا تھا جیسے دنیا بھر کی نعمتیں اس کے تصرف میں دے دی گئی ہوں جنہیں وہ بے خوف ہوکر کسی روک ٹوک کے بغیر استعمال کرسکتی تھی۔

اس پر اسے مہیا کیے جانے والے نئے آئی فون پر موصول ہونے والے مہرزاد خان کے پیغامات تھے جو اسے مسلسل سراپا حیرت بنائے رکھتے تھے۔

"میں نے تم سے تمہیں وہ دینے کا وعدہ کیا تھا جو تم ڈیزرو کرتی ہو، یہ میرے وعدے کی تکمیل کی طرف میرا پہلا قدم ہے، مجھے امید ہے کہ تم بدگمانی، ناراضی، اور نفرت کے باوجود میرے اس قدم کو قبول کرلوگی۔"

"اس نئی جگہ پر تم پہلے سے زیادہ محفوظ اور مامون ہو، یہاں وہ سب کچھ موجود ہے جو تمہیں چاہیے، جو تم پر

بجتا ہے، جو تم سے متعلق ہے، میں گزرے سالوں کے وقت کو تو نہیں بدل سکتا لیکن آنے والے وقت کو تمہارا کر دینے کے لیے کوشش ضرور کروں گا۔''

''تم مجھے جب چاہو حکم کر سکتی ہو کہ تمہاری پاکیزگی کی تروتازگی قائم رکھنے کے لیے تمہیں مزید کیا چاہیے میں ہر وہ چیز تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دینے کی کوشش ضرور کروں گا جو میرے اختیار میں ہوگی کیونکہ میرا دل وہ قلعہ ہے جو بہت پہلے سے تمہارا مفتوحہ علاقہ بن چکا ہے۔''

اسے لگتا جو سب کچھ وہ اپنی آنکھوں سے دن رات دیکھتی تھی، وہ خواب تھا۔ ''اگر یہ خواب ہے تو پھر وہ کیا تھا جو پیچھے گزرا اور وہ کیا ہوگا جو آنے والے وقت میں ہونے والا ہے۔'' وہ دن میں کئی بار سوچتی۔ ''میری زندگی کے ساتھ مسلسل یہ کیا ہو رہا ہے؟'' اس کے دل میں سوال اٹھتے...... ''مصیبت میں راحت، راحت میں مصیبت...... کیا اس تسلسل کو کہیں جا کر رکنا بھی ہے، کیا اس کا کوئی انت بھی ہوگا......'' سوال بے شمار تھے مگر جواب دینے والا کوئی نہیں ملتا تھا۔ یہاں تک کہ مہرزاد خان کی طرف بھیجے جانے والے سوالوں سے بھرپور پیغامات کے جواب بھی نہیں آتے تھے۔ وہ ایسے پیغامات کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے صرف ایک مسکراتی شکل اس کی طرف بھیج دیا کرتا تھا۔

☆☆☆

نادر نے ایک گھنٹے کے اندر تقریباً پندرھویں بار زوئی کی طرف دیکھا تھا۔ جو ٹانگیں سمیٹے، بازو گھٹنوں کے گرد حلقے کی طرح جمائے، خاموش بیٹھی سامنے دیکھے چلی جا رہی تھی۔ اس کی شکل ایسی بنی ہوئی تھی جیسے کچھ ہی دیر میں رو دے گی۔ نادر چاہ رہا تھا کہ اپنی خاموشی کو توڑتے ہوئے وہ خود بھی کچھ بولے لیکن اس کی مسلسل خاموشی سے گھبرا کر اسے خود ہی بولنا پڑا تھا۔

''کیا ہو گیا تمہیں، کیوں منہ لٹکائے بیٹھی ہو، امی نے تمہارا کتنا ساتھ دیا، تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔'' وہ سمجھ رہا تھا کہ اس روز اس کی بہنوں کی آمد اور ان کے کھڑے کیے ہنگامے کی وجہ سے زوئی کا موڈ ایسا ہو رہا تھا۔

''میں اس بات سے پریشان نہیں ہوں نادر۔'' زوئی نے بھی خاموشی توڑتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''پھر......؟'' نادر نے سوال کیا۔

''پھر یہ کہ میں تمہاری وجہ سے پریشان ہوں......'' وہ معصومیت سے بولی۔ ''میری وجہ سے تمہیں اپنی بہنوں کی باتیں سننی پڑیں، میں کتنی بری ہوں جو تمہارے لیے اتنی پریشانی کا باعث بنی اور مسلسل بن رہی ہوں......'' اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

''خدا کے لیے زوئی۔'' نادر اٹھ کر زوئی کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ ''تم اس معاملے میں ایسی شرمندگی ظاہر مت کیا کرو، مجھے شرمندگی ہونے لگتی ہے۔'' اس نے زوئی کے ہاتھ پکڑ کر انہیں سختی سے اس کے چہرے سے ہٹایا۔

''تم زبردستی تو میرے گھر نہیں آ گئیں، تم نے زبردستی مجھ سے نکاح نہیں کر لیا۔ میں خود ہر کام میں شامل تھا۔ تم شرمندہ کیوں ہو رہی ہو؟''

''پھر بھی......'' زوئی نے اس کی طرف دیکھا...... ''پھر بھی یہ خواہش تو میری تھی ناں...... تم نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔''

''تم نے خواہش ظاہر کی مجھے لگا میری قسمت جاگ گئی، سسرال جا کر سو، سو روپے والی چیزیں یہاں لا کر ہزار، ہزار روپے میں بیچا کروں گا، گارنٹی دینے کی ذمے داری بھی نہیں ہوگی، بھلا چائنا کے مال کی کیا گارنٹی...... لیکن تم نے تو میرے سارے خوابوں کے انڈے ہی توڑ دیے، یہ کہہ کر کہ ہم چائنا جا ہی نہیں سکتے بھی......'' نادر نے اسے ہنسانے کی احمقانہ کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں نہیں جا سکتے......'' زوئی کا دھیان واقعی دوسری طرف بٹ گیا۔ جب تک میرال والا قصہ نہیں نمٹتا ہم کیسے جا سکتے ہیں؟''

''میرال والے قصے سے یاد آیا، مجھے ایجنسی والوں کی طرف سے فون آیا تھا کہ آپ کی بیگم کے نمبر سے ایک ایسے نمبر پر کال کی گئی ہے۔ جس کا مالک میرال والے قصے میں تفتیش کے لیے مطلوب اور روپوش ہے۔''
نادر کو یاد آیا، بہنوں کے ہنگامے کی وجہ سے وہ یہ اہم بات تو بھول ہی چکا تھا۔

''نہیں تو......'' وہ اسی بھول پن سے بولی۔ ''میں تو بیچارے شہباز صاحب کا حال احوال معلوم کرنے کی کوشش کر رہی تھی صرف۔''

''تو، انہوں نے تمہاری کال ریسیو کر لی کیا؟''

''نہیں، وہ نمبر مسلسل بند مل رہا تھا، صرف کل رات دو بار بیل ہوئی اور پھر بند ہو گیا فون۔''

''اوہ میرے خدا......!'' نادر نے ماتھے پر ہاتھ مارا...... ''تمہیں کس نے کہا تھا گڑے مُردے اکھیڑتے ہوئے اس شخص کا حال پوچھنے کو۔''

''پھر کوئی گڑبڑ ہو گئی کیا......؟'' زوئی کی چھوٹی، چھوٹی آنکھیں پھیلیں۔ ''میں نے تو اس خیال سے کال کی کہ کہیں تمہارے خفیہ والوں نے انہیں پکڑ نہ رکھا ہو۔''

''یار تم سمجھتی کیوں نہیں ہو، ابھی تم کلیئر نہیں ہوئیں اس معاملے سے...... پھر کیوں پنگے لینے لگتی ہو۔'' نادر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ زوئی کی عقل پر کیسے ماتم کرے اور زوئی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نادر اس بری طرح پریشان کیوں ہو رہا تھا۔

☆☆☆

''آپ میری ماں کا سا درجہ رکھتی ہیں اور مجھ پر آپ کا احترام اسی طرح واجب ہے جیسے اپنی ماں کا کرتا ہوں۔'' مہرزاد خان نے اپنے سامنے بیٹھی عافیہ جہانگیر سے کہا تھا جو اس کی طرف سے بلاوے کی کال پر اپنے اور اپنی فیملی کے تحفظات کے باوجود اس سے ملنے کے لیے چلی آئی تھیں۔ وہ اس تک اس اچانک رسائی کا موقع ملنے پر بھی ششدر تھیں۔

''اس تک یقیناً آپ کی ''ایکٹوٹیز'' کی خبر پہنچ چکی ہوگی، جب ہی اس نے آپ کو بلایا ہے، وہ آپ کو وارن کرے گا، آپ کو threat کرے گا، اس لیے آپ نہیں جائیں گی وہاں۔'' ان کے شوہر جہانگیر نے کہا تھا۔

''ممی آپ ضرور جائیں بلکہ مجھے بھی ساتھ لے جائیں، دیکھیں کیا کرتا اور کیا کہتا ہے۔'' وہ دانیال تھا جو جوان تھا اور گرم جوش بھی۔ ''اگر اس نے آپ کو تھریٹ یا وارن کرنا ہوتا تو یہ کام کسی اور طرح بھی تو کر سکتا تھا۔ ون ٹو ون ملاقات کا دعوت نامہ نہ بھیجتا آپ کو...... لیکن آپ اکیلی مت جائیں۔''

''اس نے صرف مجھے بلایا ہے بلکہ بلایا تو عاصم کو تھا، عاصم نے مجھے autho rise کر دیا۔

لہٰذا میں اکیلی ہی جاؤں گی.....'' عافیہ ان تمام تحفظات کے باوجود جائے ملاقات پر پہنچ گئی تھیں۔ یہ شہر سے باہر ایک فارم ہاؤس کی بلڈنگ تھی جس میں وہ اس وقت مہرزاد خان کے سامنے بیٹھی اس کی بات سن رہی تھیں۔

''اصولاً تو مجھے آپ کے پاس جانا چاہیے تھا، ماؤں کے پاس جایا جاتا ہے، انہیں بلایا نہیں جاتا لیکن میری مجبوری میرا پروٹوکول ہے جو آپ کے لیے مسئلے کا باعث بنتا..... اسی لیے آپ کو یہاں بلانا پڑا۔ جس پر میں معذرت خواہ ہوں۔''

''چرب زبان ہے جیسا کہ سیاست دان ہوتے ہیں.....'' عافیہ نے دل میں رائے قائم کی۔

''ڈرا ہوا لگ رہا ہے، اسی لیے ایسی تمہید باندھ رہا ہے جیسے اس کی باتوں میں آ کر میں اپنی موومنٹ سے باز ہی تو آ جاؤں گی۔'' دوسری رائے قائم ہوئی۔

''میں زیادہ لمبی بات نہیں کروں گا..... مختصر اور ٹو دی پوائنٹ بات ہی ہوگی۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''میری پہلی عرض داشت یہ ہے کہ میرال صلاح الدین کو میں نے اغوا کیا نہ ہی اسے ریڈ لائٹ ایریا تک پہنچانے کا ذمے دار میں ہوں.....''

''دوسری عرض داشت یہ ہے کہ اسے میری داشتہ کہنا..... جیسا کہ آپ کے بنائے اور چلائے صفحے پر مسلسل کہا جا رہا ہے اُس کی (میرال کی) توہین کے سوا کچھ نہیں۔

''تیسری عرض داشت یہ ہے کہ ''میرال صلاح الدین'' زرنگار کے کیموفلاج سے باہر نکل چکی ہے۔ اب اسے زرنگار کے نام سے مت پکارا جائے۔

''چوتھی عرض داشت وہ میری قید میں نہیں، میری حفاظت میں ہے۔ عرصے کے بعد زندگی کی طرف لوٹتے ہوئے محفوظ و مامون۔

''وہ میری حفاظت میں آپ کی امانت ہے، میں ابھی اسے آپ کے حوالے کر دیتا لیکن فوری طور پر اس لیے نہیں کر سکتا کہ ابھی جو خطرات اس کی جان کو لاحق ہیں ان سے محفوظ رکھنے کے لیے آپ کے پاس وہ انتظام نہیں ہو سکتے جو میرے پاس ہیں لیکن جلد ہی وہ ان خطرات سے باہر نکل کر آپ کے پاس جائے گی۔

''میری آخری عرض داشت یہ ہے کہ دل اور نیت کا حال صرف اللہ جانتا ہے، انسان کا کام صرف شک کرنا ہے..... پھر بھی آپ مجھے اس الزام سے بری کر دیجیے کہ میں خدانخواستہ اس کے اغوا، اس کی عصمت کو پامال کرنے کی ناپاک کوششوں اور اس کی عزت کو تباہ کرنے کے ارادوں کا محرک تھا، ہوں یا ہو سکتا ہوں۔''

عافیہ دم بخود بیٹھی اس شخص کی باتیں سن رہی تھیں، جس کے متعلق ان کا خیال تھا کہ اسے دسیوں بار بھی پھانسی چڑھایا جائے تو اس کی سزا پوری نہیں ہو سکتی.....

''پھر تم کون ہو اس سارے قصے میں؟'' انہیں اپنی آواز کسی گہرے کنویں کے اندر سے آتی محسوس ہوئی۔

''میں.....؟'' وہ جو کھڑکی کے قریب کھڑا باہر دیکھ رہا تھا یک گھوم کر اُن کی طرف مڑا۔

''میں صوفی صاحب کی وہ دعا ہوں جو انہوں نے میرال صلاح الدین کے حق میں فرمائی تھی۔''

جاری ہے

شامِ شہرِ یاراں

عنیزہ سید

قسط 14

زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے . . . خیر و شر، نیکی اور بدی . . . زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت . . . ہر برائی پر حاوی ہوجاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سیّد نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

محمود دُرّانی اور مہرین کی تیسری اولاد حمزہ، مہرین کی زچگی میں پیچیدگی کے باعث نانی کے پاس ان کے آبائی گھر سیالکوٹ میں پروان چڑھتا ہے۔ جہاں نگین اس کے ماموں کی بیٹی سے اس کی خوب گاڑھی چھنتی ہے۔ علینہ کے والدین، نادیہ اور سعید کیانی نے کورٹ میرج کی تھی مگر شادی کے تین سال بعد سعید کیانی بیوی کو داغِ مفارقت دے گئے۔ آکسفورڈ کا پروردہ سردار مہرزاد خان اپنے باپ کے سیاسی قتل کے بعد حادثاتی طور پر سیاست میں شامل ہوا تھا اور زرنگار کے حسن و ذہانت کا شکار ہو چلا تھا...... بینش دو بھائیوں کی اکلوتی بہن، اپنی ضد اور صرف بھائیوں کے تعاون سے نیشنل کالج آف آرٹس میں تعلیم حاصل کر رہی تھی جہاں اس کا سینئر ساتھی دانیال اس سے ہر ممکن تعاون کرتا تھا۔ ایک پاکستانی مسلمان مرد اور بدھ مذہب کی پیروکار چینی عورت کی بیٹی زوئی حسین چین سے آکر پاکستان میں فارمیسی کی تعلیم حاصل کرتی ہے۔ دانیال آرٹ کا عشق رکھنے کے ساتھ فلائنگ میں بھی مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے اور ایک دن طیارے کے دھویں سے نقش و نگار بنانے کی کوشش میں حادثے کا شکار ہو جاتا ہے۔ نادر، حمزہ سے ملتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ اگر زوئی قصوروار ہوئی تو وہ خود اسے لے کر آئے گا۔ حمزہ کہتا ہے کہ اسے اب تنگ نہیں کیا جائے گا۔ علینہ اچانک فہد کی آمد سے بہت خوش ہوتی ہے لیکن جب وہ یہ سنتی ہے کہ وہ میرال کی تلاش میں آیا ہے تو یہ اسے اچھا نہیں لگتا۔ نادر اپنے گھر میں زوئی کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ لیشل، مہرزاد کو سنبھل کر چلنے کا مشورہ دیتی ہے۔ مہرزاد حلف اٹھانے کے بعد سوچ رہا تھا کہ حلف اٹھانے والوں کو حلف کے الفاظ یاد بھی رہتے ہوں گے کہ وہ ان پر عمل کر سکیں۔ مہرین، حمزہ پر شادی کے لیے زور ڈالتی ہے لیکن وہ پس و پیش سے کام لیتا ہے تو محمود درانی کہتے ہیں کہ وہ کوشش کریں گے کہ وہ اس کی چوائس کو اپروول دلا دیں۔ زرنگار کو اس خصوصی نمبر سے دبئی روانگی کا پیغام ملتا ہے اور پھر امراؤ بیگم کہتی ہے کہ سردار صاحب نے ٹکٹ بھیجا ہے۔ گڈی، مہرزاد سے کہتی ہے کہ اسے وزارت کا عہدہ ملنے کی خوشی میں بپا کی گئی تقریب میں زرنگار کو بلانا چاہیے تھا۔ علینہ، فہد کو بتاتی ہے کہ ایک سوشل ویب سائیٹ پر میرال صلاح الدین کے نام کا صفحہ موجود ہے۔ میرال کو بتایا جاتا ہے کہ اس کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل ہے اس لیے وہ دبئی نہیں جا سکتی۔ میرال حیران ہوتی ہے کہ وہ لوگ اسے کہاں لے کر جا رہے ہیں۔ مہرزاد کے آدمی اسے بتاتے ہیں کہ میرال کو بڑے گھر لایا گیا ہے۔ مہرزاد فون کرنا چاہتا ہے لیکن میرال سے رابطہ ممکن نہیں ہوتا۔ زوئی ٹیکسی کر کے میرال کی گاڑی کا پیچھا کرتی ہے۔ نادر، حمزہ محمود کو میرال کے بارے میں بتاتا ہے...... عافیہ ویب سائیٹ پر فہد کا میسج پڑھ کر اس سے رابطہ کرنے کا سوچتی ہیں۔ مہرزاد خان اپنی برادری کے لوگوں پر میرال کے سلسلے میں دباؤ ڈالتا ہے۔ لیشل، مہرزاد خان کی نیوز اینکر کے ساتھ منعقد کی گئی میٹنگ دیکھتی ہے تو اسے کچھ غیر معمولی محسوس ہوتا ہے۔ فہد اور حمزہ، دانیال اور عافیہ سے ملنے آتے ہیں۔ علینہ، فہد کے جانے کے بعد سوچتی ہے کہ اس کے ہونے سے کتنی رونق ہو گئی تھی۔ فہد، دانیال، عافیہ اور حمزہ سے کہتا ہے کہ اسے اپنے کچھ کانٹیکٹ آزما لینے دیں۔ مہرزاد کے انداز میں غیر معمولی تبدیلی پر لیشل حیران ہوتی ہے۔ نادر کی ماں اسے کہتی ہے کہ اس کی بہنیں آ رہی ہیں، وہ دونوں اپنا اپنا گروپ بنا لیتے ہیں۔ دانیال، بینش سے کہتا ہے کہ وہ اسے پرپوز کرنا چاہتا ہے۔ زرنگار کو ایک شخص لینے آتا ہے تو وہ اسے کہتی ہے کہ وہ اس پر یہ احسان کرے کہ اس کی زندگی ختم کر دے لیکن وہ ایسا کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ مہرزاد کے پاس اس کے نانا کا فون آتا ہے کہ زرنگار جلد ہی اس تک پہنچنے والی ہے اور اب اسے اپنی ماں کی خواہش کا احترام کرنا ہوگا۔ وہ مہرزاد خان سے کہتے ہیں کہ وہ اپنی ٹون بدل لے...... فہد، عافیہ اور حمزہ کو بتاتا ہے کہ میرال کو اس رات جس عمارت میں لے جایا گیا اس کا محرک مہرزاد نہیں ہے۔ دانیال کہتا ہے کہ لڑکی کو اگر وہاں سے نکالنا ہے تو پرائیویسی کو چھوڑنا ہوگا جس پر حمزہ، فہد اور عافیہ سب ہی خاموش رہتے ہیں۔ بینش کی ماں اس سے کہتی ہے کہ اب پڑھائی چھوڑ کر شادی کی فکر کرے۔ بینش ماں سے کہتی ہے کہ وہ تھوڑا انتظار کرے۔ زرنگار، مہرزاد سے کہتی ہے کہ اگر اسے پتا ہوتا کہ اسے مہرزاد کے سامنے لایا جا رہا ہے تو وہ یہاں نہ آتی اپنی زندگی ختم کر لیتی۔ مہرزاد، زرنگار کو یقین دلاتا ہے کہ اسے اب یہاں کوئی خطرہ نہیں...... وہ یہاں محفوظ ہے لیکن زرنگار کو اس کی کسی بات پر یقین نہیں آتا...... امراؤ بیگم کو پولیس پکڑ لیتی ہے۔ فہد، چیف منسٹر سے ملتا ہے لیکن اسے چیف منسٹر سے مل کر بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ حمزہ، نگین کو بتاتا ہے کہ اس نے سیالکوٹ والا گھر ماموؤں سے خرید لیا ہے۔ بینش کی ماں اسے بتاتی ہے کہ وہ اپنے بھائی کے بیٹے سے اس کا رشتہ کر رہی ہے۔ نادر، زوئی سے کہتا ہے کہ اس کے پاس ایجنسی والوں کا فون آیا تھا۔ مہرزاد، عافیہ کو ملنے کے لیے بلاتا ہے۔

اب آگے پڑھیں

وہ کیا کہہ رہا تھا...... خود کو کیا قرار دے رہا تھا عافیہ کو اس کی بات پر غور کرنے اور سمجھنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ وہ بے یقینی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اب تک انہوں نے جو کچھ اس کے بارے میں سنا اور پڑھا تھا، اسے سننے اور پڑھنے کے بعد ان کے ذہن نے اس کا ایک خاکہ تیار کر رکھا تھا...... وہ ایک چالباز، مکار، کرپٹ، عیاش، ہمہ وقت اقتدار میں رہنے والے کروک شخص کا بیٹا تھا، ملکی تاریخ کے اکثر ایسے سیاست دانوں کے بیٹوں کی طرح آکسفورڈ، کیمبرج یا ہاورڈ سے پڑھا ہوا تو ضرور تھا مگر اس کی جبلّت میں وہی مکاری، کرپشن، عیاشی اور چالبازی موجود تھی جو اس کے خاندان سے تعلق رکھنے والے تمام سیاست دانوں کا خاصہ تھی۔ اسی شخص کے ہاتھوں ایک معصوم لڑکی کا اغوا ہوا تھا، اسی نے اُسے ... حبس بے جا میں رکھا ہوا تھا اور یہ ہی شخص اس کی عصمت پامال کرنے کے جرم میں سنگساری کا سزاوار قرار دیے جانے کا مستحق تھا۔ ان کے ذہن میں اس کا یہ خاکہ پختہ اور مکمل تھا مگر اس وقت وہ کیا سنا رہا تھا۔ وہ زرنگار کو میرال صلاح الدین ڈکلیر کر رہا تھا۔ خود کو اس کے اغوا کے الزام سے بری قرار دے رہا تھا۔ میرال کی عصمت کو اپنی عزت بتا رہا تھا اور سب سے بڑھ کر وہ صوفی صاحب اور ان کی دعاؤں سے واقفیت کا حال سنا رہا تھا۔ عافیہ کا ذہن اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پلٹے کھانے لگا تھا۔ وہ کس بات کو سچ سمجھیں کس کو جھوٹ، کس کو درست قرار دیں کس کو غلط......

''میں نے غلط کیا جو اکیلی چلی آئی...... دانیال کو ساتھ لانا چاہیے تھا۔'' انہوں نے ماؤف ہوتے دماغ کو قابو کرتے ہوئے سوچا۔

''میں جانتا ہوں کہ آپ کو میری ایک بھی بات پر یقین نہیں آ رہا ہوگا۔'' وہ ان کے چہرے کے تاثرات کو جانچتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے اپنے ذہن میں جو میرا خاکہ تیار کر رکھا ہے اس کے مطابق آپ کو ایسا ہی سوچنا چاہیے۔''

عافیہ نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، یقیناً ان کی نظروں میں تذبذب تھا۔

''آپ بھی غلط نہیں سوچ رہیں......'' اس نے سر جھٹکا...... ''میری بدقسمتی کہ میری فیملی ہسٹری اور میرے موجودہ حالات، میرے بارے میں ایسے ہی خیالات کو جنم دے سکتے ہیں۔'' اس کی مسکراہٹ میں طنز کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔

''لیکن مجھے خود کو ایسے امیج سے آزاد کروانے میں کوئی دلچسپی بھی نہیں۔'' اس نے عافیہ کو یقین دلانے کے سے انداز میں دیکھا۔

''ہاں مگر آپ کے سامنے......'' پھر وہ گہری سانس لیتے ہوئے سر اٹھا کر چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ ''بلکہ شاید ہر اس شخص کے سامنے جس کا تعلق کسی نہ کسی طرح میرال صلاح الدین سے ہے، میں اپنی بے گناہی کا گواہ بننا چاہتا ہوں۔''

عافیہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا...... وہ بھی انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''بلکہ اپنی کیا...... میرال صلاح الدین کی بے گناہی کا گواہ بننے کی خواہش رکھتا ہوں۔''

''تم بات کو گھما پھرا کر مت کرو......'' عافیہ نے بہ مشکل اپنے دل کی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ تمہارے خلاف عوامی سطح پر ایک لابی سرگرم ہو رہی ہے اور تم آج کے دور میں سانس لے رہے ہو، آج کا دور......'' وہ سانس لینے کو رکیں...... ''جس میں آوازوں کو دبانا اور سروں کو کچلنا تمہارے باپ دادا کے

ادوار کی نسبت خاصا مشکل ہو چکا ہے۔'' اپنی بات ختم کرنے کے بعد عافیہ نے دُزدیدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی بات کے ردِعمل میں اس کے چہرے کے تاثرات جاننا چاہ رہی تھیں۔ وہ عمر میں اس سے بڑی تھیں، ان کا ایمان بہت مضبوط تھا اور وہ خاصی خود اعتماد بھی تھیں لیکن نہ جانے اس شخص کی شخصیت میں ایسی کیا خاص بات تھی کہ جو وہ خود کو اس سے دبتا ہوا محسوس کر رہی تھیں۔

''دور آج کا ہو یا گزرے کل کا......'' انہوں نے دیکھا ان کی بات سن کر مسکراتے ہوئے کچھ دیر اس پر غور کرنے کے بعد وہ بولا تھا۔'' یا اس سے بھی پہلے کل کا، آوازیں دبانے اور سر کچلنے کی روایتیں ختم نہیں ہو سکتیں اگر چہ ان پر عمل کے طریقے بدل چکے ہیں، بدلتے رہے ہیں اور بدلتے رہیں گے لیکن آپ اطمینان رکھیے۔'' وہ ان کے سامنے دھرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں چنگیز خان جیسی صفات رکھنے والوں کے خاندان سے ضرور تعلق رکھتا ہوں مگر چنگیز خان کے بھی کچھ اصول ایسے تھے جن کی وجہ سے وہ اپنے دور کے جنگجوؤں میں ممتاز ہوا، یاد رکھیں چنگیز خان بھی اپنی ماں کا بے حد احترام کرتا تھا اگر چہ اس بات کا ذکر تاریخ میں بہت کم ہوا۔''

''واہ...... مثال دینے کو تمہیں چنگیز خان ہی یاد آیا۔'' عافیہ نے بے اختیار کہا۔

''ہوں......'' وہ مسکرایا۔ ''اس لیے کہ میں ایک سپہ سالار کی حیثیت میں اس کا بہت بڑا مداح ہوں، وہ صحیح معنوں میں ایک قابل ترین سپہ سالار تھا۔''

''ظاہر ہے جیسی تمہاری فطرت ہے ویسی ہی مثالیں بھی تمہیں بھاتی ہوں گی۔'' عافیہ نے ناگواری سے کہا۔ ''جب ہی اُس سے متاثر ہو کر کھوپڑیوں کے بجائے مُردہ روحوں کے مینار کھڑے کرنا تمہارا خاندانی مشغلہ ٹھہرا۔''

''مجھے آپ کی اس بات سے اختلاف ہو رہا ہے، روحیں مُردہ نہیں ہوتیں، جسم مُردہ ہو جاتے ہیں، روحیں تو عالمِ بالا کی طرف پرواز کر جایا کرتی ہیں۔ عالمِ ارواح میں جا کر واپس رجسٹر ہو جاتی ہوں گی۔''

''باتوں کے توتے، مینا بنا کر ہی تو تم لوگ عام عوام کو بے وقوف بنایا کرتے ہو اور پھر ان سادہ لوحوں کے ووٹوں کے ذریعے اقتدار کے ہما پر اپنی گرفت جاری رکھتے ہو۔'' عافیہ اس کی بات سے متاثر نہ ہوتے ہوئے بولیں۔ ''خیر'' پھر انہوں نے سر جھٹکا...... ''میں تم پر واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ میں تمہاری باتوں میں آنے والی نہیں...... میں کانوں سنی پر نہیں آنکھوں دیکھی پر یقین رکھتی ہوں۔''

''خوب......'' اس کی مسکراہٹ گہری ہونے لگی۔ ''ابھی تک جس مفروضے کو لے کر آپ اپنے خیال میں ایک تحریک کو کمانڈ کر رہی ہیں، اس مفروضے کے کتنے مندرجات آپ نے آنکھوں سے دیکھ رکھے ہیں؟'' عافیہ کے پاس اس کے سوال کا جواب نہیں تھا۔

''میں جانتی ہوں مجھے یہاں بلانے کا مقصد صرف اور صرف اس تحریک کو کنٹرول کرنا ہے۔'' انہوں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''سیاست دانوں کے پاس مختلف ہتھکنڈے ہوتے ہیں تحریکوں کو کنٹرول کرنے کے...... لیکن میں واضح کر دوں، ہماری آواز بند ہوگی نہ ہی جدوجہد رکے گی۔ تم خود کو چاہے کتنا ہی پارسا ثابت کرنے کی کوشش کیوں نہ کر لو، یہ سچ ہے کہ میرال اب بھی تمہارے قبضے میں ہے، ایک معصوم بے گناہ لڑکی کے ساتھ جو ظلم تم نے کیا ہے اس پر تو آسمان بھی کانپ اٹھا ہوگا، تمہیں یونہی چھوڑ دینے کے گناہ میں کم از کم میں شریک نہیں ہو سکتی...... بھلے تم اپنے اقتدار کے نشے میں مجھ سے اور میری فیملی سے کیسا ہی سلوک کر لو۔'' انہوں نے یہ بات

مہرزاد خان کی طرف دیکھے بغیر کہی تھی۔

☆☆☆

''آپ کا تو کچھ کہہ نہیں سکتا مگر میرا دماغ ابھی چل نہیں گیا جو میں ماسے ممتاز سے کہوں کہ ہمارے گھر رشتہ ڈالے۔'' بینش کے بڑے بھائی سلیم نے رات کے کھانے کے دوران گفتگو میں اپنی اماں کے سنئے اور نادر خیال کو سننے کے بعد کہا۔

''بندے کو اپنی اوقات میں ہی رہنا چاہیے سلیم۔'' اماں نے بیٹے کے جواب کی وجہ سمجھتے ہوئے کہا۔ ''بندہ اپنے جیسوں میں ہی رہتا، بستا، جچتا ہے۔''

''نہ اماں نہ......'' سلیم نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بینش ہماری اکلوتی لاڈلی بہن ہے، اسے اتنا پڑھا لکھا کے ماسے ممتاز کے گھر کیسے بیاہ دیں، جس کے گھر کے کونے، کونے سے جہالت ٹپکتی سامنے سے ہی نظر آجاتی ہے۔''

''یہ سلیم ہے ناں......'' اماں نے ناراض ہوتے ہوئے چھوٹے بیٹے کلیم کی طرف دیکھا۔ ''اسے تو شروع سے ہی بڑے لوگوں میں بینے کھلونے (بیٹھنے کھڑے ہونے) کا شوق ہے، تو بتا تو، تو سمجھ رہا ہے ناں میری بات۔''

''میں نے کیا سمجھنی ہے بات......'' کلیم نے روغنی نان پر تلی ہوئی مچھلی کا بڑا سا ٹکڑا رکھ کر اسے رول کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ''میرے پلّے تو اس بے وقت کی راگنی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی، کدھر تو گلبرگ، کینٹ، جوہر ٹاؤن میں رہنے والوں کے رشتے دیکھنے کی بات کر رہی تھی اماں، کدھر ماسے ممتاز کا پسر ور اب نظروں میں سما گیا۔''

''بس میں نے سمجھ لیا ہے، اونچے خواب دیکھنے لگو تو بندے کو اپنی اُڈیاں (ایڑیاں) بھی اوپر اٹھانی پڑتی ہیں۔'' اماں نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''اور بندہ زیادہ دیر پباں بھار (پنجوں کے بل) کھڑا نہیں ہو سکتا، اڈیاں واپس اپنی جگہ پر ٹکانی پڑتی ہیں، اس کا قد واپس اپنی جگہ پر آجاتا ہے اور وہ جن کی ہمسری کے خیال سے پباں بھار (پنجوں کے بل) کھڑا ہوتا ہے، وہ اس کا قد بُت پہچان کر منہ موڑ لیتے ہیں، بھا ممتاز کے گھر رشتہ دے کر ہمیں اپنی اڈیاں اٹھانی نہیں پڑیں گی بلکہ اس کی اٹھیں گی، وہ تھک کر واپس زمین پر اڈیاں لگا بھی دے گا ناں تو ہمیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہمیں تو پہلے ہی پتا ہے اس کا قد بُت کتنا ہے۔'' اماں کی زندگی کے تجربوں سے لبریز اِن باتوں پر پہلے تو وہ انہیں دیکھتا رہ گیا۔

''واہ اماں واہ...... آپ نے بھی لگتا ہے کتابیں پڑھ لی ہیں، بینش کے پاس بیٹھ کر، بڑی بڑی باتیں کرنے لگی ہو۔'' اس نے مچھلی کے کانٹے منہ سے نکال کر پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''سولہ آنے سچ کہہ رہی ہوں سلیم، وقت پر عقل پر ہتھ (ہاتھ) ڈال لینے میں ہی فائدہ ہے۔'' اماں اصل بات دل میں رکھتے ہوئے سلیم کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''رہنے دے اماں، عقل کو بھی اور ہاتھ کو بھی...... ہماری بینش ہیرا ہے ہیرا...... ہم اسے راکھ میں رُلنے کے لیے ماسے ممتاز کے گھر بیاہ دیں......؟'' سلیم نے دسترخوان سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اماں کی نادر تجویز کو بُرے سے رد کرتے ہوئے کہا۔

''بینش کو پڑھائی مکمل کر لینے دے...... پھر ہم اس کے لیے شہزادہ ڈھونڈ ہی نکالیں گے تو فکر نہ کر، اپنی

بینش شہزادی ہے شہزادی، اس کے ساتھ کوئی شہزادہ ہی سجے گا نا کہ ماموں ممتاز کا جوڑی چوگا ٹھ والا..... کیوں بھئی کلیم!" اس نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بھائی کی طرف دیکھا، دونوں بھائی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس دیے۔ اماں کی تجویز ہنسی، ہنسی میں اڑ گئی۔ وہ بیٹوں کو اصل بات بتانے سے کترا رہی تھی۔ ان کے مزاجوں سے واقف تھی، بہت اچھی طرح جانتی تھی اصل بات بتائے گی تو یہی بھائی جو بینش کو شہزادی قرار دے رہے تھے اُسے اگلے ہی روز ماموں ممتاز کے گھر تو کیا اس سے چھوٹے ماموں ریاض کے گھر بھی بیاہنے پر تیار ہو جائیں گے جس کا بیٹا کسی موٹر الیکٹریشن کے پاس ابھی کام سیکھ رہا تھا اور جس کا کام میں ابھی ہاتھ بھی سیدھا نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

عافیہ کے فون کی اسکرین نے روشن ہو کر انہیں دانیال کی کال کا اشارہ دیا تھا۔ انہوں نے ایک نظر مہرزاد خان کی طرف دیکھا اور پھر فون آن کر کے کان سے لگا لیا۔

"آپ خیریت سے تو ہیں ناں ممی..... اس (گالی) نے آپ سے کوئی بدتمیزی تو نہیں کی ہے؟" دانیال کے لہجے میں شدید بے چینی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں دانیال....." عافیہ نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "گالی مت دو، تم جانتے ہو گالی دینا کیسا گناہ ہے۔"

"آئی ایم سوری ممی۔" دانیال کے لہجے میں شرمندگی ظاہر ہوئی۔ "لیکن جو شخص سراپا گالی ہو اسے کسی اچھے نام سے کیسے یاد کیا جا سکتا ہے۔"

"کبھی ایسا بھی ہوتا ہے دانیال کہ ہم حقیقتوں سے دور..... حقیقتوں سے بے خبر..... انہیں اپنی ہی نظر سے دیکھ رہے ہوتے ہیں، ہماری نظر پر ہماری سوچ زاویۂ نظر بن کر چھائی ہوتی ہے، ایسے میں حقیقتوں کو قریب سے دیکھنے پر ہم اچانک ہڑبڑا جاتے ہیں، کچھ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہو رہا ہے اس وقت، اس وقت میں ہڑبڑائی بلکہ سٹپٹائی ہوئی ہوں، میرا انتظار کرو، گھر آ کر تم سے بات کرتی ہوں۔" عافیہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور فون بند کر کے ایک بار پھر مہرزاد خان پر نظر ڈالی جو انہیں غور سے دیکھ رہا تھا۔

"میں آپ کی اس ہڑبڑاہٹ اور سٹپٹائے جانے کی صورتِ حال پر معذرت خواہ ہوں۔" وہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔"

"میں نے اپنے بیٹے سے سچ بولا ہے۔" عافیہ نے جواب دیا۔ "حقیقت کو قریب سے دیکھنا ایک الگ ہی تجربہ ہے، اس وقت میں محسوس کر سکتی ہوں کہ خود پر کیچڑ اچھلتے ہوئے دیکھ کر تمہیں کیسا لگتا ہوگا۔"

"مجھے برا نہیں لگنا چاہیے تھا۔" وہ نرمی سے بولا۔ "کیچڑ میں کھلے کنول تک رسائی حاصل کرنے کی خواہش کرتے ہوئے مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ میرے اپنے ہی قدم کیچڑ میں پڑنے سے کیچڑ اچھلے گی بھی اور مجھ پر اس کے چھینٹے بھی پڑیں گے، میرے لیے یہ صورتِ حال غیر متوقع نہیں تھی۔"

عافیہ کچھ سوچتے ہوئے غور سے مہرزاد خان کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کی بدگمانی، شکوک اور نفرت کا احساس دور کرنے کے لیے مہرزاد خان نے کچھ زیادہ وقت نہیں لیا تھا۔ اس نے صرف پینتیس منٹ کے اندر امراؤ بیگم کے ٹھکانے تک اتفاقیہ رسائی اور زرنگار سے ملاقات سے لے کر ایک ہزار راتوں کے معاوضے، کہانیاں کہنے اور کہانیاں سننے کے عمل، بدصورتی میں چھپی خوب صورتی کو بدصورتی سے نکال لینے کی کوششوں اور پھر ایک

طویل اعصابی جنگ کے بعد اپنی کوشش میں کامیابی کی داستان انہیں سنا ڈالی تھی۔ پینتیس منٹ کا عرصہ بہت مختصر مگر مہرزاد خان کا بیان جامع اور مکمل تھا۔

"پتا نہیں کیوں....." عافیہ نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ "تمہاری بات پر یقین کرنے کو دل چاہ رہا ہے اگرچہ دل یہ بھی کہہ رہا ہے کہ تم جس بھنور میں پھنسے ہوئے ہو اس بھنور کے قریب تک بھی پارسائی نام کی شے نہیں پھٹکتی مگر میرال کے بارے میں تمہارا بیان ایسا ہے کہ اس کی سچائی کی ایک نامحسوس مگر عجیب سی گواہی کہیں سے آتی محسوس ہو رہی ہے۔"

"میرے لیے یہ سب اطمینان کا باعث ہے۔" مہرزاد خان نے متانت سے کہا۔

"زرنگار کو میرال جاننا اور صوفی صاحب کی دعاؤں کا ذکر..... دو ایسی باتیں ہیں جو صرف اُسے ہی معلوم ہو سکتی ہیں جس کو میرال نے خود یہ دونوں باتیں بتائی ہوں۔" عافیہ نے مزید کہا۔

"اسی لیے میں نے آپ کو بتایا کہ میں "زرنگار" کے قریب کہانیاں کہنے اور کہانیاں سننے کے لیے گیا تھا۔ میرے پاس تو سنانے کو کچھ ایسے الفاظ ہی تھے جن سے اس کا اعتبار مجھ پر بندھ جاتا مگر اس کے پاس سنانے کو بہت کچھ تھا، وہ بہت کچھ جس کا میں نے مختصراً آپ سے ذکر کیا۔"

"پتا نہیں....." عافیہ نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ "پتا نہیں کیوں، میرال کے متعلق وہ سب سن کر ڈسکس کرتے ہوئے جو ہم تک پہنچا... یا ہم نے خود assume کر لیا، میرے ذہن میں ایک ہی بات گردش کرتی تھی کہ اگر وہ اتنے برے حالات کو پہنچ چکی ہے جو ہم سوچ رہے ہیں تو اس کے لیے صوفی صاحب جو دعائیں کیا کرتے تھے جس طرح وہ آنٹی رابعہ کو تسلی دیا کرتے تھے پھر اس کی تو کوئی حقیقت نہ ہوئی ناں جبکہ میں نے اپنے بیٹے کے سلسلے میں خود ان کی یقین دہانیوں کو معجزے کی شکل میں حقیقت میں ڈھلتے دیکھا ہے، جب سب مایوس تھے ایک صرف وہ تھے جو یقین دلاتے تھے زندگی عطا کرنے والے کی ذات بہت بڑی ہے، وہ دنیا سے جاتے، جاتے اپنے جانے اور دانیال کی زندگی اور صحت کی خبر دے گئے، وہ انتہائی عبادت گزار، پرہیزگار، نیک اور متقی شخص تھے پھر ان کی دعائیں میرال کو کیوں نہیں لگیں، میں بارہا سوچتی تھی اور میرا ذہن اس سوال پر اٹک کر بند ہو جاتا تھا۔"

"میں صوفی صاحب کو نہیں جانتا، میں نے ان کا کبھی نام بھی نہیں سنا مگر میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ کچھ نیک لوگ جب دل سے دعا دیتے ہیں تو وہ دعا لگتی بھی ہے اور معجزے بھی دکھا سکتی ہے۔" مہرزاد خان نے کہا۔

"بہرحال....." عافیہ نے سر ہلایا۔ "جو تم نے سنایا میں جب تک میرال کو اپنی آنکھوں سے دیکھ اور کانوں سے اس سے یہ سن نہیں لوں گی کہ وہ امان میں ہے، تب تک دل سے یقین نہیں کر سکتی۔"

"آپ اس کا حق رکھتی ہیں۔" مہرزاد نے کہا اور اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔

"تمہیں ثبوت دینا ہوں گے۔" عافیہ نے اپنے لہجے میں مضبوطی کا تاثر دیتے ہوئے کہا۔ "جب تک وہ نہیں ملتے، ہم اپنا کام جاری رکھیں گے۔"

"میں آج ہی میرال کو آپ کے حوالے کر دیتا کیونکہ میں بھی سمجھتا ہوں کہ میرے تحفظ میں رہتے ہوئے اسے تحفظ تو ضرور ملتا رہے گا مگر اس کے متعلق شکوک بدستور جاری رہیں گے مگر حالات اتنے پیچیدہ ہو چکے ہیں کہ فی الحال یہ ممکن نہیں، اسے آپ کے حوالے کر دینا آپ اور اس کی، دونوں کی سلامتی کو خطرے میں

ڈالنے کے مترادف ہوگا۔" مہرزاد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اور رہا آپ کا کام..." وہ مسکرایا۔ "آپ اسے شوق سے جاری رکھ سکتی ہیں مگر یہ مت سمجھیے گا کہ آپ کے اس کام سے گھبرا کر میں نے آپ کو کوئی "ڈیل" کرنے کے لیے یہاں تک آنے کی زحمت دی ہے، ہمارے ساتھ تو اب یہ روٹین بن چکی ہے۔ ہم ہمہ وقت، اٹھی انگلیوں، سوالیہ چہروں، مشکوک اشاروں، اچھلتی کیچڑ اور غلیظ گالیوں کی زد میں رہتے ہیں، اس دورِ جدید نے سیاست کو گالی میں تبدیل کر رکھا ہے پھر بھی ہم سیاست ہی کے ذریعے تبدیلی کے خواہش مند بھی ہیں۔" اس کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ تلخ ہوگئی۔

"مجھے سیاست میں کوئی دلچسپی ہے نہ غرض......" عافیہ نے کہنا چاہا۔

"مگر مجھے اس بات میں دلچسپی ضرور ہے کہ "میرال......" کے نام پر سیاست نہ کی جائے کیونکہ وہ میرا سیاسی نہیں ذاتی معاملہ ہے۔" مہرزاد نے عافیہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

عافیہ نے چونکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا...... انہیں مہرزاد خان کے چہرے پر ایک تحریر واضح ہوتی دکھائی دی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں...... "مجھے امید ہے کہ تم جتنی جلدی ممکن ہوا سے ہم تک پہنچا دو گے بظاہر وہ لاوارث نظر آتی ہے مگر تمہیں اندازہ نہیں کہ اس کے لیے چلائی تحریک میں کہاں، کہاں سے کون، کون سے مضطرب لوگ ایک، ایک کر کے ہم سے ملتے چلے گئے، یوں جیسے اس کے لیے ایک پورا خاندان سا بن گیا۔ ماں، باپ، بہن بھائی دوست سب رشتے اس کے اردگرد نظر آتے ہیں۔"

"میں سمجھ رہا ہوں اور میرا دل خوشی کی کیفیت بھی محسوس کر رہا ہے۔" مہرزاد نے بازو کمر کے پیچھے باندھتے ہوئے کہا۔ "میرا یقین اور بھی مضبوط ہونے لگا ہے کہ وہ یقیناً کسی کی دعاؤں کے حصار میں ہے۔ جب ہی تو میری نظروں نے اسے لوکیٹ کیا اور میرے اعصاب نے اسے وہاں سے نکال لینے کی تحریک پکڑی...... وہ یقیناً بہت خوش قسمت اور بلند بخت ہے ورنہ ان حالات میں کبھی اس طرح بچ نہ پاتی۔"

"ہوں۔" عافیہ نے اس کی بات سن کر سر ہلایا۔ "میں اب چلوں گی۔"

"ایک بار پھر آپ کو یہاں بلانے کی گستاخی پر معذرت خواہ ہوں۔" مہرزاد نے کہا۔ "ماؤں کو بلایا نہیں جاتا، خود ان کے پاس جایا جاتا ہے مگر یقین جانیں یہ میری مجبوری تھی۔"

"کوئی بات نہیں، میرال تک رسائی کے لیے تو میں کہیں بھی جانے کو تیار ہوں۔" عافیہ نے کہا۔

"ایک درخواست بھی کروں گا آپ سے۔" مہرزاد نے آگے بڑھ کر عافیہ کے لیے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "اپنے صفحے کی تفصیلات کی مد میں لکھے اس جملے کو نکال دیجیے گا۔ جس میں بولڈ الفاظ میں لکھا گیا ہے کہ "seeing is believing" کیونکہ جو نظر آتا ہے ہمیشہ وہی سچ نہیں ہوتا۔"

عافیہ نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور آگے بڑھ گئیں...... سردار زادہ مہرزاد خان جسے دیکھنے پر وہ اسے گولی مار دینے کی خواہش مند تھیں سے ملاقات ان کی زندگی کے گنے، چنے انوکھے تجربات میں سے ایک ثابت ہوئی تھی۔

☆☆☆

وہ اُس جگہ پر قید تھی یا وہ جگہ اس کی ملکیت تھی، اس جگہ پر رہائش کے اوّلین دنوں میں اسے یہ خیال نہیں آیا تھا، ایک طویل اعصابی اور ذہنی مشقت جھیلنے کے بعد اسے چند ایسے دن میسر آئے تھے جن میں اس کے ذہن،

کوئی بوجھ تھا نہ دل میں خوف...... "شدّاد کی جس جنت کا ذکر اس نے کتابوں میں پڑھ رکھا تھا وہ شاید ایسی ہی ہوگی۔" وہاں رہتے ہوئے اس نے البتہ یہ ضرور سوچا تھا، وہ جس، جس جہنم سے گزر کر یہاں پہنچی تھی اس کے بعد اسے یہ جگہ انسان کی بنائی جنت ہی محسوس ہو رہی تھی لیکن پھر وہ اولین دن گزر گئے اور اس کی فطرت اس جگہ اور یہاں کے آرام و سکون کی عادی ہونے لگی۔ اس کے بعد ذہن میں سوال اٹھنے لگے اور دل اکتانا شروع ہوگیا، الجھنا شروع ہوگیا۔

"آخر مجھے یہاں بھیجنے اور رکھنے کا مقصد کیا ہے؟"

"کیا آپ مجھے یہاں قید رکھ کر وہ ذہنی مسرت حاصل کرنا چاہتے ہیں جو کہانیوں کے جنّ کو کسی شہزادی کو اپنی قید میں رکھ کر محسوس ہوا کرتی تھی؟"

"کیا مجھے ایسی جگہ زندگی کے باقی دن بلا کسی قصور سولٹری کنفائنمنٹ کی سزا کاٹتے گزار دینا ہوں گے...... یہیں میری زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا اور میں یہیں دفن کر دی جاؤں گی؟"

"یہ جگہ وہ رنگون ہے جو میرے لیے کالا پانی ثابت ہو رہا ہے۔"

مہرزاد خان کو اس کے خصوصی نمبر سے اب اسی قسم کے پیغامات موصول ہو رہے تھے، وہ یہ پیغامات بھیجتی تھی، ان کے جواب نہ آنے پر جھنجلاتی تھی اور چڑ کر پہلے سے بھی زیادہ تلخ اور سخت پیغامات بھیجتی تھی۔ رفتہ، رفتہ اُسے اس جگہ پر موجود ہر چیز سے اکتاہٹ محسوس ہونے لگی...... بیش قیمت سامان سے سجے کمرے، سبزہ، پھل، پھول، کتابیں، ٹی وی جس پر محدود اور مخصوص چینلز آتے تھے یہاں موجود اس کی

خدمت کے لیے ہمہ وقت مستعد ملازمین، اس کا دل ان سب سے اچاٹ ہونے لگا۔ وہ اس گھر کے خصوصی پریئر روم میں جاتی اور گھنٹوں کوئی دعا، کسی نماز، کوئی ایک آیت کی تلاوت کیے بغیر وہاں بیٹھ کر باہر نکل آتی۔

''کیا میرے دل پر جہل اور کفر کی مہر لگ چکی ہے؟''

''کیا میں سماعت رکھنے کے باوجود بہری، بصارت کے باوجود بے بصر اور قوتِ گویائی رکھنے کے باوجود گونگی ہو چکی ہوں؟''

''آزمائش کا ایک دور ختم ہونے کے بعد کیا آزمائش کا یہ نیا دور شروع ہو چکا جس میں، میں اپنے عمل میں آزاد اور کوئی عذر، کوئی دلیل میرے حق میں میرے کام نہ آئے گی؟''

سوال تھے، سوچیں تھیں اور اَن گنت الجھنیں تھیں...... شاید وہ ان سوالوں، سوچوں اور الجھنوں میں گھر کر ذہنی توازن کے بگاڑ کا شکار ہو جاتی اگر ایک خوشگوار شام کو بغیر کسی پیشگی اطلاع کے مہر زاد خان وہاں نہ آجاتا...... اس کی آمد کے ساتھ ہی پہلے سے ہمہ وقت مستعد عملہ اور بھی زیادہ مستعد اور مصروف نظر آنے لگا تھا۔ یوں جیسے زندگی نے ہڑبڑا کر سانس لی ہو...... اس کی طرح اس گھر میں ایک مخصوص روٹین میں مگن ہر شخص جیسے بوکھلا کر گہری نیند سے جاگا تھا۔ ہر طرف دوڑ، بھاگ، رفتار نظر آنے لگی تھی۔ اپنی آمد کے آدھے گھنٹے کے بعد ہی وہ میرال کے سامنے موجود تھا۔

''جی فرمائیں...... اب میری زندگی جو آپ کے اختیار میں ہے کہ بارے میں آپ کا اگلا فیصلہ کیا ہے، اب مجھے کن نئے حالات سے دوچار ہونا ہے؟'' اس نے اس کے اپنے سامنے بیٹھتے ہی بغیر کسی سلام دعا کے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا تھا۔ مہر زاد خان کے چہرے پر تذبذب کا سایہ جھلکا تھا۔ جسے دیکھ کر وہ اس کا جواب سنے بغیر ہاتھ اٹھا کر اسے تسلی دینے کے سے انداز میں بولی تھی۔

''فکر مت کیجیے، میں نے آپ کے اس اندازِ حکمرانی کے سامنے خود کو بے اختیار جانتے ہوئے اپنی ذہنی، روحانی اور جسمانی شکست تسلیم کر لی ہے، فرمائیں اگلا حکم کیا ہے؟ خاکسار کسی روبوٹ کے مانند اسے بجالانے کو تیار ہے۔''

''اچھا......'' مہر زاد خان نے اپنے چہرے پر چھائے تذبذب اور حیرانی کو چھپانے کی کوشش میں مسکرا کر کہا۔ ''تمہاری زبان اور تمہارا بیان، بڑا زبردست ہے، تمہاری ایک اضافی خوبی...... جس کی تعریف نہ کرنا بھی زیادتی ہوگی۔''

''تعریف و توصیف کے چکر کو اب جانے دیجیے سردار زادہ صاحب، اسی چکر میں پھنسا کر آپ نے مجھے سنہری خواب دیکھنے کی عادت ڈالی تھی لیکن اب یہ ہتھکنڈا پرانا ہو چکا، کوئی نیا حربہ آزمائیں......'' وہ تلخی سے بولی تھی۔

''میرے اندازِ حکمرانی کے سامنے اپنی شکست تو تم تسلیم کر ہی چکی ہو پھر مجھے کوئی ہتھکنڈا آزمانے کی کیا ضرورت ہے۔'' وہ اسی طرح مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ میرال کے چہرے پر ایک تلخ اور طنز سے بھرپور مسکراہٹ پھیلی۔

''چلیں پھر میرے شکست تسلیم کر لینے کے اعلان کا جشن ہی منا لیجیے، آپ پورا حق رکھتے ہیں اس جشن کو منانے کا۔'' اس نے اپنی بوجھل پلکوں میں چھپی غلافی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ غور سے

اسے دیکھ رہا تھا۔ اسی طرح جیسے وہ امراؤ بیگم کے ہاں گھنٹوں اس کے سامنے بیٹھا اس کی بیان کی جانے والی داستان سنتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہیں؟'' اس کی محویت سے گھبرا کر اس نے اپنے لہجے کو مزید کھردرا بنایا۔ ''شیر اپنے شکار کو کس زاویے سے بھنبھوڑنے میں زیادہ لذت محسوس کرتا ہے۔ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں کیا؟''

''ہوں......'' وہ چونک کر اپنی محویت سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔ ''شکر ہے تم نے مجھے شیر سے تشبیہ دے دی ورنہ شکار تو کتے بھی کرتے ہیں۔''

''آپ جیسے لوگوں کے شکرانے کے بھی کیا، کیا پیمانے ہوتے ہیں۔'' وہ مزید تلخ ہوئی۔ ''جانوروں سے تشبیہ دیے جانے پر ناراض ہونے کے بجائے شیر اور کتے کے فرق پر شکر ادا کر رہے ہیں؟''

"Do you know that you are sounding quite rude?"

مہر زاد اچانک سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ میرال نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا مگر مہر زاد نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے منع کر دیا۔

''تمہارا اگرچہ اس میں کوئی قصور بھی نہیں ہے، تم جن حالات کا شکار رہی ہو ان کی وجہ سے تمہارا ایسا ہو جانا ایک فطری ردعمل ہے لیکن شاید مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم پر یہ انداز جچتا نہیں یا شاید اب کے میں تم سے اس انداز کی توقع نہیں کر رہا تھا۔'' مہر زاد کے لہجے میں نہ جانے ایسا کیا تھا کہ وہ جواب دینا چاہتے ہوئے بھی جواب نہیں دے پائی تھی۔

''میں دو ہفتوں سے تمہارے ایسے ہی پیغامات وصول کرتے ہوئے بھی اِسی الجھن کا شکار رہا ہوں جو آج تمہارے سامنے بیٹھ کر تمہاری باتیں سن کر میرے دل کو جکڑ رہی ہے۔'' مہر زاد خان نے کہا۔ ''شاید تمہیں اندازہ نہیں کہ کس آگ کے دریا سے گزرنے کے بعد تم یہاں پہنچی ہو...... یہ جگہ یا زندگی جو اِک کنارہ ہے ایسا کنارہ جس پر زندگی اپنی تمام تر خوب صورتیوں کے ساتھ بستی بسائے بیٹھی ہے۔''

''کیا میں آگ کے دریا سے گزر چکی ہوں؟'' میرال نے ابرو چڑھاتے ہوئے اس سے سوال کیا...... ''آپ کہتے ہیں کہ میں آگ کا دریا پار کر چکی ہوں۔'' اب کے وہ طنزیہ انداز میں ہنسی...... ''جبکہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ آگ کا دریا بے کنار ہے، یہ چہار سو پھیلا ہوا ہے کیونکہ اس کا تو کوئی کنارہ ہی نہیں ہے۔'' اس کی بات غور سے سنتا مہر زاد اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا...... اس نے ایک نظر میرال پر ڈالی اور پھر ایک لمبی سانس لیتے ہوئے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس کا یہ انداز اتنا نامانوس اور اجنبی تھا کہ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔

''اگر میں تمہیں بتا دوں کہ آگ کے دریا میں ہاتھ پاؤں مارنے اور اس کیفیت میں ہونا جس میں تم اِس وقت ہو...... میں کیا فرق ہے تو شاید تم عمر بھر کسی بات کا شکوہ نہ تو اللہ سے، نہ ہی کسی انسان سے کر سکو، تم خود پر نازل ہونے والی blessings (اللہ کی جانب سے عنایات) کو دیکھ لو اور سمجھ پاؤ تو شاید یہ بھی بھول جاؤ کہ تم پر اتنے سال کیا، کیا بیتی!'' مہر زاد خان کا لہجہ سنجیدہ اور سخت تھا۔ ''مجھے تو تم پر کبھی، کبھی رشک آنے لگتا ہے۔'' اس نے میرال کی طرف دیکھا۔ ''اتنی deprived (محروم) اور پھر اتنی blessed، کاش تم جان پاؤ۔''

''میں یہ جان کر بھی کیا کر لوں گی، آپ کی deprivations اور blessings کے

وہ ادب کی کتاب جیسا تھا

بہاروں کی ایک خوشبو بھری صبح میں یہ خوب صورت تقریب...... میڈم فرزانہ امین چوہدری کے لیے سجائی گئی تھی جو تحصیل کوٹ مومن ہائیر سیکنڈری اسکول کی پرنسپل رہ چکی ہیں...... ان کے بیسویں گریڈ کی ترقی پر ان کے اعزاز میں یہ خوب صورت تقریب منعقد کی گئی جس میں اسکول و کالج کے اسٹاف کے علاوہ کوٹ مومن کی دیگر معزز و معتبر شخصیات نے شرکت کی اور میڈم فرزانہ امین چوہدری کی علم کے شعبے میں دیرینہ وابستگی اور محنت و کامیابی پر مبارک باد کے ساتھ خراج عقیدت پیش کیا۔ اسی تقریب میں مس طیبہ کی ریٹائرمنٹ پر انہیں بھی زبردست خراجِ تحسین پیش کیا گیا کہ شعبۂ تدریس میں ان کی بھی نمایاں خدمات رہی ہیں۔ مقررین میں میڈم رابعہ طاہر خان، پھلروان۔ مس نعیمہ، سابق ڈپٹی ڈی سی او، مس روبینہ حسن، پرنسپل معظم آباد۔ مس عنبر، سرگودھا۔ میڈم شمیم، 10 چک شمالی۔ میڈم مسرت اعجاز، مدھرا نجھا۔ میڈم زیتون، 11 چک جنوبی۔ میڈم رشیدہ۔ پھلروان اور دیگر اسٹاف میں سے مس کوثر، مس رافعہ، مس صائمہ ستار، مس معظمہ بتول، مس مطلوب، مس فہمیدہ حسن...... نے فرداً فرداً اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کیا۔ میں نے مس فرزانہ امین چوہدری کی کردار ساز شخصیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انہیں جو خراج عقیدت پیش کیا تھا وہ اگر چہ کچھ بھی نہیں تھا میں ان کے عمل و ہنر کے علاوہ ظاہری و باطنی خوب صورتی کو لفظوں کی پوشاک پہنا ہی نہ سکی تھی مگر پھر بھی میرے الفاظ کو اور میرے جملوں کو شرکائے تقریب نے بہت سراہا اور انہی کے اصرار پر میں وہ الفاظ قارئین پاکیزہ سے شیئر کر رہی ہوں کیونکہ یہ تمام افراد بھی پاکیزہ کے بہت فین ہیں۔ فرزانہ امین چوہدری ایک کم ترقی یافتہ شہر کی ایسی صاحبِ کمال بیٹی ہے جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ جو جرأت، شرافت، غیرت کا پیکر ہے جسے شہرت کی چاہ نہ آرزو اور نہ دولت کی حرص و ہوس وہ فقط علم تقسیم کرنا جانتی ہے یہی اس کی زندگی کا مشن تھا، ہے اور رہے گا معاشرے کی ایسی با کردار اور باشعور بیٹیوں سے ہی معاشرے کا آدھا چہرہ مکمل ہوتا ہے اور ایسی صاحبِ کردار لڑکیاں ہی تو اماوس کی کالی سیاہ راتوں میں چراغ کی طرح ہوتی ہیں، میڈم فرزانہ نے میرے شہر کی لڑکیوں کو نہ صرف درسی کتب کا علم عطا کیا بلکہ ان کی ذہنی نشوونما اور کردار کی تربیت کر کے سنہری اقدار اور مثبت روایات کو پروان چڑھایا۔ میڈم فرزانہ نے اپنی فہم و فراست، علم و دانش اور اخلاق و کردار سے جہاں اپنے فرائضِ منصبی کو بطریقِ احسن نبھایا وہاں لوگوں کے...... خصوصاً اپنی شاگردوں اور ساتھی اساتذہ کے دلوں میں گھر کر لیا...... اسی لیے تو ان کے اس کالج سے چلے جانے کے ذکر سے ہی ہر آنکھ پُر نم تھی، ہر دل اداس تھا۔ ترقی کے اس تیز ترین دور میں جہاں حرص و ہوس، لالچ، طمع اور بدلے کی خواہش نے معاشرے کے دلکش خدوخال کو مسخ کر کے... بدصورت شکل دے دی ہے وہاں میڈم فرزانہ جیسے بااصول، ثابت قدم اور شخصیت ساز لوگ اگر چہ خال، خال ہیں مگر ہیں ضرور...... اور ان کی خدمات اندھیری راتوں میں روشن چراغوں کے مانند نمایاں اور جگمگاتی رہتی ہیں...... جنہوں نے رشوت اور سفارش کی بدنما چھینٹوں سے خود کو عیب دار نہیں ہونے دیا، مساوات کے اصولوں کو اپنا کر طبقوں میں امتیاز نہ آنے دیا...... امیر غریب کے لیے یکساں اصول اپناتے ہوئے میرٹ کو فروغ دیا...... اور تحصیل کوٹ مومن کے اس نوزائدہ ادارے کی بنیادوں کو اپنے اخلاق، محنت اور لگن سے سینچا اور مضبوط کیا۔ یہی لوگ ہوتے ہیں جن کے نقشِ قدم پر چل کے کھوئی منزلوں کے نشان ملتے ہیں۔ یہ نسلوں کے امین ہوتے ہیں اور ذہنوں کو اپنی محنت، قابلیت سے شعور و آگہی اور پاکیزگی عطا کرتے ہیں اور فعال معاشرے کی تشکیل میں اپنا حصہ ڈالتے جاتے ہیں، میرے پیارے پاکستان کو ایسے ہی مخلص اور محنتی لوگوں کی ضرورت ہے اور کبھی، کبھی ایک ننھا سا دیا بھی کافی ہوتا ہے روشنی کے لیے...... بس آپ امید اور روشنی کا دیا کبھی بجھنے نہیں دیں۔

دعاؤں کی طالب

مسز نسیم غلام علی گوندل، کوٹ مومن

standards شاید میں کبھی سمجھ نہ پاؤں۔" میرال، مہرزاد کے بدلے ہوئے انداز اور لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

"جان لوگی...... بہت جلد جان لوگی۔" مہرزاد نے کہا۔

"جان لوں گی؟" اس نے حیرت بھرے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ "گویا ابھی اور بھی کچھ ہونا باقی ہے، کوئی نیا باب کھلنے والا ہے کیا......؟"

"تمہارے لہجے کی بدگمانی، نفرت، شکوک اور اس میں گھومتے بل کھاتے سوال اگر چہ جان لیوا ہیں مگر کیونکہ میں سخت جان ہوں، اس لیے سنبھل جاؤں گا۔" مہرزاد نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "مجھے ابھی واپس جانا ہے، میں آج اِدھر تھوڑا وقت لے کر آیا تھا۔ سوچا تھا کہ تم سے کچھ اپنے دل کی کہوں گا مگر......" وہ کہتے کہتے رکا...... "ایک بدگمان دل سے اپنے دل کی بات کہنے کا کیا فائدہ...... اس لیے دل کی دل ہی میں لیے چلتا ہوں...... کہانیاں سننے اور کہانیاں کہتے، کہتے اصل کہانی ان کہی اور ان سنی رہ بھی جائے تو شاید کوئی فرق نہ پڑے......" وہ اپنی بات کے جواب میں اس کی بات سنے بغیر تیز قدموں سے چلتا باہر نکل گیا۔ میرال کے لیے اس کے آخری الفاظ معنی خیز تھے اور غور طلب بھی......



"آپ کو اندازہ ہے ممی کہ یہ سیاست دان جو ہوتے ہیں ان کے پاس ایک ہی تو ہنر ہوتا ہے کہ لچھے دار الفاظ میں سننے والے کو پھنساتے جائیں اور وہ پھنستا جائے۔" دانیال نے جھنجلاتے ہوئے عافیہ سے کہا۔ مہرزاد خان سے مل کر واپس آنے کے بعد اُن کا رویہ اور گفتگو اس کے لیے حیرت انگیز امر تھا وہ اسے الجھا بھی رہی تھیں۔

"لیکن میرا خیال نہیں تھا کہ آپ جیسی خاتون کو وہ یوں اپنے الفاظ کے جال میں پکڑ سکتا ہوگا۔" پھر اس نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ "آپ کیا نہیں جانتیں...... آپ کو ان شعبدہ بازوں کے بارے میں کیا علم نہیں؟ اس ملک، اس معاشرے کی تاریخ سے آپ کی واقفیت بھی کم نہیں پھر بھی آپ اس کی باتوں میں آگئیں؟" وہ عجیب کیفیت سے دوچار تھا۔

"میں اس کی باتوں میں نہیں آئی دانیال۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا، ان کا لہجہ نرم تھا اور چہرے پر سکون چھایا ہوا تھا۔ "نہ ہی اس نے مجھے اپنی باتوں میں الجھانے کی کوشش کی، جب میں یہاں سے گئی تھی اس وقت اس کے بارے میں میرے خیالات بھی وہی تھے جو تمہارے ہیں لیکن اس کے سامنے جا کر، اس کی گفتگو

سن کر مجھے ایسا لگا کہ جو نظر آتا ہے ہمیشہ وہی حقیقت نہیں ہوتا۔''

''آپ کا مطلب ہے جیسا آج کل وہ ہر جگہ portray ہو رہا ہے وہ ویسا نہیں ہے ؟'' دانیال کے لہجے میں ہلکا سا تمسخر جھلکا۔ ''وہ ویسا ہی ہے ممی بلکہ شاید اس کا کردار اس سے بھی زیادہ گھناؤنا ہوگا۔''

''معاشرے کے ہر فرد نے اپنے، اپنے دائیں ہاتھ میں برش پکڑ رکھا ہے۔'' عافیہ نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اپنے، اپنے برش سے ہم سب جسے چاہیں جب چاہیں اور جیسا چاہیں portray کر لیتے ہیں اور پھر اسی پورٹریٹ کو حقیقت سمجھ لیتے ہیں، اس لیے کہ ہمیں جو نظر آتا ہے ہم اسی پر یقین کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔''

''اوہ ممی!'' دانیال کا دل چاہ رہا تھا اپنا سر پیٹ لے، اس کی ماں اسے میرال کے سلسلے میں کی جانے والی ہر کوشش بند کر دینے کا حکم سنا چکی تھی اور مسلسل مہرزاد خان کی وکالت کیے چلی جا رہی تھی۔ ''آپ نے وہ کالمز نہیں پڑھے جو اس کے بارے میں لکھے جاتے ہیں، انٹرنیٹ پر اس کے بارے میں کیے جانے والے تبصرے نہیں دیکھے ہو وہ، اس کی فیملی، اس کی ہسٹری، میرال کے سلسلے میں اس کا سامنے آنے والا کردار کوئی ایک چیز بھی اس کی وکالت کرتی نظر آتی ہے آپ کو؟'' وہ ان سے سوال کر رہا تھا۔ ''اور آپ ہیں کہ ایک ہی ملاقات میں reverse ہو گئیں۔''

''کبھی، کبھی ایک ہی ملاقات کسی کو جان لینے کے لیے کافی ہوتی ہے دانیال۔'' عافیہ نے اسی نرمی سے کہا جو وہ دانیال کو کوئی بات سمجھانے کے لیے اختیار کیا کرتی تھیں۔ ''اور کالم نگاروں، صحافیوں، بلاگرز کا کیا ہے، ان کے ہاتھوں میں کوئی بھی رقم تھما کر جیسے چاہے پتھر پکڑا دے، انہیں کسی پر کچھ بھی لکھتے ہوئے کیا عار ہو سکتی ہے مگر ہم تم......'' انہوں نے دانیال کی طرف دیکھا۔ ''دانیال میری اور تمہاری حیثیت مختلف ہے، ہم جن تجربوں سے گزر چکے ہیں، ہمیں کسی پر پتھر برسانے سے پہلے کیا سو دفعہ سوچ نہیں لینا چاہیے، خصوصاً جب ہم جان چکے ہوں کہ جس پر پتھر برسانے کے لیے ہم ہجوم میں کھڑے ہیں، اس کا تعلق شیاطین کے اس قبیلے سے نہیں ہے جن پر پتھر برسائے جانے چاہئیں۔'' اب عافیہ جذباتی ہو رہی تھیں۔ دانیال نے ان کی طرف دیکھا ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''ہم کسی غلط سمت چلنے لگیں گے ناں دانیال یا ہم کسی سے زیادتی کر جائیں گے تو ہماری پکڑ دوسروں سے زیادہ ہوگی، ہم سے تو کہا جائے گا کہ ''ارے تمہیں تو ایک موقع اور دیا گیا تھا، تمہیں تو مہلت عطا کی گئی تھی پھر بھی تم نہ دیکھ سکے، نہ سن سکے، نہ حق بات سہہ سکے۔''

دانیال نے ایک مرتبہ پھر ماں کی طرف دیکھا۔ وہ ان کے چہرے کے تاثرات جانچ کر ڈر گیا تھا۔

''اوکے، اوکے!'' اس نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''جیسا آپ کہہ رہی ہیں ممی یقیناً ویسا ہی ہوگا۔''

''میں یہ نہیں کہتی کہ وہ کوئی پرفیکٹ انسان ہوگا۔'' عافیہ نے اپنے جذبات کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔ ''آدم زادوں کے جس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے یقیناً اس پر ان کا اثر ضرور ہوگا مگر میرال کے سلسلے میں اس کا رویہ یقیناً مختلف ہے، ہمیں تحمل اور صبر سے اس کے دعوے اور وعدے کی تکمیل تک انتظار کرنا چاہیے۔ اگر وہ غلط ہوگا تو بھی سامنے آجائے گا، سچا ہوگا تو بھی پتا چل جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اب کے دانیال نے ماں کی گفتگو سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔ ''ہم ایک معجزے کی امید میں دن، مہینے، سال صبر کے ساتھ انتظار کر چکے ہیں تو دوسرے معجزے کی امید میں مزید انتظار کر لینے میں کوئی

حرج نہیں۔''

''مجھے یقین تھا تم میری بات سمجھ جاؤ گے۔'' عافیہ کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ پھیلی۔

''میں سمجھ چکا اور اب حمزہ اور فہد کو بھی سمجھا دوں گا، مجھ سے زیادہ شاید وہ اس سلسلے میں جذباتی ہیں۔'' دانیال نے کہا۔

''میں میرال کے سلسلے میں مکمل طور پر پُرامید ہوں، جب مہرزاد خان اُسے ہمارے پاس بھیجے گا...... میری خواہش ہے کہ میں تمہارے ڈیڈی، دانیال تم اور تمہاری فیملی اس گھر میں اس کا یونہی استقبال کریں جیسے کوئی خاندان اپنی مدتوں بعد گھر واپس آنے والی بیٹی کا کرتا ہے۔'' اس شام عافیہ نے اپنی بہو سے اسکائپ پر بات کرتے ہوئے کہا تھا۔

☆☆☆

اشعر نے سیڑھیوں کے ساتھ اوپر جاتی منقش ریلنگ پر ہاتھ پھیرا، اس آبنوسی ریلنگ کے نچلے سرے پر شیر کا منہ بنا تھا، ایک ایسا شیر جس کا منہ کھلا تھا اور آنکھیں پوری کھلی تھیں، ریلنگ کے اوپری اور نچلی سطح کے درمیان بنی جالی کسی ماہر کاریگر کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ اشعر کو وہ گھر اس وقت بھی بہت مانوس سا لگا تھا جب وہ نگین سے شادی ہو جانے کے بعد پہلی بار اپنی سسرال سیالکوٹ آیا تھا۔ شہر کے ایک پرانے محلے میں نگین کے والدین کے قدرے جدید طرزِ تعمیر پر بنے گھر کے ساتھ جُڑا یہ قدیم طرزِ تعمیر کا حامل گھر اسے بہت پسند آیا تھا۔ اس گھر میں نگین کی دادی اپنے نواسے حمزہ کے ساتھ رہتی تھیں۔ اسے یہاں آکر محسوس ہوا تھا کہ اس کی نئی نویلی دلہن نگین کو بھی اس گھر سے خاصا اُنس تھا۔ اپنے والدین کے گھر کے بجائے وہ ان چند دنوں میں جب وہ سیالکوٹ میں مقیم رہے تھے زیادہ وقت اپنی دادی کے گھر میں گزارتی تھی۔

''یہ سیڑھیاں دیکھ رہے ہیں آپ؟'' وہ نچلی منزل کی چھت سے اوپر ایک اور چھت کی طرف جاتی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتاتی۔ ''اپنے بچپن کی گرمیوں کی اکثر چھٹیاں ہم نے انہی سیڑھیوں میں بیٹھے چھٹیوں کا کام کرتے، کھاتے پیتے، کھیلتے گزاری ہیں، انہی سیڑھیوں کے ذریعے ہم بالائی چھت پر جایا کرتے تھے اور نیچے محلے کی گلیوں میں جھانکتے ہوئے آتے جاتے لوگوں پر نظر رکھتے، ان پر کمنٹس پاس کیا کرتے تھے۔''

''لکڑی سے بنے اس کمرے میں ہم سردیوں کی شاموں میں بی اماں کے بستر میں گھس کر ان سے کہانیاں سنا کرتے تھے۔'' وہ اسے اس گھر کا ایک، ایک کمرا دکھاتے ہوئے اس سے جُڑی اپنی یادوں کا ذکر کرتی۔

''اس بڑے کمرے میں جہاں یہ بڑا سا ریڈیو رکھا ہے ناں، یہیں بیٹھ کر ابا میاں اور چھوٹے چچا رات آٹھ بجے کی خبریں سنتے تھے، انہیں ٹی وی پر ہونے والی خبروں سے ریڈیو کی خبریں زیادہ اچھی لگتی تھیں۔ ہم بھی ان کے پاس بیٹھ کر خبریں سنتے تھے، اسی لیے تو ہماری اردو اتنی اچھی ہے۔'' وہ کہتی۔

''تمہاری اردو اتنی اچھی ہے، جب ہی اس گھر سے جُڑی یادوں کا ذکر کرتے ہوئے تم خود کو میں کے بجائے ہم کہنے لگتی ہو مغلیہ شہزادی۔'' اشعر مسکرا کر کہتا۔

''ارے ہم سے مراد میں اکیلی تھوڑی ہوتی ہوں۔'' اس کی اس بات کا جواب نگین نے کھلکھلا کر ہنستے

ہوئے دیا تھا۔

''پھر؟'' اشعر اس جواب پر حیران ہوتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

''ہم سے مراد میں اور حمزہ ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بتایا تھا۔ ''میں اور حمزہ بچپن سے اکٹھے پڑھتے، اکٹھے کھیلتے آرہے ہیں، دو سال ہی تو چھوٹا ہے مجھ سے حمزہ۔'' نگین کے اس جواب نے ہی اشعر کی توجہ حمزہ کی طرف مبذول کرائی تھی۔ نگین کے اپنے بہن، بھائیوں اور اس کے دیگر کزنز سے کہیں مختلف وہ خاموش طبع اور سنجیدہ لڑکا اسے اس وقت بھی چونکا گیا تھا۔

''یہ لڑکا تو بہت مختلف ہے بھئی، لیے دیے رہنے والا، خاموش سا۔'' اس نے حمزہ سے پہلی ملاقات کے بعد نگین سے کہا تھا۔ اس کی اس بات کے جواب میں نگین نے اسے حمزہ کی داستان سنائی تھی...... اور اس داستان کو سننے کے بعد اگلی ملاقات ہی میں اشعر کی حمزہ سے اسی طرح دوستی ہوگئی تھی جیسے نگین کی حمزہ سے تھی۔

اس نے یاد کرتے ہوئے سر جھٹکا اور مسکراتے ہوئے سامنے دیکھا۔ حمزہ اس نیم تاریک ڈیوڑھی سے نکل کر اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا تھا، جس میں بقول نگین کے گرمیوں کی دوپہروں میں وہ اور حمزہ بیٹھ کر تختیاں دھوتے، سکھاتے اور لکھنے میں مصروف رہتے تھے۔

''تم نے اس ڈیوڑھی کو بھی رینوویٹ کیا ہے کیا؟'' اشعر نے حمزہ سے پوچھا۔

''ہاں کچھ کچھ، آئیں آپ کو دکھاؤں۔'' وہ اسے لیے ڈیوڑھی کی طرف آگیا، اس نیچی چھت والی نیم تاریک ڈیوڑھی کے سر پر اب نیچی چھت کے بجائے پر بلڈ فائبر گلاس سایہ فگن تھا جس سے آسمان پر سجے سورج کی روشنی چھن کر نیچے تک آرہی تھی۔ فائبر گلاس کی چھت کی وجہ سے اب یہ ڈیوڑھی ایک روشن اور کشادہ انٹرنس میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس کی مشرقی دیوار کے ساتھ دو سواتی کرسیاں اور ایک چنیوٹی میز رکھی تھی اور فرش ہینڈ میڈ ٹائلز سے آراستہ تھا۔

''میں تمہارے اعلیٰ ذوق کا قائل ہوگیا حمزہ، تم نے جس خوب صورتی سے اس گھر کو قدیم اور جدید انداز میں رینوویٹ کیا ہے اسے دیکھ کر لگتا ہے کہ تم کوئی ماہر تعمیرات ہو۔'' اس نے تحسین آمیز نظروں سے حمزہ کو دیکھا۔

''پتا نہیں یہ اچھا ہے کہ نہیں۔'' حمزہ نے کمرے میں چاروں طرف نظر گھماتے ہوئے جواب دیا۔ ''میری تو بس ایک کوشش ہی ہے۔''

''یہ صرف اچھا نہیں بلکہ بہت ہی اچھا ہے۔'' اشعر نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ ''ویسے ان پر پیسہ بھی تو بہت خرچ ہوا ہوگا، جس طرح تم نے عمارت کی اصل شکل کو برقرار رکھتے ہوئے اسے جدید انداز میں ازسرِنو سجایا ہے، ایسے کام کے لیے تو بہت زیادہ پیسہ چاہیے ہوتا ہے۔''

''ہاں، شاید اپنی استطاعت سے بڑھ کر خرچ کر چکا ہوں۔'' حمزہ نے سر ہلایا۔

''اس کا اب کرو گے کیا؟'' اشعر کا ذہن کب کا اس ایک سوال میں اٹکا ہوا تھا۔

''تم خود تو یہاں رہ نہیں سکتے، تمہاری جاب لاہور میں ہے، اس گھر کو رینٹ پر دو گے کیا؟''

''ارے نہیں اشعر بھائی۔'' وہ تیزی سے بولا تھا۔ ''اپنے شوق، اپنی محبت، اپنے جذبات اور اپنے اُنس کو کون رینٹ پر دیتا ہے؟''

''پھر؟'' اشعر نے ابرو چڑھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''پھر......'' حمزہ نے اشعر کی طرف سے دھیان ہٹا کر دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھیں اس کا کیا مستقبل ہوتا ہے۔ ابھی تو اس کے بہت سے چھوٹے موٹے کام باقی ہیں۔''

''چلو تم نے جو بھی اس کے بارے میں سوچا ہے وہ اپنی جگہ، بہرحال یہ گھر اب پہلے سے بھی زیادہ آئیڈیل گھر بن چکا ہے۔'' اشعر نے کہا۔

''میں اسی لیے آج آپ کو ساتھ لایا تھا۔ مجھے یقین تھا آپ کو یہ پسند آئے گا، میں نے تو سوچا تھا نگین بھی ساتھ آئے گی مگر معذرت کے ساتھ اشعر بھائی، نگین کو آپ کے گھر نے اپنے کاموں میں کچھ زیادہ ہی جکڑ رکھا ہے۔'' حمزہ نے پہلی بار اشعر سے گلہ کیا۔

''شکایت کر رہے ہو، شکوہ، گلہ ٹائپ...... ہے ناں؟'' اشعر مسکرایا۔

''جی بالکل۔'' حمزہ نے سر ہلایا۔

''اب چھوٹے کی شادی ہو جائے گی تو اس کی بیوی آنے کے بعد نگین پر سے ذمے داریوں کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔'' اشعر نے اس کی بات کا مختصر سا جواب دیا۔

''پتا نہیں کیوں، مجھے لگتا ہے کہ نگین اس طرح گھریلو ذمے داریوں میں جکڑے جانے کے لیے نہیں بنی تھی۔ اس کا سارا علم، ذہانت، تعقل، کچن کے مسالوں اور ڈیٹرجنٹ پاؤڈر کے دانوں میں گم ہو رہا ہے۔ یہ اس کے ساتھ زیادتی ہے۔''

''میں جانتا ہوں یار۔'' اشعر نے تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ ''مگر ہم لوگ جیسے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں

وہاں لڑکی کی زندگی رفتہ، رفتہ ایسی ہی ہوتی چلی جاتی ہے۔"

"ہوتی ہوگی۔" حمزہ نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ "مگر آپ جیسے شخص سے مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ نگین کو یوں گم ہوجانے دیں گے۔ اس کے کمپرومائزز کو آپ کے سہارے اور کنسرن کا شانہ درکار تھا، آپ بدقسمتی سے اسے وہ دے نہیں پائے۔"

اشعر نے حمزہ کی طرف دیکھا جو کچھ وہ خود نگین کے بارے میں محسوس کرتا چلا آرہا تھا، حمزہ نے اسے الفاظ کا پہناوا دیا تھا۔ اس وقت وہ دونوں اس قدیم گھر کے صحن میں کھڑے تھے جس کی مغربی جھری دار دیوار کی جھریوں سے تازہ ہوا گزر کر ان تک پہنچ رہی تھی۔ وہیں کھڑے، کھڑے اشعر نے اپنے دل میں خود سے نگین کے بارے میں ایک عہد کیا تھا اور یہ خاموش عہد کرنے کے بعد اس نے حمزہ کی طرف مسکرا کر دیکھا تھا۔ حمزہ کو لمحے بھر کے لیے وہم ہوا تھا کہ شاید اشعر اس کی باتوں سے ناراض ہوگیا تھا مگر اس کی مسکراہٹ اسے نگین کے لیے پُرامید کرگئی تھی۔

☆☆☆

"یقین کیجیے ڈیڈ اگر اس طرح کے کارنامے ریکارڈ کرنے والا کوئی ادارہ ہوتو دنیا کے بہترین ریکارڈ فائنڈرز کی فہرست میں میرا نام ٹاپ آف دی لسٹ پر ہوگا۔"

"پہلی بار مجھے بھی ایسا لگ رہا ہے کہ تم نے کوئی ڈھنگ کا کام کیا ہے۔"

"انتقام ڈیڈ...... انتقام ایک ایسی آگ ہے جو انسان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو تپا کر کندن بنا دیتی ہے۔"

"واہ رہے میرے بانکے تیری اردو دانی کے صدقے، لگتا ہے آج کل اپنے نامور دانشور وصوفی کزن کے ساتھ خاصا وقت گزار رہے ہو۔"

"ارے کس کا نام لے دیا ڈیڈ! اس بے چارے کا تو اپنا سارا وقت چہرے پر مسکینی سجا کر، آنکھوں میں ذہانت کے سرمے لگا کر، لہجے میں دانشوروں سے تاثر ٹپکا کر، لیکچر دینے کی تیاریوں میں گزر جاتا ہے، اس کے ساتھ کوئی دوسرا کیا وقت گزارے گا۔"

"جو بھی ہے ویسے بندہ ہے اوّل درجے کا فنکار، ایک دم اے کیٹیگری!"

"جی بالکل! بڑی محنت کے بعد وہ نمونہ تیار ہوتا ہے جسے لوگ آدھی رات کو ٹی وی اسکرین پر جلوہ گر دیکھتے ہیں۔"

"ارے ہمارے خاندان کی فنکاریوں کا تو ایک زمانہ گواہ ہے۔"

"بس پھر یاد رکھیے اس خاندان کے فنکاروں میں ایک اور فنکار کا گراں قدر اضافہ ہونے جارہا ہے، ایسا بس بھر دیا ہے اپنی فنکاری میں کہ اس کا ڈساوہ سردارزادہ پانی بھی نہ مانگ سکے گا۔"

"ارے پانی کی بوتل ساتھ رکھ دینا اپنے ڈنک کے، اس بے چارے نے اتنے جتن سے جو گریس کی دختر کے عرق سے جان چھڑا کر خود کو پانی پر لگایا ہے تو تڑپ، تڑپ کر جان دیتے ہوئے اسے ایک عدد امپورٹڈ پانی کی بوتل تو نصیب ہونی ہی چاہیے۔"

"ہاہا پانی کی طلب میں اس کی نظریں اویس خان کے گھر کی طرف دیکھیں گی وہ کبھی بھول کر بھی نہیں بوجھ پائے گا کہ زہر اس کے پیالے میں دراصل گھولا کس نے تھا۔"

"ایک ہی وقت میں ہر سرحد پر جنگ چھیڑ لینے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے، بچہ ابھی کچا ہے، ورنہ جو چالیس سالوں

میں چلنی چاہیے تھیں ایک ہی سال کے اندر، اندر چلنے کی کبھی نہ سوچتا۔"

"بس پھر اب اس کچے بچے کو دیکھیے اور میرا تماشا دیکھیے ہوتا کیا ہے۔"

"مجھے اپنی پشت پر ایک تھپکی دے لینے دو، تم جو کارنامہ انجام دینے جارہے ہو اس کے سرانجام ہوجانے کے بعد میدان ہمارے لیے اتنا وسیع ہوجائے گا کہ اس میں کھل کھیلتے ہوئے شاید تمہاری پشت پر تھپکی دینے کا وقت نہ ملے۔"

"لیں مائی ڈیئر ڈیڈ میرا شانہ بھی حاضر ہے اور پُشت بھی، ایک کے بجائے زیادہ تھپکیاں دے لیں ایک ہی بار میں...... کیونکہ اس کارنامے کو انجام دے لینے کے بعد ایک کتنے ہی کارناموں کا راستہ کھلنے والا ہے اور پھر وقت کا کیا پتا آپ کو ملے نہ ملے۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے، ان سردارزادوں کے گھر کی لڑائی ان کے گھر میں ہی مچا دینے جیسی عقل مندی سے بڑا کارنامہ کوئی ہو ہی نہیں سکتا جی بھر کر تھپکیاں لو۔"

"میں تو اس پاتال سے 'امراؤ بیگم' کا ہیرا نکال لانے کا تہیہ کیے بیٹھا تھا ڈیڈ مگر قسمت دیکھیں ایک رکھیل کے بجائے درمیان ہی میں میرے ہاتھ سردارزادے کی نہ ہونے والی منگیتر لگ گئی، اب صبح ہو یا شام، رات ہو یا دن، وقت اس کی مہربان زلفوں کی چھاؤں ہی میں گزرتا ہے۔"

"بڑے لکی ہو بھئی! ورنہ اس خاندان کی مہ جبینوں سے ہمارا واسطہ کم ہی پڑا ہوگا کبھی، وہ حسینائیں انتخاب کرتے ہوئے اپنے خاندان اور قبیلے کی دشمنیوں، دوستیوں کا بڑا الحاظ کرتی ہیں۔"

"اس بار خاندان کی نہیں ذاتی دشمنی نے اس کی اور ہماری پرانی دشمنی کو دوستی میں بدل دیا ہے۔ ہمارا aim ایک ہے اور game بھی ایک سا ہی ہونے والا ہے۔"

"چلو بھئی بیسٹ آف لک، میں وہیں انتظار کروں گا تمہارا فیڈرل کیپٹل میں۔"

"آپ جارہے ہیں کیا؟"

"ہاں آج ہی، بڑے صاحب کی عزیزہ نے طلب کیا ہے، کچھ ذاتی مصروفیات ہیں ان کے ساتھ۔"

"گویا یہ سرکاری وزٹ نہیں ہوگا؟"

"نہیں خالصتاً ذاتی۔"

"چلیں پھر وہیں بیٹھ کر اس بریکنگ نیوز کا انتظار کیجیے گا کہ کب آتی ہے۔"

"شیور، شیور۔"

☆☆☆

"میں نے مہرزاد خاناں ایک ہی فرمائش رکھی تھی تمہارے سامنے...... اور برادری کو تمہارے پیچھے کھڑا کر دیا تھا۔" بلغمی آواز میں بولنے والے نانا جان نے اپنے قریب رکھے پیچوان کا کش لگاتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

"میں برادری کا مشکور ہوں نانا جان" وہ احترام سے بولا تھا۔

"مگر وہ جو برادری تم سے ناراض ہے، اس کا کیا کریں؟"

"انہیں ناراض نہیں ہونا چاہیے نانا جان...... کسی سے کوئی کام زبردستی نہیں کرایا جا سکتا، میرے پیچھے کھڑے ہونے میں برادری کا اپنا مفاد تھا، ایک ایسی وزارت جاتی رہتی جو برسا برس تک حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی رہی، سو اور وزارتیں تو ہاتھ آئیں مگر یہ نہیں آئی، ایسے میں اسے بچانے کے لیے میرے پیچھے

کھڑے ہونے کا سودا برا نہیں تھا۔'' اس کے لہجے میں خاصا اطمینان تھا۔

''تم چیزوں کو فار گرانٹڈ لے رہے ہو مہرزاد خان۔'' بلغمی آواز کی دھاڑ بھی خاصی زبردست تھی۔

''وہ ایک unconditional سپورٹ تھی نانا جان۔''

''نہیں تھی unconditional، اویس خان کی بہن اور عبدالکریم خان کی پوتی کو تمہارے گھر آنا ہے بدلے میں بیاہ کر، تمہاری ماں نے خود ان کے گھر جا کر نشانی میں بیس تولے سونا ڈالا تھا بچی کو۔''

''یہ سب کام بالا ہی بالا سوچے اور کیے گئے ہوں گے نانا جان! میرا ان سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں، میں نے صاف الفاظ میں کہا تھا کہ برادری میرا ساتھ دیتی ہے تو ٹھیک ہے، دوسری صورت میں مجھے بھی اپنا راستہ معلوم ہے۔''

''بلاؤ اپنی ماں کو، وہ بھی تو یہیں ہے، پوچھو اس سے کیا نشانی کے ساتھ اس نے قبیلے سے تمہاری غیر مشروط حمایت طلب نہیں کی تھی؟''

''وہ ماں ہیں اور ان کی ممتا ان سے کچھ بھی کرا سکتی ہے لیکن میں نے ان سے بھی اس سلسلے میں اتفاق نہیں کیا تھا۔''

''بہت برا ہو جائے گا مہرزاد خان، بہت برا کرو گے تم اگر اس بات سے ہٹ گئے، صدیوں سے پختہ چلی آ رہی دیواروں میں دراڑیں پڑنے لگیں گی۔''

''دراڑوں کے ساتھ بھی بہت عرصہ چل جائیں گی یہ دیواریں نانا جان، یہ عمارت اتنی جلد ڈھے جانے والی نہیں ہے۔ اس کی بنیادوں میں کتنوں ہی کا خون دفن ہے، بے شمار آہیں اور سسکیاں دبی ہوئی ہیں ان کے نیچے، ان دیواروں کو اپنا بھرم تو بہر حال رکھنا ہی ہے۔ جتنی جلد زمیں بوس ہوں گی اتنی ہی جلد ان کے نیچے دبی آہیں اور سسکیاں نکل کر باہر آ جائیں گی، سو دیواروں کی دراڑوں سے مت ڈریں۔''

''تم نہیں جانتے مہرزاد خان! تم کیوں نہیں سمجھتے...... بہت برا ہو گا اگر تم اس کمٹ منٹ سے ہٹ جاؤ گے، کیا فرق پڑے گا تمہیں جو ایک بار باجے ان کی مرضی سے بجوا لو گے، اس کے بعد جتنی بار مرضی ہے سہرے باندھنا، حرم پال لینا، تمہیں کسی نے منع کرنا ہے کیا؟''

''صرف ایک بار ہی کی تو بات ہے نانا جان، ایک بار ہو گیا تو باقی کیا رہ جائے گا؟'' مہرزاد خان نے کہا اور ان کی طرف دیکھا جو اپنے فون پر کسی کا نمبر ملا رہے تھے۔

''ہاں، میں بول رہا ہوں مہرزاد کی ماں......'' وہ کہہ رہے تھے۔

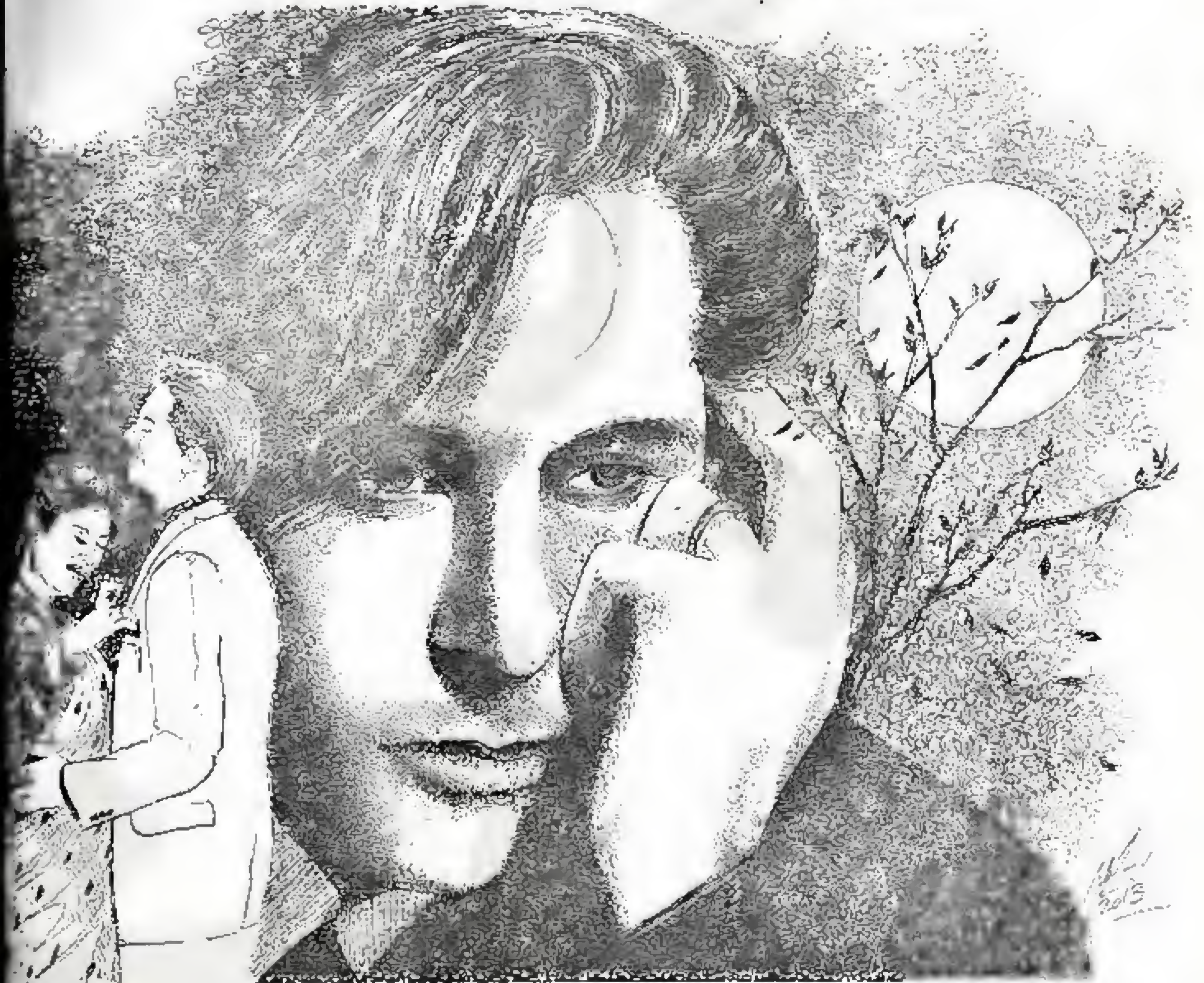
''مجھے تمہارے بیٹے کی جوانی کا خیال آتا ہے اسی لیے بار، بار بیچ میں پڑ جاتا ہوں، اس کے باپ نے تو کھا ہنڈا کے گولی کھائی تھی، یہ جوانی میں ہی سینہ تان کر کھڑا ہو گیا ہے، اسے سمجھا میری بچی، مجھ سے یہ صدمہ برداشت نہیں ہو گا اس عمر میں۔'' وہ کہہ رہے تھے اور مہرزاد خان خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ ان کے کان سے لگے فون میں ابھرتی آواز دوسری طرف جس کان تک پہنچ رہی تھی اس کی سماعت پر کیسے دھماکے ہو رہے ہوں گے اور اس دل پر کیا گزر رہی ہو گی۔

جاری ہے

شامِ شہرِ یاراں

عنیزہ سیّد

قسط 15



زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے . . . خیر و شر، نیکی اور بدی . . . زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت . . . ہر برائی پر حاوی ہوجاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سیّد نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

محمود دُرانی اور مہرین کی تیسری اولاد حمزہ، مہرین کی زچگی میں پیچیدگی کے باعث نانی کے پاس ان کے آبائی گھر سیالکوٹ میں پروان چڑھتا ہے۔ جہاں نگین اس کے ماموں کی بیٹی سے اس کی خوب گاڑھی چھنتی ہے۔ علینہ کے والدین، نادیہ اور سعید کیانی نے کورٹ میرج کی تھی مگر شادی کے تین سال بعد سعید کیانی بیوی کو داغِ مفارقت دے گئے۔ آکسفورڈ کا پروردہ سردار مہرزاد خان اپنے باپ کے سیاسی قتل کے بعد حادثاتی طور پر سیاست میں شامل ہوا تھا اور زرنگار کے حسن و ذہانت کا شکار ہو چلا تھا...... بینش دو بھائیوں کی اکلوتی بہن، اپنی ضد اور صرف بھائیوں کے تعاون سے نیشنل کالج آف آرٹس میں تعلیم حاصل کر رہی ہے جہاں اس کا سینئر ساتھی دانیال اس سے ہر ممکن تعاون کرتا ہے۔ ایک پاکستانی مسلمان مرد اور بدھ مذہب کی پیروکار چینی عورت کی بیٹی زوئی حسین چین سے آکر پاکستان میں فارمیسی کی تعلیم حاصل کرتی ہے۔ دانیال آرٹ کا عشق رکھنے کے ساتھ فلائنگ میں بھی مہارت حاصل کرنا چاہتا تھا اور ایک دن طیارے کے دعوے سے نقش و نگار بنانے کی کوشش میں حادثے کا شکار ہو جاتا ہے۔ علینہ اچانک فہد کی آمد سے بہت خوش ہوتی ہے لیکن جب وہ یہ سنتی ہے کہ وہ میرال کی تلاش میں آیا ہے تو یہ اسے اچھا نہیں لگتا۔ نادر اپنے گھر میں زوئی کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ بتول، مہرزاد کو سنبھل کر چلنے کا مشورہ دیتی ہے۔ مہرین، حمزہ پر شادی کے لیے زور ڈالتی ہے لیکن وہ پس و پیش سے کام لیتا ہے تو محمود درانی کہتے ہیں کہ وہ کوشش کریں گے کہ وہ اس کی چوائس کو اپرو دل دلا دیں۔ زرنگار کو اس خصوصی نمبر سے دبئی روانگی کا پیغام ملتا ہے اور پھر امراؤ بیگم کہتی ہے کہ سردار صاحب نے ٹکٹ بھیجا ہے۔ علینہ، فہد کو بتاتی ہے کہ ایک سوشل ویب سائٹ پر میرال صلاح الدین کے نام کا صفحہ موجود ہے۔ میرال کو بتایا جاتا ہے کہ اس کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل ہے اس لیے وہ دبئی نہیں جا سکتی۔ میرال حیران ہوتی ہے کہ وہ لوگ اسے کہاں لے کر جا رہے ہیں۔ زوئی ٹیکسی کر کے میرال کی گاڑی کا پیچھا کرتی ہے۔ نادر، حمزہ محمود کو میرال کے بارے میں بتاتا ہے...... عافیہ ویب سائٹ پر فہد کا میسج پڑھ کر اس سے رابطہ کرنے کا سوچتی ہیں۔ بتول، مہرزاد خان کی نیوز اینکر کے ساتھ منعقد کی گئی میٹنگ دیکھتی ہے تو اسے کچھ غیر معمولی محسوس ہوتا ہے۔ فہد اور حمزہ، دانیال اور عافیہ سے ملنے آتے ہیں۔ علینہ، فہد کے جانے کے بعد سوچتی ہے کہ اس کے ہونے سے کتنی رونق ہو گئی تھی۔ فہد، دانیال، عافیہ اور حمزہ سے کہتا ہے کہ اسے اپنے کچھ کانٹیکٹس آزما لینے دیں۔ مہرزاد کے انداز میں غیر معمولی تبدیلی پر بتول حیران ہوتی ہے۔ نادر کی ماں اسے کہتی ہے کہ اس کی بہنیں آرہی ہیں، وہ دونوں اپنا اپنا گروپ بنا لیتے ہیں۔ دانیال، بینش سے کہتا ہے کہ وہ اسے پرپوز کرنا چاہتا ہے۔ زرنگار کو ایک شخص لینے آتا ہے تو وہ اسے کہتی ہے کہ وہ اس پر یہ احسان کرے کہ اس کی زندگی ختم کر دے لیکن وہ ایسا کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ مہرزاد کے پاس اس کے نانا کا فون آتا ہے کہ زرنگار جلد ہی اس تک پہنچنے والی ہے اور اب اسے اپنی ماں کی خواہش کا احترام کرنا ہوگا۔ وہ مہرزاد خان سے کہتے ہیں کہ وہ اپنی ٹون بدلے...... فہد، عافیہ اور حمزہ کو بتاتا ہے کہ میرال کو اس رات جس عمارت میں لے جایا گا اس کا محرک مہرزاد نہیں ہے۔ دانیال کہتا ہے کہ لڑکی کو اگر وہاں سے نکالنا ہے تو پرائیوی کو چھوڑنا ہوگا جس پر حمزہ، فہد اور عافیہ سب ہی خاموش رہتے ہیں۔ بینش کی ماں اس سے کہتی ہے کہ اب پڑھائی چھوڑ کر شادی کی فکر کرے۔ بینش ماں سے کہتی ہے کہ وہ تھوڑا انتظار کرے۔ زرنگار، مہرزاد سے کہتی ہے کہ اگر اسے پتا ہوتا کہ اسے مہرزاد کے سامنے لایا جا رہا ہے تو وہ یہاں نہ آتی اپنی زندگی ختم کر لیتی۔ مہرزاد، زرنگار کو یقین دلاتا ہے کہ اسے اب یہاں کوئی خطرہ نہیں...... وہ یہاں محفوظ ہے لیکن زرنگار کو اس کی کسی بات پر یقین نہیں آتا...... امراؤ بیگم کو پولیس پکڑ لیتی ہے، فہد، چیف منسٹر سے ملتا ہے لیکن اسے چیف منسٹر سے مل کر بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ حمزہ، نگین کو بتاتا ہے کہ اس نے سیالکوٹ والا گھر ماموؤں سے خرید لیا ہے۔ بینش کی ماں اسے بتاتی ہے کہ وہ اپنے بھائی کے بیٹے سے اس کا رشتہ کر رہی ہے۔ نادر، زوئی سے کہتا ہے کہ اس کے پاس ایجنسی والوں کا فون آیا تھا۔ مہرزاد، عافیہ کو ملنے کے لیے بلاتا ہے۔ مہرزاد نے عافیہ سے مل کر ان کی بدگمانی، شکوک کو ختم کر دیا تھا۔ سلیم اپنی ماں کو منع کرتا ہے کہ وہ اپنے ماموں کے گھر بینش کا رشتہ کرنے کا سوچے بھی نہ...... میرال اب وہاں رہتے ہوئے اکتانے لگی تھی۔ عافیہ، دانیال کو سمجھاتی ہیں کہ مہرزاد سے مل کر انہیں اندازہ ہوا کہ مہرزاد دنیا انسان نہیں ہے جیسی باتیں اس کے لیے مشہور کی جا رہی ہیں۔ حمزہ، اشعر سے کہتا ہے کہ اسے لگتا ہے کہ نگین گھریلو ذمے داریوں میں جکڑے جانے کے لیے نہیں بنی یہ اس کے ساتھ زیادتی ہے۔ نانا جان، مہرزاد خان سے کہتے ہیں کہ ان کی صرف ایک فرمائش تھی اور اگر وہ اس کمٹمنٹ سے ہٹ گیا تو بہت برا ہوگا۔

اب آگے پڑھیے

بینش کے بھائی کلیم نے حیرت سے اپنے سامنے بیٹھے لڑکے کو دیکھا جو کچھ دیر پہلے اس کی دکان پر آیا تھا اور کپڑا دیکھنے یا خریدنے کے بجائے سیدھا کیش کاؤنٹر پر بیٹھے کلیم کی طرف آگیا تھا۔

''جی بھائی فرمائیں۔'' کلیم نے پہلے اسے ایک ایسا گاہک جان کر مؤدبانہ انداز میں سوال کیا جس کو دکان کے سیلزمینوں کے بجائے براہِ راست دکان کے مالک سے بات کرنے کا شوق ہوتا ہے۔

''مجھے آپ سے ملاقات کرنی ہے، آپ کلیم صاحب ہی ہیں ناں؟'' لڑکے نے جواباً کہا۔

''جی، جی...... بیٹھیں، بیٹھیں...... اوئے تاج جا بھاگ کر جا دو ٹھنڈے پکڑ لا، آپ کیا لو گے جی سیون اپ یا کوکا کولا!'' کلیم نے اس لڑکے سے جان پہچان نہ ہونے کے باوجود دکان داری کے سنہری اصولوں میں سے ایک پر عمل کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں پلیز، میں فزی ڈرنکس نہیں پیتا، آپ زحمت نہ کریں پلیز۔'' لڑکے نے ہاتھ اٹھا کر منع کرتے ہوئے کہا۔

''فزی، فوزی نہیں جی کولڈ ڈرنک منگواتا ہوں آپ کے لیے، چلو مرنڈا یا فانٹا منگوالوں پھر؟'' کلیم نے اس کی بات قطعاً نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''نہیں، نہیں کلیم بھائی پلیز میں یہاں کچھ کھانے پینے نہیں، آپ سے چند ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔'' لڑکے نے کہا۔

''ہیں باتیں کرنے آیا ہے؟'' کلیم دل ہی دل میں مایوس ہوا۔ ''میں تو اسے کسٹمر سمجھ کر ڈیل کر رہا تھا، پر یہ تو لگتا ہے کسی بیمے کمپنی کا ایجنٹ، باتیں کرنے آیا ہے۔'' کلیم نے اس کی طرف چونک کر دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔

''اوئے تاج، رہنے دے یار بھائی صاحب کو نہیں پسند یہ سب سفید اور کالی بوتلیں۔'' اس نے سیلز مین کو کچھ بھی لانے سے منع کر دیا۔ اسی دم اس کے پاس ایک گاہک پے منٹ کے لیے آگیا۔

''جی باؤ جی فرماؤ، کیا بات کرنی ہے۔'' کھٹا کھٹ پے منٹ لے کر پیسے اپنے سامنے رکھے کیش کی دراز کے مختلف خانوں میں پھینکنے کے بعد اسے بند کر کے لاک لگاتے ہوئے اس نے آنے والے کی طرف دیکھا۔ ایک اور انشورنس ایجنٹ کے تصور ہی سے اس کا دل بیزار ہونے لگا تھا۔

''میرا نام دانیال جہانگیر ہے بھائی کلیم......'' لڑکے نے کہنا شروع کیا اور اپنی آمد کا مقصد بتانے لگا۔ جتنی دیر وہ بولتا رہا کلیم کا منہ کھلا رہا اگرچہ اس کے زاویے بدلتے گئے۔

''اب سمجھ آیا اس دن اماں مامے ممتاز کے لڑکے کے رشتے کی بات کیوں کر رہی تھی۔'' اس لڑکے کی بات سنتے ہوئے خیال آیا تھا۔ ''لگتا ہے اماں کو بھی اس کی باتوں کی سو (خبر) لگ گئی کدھر سے۔'' اس نے لڑکے کی کسی بھی بات کا جواب دینے سے پہلے سوچا تھا۔

☆☆☆

''تم نے ہم سے اس بات کا ذکر بھی نہیں کیا اور خود ہی اس کے بھائی سے بھی جا کر مل آئے۔'' اس رات کھانے کی ٹیبل پر بیٹھے دانیال کی بات سن کر عافیہ کے ہاتھ میں پکڑا ڈونگا ہاتھ ہی میں رہ گیا۔

''جی ہاں!'' اس نے بے نیازی سے کھانا کھاتے ہوئے جواب دیا اور پھر عافیہ کے ہاتھ پر نظر پڑنے پر ڈونگا ان کے ہاتھ سے لے لیا۔

''میں امید کرتا ہوں کہ تم کسی کے ساتھ مذاق نہیں کر رہے ہو، نہ ان لوگوں سے نہ ہی ہم سے۔'' جہانگیر

نے اس کی بات کے جواب میں اپنا ردِ عمل ظاہر کیا۔

''یقیناً نہیں۔'' اس نے کن انکھیوں سے اُن کی طرف دیکھا۔ ''آپ جانتے ہیں کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔''

عافیہ اب بھی بے یقینی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ دانیال نے ان کے ہاتھ سے ڈونگا لے لیا تھا لیکن بے دھیانی میں ان کا ہاتھ یونہی ہوا میں کھڑا تھا جیسے ڈونگا اب بھی ان کے ہاتھ میں ہو۔

''ریلیکس ممی، آپ کیوں اتنی tensed ہو گئیں۔'' اس نے ماں کو یوں حیرانی کے عالم میں بیٹھے دیکھ کر کہا۔

''دانیال میرا خیال ہے کہ تم دوبارہ سے ایڈونچرس ہو رہے ہو..... حالانکہ تم ایڈونچرس ہونے کا انجام جانتے ہو۔'' عافیہ نے چونک کر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ممی آپ کچھ زیادہ ہی ٹینسڈ ہو گئیں۔'' دانیال نے کہا۔ ''میرے دل میں ایک خیال خواہش کی طرح ابھرا ہے، میں نے آپ کو بتانے سے پہلے ان لوگوں سے اس لیے بات کی کہ مجھے اندازہ ہو سکے اس بات کو کرنے کا کوئی فائدہ بھی ہے یا نہیں۔''

''پھر؟'' جہانگیر نے نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں ان سے بات کر کے لگا..... بات کرنے کا کوئی فائدہ ہے؟''

''لگتا ہے کہ فائدہ ہے، جب ہی آپ سے بات کر رہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''تمہیں کیسے لگا فائدہ ہے؟'' جہانگیر نے عافیہ کی طرف دیکھتے ہوئے دانیال سے سوال کیا۔ ''جبکہ تم بتا رہے ہو کہ وہ بہت ٹریڈیشنل اور آرتھوڈوکس قسم کے لوگ ہیں، شاید کچھ بیک ورڈ سے بھی ہیں پھر انہوں نے تمہاری بات سن کیسے لی؟''

''یقیناً اپنے کانوں سے سنی۔'' دانیال نے اس تناؤ زدہ ماحول کو خوشگوار بنانے کے لیے مسکرانے کی کوشش کی مگر ماں اور باپ دونوں کے ہی سنجیدہ چہرے دیکھ کر اسے سنجیدہ ہونا پڑا۔

''میں بھی سمجھیں سر پر کفن باندھ کر وہاں گیا تھا۔ اگرچہ میں ڈرا نہیں کیونکہ ایک مرتبہ میرے سر پر بندھا کفن کافی طویل عرصے کے بعد کھل چکا، اب مجھے اس سے ڈر نہیں لگتا۔''

''یہ ایک فلیٹ جوک ہے دانیال۔'' عافیہ نے اسے ڈانٹا۔

''آئی ایم سوری ممی!'' وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ ایک مس میچ ہو گا تمہارے اور ان کے بیک گراؤنڈ میں خاصا فرق نظر آ رہا ہے۔'' جہانگیر کا ذہن ایک نکتے پر اٹک گیا تھا۔

''خیر بیک گراؤنڈ کی تو آپ رہنے دیں، اگر ان دونوں کے درمیان اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہو تو بیک گراؤنڈ اور اسٹیٹس جیسے ایشوز کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔'' عافیہ نے کہا۔ ''لیکن یہ سنجیدہ بھی ہے یہ کیسے پتا چلے۔'' انہوں نے دانیال کی طرف دیکھا۔

''میں ایک مُردے کی طرح سنجیدہ ہوں ممی آپ کو نہیں لگ رہا کیا؟'' دانیال نے کہا۔ ''میرا خیال تھا کہ اس روز جب میں بینش کو گھر لے کر آیا تھا آپ اسی روز سمجھ گئی ہوں گی جبکہ میں کسی بھی دوست کو یوں بے تکلفی سے گھر نہیں لے کر آیا کرتا۔''

''ہاں میں چونکی تو تھی لیکن پھر اسی روز سے یہ میرال والا سلسلہ شروع ہو گیا اور یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی۔'' عافیہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''لیکن آپ لوگ سمجھ نہیں پا رہے کہ ہم اور وہ......'' جہانگیر نے کہنا چاہا۔

''اللہ معاف کرے، یہ آپ کیا بار بار دُہرائے چلے جا رہے ہیں، میں نے کہا ناں کہ یہ کوئی ایشو نہیں۔'' عافیہ نے شوہر سے کہا۔ ''ہاں اب تم بتاؤ اس کے بھائی نے تمہیں کیا جواب دیا؟''

''ہاں وہ۔'' دانیال، ماں کی لمحے بھر کی ناراضی دور ہوتے دیکھ کر بولا۔ ''پہلے تو وہ بھڑکتے دکھائی دے رہے تھے لیکن پھر......'' اس نے جہانگیر کی طرف دیکھا۔ ''ڈیڈی کا ریفرنس سن کر وہ ٹھنڈے پڑ گئے اور بولے بہتر ہے اپنے ماں، باپ کو ہمارے گھر بھیجو ہم سوچیں گے۔''

''اچھا جب ہی اب ہمیں بتا رہے ہو کیونکہ ہماری ضرورت پڑ گئی۔'' وہ خفا سے ہو گئے۔

''ارے نہیں ڈیڈی، اگر پہلے آپ کو بتا دیتا اور آپ دونوں کے جانے پر وہ انکار کر دیتے تو یہ میرے لیے زیادہ بری پچویشن ہوتی۔ صرف مجھے انکار کی بات اور تھی۔''

"Jahangir, he is wiser than you" عافیہ نے اس کی بات سن کر شوہر کی طرف دیکھا اور دونوں مسکرا دیے۔

☆☆☆

دارالحکومت میں ایک گمبھیر سی فضا چھائی ہوئی تھی۔ ہر طرف خوف اور سراسیمگی کا راج نظر آ رہا تھا۔ زندگی کا کاروبار اگرچہ معمول کے مطابق چل رہا تھا لیکن اس روز شہر میں ہونے والے ایک اہم واقعے نے ہر آنکھ اور کان کی توجہ اپنی طرف مبذول کر رکھی تھی۔ پارلیمنٹ لاجز، پارلیمنٹ کی طرف جانے والے راستوں، شاہراہ دستور اور وی آئی پی ریذیڈینسز میں غیر معمولی نقل و حرکت نوٹ کی جا رہی تھی۔ پریس کلبز، ٹی وی نیوز رومز اور ریڈیو نیوز رومز میں بھی کھلبلی سی مچی نظر آ رہی تھی۔ ملک کے چھوٹے بڑے شہروں اور دور دراز علاقوں تک میں جہاں سیٹلائٹ ٹی وی کی نشریات دیکھی جا سکتی تھیں۔ ٹی وی اسکرینز پر ایک بریکنگ نیوز بار بار چل رہی تھی۔

''شہر میں ایک اعلیٰ حکومتی عہدیدار اپنے ہی محافظ کی چلائی گولی لگ جانے سے شہید ہو گئے۔''

خبر گرم تھی اور اس پر ہونے والی گفتگو اس سے بھی زیادہ گرم۔ قیافوں، قیاس آرائیوں اور چہ میگوئیوں کا بازار اس سرد موسم میں بھی گرم ترین تھا۔

☆☆☆

ہر طرف خون کا، سراسیمگی کا، چہ میگوئیاں اور معتبر و غیر معتبر ذرائع سے آنے والی خبروں کا راج تھا۔ مرنے والا پارٹی کے پرانے، ادنیٰ اور مستقل خادموں میں سے ایک تھا، ایک طویل مدت کی خاکساری اور خدمت کے عوض اسے حکومت کی طرف سے خصوصی عہدہ عنایت فرمایا گیا تھا اور اس عہدے کے ذریعے اس نے حکومت مخالفین و ناقدین کی اکثریت کو ناکوں چنے چبوائے تھے۔

''کیسی شیر دل جیسی دہاڑتی شہید کی۔ راتوں رات شہید بن کر شہادت کی ایک روایتی داستان بن .... جانے والے اس شخص کے بارے میں ٹی وی چینلز کے ٹاک شوز اور خصوصی پروگرام نوحہ کناں تھے۔ وہ نہ صرف ایک منجھا ہوا سیاست دان تھا بلکہ ایک دانشور اور صاحب علم شخص بھی تھا۔ اس کے خاندان کا علم و ادب سے گہرا تعلق تھا اور اپنے سرکاری عہدے کے ان چند سالوں میں تو وہ ہر میدان میں ہی خبروں میں اس قدر موجود رہا تھا کہ اس کی موت کی خبر نے ہر کان کو ہر آنکھ کو ششدر کر کے رکھ دیا تھا۔ اتنی اچانک اور ایسی موت ٹی وی اسکرینز اس کی جائے شہادت اور گاڑی کے فوٹیجز بار بار چلا رہے تھے۔ اس کے قاتل کو دو انگلیوں سے فتح کا

www.paksociety.com

نشان بناتے پولیس وین میں سوار ہوتے ہوئے بھی بار بار دکھایا گیا جیسے اس نے کوئی عظیم معرکہ سرانجام دیا ہو۔

''گو قاتل رنگے ہاتھوں پکڑا گیا مگر امید نہیں کہ اسے سزا ملے گی۔'' اس کی موت پر تبصرہ کرنے والوں کے ایک گروپ کی یہ رائے بھی تھی۔

''قاتل کو سرِ عام پھانسی پر لٹکایا جائے۔'' چند روز پہلے مرنے والے کے انسانی حقوق کی حمایت میں جاری ہونے والے بیان کی مخالفت کرنے والے بھی نعرے لگا رہے تھے۔

''اس ملک کی تاریخ میں آج تک نہ تو کوئی قاتل بے نقاب ہوا نہ ہی کوئی سازش...... اور جو پکڑے گئے وہ بھی وندناتے پھرتے رہے، یہ ہی حال اس کیس کا بھی ہوگا۔'' کوئی تبصرہ فرما رہا تھا۔

''انسان کو ایسا آؤٹ اسپوکن بھی نہیں ہونا چاہیے کہ جو منہ میں آئے کہہ ڈالے، مرنے والے نے اپنے بلند و بانگ لفظوں کی سزا پائی۔'' کسی کا خیال تھا غرض جتنے منہ اتنی باتیں اور خبروں اور تبصروں کے اس گرم بازار سے ذرا ہی فاصلے پر موجود ایک بڑی سرکاری عمارت میں مقیم مرنے والے کا بڑا صاحب، شطرنج کی بساط سامنے بچھائے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا...... اکیلا ہی بیٹھا مہروں کی پوزیشنوں پر نظر رکھے۔ زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔

''فدوی نے تو عرض کیا تھا سائیں کہ اِتنا زور سے مت ہنسو، یہ جو وقت ہے ناں اپنے چوبیس گھنٹوں کے سائیکل میں ہر گھڑی دنیا کے کسی نہ کسی انسان پر ہنس رہا ہوتا ہے، تم نہ ہنسو زور سے۔ کدھر یہ وقت اس گھڑی تم پر بھی نہ ہنس رہا ہو اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔ ارے میں نے تو بابا خبردار کیا تھا مگر کیا، کیا جائے کہ تم غور کرنے کے عادی نہ تھے اسی لیے تو سمجھنے سے رہ گئے۔ قہقہے لگاتے ہی چلے گئے۔ ذرا بھی رک کر نہ سوچا کہ یہ بڑا صاحب مجھے کیوں کہہ رہا ہے کہ تمہارا وقت آگیا ہے۔ ہاں بھئی سردارزادے کی دشمنی نے تمہارے کانوں کے اسپیکر ہی خلط ملط کر رکھے تھے سائیں، تمہارے کانوں کا میکنزم خراب ہو چکا تھا جب ہی ہر سنی بات کو سردارزادے کی دشمنی کی روشنی ہی میں ڈی کوڈ کرتے رہ گئے۔ افوہ تم بیچارے، دل تمہارے جانے پر اداس بھی ہے سائیں! پرانے وقتوں کے منظر بھی نظر کے سامنے آرہے ہیں۔ مگر کیا، کیا جائے تمہارا وقت آچکا تھا۔ تمہیں تو جانا ہی تھا۔ تم کیوں گئے سائیں، گولی سردارزادے کی طرف جا کر بریکنگ نیوز بننے کے بجائے تمہاری طرف کیوں مڑ گئی یہ تو ایک سربستہ راز ہے بابا۔ مگر تم چلے گئے اور تمہاری خدمتوں کو یاد کر کے تمہیں سیلوٹ کرنے کو بھی جی چاہ رہا ہے، کیا بڑے مفکر تھے تم بابا...... کیا عمدہ دانشور اور کیا کائیاں سیاست دان۔'' بڑا صاحب شطرنج کی بساط پر بچھے مہروں کی پوزیشنز دیکھتے ہوئے زیرِ لب مسکراتا سوچے جا رہا تھا۔

''چلو خیر ایک بار باضابطہ اور سرکاری طور پر تم کو خدا حافظ کہہ چکا اب ایک بار تمہاری روح کو جو یقیناً انہی در و دیوار میں آکر چنگھاڑا کرے گی کو بھی ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سیلوٹ کرتا ہوں اور عرض کرتا ہوں گڈ بائے کامریڈ سائیں گڈ بائے۔''

☆☆☆

''شیروں کی دہاڑ دہاڑنے والا کتے کی موت مر گیا جناب والا۔'' پارٹی کا ایک مقبولِ عام کارکن مہرزاد خان کے سامنے بیٹھا کہہ رہا تھا۔ وہ اس موت سے گویا محظوظ ہو رہا تھا جبکہ یہ ہی وہ شخص تھا جو کچھ دیر پہلے ہی مرحوم کی نمازِ جنازہ میں شرکت کر کے آیا تھا۔ ''اندر کھاتے کے حالات کون نہیں جانتا سردار صاحب، کم سے کم میں تو خوب ہی جانتا ہوں۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''مگر ستم ظریفی شاید اسی کو بولتے ہیں کہ آج جنازہ پڑھنے کے لیے ہیلی پیڈ پر آپ وزیرِ اعظم کے ساتھ ہیلی کی سیڑھیاں اترے اور مرنے والا لکڑی کے تابوت میں

خاموش پڑا تھا۔ کون، کون ایسا نہیں آیا تھا وہاں جس کا ذکر کرتے مرحوم انگارے چبایا کرتا تھا۔ مگر دیکھ لیں جی موت کی بے بسی کیسی ہوتی ہے، کیسا متکبر، مغرور، دوسروں کو کچھ نہ سمجھنے والا شخص، اتنے سارے ناپسندیدہ مہمانوں کی آمد پر کچھ بول سکتا تھا نہ کسی کو گیٹ آؤٹ سگنل دے سکتا تھا...... توبہ، توبہ جی۔'' کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے وہ بولا۔ ''بڑے، بڑے بول بولتا تھا، ساری بیوروکریسی کو آگے لگایا ہوا تھا۔ بڑے صاحب نے بھی اسے کچھ زیادہ ہی چھوٹ دی ہوئی تھی۔ کیسی کیسی باتیں منہ سے بے دھڑک نکال دیا کرتا تھا مگر دیکھ لیں جی کیسی معمولی سی بات موت کا بہانہ بن گئی۔ اپنے ہی محافظ کو ایسا طیش دلایا گیا کہ اس نے سیدھے فائر مار دیے، توبہ...... ہے تو افسوس کی بات مگر آپ سمجھیں خس کم جہاں پاک جی......''

مہرزاد، اپنی گھنی مونچھوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے اپنے سامنے بیٹھے شخص کی بات سن رہا تھا اور اس کی آنکھوں کے سامنے کئی پرانے منظر، ملاقاتیں، فلم کی طرح گزر رہی تھیں۔ گزشتہ دنوں سنی ہوئی کئی باتیں اس کے ذہن میں ڈی کوڈ ہو رہی تھیں الفاظ کے اصل معنی جب مجسم حقیقت بن کر سامنے آتے ہیں تو کیسا لگتا ہے، اسے اس روز اندازہ ہو رہا تھا۔

''ملک صاحب، بس کردیں۔'' پھر وہ انتہائی سنجیدہ لہجے میں سامنے بیٹھے ہوئے شخص سے مخاطب ہوا تھا۔ ''دشمن مرے تے خوشی نہ کریئے سجناں وی مرجاناں۔'' اس کا سرائیکی لہجہ درشت ہوگیا۔

''سردار صاحب میں خوشی نہیں منا رہا۔ صرف مرحوم کہ جسے آج سے شہید ہی کہہ کر یاد رکھا جائے گا...... کے غرور کی بات کر رہا تھا۔ مٹی کے ساتھ مل کر مٹی ہو جائے گا ہفتے دس دن کے اندر، ساری ڈیلنگز، سب ہتھکنڈے، ساری چالیں، سب سازشیں اِدھر کی اِدھر ہی رہ گئیں اور بندہ بس ایک گولی کی مار ثابت ہوا۔'' ملک نے اپنے رویے کا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

''او چھڈ و جی'' اسی دوران پارٹی کا ایک صفِ اوّل کا رہنما جو آکر ان کے درمیان بیٹھ چکا تھا ہاتھ ہلا کر بولا۔ ''محافظ فورس بدنام ہوگئی پوری کی پوری اس واقعے سے، ایک ایک کی شامت آئی ہوئی ہے کل رات سے۔''

''محافظ فورس تو فیس سیونگ کے لیے استعمال ہوئی اصل میں تو چٹی چمڑی والوں سے مال مارنے کا چکر ہے جی سارے کا سارا، اب یہ تو کسی کو پتا نہیں چلے گا ناں کہ کس کے کون سے اکاؤنٹ میں کتنا منتقل ہوا ان بیچارے کو پھڑکانے کے بعد۔'' ملک نے لہجہ اور بات بدلتے ہوئے کہا۔

''ہی، ہی، ہی۔'' دونوں مہمان گھٹی، گھٹی ہنسی ہنس رہے تھے۔

''واہ بھئی تم تو یونہی بڑے بول، بول کر بڑے صاحب کی نظروں میں اپنا مقام مزید بڑا بنانے کے چکر میں مارے گئے۔'' مہرزاد نے ان دونوں کی ہنسی سنتے ہوئے جانے والے کو تصور میں مخاطب کیا۔ ''ٹریگر پر انگلی میرے لیے رکھوانے آئے تھے تم فیڈرل کیپٹل میں صاحبزادے سمیت، اس انگلی کے رکھے جانے سے پہلے ہی کسی دوسرے نے تمہارا نشانہ لے کر کوئی اور ٹریگر دبا دیا۔'' اس کے دل میں عجیب سی اداسی گھر کرنے لگی تھی۔ ''بس اتنی سی ہی حقیقت ہے زندگی کی، بس یہاں تک ہی موت زندگی کی حفاظت کر پاتی ہے اس کے بعد زندگی کی جگہ وہ خود لے لیتی ہے۔ زندگی قہقہے لگاتی رہتی ہے، موت جامد خاموشی کا نام ہے۔ دونوں میں سے طاقتور کون ہے؟ زندگی ایک پرچھائیں یا موت ایک اٹل حقیقت؟'' اس کا دل گھبرا سا گیا، اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اپنی پوزیشن بدلی اور اپنے سامنے بیٹھے حضرات کی گفتگو سننے لگا۔

اسی شام ٹی وی نیوز چینلز نے سردارزادہ مہرزاد خان کو صدرِ مملکت کے ساتھ مرحوم کے اہلِ خانہ کے ساتھ تعزیت

کرتے دکھایا تھا۔ مرحوم کا صاحبزادہ تعزیت وصول کرتے ہوئے سردار مہرزاد خان کے عین سامنے بیٹھا تھا۔

اسی شام مرحوم کی یاد میں جائے شہادت پر شمعیں جلانے والے سول سوسائٹی کے ارکان کے ساتھ وفاق کی یک جہتی کے اظہار کے طور پر بھی سردارزادہ مہرزاد خان ان کی اوّلین صفوں میں موجود تھا۔

"سنا ہے یہ جو وقت ہے ناں چوبیس گھنٹوں کے سائکل میں ہر گھڑی کسی نہ کسی انسان پر بڑی زور سے ہنس رہا ہوتا ہے۔"

☆☆☆

"ہا ہائے...... اوے کلیم تیری عقل چولھے میں گر کر سواہ (راکھ) تو نہیں ہوگئی۔ تجھے پتا بھی ہے کہ تو کیا کہہ رہا ہے؟" بینش کی اماں نے بیٹے کی بات سن کر اور سمجھ کر ناک پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے اچھی طرح پتا ہے اماں میں کیا کہہ رہا ہوں۔" کلیم نے کشمیری چائے کے پیالے کی سطح پر تیرتی بالائی کی ایک موٹی سی تہ کو انگلیوں سے اٹھا کر زبان پر رکھتے ہوئے کہا۔

"نہ خاندان، نہ برادری، نہ گوت...... تو یہ بات کہہ کس بنیاد پر رہا ہے خانہ خرابہ!" اماں کا بس نہیں چل رہا تھا کوئی بھاری شے اُٹھا کر بیٹے کے سر پر دے ماریں۔ جس کی عقل پھر جانے میں انہیں کوئی شک نہیں رہا تھا۔

"او چھڈّو اماں جی۔" کلیم نے خوشبودار چائے کا گھونٹ سڑکتے ہوئے کہا۔ "اب کدھر زمانہ رہ گیا ہے خاندان، برادری، گوت، قبیلے دیکھنے کا۔ اب سب کے سب ایک دوسرے میں ضم ہو رہے ہیں۔"

"لوگوں کا زمانہ نہیں رہا ہوگا۔" اماں نے ہاتھ ہلا کر حقارت سے کہا۔ "ہم تو حسبی نسبی لوگ ہیں، ہم اور ہمارا زمانہ اب بھی وہی ہے۔ ذات کے کشمیری کھرے، اصلی نسلی۔"

"نہ کریں اماں جی ایسی باتیں۔" کلیم ہنسا۔ "آپ لڑکے کو دیکھیں گی تو بھوک مٹ جائے گی آپ کی ایسا سُچّے ہیرے جیسا لڑکا ہے اوپر سے میں تو یہ سن کر ہی گونگا ہوگیا کہ وہ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم کیا اور ہمارا خاندان کیا، وہ لوگ تو نسلوں سے منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہونے والوں میں سے ہیں، اسی لہور شہر کے ناں۔" اس نے دائیں بائیں دیکھنے کے بعد سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔ "پانچ بڑے خاندانوں میں سے ایک ان کا خاندان ہے۔ لوگ جھک جھک کر سلامیں کرتے تھے ان کے وڈ وڈیروں (بڑوں) کو۔"

"سلامیں کرتے تھے، ہونہہ۔" اماں نے ہتک آمیز لہجے میں کلیم کی بات دُہرائی۔ "ہمیں کیا ہماری طرف سے پوری دنیا سلام کرتی پھرے انہیں...... جو ذات کے کشمیری نہیں تو فائدہ کیا۔"

"کیا خاص بات ہوگئی بھئی آج۔" اسی دم سلیم بھی دکان بند کر کے گھر واپس پہنچ چکا تھا اور دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے اماں کی گرما گرم آوازیں اسے بھی سنائی دے چکی تھیں۔

"اماں بڑی گرم ہو رہی ہیں، لگتا ہے آج بونگ کا گوشت اچھا نہیں ملا اماں کو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"بونگ پر نہیں اس تیرے بھائی کی بوٹیوں پر دماغ گرم ہو رہا ہے میرا۔" اماں نے کلیم کی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں، کیا ہوا؟" سلیم چولھے کے قریب رکھی نیچی چوکی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"آج دوپہر کو جب تو گھر آیا ہوا تھا ناں کھانا کھانے، پیچھے سے سٹیت لگ گئی اس اَنّے موت (اندھے) کی عقل پر۔" اماں نے ماتھا پیٹتے ہوئے کہا۔

"ہیں!" سلیم چونک کر بولا۔ "وہ کیسے؟"

اماں نے سارا معاملہ تفصیل کے ساتھ سلیم کے گوش گزار کیا۔

"اچھا...... اچھا، اچھا" پوری بات سن کر سلیم کو جیسے کچھ یاد آگیا۔ "جب ہی ریاض کہہ رہا تھا کہ یا سلیم آج ادھر ایک گاہک آیا تھا جس کے نیچے بڑی قیمتی گڈی (گاڑی) تھی چم چم کرتی، خرید کر تو کچھ نہیں گیا پا کلیم سے باتیں کرتا رہا۔ میں سمجھا فیصل آباد والے شیخ کا بیٹا ہوگا کیونکہ وہ کہہ گیا تھا اس دفعہ کے "مال" کے نئے ریٹوں کے بارے میں صلاح مشورہ کرنے میں نہیں، میرا بیٹا آئے گا۔"

"یا سلیم، اماں تو ٹھہری پرانے خیالات کی۔" کلیم کو بات کرنے کا موقع ملا تو وہ سہولت سے بولا۔ "اگر اس فیملی کے ساتھ ہمارا رشتہ جُڑ گیا ناں تو فیصل آباد والے سارے کے سارے ہمارے پاس آ کر ہم سے ریٹ مانگا کریں گے، اوئے ادھر ڈبی بازار کی مین دکان کی برانچیں ہی برانچیں کھل جاتی ہیں پورے لہور شہر میں، گلبرگ کیا تو ڈیفنس کیا تو مال کیا، تو لبرٹی کیا، اور ریگا میں تو پورا ایک فلور ہے ان کا جناب۔ میں نے تو سنتے ہی اندازہ لگا لیا تھا مال آف لہور میں بھی دکان نہ ملی ہمیں تو نام بدل دینا میرا۔" کلیم کا جوش اور سانسیں یہ بات سناتے سناتے تیز ہوئے جا رہے تھے۔

"وے ستے منہ وے تیرا اوے کلیم!" اماں یہ کاروباری دلچسپی کے معاملات سن کر اور بھی بھڑک اٹھیں۔ "بہن بیانی ہے کہ بیچنی ہے تو نے، وے ہوش کے ناخن لے وے یملیا پاگلا۔" اب غصے کے مارے اماں کا بس نہیں چل رہا تھا کلیم کو سیدھا چولھے ہی میں جھونک دے اور غصے کے اس اظہار کے دوران وہ کن انکھیوں سے بڑے بیٹے کے تاثرات بھی جانچنے کی کوشش کر رہی تھی جو کلیم کی بات سن کر گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

"ارے آرام سے اماں آرام سے۔" اماں کی بات ختم ہونے پر سلیم بھی اپنی سوچ سے باہر نکل آیا۔



"بات کا کوئی آگا پیچھا بھی تو دیکھنے دیا کرو، آپ تو ایک دم ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو جاتی ہیں۔"

"ہیں۔" اماں کے ہاتھ میں پکڑا فرائی پین ایک دم نیچے گر گیا۔ سلیم کی بات اور اس کا لہجہ انہیں بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔

"اماں وہ رشتہ لے کر خود ہمارے تک آیا۔ ہم تو نہیں گئے ناں!" سلیم نے اماں کے تپتے دماغ کی حرارت کو مزید تیز کرتے ہوئے کہا۔

"اسے تمہاری اس لاڈلی بہن نے تمہاری طرف بھیجا ہوگا، وہ یونہی نہیں آ گیا منہ اٹھا کے۔" اماں چہک کر بولیں۔

"بات یہ ہے پا سلیم۔" کلیم نے اماں کی سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "اماں ٹھہریں پرانے وقتوں کی، اماں کو کیا پتا اچھے رشتے نہیں ملتے آج کل ڈھونڈنے سے بھی، ایسے میں یہ جو رشتہ آیا ہے ناں اس کا یہ پہلو چھوڑ دو کہ وہ بینش کے ساتھ پڑھتا ہے یا وہ اپنی برادری کا نہیں...... تو تمہیں خود نظر آئے گا کہ یہ رشتہ چھوڑنا حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

"یہ بھی چھوڑو، وہ بھی چھوڑو، بے غیرت بن کر اکیلے لڑکے کے ساتھ لڑکی رخصت کر دو۔" اماں نے ایک مرتبہ پھر درمیان میں لقمہ دینا چاہا۔

"آپ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوں اماں تو میں کچھ سوچوں ناں......" سلیم نے جھنجلا کر کہا۔ اماں سلیم کے لہجے پر خون کے گھونٹ پیتے ہوئے خاموش ہو گئیں۔

"اگر وہ لڑکا تم سے خود رشتے کی بات کرنے آیا تھا تو اس سے یہ تو پوچھنا تھا کہ بھائی تمہارے ماں، باپ کدھر ہیں؟" کچھ دیر غور کرنے کے بعد سلیم نے بھائی کو مخاطب کیا۔

"کہا تھا اس سے میں نے، وہ بولا آپ اجازت دیں گے تو انہیں بھیجوں گا ناں۔" کلیم نے مسکرا کر جواب دیا، اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ بات سلیم کے دل کو لگی تھی۔ اپنے کاروبار کو وسعت دینے کے وہ دونوں بھائی جو صرف منصوبے ہی بناتے رہتے تھے ان منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سہگلوں کے خاندان سے رشتہ جڑ جانے سے بہتر موقع اور کیا مل سکتا تھا۔

"چل پھر اسے فون لگا کر کہہ دے کہ اپنے ماں، باپ کو بھیجے ہمارے پاس۔" سلیم نے بات ختم کرتے ہوئے کہا اور اماں دونوں بیٹوں کا باری، باری منہ ہی دیکھتی رہ گئیں۔

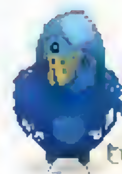
"پر سلیم...... ذرا یہ سوچ، برادری والے کیا کہیں گے، میرے تو پسرور والے پیکے (میکے) چھوٹ جانے ہیں جب انہیں پتا چلا کہ غیر برادری میں لڑکی دے دی ہم نے۔" اماں لاچار ہو کر آنکھوں میں آنسو بھر لائیں۔

"مامے ممتاز کے بیٹے کے ساتھ جو جوڑی چوگاٹھ کا کام کرتا ہے لڑکی بیاہ دینے سے پیکے راضی رہتے ہیں کیا؟" کلیم بڑے بھائی کی شہ پا کر بلند آواز میں بولا۔

"لڑکی کی زندگی خراب کر دینے سے آپ بھی راضی، برادری بھی راضی، واہ اماں کیا عقل پائی ہے۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔

"یہ رشتہ اگر واقعی ہو بھی گیا ناں اماں تو یہی برادری والے ہمیں سلام کرتے پھریں گے۔" سلیم نے نرمی سے کہا۔

اور اماں، قسمت کی اس ستم ظریفی پر کہ جوان بھائی ہی بہن کی اپنے لیے لڑکا پسند کرنے والی اتنی جرأت بد جسارت کو نظر انداز کرتے ہوئے خوش ہو رہے تھے...... بے چاری اماں جو اس کنزیومر سوسائٹی میں آنے والے



اعلیٰ توقعات اور اونچی خواہشات کے انقلاب سے ناواقف تھیں، وہ بیٹوں کے اس رویئے کو کہاں سمجھ سکتی تھیں۔

☆☆☆

”آپ نے اپنی چینی چپٹی بہو کو قبول کرلیا، اب یہ بتائیں ولیمہ کب کررہی ہیں اس کا؟“ نادر کی آپا جو زوئی کو گھر میں بہو کا مکمل مقام پائے دیکھ کر برداشت نہیں کرپاتی تھیں اپنے غصے کا زور اپنی اماں پر نکالتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”بہت جلد......“ اماں نے اطمینان سے کہا، وہ بہو کے سکھائے طریقے سے شملہ مرچ اور گاجریں باریک باریک کاٹ رہی تھیں۔

”بڑے دنوں سے سن رہے ہیں بہت جلد، بہت جلد۔“ آپا نے تھال میں سے گاجر اٹھا کر دانتوں سے کتری اور پھر آخ تھو کرتے ہوئے گاجر واپس تھال میں پھینک دی۔ ”توبہ میرے اللہ، یہ کیسی گاجریں ہیں، کہاں سے اٹھالائیں، نہ رنگ نہ ذائقہ......“

”یہ......“ اماں چھری والا ہاتھ روک کر شرارت بھرے انداز میں مسکرائیں۔ ”یہ چینی گاجریں ہیں چینی، چائنا سے آئی ہیں۔“

”بس چار دن اور رہ لینے دیں بہو صاحبہ کو ادھر، دیواروں اور دروازوں پر بھی چینیت برسنے لگے گی۔“ آپا جل کر بولیں۔

”مجھے یقین ہے جلد ہی وہ آپ کو بھی مینڈک اور چوہے کھانے پر لگادے گی۔“

”ارے توبہ کرو۔“ اماں نے جھٹ سے بہو کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔

”وہ تو کہتی ہے پاکستان میں جیسے دکاندار مرغیاں کاٹتے ہیں مجھے ان پر قطعی بھروسا نہیں، اللہ جانے تکبیر بھی پڑھتے ہیں کہ نہیں، گردن پر چھری پھیری اور گندے مندے مکھیوں اور غلاظت سے بھرے ڈرم میں تڑپنے کو پھینک دی، ایک کے بعد ایک دبادب اور پھر اسی دقت نکال کر پر، کھال سب نوچ، پانچ ٹکڑے کاٹ کر شاپر میں ڈال کر گاہک کے ہاتھ میں پکڑا دیا' چل میرے بھائی، جا حرام مرغی بھون کر کھا جا۔“ ارے وہ تو زوئی نے ہی مجھے دکھایا، اماں ذرا مرغی کے گوشت کو غور سے دیکھیں، اس کی رگوں میں خون جما ہوا ہے، ظالموں نے ٹھیک طریقے سے نہ حلال کیا نہ تڑپنے دیا۔“ اماں نے سر جھٹکا۔

”اب تو وہ نادر سے ہفتے بھر کے لیے زندہ مرغیاں منگواتی ہے اسی سے چھری پھروا کر اسے صاف کرواتی ہے خود ہی کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے بنا کر فریزر میں محفوظ کرلیتی ہے۔ اتنی تو وہ حلال، حرام کی تفریق کرنے والی ہے، وہ کہاں ہے کوچوہے، مینڈک کھائے گی بھلا۔“

”افوہ......آپ کے خیال میں تو وہ ہم سے بھی بڑی مسلمان نکلی...... ویسے تو نہیں کہیں ذرا پتا کروالیتا تھا اس عفت پروین کا۔“ آپا کو اماں کی طرفداری کہاں اچھی لگ سکتی تھی۔

”ہاں ہم سے بڑی مسلمان ہے۔“ اماں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”ہم نام کے مسلمان، نہ باقاعدہ نمازی نہ باقاعدہ روزے دار، وہ نمائشی مسلمان نہیں ہے اسے سب پتا ہے کہ زندگی ایک مسلمان نے کیسے گزارنی ہے۔“

”تو پھر ولیمہ تو کرلیں، عفت پروین کا نکاح بھی حلال ہوجائے گا۔“ آپا جل کر کباب ہوتے ہوئے بولیں۔

”کریں گے ولیمہ جلدی کریں گے، نادر بتا رہا تھا زوئی کا ایک کام پھنسا ہوا ہے کہیں، وہ ہوجائے تو ولیمہ بھی کریں گے۔“

''کام پھنسا ہوا ہے؟'' آپا کو نئی سوجھی۔ ''غیر قانونی طریقے سے آئی ہوگی ناں پاکستان' اسی لیے کام پھنسا ہوا ہے...کیا پتا کوئی جاسوس ہو یا دنہیں کوئی بندے آئے تھے نادر کے پاس جب ہمیں پہلی بار پتا چلا تھا ...زدگی کے بارے میں۔''

''چلو......'' اماں نے سر جھٹکا۔ ''تم کوئی نئی کہانی گھڑ لو۔'' وہ سبزی کا تھال اٹھا کر کھڑی ہوگئیں۔ ''اے بی بی ہم بڑے سکون سے رہ رہے ہیں اپنے گھر میں، ہمارا سکون قائم رہنے دو، نہ سناؤ نئی نئی ہمیں۔'' اماں کچن کی طرف چل دیں اور آپا ہکا بکا ہو کر ماں کو دیکھ رہی تھیں جو پہلے ان کے بغیر کوئی کام نہیں کرتی تھیں اور اب جن کے حواسوں پر چٹنی چٹنی بہو چھا چکی تھی۔

☆☆☆

''میرے شوہر کے قاتل کو فی الفور سزا دی جائے۔'' شہید کی بیوہ کی التجا۔

''میرا باپ شہادت کی موت مرا، اسے شہادت نصیب ہوئی مگر ہم اسے مارنے کی سازش کرنے والوں کو بےنقاب کرنے تک چین سے نہیں بیٹھیں گے۔'' شہید کے بیٹے کا اعلان۔

''ہم وفاقی حکومت سے درخواست اور امید کرتے ہیں کہ وہ شہید کے خاندان کو تحفظ فراہم کرے گی۔'' شہید کے ساتھیوں کے اظہار خیالات۔

''شہید کا قتل ایک فردِ واحد کا عمل ہے، اس کے پیچھے کسی سازش کا عمل دخل نہیں۔''

''شہید کی پارٹی کے لیے خدمات کے عوض خصوصی اعزاز کا اعلان کیا جائے۔'' پارٹی رہنما' بھائیو اور بہنو ہم آپ کے مجروح جذبات کا حال جانتے ہیں، پارٹی کی تاریخ ''شہدا کے خون سے لہو رنگ ہو چکی ہے، ملک کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ جمہوریت کی بقا کے لیے جتنی قربانیاں ہماری پارٹی نے دیں کسی اور نے نہیں دیں مگر میں آپ سے التماس کرتا ہوں کہ صبر سے کام لیں جیسا کہ ہمارے دین کا حکم بھی ہے، روایت بھی، ہم پارٹی کی خون رنگ روایتوں کے امین ہیں اور اس امانت کو اسی عزم کے ساتھ لے کر آگے چلیں گے جس کے ساتھ اب تک چلتے آئے ہیں۔'' پارٹی چیئرمین کا شہید کی یاد میں منعقد ہونے والے ریفرنس سے خطاب......

مہرزاد خان نے سب اخبارات کی چھوٹی بڑی سرخیوں پر نظر ڈالی اور آنکھیں سکیڑتے ہوئے نظر خلا میں موجود کسی نقطے پر مرکوز کرلی۔

''رنگے ہاتھوں پکڑے جانے والے قاتل، اعترافِ قتل، آلۂ قتل سمیت گرفتاری اور وجۂ قتل کے بیان کے بعد بھی سازش کی بو؟'' سوچتے، سوچتے ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

''میں ان سارے اتفاقات پر ششدر ہوں میر ال صلاح الدین، جو تمہارے راستے صاف کر رہے ہیں، جو تمہیں ایک پُرسکون مستقبل کی طرف لے جا رہے ہیں، تمہیں تمہاری منزل تک پہنچانے کی راہ میں، میں جس کانٹے سے سب سے زیادہ خائف تھا دیکھو وہ کیسے نکلا......اب تو مجھے یقین ہونے لگا ہے کہ تمہیں جس شخص نے دعا دی وہ اللہ کا کوئی خاص ہی بندہ تھا کاش کبھی میں بھی ان سے ملا ہوتا، شاید جو ان کے فیضانِ نظر سے میرے راستے میں اُگے ببول بھی گلزار بن جاتے لیکن......'' اس نے آرام کرسی کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے آنکھیں موند کر سوچا۔ ''تمہیں تو بقول تمہارے صرف تمہارے اپنے بڑے بولوں کی فصل کاٹنی تھی سو وہ جلد کٹ گئی مگر میرے سامنے تو نسلوں کے بولے گئے بڑے بولوں کی فصل تیار کھڑی ہے جو مجھے کاٹنی ہے اور میری درانتی گند ہونے لگی ہے اور میرے ہاتھ شل ہو رہے ہیں۔'' اس کے چہرے پر کرب پھیل رہا تھا۔

''سر آج آپ کی خصوصی میٹنگ شیڈولڈ ہے بڑے صاحب کے ساتھ۔'' اس کے پی اے نے آ کر اسے مؤدبانہ انداز میں مخاطب کیا، اس نے آنکھیں کھول کر پی اے کی طرف دیکھا۔

''ٹائم......؟''

''رات ساڑھے نو بجے۔''

''اور کیا ہو رہا ہے آج؟'' اس نے سیدھے ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے آنکھوں کو دباتے ہوئے پوچھا۔

''سر، شہادت کے سلسلے میں پریس کانفرنس ہے۔''

''وہ تو وزارتِ داخلہ کا معاملہ ہے۔''

''منسٹری آف انفارمیشن بھی انوالوڈ ہے سر۔'' پی اے کو یقیناً حیرت ہو رہی تھی کہ ایک جانے بوجھے شیڈول کو وہ نئے سرے سے کیوں جاننا چاہ رہا تھا اور اگر جاننا بھی چاہ رہا تھا تو غیر متعلقہ سوال کیوں کر رہا تھا۔

''مس یشل اپنے ڈیسک پر موجود ہیں یا نہیں......؟'' اس نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''وہ موجود ہیں سر اور انہیں خود بھی آپ سے ملاقات کرنی تھی، وہ کئی بار مجھ سے پوچھ چکیں کہ ان کو ملاقات کا ٹائم کب دیا جائے گا۔''

''ہوں......'' اس نے اپنے سامنے رکھے لیپ ٹاپ کی اسکرین اسکرول کرنا شروع کی...... ''نوٹس تو وہ مجھے فارورڈ کر چکیں۔'' اس نے پی اے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اس کی نظروں میں سوال تھا۔ نوٹس فارورڈ ہو چکے تو اب یشل کو اس سے کس سلسلے میں ملنا تھا۔

''جی سر......وہ اپنا ہوم ورک گھر ہی سے مکمل کر کے بھیج دیتی ہیں۔'' پی اے نے سوال کا جواب دیا۔

''یشل نے ڈی ایچ اے میں جس پلاٹ کی بات کی تھی، اس کا کیا ہوا؟'' مہرزاد کو اچانک یاد آیا تھا۔

''وہ تو اسی روز ادکے ہو گیا تھا سر جس روز آپ نے ملک صاحب سے بات کی تھی۔''

''ہوں......'' اس نے میز کی سطح پر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو قینچی کی شکل میں جوڑتے ہوئے دونوں انگوٹھے ہلائے، وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یشل کے سلسلے میں ایسی کون سی بات ہو سکتی تھی جس کے لیے وہ ملاقات کا وقت چاہنے لگی تھی۔

''اور سر مجید خان بھی آپ سے ملاقات کا متمنی ہے۔'' پی اے نے موقع غنیمت جان کر ایک اور درخواست اس کے سامنے رکھی۔

''مجید خان؟'' مہرزاد بری طرح چونکا۔ ''اسے جو ڈائریکشنز دی گئی تھیں کیا ان پر عمل نہیں ہوا، وہ ابھی تک کیپٹل میں ہی موجود ہے کیا؟''

''سر! اسے اپنے بیوی، بچوں کا تحفظ درکار ہے۔''

''ہیل ود......'' مہرزاد خان طیش میں آ کر بولا۔ ''اس حرام خور سے کہا تھا کہ فوراً نکل جائے، وہ (گالی) کا بچہ ابھی تک بیوی، بچوں کا تحفظ مانگ رہا ہے۔''

''غریب آدمی ہے سر۔'' پی اے نے طرفداری کی ہمت کی۔

''شٹ اپ...... وہ غرایا۔ ''غریب آدمی کا بچہ......کیا تم لاعلم ہو کہ اس کے پرسنل اکاؤنٹ میں کتنا مال ٹرانسفر ہوا ہے اور اس مال کا اسپانسر کون ہے؟''

"میں جانتا ہوں سر۔" مہرزاد خان کا یہ وہ موڈ تھا جس کے سامنے کھڑے ہونے کی ہمت کوئی بھی نہیں کیا کرتا تھا۔
"why then you didn't try to shut your big mouth up?" وہ غرایا۔
"سر......" پی اے سیدھا کھڑا ہوا۔
"اس سے بولو شکل گم کرے اپنی آدھے گھنٹے کے اندر، اندر ورنہ وہ جہاں ہوگا اس کے بیوی بچوں کی روحیں اس جگہ کا تصور کر کے ہی فنا ہو جائیں گی۔"
"جی سر......" پی اے نے موقع غنیمت جان کر فائلیں بغل میں دبائے باہر نکلنے کی، کی۔
"اور سنو......" مہرزاد نے پیچھے سے آواز دی۔ "مس پیشل کو فوراً بھجواؤ میرے پاس پچیس منٹ ہیں صرف۔"
"سر......" کھلتے دروازے کے درمیان سے آواز آئی تھی۔

☆☆☆

"آپ تو...... آپ تو جانتے ہیں انکل، آپ تو سب سمجھتے ہیں، ساری کہانی کا علم ہے آپ کو۔"
"ارے، رے، رے میرا بچہ...... نہ، نہ، بابا اپنی آواز قابو میں کرو سائیں، تم تو شیر کی اولاد ہو، آواز کیوں کانپنے لگی تمہاری۔"
"جو ہوا ہے انکل، آپ کو سب پتا ہے، ڈیڈی وہ معاملہ کلیئر کر چکے تھے جو قتل کی وجہ بیان کیا جا رہا ہے سر...... محافظ فورس کے اس رکن کو خصوصی طور پر ہدایت دے کر یہ کام کروایا گیا ہے انکل، آپ اس کی ملازمت کی ہسٹری چیک کرلیں سر، وہ کس، کس کے ساتھ رہ چکا ہے سر۔"
"آرام سے بیٹا جی، آرام سے سائیں...... تمہاری سانس کیوں پھولنے لگی، ایک، ایک کر کے سناؤ ناں باتیں، میرے دو کان ہیں سائیں، دونوں ایک وقت میں ایک ہی بات کیچ کرتے ہیں، دو دو نہیں۔"
"انکل آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔"
"ارے توبہ میری توبہ بابا، ایسے میں مذاق کس کافر کو سوجھتا ہے سائیں، تم گھبرا زیادہ گئے ہو اس لیے ہر چیز، ہر بات الٹی محسوس کر رہے ہو۔"
"آپ ہماری پچویشن کو سمجھنے کی کوشش کریں انکل، ڈیڈی بھلے چنگے اپنے عہدے کے پورے طمطراق کے ساتھ میڈم کے بلاوے پر دارالخلافہ گئے تھے اور ان کی زندہ واپسی ہوئی ہی نہیں، ڈیڈی بھی گئے، عہدہ بھی گیا۔"
"ارے بابا، اب سمجھا ڈیڈی کے ساتھ ساتھ عہدہ بھی تو گیا، ہاں، ہاں بھتیجے جو تمہاری حالت ہے اس کی وجۂ خاص سمجھ میں آنے لگی ہے۔"
"انکل...... آپ سمجھنے کی کوشش تو کریں...... جو ڈیڈی کو مار سکتا ہے، وہ مجھے، ماما کو اور میری بہنوں کو بھی تو مار سکتا ہے۔"
"وہ کیسے مار سکتا ہے؟ بابا تم لوگوں کو...... from behind the bars کوئی کسی کو کیسے مار سکتا ہے سائیں۔"
"انکل میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟"
"ارے تم گھگھیانا اور گڑگڑانا بند کرو تو میں کچھ سمجھوں ناں بابا......"
"انکل آپ کے پاس اس وقت پوری فورس ہے، آپ ہمارا ساتھ دیں تو ہم اس ٹریجڈی کا سامنا کر سکتے ہیں۔"
"فورس تو پوری لگا دی تمہارے ساتھ، تمہارے باپ کے جنازے پر کون تھا جو نہیں گیا بابا، پرائم منسٹر سے

لے کر پوری کیبنٹ، پارٹی عہدیدار، اپنے غیر سب، تمہارے گیٹ پر تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے، بتاؤ اس سے آگے اور کیا مدد کی جاسکتی ہے...... ہاں تم اور تمہاری ماں جو جی میں آرہا ہے ان کیمرے اور مائیک والوں کے سامنے بیٹھ کر بولتے جا رہے ہو، نہ کسی بیان میں تال میل ہے نہ ہی کوئی consistancy ہے، تمہارا البتہ میں کیا انتظام کرسکتا ہوں بھئی جب قاتل خود گرفتاری دے گیا، قبول بھی کر گیا، پھر میرے تیرے پر الزام بازی کیوں کرتے ہو سائیں تم لوگ......"
"انکل اس کے خلاف کیس کچا درج کیا گیا ہے، فیک شواہد، فیک آئی ڈیز والے گواہ، اسے چھوڑ دیا جائے گا میں ہنڈرڈ پرسنٹ شیور ہوں، اس نے جس کسی کی شہ پر گولی چلائی وہ دندناتا پھر رہا ہے، وہ آپ کی حکومت کی طرف سے پریس اور الیکٹرانک میڈیا کے سامنے پارٹی کی طرف سے ڈیڈی کا کیس ڈسکس کرتا پھر رہا ہے۔ اس (گالی) پر ہاتھ نہیں ڈالتے آپ...... جبکہ ڈیڈی نے مجھے اسی صبح بتایا تھا کہ آپ نے انہیں یقین دلایا ہے کہ اس کا ٹائم ختم ہو چکا ہے۔"
"ارے بابا...... کیسا جھوٹا آدمی تھا تمہارا باپ، میں نے ٹائم آجانے کی بات کی تھی، ٹائم ختم ہونے کی بات کہاں کی تھی میں نے، لو دیکھو تو سائیں جاتے، جاتے بھی مجھ غریب سے غلط بات منسوب کر گیا۔"
"افوہ انکل، مجھے نہیں لگتا، میں آپ کو قائل کرسکتا ہوں لگتا ہے ہسٹری کے تمام سیاسی مرڈرز کی طرح یہ مرڈر بھی ایک مسٹری بن کر فائلوں تلے دب جائے گا۔ I can well understand the game مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ کون کس کا پیادہ ہے اور کون کس کا فیل ہے، ویل...... ہم بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے ہوئے انکل بتا رہا ہوں آپ کو، بعد میں شکایت نہ کیجیے گا۔"
"بڑی ہی ٹریجڈی ہے بھئی، ایک تو تمہارے باپ کا مرڈر پارٹی کے لیے ہیڈک بنا ہوا ہے، اوپر سے تم چیلنج کرنے پر اتر آئے ہو وہ بھی ہمیں ہی...... واہ بھئی واہ......"
"میں اس سردارزادے کی بات کر رہا ہوں انکل، اب ہماری اس کی کھلی جنگ ہے۔"
"کمال کے شاطر ہو بابا، چال چلنے سے پہلے ہی اعلان کر دیتے ہو کہ فلاں، فلاں چال چلنے والے ہو۔ داد دینی پڑے گی تمہارے پلان آف گیم کی، شاہ کے سارے پیادے، فیلے، وزیر، مشیر سب محفوظ اور تم شاہ مات کی آواز لگا رہے ہو، ہوش کرو سائیں تمہارا باپ بھی اپنی ایسی ہی بونگیوں کے جال میں الجھ گیا، تمہاری فیملی کی یہ کوئی ٹریڈیشن سی ہی نہیں بن گئی جال میں پھنس کر وادیلے کرنے کی۔"
"this is the limit uncle مجھے سب اندازہ ہو رہا ہے، آپ اسی ہفتے نیا چہرہ سامنے لا کر ہمیں وہاں سے بے دخل بھی کرنے والے ہیں، سرکاری سیکیورٹی بھی واپس لے لی جائے گی اور مراعات بھی، صوبے میں چھوٹا صاحب گھات لگائے بیٹھا ہے اور وفاق میں آپ کا وہ پٹھا...... ساری گیم سمجھ میں آرہی ہے، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے وقت یہ بھی گزر جائے گا انکل، چونکہ لڑائی بھی لڑے جانے کے بعد ایک دن ختم ہو ہی جاتی ہے۔"
بسم اللہ سائیں، بسم اللہ...... تم اپنا غصہ اپنا طیش بھلے کیسے بھی دور کرنا چاہو کر گزرو...... ہاں نئے چہرے کی جہاں تک بات ہے تو وہ تو سرکاری مجبوری ہے بابا...... عہدے خالی رکھے جاسکتے ہیں نہ ہی عہدوں کی مراعات عہدیداروں کے سوا کسی اور کو دی جاسکتی ہیں۔ نیا چہرہ تو لانا ہی ہوگا ناں سائیں...... اور پھر تمہارا کیا ہے، تمہاری ماں کے پاس کروڑوں کی جائداد ہے، اس نے ان چند سالوں میں ملینئر سے بلینئر بننے تک کا سفر طے

کیا ہے، سرکاری مہمان رہتی رہی ہے وہ آخر، منہ بھرا، اکاؤنٹس بھرے، دل نہیں بھرا البتہ، اسے بول دینا سائیں، انکل بولتے تھے دل نہیں بھرا۔ ہمارا دوست نہیں رہا تو کیا ہوا...... اس کے ساتھ پرانی یاد اللہ ہے جب چاہے آئے، دیدہ و دل کیا کہتے ہیں ا سے فرشِ راہ ہیں بابا۔"

"میں چلتا ہوں انکل۔"

"دانت پیس کر اور سانس پُھلا کر جاؤ گے ناں بیٹا...... تو دانتوں اور سانسوں کی تو کوئی گارنٹی نہیں کب گر جائیں کب ختم ہو جائیں۔"

"میرے دانت intact ہیں انکل اور سانس بھی...... میرے زیر و بم تو صرف a face behind the veil دیکھ لینے پر a masked face کے نظر آ جانے پر اِدھر اُدھر ہوئے ہیں انکل۔ I must say this is a freezing scene"

"freezing scene ہے تو سب dissolve ہو گیا ناں سائیں...... میں سمجھا wise guy تھا عقل سے پیدل ہو، ارے بابا اصل میں تو تمہاری عقل فراری کی سواری کر رہی ہے۔"

"how blind a man I am مجھے یا میری فیملی کے کسی اور ممبر کو کچھ ہوا ناں انکل، تو ڈائریکٹ ذمے داری آپ پر آ جائے گی...... میں نوٹ لکھ کر بھجوا رہا ہوں رجسٹرار آف سپریم کورٹ کو۔"

"بسم اللہ سائیں بسم اللہ......"

"خدا حافظ...... گڈ بائے فار گڈ......!"

"گڈ بائے سائیں...... ایک yellow کارڈ تمہارا باپ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر یہاں سے گیا تھا آخری بار جاتے ہوئے، ایک مختلف قسم کا...... یلو کارڈ تمہارے ہاتھ میں نظر آ رہا ہے مجھے...... اب اللہ سائیں کی کرنیاں تو اللہ ہی جانے ناں...... فدوی کبھی خود تو بساط پر بیٹھا ہی نہیں، بس پردے کے پیچھے بیٹھ کر بساط پر چلی جانے والی چالوں کا نظارہ کرنے کا البتہ بہت شوقین ہے۔ ہاہاہا......"

☆☆☆

"بے چاری امراؤ بیگم......" تاؤ شریف نے مہین پردوں سے پار تخت پوش پر بیٹھی امراؤ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ "جیل کی سیر سے چھوٹ کر واپس آ گئی تو ٹھکانے کا نقشہ ہی بدلا ہوا پایا...... راج پاٹ تمام ہوا...... ملتان والی نے اس کی عدم موجودگی میں ادھر آ بسیرا کیا، کاروباری نقطۂ نظر سے امراؤ بیگم سے زیادہ سیانی نکلی، دن دُگنی رات چوگنی ترقی ہوئی، ہم ایسے غریب غربا سازندے بھی حضور بندگی کرنے پر لگ گئے۔ "بندگی جناب" کا نعرہ مارنے والوں کو اپنے پیٹ کے سوا کس چیز کی فکر ہوتی ہے، ہمیں کیا کہ جس کے سامنے جھک کر فرشی سلام جھاڑ رہے ہیں وہ بادشاہ گر ہے یا خود ہی بادشاہ ہے، نئے پرانے سے بھی ہمیں فرق نہیں پڑتا، رزق آنا چاہیے بس اور وافر آنا چاہیے...... ہمارے سازوں کے کِل پیچ زنگ آلود نہ ہونے پائیں، ہماری دلچسپی تو اتنی ہی ہے زندگی میں۔" وہ سوچتے، سوچتے مسکرایا اور پھر سامنے دیکھنے لگا۔ "مگر بے چاری امراؤ بیگم ایسی پھنسی چوہے دان کے اندر کہ سارے کس بل نکل گئے، نہ کوئی تعلق کام آیا نہ رشتہ...... سب سے زیادہ بڑا تعلق تو اس سے تھا جس بیچارے کا باپ سنا ہے اپنے ہی محافظ کے ہاتھوں مر گیا...... چچ، چچ کیسے بڑے، بڑے دعوے کیا کرتا تھا، وہ یہاں ہی بیٹھ کر سردار زادے کی نسلیں تک پَن (کنگال) چھوڑتا تھا، اس بیچارے کے ہاتھ بھی کچھ نہ لگا، زرنگار کو لے اُڑنے کے دعوے کرتا تھا اور سردار زادے کو ختم کروا دینے کے مگر کیسا وہ سردار زادہ

صاقب زرنگار کو نکال لے گیا یہاں سے، اللہ کرے زرنگار خیریت سے ہو، میری تجربہ کار نظروں نے تو پہلے ہی دن جانچ لیا تھا کہ سردار زادہ آیا ہی زرنگار کے لیے تھا یہاں اور پھر اس نے اسے اپنے نام کرلیا، بیچاری بڑے خاندان کی لگتی تھی، امراؤ بیگم پر ایسے ہی تو مار نہیں پڑی ناں زمانے کی، جیل کی ہوا کھا آئی، ٹھور ٹھکانا راج پاٹ گیا، اب سفید جھاٹا (بال) لیے ایسے ہی کسی روز اس کا دم نکل جاتا ہے، اللہ جانے اوپر والے کا سامنا کس منہ کے ساتھ کرے گی روزِ حشر۔'' تاؤ شریف نے اپنے عقب سے آتی چپلوں کے گھسٹنے کی آواز سنی اور اپنے سازوں کے غلاف اتارنے میں مشغول ہوگیا۔

☆☆☆

''یہ میرا استعفیٰ ہے۔'' مہرزاد نے یشل رئیس کی آواز سنی اور پھر اپنے سامنے میز پر رکھے سفید لفافے پر نظر ڈالی۔

''اس کی ایک سافٹ کاپی میں آپ کو میل کرچکی ہوں لیکن شاید آپ نے وہ میل دیکھی نہیں۔'' وہ کہہ رہی تھی۔

''نہیں۔'' مہرزاد نے یشل کی طرف دیکھے بغیر میز پر سے لفافہ اٹھایا، کسی بھی غیر متوقع صورتِ حال کے سامنے آجانے پر اپنے احساسات کو سرد مہری اور بے نیازی کی تہہ کے نیچے کیسے چھپایا جاتا ہے یہ مہرزاد خان سے بہتر کون جانتا تھا۔ اس نے لفافے کی سیل توڑی اور پھر اس میں رکھا کاغذ نکالے اور پڑھے بغیر لفافہ واپس میز پر رکھ دیا۔

''تمہارے پاس یقیناً اس کی وجوہات ہوں گی۔'' اس نے بازو میز کی سطح پر رکھ کر آگے جھکتے ہوئے کہا۔

''یقیناً......'' یشل نے مہرزاد خان کی بے نیازی پر دل میں امڈنے والے حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتے ہوئے گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''کیا یہ اس کے لیے اتنی ہی معمولی بات ہے کہ جس کا نوٹس بھی نہ لیا جائے؟'' اس نے سوچا۔ ''میں مزید اس سسٹم کا حصہ نہیں بنے رہنا چاہتی۔'' اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ وجوہات کی تفصیل نہیں پوچھے گا مگر کیونکہ وہ خود اسے تفصیل سے بتانا چاہتی تھی اس لیے اس نے خود ہی بتانا چاہا۔

''اچھی بات ہے۔'' مہرزاد نے بے نیازی سے سر ہلایا۔ ''اگرچہ تم براہِ راست کسی بھی سسٹم کا حصہ نہیں ہو...... پھر بھی خود کو اہم جاننا ہر شخص کا بنیادی حق ہے۔'' طیش اور بے بسی کی ایک لہر یشل کے جسم میں دوڑ گئی۔

''یاد رہے میں آپ کے لیے ایک استعمال شدہ ٹشو پیپر کی حیثیت سے جانے جانا نہیں چاہتی، میرے سینے میں بہت سے راز محفوظ ہیں اور میں نے کسی آئین، قانون یا فردِ واحد سے وفاداری کا حلف بھی نہیں اٹھا رکھا۔'' اس نے تیز آواز میں کہا۔

''اوہ......'' وہ بے اختیار مسکرایا اور یشل کی طرف دیکھتے ہوئے داد دینے کے سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بلیک میلنگ......!'' اس نے ابرو چڑھائے...... ''جبکہ تم سے بہتر کون جانتا ہوگا...... مجھے اس دھمکی کے جال میں پھنسانے کے خواب دیکھنے والا احمقوں کی جنت میں رہنے کے سوا کچھ بھی نہیں کیا کرتا۔''

''آپ کی سوچ ہے، میری اس ایک بات کے اندر کیا چھپا ہوا ہے۔'' یشل ہمیشہ کی طرح مہرزاد خان کی خود اعتمادی سے مرعوب ہوئی مگر اس نے اپنے لہجے کا اعتماد کھونے نہیں دیا۔

''میں بہت کم عرصے میں میکسیم ''چھپے ہوئے'' سے بھی گزر چکا ہوں میم، آپ مزید مجھے کیا نکال کر دکھائیں گی، شوق سے چھپے ہوئے کو بار ہا نکالیے مگر یاد رکھیے گا کہ تھوکا صرف چاند پر ہی جاتا ہے اور اس تھوکنے کے عمل کا نتیجہ کیا ہوتا ہے یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا، آپ ماشاء اللہ ذہین، فطین، حد سے زیادہ پڑھی لکھی باشعور خاتون ہیں۔'' وہ ایک ہی جست میں تم سے آپ پر آگیا تھا۔

''مجھے یہ سوچ کر ہی جھرجھری آرہی ہے کہ میں نے آپ کو کیا سمجھا تھا اور آپ کیا نکلے...... ایک لڑکی کی خاطر اپنے وعدے، دعوے اور نعرے داؤ پر لگادینے والے روایتی سردار زادے!'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''تھینک یو فار دی کمپلیمنٹ ......!'' مہرزاد نے گردن ذرا سی ٹیڑھی کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''وہ سب جو میں نے آپ کے لیے لکھا، ہر وہ فورم جہاں پر کھڑے ہوکر میں آپ کی وکیل ہوئی، ہر وہ لفظ جو میرے قلم سے اور میرے منہ سے آپ کی خاطر نکلا میں اس پر شرمندہ ہوں۔'' یشل نے طیش میں آتے ہوئے کہا۔

''آپ شوق سے اپنے لکھے اور بولے ہوئے الفاظ واپس لے سکتی ہیں، یہ کوئی بڑی ڈیل نہیں ہوگی۔'' مہرزاد نے اس کے طیش کو بھی خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہا۔

''مگر اب میرا قلم جو آپ کے لیے لکھے گا اور میرا منہ جو آپ کے لیے بولے گا اس پر یقیناً میں کبھی شرمندہ نہیں ہوں گی، آپ کو علم نہیں ہوگا کہ گزشتہ چند ہفتوں میں آپ نے جو کچھ کیا، جس، جس سے ملے جو، جو کہا، وہ سب میرے پاس نوٹ ہوا پڑا ہے۔''

''مجھے حیرت ہو رہی ہے نہ ہی میں چونکا ہوں، مجھے معلوم ہے آپ جیسوں کو دوسروں کو اسٹاک کرنے کی لت لگی ہوتی ہے، آپ لوگ عادت سے مجبور ہوتے ہیں۔'' مہرزاد نے یشل کے اشتعال کو مزید ہوا دیتے ہوئے کہا۔

''چلیں دیکھتے ہیں، کس کو لگی کون سی لت کیا رنگ لاتی ہے۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''اپنی نوکری میں گزرے میری زندگی کے بُرے ترین دنوں پر میں آپ کی بہرحال مشکور رہوں گی، آپ نے مجھے خوب سکھایا۔''

''میں نے آپ کو خوب سکھایا؟'' وہ زیرِلب مسکرایا۔ ''سوائے پیڑ پر چڑھنے کے، اب آپ پیڑ پر چڑھنے کی کوشش کرنے جارہی ہیں، میری ہمدردیاں آپ کی تمام ہڈیوں اور پسلیوں کے ساتھ رہیں گی۔''

''دھمکی مت دیں، کوئی نئی بات کریں......'' یشل نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے کوئی نقصان پہنچا تو سب جانتے ہیں کہ میں کس کی نوکری سے استعفیٰ دے رہی ہوں۔''

''ارے آپ خود کو اتنا اہم کیوں سمجھ رہی ہیں کہ میں آپ کو دھمکی دوں گا، شاید آپ نہیں جانتیں زندگی کا نظام انسانوں کے آنے یا جانے سے کبھی نہیں رکتا۔''

''آپ میری باتوں کو جتنا لائٹ لینے کی اداکاری کررہے ہیں، حقیقت میں وہ اتنی ہلکی ہیں نہیں......'' یشل نے کچھ دیر تک مہرزاد خان کو دیکھتے رہنے کے بعد کہا۔ ''خدا حافظ......'' پھر وہ جوتوں کی ایڑیوں پر گھومی اور تیز قدموں سے چلتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

یشل کے جانے کے بعد مہرزاد خان نے میز پر رکھا سفید لفافہ اٹھا کر اسے بغیر پڑھے پھاڑ کر پرزوں کی شکل دینے کے بعد ٹریش بن میں ڈال دیا اور خود میز پر رکھے رنگ برنگ ٹیلی فونز میں سے ایک خصوصی فون کا چونگا اٹھا کر کسی سے بات کرنے لگا۔

☆☆☆

ہینش کے لیے دانیال کا خود اس کے بھائی کلیم کے پاس آکر اپنا مدعا بیان کرنا ایک بہت بڑا اور جرأت مندانہ قدم تھا۔ جب اسے اس آمد اور ملاقات کا علم ہوا تو ایک دو پل کے لیے تو اس کا دل جیسے دھڑکنا ہی بھول گیا لیکن تیسرے پل میں اس کے دل کو اس بات پر غور کرنا پڑا کہ اپنا مدعا بیان کرنے کی اس جرأتِ رندانہ پر اس کے بھائیوں کا ردِعمل کیا ہوسکتا تھا۔

''مجھے نہیں لگتا کہ اس ایکسٹریم سچویشن کا ری ایکشن بھی اتنا ایکسٹریم ہوگا۔'' دانیال نے اس کو بوکھلائے

ہوئے دیکھ کر بے نیازی سے کہا وہ ایک بڑے سے لفافے میں سے مسالا لگے پاپ کارن نکال کر کھانے میں مگن تھا۔ ’’میرا ابھی تمہاری طرح ایک خیال یہ بھی تھا کہ تمہارا بھائی مجھے اپنے سیلز مینوں کی مدد سے اٹھوا کر دکان سے باہر پھنکوا دے گا۔ ایسے میں بھی کچھ نہ ہوتا سوائے میری بہ مشکل جڑی چند ہڈیوں کے دوبارہ سے کریک ہو جانے کے مگر تمہارے حصول کی خاطر ہڈیوں کا دوبارہ ٹوٹ جانا کوئی بڑا ایشو نہیں ہوتا۔‘‘

’’میں حیران ہوں بھائی نے ایسا کیوں نہیں کیا......؟‘‘ بینش نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

’’شاید انہیں ہم دونوں کی معصوم سی لو اسٹوری پر ترس آ گیا ہو۔‘‘ وہ مسکرا کر بولا اور خالی لفافے کو ہلا کر اس میں بچے کھچے پاپ کارن کی موجودگی کا اندازہ کرنے لگا۔

’’تمہاری سوچ ہے ایسا ہوا ہوگا؟‘‘ بینش نے سر ہلایا...... ’’ہو سکتا ہے تمہاری شکل صورت اور ٹھاٹھ کا اندازہ لگاتے ہوئے وہ ایسا کرنے سے رک گئے ہوں کہ ایسا کرنے سے انہیں لینے کے دینے بھی پڑ سکتے تھے لیکن میں تو پوری طرح ان کے اختیار میں ہوں، وہ مجھے قتل کرنے سے کم کسی اقدام پر شاید ہی راضی ہو پائیں۔‘‘

’’اچھا......‘‘ دانیال نے خالی لفافہ ڈسٹ بن میں پھینکتے ہوئے رک کر بینش کی طرف دیکھا۔ ’’تو پھر کیا ہے یار، ہو جانا قتل، شہیدِ عشق کہلاؤ گی تاریخ میں۔‘‘ اس کے چہرے پر شرارت پھیل گئی۔

’’میں مذاق نہیں کر رہی......‘‘ بینش نے ناراض سی شکل بناتے ہوئے اپنے مخصوص اندرونِ لاہوری لہجے میں کہا اور دانیال دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔

’’کیا ڈیڈی کا خیال درست ہے کہ میرے اور بینش کے لائف اسٹائل میں زمین آسمان کا فرق ہے اور یہ مشکل سے ہی میرے ماحول میں ایڈجسٹ کر پائے گی۔‘‘ اس نے سوچا۔ اس کے سامنے بیٹھی لڑکی کا چہرہ کسی بھی قسم کے میک اپ سے عاری تھا۔ بھورے بال سیدھے تھے اور چٹیا کی شکل میں بندھے اس کی پشت پر لٹک رہے تھے...... اس نے سفید زمین پر ہلکے سبز پھولوں کے پرنٹ کی عام سی کاٹن کی قمیص پہن رکھی تھی اور اس کا سفید دوپٹا گلے میں بے پروائی سے پڑا تھا۔ اس کی رنگت سرخ و سفید تھی اور شکل پر کسی قسم کی تیزی طراری کے بجائے معصومیت جھلکتی تھی۔ اس نے اس کی سیدھی لانبی سفید انگلیوں کو دیکھا، اس کے ہاتھ جو دیکھنے پر ہی کسی پیدائشی تخلیق کار کے ہاتھ نظر آتے تھے اور یہیں آ کر اس کی نظریں رک گئیں۔ بینش ان دنوں کیلی گرافی پر کام کر رہی تھی اور منی ایچر پینٹنگ پڑھ رہی تھی، دانیال اس کا کام اور شوق دیکھ کر اندازہ لگا چکا تھا کہ آنے والے سالوں میں ذرا سی مدد اور رہنمائی کے ذریعے وہ اس میدان میں بہت آگے جانے والی تھی۔

’’وہ مددگار اور رہنما میرے سوا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا......‘‘ اس نے اپنی ممی کو اس بحث کے دوران کہ بینش سے شادی کا اس کا فیصلہ کیسا رہے گا بتایا تھا۔ ’’آپ یقین جانیں ممی، میں اسے دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرا اور اس کا ہمیشہ کا ساتھ ہے جیسے میں بنا ہی اس کے لیے ہوں یا جیسے مجھے دوبارہ زندگی ملنے کی مصلحت میں ایک وجہ یہ بھی شامل تھی کہ مجھے اس لڑکی سے ملنا اور اسے اپنانا تھا۔‘‘

’’دانیال نہ جانے کیوں مجھے تمہاری باتوں سے خوف آ رہا ہے۔‘‘ ممی نے کہا تھا...... ’’تم اس معاملے میں ویسے ہی کریزی ہو رہے ہو جیسے فلائنگ سیکھتے ہوئے تھے اور اس کریز کا انجام تم جانتے ہو۔‘‘

’’وہ محض ایک حادثہ تھا ممی، دنیا کی تاریخ میں ہونے والے کروڑہا حادثوں میں سے ایک حادثہ، میں فلائنگ کے سلسلے میں کریزی نہ بھی ہوتا تو میرا صرف شوق ہی مجھے اس حادثے کی طرف لے جاتا کیونکہ وہ حادثہ میرا مقدر تھا۔‘‘ اس نے سادہ الفاظ میں ممی کو سمجھایا تھا۔

’’اور آپ خود ہی تو کہتی ہیں کہ وہ حادثہ ہم سب کو ایک نئی زندگی، ایک نئی سوچ سے متعارف کروانے کی وجہ تھا۔‘‘ ممی کو بدستور متذبذب دیکھ کر اس نے کہا تھا۔ ’’بینش کا انتخاب اسی نئی سوچ کی ہی تو ایک کڑی ہے، حسب نسب، خاندان، ذات، برادری...... سب ہمارے ذہن کی گھڑی غلط اختراعات ہیں۔‘‘

’’شاید تم ٹھیک کہتے ہو، شاید اس بار میں جذباتی ہو رہی ہوں۔‘‘ اس بحث کے آخر میں ممی نے بھی تسلیم کرتے ہوئے کہا تھا..اور اب یہاں وہ لڑکی بینش تھی جو اس خوف سے ہی اس روز گھر واپس جانے سے گھبرا رہی تھی کہ اس کے بھائی یقیناً دانیال سے اس کی دوستی کو بے راہ روی گردان کر بھون کر رکھ دیں گے۔

’’تمہارے بھائی نے مجھے اپنے والدین کو تمہارے گھر بھجوانے کا کہا ہے اور آج شام کو وہ مجھ سمیت تمہارے گھر ہوں گے...... تم خواہ مخواہ گھبرا رہی ہو......‘‘ دانیال نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے بینش کو مژدۂ جانفزا سنایا۔

’’مجھے یقین نہیں آ رہا...... میرے بھائی اتنے روشن خیال ہو سکتے ہیں۔‘‘ بینش نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

’’شام تک تمہیں یقین آ جائے گا۔‘‘ دانیال کے لہجے میں یقین تھا اور امید بھی۔

☆☆☆

’’اگر آپ میرال صلاح الدین کے کسی خصوصی استقبال کا اہتمام کرنا چاہتی ہیں تو اس کا مناسب وقت آیا ہی چاہتا ہے، آپ اپنی تیاری شروع کر دیں۔‘‘ ایک نامعلوم نمبر سے عافیہ کو پیغام وصول ہوا تھا، انہوں نے اس نمبر پر کال کرنا چاہی تو وہ نمبر بند ملا اور اس پیغام کے جواب میں بھجوایا گیا پیغام اپنی وصولی ناکام ثابت ہونے کا اعلان کرنے کے بعد خاموش ہو گیا تھا۔

’’سچ کہتے ہیں لوگ، ان گورنمنٹ آفیشلز سے کسی قسم کا بھی معاملہ حیران کُن اور مہنگا ثابت ہوتا ہے۔‘‘ عافیہ نے سوچا تھا اور مناسب وقت کا انتظار کرنے میں مصروف ہو گئیں۔

☆☆☆

’’اتنے دن بعد اچانک تمہیں ہماری یاد کیسے آ گئی جبکہ میں تو سمجھی تھی کہ ہم تمہارے لیے بھولی بسری کہانی بن چکے ہوں گے۔‘‘ علینہ نے فہد کی کال وصول کرتے ہوئے کہا تھا۔

’’وہ کہانیاں جو انسان نے خوب ہی سن رکھی ہوں اور جو اسے الف سے یے تک رٹی ہوئی ہوں، وہ بھولی بسری کبھی نہیں بن سکتیں۔ وہ اس کے لاشعور میں ہر وقت محفوظ رہتی ہیں۔‘‘ فہد نے جواب میں مسکرا کر کہا۔

’’کہو کیسی ہو تم......؟‘‘

’’میں ٹھیک ہوں بلکہ ہم دونوں ٹھیک ہیں میں بھی اور ممی بھی۔‘‘

’’تمہارے شہر کا موسم کیسا ہے، اس کی شامیں آج کل کے جاتے سرما میں بہت خوب صورت ہو جاتی ہیں، کیا وہ اب بھی ویسی ہی ہیں؟‘‘ فہد نے سوال کیا۔

’’میرا شہر......؟‘‘ علینہ نے سوال کے جواب میں سوال کیا۔ ’’کیا یہ تمہارا شہر نہیں ہے؟‘‘

’’وہ میرا شہر تھا اب شاید نہیں ہے۔‘‘ فہد کے لہجے میں اداسی اتر گئی۔ ’’اب میرے لیے وہ ’’شہرِ یاراں‘‘ ہے، اس شہرِ یاراں کی شامیں، مجھے اکثر بہت یاد آتی ہیں، بتاؤ کیا وہ شامیں اب بھی اتنی ہی خوب صورت ہیں جتنی تب تھیں جب میں بھی اس شہر کا ایک مکین تھا؟‘‘

’’ڈیپینڈ کرتا ہے کہ تمہارے شہرِ یاراں میں وہ لوگ موجود ہیں یا نہیں کہ جن کی موجودگی اس شہر کی شاموں کو یادگار بنا دیا کرتی تھی۔‘‘ علینہ نے الجھتے ہوئے کہا۔

''شہرِ یاراں...... ہمیشہ شہرِ یاراں ہی رہتا ہے علینہ...... یاروں کی موجودگی یا عدم موجودگی اس کے ٹائٹل پر کوئی خاص اثر نہیں کیا کرتی اور میرے شہرِ یاراں میں تو تمہارے فارمولے کے مطابق ابھی تم اور تمہاری ممی موجود ہیں لہٰذا میرے لیے تو وہ ہر طرح سے ''شہرِ یاراں'' ہی ہے۔''

''اب بتاؤ اس کی شامیں کیسی ہیں؟'' علینہ کی خاموشی پر اس نے اپنا سوال دُہرایا۔

''تم یہ بتاؤ میرال کا کیا بنا، تمہاری جستجو کہاں تک پہنچی......؟'' علینہ کے جواب پر وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

''تمہیں ایک بات بتاؤں......؟'' اس نے علینہ کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔

''ہاں بتاؤ......؟''

''تم پکی sadist ہو اور تمہیں اس اندازِ فکر سے کوئی بھی بات، کوئی بھی تبدیلی ہٹا نہیں سکتی۔''

''شاید میں ایسی ہی ہوں...... پھر......؟'' جواب میں علینہ نے کہا۔

''پھر کچھ نہیں......'' فہد نے کہا۔ ''تم میرال کا پوچھ رہی تھیں ناں...... تو اس کے سلسلے میں ایک امید افزا حوصلہ افزا بات دانیال نے مجھے بتائی ہے کہ شاید ہم جلد ہی اس سے ملنے والے ہیں۔''

''ہاں، مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔'' علینہ نے فوری جواب دیا۔

''سکستھ سینس جاگ گئی کیا تمہاری......؟'' فہد ہنسا۔

''نہیں، میں اتنی لکی کہاں ہوں کہ میری چھٹی حس مجھے اشارے دے، میں نے تو تمہارے ''شہرِ یاراں'' والے جملے سے اخذ کیا، لگتا ہے میرال کے سلسلے میں کوئی اچھی خبر ملی ہے تمہیں۔''

''واہ کیا بات ہے تمہاری، کیسے...... exact logical conclusion نکالتی ہو تم۔'' فہد اس بار کھل کے ہنس دیا۔ ''لڑکی لگتا ہے تمہاری اس sadistic اپروچ پر تمہارے کان کھینچنے پڑیں گے اب۔''

''تم میرے کان کیا کھینچو گے، میرے کان تو حالات نے ساری عمر ہی کھینچے رکھے......''

''پھر وہی ڈارک باتیں......'' فہد نے جھنجلا کر کہا۔ ''مجھے پتا ہے تم مجھے اس ''شہرِ یاراں'' کی شاموں کا حال سنانے سے بچنے کے لیے یہ ساری گفتگو کر رہی ہو۔''

''میرے لیے تو اس شہر کی تمام شامیں ایک سی ہیں، سردی، گرمی، بہار، خزاں کسی بھی موسم میں کوئی فرق نہیں نظر آتا۔'' علینہ اسی انداز میں بولی۔

''چلو اللہ تمہیں ہدایت دے اور تمہاری صبحوں اور شاموں کو نئے، نئے انداز اور رنگ عطا فرمائے۔'' فہد نے اس کے اس انداز کے سامنے ہار مانتے ہوئے کہا۔ ''کل رات میں اپنے اسپیشل شو میں سی فوڈ ریسپیز سکھانے والا ہوں، دیکھنا مت بھولنا۔''

''میں ممی کو بتا دوں گی، وہ نہ صرف تمہارا شو باقاعدگی سے دیکھتی ہیں بلکہ تمہاری ریسپیز ٹرائی کرنے کے چکر میں کچن میں بھی جانے لگی ہیں۔''

''گریٹ......!'' فہد خوش ہو گیا...... ''تمہیں اپنی ممی کی تقلید کرنی چاہیے، وہ تم سے زیادہ سمجھدار ہیں۔''

''میں جانتی ہوں، دنیا کا ہر دوسرا فرد مجھ سے زیادہ سمجھدار ہے۔'' وہ یاسیت بھرے لہجے میں بولی۔

''چلو پھر مجھے اجازت دو کیونکہ ایک ناسمجھ کے لیے دعا کرنے کے سوا میرے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں ہے۔'' فہد نے گفتگو ختم کرتے ہوئے کہا۔

جاری ہے

شامِ شہرِ یاراں

عنیزہ سیّد

قسط 16

زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے... خیر و شر، نیکی اور بدی... زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت... ہر برائی پر حاوی ہو جاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سیّد نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

محمود درانی اور مہرین کی تیسری اولاد حمزہ، مہرین کی زچگی میں پیچیدگی کے باعث نانی کے پاس ان کے آبائی گھر سیالکوٹ میں پروان چڑھتا ہے۔ جہاں نگین اس کے ماموں کی بیٹی سے اس کی خوب گاڑھی چھنتی ہے۔ علینہ کے والدین، نادیہ اور سعید کیانی نے کورٹ میرج کی تھی مگر شادی کے تین سال بعد سعید کیانی بیوی کو داغِ مفارقت دے گئے۔ آکسفورڈ کا پروردہ سردار مہر زاد خان اپنے باپ کے سیاسی قتل کے بعد حادثاتی طور پر سیاست میں شامل ہوا تھا اور زرنگار کے حسن و ذہانت کا شکار ہو چلا تھا..... بینش دو بھائیوں کی اکلوتی بہن، اپنی ضد اور صرف بھائیوں کے تعاون سے نیشنل کالج آف آرٹس میں تعلیم حاصل کر رہی تھی جہاں اس کا سینئر ساتھی دانیال اس سے ہر ممکن تعاون کرتا ہے۔ ایک پاکستانی مسلمان مرد اور بدھ مذہب کی پیروکار چینی عورت کی بیٹی زوئی حسین چین سے آکر پاکستان میں فارمیسی کی تعلیم حاصل کرتی ہے۔ دانیال آرٹ کا عشق رکھنے کے ساتھ فلائنگ میں بھی مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے اور ایک دن طیارے کے دعوے سے نقش و نگار بنانے کی کوشش میں حادثے کا شکار ہو جاتا ہے۔ نادر اپنے گھر میں زوئی کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ زرنگار کو اس خصوصی نمبر سے دبئی روانگی کا پیغام ملتا ہے۔ میرال کو بتایا جاتا ہے کہ اس کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل ہے اس لیے وہ دبئی نہیں جا سکتی۔ میرال حیران ہوتی ہے کہ وہ لوگ اسے کہاں لے کر جا رہے ہیں۔ نیشل، مہر زاد خان کی نیوز اینکر کے ساتھ منعقد کی گئی میٹنگ دیکھتی ہے تو اسے کچھ غیر معمولی محسوس ہوتا ہے۔ فہد اور حمزہ، دانیال اور عافیہ سے ملنے آتے ہیں۔ علینہ، فہد کے جانے کے بعد سوچتی ہے کہ اس کے ہونے سے کتنی رونق ہوتی تھی۔ فہد، دانیال، عافیہ اور حمزہ سے کہتا ہے کہ اسے اپنے کچھ کا ٹیکٹس آزما لینے دیں۔ نادر کی ماں اسے کہتی ہے کہ اس کی بہنیں آ رہی ہیں، وہ دونوں مہر زاد کے انداز میں غیر معمولی تبدیلی پر نیشل حیران ہوتی ہے۔ مہر زاد کے پاس اس کے نانا کا فون آتا ہے کہ زرنگار جلد ہی اس تک پہنچنے والی ہے اور اب اسے اپنا اپنا گروپ بنا لیتے ہیں۔ مہر زاد خان سے کہتے ہیں کہ وہ اپنی ٹون بدلے..... فہد، عافیہ اور حمزہ کو بتاتا ہے کہ اپنی ماں کی خواہش کا احترام کرنا ہوگا۔ وہ مہر زاد خان ہے۔ دانیال کہتا ہے کہ لڑکی کو اگر وہاں سے نکالنا ہے تو میرال کو اس رات جس عمارت میں لے جایا گیا اس کا محرک مہر زاد نہیں ہے۔ بینش کی ماں اس سے کہتی ہے کہ اب پڑھائی چھوڑ کر پرائیویسی کو چھوڑنا ہوگا۔ جس پر حمزہ، فہد اور عافیہ سب ہی خاموش رہتے ہیں۔ زرنگار، مہر زاد سے کہتی ہے کہ اگر اسے پتا ہوتا کہ اسے شادی کی فکر کرے۔ بینش ماں سے کہتی ہے کہ وہ تھوڑا انتظار کرے۔ مہر زاد، زرنگار کو یقین دلاتا ہے کہ اسے اب یہاں کوئی مہر زاد کے سامنے لایا جا رہا ہے تو وہ یہاں نہ آتی اپنی زندگی ختم کر لیتی۔ امراؤ بیگم کو پولیس پکڑ لیتی ہے، فہد، چیف خطرہ نہیں..... وہ یہاں محفوظ ہے لیکن زرنگار کو اس کی کسی بات پر یقین نہیں آتا..... حمزہ، نگین کو بتاتا ہے کہ اس نے سیالکوٹ والا گھر منسٹر سے ملتا ہے لیکن اسے چیف منسٹر سے مل کر بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ نادر، زوئی سے کہتا ماموؤں سے خرید لیا ہے۔ بینش کی ماں اسے بتاتی ہے کہ وہ اپنے بھائی کے بیٹے سے اس کا رشتہ کر رہی ہے۔ مہر زاد نے عافیہ سے مل کر ان کی ہے کہ اس کے پاس ایجنسی والوں کا فون آیا تھا۔ مہر زاد، عافیہ کو ملنے کے لیے بلاتا ہے۔ بدگمانی، شکوک کو ختم کر دیا تھا۔ سلیم اپنی ماں کو منع کرتا ہے کہ وہ اپنے ماموں کے گھر بینش کا رشتہ کرنے کا سوچے بھی نہ..... میرال اب وہاں رہتے ہوئے اکتانے لگی تھی۔ عافیہ، دانیال کو سمجھاتی ہیں کہ مہر زاد سے مل کر انہیں اندازہ ہوا کہ مہر زاد و یسا انسان نہیں ہے جیسی باتیں اس کے لیے مشہور کی جا رہی ہیں۔ حمزہ، اشعر سے کہتا ہے کہ اسے لگتا ہے کہ نگین گھریلو ذمے داریوں میں جکڑے جانے کے لیے نہیں بنی یہ اس کے ساتھ زیادتی ہے۔ نانا جان، مہر زاد خان سے کہتے ہیں کہ ان کی صرف ایک فرمائش تھی اور اگر وہ اس کمٹمنٹ سے ہٹ گیا تو بہت برا ہوگا۔ دانیال، بینش کے بھائی سے ملنے آتا ہے تو اسے سمجھ آتی ہے کہ اماں، مامے ممتاز کے بیٹے کے رشتے کا ذکر کیوں کر رہی تھی۔ دانیال، عافیہ اور جہانگیر کو بینش کے بارے میں بتاتا ہے اور اس کے گھر چلنے کا کہتا ہے۔ ایک اعلیٰ حکومتی عہدے دار اپنے ہی محافظ کی گولی سے شہید ہو جاتا ہے۔ بینش کے دونوں بھائی اپنی اماں کو دانیال کے لیے راضی کر لیتے ہیں۔ امراؤ بیگم جیل کی سیر کر کے آ جاتی ہے۔ نیشل، مہر زاد کو اپنا استعفیٰ دے دیتی ہے۔ بینش، دانیال کے اپنے بھائیوں سے ملنے پر ان کی روشن خیالی پر حیران ہوتی ہے۔ عافیہ کے پاس میسج آتا ہے کہ وہ میرال کے استقبال کی تیاری شروع کر دیں..... فہد، علینہ کو فون کرتا ہے تو وہ اس کی باتوں سے اندازہ لگاتی ہے کہ میرال کے سلسلے میں کوئی اچھی خبر ہے۔

اب آگے پڑھیں

''جمعہ کے دن صبح دس بجے تک تم تیار ہو جانا، تمہیں آگ کے دریا کے کنارے پر بسی زندگی کی بستی تک پہنچانا ہے۔ اللہ سے میری دعا ہے کہ وہ میری مدد کرے اور رہنمائی بھی۔''

مہر زاد خان کے خصوصی نمبر سے آنے والے اس پیغام کو میرال نے تھکے ذہن اور الجھے ہوئے دل کے ساتھ وصول کیا تھا۔

''ایک سفر اور درپیش ہونے کو ہے گویا۔'' اس نے کُڑھتے ہوئے سوچا۔ ''سفر جس کی راہیں بھی انجانی ہیں اور منزل بھی نامعلوم، سفر کیا ہے چوہے اور بلی کا سا کھیل ہے، نہ بلی کے ہاتھ چوہا لگتا ہے نہ چوہے کی جان بلی سے چھوٹتی ہے۔''

''میں اب مزید کسی وی آئی پی موومنٹ کا حصہ نہیں بنوں گی، مجھے یہاں سے کہیں اور جانا ہے نہ ہی جانے کی خواہش ہے، میں اپنی باقی کی عمر اس چار دیواری سے ٹکریں مارتے ہی گزار دینا چاہتی ہوں۔'' اس نے جواب میں لکھا۔

''چلو تم سے وعدہ رہا..... یہ وی آئی پی موومنٹ نہیں ہوگی..... حالانکہ تم صرف وی آئی پی موومنٹ نہیں، وی وی وی آئی پی موومنٹ کی مستحق ہو۔'' جواب میں مہر زاد نے اس کے پیغام کے دوسرے حصے کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''ہونہہ، دیکھتے ہیں یہاں سے کون جاتا ہے۔'' میرال نے غصے میں آتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ جگہ تمہیں اچھی لگی، چلو تمہیں یہاں ہی واپس آنے کے لیے ہی سہی جانا تو پڑے گا۔'' جواب آیا۔

''دیکھتے ہیں، کون جا کر واپس آتا ہے۔'' اس نے لکھا۔

''غصے میں بعض دفعہ تم بغیر سوچے سمجھے بول جاتی ہو، ہر بات یوں نہیں بول دیا کرتے، وقت کے غیظ سے ڈرنا چاہیے۔'' اس کے پیغام کے جواب میں اس بار مہر زاد کی کال آئی تھی۔

''اب ڈرنے کو رہ ہی کیا گیا ہے، کس انہونی سے ڈروں.....؟'' میرال نے تنک کر کہا۔ ''جو کچھ ہو چکا اس سے گزرنے کے بعد سب ڈر خوف دل سے نکل چکا ہے۔''

''ہاں، یہ بھی درست ہے۔'' جواب میں وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا تھا۔ ''شاید اب تمہارے ڈرنے کا دور ختم ہوا اور میرے ڈرنے کا دور شروع ہو گیا۔''

''آپ اور ڈر.....؟'' وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔ ''کیوں مذاق کرتے ہیں۔''

''جب تک انسان کے پاس کھونے کو بے وقعت چیزیں ہوتی ہیں وہ بے خوف رہتا ہے مگر جب کوئی قیمتی چیز اس کے ہاتھ لگ جاتی ہے تو وہ ایک پیہم خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے، ہاتھ لگی قیمتی چیز کے کھونے کا ڈر ہمہ وقت اسے آن گھیرتا ہے۔''

''میری سمجھ میں آپ کی باتیں نہیں آتیں.....'' وہ جھنجلا کر بولی۔

''تم دانستہ جن باتوں کی طرف سے سمجھ کے دروازے بند کر لیتی ہو وہ کیونکر سمجھ آئیں گی..... خیر یاد رہے ایک ہزار راتوں میں سے نصف سے بھی کم گزری ہوں شاید اور تمہارا دن طلوع ہونے کو ہے، مجھے اکثر تمہاری خوش قسمتی پر رشک آتا ہے۔''

''اس سے بڑا لطیفہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔'' میرال کی ہنسی میں تلخی تھی اور شکستگی بھی۔

''تم جلد ہی مذاق اور سنجیدگی میں فرق بھی جان جاؤ گی، بہر حال جمعے کا دن یاد رکھنا، اللہ میری مدد اور

رہنمائی فرمائیے۔'' مہرزاد نے کہا اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

''اشعر جب سے سیالکوٹ سے واپس آئے ہیں، تمہارے رینوویٹڈ گھر کی تعریف ہی میں رطب اللسان رہتے ہیں۔'' حمزہ سے بہت دن پیچھے ہونے والی اس ملاقات میں نگین نے اسے کہا تھا۔

''یہ اشعر بھائی کی گریٹ نیس ہے۔'' حمزہ مسکرایا۔ ''یہ بتاؤ وہ صرف گھر کی تعریف میں ہی رطب اللسان رہتے ہیں یا تمہاری تعریف بھی کیا کرتے ہیں کبھی۔''

''ارے گھر اور میں ایک لائن میں کیسے کھڑے ہوگئے، میں گھر کی بات کر رہی ہوں درمیان میں، میں کہاں سے آگئی؟'' نگین ہنسی۔

''دونوں کا کنکشن ہے اسی لیے پوچھ رہا ہوں۔'' حمزہ سنجیدہ تھا۔ ''کیا اشعر بھائی سیالکوٹ سے واپس آکر پہلے سے مختلف رویہ نہیں دینے لگے تمہیں۔''

''کیوں، کیا وہاں کوئی بات ہوئی تھی تمہارے اور اشعر کے درمیان؟'' نگین نے قیافہ لگانے کی کوشش کی۔

''ہاں......!'' حمزہ نے سر ہلایا۔ ''میں نے اشعر بھائی سے گلہ کیا تھا کہ انہوں نے تمہیں صرف گھر گرہستی تک محدود کر رکھا ہے جبکہ تم جتنی ٹیلنٹڈ اور سمجھدار ہو تمہارے مشاغل کا دائرہ وسیع ہونا چاہیے۔''

''ہوں......'' نگین مسکرائی۔ ''جب ہی اشعر مجھ سے کہہ رہے تھے کہ انہیں لگتا ہے وہ میری قدر نہیں کر پائے۔''

''اگیزیکٹلی......'' حمزہ نے فوراً کہا۔ ''وہ واقعی تمہاری قدر نہیں کر پائے۔''

''ایسا نہیں ہے۔'' نگین نے سادگی سے کہا۔ ''اشعر کو اچھی طرح پتا ہے کہ میں ان کے لیے اور ان کے گھر کے لیے کیا رول پلے کر رہی ہوں، کچھ لوگ فطری طور پر کم گو ہوتے ہیں، اپنے خیال کا اظہار نہیں کر پاتے لیکن جو جذبہ ان کے دل میں ہوتا ہے کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی عیاں ہو ہی جاتا ہے جیسے اشعر بھلے براہِ راست میری تعریف نہ کریں......ان کی کسی نہ کسی بات سے اظہار ہو ہی جاتا ہے اور میرے اطمینان کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔''

''کتنی بھلی لوگ ہوتی ہو تم ایسی لڑکیاں بھی......'' حمزہ کو ہنسی آگئی۔ ''نان ڈیمانڈنگ......ہمیشہ مطمئن و مسرور، کاش میں بھی ایسا ہو سکتا۔''

''تم ایسے نہیں ہو سکتے کیونکہ تم مرد ہو، جس کی فطرت ہی ڈیمانڈنگ ہوتی ہے اور کمانڈنگ بھی......مرد کی فطرت میں یہ دو عناصر موجود نہ ہوں تو وہ مرد نہیں ہوتا۔''

''مرد نہیں ہوتا تو کیا ہوتا ہے؟''

''پھر وہ عورت اور مرد کے درمیان کی مخلوق کی کوالٹیز کا حامل بہت ہی بے چارہ انسان ہوتا ہے۔''

حمزہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

''کیا بات ہے، آج خلافِ معمول بہت خوش نظر آ رہے ہو؟'' نگین چونکی......''میرال کا کچھ سراغ ملا کیا؟''

''دونوں سوالات کا آپس میں بظاہر تو کوئی تعلق نہیں نظر آتا پھر تم نے ایک ہی سانس میں کیوں کیے......؟'' حمزہ نے دانستہ سوال کیا۔

''یہ کاز اینڈ ایفکٹ کی تھیوری کے سوال ہیں، آپس میں بظاہر تعلق نظر نہیں بھی آئے تو بھی مربوط ہیں۔'' نگین شرارت بھرے انداز میں مسکرائی۔

''گویا میرال کا سراغ ملنا میری خوشی کا کاز ہو سکتا ہے۔'' حمزہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''پچھلے ایک عرصے سے تم جتنے اس کے لیے سرگرداں ہو اور کوئی سراغ نہیں ملنے پر مایوس اور دکھی نظر آتے رہے ہو، اس صورتِ حال میں تو یقیناً۔'' نگین نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو اور میں خود بھی نہ جانتا ہوں۔'' حمزہ بدستور مسکرا رہا تھا۔

''پھر بتاؤ میرال کا کچھ پتا چلا؟''

''ہاں، امید بندھی ہے، اللہ کرے یہ امیدِ نظر، سماعت اور دل کا دھوکا نہ ہو۔''

''واہ......یہ تو بہت بڑی خبر ہے، مٹھائی کھلاؤ۔'' نگین خوش ہوتے ہوئے بولی۔

''اکیلے مجھی کو نہیں، ہر اس شخص کو جو بنیادی انسانی حقوق کی پامالی کے خلاف، خواتین کی عزت و عصمت کی حفاظت اور بلند اخلاق و اطوار کی حمایت میں آواز بلند کرتا ہے اسے میرال کی ممکنہ بازیابی پر مٹھائی کھلانی چاہیے۔ چند سو صرف چند سو آوازوں نے اکٹھے بلند ہو کر اس ناممکن کو ممکن کر دکھایا ہے، کون کہتا ہے مسلسل گرتے پانی کے قطرے پتھروں میں سوراخ نہیں کر پاتے......؟'' حمزہ نے بلند آواز میں کہا۔

''امیزنگ......!'' نگین، حمزہ کا لہجہ سن کر متاثر ہوتے ہوئے بولی۔ ''تم تو خاصے دوکل ہوگئے ہو بھائی۔''

''ہاں، میں ہو گیا ہوں کیونکہ اتفاق سے میں ایسے لوگوں سے ملنے لگا ہوں جو دعاؤں کی قبولیت کے معجزوں کی عملی تفسیر ہیں اور ایسے لوگوں کی صحبت انسان کو حوصلہ دلاتی ہے، امید اور ایمان کا پیغام دیتی ہے......شاید میں تمہیں کبھی بتا نہ سکوں ایک صرف میرال کی تلاش نے مجھے کیسے، کیسے انوکھے تجربوں سے دوچار کرایا ہے۔'' حمزہ نے کہا۔

''مجھے نظر آ رہا ہے۔'' نگین مسکرائی۔ ''اپنی ممی کو ان باتوں کا قائل کر کے دکھاؤ گے تو معجزوں کی تاریخ میں ایک اور کا اضافہ ہو جائے گا۔''

''ہا......ہا......ہا......'' حمزہ دل سے ہنسا۔ ''تم مجھے چیلنج کر رہی ہو؟''

''یونہی سمجھ لو......وہ کسی گلاس فیکٹری کے مالک کی بیٹی سے تمہارا رشتہ جوڑنے کے لیے ایکسٹریملی میریس ہیں، ان کو مولڈ کر لو کہ وہ ایسا نہ کریں تو میں مان جاؤں تم نے کئی تجربے حاصل کر لیے ہیں۔'' نگین نے کہا۔

''ممی تو چلتی ہی مجھے اونچا اڑانے کے لیے ہیں، ان کی ضد کا کوئی علاج نہیں۔'' حمزہ مسکرایا۔

''دیکھ لو......بغیر استعمال کیے ہتھیار پھینک رہے ہو۔'' نگین نے اکسایا۔

''میں نے ہتھیار پکڑے ہی کہیں جناب میں تو دوا کا نہیں دعا کا قائل ہو چکا ہوں اب......''

''یہ بزدلی ہے یا مصلحت پسندی؟''

''اسے ایمان کہتے ہیں محترمہ......!''

''اللہ رے بے ایمانوں کو ایمان کا شوق چرایا ہے، خیر ہو اب تو سب کی۔'' نگین ہنستی چلی گئی۔ حمزہ محظوظ ہوتے ہوئے اسے ہنستے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس روز بچپن کے وہ دو گہرے دوست ایک دوسرے کو خوش دیکھ کر بہت خوش تھے۔

☆☆☆

''ارے بابا روتی کا ہے کو ہو، تمہارے رونے سے کیا بات میری سمجھ میں آجائے گی۔ بات کرو بات......بابا آنسو تو فدوی کو کبھی سمجھ میں آئے نہ آئیں گے۔''

”میں نے کتنی بار آپ سے رابطہ کرنا چاہا، آپ تک رسائی ممکن نہیں ہوئی، خود آپ نے جب سے صاحب شہید ہوئے ہیں ہماری خیر خبر تک نہیں لی۔“

”اب تم بولو گی میں سیریس نہیں ہوتا کبھی، خود بتاؤ اپنے صاحب کو شہید کہہ رہی ہو اور میں ہنسوں بھی نہیں، بی بی جان تمہارے منہ سے اس کے لیے یہ لفظ جچتا نہیں، تم سے زیادہ اس کے کرتوتوں سے کون واقف ہوگا۔“

”کرتوتوں سے تو خیر میں سب ہی کے واقف ہوں، جن میں سے کئی تو شہادت کا رتبہ پا کر اپنی موت کو قوم کی حیات قرار دلوا چکے ہیں۔ یہ جو آپ کا میڈیا ہے ناں اسی کی کسوٹی پر تو موت کی آزمائش ہوتی ہے، فرسٹ اسٹیپ پر یہ جسے شہید قرار دے، وہ شہادت کا رتبہ پا جاتا ہے، یہ شہادت پہلے آپ کے گھر پر راج کرتی تھی اب اپنا ایک حصہ ہمیں عطا کر گئی، جب ہی تو منہ پر چڑھ گئی۔“

”ہاں تو یوں بولو ناں منہ پر چڑھ گئی، اب میڈیا یا عام لوگوں کے سامنے تو منہ پر چڑھی منہ سے نکلے تو خیر ہے سائیں...... لیکن ہم جب آپس میں بیٹھے ہوں تو یہ منہ پر جچتی نہیں۔ اس حمام میں جو ہم سب کا مشترکہ ہے سب ہی بے لباس ہیں بی بی جان...... اور ایک بات اور شہادت جو ہمارے گھر پر راج کر رہی ہے ناں بڑی کرموں والی ہے، اسی کا دیا تو کھا رہے ہیں اور اگلی نسلوں تک کھاتے رہیں گے لیکن تمہارے صاحب والا سلسلہ کچھ اور ہے، اس کی سو کالڈ شہادت آج حال کل ماضی کا قصہ بن جانے والی ہے۔ اس کی شہادت کو کیش کرانے کے خواب مت دیکھنا، نقصان میں رہو گی بابا...... وہ مرنے والا بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ اہلِ علم و دانش کا سپوت ہے تو بس اس سپوت کی شہادت پر کالم، آرٹیکلز، فیچرز اور شاید ایک آدھی کتاب تو لکھی جائے گی اور اسے ادب و ثقافت کا لیجنڈ بنا کر اس کی تصویر شیشے کے فریم میں جڑ کر چائے خانوں، کتب خانوں اور اکیڈمیز کی دیواروں پر تو لگا دی جائے گی اس سے آگے اس کی شہادت کوئی فائدہ نہیں اٹھانے والی...... بہت سمجھاتا تھا اسے نہ پھر و پر پھیلائے مرغے کی طرح مگر وہ سمجھا نہیں، کہا تھا اس کو یہ چند سال ملے ہیں جمع کر لو جتنا کر سکتے ہو آنے والے سالوں کے لیے...... مگر نہیں مانا، سائیں دیکھو، جن کو لیجنڈ بننے کا شوق ہوتا ہے ناں انہیں لیجنڈ کی ہسٹری بھی تو معلوم ہونی چاہیے ناں...... لیجنڈز کی تصویروں پر ہار پھول تو ڈالے جا سکتے ہیں ان پر روپے نہیں لٹائے جاتے‘ لیجنڈز کو دھن دولت سے کیا مطلب سائیں۔“

”میں سب سمجھتی ہوں صاحب......“

”ہاں میرے کو معلوم ہے تو سب سمجھتی ہے، ایسے ہی تو تیری عقل کی داد نہیں دیتے بیٹھے یار لوگ۔“

”صاحب یہ آفیشل میٹنگ ہے، جہاں میں عدت سے اٹھ کر فریاد لے کر آئی ہوں، اِدھر تو تکار مت کریں، عزت کا سوال ہے۔“

”اوہ ہاں...... اچھا کیا یاد دلا دیا، اب بولو کیا کہنا ہے؟“

”صاحب، سرکاری رہائش گاہ کے کونے میں پڑے ہیں ہم لوگ، سینٹرل بلڈنگ میں وفاق کا نیا نمائندہ آ گیا، وفاقی حکومت کوئی مالی معاونت کرتی نظر نہیں آتی اور میرے بچے انصاف کے طلب گار ہیں ہر رات نئے چہرے انہیں نیا سبق پڑھانے آ جاتے ہیں، گرم لوہے پر چوٹ لگانے کی باتیں سناتے ہیں‘ وہ بچے ہیں، کانوں کے کچے ہیں نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی باتوں میں آ جاتے ہیں، بہت سمجھاتی ہوں مگر نا کام ہو جاتی ہوں، سردار زادے کو سبق سکھانے کا عہد کیے بیٹھے ہیں، شمال اور جنوب کی چٹانوں میں چھپے بیٹھوں سے اندر کھاتے رابطے ہو رہے ہیں، میں بے بس ہوں میری مدد کیجیے۔“

”باپ پہ پوت پتا پر گھوڑا...... دھت تیرے کی...... بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا، بڑے فخر سے کہتا تھا اہلِ علم و دانش کی اولاد ہوں، عقل بند نکلا اور اس کے پوت وہ جو اس کا دستِ راست تھا ناں جو اکثر اس کے ساتھ آیا کرتا تھا اور ابھی پچھلے دنوں بھی آیا تھا، اس کے پیر تو مجھے پالنے میں ہی نظر آ چکے، وہ بھلا دماغ سے تھوڑی سوچتا ہے‘ نخنوں سے سوچتا ہے، کسی اور کو تو کیا مجھے بھی چیلنج کر گیا، میں کہے دیتا ہوں اس کا آخیر اچھا نہیں ہوگا، سمجھا لو اسے۔“

”بتایا تو ہے بے بس ہوں نہیں سنتا، اسی لیے تو عدت توڑ کر میڈیا سے چھپ کر رات کے اندھیروں میں آپ تک پہنچی ہوں۔“

”اسے اس کے حال پر چھوڑ دو، بیٹیوں کو لے کر لندن سدھار جاؤ، وہاں اچھی بھلی پراپرٹی ہے تم لوگوں کی اور یہ نہیں تو اٹھ آؤ اِدھر ہی میرے پاس بہت جگہ ہے دل میں بھی اور گھر میں بھی۔“

”کیسے چھوڑ دوں اسے اس کے حال پر، وہ آگ میں ہاتھ ڈالنے کو تیار بیٹھا ہے۔“

”جب جلیں گے ہاتھ تو ہی پتا چلے گا ناں اس کو کہ جلنا کیا ہوتا ہے، اسے تجربہ کرنے کا شوق ہے اسے تجربہ کرنے دو...... رہا سردار زادہ تو بابا اسے چھیڑنے کی حماقت مت کرو تم لوگ، وہ ہاتھ نہیں آنے کا، اس کے اگلے قدم کو تو خود نہیں پتا ہوتا کہ کدھر کو اٹھنے والا ہے، اسے کیا پکڑو گے تم لوگ۔“

”کب چاہتی ہوں میں کہ اس پر کوئی ہاتھ ڈالے، اب باپ، بیٹوں کو ہی انتقام لینے کا سودا سمایا تھا۔“

”ارے ایک معمولی سی رکھیل کو لے کر منہ بنا کر بیٹھ گیا وہ اور جان سے بھی گیا اب یہ بیٹا تمہارا بالکل باپ کے قدموں پر قدم رکھ رہا ہے آخر برا ہوگا اس کا، میں پھر کہہ رہا ہوں......“

”وہ سردار زادے کی وجہ سے جان سے نہیں گیا، میں اور آپ تو خوب جانتے ہیں۔“

”فیس سیونگ کرنا سیکھو بی بی جان...... !تم کو کتنا سکھانے کی کوشش کرتا ہوں، تم سیکھتی ہی نہیں۔“

”گویا کوئی حل نہیں؟“

”نہ...... بالکل نہیں......“

”پھر میں عدت ختم ہوتے ہی انہیں لے کر دبئی چل دوں گی۔“

”دائز سو وائز...... اُدھر تو اپنا آنا جانا لگا ہی رہتا ہے، یہ ہی کوئی چیک اپ ویک اپ، کوئی نجی دورہ دورہ......“

“wait will be there”

”سو سویٹ آف یو بی بی جان۔“

☆☆☆

گھر واپسی پر بینش کو جس صورتِ حال کی توقع تھی، وہ اسے نظر نہیں آئی، نہ تو بھائی پستول کے ٹریگر پر انگلی رکھے اس کے منتظر تھے نہ ہی اماں چپل پکڑے اس پر جھپٹ پڑنے کو تیار تھیں...... اماں خاموش مگر خاصے مصروف انداز میں کچن میں کام کر رہی تھیں...... دو عورتیں، جنہیں محلے والے شادی بیاہ کے مواقع پر پیسے دے کر کام کرواتے تھے گھر کی صفائی اور خصوصی برتنوں کی دُھلائی میں مصروف تھیں۔

”کوئی مہمان آنے والے ہیں اماں؟“ کچھ دیر تک خاموشی سے صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد اس نے ڈرتے، ڈرتے اماں سے پوچھا۔

”بڑی تو چھنی کاکی ہے ناں...... تجھے تو پتا ہی نہیں جیسے۔“ اماں نے غصے سے کہا۔ ”کشمیریوں کے آسمان

پر ہمکلوں کی تھگلی لگانے کا منصوبہ بنا کر معصومیت سے پوچھتی ہے مہمان آنے والے ہیں کیا......؟'' اماں نے منہ بنا کر بینش کی نقل اتاری...... '' آرہے ہیں وہ تیرے لگتے لانے کوئی، وہ جو تیرے سوہرے بننے والے ہیں اور تیرے بھائیوں کو دوسری ہر بات بھولی ہوئی ہے۔ کہتے ہیں ذات برادری، کنبہ، قبیلہ، پرانی رسمیں ہیں، لڑکے کا خاندان' لہور (لاہور) کے پانچ بڑے خاندانوں میں سے ایک ہے، تو دیکھ لینا بینش تجھے نوکرانی بنا کر رکھنا ہے انہوں نے...... تجھے جو بڑے چا (شوق) چڑھے ہوئے ہیں ناں تو سارے چا جاتے ہی دور ہو جانے ہیں، اپنے آسمان سے اتر کر دوسرے کے آسمان پر جا سجنے کا ارمان کرنے والے تارے بڑی بری طرح ٹوٹ کر گرتے ہیں۔ پر میں کیا کروں میری چلتی کدھر ہے، ہائے اب میں تیرے ماموں اور چاچا کو کیا منہ دکھاؤں گی، ساری برادری نے تھو، تھو کرنا ہے مجھ پر...... بی صفیہ، یہ چینی کا ڈونگا ہے لوہے کا نہیں جو اتنی زور سے پٹخ رہی ہے، فرانس کا سیٹ ہے سچی چینی کا آرام سے رکھ اسے...... ان بے چاریوں کو کیا پتا برتن، برتن میں فرق ہوتا ہے یہ بے چاریاں اسٹین لیس اسٹیل کے بھانڈے (برتن) دھونے بلی (عادی) ہوئی ہیں......'' اماں کی روبینش کی متوقع سسرال والوں کے رونے، رونے سے چلتی کہیں اور بہہ گئی اور بینش کا دل خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔ اماں کے رونے کے درمیان ہی سہی اسے پوری صورتِ حال کا اندازہ تو ہو چکا تھا۔

''ہائے کیا اتنا بڑا کام اتنی آسانی سے بھی ہو سکتا ہے......'' اس نے اپنے کمرے میں جا کر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا عکس دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔ ''یوں جیسے جادو کی چھڑی چل گئی ہو، اوہ......'' اس نے دونوں ہاتھوں کو آپس میں بھینچتے ہوئے اوپر دیکھا...... ''میری قسمت کی مہربان پری، تمہارا بہت شکریہ، تم نے میرے لیے شہزادہ بھیج ہی دیا، کسی دوسرے دیس کا ہی سہی...... ہے تو شہزادہ ناں اور شہزادہ بھی ایسا کہ چہار دیس میں اس جیسا کوئی نہ ہو۔''

اس شام عافیہ، جہانگیر اور دانیال، بینش کے گھر پر مہمان تھے۔

''میں تو عرصہ ہوا طبقاتی فرق، ماحول کے فرق اور رہن سہن کے فرق پر یقین کرنا چھوڑ چکی ہوں، میرے لیے سب برابر ہیں، ایک جیسے انسان۔'' عافیہ نے بینش کی اماں کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے کہا تھا۔

''مگر بہن جی، آپ میں اور ہم میں بہت فرق ہے۔'' اماں نے دانیال پر نظر ڈالتے ہوئے ہچکچا کر کہا تھا۔ ''ارے واہ، یہ تو واقعی بانکا سجیلا شہزادہ ہے، پا ممتاز کے بیٹے تو اس کے سامنے کوئی مال ہی نہیں۔'' وہ دل ہی دل میں قائل ہونے لگی تھیں۔

''ارے بہن...... آپ کیسے فرق کی بات کرتی ہیں، میری تو اپنی اوقات کان میں جھاڑو کے تنکے پہننے کی بھی نہیں، میں دولت، پیسے، ٹھاٹھ باٹھ کا فرق کیسے فرق سمجھوں۔'' عافیہ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ ''آپ لوگوں پر تو خدا کا بہت فضل ہے، یقین جانیں میرا یہ بیٹا اگر مجھے کسی جھونپڑی میں بھی لے جاتا اور کہتا کہ وہاں وہ لڑکی رہتی ہے جس سے یہ شادی کرنا چاہتا ہے تو میں آنکھیں بند کر کے چلی جاتی۔ اللہ نے میرے اس بیٹے کو جو ''وژن'' عطا کیا ہے، بہن، اسے ہم ہی جانتے ہیں، آج ہم آپ کے در پر سوالی بن کر آئے ہیں، بس آپ خیر ڈال دیں ہماری جھولی میں۔''

''اے لو...... یہ اتنی بڑی رئیس بی بی کیسی غریب غربوں والی باتیں کرتی ہے۔'' اماں نے دل میں سوچا۔ ''کیا پتا خود بھی اس کا...... پیکا (میکا) ہمارے، تمہارے جیسا ہی ہو، جب ہی تو بیٹے کے انتخاب پر کوئی اعتراض نہیں اور دیکھو تو کلیم کہتا تھا پانچ بڑے خاندانوں میں سے ایک ہے ان کا خاندان اور اس بی بی کو دیکھو، دل

(وائل) کا جوڑا پہن کر آ گئی، یہ والا پرنٹ میں نے اچھرے میں بھی دیکھا تھا۔ بائیس سو سے زیادہ قیمت نہیں اس کی، اس سے اچھا تو میرا یہ چکن کا جوڑا ہے، ساڑھے چھ ہزار کا...... اللہ او روے میرے بیٹے اچھے سے اچھا پہناتے ہیں مجھے...... دل ہونا چاہیے بندے کا...... سچ ہے جو جتنا امیر ہوتا ہے اتنا ہی کنجوس بھی ہوتا ہے، کان، بازو، سب ننگے اس بی بی کے، میرے چار تولے کے کڑے کیسے لالچی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔'' انہوں نے آستین برابر کرتے ہوئے سوچا۔ ''لے پھر بینش شہزادہ تو تجھے مل گیا، پر دل والا نہیں لگتا، اس کی ماں تجھے جھاڑو کے تنکے ہی پہنائے گی اور کر من مانیاں، ماسے ممتاز نے تجھے سونے میں پیلا کر دینا تھا قسمے۔'' اماں کی سوچ کے زاویے پل، پل بدلتے ہی رہے اور عافیہ جہانگیر، بینش کو سالیٹر ڈائمنڈ کی انگوٹھی پہنا کر اس کے ہاتھ میں ایک خوب صورت سا پاؤچ پکڑا کر نشانی کر بھی گئیں۔ اماں کے بنائے کشمیری کھانوں کی تعریف کرتے وہ لوگ ان سے جلد ان کے ہاں آنے کا وعدہ لے کر رخصت ہو گئے۔ سلیم اور کلیم مہمانوں کے رخصت ہو جانے کے بعد خوشی کے مارے یوں گلے مل رہے تھے جیسے ان کے کاروبار کو ابھی سے جاگ لگ گئی ہو اور بینش کے تو شاید قدم ہی زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ دانیال جہانگیر سے بڑھ کر وہ اپنے لیے کیا مانگ سکتی تھی، وہ لڑکا جو قدرت کا عطیہ تھا، ایک چلتا پھرتا معجزہ تھا وہ جو اَن مولڈ بینش کو بہترین سانچے میں مولڈ کر لینے کا فن جانتا تھا...... وہی تو اس کا شہزادہ تھا۔

☆☆☆

''جمعہ دوپہر ڈیڑھ بجے انشاء اللہ......'' عافیہ کے فون پر اسی نامعلوم نمبر سے پیغام موصول ہوا جس پر نہ تو



واپس کال کی جاسکتی تھی نہ ہی اس پر پیغام کا جواب جاتا تھا۔ جمعے کی صبح کو ہی ان کا بڑا بیٹا عاصم اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پاکستان آرہا تھا۔

"کاش یہ جمعہ واقعی میرال کو ہمارے پاس لے آئے، ہم اس کی فیملی کی حیثیت میں اس کا استقبال کریں گے۔" عافیہ نے سوچا اور فہد اور حمزہ کو بھی اس خبر سے مطلع کرنے میں مصروف ہوئیں۔

☆☆☆

یشل نے مہرزاد خان کے ذاتی دفتر کی طرف سے موصول ہونے والے خیرسگالی کے تحفے، پھول اور ڈی ایچ اے میں پلاٹ کے کاغذات کی سبز فیتے میں بندھی سربہ مہر فائل وصول کرنے کے بعد حیرت سے سر جھٹکا۔ "مہرزاد خان اور ایسا کول رسپانس!" اسے یقین نہیں آرہا تھا جبکہ اس کا خیال تھا کہ استعفیٰ کے بعد اس کے اپنے پاؤں سے کھیٹر ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی یا پھر اس کے سامنے انتہائی پرکشش دانہ پھینک کر اسے واپس بلانے کی سعی کی جائے گی...... پہلا خیال روایتی خوف اور دوسرا سراسر خوش فہمی کا پیدا کردہ تھا لیکن اس کے دونوں ہی خیال غلط ثابت ہوئے تھے۔ مہرزاد خان کے دفتر سے اسے باقاعدہ خدا حافظ کہہ دیا گیا تھا۔ حسب معمول ایک ایسا عمل جس کی پیش گوئی کرنا ناممکن تھا۔ مہرزاد خان، مخالفین کو معاف کردینے کا عادی تھا یا ان کے راستے میں پھول بچھا کر انہیں اپنا بنا لینے کا؟ کوئی ایسا فارمولا یا پیمانہ یشل کے ہاتھ نہیں لگا تھا جو مہرزاد خان کے مخالفین کے بارے میں نقطۂ نظر اور طریقۂ عمل کو جانچ سکے لیکن جس طرح بھی وہ مخالفین کے لیے سوچتا تھا آخر میں وہ پورے منظرنامے پر چھایا ہوا ہی نظر آتا تھا۔

"لیکن میرا معاملہ مختلف ہے سردارزادہ مہرزاد خان!" یشل نے وصول کردہ تحائف پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔ "میں تمہارے اس جیسچر آف گڈول، کو ممنونیت کی نظر سے نہ دیکھ پاؤں گی کیونکہ مجھے انہیں رد کرکے آگے بڑھ کر کا نتیجہ دیکھنے کا شوق ہونے لگا ہے۔ جب شکار جال میں کسی طرح بھی پھنس نہیں پاتا تو تم کیا کرتے ہو مجھے یہ دیکھنا ہے......"

"چلو ایک promising statesman کا جادو تو تمہارے سر سے اترا۔" اس کے استعفیٰ کی خبر پر ایک معروف تجزیہ نگار جو اس کا قریبی دوست بھی تھا، نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ لوگ جتنے بھی مختلف نظر آنے کی کوشش کریں، ان کی جڑیں، ان کی پرورش اور ان کے ذہن کی نشوونما ایک سے خطوط پر ہوئی ہوتی ہے۔ نظام کے باہر بیٹھ کر نظام بدلنے کی بات اور دعویٰ کرنا، نظام کے اندر جاکر اس کا حصہ بن جانے سے اجتناب بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ تم نے دیکھا اس نے کتنی کوشش کی مگر خود کو بچا نہیں سکا۔"

"مہرزاد خان سے میری مایوسی کی وجہ یہ نہیں کچھ اور ہے۔" یشل نے جواب دیا۔ "ایک ذاتی معاملے کو حل کرنے کے لیے صرف ایک ذاتی معاملے کے حل کے لیے لکھوں کو جل دینا میرے اور اس کے اختلاف کی اصل وجہ ہے۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔ "ایسا بھی کیا کہ ایک فرد کے لیے کل اجتماع کو داؤ پر لگا دیا جائے اور اس ایک فرد کی خاطر اس نے اپنی موجودہ پوزیشن کو کس، کس طرح استعمال کیا، اس کی کہانی تو میں بے نقاب کروں گی۔"

"اور تمہارا خیال ہے وہ کرنے دے گا؟" تجزیہ نگار نے ...... استہزائیہ انداز میں کہا۔ "کم از کم مجھے آنے والے وقت میں ایسا کوئی سین نظر نہیں آرہا کہ مہرزاد خان کو کوئی چیلنج کرسکے۔ نظام سے سمجھوتا کرتے

ہوئے اس نے اپنے پنجے نظام پر کچھ یوں جما لیے ہیں کہ اب تو اس کا بڑا صاحب بھی اس کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ حالیہ مثال وہ قتل ہے جسے "شہادت" کی چادر اوڑھا دی گئی۔ کتنوں کو معلوم ہے کہ کس کے "اثر" کے سامنے پرانے تعلق کو "قربان گاہ" پر چڑھا دیا گیا۔"

"یہی تو......" یشل نے دانت پیسے۔ "الفاظ اور القاب کی ان خودساختہ چادروں کو ہی تو ان میں پوشیدہ "سچائیوں" پر سے نوچ پھینکنا ہے مجھے۔"

"اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو...... مجھے تمہارا مستقبل مخدوش لگ رہا ہے، یوں بھی ہوسکتا تھا کہ پھولوں، تحائف اور پلاٹ کی فائل کے ساتھ ایک نمائشی ریوالور بھی بطور تنبیہی علامت تمہیں بھجوایا جاتا اگر ایسا نہیں ہوا تو غنیمت جانو اور اپنی زندگی انجوائے کرو...... زندگی قیمتی چیز ہے اسے ایسی "سچائیوں" کو بے نقاب کرنے کے شوق میں کھو دینا حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

"شوق کی کوئی قیمت نہیں ہوتی انکل!" یشل نے بال برابر بھی متاثر نہ ہوتے ہوئے کہا۔ "ہاں جنون کی قیمت ضرور ہوا کرتی ہے اور ادا بھی کرنی پڑتی ہے اور اس کے لیے میں تیار ہوں۔" اس کے لہجے میں عزم تھا اور پختگی بھی......

وہ مہرزاد خان کو باور کرا دینا چاہتی تھی کہ دنیا میں ایسے بھی تھے جو اس سے زیادہ سرپھرے اور موت سے بے نیاز تھے، ہر کسی کو خیرسگالی، دشمنی، تنبیہہ یا طاقت کے زور پر خاموش کرا دینا ممکن نہیں...... مہرزاد خان کے بقول اس نے اسے پیڑ پر چڑھنا نہیں سکھایا تھا اور اب اسے ہر حال میں کسی بھی طرح پیڑ پر چڑھنا تھا۔ پیڑ سے چمٹ کر رینگ، رینگ کر، سرک، سرک کر یا پھر رسی کے سہارے...... لیکن وقت کا منصوبہ اس کے منصوبے سے کتنا مختلف تھا اس کا ادراک اسے اس شام ہوا جب وہ ایک نامور بیوروکریٹ کے ہاں ہاؤس وارمنگ پارٹی پر مدعو تھی۔ رنگوں اور روشنیوں سے جگمگاتے اس نوتعمیر شدہ محل کے وسیع لان میں مدھر موسیقی کی لہریں ہوا کے سنگ سب طرف...... بکھر رہی تھیں...... بے شمار شناسا چہرے، قیمتی لباس، بیش قیمت زیورات، جدید ہیراسٹائل اور میک اپ میں سجی خوب صورتیاں اس کے سامنے تھیں اور وہ خود بھی بہت دنوں بعد فریش موڈ میں اِدھر اُدھر گفتگو میں مصروف، وقت سے لطف اٹھا رہی تھی۔ جب ہی اچانک موسیقی کی آواز مدھم ہوئی، خوش گپیاں چہ مگوئیوں میں تبدیل ہوئیں اور ہنستے مسکراتے چہروں پر عجیب سی سراسیمگی پھیلتی دکھائی دینے لگی۔

"کیا ہوا......؟" کسی انہونی کے احساس سے مغلوب ہوتے ہوئے اس نے بوکھلا کر کسی سے پوچھا تھا۔

"انفارمیشن منسٹر مہرزاد خان کی گاڑی پر حملہ ہوا ہے اور اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ بچا یا نہیں...... اس کا محافظ جو ڈرائیو بھی کررہا تھا کے مارے جانے کی تو مصدقہ اطلاعات آرہی ہیں۔" اسے کس نے جواب دیا تھا یہ اُسے پتا نہیں چلا تھا مگر اسے یہ یاد تھا کہ یہ خبر سننے کے بعد رنگوں اور روشنیوں کا سیلاب تاریکی میں ڈوبنے لگا تھا...... مہرزاد خان کے متعلق اسے سبق سکھا دینے کے دعوے، اڑ کر کہیں دور جا گرے تھے یا ہواؤں ہی میں بکھر کر رہ گئے تھے۔ اسے یاد تھا تو بس اتنا کہ اس کا دل مہرزاد خان کی خیریت اور سلامتی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ وہ تھا تو اس سے اختلاف بھی تھا، اگر وہ نہیں رہا تھا تو جو بھی اس کے بارے میں ذہن میں آرہا تھا وہ محض اس کی خوبیاں تھیں، اس کی دلیری، اس کی ذہانت، مستقل مزاجی، خاموشیوں میں چھپے طوفان، کسی عظیم سپہ سالار کی طرح سامنے سے تیر کھانے کا حوصلہ، اس کی گفتگو جس میں دلائل ہوتے، تعقل ہوتا اور دوسرے کو خود سے متفق کر لینے کا وصف بھی، چہ مگوئیوں، آئی فونز، اسمارٹ فونز، بلیک بیریز، سٹیلائٹ فونز پر اِدھر سے اُدھر معلومات منتقل ہونے کے ساتھ ساتھ چند لمحوں کی سراسیمگی کے بعد پارٹی پھر اُسی جوش سے جاری تھی...... مگر بہت دنوں کے

بعد خود کو فریش محسوس کرنے والی ییشل کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

''کیا انسان کی صرف اتنی وقعت ہے کہ اس کے مرنے کی خبر پر بس دم بھر کو ہنگامہ رکے اور پھر سے شروع ہو جائے ؟'' اس نے رنگ و نور کے اس سیلاب سے گھبرا کر باہر نکلنے کے بعد سوچا تھا۔ باہر سڑکوں پر روشنیوں اور اندھیروں کے امتزاج کے درمیان زندگی رواں دواں تھی۔ اس نے اپنے فون کی اسکرین آن کی..... اس کے فون پر مختلف دوستوں کے پیغامات آئے ہوئے تھے۔

''خبریں متضاد اور کنفیوز کن ہیں، کچھ کا خیال ہے کہ وہ مر چکا ہے مگر بتایا نہیں جا رہا۔ کچھ کہہ رہے ہیں اسے غائب کر دیا گیا ہے کیونکہ جائے حادثہ سے اس کی گاڑی پُر اسرار طور پر غائب ہو چکی ہے لیکن اس کا ڈرائیور جو آج اس کے ساتھ دیکھا گیا تھا کی لاش سرکاری اسپتال میں وصول کی جا چکی ہے۔ عجیب پُراسرار صورت حال ہے۔'' اس کی ایک دوست جو وزارتِ داخلہ سے منسلک تھی نے خبر دی تھی۔

''نہیں!'' ییشل نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اپنے ہینڈ فری پر کسی سے بات کرتے ہوئے کہا تھا۔

''اسے موت نہیں آنی چاہیے، وہ بہت سوں کی طرح جاتا ہوا لگتا تھا مگر وہ بہت سوں سے مختلف تھا۔ اسے زندہ رہنا چاہیے کیونکہ اس کی زندگی سے زندگی کا ایک معجزہ مشروط ہے۔'' وہ جو کہہ رہی تھی اس کا مفہوم صرف وہ جانتی تھی مگر وہ جو کہہ رہی تھی اسے کہتے ہوئے وہ پاگلوں کی طرح رو رہی تھی یہ اس کی مخاطب بھی جانتی تھی۔

☆☆☆

''نیلور سے اسلام آباد جاتے ہوئے سردار زادہ مہر زاد خان کی گاڑی پر نامعلوم افراد کا حملہ، اس حملے میں وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات کا ذاتی ڈرائیور مجید خان مارا گیا سردار زادہ مہر زاد خان کی اس گاڑی میں موجودگی کی تا حال تصدیق نہیں ہو سکی۔'' الیکٹرانک میڈیا پر نیوز چینلز دوپہر بارہ بجے سے شام تک یہ بریکنگ نیوز اور اس پر ہونے والے تبصروں اور تجزیوں کے سوا کچھ اور پیش نہیں کر پائے تھے۔

''سردار زادہ مہر زاد خان، اپنی ذاتی مصروفیات کی وجہ سے آج رحیم یار خان میں ہیں، جس گاڑی پر حملہ ہوا اس میں صرف مجید خان موجود تھا جسے وہ گاڑی چند روز قبل ہی سردار صاحب نے تحفے کے طور پر دی تھی..... مجید خان کا کسی سے یہ ذاتی اولڈ اسکور تھا جسے آج پورا کیا گیا۔ سردار زادہ صاحب بفضلِ تعالیٰ محفوظ ہیں اور بالکل خیریت سے ہیں۔'' رات گئے وزارتِ اطلاعات و نشریات کے ترجمان نے ایک پریس ریلیز جاری کرتے ہوئے کہا تھا۔

جس وقت ٹی وی چینلز اور پریس کلبز سے لے کر عام ریستورانوں، چا خانوں اور گھروں کے لاؤنجز میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے والے عام عوام کے تبصرے جاری تھے اسی وقت اسلام آباد سے لاہور جانے والی موٹر وے پر موجود ٹریفک میں ایک عام گاڑی بھی اپنی منزل کی طرف رواں تھی جس کے سوار مجید خان کی گاڑی سے نکل کر اس دوسری عام نمبر والی گاڑی پر سوار ہوئے تھے۔ گاڑی ڈرائیو کرنے والے کے بازو پر پٹی بندھی تھی اور اس کے چہرے پر تکلیف کی شدت کے آثار بھی تھے۔ عام گاڑیوں کے درمیان چلتی یہ گاڑی یقیناً وی آئی پی موومنٹ نہیں کر رہی تھی۔ اسے اپنی منزل تک پہنچنے میں اگرچہ تاخیر ہو چکی تھی مگر اسے بہر حال اُسی روز وہاں پہنچنا تھا کیونکہ وہ وعدہ کیے گئے جمعے کا روز تھا۔

☆☆☆

''ان سے ملو نادر..... یہ شہباز صاحب اور ان کی بیگم ہیں.....'' زوئی نے گھر کے مختصر سے ڈرائنگ روم

میں بیٹھے دو مہمانوں کا نادر سے تعارف کرواتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ.....'' نادر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے زوئی کی طرف دیکھا۔

''میں نے تمہیں بتایا تو تھا نادر... وہ یہی شہباز صاحب ہی تو تھے جنہوں نے مجھے اور میرال کو پناہ دی تھی سیالکوٹ جاتے ہوئے۔ تمہاری ایجنسیز والے ان کے بھی پیچھے پڑے ہوئے ہیں، یہ لوگ بے چارے کبھی ایک جگہ کبھی دوسری جگہ چھپتے پھر رہے ہیں، بہت ڈرے ہوئے ہیں، یہ بہت معصوم اور سیدھے سادے لوگ ہیں۔'' زوئی نے تاسف کے ساتھ بتایا تھا۔

''انہیں ہمارے گھر کا پتا کیسے معلوم ہوا.....؟'' نادر نے ہولتے دل کے ساتھ پوچھا۔

''انہیں کیسے معلوم ہونا تھا، میں نے خود بتا کر انہیں یہاں بلوایا ہے۔'' زوئی متوقع صورتِ حال سے بے خبر بتا رہی تھی۔ ''بڑی مشکل سے ان سے رابطہ ہوا تھا۔ میں نے اس روز بتایا تھا ناں تمہیں، ان کی صورتِ حال سن کر مجھے بڑا دکھ ہوا، اس لیے میں نے انہیں یہاں بلا لیا۔ ہماری بیسمنٹ میں رہ لیں گے چھپنا ہی ہے ناں.....''

''اوہ میرے خدا..... زوئی.....'' نادر کا دل چاہا وہ اپنا سر پیٹ لے۔ پچھلی مصیبت ختم نہیں ہوئی تھی زوئی نے اپنے لیے ایک نئی مصیبت کھڑی کر لی تھی۔

''تم ذرا باہر آؤ۔'' وہ زوئی کو گھورتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ نادر کی بداخلاقی پر شرمندہ ہوتی زوئی کمرے سے باہر آئی۔

''وہ ایجنسیز والے تمہاری جان ابھی تک نہیں چھوڑ رہے، اگرچہ وہ اس کیس سے کچھ نکال نہیں پائے لیکن وہ لوگوں کو تنگ کرنے کے عادی ہیں جانتی ہو ناں..... پھر کیا ضرورت تھی، کیا ضرورت تھی تمہیں ان لوگوں کو بھی یہاں بلا لینے کی.....؟'' نادر زوئی کے باہر آتے ہی چیخنے لگا تھا۔

''آرام سے نادر.....'' زوئی گھبرا کر بولی۔

''کیا آرام سے.....؟'' نادر نے بھنا کر کہا۔ ''زوئی ان لوگوں کے پیچھے بھی وہ پڑے ہوئے ہیں اور تمہارے بھی، تم تینوں ایک جگہ اکٹھے ہو جاؤ گے تو سوچو کیا نقشہ بنے گا ان کے ذہن میں، وہ کیا، کیا کڑیاں نہیں ملائیں گے۔''

''لیکن انہیں کیسے پتا چلے گا کہ یہ یہاں ہیں ؟'' زوئی کو نادر کی بات سمجھ آنے لگی تھی۔ پھر بھی اس نے ایک کمزور سا سوال کیا۔

''انہیں کس بات کا پتا نہیں ہوتا زوئی..... تم سے زیادہ کون جانتا ہوگا۔'' نادر نے بے بسی سے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

''وہ پہلے کون سا ہمیں بخش رہے ہیں نادر.....'' زوئی نے ایک بے بس سی دلیل دینے کی کوشش کی۔

''کاہے کو جھگڑ رہے ہو اس بے چاری سے۔'' نادر کی اماں نہ جانے کدھر سے ہمیشہ کی طرح زوئی کے لیے فرشتہ بن کر کمرے میں آ گئیں۔

''پلیز اماں اس وقت اس کی حمایت مت کیجیے گا، آپ نہیں جانتیں اس نے.....'' نادر کو واقعی زوئی پر غصہ آ رہا تھا۔

''میں سب سن چکی ہوں، خدا کا خوف کرو نادر، مہمان تو رحمت ہوتے ہیں، کیا پتا اسی رحمت کے باعث تمہاری جان بھی اس منحوس ماری مصیبت سے چھوٹ جائے۔ چلو زوئی چل کر مہمانوں کے کھانے پینے دھونے

کا انتظام کرتے ہیں۔'' اماں، زوئی کا بازو پکڑ کر اسے باہر لے گئیں...... نادر بے چارگی سے دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

اس کی آنکھیں وحشت اور دہشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ ہونٹ سفید پڑ رہے تھے اور بال بکھر چکے تھے۔ اس روز جو خونیں ڈراما وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی، اس کی دہشت سے اسے مہر زاد خان کی موجودگی بھی باہر نہیں نکال پا رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے مجید خان کو مرتے دیکھا تھا، مجید خان جو اُسے اس ٹھکانے سے لے کر چلا تھا جہاں وہ اتنے دن سے رہ رہی تھی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح بار بار سوال کیا تھا وہ کہاں جا رہا ہے جا اسے کہاں لے کر جایا جا رہا ہے ؟ جواب میں مجید خان پہلے کی طرح...... ''ہم حکم کے غلام ہیں بی بی صاحب، اشارے کے منتظر، ہمیں اس سے آگے نہ تو کچھ بولنے کی اجازت ہے نہ بتانے کی۔''

اس روز مجید خان نے اسے یہ بھی تو بتایا تھا کہ اس بار اس کی آنکھوں پر پٹی باندھنے کا حکم نہیں دیا گیا اور وہ کسی ائر پورٹ کی طرف بھی نہیں لے جائی جائے گی، اسے یاد تھا صرف اپنا ذہن بٹانے کی خاطر اس نے مجید خان سے پوچھا تھا کہ اس کے کتنے بچے تھے اور اس کی فیملی کہاں رہتی تھی۔ مجید خان نے یہ بھی بتایا تھا کہ اسے نوکری سے آزادی مل چکی تھی اور میرال کو بتائی گئی منزل پر پہنچانا اس کا آخری ٹاسک تھا، اس کے بعد وہ اپنے بیوی، بچوں کے پاس جانے والا تھا۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ اس نے مجید خان سے اس دوسرے شخص کے بارے میں پوچھا تھا جس کی باتیں اس نے آنکھوں پر پٹی باندھ کر کیے جانے والے سفر کے دوران سنی تھیں۔ مجید خان نے اسے بتایا تھا کہ وہ دوسرا شخص اپنے عزم میں کامیاب رہا تھا اور اپنا ٹاسک پورا کر چکا تھا۔ کون سا ٹاسک اور کیا ٹاسک اس کی نشان دہی اس نے نہیں کی تھی۔ وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ جب گاڑی پر فائرنگ شروع ہوئی تھی۔ گاڑی کے پہیے برسٹ کر گئے اور گاڑی کے رکنے پر نہ جانے کیسے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا گیا تھا، مجید خان اکیلا اور نہتا تھا۔ اس نے مزاحمت کی کوشش کی تھی مگر وہ کیا اور کتنی مزاحمت کرتا...... اس کے سر اور گردن میں گولی لگتے اس نے خود دیکھا تھا، خون کی دھاریں مجید خان کے سر اور گردن سے پھوٹی تھیں اور پل کی پل میں وہ خون میں نہا کر دوسری سیٹ پر جا گرا تھا۔ میرال کو یاد آیا کہ وہ کلمہ پڑھ چکی تھی جب اس کی سائڈ کا دروازہ کھول کر کسی نے اسے باہر کھینچا تھا اور ایک پل کے ہزارویں حصے میں وہ کسی دوسری گاڑی میں پھینک دی گئی تھی۔ اس کا سر کسی چیز سے ٹکرانے سے وہ بے ہوش ہوئی تھی یا خوف اور صدمے سے یہ اسے یاد نہیں تھا...... مگر جب اس کی آنکھ کھلی وہ ایک گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لیٹی ہوئی تھی اور اس گاڑی کو کوئی اور نہیں خود مہر زاد خان چلا رہا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے پچھلا پورا منظر گھوم گیا تھا۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے...... وہ سب کیا تھا؟'' اس نے ہوش میں آتے ہی اٹھ کر پوچھا تھا۔

''وہ وہی تھا جس کا مجھے ڈر تھا۔ وہی جس سے بچنے کی خاطر میں نے اتنا سیاوہ پلان بنایا کہ جس کی کسی کو خبر ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا...... لیکن غلطی میری ہی تھی، میں بھول گیا تھا کہ سانپ کا بیٹا سنپولیا ہوتا ہے اور سنپولیے کی صفات بھی سانپ سے کم نہیں ہوتیں۔'' وہ بغیر تمہید باندھے بولا تھا۔ ''مگر ہے ناں سنپولیا، صرف دودھ پر پلنے والا سنپولیا...... بھول گیا کہ سنپولیے کے لیے تو صرف نیولا ہی کافی ہوتا ہے، پلان بی کا دھوکا کھا گیا، پلان اے اس کے وہم میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔''

''یہ سب کیا ہے، میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آ رہی......؟'' وہ سر جھٹکتے ہوئے بولی تھی۔ مجید خان اسے پھر سے یاد آیا۔ ''مجید خان کہاں ہے، اس کا کیا بنا؟''

''مر گیا......'' وہ تلخی سے بولا۔ ''اسے بھی اپنی سی کرنے کی مار پڑی، لاکھ سمجھایا تھا چھوٹی گاڑی پر نکلنا اسے منسٹر کی عطا کردہ گاڑی کا خمار چڑھا تھا عین وقت پر ارادہ بدل گیا، نیت کے فتور کی سزا پا گیا احمق۔''

''وہ مر گیا اور آپ یہ بات اتنی آسانی سے کہہ رہے ہیں۔'' میرال کی آنکھیں وحشت زدہ ہوئیں اور پھر مہر زاد خان کے بازو پر ٹک گئیں جس پر بندھی پٹی سے خون ابھی تک رِس رہا تھا یوں جیسے عجلت میں ادھوری اور بیکار سی فرسٹ ایڈ لینے کے بعد اس کی پروا ہی نہیں کی ہو۔ ایک ہی دن میں ایسے جیتے جاگتے انسانی خون کو یوں بہتے دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہوئے جا رہے تھے۔

''ایک اچھے بھلے صحت مند انسان کا یوں مر جانا آپ کے لیے معمولی بات ہے کیا......؟'' اس نے وحشت زدہ انداز میں کہا۔

''میرے لیے اس وقت سب سے اہم بات یہ ہے کہ تم بچ گئیں؟ تمہارے وفاع میں، میں خود بھی مر جاتا تو یہ اتنی ہی آسان بات ہوتی جتنی مجید خان کے مرنے کی ہے۔'' اس نے بیک ویو مرر میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی نظروں سے میرال کی نظریں ٹکرائی تھیں اور اسے جیسے ایک دھچکا سا لگا تھا۔ اس شخص کی نظروں میں کیا تھا... سوال تھے...... جواب تھے...... کہانیاں تھیں...... قصے تھے...... داستانیں تھیں...... فسانے تھے...... کیا تھا' جس نے اسے فوری طور پر نظریں چرا لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

''ہم لاہور شہر میں داخل ہو چکے ہیں۔'' اس کی آواز گاڑی میں گونجی تھی۔ ''نہ جانے کتنے عرصے کے بعد خود کسی پروٹوکول کے بغیر گاڑی ڈرائیو کر کے یہاں پہنچا ہوں، بہت سے پرانے وقت یاد آ گئے۔''

میرال نے بے ساختہ کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کی، کھڑکی کے شیشے سیاہ تھے، ونڈ اسکرین کا اوپری حصہ بھی سیاہ تھا اور نیچے کا شیشہ ٹنٹڈ تھا۔

''آپ کی نیلی ستی میری رہنمائی کر رہی ہے، میں آپ کے پیچھے ہی آ رہا ہوں۔'' پھر اس نے فون پر کسی سے کہا تھا۔ اگلے آدھے گھنٹے تک صبر آزما خاموشی چھائی رہی اور پھر جیسے گاڑی کسی عمارت میں داخل ہو رہی تھی۔ گیٹ کھلنے کی آواز میرال نے خود سنی تھی۔ کسی ایک جگہ جا کر گاڑی رک گئی تھی اور فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر مہر زاد خان باہر نکلا تھا۔

''ہم نے حادثے کی خبر سنی، میرا تو دم اوپر کا اوپر، نیچے کا نیچے رہ گیا۔'' ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ میرال کے کان کھڑے ہو گئے۔ ''اب کیا ہونے والا ہے؟'' پھر اس کی سائڈ کا دروازہ کھولا گیا اور مہر زاد خان نے اندر جھانک کر اس سے کہا۔

''باہر آ جاؤ میرال، تم آگ کے دریا کے کنارے بسی بستی تک پہنچ چکی ہو، یہاں' جہاں زندگی اپنی تمام تر خوب صورتیوں کے ساتھ بسی نظر آئے گی۔''

وہ اس سے نظریں ملائے، اس کی طرف دیکھے بغیر کسی معمول کی طرح گاڑی سے باہر نکل آئی تھی۔ یہ ایک وسیع اور عالی شان گھر کا ڈرائیو وے تھا۔ جس پر اس کے سامنے کتنے ہی لوگ کھڑے تھے۔ اس کے قدموں تلے سرخ قالین بچھا تھا اور سامنے کھڑے لوگوں کے ہاتھ میں پھولوں کے گلدستے تھے، ان کی آنکھوں میں محبت تھی، آنسو تھے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''ویلکم بیک میرال...... ویلکم بیک ٹو لائف......'' ایک ہنستی مسکراتی لڑکی اور ایک بڑی عمر کی خاتون نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ سب چہرے اس نے پہلے بھی دیکھ رکھے تھے، کہاں...... خواب

میں...... یا خیال میں...... اس کا ذہن ایک بار پھر ماؤف ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

"its so heartening to know that you are ok" اس کو موصول ہونے والی لاتعداد کالز اور پیغامات میں ایک پیغام نیشل رئیس کا بھی تھا۔ جسے پڑھ کر وہ زیرِ لب مسکرایا تھا۔

"its so heart'ening to know that you are happy on the sur)vival of a so called black sheep"

اُس نے اسی وقت نیشل کے نمبر پر واپس جواب بھیجا تھا اور یہ واحد جواب تھا جو اس نے اپنی خیریت دریافت کرنے والے کسی پیغام پر بھیجا تھا۔

☆☆☆

"میں عافیہ جہانگیر ہوں اور یہ میرے ہزبینڈ جہانگیر سہگل......"

"میں عاصم جہانگیر اور یہ میری وائف شاندانہ......"

"مجھے دانیال جہانگیر کہتے ہیں۔"

"میں حمزہ محمود ہوں۔"

"اور میں فہد صدیقی......"

ان سب نے جو اس کے سامنے بیٹھے تھے اپنا تعارف اس سے کروایا تھا، شاید ان میں سے کوئی چہرہ بھی نامانوس نہیں تھا مگر شاید وہ سب کے سب اجنبی تھے۔ فاصلے پر کھڑے اجنبی اور اس کمرے میں موجود فقط ایک ہی بہت مانوس چہرہ اس کے بالکل ساتھ کھڑا تھا۔

"عافیہ آنٹی......!" بواجی کی وہ حادثاتی سہیلی جنہیں صوفی صاحب جیسے مشترکہ نکتے نے آپس میں ملایا۔

"دانیال جہانگیر......" وہ لڑکا جسے کئی برس پیچھے اس نے بے حس وحرکت اسپتال کے بیڈ پر زندگی بچانے والی مشینوں سے جُڑے دیکھا تھا اور جس کے بارے میں اس نے فتویٰ دیا تھا کہ اگر وہ بچ گیا تو اس نئے دور کا frankenstein ہی بنے گا۔

"حمزہ محمود......" وہ مسکین طبع، کم گو لڑکا جو بواجی کی بچپن کی سہیلی بی اماں کے ساتھ ان کے گھر ایبٹ آباد آیا کرتا تھا۔ جو بہت ذہین تھا اور اسے مضمون لکھ کر دیا کرتا تھا۔

"فہد صدیقی......" اس کے بچپن کا دوست، ٹینس کورٹ کا ساتھی، ذہین، لائق، ایکٹو، بریلینٹ اسٹوڈنٹ فہد صدیقی جس سے آگے نکلنے کی کوشش میں وہ بے حال ہو، ہو جایا کرتی تھی۔

وہ سب اس کے سامنے موجود تھے اور ان کے بارے میں اسے بتایا گیا تھا کہ وہ سب اسے ہی تلاش کرتے ایک فورم پر اکٹھے ہوئے تھے۔

"آپ فکر نہیں کریں بی بی، میرال کی حفاظت کے لیے ہم نے خصوصی دعا کی ہے، یہ زندگی کی ہر مشکل اور ہر امتحان سے یوں نکلے گی جیسے مکھن سے بال نکلتا ہے۔ اسے ایسی، ایسی جگہ سے مدد اور محبت ملے گی جہاں سے اس کا یہ تصور بھی نہ کرسکتی ہوگی۔" صوفی صاحب نے بواجی سے فرمایا تھا، آنسو مسلسل اس کی آنکھوں سے بہے چلے جارہے تھے، یہ آنسو ان اذیتوں کی یاد کے تھے جن سے وہ گزری تھی یا ان راحتوں کے شکرانے کے جن سے وہ اس روز دوچار ہوئی تھی۔ کیا واقعی یہ وہ بستی تھی جو آگ کے دریا کے دوسرے کنارے پر بستی تھی اور

جہاں زندگی اپنی تمام تر خوب صورتیوں کے ساتھ موجود تھی۔ اس نے بے یقینی سے ان سب کو دیکھا تھا۔ کیا اب زندگی میں کوئی امتحان، آزمائش، کڑا وقت اور اذیت نہ ہوگی....؟ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ ہاں ان میں سے کوئی بھی چہرہ نامانوس نہیں تھا مگر ایک عجیب سی اجنبیت کا احساس تھا۔ ایسے میں کمرے میں موجود صرف ایک چہرہ ہی مانوس لگ رہا تھا اور وہی چہرہ اسے اپنے ساتھ بھی کھڑا محسوس ہورہا تھا اور وہ چہرہ مہرزاد خان کا چہرہ تھا۔

☆☆☆

''میں نے آپ سے کہا تھا صاحب، فریاد کی تھی آپ سے کہ وہ میرے بچوں کو ورغلا رہے ہیں، میرے بچے انجان اور ناتجربے کار ہیں انہیں سمجھائیں۔ آپ نے ان سے کچھ نہیں کہا، دیکھا وہ اس معصوم کو ورغلا کر اٹھا لے گئے۔''

''وہ کسی کے کہنے میں تھا کہاں بی بی جان......؟ اس کا آخیر اچھا نہیں ہوگا اسے سمجھاؤ کہا تھا ناں دیکھا وہی ہوا......اب ہاتھ جلیں گے تو جانے گا کہ تپش کیا ہوتی ہے۔''

''نہ کہیں ایسا، اللہ کا واسطہ ہے اس کا پتا لگائیں۔''

''ارے میں کیسے پتا لگا سکتا ہوں بی بی جان، وہ تو بابا اپنے دوستوں کے پاس ہے، جن کو نوٹوں کی پوٹلیاں دکھا کر بولتا تھا، سردار زادے کو اڑا دو......ارے میں نے کہا تھا ناں اس سردار زادے کے تو اپنے قدموں کو بھی خبر نہیں ہوتی انہوں نے کدھر کو اٹھنا ہے، کھا گیا ناں دھوکا ایک گاڑی کے میک سے، عقل بند، آنکھوں کا اندھا، یہ نہ جان سکا کہ وہ اتنا معصوم ہے کہ اپنی ہی گاڑی کو عام آمدورفت والی ٹریفک میں ڈال دے گا، اس کے ہاتھ کیا آیا ایک ڈرائیور کی لاش اور اپنا اغوا برائے تاوان......بڑے ہی اعلیٰ قسم کے اُلو تھے دونوں باپ، بیٹے چچ......چچ......اہل علم و دانش کی اولادیں بے چاری۔''

''آپ کے اختیار میں تو سب کچھ ہے، آپ بارگیننگ کروادیں پلیز......''

''کس سے بارگیننگ کروادوں بابا......سردار زادے سے......؟ نہ سائیں نہ......اسے تو چھیڑنے سے میرے کو خود کو ڈر لگنے لگا ہے۔ پیسہ دے کر حملہ کروانے والوں کے ہاتھوں تمہارا بیٹا اٹھوا دیا اس نے، میں تو حیران ہوں کا ہے کا ناشتا کرتا ہے یہ خبیث کی اولاد جو ایسا ذہن پایا اس نے۔''

''پلیز......آپ بات کریں، آپ بات کروادیں......میرا بلڈ پریشر شوٹ کرچکا ہے۔ ہارٹ بیٹ نارمل نہیں رہی۔''

''ہاں ناں ایسا ہی ہونا تھا تمہارے ساتھ، گھسیاروں کے ساتھ رہو گی تو گھاس ہی کاٹنے کو ملے گی، کتنا کہا تھا کہ اِدھر آجاؤ، بہت جگہ ہے دل میں اور گھر میں بھی۔''

''موقع ہی کہاں ملا، کہیں آنے جانے کو......ابھی سوچ رہی تھی کہ یہ ہوگیا، اللہ کا واسطہ بات کروادیں۔''

''ارے بی بی جان تم تو ایسے بول رہی ہو بات کروادیں جیسے اِدھر ہی کہیں پڑا ہے میرے آس پاس۔''

''یہ aspect بھی rule out نہیں کیا جاسکتا۔''

''اچھا......اب تم بھی مجھے چیلنج کرنے پر اتر آئیں......اپنے miserably ended شوہر اور اپنے دام میں آنے والے صیاد بیٹے کا انجام بھول گئیں کیا......؟''

''نہیں، میں نہیں بھولی......جانتی ہوں کہ اس وقت قبلۂ عالم کا اقبال بلندیوں کی انتہا پر ہے۔''

''وائز لیڈی، چلو شاباش پریس کانفرنس کرو، واویلا مچاؤ، مارچ کرو ڈیزائنرز سوٹ پہن کر اپنے جیسی لیڈیز کے ساتھ، جو جوڑے اپنے ہزبینڈ کی تعزیت کے دنوں کے لیے تم نے معروف ڈیزائنرز سے سلوائے تھے ان کی

ایک لاٹ مجھے معلوم ہے لیٹ ڈلیور ہوئی تھی، بس سمجھو ان کو پہننے کا خوب موقع ہاتھ آیا ہے، پہن ڈالو ایک، ایک کرکے سب، تمہارا بیٹا جن کا مہمان ہے وہ لاکھوں میں نہیں کروڑوں پر ٹلیں گے۔ لہٰذا فی الحال صرف شور مچانے پر اکتفا کرو، اسے اپنی حماقتوں کی سزا کاٹنے دو۔''

''بات سنیں صاحب، بات سنیں۔''

''ہاہاہا......لائن آف ہوگئی......کیا بات سنوں......اب تم ایسے ڈھلتے سورج کی بابا......آسمانوں پر نئے، نئے سورج چمک رہے ہیں، اُدھر کو نظر نہ کروں اور تمہاری سنوں......تمہارے احمق بیٹے کو جس ٹولی میں ان کے حوالے کیا گیا ہے، وہ تو برسوں نہیں نظر آنے والا تمہیں سوائے اسکائپ کے......ارے عیاشی کرنے دو اسے وہاں......مہمان ہے مہمان وہ بھی بہترین میزبانوں کا......ہاہاہا۔''

☆☆☆

''تم میرا سامنا کرنے سے بچنے کے لیے مجھ سے فرار حاصل کرتے رہے ہو ناں......لو میں آج خود تمہارے سامنے آگئی ہوں۔ شہروں کے درمیان اب فاصلے ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ ایک سابقہ منسٹر کی بیوی اور ایک موجودہ منسٹر کی ماں کے لیے تو یہ فاصلے کوئی معنی نہیں رکھتے، ہیں ناں......'' مہرزاد نے اپنی اماں کے دبنگ انداز میں کہے الفاظ سنے اور آنکھیں بند کرلیں۔

''یاد کرو کتنے مہینے گزرے میری تمہاری آخری ملاقات کو......کتنی بار تم علاقے میں آئے اور مجھ سے ملے بغیر مردانے ہی میں وقت گزار کے واپس چلے گئے، کس بات کی شرم ہے مہرزاد خاناں جو ماں کا سامنا کرنے سے روکتی ہے تمہیں؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے، آپ میری مصروفیت سے واقف ہیں۔''

''میں تمہاری مصروفیت سے واقف ہوں، پوری دنیا کے لیے چوبیس گھنٹے حاضر اور ماں کے لیے کسی بھی دن کا ایک لمحہ بھی نہیں، تم جانتے ہو ناں ماں حجرے سے نکلنے کی عادی نہیں، سوچا ہوگا کہ نہیں جاؤں گا تو سالوں ملاقات نہیں ہوگی۔''

''ایسی بات نہیں ہے، آپ جانتی ہیں میں اتنا برا نہیں ہوں۔''

''میں نے برے کا لفظ استعمال نہیں کیا، میں ماں ہوں خاناں تمہاری، سوچو جب ماموں جان نے مجھے فون پر بتایا ہوگا کہ تمہاری زندگی کو خطرہ ہے اور مجھ سے کہا ہوگا کہ بیٹے کی جوانی پر ترس نہیں آتا تو میرے دل پر کیا گزری ہوگی......میں نے کتنی بار تم سے فون پر بات کرنے کی کوشش کی مگر تم نے بات نہیں کی، نتیجہ دیکھ لیا کیسے ٹی وی کی اسکرینوں پر تم پر حملے کی خبریں چل رہی ہیں۔ ماں کی ممتا کا امتحان لیتے ہو کیا، دیکھ لو پھر ماں اپنی ممتا سمیت امتحان دینے خود آکر تمہارے سامنے کھڑی ہے، اب بتاؤ کدھر بھاگو گے؟''

''کس نے کہا کہ میں بھاگ رہا ہوں، آپ سے بھاگ کر کدھر جاؤں گا۔'' مہرزاد نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''بھاگ ہی تو رہے تھے میں نے آلیا۔'' وہ بولیں۔

''وہم ہے آپ کا۔''

''وہم تو میرے دل میں نہ جانے کیا، کیا آتے ہیں، مہرزاد خاناں کیوں پیچھا دیتا ہے برادری کو، قبیلے کو وعدہ کرلینے کے بعد۔''

یہ وہ سوال تھا جس سے وہ بچنا چاہتا تھا مگر وہ اس کے سامنے بیٹھی پوچھ رہی تھیں۔ ”دنیا کا ایک نہ ایک شخص ضرور آپ کا چوہے دان ثابت ہوتا ہے، اس سے کیسے بچا جائے ؟“ اس نے سوچا تھا۔

”میں نے برادری سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔“ وہ دانستہ ترکھائی سے بولا تھا۔

”تم نے مجھ سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ تم نے برادری سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا، ٹھیک ہے تم صرف اپنے کام نکلوانا جانتے ہو۔“ وہ ڈانٹنے کے انداز میں بولیں...... ”اور وہ بھی ایک رکھیل کے لیے۔“

”اماں پلیز......“ وہ بے اختیار بولا۔

”یاد کرو خاناں میں نے تمہیں کہا تھا نہ آؤ اس سیاست میں، بھاگ جاؤ، تم نے کہا نہیں بھاگوں گا ہرگز نہیں، اسی میں رہ کر اسی سے مختلف بن کر دکھاؤں گا...... بتاؤ کہا تھا کہ نہیں؟“

”میرا اب تک کا ریکارڈ دیکھ لیں، مجھے اپنی بات پوری کرنے کے لیے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا۔“ وہ بھاری آواز میں بولا۔

”میں نے کہا تھا وعدہ کرو...... اپنی سیج پر خاندانی لڑکی لاؤ گے......“

”میں ایسا ہی کرنے والا ہوں، وعدہ خلافی کا کوئی ارادہ نہیں میرا۔“

”وہ لڑکی...... جس کے لیے تم نے اپنی آن، بان، نام، عزت، خاندان، قبیلہ، برادری سب داؤ پر لگا دیا...... جسے طوائفوں کے گروہ سے نکال کر لائے ہو، جس کے ساتھ نکاح کے بغیر راتیں گزارتے رہے ہو؟“ وہ گرجی تھیں۔

”بس اماں جان......!“ اب کے اس کی برداشت سے بات باہر ہوگئی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ”بہتر ہوتا کہ آپ کے رپورٹرز جو خبریں آپ کو دیتے ہیں ان کو منہ سے نکالنے سے پہلے اپنے بیٹے سے پوچھ لیتیں...... مجھ سے بات تو کر لیتیں، کیا میرا آپ پر کوئی حق نہیں ہے؟“ اس نے ان کی طرف دیکھا۔ ”کیا آپ مجھے اتنا چھوٹا اور گرا ہوا سمجھ سکتی ہیں؟“

”مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت تب ہوتی اگر میں خود جا کر گڈی کی نند کو نشانی نہ ڈال آئی ہوتی۔“

”وہ آپ کا اپنا فیصلہ تھا...... میرا اس میں دخل نہیں۔“

”میرا ہی سہی...... تمہیں میرا فیصلہ اپنانے سے انکار ہوا، قبیلہ تمہارے سامنے ڈٹ گیا، وہی قبیلہ جو تمہارے پیچھے کھڑا تھا۔ سامنے ڈٹ گیا...... ارے ایسے نکمے چالباز نکلو گے تم، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ باتیں تو بڑے، بڑے سپہ سالاروں کی کرتے تھے اور نکلے اتنے احمق کہ اپنوں کو بھی دشمن بنا لیا۔“ وہ یقیناً اس کی ایموشنل برین واشنگ کرنا چاہ رہی تھیں۔ ”ایک جھلک تو دکھا دی ناں انہوں نے تمہیں اپنی...... کل تک تمہاری گاڑی پر حملے کے چرچے ہیں...... ہزار منہ ہزار باتیں ہیں۔“

”وہ حملہ ان بزدلوں نے نہیں کیا تھا۔ جس نے کیا تھا اس کے ساتھیوں کا چہرہ دکھا دوں تو دنگ رہ جائیں آپ۔“ وہ اپنی آواز کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

”مجھے تمہاری سیاستوں میں کوئی دلچسپی نہیں مہر زاد، میرے لیے صرف ایک چیز اہم ہے اور وہ تمہاری زندگی ہے۔“ انہوں نے حسبِ توقع اس کی بات پر غور کیے بغیر کہا۔ ”ماموں جان مجھے بتا چکے ہیں، اگر تم اویس خان کے گھر شادی کے فیصلے سے پیچھے ہٹتے ہو تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے، میری بوڑھی ممتا اور کمزور ہاتھوں پر رحم کرو خاناں...... میرے پاس تمہارے علاوہ کوئی دوسری قیمتی متاع نہیں ہے۔“

”آئی ایم سوری اماں جان......! یہ میں نہیں کرسکتا، آپ کوئی اور حکم سنا دیں، میں بلا چون و چرا...... مان جاؤں گا مگر اویس خان کی بہن سے شادی ناممکن بات ہے۔“ مہر زاد اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

”میں نے تمہاری جان کی امان مانگی ہے ان سے مہر زاد خان اور اس کی صرف یہ ہی ایک صورت ہے۔“ وہ اپنی لرزتی آواز کو مضبوط بنانے کی کوشش کررہی تھیں لیکن اس میں ناکام ثابت ہورہی تھیں، ان کی آواز بھیگنے لگی تھی۔

”آپ میرے ساتھ آئیں۔“ مہر زاد نے کہا اور انہیں سہارا دے کر چلاتا ہوا اپنے بیڈ روم میں لے آیا۔ وہ اس کے بیڈ پر بیٹھی تھیں اور ان کے سامنے کاغذات اور تصویروں کا ایک ڈھیر تھا، وہ اپنی نظروں سے اس لڑکی کی تصویریں دیکھ رہی تھیں جو اُن کی نظر میں خاندانی تھی، شریف تھی اور جس کے بطن سے پیدا ہونے والی پاک، صاف نسل ان کے خوابوں کی تعبیر بننے والی تھی۔

”آپ جس خواہش کو لے کر کریم خان کے گھر پہنچی تھیں اور جس کو پورا کرنے کا آپ نے مجھ سے بھی وعدہ لیا تھا...... کیا یہ لڑکی اس خواہش کو اس خواب کو پورا کرے گی؟“ ان کی نظروں کے سامنے رکھی تصویروں کو ہاتھ میں اٹھا کر واپس پھینکتے ہوئے مہر زاد نے کہا تھا۔

”میں نیک آدمی نہیں ہوں، مجھ میں ہر عام کم عمل انسان والی خصوصیات موجود ہیں مگر یہ......“ اس نے تصویروں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ طوق جو آپ میرے گلے میں لٹکانا چاہتی ہیں اس سے تو وہ موت ہی اچھی ہے جو اویس خان اور قبیلہ مجھے انکار کی صورت میں دینے والا ہے۔“

”ٹھیک ہے......“ وہ کسی زومبی کی طرح نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولیں، ان کی نظریں اب بھی تصویروں پر جمی تھیں۔ ”ٹھیک ہے، میں سمجھ گئی اس سارے کھیل کو جو تمہاری گاڑی پر حملہ کرنے کے لیے کھیلا گیا...... ٹھیک ہے۔“ انہوں نے سر اٹھا کر مہر زاد خان کی طرف دیکھا۔ ”نہ کرو اس مہ جبیں سے شادی...... مگر ابھی تم نے مجھ سے کہا اس کے علاوہ جو کہوں گی مانو گے۔“

”بالکل مانوں گا......“ وہ سر سے ایک بڑا بوجھ اتر جانے کی خوشی میں سرشار تھا...... اپنی کہی بات کا اعادہ کرتے ہوئے اس نے لمحے بھر کے لیے بھی نہیں سوچا کہ ان کا دوسرا حکم اس پر کیسا کڑا پڑنے والا ہے۔

”اگر مجھے دل سے ماں سمجھتے ہو اور ماں کے احترام کو واجب جانتے ہو تو وعدہ کرو تم اُس لڑکی سے کوئی تعلق نہیں رکھو گے جس کی وجہ سے یہ سارا فساد پڑا۔“ وہ کہہ رہی تھیں اور مہر زاد کی سماعت اچانک جواب دینے لگی تھی۔

”یہ کیسی شرط ہے؟“ اس کے منہ سے الفاظ بہ مشکل نکلے تھے۔

”یہ شرط نہیں ہے، یہ ایک ماں کی التجا ہے۔“ ان کی آواز کانپنے لگی۔ ”اسے ساتھ لگائے رکھو گے، اس کی قربت میں سکون ڈھونڈو گے، اس سے نسل بڑھانے کی خواہش کرو گے تو کچھ بھی ہونے سے پہلے، پہلے قدم پر ہی خاک و خون میں لوٹ جاؤ گے، قبیلہ نہ اِدھر ہلنے دے گا نہ اُدھر۔“

”میں قبیلے کو فیس کرنے کی ہمت رکھتا ہوں اماں جی!“

”ہمت کو چھوڑو تم قبیلے کی فطرت سے واقف نہیں ہو۔“ وہ کمزور لہجے میں بولیں۔ ”انہوں نے اس بات کو انا کا مسئلہ بنا لیا ہے، قبیلے کی، برادری کی کوئی لڑکی نہیں تو وہ بھی نہیں بلکہ اگر دس لڑکیاں قبیلے اور برادری سے بیاہ کر اپنے حجرے بسا لو تو پھر بھی وہ نہیں آسکتی تمہاری زندگی میں جس کی خاطر تم قول سے پھرے تھے۔“ ان کی آواز کپکپانے لگی۔

”یہ شاہ مات تھی یا چیک میٹ کی صرف کال تھی۔“ اس کا زیرک ذہن لمحوں میں کیلکولیٹ کرنے

میں مصروف ہوا۔

''دیکھ خاناں......!'' اماں نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑے۔ ''یہ میرے ہاتھ دیکھ، میں ماں ہوں تیری۔ میری ان آنکھوں نے ان کی نسلوں کی تاریخ کو دیکھ رکھا ہے، تو لاکھ پہلو بچائے گا ان کی ضد کی مار تیرا پیچھا کرے گی، نہ رول اپنی جوانی کو، اس پر ترس کھا، مجھ پر ترس کھا، میں تیرا غم سہنے کے قابل نہیں، میں بہت سے رشتے پہلے ہی گنوا بیٹھی ہوں، اب میں تجھے کھونے کا حوصلہ نہیں کر سکتی، چھوڑ دے مہر زاد خاناں بھول جا...... بھول جا کہ کوئی ایسی بھی تیری زندگی میں آئی تھی جس کی تو نے چاہ کی تھی...... چاہت کو پانے کی کوشش کرے گا تو جان کو کھودے گا...... جان گئی تو گئی جان نہ اس کے کام کی نہ میرے کام کی...... میں بڑھیا تنکے چنتی رہوں گی اور وہ بیرا گن خون رنگ سفید دوپٹا اوڑھے خاک میں رُلے گی۔ چھوڑ دے ضد، بھول جا خاناں...... ماں کی التجا نہ سہی، ماں کا حکم مان کر ہی بھول جا۔''

وہ کہہ رہی تھیں اور مہر زاد خان سن رہا تھا۔ جس کی خاطر ساری دنیا کو چکمہ دے آیا تھا، ماں کے چند جملوں نے اس کے حصول کی خواہش کو اپنا شکار بنا کر چاروں شانے چت گرا دیا تھا۔ وہ ماں تھیں انہیں اندھے تیر چلانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ انہیں تو صرف ایک حکم سنا دینا ہی کافی تھا اور دنیا کے کسی عظیم ترین سپہ سالار نے بھی ماں کے حکم کو کسی ڈھال پر روکنے کا گر سیکھا تھا نہ سکھایا تھا۔

☆☆☆

''میں نے تم سے کہا تھا ناں دانیال...... کہ مہر زاد خان کی گفتگو میں مجھے سچائی نظر آتی ہے۔ اس نے بغیر کسی شعوری کوشش کے میرے لاشعور کو قائل کر لیا کہ ہمیں اسے اتنا وقت دینا چاہیے جو وہ مانگ رہا تھا۔'' عافیہ نے دانیال سے کہا تھا۔

''اور تم میرال...... یقین کر لو کہ مہر زاد خان ہی صوفی صاحب کی وہ دعا ہے جو انہوں نے تمہارے حق میں اپنے رب کے ہاں مانگی تھی۔'' انہوں نے میرال کی طرف دیکھا تھا۔

''میں کیا کہوں، کیا بولوں، زندگی کے زنداں سے نکلی ہوں تو آزاد فضا کی سانسوں نے مجھے، میرے اعصاب کو اور میری سوچ کو حق دق کر رکھا ہے، میں کن حالات سے گزرتی رہی، مشکل میں پڑتی رہی، آزمائش سے بچتی رہی، آزمائش سے نکلتی رہی، نئی مشکل میں پڑتی رہی مگر ہر نئے مرحلے سے یوں نکلی جیسے مکھن سے بال اور پھر مجھ پر وہ کڑا وقت بھی آیا جب میں نے ہر مصیبت کی وجہ مہر زاد خان کو گردانتا شروع کر دیا...... میں سدا کی ناشکری، محسن کش اور بڑے بول بولنے والی اپنے طعنے اور بدگمانی کے جال سے زندگی کی اتنی مار کھا کر بھی نہ نکل سکی، اپنے پر پڑنے والی آزمائشوں کے رونے روتے، کبھی ان سے بے بس ہو کر خودکشی کے منصوبے بناتے کبھی شکست خوردہ انداز میں ان سے مصالحت کر لینے کا عزم کرتے ہوئے میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ان سب حالات سے باہر تقدیر میرے لیے کیا تدبیر کر رہی ہے، برے سے برے حالات میں بھی بچاؤ کی ایک ڈھال اچانک کیسے اور کہاں سے میرے سامنے آتی رہی، بچاؤ کی وہ ڈھال تھی کہ بواجی کی لگن یا صوفی صاحب کی دعا یا پھر مہر زاد خان کی محبت......'' سوچتے، سوچتے اس نقطے پر پہنچ کر جیسے اسے ایک زوردار جھٹکا لگا......

''مہرزاد کی محبت'' اس نے سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے گلاس وال سے باہر دیکھا، عافیہ کے گھر کے لان میں اندھیرا اتر رہا تھا اور وسیع لان میں جا بجا لگے آرائشی قمقمے روشن ہو رہے تھے، لان سے پار دور گیٹ پر باوردی گارڈ مستعد کھڑے تھے، یہ خصوصی گارڈ مہر زاد خان کی طرف سے بھجوائے گئے تھے۔ اسے میرال کی عافیہ کے گھر

میں موجودگی کے سلسلے میں تحفظات تھے اسی لیے یہ خصوصی فورس یہاں بھجوائی گئی تھی۔

''ایک گھر، چند بہت اپنے لوگ، ایک پُرکیف و پُرسکون زندگی۔'' پھر اس نے اس کمرے کے چاروں کونوں پر نظر ڈالی جس میں وہ بیٹھی تھی۔ مغرب کی اذان کی آواز سنتے ہی عافیہ اور دانیال نماز کے لیے اٹھ گئے تھے۔ ''خواب و خیال ہو چکے تھے وہ احساسات جن کا اب کبھی تصور بھی نہیں آیا تھا۔ کس طرح ممکن بن کر میری زندگی میں واپس آ گئے۔'' دانیال نے اسے اس کی تلاش کے سلسلے میں اپنی ایک، ایک کوشش کا حال سنایا تھا۔ حمزہ نے اسے بتایا تھا اسے کیسے خبر ہوئی وہ غائب ہو چکی تھی اور پھر کیسے اس کا دل و دماغ اس کی جستجو میں لگ گیا۔ فہد نے علینہ اور نادیہ آنٹی سے ری یونین اور پھر اپنے دل کا احوال اسے تفصیل سے سنایا۔ کون اقتدار کے ایوانوں تک اس کی کھوج میں پہنچا، کون خفیہ ایجنسیوں پر پانی کی طرح پیسہ لٹاتا رہا، کس کس طریقے سے اس کے لیے مہم چلائی جاتی رہی۔ ''یہ سب کس طرح ممکن ہوا۔'' اس نے سوچا۔ ''کس نے دنیا کے مختلف حصوں میں بیٹھے ان لوگوں کے ذہنوں میں میرا خیال ڈالا...... کس نے ان سب کو میری طرف موڑا۔''

''یہ سب بارگاہِ الٰہی سے جاری ہونے والے احکامات کا کرشمہ ہے۔'' عافیہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ ''انسان دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے، اپنی درخواست بارگاہِ الٰہی میں رجسٹر کراتا ہے، دعا مانگتے وقت انسانوں کے دلوں کے احساسات کم و بیش ایک سے ہی ہوتے ہیں مگر کچھ لوگ اپنی ریاضت، اپنی عبادت اور اپنی سعی کے نتیجے میں اس بارگاہ میں دوسرے انسانوں کی نسبت زیادہ خصوصیت سے سنے جاتے ہیں کیونکہ ان کا اور محبوب کا رشتہ دوسرے انسانوں کی نسبت زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ تمہاری بواجی تمہارے لیے پریشان تھیں، انہوں نے صوفی صاحب سے دعا کے لیے کہا، صوفی صاحب محبت تھے اور محبوب سے ان کا رشتہ گہرا تھا، اسی لیے مجھے یقین ہے ان کی دعا قبولیت سے سنی گئی، جب ہی تو ہم سب ایک نکتے پر اکٹھے ہوئے، جب ہی تو مہر زاد خان جیسے شخص نے تمہیں اپنی زندگی میں مرکزی حیثیت دے دی، یہ ہم سب خود نہیں کر رہے تھے، ہم سے کروایا جا رہا تھا۔ کائنات کا سارا نظام علت اور معلول کے قانون پر چل رہا ہے، جب ہی تمہارے لیے دعا کے معلول ہم اور علت تمہاری آزمائش بنی۔''

وہ ششدر بیٹھی عافیہ کی باتیں سن رہی تھی۔

''پھر تم اگر غور سے دیکھو تو تمہیں ہم مرکزی کرداروں کے علاوہ اس سلسلے میں ایک مہین سی چین بناتے اور لوگ بھی نظر آئیں گے۔ بینش، علینہ، نگین، زرنگی، نادرا اور نہ جانے کتنے ہی اور...... ان سب کو بھی ایک چین میں تمہاری علت نے باندھا...... مجھ پر تو یہ سلسلہ خود ایسے گزرا ہے کہ نظر کے سامنے اب کوئی راز، راز نہیں رہا، میرے بیٹے دانیال کے حادثے اور اس کے بعد ہونے والے واقعات نے میری اور میری فیملی کی آنکھیں کھول کر رکھ دیں، مجھ سے زیادہ اس معاملے کو کون سمجھ سکتا ہے۔'' آنکھیں تو میرال کی بھی کھل گئی تھیں، ایک، ایک کر کے اپنی زندگی کا ہر واقعہ یاد آ رہا تھا، کیسے وہ بواجی کو ستاتی اور اپنی قسمت پر شکوہ کناں رہتی تھی، کیسے ہر مثبت میں سے منفی پہلو ڈھونڈ نکالا کرتی تھی اور کیسے اسے اس کی کم مائیگی کا، بے بسی کا، بے چارگی کا آئینہ دکھایا گیا تھا۔

''مجھے نہیں معلوم وہ اپنے کردار میں عموماً کیسا ہے مگر تمہارے لیے وہ خصوصاً فرشتہ ثابت ہوا۔'' حمزہ نے مہر زاد خان کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس پر کیچڑ اچھلتی دیکھی ہے، تمہارے لیے بنایا گیا وہ صفحہ جو ہم سب چلا رہے تھے اور جسے اب ڈی ایکٹو کر دیا گیا ہے، اس پر لوگوں کی زبانیں لپلپاتی تھیں اور لفظ اس کی پگڑی اچھالتے تھے اور

اس کے ہاتھ میں ان ہی سب چیزوں کا کنٹرول تھا، کوئی اور ہوتا تو ہم سب کو ایسا غائب کرواتا کہ ہمارا نام ونشان تک نہیں ملتا مگر اس نے خود کو داغ دار کر کے تمہیں داغ دار ہونے سے بچائے رکھا۔'' فہد نے کہا تھا۔

''میرے لیے کسی پاکستانی سیاست دان کا یہ کردار ایک انوکھا تجربہ ہے، جو خوشگوار ہونے کے ساتھ ساتھ حیرت کا باعث بھی ثابت ہو رہا ہے۔'' عافیہ کے بڑے بیٹے عاصم نے کہا تھا۔

''جو کچھ بھی ہو گزرا، وہ ماضی۔ اور اب حقیقت یہ ہے کہ تم آزاد ہو اور ہم سب تمہارے ہر فیصلے میں تمہارے ساتھ ہیں۔'' عاصم کی بیوی شاندانہ نے کہا تھا۔

''میرا فیصلہ......؟'' میرال نے سوچا تھا۔ ''اس کے فیصلے سے مشروط ہے جو میرے لیے صوفی صاحب کی دعا ثابت ہوا۔'' چند دن کے اندر جانوروں کی سی صفات رکھنے والا، مکمل ترین انسان بن چکا تھا، وہ وہی تھا جسے دیکھ کر اور جس کی باتیں سن کر وہ کہانیاں کہنے اور سننے پر تیار ہوئی تھی، وہی تھا جس کے کہنے پر اس نے اپنے کارڈ میز پر رکھ دیے تھے۔ وہ اس کے لیے کہاں اور کیسے، کیسے ڈھال بنا...... اس کی نابینا نظر کو اب بینائی ملی تھی۔ وہ جیسے ایک طویل خوفناک خواب سے جاگی تھی۔

☆☆☆

''مگر ایسا ہو نہیں سکتا۔'' اسی ہفتے ایک دن مہرزاد خان نے عافیہ سے بات کی تھی۔

''بیٹا میں نے تمہاری نظروں میں اس کے لیے جو جذبہ دیکھا تھا اور جس فکر کے ساتھ تم نے اس کی عزت و عصمت کی حفاظت کا اہتمام کیا، وہ کوئی اور ہی کہانی سنا رہے تھے، میں نے اسے بیٹی کہا ہی نہیں، میں اس کی ماں بن کر دکھاؤں گی، تمہارے جیسے شخص کا ساتھ اپنی بیٹی کے لیے قبول کرتے ہوئے مجھ سے زیادہ خوش شاید ہی کوئی اور ہو۔'' عافیہ نے ہی مہرزاد خان سے یہ بات چھیڑی تھی۔

''شاید آپ ٹھیک کہتی ہیں مگر ایسا ہو نہیں سکتا۔'' اس کے جواب نے عافیہ کو حیران کر دیا تھا۔

''میں میرال کو زر نگار کے ''کلوک'' سے نکال کر باہر لانے والا، میں اس کی عزت و عصمت کی حفاظت کے لیے لانگ ٹرم پلاننگ کرنے والا، میں ہی اس کے لیے دل میں شدت سے ایک جذبہ محسوس کرنے کے باوجود اس کے اپنے اختیار میں ہوتے ہوئے اپنے خدا سے اپنے نفس کی سرکشی دبا دینے کی دعا کرنے والا، میں ہی اسے ایک باعزت زندگی میں واپسی کے راستے تراش کے، تلاش کے دینے والا شخص ہوں اور میں ہی کروڑوں انسانوں کے ہجوم میں کسی بھی فورم پر کھڑے ہو کر اس کی عزت و عصمت کی پاکیزگی کی قسم کھا کے گواہی دینے کو بھی تیار ہوں گا لیکن اس کا حصول، اس پر اختیار، اس کا ساتھ میرا مقسوم نہیں ہے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''میرے راستے جنون کے راستے ہیں، جو کٹھن اور مشکل ہیں۔ میرے ساتھ میں اس کے لیے عزت اور معتبری مقدر نہیں ہوگی کیونکہ میرے کوچے اور میرے بازار کے رنگ ڈھنگ ہی اور ہیں...... میں اسے مزید دکھ اور کٹھنائیاں سہتے نہیں دیکھ سکوں گا کیونکہ میری راہ خار دار ہے اور اس کے پیر تو پہلے ہی آبلہ پا ہیں، آپ سے میری درخواست ہے کہ کسی بہت اچھے...... بہت قدر کرنے والے انسان سے اس کی شادی کروا دیں، میرا دل اور میری سوچ اس سے دست بردار ہوئے۔''

عافیہ کی سماعت پر جیسے بم برس رہے تھے، ان کا خیال تھا میرال کو یوں باعزت طور پر ان کے حوالے کرنے کے پیچھے مہرزاد خاندان کا ایک ہی مقصد ہو سکتا تھا اور وہ یہ ہی تھا کہ وہ اسے ایک معتبر گھر کے سامنے سے اپنے ساتھ رخصت کروا لے، جس منظر میں وہ جیتا تھا وہاں اپنے سروائیول کے لیے اس کا ایسا کرنا ضروری

تھا...... لیکن وہ تو میرال صلاح الدین سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہی ہو گیا۔

''شاید اس نے ٹھیک فیصلہ کیا، ہمارے، تمہارے اور ان نادیدہ لوگوں کے ہاتھوں جو میرال کے سلسلے میں انوالوڈ رہے میرال کا وجود، ایک شک بن کر سامنے آیا ہے، اگر مہرزاد خان اسے اپناتا ہے تو شاید شک کے اس بیج کو اپنے کیریئر کے پورٹ فولیو سے نکال نہ پائے، ایسا ہوتا ہے تو نقصان سراسر میرال کا ہے، وہ باقی کی عمر ایک سوالیہ نشان بن کر جیے گی کیا؟'' جہانگیر نے عافیہ کی زبانی مہرزاد کی بات سن کر کہا۔ ''مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ مہرزاد خان، میرال سے اپنی محبت کی شدت کا ایک اور ثبوت دے رہا ہے، وہ کبھی نہیں چاہے گا کہ محبت ایسے عظیم جذبے پر کالم نگاروں کے قلم سیاہ الفاظ اگلیں اور لیڈنگ میگزین چٹ پٹی، سنسنی خیزی سے بھرپور اسٹوریز بنا کر پیش کریں۔ میرے دل میں مہرزاد خان کی عزت و احترام میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔''

''لیکن اگر میرال کا وجود ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گیا...... اور ہم سب کی گواہیاں بھی اس کا دفاع نہیں کر پائیں گی تو پھر اسے کون جی دار اپنائے گا؟'' عافیہ نے ان سب سے سوال کیا جو اُن کے ساتھ میرال کی بازیابی مہم میں شامل تھے۔

''میں......'' سب سے پہلے حمزہ محمود کا جواب آیا تھا اور فوری طور پر آیا تھا۔

''میں اور تہ دل سے۔'' فہد صدیقی نے کہا تھا۔ ''اور مجھے اس پر فخر محسوس ہوگا۔''

''اگر کوئی اتنی ہمت نہیں کرتا تو ہم میرال کو اپنے ساتھ امریکا لے جائیں گے، وہاں اس کے لیے باعزت زندگی میں واپسی کے زیادہ چانسز ہوں گے۔'' عاصم اور شاندانہ نے کہا تھا۔

عافیہ نے پوری صورتِ حال بلا کم و کاست میرال کے سامنے رکھ دی تھی۔ مہرزاد خان کے جواب نے میرال کے دل کو چند ثانیوں کے لیے دھڑکنا بھلا دیا تھا۔

''شاید وہ ٹھیک کہتا ہے۔'' پھر وہ ٹرانس کی سی کیفیت میں بولی تھی۔ ''میں جیسی ہوں، ویسی لڑکی اسے ڈیزرو ہی نہیں کرتی...... اسے میری ناشکریوں اور گلے گزاریوں کی سزا ہی بن جاتا تھا، رسائی کے اتنا قریب اور رسائی سے میلوں دور...... خوش قسمتی نے میرے ہی سر کا ہما بن جانے کا ٹھیکا تو نہیں لے رکھا ناں......'' اس کا لہجہ بھیگنے لگا تھا۔

''گلہ مت کرنا بیٹا، شکوہ مت کرنا۔'' عافیہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔ ''دیکھو وہ اپنی limits کا ذکر کرتے ہوئے تم سے دست بردار ہونے کا کہہ رہا ہے، نہ تو تم سے محبت کا انکار ہے نہ تمہاری پاکیزگی پر کسی شک کا اظہار ہے۔''

''میری اوقات کی یاددہانی تو ہے ناں...... انسانی ہمدردی کا جذبہ اپنی جگہ، اپنی عزت، انا اور خودداری کی حفاظت ایک مختلف معاملہ ہے۔'' میرال کے لہجے میں ایک مرتبہ پھر تلخی عود کر آئی۔

''پھر گلہ، وہی شکوے شکایتیں؟'' عافیہ نے اسے تنبیہہ کی۔ ''اس کے الفاظ یاد کرو، میں اسے ڈیزرو نہیں کرتا اور غور کرو کہ وہ تمہیں کس مقام پر رکھتا ہے، ورنہ تم تو اس کے اختیار میں تھیں وہ جو چاہے کر سکتا تھا تمہارے ساتھ...... مگر تم نے دیکھا کیچڑ اس پر اچھلی، داغ دار بھی وہ ہوا...... وہ بھی کس کے لیے، کس کی خاطر......؟''

میرال نے عافیہ کی بات سنی اور خاموش ہو گئی۔

''ہم کسی کے اندرونی معاملات کو نہیں جانتے ہیں بیٹا۔ اور جب علم نہیں تو سوال بھی نہیں کرنے چاہئیں، گلے بھی نہیں کرنے چاہئیں۔ تم تصویر کا دوسرا رخ بھی تو دیکھو...... مہرزاد تو تمہاری عصمت کی پاکیزگی کا خود گواہ

ہے مگر حمزہ اور فہد کے لیے یہ صرف کانوں سنی باتیں ہیں، ان کے اعتبار کا عالم تو دیکھو، بغیر کسی حیل و حجت وہ کل کے تم سے شادی کرنے کو تیار ہیں، کیا یہ اللہ کا خصوصی کرم نہیں تم پر؟" عافیہ کو سمجھ نہیں آتا تھا کہ میرال کو کس طرح سمجھائیں۔

شاید وہ میرال کے محسوسات کو سمجھ نہیں پائی تھیں، مہر زاد کا وجود، مہر زاد کا سایہ اور پھر اس سامنے سے بے دخلی..... شاید میرال کسی اور کے لیے سوچنے کے قابل ہی نہیں رہ چکی تھی۔

"میں علینہ بات کر رہی ہوں میرال۔" انہی دنوں اسے علینہ کا فون آیا تھا۔ "فہد سے تمہارے بارے میں معلوم ہوا، شکر اللہ کا تم مل گئیں، فہد کو تمہارے لیے اتنا پریشان دیکھ کر..... مجھے تو تم پر بہت رشک آتا تھا، تم خوش قسمت ہو میرال کھو کر بھی مل گئیں، ہم ایسے کہ سامنے موجود ہو کر بھی نظر نہیں آتے۔" میرال نے علینہ کی طویل گفتگو کا نچوڑ نکالا تھا اور اسے اس لڑکی کی کہی اصل بات سمجھنے میں ذرا بھی دقت نہیں لگا تھا۔ وہ بات، جو علینہ نے کہی ہی نہیں تھی اور کہہ بھی گئی تھی۔

"کیا یہ ضروری ہے کہ میں ضرور ہی شادی کرلوں، کیا میں ایسے ہی زندگی نہیں گزار سکتی؟" اس نے عافیہ سے پوچھا تھا۔

"ہاں یہ ضروری ہے، میں جلد از جلد تمہیں اس معاشرے میں باعزت مقام پر دیکھنا چاہتی ہوں..... اور باعزت مقام کسی باعزت شخص کے ساتھ ہی میں ہے، زندگی کے اتنے بھیانک تجربوں نے تمہیں اتنا تو سکھایا ہی ہوگا۔" عافیہ نے جواب دیا تھا۔

☆☆☆

وزارتِ اطلاعات و نشریات سے ایک رپورٹ کی سمری ایوانِ صدر میں وزیر اعظم کے تائیدی دستخطوں کے ساتھ بھجوائی گئی تھی، اس سمری میں چند سفارشات درج تھیں، ایوانِ صدر سے یہ سمری منظوری پا کر ری ڈائریکٹ کردی گئی تھی۔

☆☆☆

کسی نے کال بیل پر انگلی رکھی تھی اور پھر جیسے اپنی انگلی اٹھانا ہی بھول گیا تھا۔ زوئی، نادر اور اماں گھر کے پچھلے صحن میں مولسری کے درخت کے نیچے چار پائی بچھائے بیٹھے تھے۔

"دیکھ لے نادر..... بیل شارٹ ہے کوئی اس کے ساتھ چپڑ (چمٹ) تو نہیں گیا بے چارہ بد قسمت....." اماں نے نادر کو اٹھ کر دیکھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ نادر اٹھ کر گیٹ تک گیا تھا اور وہیں کا ہو کر رہ گیا تھا۔

"میں دیکھتی ہوں۔" زوئی نے کچھ دیر انتظار کرتے رہنے کے بعد کہا۔

"تم دیکھو میں اس بے چارے شہباز صاحب کو کچھ کھانے کو دے آؤں، غم اور فکر نے بے چارے کو گھر سے بے گھر بھی کر دیا اور شوگر، بلڈ پریشر جیسی بیماریاں بھی لگا دیں۔ نہ کرنی کی سزا پا رہے ہیں، بے چارے دونوں۔" اماں بھی زوئی کے پیچھے آتے ہوئے بولیں۔

"کون ہے نادر؟" زوئی نے برآمدے میں کھڑے ہو کر بلند آواز میں پوچھا، نادر نے مڑ کر دیکھا..... زوئی کا رنگ فق ہو گیا..... نادر کے سامنے خفیہ ایجنسی کے وہی تین چہرے موجود تھے، جنہوں نے اِس گزرے وقت میں خود کو زوئی اور نادر کی جان کا جنجال بنا رکھا تھا۔

جاری ہے



شامِ شہر یاراں

عنیزہ سیّد

آخری قسط

زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے۔۔۔ خیر و شر، نیکی اور بدی۔۔۔ زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت۔۔۔ ہر برائی پر حاوی ہو جاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سیّد نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے



"اب کیا ہوا نادر؟" نادر ان لوگوں کو وہیں کھڑا چھوڑ کر زوئی کی طرف آیا تو اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔ "شہباز صاحب کا پتا چل گیا کیا انہیں؟"

"نہیں زوئی اس بار وہ صرف پتا چلانے نہیں آئے....." نادر سنجیدگی سے بولا۔ "اس بار وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جانے آئے ہیں۔"

زوئی کے قدموں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی۔

"نہ صرف تمہیں بلکہ شہباز صاحب کو بھی۔"

"شہباز صاحب بے چارے کو بھی؟" زوئی کو پہلے سے زیادہ یہ جملہ سن کر تکلیف ہوئی تھی۔

"ہاں..... تمہیں جلدی جانا ہوگا۔" زوئی کو نادر کے لہجے اور رویے پر حیرت ہورہی تھی۔ اس کے چہرے پر کسی پریشانی کے آثار نہیں تھے، وہ مطمئن تھا اور پرسکون بھی جیسے کسی بلا کے ٹل جانے پر ہوا جاتا ہے۔

"اماں!" زوئی نے عقب سے آتی قدموں کی آواز سن کر گردن موڑ کر دیکھا۔

"اب لینے کے لیے سر پر آن کھڑے ہوئے ہیں تو جانا تو ہوگا نا۔" اماں نے پہلی بار اس کی طرف داری کرنے کے بجائے نادر ہی کے سے لہجے میں کہا۔

"او میرے اللہ..... کوئی ساتھی بھی نہیں رہا....." زوئی نے آسمان کی طرف دیکھا۔ "میں نے تو نادر کو پا کر سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔" اس نے ایک بار پھر باری، باری نادر اور اماں کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کے چہروں پر ایک ہی تحریر لکھی تھی۔ "سوچ کیا رہی ہو، اب جاؤ..... ہماری جان چھوڑو۔" اس تحریر کو پڑھنے کے بعد زوئی نے سر ہلایا اور تیز قدموں سے چلتے ہوئے اندر چلی گئی۔ پھر اس میں موجود واحد کمرے کی چارپائی سے بیمار اور کمزور شہباز صاحب کو بازو کا سہارا دے کر باہر لانے میں اسے دس منٹ لگے تھے۔ "چلیں....." اس نے ان تینوں اہلکاروں کے قریب جا کر کہا تھا اور پھر نادر کی طرف دیکھا۔

"میں تو ان سے پہلے ہی وعدہ کر چکا تھا زوئی اگر یہ ثابت ہو گیا تو تمہیں لے جانے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" وہ بے نیازی سے شانے اچکاتا ہوا بولا اور پھر باری، باری ان تینوں سے ہاتھ ملا کر انہیں رخصت کرنے لگا۔

ان کی جیپ میں شہباز صاحب کو سوار کرانے کے بعد خود سوار ہونے تک زوئی کے دل میں موجود نادر اور پاکستان سے محبت کے بت میں کئی دراڑیں آچکی تھیں۔

☆☆☆

"وہ کہتا ہے کہ وہ جہانگیر سہگل کی لے پالک بیٹی ہے، مجھے اس بات پر شک ہے۔ جہانگیر سہگل کسی بچی کو کیوں اڈاپٹ کرے گا بھلا۔" لہرین نے محمود درانی سے کہا جو اخبار کے پیچھے چہرہ چھپائے بیٹھے تھے۔

"کوئی کام، کوئی بھی شخص کیوں کرتا ہے، میں اس کے بارے میں کیا رائے دے سکتا ہوں۔" محمود درانی نے بنوز چہرہ اخبار کے پیچھے چھپائے ہوئے کہا۔

"مجھے پہلے اس بات کی تحقیق کرنا ہوگی، چھان بین کرنی پڑے گی کہ وہ بچی دراصل ہے کس کی؟" لہرین نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ کے لیے اتنا کافی نہیں کہ جہانگیر سہگل اسے بیٹی کہتا ہے۔" اب کے محمود درانی کو اخبار چہرے کے آگے سے ہٹانا پڑا۔

"نہیں..... یہ کافی نہیں ہے۔" نیرین نے سر ہلا کر کہا اور اپنے فون پر کسی کا نمبر ملانے لگیں۔ محمود درانی اب پوری توجہ سے انہیں دیکھ اور سن رہے تھے۔

"ہاں رضا....." انہوں نے اپنے ایک بھتیجے کا نام لیا۔ "کچھ پتا لگا؟"

"اچھا.....! کیا بتایا اس نے۔"

"کیا.....؟"

"اغوا ہوگئی تھی، اسکینڈلز سامنے آئے تھے۔" ان کا لہجہ بدلنے لگا اور محمود درانی کا دل بیٹھنا شروع ہوا۔

"تو یہ سب ہوا کدھر، کہاں بات ہوتی رہی، ہمیں تو نہیں پتا، ہم نے تو یہ خبریں نہیں سنیں۔" ان کی آواز میں تیزی آنے لگی۔

"ہائے میرے اللہ، منسٹر کی داشتہ رہ چکی ہے۔" ان کی آنکھیں پھیلیں۔

"حمزہ کو وہ کہاں ٹکرا گئی۔ یہ تو بضد ہے شادی کرے گا تو اسی سے کرے گا۔" انہوں نے بین کرنے کے سے انداز میں کہا تھا۔

"ہائے نہیں..... میں بھلا یہ ہونے دیتی ہوں، ان بڑے لوگوں کے اندر تو نہ جانے کیسا گند بھرا ہوتا ہے۔ توبہ، تو یہ میرا حمزہ تو معصوم ہے، بے چارے کو زمانے کے بیا رضیہ کی اتنی خبر کہاں، نہیں میں سمجھالوں گی اسے تم فکر مت کرو....." انہوں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا اور فون بند کر کے فخریہ نظروں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں دیکھا میں نے پتا لگا لیا۔

☆☆☆

"تم مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہو فہد؟" اس ویک اینڈ پر جب فہد لاہور آیا اور میرال سے ملنے عافیہ کے گھر پہنچا تو اتنے وقت میں پہلی بار میرال کو ایک نارمل موڈ اور بہتر حلیے میں پایا۔ وہ آہستہ آہستہ اس ٹراما سے باہر نکل رہی تھی جس نے اسے اپنے آہنی پنجوں میں دبوچ رکھا تھا۔

"اس لیے کہ تم مجھے اچھی لگتی ہو اور میں تمہیں خوش رکھنا اور خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔" فہد نے مختصر جواب دیا۔

"اگر میں کہوں کہ تم مجھ سے اس لیے شادی کرنا چاہتے ہو کہ تم سمجھتے ہو اس نارمل معاشرے میں مجھ جیسی ایب نارمل حالات کی شکار لڑکی سے شاید ہی کوئی شادی پر رضامند ہو کیونکہ جو بھی سنے گا شکوک کا شکار ہو جائے گا اور ان حالات میں میرے بچپن کے دوست ہونے کے ناتے تمہیں ہی یہ قربانی دینی چاہیے تو یقیناً تم یہ بات نہیں مانو گے، ہے ناں.....!"

فہد کے دل نے ایک دھڑکن چھوڑ دی، وہ جتنی خوب صورت تھی اتنی ہی ذہین بھی تھی..... اور یہ بات وہ بہت پہلے سے جانتا تھا۔

"تم ایک سلیبریٹی ہو فہد، تمہارا نام ہے معاشرے میں، لوگ تم سے ایک ایب نارمل فیصلے کی توقع نہیں کرتے، تمہارا امیج، تمہاری شخصیت سب اس ایک فیصلے کا شکار ہو سکتے ہیں۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں میرال، تم جانتی ہو کہ میں ہمیشہ سے ہی تمہارے لیے اچھی فیلنگز رکھتا ہوں۔"

"اچھی فیلنگز رکھنا اور بات ہے..... ایک سلیبریٹی کسی سوشل کاز کے لیے چلائی جانے والی مہم کا حصہ بن کر اپنا امیج مزید بہتر تو کر سکتا ہے مگر اس مہم کے اندر موجود سیاہیوں کو اپنے چہرے پر سجا لینا اس کے لیے مشکل کھڑی کر دیتا ہے۔"

فہد نے سر اٹھا کر میرال کی طرف دیکھا، وہ مجسم حُسن تھی، ایک ایسا حسن جس پر حزن اور ملال نے شاید مستقل ڈیرے جمالیے تھے۔

"تم سمجھتی ہو سلیبریٹی ہونا میرے لیے بہت اہم چیز ہے کیا؟" اس نے سوال کیا۔ "میں سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔"

"ایسا کہنا آسان ہے فہد..... اور کرنا....." وہ رکی۔ "بہت طویل سفر ہے کر کے دکھانا اور جیسے تمہیں مجھ سے انسیت محسوس ہوتی ہے ویسے ہی مجھے بھی تم سے محسوس ہوتی ہے، میں تمہیں اس لیے کٹھن سفر کا مسافر نہیں بنا سکتی۔"

"گویا تم مجھے ریجیکٹ کر رہی ہو؟" فہد نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا میری اوقات کسی کو ریجیکٹ یا قبول کرنے کی ہے؟" جواب میں میرال نے سوال کیا۔

"تمہاری اوقات....." فہد نے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا اب بھی تمہیں اس کے بارے میں کوئی شک ہے؟"

"نہیں کوئی شک نہیں ہے۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "لیکن میں انسانوں کے لیے آزمائش بن کر نہیں جینا چاہتی..... آزمائش کہنے کو صرف ایک لفظ ہے مگر اس میں سے گزرنا پوری قیامت ہے تمہیں اندازہ نہیں۔"

"پھر اگر میں نہیں تو کون ہے جو آزمائش میں پڑے بغیر تمہیں اپنا سکے گا؟" فہد نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے علم نہیں لیکن تمہیں ایک مشورہ دوں گی کہ اگر تمہارے اندر قربانی کا جذبہ ہے تو تم اس کو اپنا لو، جو تمہیں چاہتی ہے، جس کے لیے تمہارا ساتھ اہم ہے۔"

فہد اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے ایک گہری سانس لیتے ہوئے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی دائیں ٹانگ کا ہلتا گھٹنا اس کے اندرونی اضطراب کو صاف ظاہر کر رہا تھا۔

"اپنا من چاہا پا لینے کی خوشی اپنی جگہ..... لیکن کسی کا من چاہا اسے دے دینے کی خوشی بھی محسوس کرنی چاہیے کبھی..... اس کا الگ ہی مزہ ہوتا ہے۔" میرال نے کہا۔

"تم جانتی ہو وہ تم سے کتنی جیلس ہوتی ہے۔" فہد نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"یہی تو اس کی تم سے محبت کی واضح ترین علامت ہے۔" میرال نے فوری جواب دیا۔

"محبت.....؟" فہد کے لہجے میں استہزائیہ تھا۔ "وہ احساسِ کمتری کا شکار ہے۔"

"اسے اس احساسِ کمتری سے تم ہی نکال سکتے ہو، دوسروں کے لیے جینے میں بہت مزہ ہے فہد، تم ایک بار آزما کر تو دیکھو۔"

"میں اس suggestion پر احتجاج اس لیے نہیں کروں گا کہ یہ تم دے رہی ہو اور تم میرے لیے کتنی اہم ہو، اس کا اندازہ شاید تمہیں کبھی نہیں ہو سکے۔"

"اگر تم میری تجویز مان لو تو یقیناً مجھے اندازہ ہو جائے گا۔"

فہد نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنا آئی فون نکال کر اس پر ایک نمبر ملایا۔

"ہیلو علینہ..... کیسی ہو تم؟" اس کی آواز کمرے میں گونجی تھی۔

"سنو آج شام تک میں ایبٹ آباد پہنچ رہا ہوں، نادیہ آنٹی سے ملاقات ہو سکتی ہے ناں.....؟"

"نہیں، میڈیکل ایڈوائس نہیں لینی، مجھے تمہیں پرپوز کرنا ہے آنٹی نادیہ کے سامنے۔"

میرال غور سے فہد کی بات سن رہی تھی اور اس آخری بات کے ردِعمل کو گفتگو میں شریک نہ ہوتے ہوئے بھی سمجھ سکتی تھی۔

''چپ کیوں ہوگئیں؟'' فہد کہہ رہا تھا۔

"you there?" پھر اس نے سوال کیا تھا۔

''ہاں تو بس پھر میرا انتظار کرو آج میں پہنچوں گا کل ہم لوگ ٹھنڈیانی چلیں گے۔ اوکے.....!'' فہد کہہ رہا تھا۔

☆☆☆

'' پہلے تو تمہاری ساس کہتی تھی کہ اس کی کوئی بیٹی نہیں ہے، اب اچانک یہ بیٹی کہاں سے نکل آئی؟'' ہینش کی اماں نے دانیال کے گھر سے واپسی پر اس سے کہا تھا۔ دانیال ہینش کو میرال کے بارے میں بتا چکا تھا اور اماں کو میرال کی کہانی سنانا طوفان کھڑا کر دینے کے مترادف تھا۔

''انہوں نے آپ کو بتایا ہی ہوگا اماں؟'' ہینش نے ڈپلومیٹک جواب دیا۔

''ہاں نہیں کیا بتا رہی تھیں کہ بچھڑی ہوئی بھانجی دوبارہ ملی ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''مگر میرا دل نہیں مانتا اس لڑکی کا تو ماندرا (چہرہ مہرہ) ہی ان لوگوں سے نہیں ملتا ہو تو دور سے کشمیرن لگتی ہے کی۔''

''افوہ.....اماں آپ بھی کیا بال کی کھال اتارنے لگ جاتی ہیں۔'' سلیم جھنجلا کر بولا۔ ''ہوسکتا ہے دانیال کا خالو کشمیری ہو پیچھے سے۔''

''لو.....'' اماں نے ایک اور نکتہ نکالتے ہوئے کہا۔ ''اگر ایسا ہے تو پھر تو بھی ان ممکلوں کا خاندان تو بھان متی کا کنبہ ہی ہے، کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔''

''جو بھی ہے، آج تک کسی نے ان کے خاندان کی طرف انگلی تو اٹھائی نہیں، ایک آپ ہیں کہ جب موقع ملتا ہے ان میں کیڑے نکالنے لگتی ہیں۔'' کلیم بھی زچ ہو کر بولا۔

''جہاں کیڑے ہوں گے وہیں نظر بھی آئیں گے اور نکالے بھی جائیں گے۔'' اماں ہٹ دھرمی سے بولیں۔ ''تم لوگوں کو نہ جانے کاہے کا ہوکا لگا ہوا ہے، تمہارا بس چلے تو آج ہی بہن کی انگلی پکڑ کرا سے ان کے گھر چھوڑ آؤ۔''

''وہ لوگ ہیں ہی اتنے اچھے.....ہمیں تو ان میں اور خود میں کوئی فرق نہیں نظر آتا۔'' سلیم نے بے نیازی سے کہا۔

''سب جانتے ہیں اچھے کیوں ہیں۔'' اماں کی زبان خاموش رہ ہی نہیں سکتی تھی۔ ''لڑکا ان کا ٹٹ بھج (ٹوٹ پھوٹ) کر دوبارہ جڑا ہے، اللہ جانے کون کون سی مشینیں اس کے اندر ڈالی گئی ہوئی ہیں، ربڑ کی آنتیں اور پلاسٹک کا معدہ.....انہوں نے تو اچھا ہونا ہی ہے، انہیں ہینش کے گنوں والی لڑکی اور کہاں ملنی تھی۔''

''افوہ اماں.....'' کلیم سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ''ان کا بیٹا ہیرا ہے ہیرا.....'' وہ جتانے کے سے انداز میں بولا۔ ''وہ چاہتے تو اونچے سے اونچے گھرانے میں اس کا رشتہ کر لیتے مگر آپ نے دیکھا نہیں کتنی عاجزی، کتنی خدا خوفی ہے ان میں، دولت، پیسے اور اسٹیٹس کے فرق کو فرق سمجھتے ہی نہیں وہ لوگ جب ہی تو خود چل کر رشتہ لے کر آئے تھے۔''

''بڑا احسان کیا تھا ناں جو رشتہ لے کر آئے تھے، نہ آتے تو ہم نے ان کے گھر جا کر رشتہ دینے نہیں آنا

تھا۔" اماں اب بھی پوری اکڑ دکھا رہی تھیں۔

"بس اماں بہت ہوگئی۔" بالآخر سلیم تختی سے بولا۔" وہ لوگ جیسے بھی ہیں اب ہمارے کُرم (سمدھی) ہیں، کوئی بات نہیں ہوگی اب ان کے سلسلے میں۔ رہی آپ کی برادری تو جا کر سُن کون ایسا ہے جو رشتے والی بات سن کر رشک نہیں کر رہا بینش کی قسمت پر۔" اب اماں کو بیٹے کے تیور ٹھیک نہیں لگے اسی لیے سر جھٹک کر خاموش ہوگئی تھیں۔

"کتنی عجیب سی بات ہے ناں......" اس رات بینش نے اپنے بستر پر بیٹھے کتاب میں رکھی دانیال کی تصویر دیکھتے ہوئے کہا۔" مائیں اپنی بیٹیوں کے لیے شہزادوں کے خواب دیکھتی ہیں اور جب کوئی شہزادہ واقعی آن پہنچتا ہے تو اس میں کیڑے نکالنے لگتی ہیں۔"

"تمہاری اماں غلط نہیں ہیں۔" اگلی صبح کیفے میں بیٹھے دانیال نے اسے بتایا تھا۔" وضعدار اور پرانے خیالات کے لوگوں کی طرح ان کا ری ایکشن فطری ہے۔ ہمارا معاشرہ پروگریشن کے فیز سے گزر رہا ہے، پرانے کو نئے میں تبدیل ہوتے ٹائم تو لگے گا، یہ کیا کم غنیمت ہے کہ انہوں نے ہمارا رشتہ ہو جانے دیا ہے۔"

"انہیں میرال والی بات پر بھی تشویش ہے۔" بینش نے اسے بتایا۔

"فکر مت کرو، ہم جلد از جلد میرال کی شادی کسی بہت اچھی فیملی میں کرنے کی فکر میں ہیں جب تک تم میرے گھر آؤ گی، میرال والا معاملہ ویسے ہی نمٹ چکا ہوگا۔" دانیال نے بے فکری سے کہا۔

"ویسے وہ حقیقت میں کتنی خوب صورت ہے ناں......" بینش نے یاد کیا۔" ایسے لگتا ہے مجسم حسن نہیں خواب دیکھ رہے ہوں۔"

"ہوں......" دانیال نے کہا۔" یہی حسن تو اس کا دشمن بن گیا...... اور دیکھو اسے کن کن راستوں سے گزارتا کہاں تک لے گیا۔"

"وہ جو منسٹر صاحب ہیں، کیا وہ نہیں کریں گے میرال سے شادی؟" بینش نے تجسس کے مارے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ نہیں۔"

"ہاں...... وہ کیوں...... میرا خیال تھا کہ وہ اس کی محبت میں ہی یہ سب کرتا رہا۔" بینش کا ردعمل فطری تھا۔

"ہم سب کا بھی یہی خیال تھا...... مگر لگتا ہے اس کے سیاسی اور خاندانی حالات اسے اس شادی کی اجازت نہیں دیں گے۔" دانیال نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"تو ان لوگوں کو کیا فرق پڑتا ہے، یہ تو خفیہ شادیاں کرنے کے ماہر ہوتے ہیں۔"

"میرال اس کے لیے شاید...... one and only والا معاملہ ہے۔" دانیال نے کہا۔" میرا مطلب ہے یہ میرا تجزیہ ہے اس کے بارے میں۔" اس نے بینش کو وضاحت دیتے ہوئے کہا۔" اور جب کوئی کسی کی زندگی میں ایسا امپورٹنٹ ہو تو پھر وہ اس تک پہنچنے اور اسے پانے کے لیے چور راستے نہیں ڈھونڈتا...... مہرزاد خان نے ممی سے خود کہا ہے کہ کوئی اچھا لڑکا دیکھ کر میرال کی شادی کروا دیں۔"

"ہائے......" بینش نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔" کتنا مشکل ہے ناں یہ کہنا۔"

"وہ بہت مختلف شخص ہے، اس کے مضبوط جسم کے اندر اس سے بھی زیادہ مضبوط دل و دماغ موجود ہے اور اس پر وہ پورا اختیار بھی رکھتا ہے۔" دانیال نے کہا۔" میں نے اس سے ملاقات کے دوران اسے مکمل آبزرو

کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ مجھے بہت اچھا لگا۔ وہ بہت سوں سے بہت مختلف ہے۔"

"اور ہم پچھلے کئی مہینوں سے اسے گالیاں دیتے چلے آ رہے تھے۔" بینش نے کہا۔

"اور اس نے وہ گالیاں بھی پھول سمجھ کر وصول کیں..... سوچو تو وہ میراں کے لیے کیا جذبہ رکھتا ہوگا۔"

"ایسا جذبہ کہ اپنے سیاسی کیریئر پر محبت قربان کر دی۔" بینش کے لہجے میں طنز تھا۔

"میں فی الحال کچھ کہہ نہیں سکتا۔ وہ بہت unpredictable انسان ہے، دیکھتے ہیں وہ آگے کیا کرتا ہے۔" دانیال نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہیلو گائز....." سامنے سے آتی ثمرین نے دانیال کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔ "بلکہ مجھے کہنا چاہیے ہیلو لو برڈز۔"

"ہیلو ثمرین۔" دانیال نے چہرے پر اتر آتی ناگواری کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"سو فائنلی تم نے اس لڑکی سے رشتہ جوڑ ہی لیا۔" ثمرین نے ایک حقارت بھری نظر بینش پر ڈالی۔ "تم جہاز سے کیا گرے تمہاری چوائس اور سلیکشن بھی آسمان سے زمین پر آ گریں، مجھے تم سے ہمدردی ہے۔"

"کیوں ہمدردی ہے تمہیں؟" دانیال وہاں سے جانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے دوبارہ بینش کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تمہاری چوائس دیکھ کر۔" ایک مزید حقارت بھری نظر بینش پر ڈال کر وہ بولی۔ "ایک ایسی لڑکی جسے ڈھنگ سے اردو بھی بولنی نہیں آتی، جو لگتا ہے ڈریس اپ بھی اپنی مادری زبان میں ہوتی ہے، جسے کلچر اور آرٹ اور لٹریچر سے زبردستی کا لگاؤ ہے اور جسے دنیا کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں، تم نے اس سے منگنی کر لی.....؟ تمہاری غریبانہ سوچ پر مجھے ہمدردی کیوں نہ ہو تم سے، آفٹر آل ہم پرانے دوست ہیں۔"

"ثمرین بینش میری منگیتر ہے اور اس کے بارے میں ایسے الفاظ دوبارہ استعمال... کرنے کی اجازت میں تمہیں نہیں دوں گا۔" دانیال نے اپنے اشتعال کو قابو کرتے ہوئے کہا۔ "بہت اچھا ہوا میں جہاز سے گرا، گرنے کے بعد مجھے زمین پر موجود ہر چیز زیادہ واضح نظر آنے لگی، ورنہ اس سے پہلے میرا حال یہ تھا کہ بستا زمین پر تھا اور اڑتا آسمانوں پر تھا، نہ زمین کی مخلوق تھا نہ آسمانوں کی..... جب ہی تو کوؤں اور ہنسوں میں فرق نہیں کر سکا کبھی۔"

"ویری..... sarcastic اینڈ ویری فنی۔" ثمرین طنزاً بولی۔ "آئی وش تمہیں کبھی اپنے فیصلے پر پچھتانا نہ پڑے۔"

"انشاء اللہ کبھی ایسا نہیں ہوگا۔" دانیال نے مضبوط لہجے میں کہا۔

ثمرین ایک اور حقارت اور طنز بھری نظر بینش پر ڈال کر وہاں سے اٹھ گئی۔ دانیال نے اسے دور جاتے دیکھا اور پھر گردن موڑ کر اپنے پہلو میں بیٹھی بینش کو جس کی آنکھوں میں آنسو بھر رہے تھے۔

"ارے یہ کیا....." اس نے بینش کا سر نرمی سے اونچا کیا۔

"اتنی انسلٹ..... اتنی humiliation" بینش نے بدقت کہا۔ "آپ کے ساتھ میں..... مجھے ہر دم اسی کا ڈر رہے گا۔"

"احمق ہو تم جو اس خوف میں مبتلا ہو۔" دانیال نے ٹشو پیپر اسے پکڑاتے ہوئے کہا۔

"ارے میری جان..... میں جو تمہارے ساتھ ہوں ہر دم..... ہر لمحہ اور میرے گھر والے بھی..... پھر تمہیں ایسے رویوں کا خوف کیوں ہے۔" وہ اسے دلاسا دے رہا تھا..... لیکن بینش کے دل سے تذلیل کا

احساس نہیں جا رہا تھا۔

"میں نے تم سے ایک بار کہا تھا انسان کو اپنے بارے میں کانفیڈنٹ ہونا چاہیے...... اگر وہ غلط نہیں ہے تو دنیا کے سارے لوگ جو مرضی کہتے رہیں وہ غلط نہیں ہو سکتا اور یہی کانفیڈنس دنیا کی زبانیں بند کرا کے چھوڑے گا...... ابھی میں نے تمہیں مہرزاد خان کے بارے میں بتایا...... ہم تو ہم اللہ جانے اس نے کہاں، کہاں سے کیا کچھ نہ سنا ہوگا، کیا کچھ نہ فیس کیا ہوگا مگر تم نے اس کے اعتماد کا لیول نہیں چیک کیا شاید چلتی گولیوں سے خود کو نکال کر ہمارے پاس پہنچا گیا اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی، رول ماڈلز صرف اچھی دنیا میں ہی نہیں تلاش کرنے چاہئیں، رول ماڈل ہم سب کی دھتکاری ہوئی دنیا میں بھی مل جاتے ہیں......اور یہ ثمرین...... "اس نے اُسی سمت دیکھا جدھر ثمرین گئی تھی۔

"pity on her...... وہ صرف تم سے جیلس ہو رہی ہے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے وہ تم سے حسد کر رہی ہے، دل میں تم پر رشک کر رہی ہوگی، اس سے ثابت ہوا کہ تم ہر چیز سے ہر بات سے above ہو۔"

بینش نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

"بس کرو اور اب جو میں کرنے والا ہوں اس میں مجھے پوری طرح سپورٹ کرنے کی تیاری کرو۔" پھر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"کیا کرنا ہے؟" بینش نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ محبت کا ایسا اظہار تو مردے میں بھی جان ڈال سکتا تھا اور اس نے تو ابھی جینا شروع کیا ہی تھا۔

"ایک تو اپنی آرٹ گیلری بنانی ہے، بی اینڈ ڈی ایکسپریشنز کے نام سے اور جس میں تمہارے سٹی اسکیپرز اور کیلی گرافی کے شاہکار خصوصیت کا درجہ رکھتے ہوں گے...... اور دوسرا یہ کہ میں دوبارہ سے فلائنگ کلب جوائن کرنے والا ہوں۔"

"نہیں...... یہ نہیں ہوگا۔" بینش نے گھبرا کر کہا۔ "آپ فلائنگ کلب...... ہرگز نہیں جاؤ گے۔"

"میں ضرور جاؤں گا لیکن ایک نئے عزم کے ساتھ، اسکائی از دی لمٹ کے نعرے کے ساتھ، اب میں beyond the skies جانے کا دعویٰ نہیں کروں گا اور تم دیکھو گی کہ اس بار میں کیسا بیبا فلائر بنوں گا۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ بینش نے بھی مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

☆☆☆

"مجھے معلوم نہیں محترمہ آپ نے میرے بیٹے کو کیسے ورغلا لیا، ایک ایسی لڑکی سے شادی کرنے کی ضد کرنے لگا ہے وہ جس کا آگا پیچھا ہی ٹھیک نہیں، تو یہ تو یہ آپ کو خدا کا خوف نہیں آیا، ایسے نامور خاندان کے بیٹر تلے ایسا لغو اور چھوٹا کام کرتے ہوئے۔" عافیہ کو یہ جملے سنتے ہوئے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا، یہ جملے حمزہ کی ممی بول رہی تھیں اور بولتے ہوئے کہیں سے بھی مہذب اور پڑھی لکھی خاتون نہیں لگ رہی تھیں۔

"کیا کمی دیکھی آپ نے میرال میں جو ایسے کہہ رہی ہیں؟" عافیہ پوری کوشش کے ساتھ ایسے نرم الفاظ بولنے میں کامیاب ہوئی تھیں۔

"کمی......؟" وہ ہاتھ پھیلا کر بولیں۔ "کوئی ایک کمی ہو تو بولوں...... اغوا شدہ، کوٹھے والیوں کے ہاں رہنے والی، منسٹر کی داشتہ، جسے اچھی طرح برت کے وہ آپ کے حوالے کر گیا اور اب آپ اس کے ذریعے شریف خاندانوں کے لڑکے پھنسا رہی ہیں، خدا کا خوف کریں...... سنا ہے بڑی اللہ والی بنی ہیں آپ ویسے تو،

اللہ رسولؐ کے نام کے پردے تلے یہ حرکتیں، توبہ توبہ بی بی خدا کو کیا منہ دکھاؤ گی کل کو۔" عافیہ کا واسطہ ایک بد زبان اور مغرور خاتون سے پڑ رہا تھا اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان خاتون کو کیسے ہینڈل کریں۔

"پھپھو آپ تو کوئی اور بات کرنے کا کہہ کر لائی تھیں مجھے۔" خاتون کے ساتھ آنے والی لڑکی شرمندہ، حیران اور پریشان تھی، یہ لڑکی نگین تھی جسے مہرین خاص طور سے اپنے ساتھ لے کر آئی تھیں۔

"میں یہی کہنے اور ان محترمہ سے یہی پوچھنے آئی تھی۔" انہوں نے نگین سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

"دیکھیے محترمہ، میں آپ کے بیٹے کی نیک دلی، شرافت اور نیک فطرتی کی وجہ سے آپ کی باتیں برداشت کر رہی ہوں۔" بالآخر عافیہ کے صبر کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

"ہماری شریف، باعصمت، باکردار بچی پر یہ واہیات الزام لگانے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔ خدا سے مجھے مت ڈرائیں، خود اس کا خوف کریں کہ آپ کسی بات کے سیاق و سباق کو جانے سمجھے بغیر ایک خاندانی، باعزت بچی پر شرمناک الزام لگا رہی ہیں، معافی مانگنی چاہیے آپ کو اللہ تعالیٰ سے، اس سے پہلے کہ آپ اس کے غضب کی پکڑ میں آ جائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کے بیٹے کو نہ تو کسی نے یہ رشتہ جوڑنے پر مجبور کیا ہے نہ ہی اکسایا ہے، وہ اپنی مرضی سے یہ رشتہ مانگنے آیا تھا۔"

"ارے اتنی ہی شریف اور باعصمت و باکردار ہے یہ لڑکی تو آپ اپنے بیٹے سے کیوں نہیں جوڑ لیتیں اس کا رشتہ، آپ کا بھی تو ایک بیٹا کنوارا ہے ناں.....؟" مہرین نے چمک کر کہا۔ "نیکی کرنے کا شوق چرایا ہے ناں تو بسم اللہ اپنے گھر سے کیوں نہیں کر لیتیں۔ بجائے دوسروں کے گلے منڈھنے کے لڑکی کو۔" عافیہ ایک دم خاموش ہو گئیں۔

"دیکھا کیسے سانپ سونگھ گیا انہیں، اب جب اپنے بیٹے کی بات آئی ہے۔" عافیہ کو خاموش دیکھ کر مہرین نے نگین کو کہنی مارتے ہوئے کہا، نگین عافیہ کی طرف بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔ "ذرا باندھ کر دکھائیں گندگی کے اس طوق کو اپنے بیٹے کے گلے میں پھر میں جانوں گی..... دوسروں کے بیٹے پھنسانے تو بہت آسان ہوتے ہیں۔" مہرین بولے چلی جا رہی تھیں۔

"پھپھو آپ کو بتایا تو تھا کہ وہ بی اماں کی نیکی کی.....؟" نگین نے کہنا چاہا۔

"ارے چھوڑو بی اماں اور ان کی نیکی کو.....؟" مہرین غصے سے غرائیں۔ "ساری عمر کے لیے بھوت بن کر چمٹ گئی بی اماں کی روح میرے حمزہ کو، ان کی مروت میں ایک دھکیل سے شادی کرنے چلا تھا۔"

"پلیز آپ خاموش ہو جائیں۔" عافیہ سے میرالل کے لیے بولا جانے والا یہ لفظ برداشت نہیں ہوا۔ "آپ کو اپنے بیٹے کی خواہش سے اتفاق نہیں ہے تو مت کیجیے یہ رشتہ مگر اب میں مزید آپ کو اس بچی پر کیچڑ اچھالنے نہیں دوں گی۔"

"اسے اپنی بہو بنا لیں..... باعزت مقام دے دیں، کیچڑ اچھلنی خود ہی بند ہو جائے گی۔ آپ جیسوں کے پردے میں چھپ کر تو کوئلہ بھی ہیرا بن جاتا ہے، اچھی رہیں گی میری مان کر، ورنہ ادھر ادھر کے لڑکے پھانسنے کے چکر میں تو یوں ہی بے عزت ہوتی رہیں گی۔"

"آپ فکر نہ کریں، مجھے اس بچی کی خاطر ایسا کرنا پڑا تو میں یہ بھی کر گزروں گی۔" عافیہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اللہ مجھے اس کی عزت کی چادر کی حفاظت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔"

عافیہ کے جواب نے نگین کے ساتھ ساتھ مہرین کو بھی ششدر کر دیا تھا۔

☆☆☆

سارا راستہ آنسو کسی گرم سیال کی طرح زوئی کی آنکھوں سے بہتے رہے تھے۔ خود پر پڑنے والی ناگہانی صورت حال کے غم سے زیادہ اسے نادر اور اس کی اماں کے رویے کی روکھائی اور بے اعتنائی نے حد درجہ دکھی کر دیا تھا۔ نادر کا رویہ اس کے لیے اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ اس سے آگے کچھ سوچنے کے قابل ہی نہیں رہی تھی۔ دائیں ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے شہباز صاحب کی طرف دیکھا۔ جن کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا تھا۔ ان کے ہاتھ اور ہونٹ لرز رہے تھے۔ زوئی کو بے اختیار ان پر ترس آنے لگا۔

"یا خدایا! صرف ایک چھوٹی سی نیکی وہ بھی غلط فہمی کی نیکی کی اتنی بڑی سزا۔" وہ کھڑکی سے باہر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے شکوہ کناں ہوئی۔

"لیں جی دفتر آ گیا، آپ آ جائیں نیچے۔" ایک بڑی سی عمارت کے گیٹ کے اندر جیپ داخل کرنے کے بعد روکتے ہوئے ڈرائیور نے کہا اور زوئی کے ساتھ والا دروازہ کھول دیا گیا۔ زوئی لرزتی ٹانگوں کے ساتھ پہلے خود جیپ سے اتری اور پھر شہباز صاحب کو سہارا دے کر اتارنے لگی۔

"بزرگ کے لیے وہیل چیئر لاؤ اوئے۔" ایک اہلکار نے اپنے ماتحت کو آواز دے کر کہا۔ دو منٹ کے بعد شہباز صاحب کے لیے وہیل چیئر آ گئی..... شہباز صاحب کی وہیل چیئر دھکیلتے اور اپنی ٹانگوں کو گھسیٹتے زوئی نے ایک مختصر فاصلہ طے کرنے میں کافی وقت لیا۔ ان کے آگے چلنے والا اہلکار ایک دفتر نما کمرے کے سامنے جا کر رک گیا اور دروازہ کھول کر اندر جھانکنے لگا۔

"صاحب اندر ہی بیٹھے ہیں، آپ آ جائیں۔" اس نے زوئی کو مخاطب کیا۔ زوئی اس کے پیچھے چلتی اندر داخل ہوئی۔ یہ ایک کشادہ اور خوب صورتی سے سجا دفتر تھا۔

"سر جائیز لڑکی اور بینک منیجر۔" اہلکار نے اعلان کیا، میز پر سر جھکائے شخص نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا اور جیسے تعظیماً کھڑا ہو گیا۔ اس شخص کے بال سفید اور چہرے پر طویل تجربے کی کہانی لکھی تھی۔

"آئیں پلیز بیٹھیں۔" وہ خوش دلی سے مسکراتے ہوئے اپنے سامنے رکھے صوفوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ "غلام محمد بہت اچھی اور پُرتکلف چائے بھجواؤ۔" پھر اس نے انٹر کام کا چونگا اٹھا کر کسی سے کہا۔

زوئی کے لیے یہ رویہ اور ماحول بھی غیر متوقع تھا۔ وہ شہباز صاحب کی چیئر دھکیلتی صوفے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی رہنمائی کرنے والا اہلکار کمرے سے باہر جا چکا تھا۔

"جی تو مس زوئی حسین۔" وہ شخص جو اس دفتر کا صاحب تھا زوئی کی طرف دیکھ کر بولا۔ "اور ملک شہباز صاحب!" پھر اس نے شہباز صاحب کی طرف دیکھا۔

"کیسے ہیں آپ؟"

"جی ٹھیک....." زوئی نے شہباز صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم نے شہباز صاحب آپ کے گھر پر بندے بھجوائے، آپ سے ٹیلی فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن آپ کا کچھ اتا پتا نہیں تھا۔" اس شخص نے شہباز صاحب سے کہا۔

"اور مس زوئی آپ کے تو خیر ہر بندے سے بات ہو گئی تھی۔" اس نے زوئی کی سماعت پر بمباری کی۔

"اور پھر ہمارے خفیہ والوں ہی کا کمال ہے کہ آپ کو مس زوئی کے گھر میں لوکیٹ کر لیا انہوں نے۔" پھر وہ شہباز صاحب کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"ہمیں یہاں کیوں لائے آپ؟" زوئی کی باریک آواز کمرے میں پھیلی۔

''آپ دونوں کو سلیوٹ کرنے کے لیے۔'' اس شخص نے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ ابتدائی فارم فل کروانے کے لیے۔'' اس نے دو فارم ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ لوگ اپنا، اپنا بائیو ڈیٹا خود درج کرلیں اس میں، مس زروئی۔'' اس نے زروئی کی طرف دیکھا۔ ''آپ کو بہت مبارک ہو، آپ کا نام اس سال سماجی بہبود کے لیے دی گئی خدمات کے سلسلے میں صدارتی تمغہ برائے حسنِ کارکردگی کے لیے فائنل ہو چکا ہے۔'' اس نے زروئی کی سماعت پر ایک مرتبہ پھر بمباری کرتے ہوئے کہا۔

''اور شہباز صاحب آپ کی دلیرانہ مدد جو آپ نے مس میرال صلاح الدین کو فراہم کی کے عوض آپ کو خصوصی انعام سے نوازا جا رہا ہے اور ان دونوں انعامات کی سفارش وزارتِ اطلاعات و نشریات کی طرف سے کی گئی ہے۔ میں خود بھی۔'' وہ شخص کھڑے ہوتے ہوئے بولا اور ماتھے پر ایک مرتبہ پھر ہاتھ لے جا کر سلیوٹ کے سے انداز میں ان کی طرف دیکھا۔ ''آپ دونوں کی اس خاموش خدمت پر آپ کو سلیوٹ کرتا ہوں۔''

اس دفتر کی مشرقی دیوار پر سجے پاکستان کے قومی پرچم اور بڑے سے منقش فریم میں جڑے پاکستان کے نقشے پر زروئی کی نظر پڑی۔ وہ جغرافیائی حدود کی حقیقت کو نہ مانتے ہوئے اس ملک کی شہری بننے پر بضد رہی تھی اور اس نے اس خواہش کے پورا ہونے کے بعد کتنی ہی بار سوچا تھا کہ اس نے ایسا کر کے اپنے سیدھے سادے راستے میں کیسے کانٹے بو لیے تھے جو اس کے پیر چلتے، چلتے آبلہ پا ہونے لگے تھے..... مگر یہ اس کی نیت، شوق لگن، یونیورسل محبت کی سچائی تھی جو اس روز ایک ایسے صلے کی شکل میں اس کے سامنے آئی تھی جس کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے ڈبڈبائی نظروں سے شہباز صاحب کی طرف دیکھا..... جن کی اپنی آنکھوں سے اشک رواں تھے اور وہ اسی مشرقی دیوار کی طرف چہرہ موڑے ماتھے پر ہاتھ رکھے پرچم کو سلیوٹ کر رہے تھے۔

اس روز گھر واپسی پر زروئی کا ارادہ نادر سے ایک بہت بڑا جھگڑا کرنے کا تھا..... لیکن گھر واپسی پر اس کے سامنے ایک انوکھا ہی منظر موجود تھا۔ اس کی ساس، سب نندیں، نندوئی ان کے بچے اور شہباز صاحب کی بیگم ان کے راستے میں پھول بکھیرے، پھولوں کے ہار اور گجرے لیے اس کے اور شہباز صاحب کے منتظر تھے۔ گھر کا ہر کمرا سجا ہوا تھا اور میز پر مٹھائیوں اور کیک کے ان گنت ڈبے رکھے تھے، وہ اتنے بھرپور انداز میں اپنی سسرال اور اپنے پاکستان میں قبول کرلی گئی تھی کہ اس کی پچھلی تمام تکلیفیں اور آبلہ پائی اسے بھولنے لگی تھی۔

''تم بہت بے ایمان ہو نادر.....'' مٹھائی کھاتے ہوئے اس نے باریک آواز میں چلاتے ہوئے کہا۔

''اور آپ بھی اماں۔'' پھر اس نے ساس کی طرف دیکھا۔

''ہمیں تو کب سے ہی پتا تھا، ہم نے سوچا تمہیں دہ دیا جائے کیا بھلا نادر.....؟'' اماں نے نادر کی طرف دیکھا۔

''سرپرائز..... ہاں سرپرائز.....'' نادر کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

''بس میں کچھ نہیں جانتی زروئی، مجھے تو تم چائنا سے اصلی چائنیز ڈیکوریشن پیس لا کر دوگی جب اگلی بار وہاں جاؤ گی تو.....'' یہ نادر کی آپا تھیں جنہیں سب سے زیادہ اس سے اختلاف تھا۔ جادو کی چھڑی سی چلی تھی اور منظر یکسر بدل گیا تھا۔ اسی ہفتے کے اختتام پر شہر کے ایک اچھے بینکویٹ ہال میں زروئی اور نادر کے ولیمے کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں حمزہ محمود درانی نے بطورِ خاص شرکت کی تھی اور زروئی سے اس ساری تکلیف پر معذرت کرتے ہوئے جو اسے ایجنسیز کی تحقیقات کے دوران اٹھانی پڑیں، خود اس کے سامنے کھڑے ہو کر اسے سلیوٹ کیا تھا۔ یہ ایک ایسا سلیوٹ تھا جس کا حمزہ نے نادر سے وعدہ کر رکھا تھا۔

☆☆☆

"تم بھی تو جذبۂ خدمت سے سرشار ہوناں دانیال...... پھر قربانی کی تو کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ بے در پے بھی، میرال کے رشتے کے سلسلے میں جس قسم کی گفتگو سن چکی ہیں انہیں یہ فیصلہ اسی وجہ سے کرنا پڑا۔" شاندانہ نے اپنے بیڈ پر سیدھے لیٹے دانیال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"قربانی کی کوئی تک بھی تو بنتی ہوناں بھابی۔" دانیال بے بسی سے بولا۔ "آپ خود جانتی ہیں کہ یہ کیسی بے تکی بات ہے۔"

"دیکھاناں...... جب بات خود پر آئے تو کیسا لگتا ہے۔" شاندانہ نے اکسایا۔ "ہم اِدھر اُدھر جہاں بھی میرال کی شادی کرنے کی کوشش کریں گے ہمیں کم وبیش ایسی ہی باتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایک تم ہو جو سب جانتے ہو، سب سمجھتے ہو یقین کرتے ہو اور مانتے بھی ہو۔"

"پلیز بھابی مجھ سے اتنی بڑی بات کی توقع نہیں کی جائے، آپ جانتی ہیں کہ میں نے کبھی میرال کو اس اینگل سے نہیں دیکھا اور پھر بینش کے ہوتے ہوئے میں ایسا سوچ بھی کیسے سکتا ہوں۔" دانیال نے کہا۔

"دیکھو دانیال...... بینش اتنی اچھی لڑکی ہے، اس کے پیچھے ایک اچھی فیملی بیک گراؤنڈ ہے، اسے تو کوئی بھی اپنانے میں فخر محسوس کرے گا مگر میرال......" شاندانہ نے اپنی بات ادھوری چھوڑتے ہوئے دانیال کی طرف دیکھا جو اٹھ کر بیٹھ گیا تھا، اس کی نظریں خلا میں جمی تھیں اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

☆☆☆

"پھوپو نے بہت بڑی زیادتی کی ہے حمزہ، انہیں سوچ سمجھ کر یہ بات منہ سے نکالنی چاہیے تھی...... مجھے تو بہت پہلے سے اس ہنگامے کی توقع تھی۔" نگین نے عافیہ کے گھر سے واپسی پر سب قصہ حمزہ کے گوش گزار کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ممی نے بہت بڑی حماقت کی جو یہ سب وہاں جا کہا......" جواب میں حمزہ کا ردِعمل نگین کی توقع سے زیادہ شدید تھا۔ "ممی نے بی اماں کے حوالے کر کے بھی مجھے نہیں کھویا تھا لیکن آج شاید انہوں نے ہمیشہ کے لیے مجھے کھو دیا۔" وہ جذباتی ہو رہا تھا۔

"میں بی اماں کے ہاتھوں پلا بڑھا ہوں نگین۔" پھر اس نے نگین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "بی اماں جو رتبوں، روایتوں، وضع داریوں اور اپنی بات کا پاس کرنے والی نسل کی امین تھیں۔ بی اماں نے یہ سب خصوصیات گھٹی کے ساتھ میرے اندر بھی ڈال دیں جب ہی تو میں تم لوگوں کی اور ممی کی اس دنیا میں مس فٹ ہوں، خدا کی قسم نگین میں اگر بی اماں کی بوائی سے کمٹ منٹ کے بارے میں نہ بھی جانتا ہوتا تو میرال کے لیے اپنا پرپوزل ضرور بھجواتا کیونکہ ابھی تو اسے کسی مسیحا کی ضرورت ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ اس کے لیے مجھ سے بہتر کوئی اور مسیحا ہو سکتا ہے، میں تو خود اپنی ذات کی تنہائی کا شکار ہوں اور اپنے ہی جیسی کسی شریکِ حیات کے ساتھ بی اماں کا گھر بسانا چاہتا ہوں مجھے ان خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ جو مجھ میں ہیں کون قبول کرے گا بھلا؟"

نگین کے پاس حمزہ کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا...... وہ تو اس کے پرپوزل کے ردِعمل میں ہر ایک کی رائے سن کر حیران ہو رہی تھی اور تو اور روشن خیال اور تعلیم یافتہ اشعر میاں بھی حمزہ کی تجویز پر اعتراض کر رہے تھے۔

"حقیقت چاہے جو بھی ہو، ہم شریف خاندان کے لوگ ہیں نگین، حمزہ کو ہمیں ہماری ہی نظروں

میں شرمندہ کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔" اشعر کے کشف نے نگین کو حیران کر کے رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

"کیچڑ میں کھلے پھول کو کیچڑ میں ہی پڑے رہنے دینا چاہیے کیونکہ وہ کیچڑ سے باہر نکل کر بھی اپنی اصلیت کے ساتھ ہی پہچانا جاتا ہے، شاید وہ کیچڑ میں ہی بھلا اچھا لگتا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے کیچڑ کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔" بہت دن پیچھے مہرزاد خان نے میرال سے رابطہ کیا تھا اور اس کی کہی بات سنی تھی۔

"آپ عزت داروں کا معاشرہ مجھے قبول کرنے سے انکاری ہے کسی اور کی کیا کہیں خود آپ بھرے ہجوم میں میری گواہی دینے کا دعویٰ کرنے کے باوجود مجھے قبول کرنے سے انکار کر چکے ہیں باقی کے لوگ تو عام دنیا" ہیں اور دنیا کو کیا پڑی اس گواہی پر آمنا و صدقنا کہے۔" وہ کہہ رہی تھی۔

"تم جتنا زیادہ مجھ سے بدگمان ہوتی ہو مجھے اتنا ہی زیادہ اطمینانِ قلب محسوس ہوتا ہے۔" مہرزاد خان نے دل میں سوچا تھا۔ "بہت بہتر ہے تم مجھے بہت برا جانو اور بردوں کی زندگی میں اچھی چیزیں بجتی نہیں، میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہاں خوب صورتی کے اندر بدصورتی بستی ہے اور وہاں تم جیسے لوگ بچتے ہیں نہ ایسی بدصورتی کے درمیان جی پاتے ہیں، ہم ایسوں کے اصول دور سے ہی سہانے لگتے ہیں میرال صلاح الدین اور تمہیں اس بدصورتی میں بسا کر جیتے جی تمہارا گلا گھونٹ دینے کا گناہ میں کیسے کر سکتا ہوں...... جبکہ میں نے تو خود تمہیں ... زرنگار کی بدصورتی سے نکال کر میرال صلاح الدین بنا دینے کے لیے اپنے نفس کا گلا خود اپنے ہاتھوں سے گھونٹے رکھا...... میں واپس تمہیں نفس کی خود غرضی کی، سیاہ کاری، جھوٹ، فریب، ذاتی انا، جھوٹی انا پرستی اور جاہلانہ رسم و رواج کی دنیا میں لے جانے کا جرم نہیں کر سکتا۔ مجھے معاف کر دینا، میرال میرے قدم میری حدود پر کھڑے ہیں، ان سے پار جانے کی کوشش کروں گا تو خود تو تباہ ہو ہی جاؤں گا، تمہاری بربادی کا بھی باعث بن جاؤں گا۔" وہ کہہ رہا تھا اور اس کے الفاظ میرال کے دل پر آنسو بن کر گر رہے تھے۔

"مجھے قسم ہے اس عظیم جذبے کی جو تم پر پہلی نظر پڑتے ہی میرے دل میں جاگا تھا، جس کے اثر میں، میں آگے چلا، کہانیاں کہنے اور کہانیاں سننے کے سلسلے سے آگے ایک ہزار راتوں کی قیمت ادا کرنے تک اور پھر اس سے بھی آگے اس کیچڑ میں جہاں تم جیسا کنول ڈولتا تھا، اس بدصورتی جس نے تم جیسی خوب صورتی کو اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا تک رسائی کے دوران کوئی لمحہ ایسا نہیں آیا جب میرے دل نے تمہاری تمنا نہ کی ہو، میرے حواسوں سے اتر کر تم کہیں اور چلی گئی ہو۔ دنیا مجھے سیاست کرتے، انتخاب لڑتے، تقریریں کرتے، جیتتے، جشن مناتے، وزارت کا حلف اٹھاتے، پیشہ ورانہ ذمے داریاں پوری کرتے ہر روز دیکھتی رہی مگر قسم ہے مجھے اپنے رب کی اس سب کے دوران بھی کوئی لمحہ ایسا نہیں تھا جب تم میری سوچ پر حاوی نہ تھیں......" وہ کہہ رہا تھا۔

"میرا جذبہ کتنا عظیم تھا اس کی سب سے بڑی گواہ تم خود ہو میرال...... وہ راتیں یاد کرو، جن میں تمہارے، میرے، تنہائی اور میرے اختیار کے سوا صرف خدا تھا۔" میرال کا دل لرزنے لگا۔

"وہ دن یاد کرو جب اس مرنے والے اور اس کے بیٹے کی قید سے نکال کر میں تمہیں اپنے ریسٹ ہاؤس میں لے گیا، کتنے دن، ہفتے، مہینے تمہارے وہاں گزرے، کیا مجھ ایسے شیر کے دانت تیز نہ تھے یا شکار تر و تازہ نہ تھا؟"

میراں کا دل اپنے کہے لفظوں کے ایک ایک حرف پر ہزاروں ہزار بار ندامت کی گہرائیوں میں ڈوبنے لگا۔

"کیا تھا جو میں مسز جہانگیر اور ان کے دوستوں کی اٹھتی آواز کو شروع میں ہی دبا دیتا، میرے پاس اختیار نہ تھا یا مجھے خود پر اچھلتی کیچڑ اچھی لگتی تھی؟" حقیقتیں مزید عریاں ہو کر میراں کو اپنا آپ دکھانے لگیں۔

"اور پھر مجید خان تو مر ہی گیا تھا، دو چار گولیوں کی زد میں تم بھی آ جاتیں، قصہ ہی ختم ہو جاتا، مسز جہانگیر اور ان کے دوستوں کے اٹھتے ہوئے قلم مجھے عظیم ترین شخصیت کروانے لگتے، برستی گولیوں میں خود کو جھونک کر، پروٹوکول اور پوزیشن کی پروا کیے بغیر جان پر کھیلتے ہوئے اپنا وعدہ ایفا کرنے کی مجھے کیا ضرورت تھی میراں اگر تمہارا میری نظر میں وہ مقام نہ ہوتا جو ہے۔" میراں کو پہلی بار اس کی آواز بھرائی ہوئی محسوس ہوئی۔

"خدا گواہ یہ سب سچ ہے۔" میراں نے بہ مشکل حلق میں گھٹے الفاظ ادا کیے۔ "لیکن اب جبکہ آگ کا دریا عبور ہو چکا، پھر مجھے کیوں زندگی کی بستی میں تنہا چھوڑے جاتے ہیں۔"

"کیونکہ میں تمہیں اپنے ساتھ کی پل، پل کی موت مرتے نہیں دیکھ سکتا۔ خود اپنے ہاتھوں سے تمہیں زندگی کی بسی بسائی بستی میں چھوڑ کر آیا ہوں۔ واپس آگ کے دریا میں لپیٹنے لے آؤں۔ میں بہت بہادر، بہت ذہین، کسی سے نہ ڈرنے والا، گھوڑوں کی پشت پر بیٹھ کر سینہ سپر جنگجوؤں کا مداح، پشت سے آئے وار کا شکار ہو چکا ہوں...... اور یہ وار میرے اس اپنے نے کیا ہے جسے بے گناہ قرار دینے کی مجھ میں ہمت ہی نہیں ہے۔ میں اس وار کے آگے نہتا ہوں میراں۔ میرے ہاتھ اوپر کو اٹھے ہوئے ہیں اور ہونٹ سل چکے ہیں، میرے ہتھیار میرے قدموں میں پڑے ہیں۔"

میراں نے اس کی بات سنی اور ضبط گریہ کرتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اپنی ساری بات کہہ چکا تھا۔ اب اس کے پاس اور نہ خود میراں کے پاس کچھ کہنے کو باقی تھا۔

"تم مجسم دعا ہو میراں صلاح الدین، میرے لیے دعا کرنا میں اپنوں کی بوئی جو فصل کاٹ رہا ہوں، وہ کٹ جائے اور میرے ہاتھ شل نہ ہوں۔" اس نے آخری بات کی تھی اور فون بند کر دیا تھا۔ میراں سب کچھ پا کر بھی اسے ہار چکی تھی۔

☆☆☆

"میرا نام محمود دُرانی ہے، میں حمزہ کا والد ہوں اور آپ سے اپنی بیوی کے انتہائی غلط رویے کی معافی مانگنے آیا ہوں۔" محمود درانی نے باری، باری عافیہ اور جہانگیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"انہوں نے غلط رویہ ہی نہیں اپنایا، بہت بڑی زیادتی کی۔" عافیہ نے کہا۔

"وہ نا سمجھ اور بدبولی ہے، میں بتا نہیں سکتا میں کتنا شرمندہ ہوں۔" محمود درانی سر جھکائے ہوئے بولے۔

"کہے ہوئے الفاظ اور دیے ہوئے زخم واپس نہیں ہو سکتے...... لیکن پھر بھی آپ خود چل کر آئے ہیں اس لیے ہم اپنے دل سے بات نکال دیں گے۔" جہانگیر نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں حمزہ کے والد کی حیثیت میں خود آپ سے میراں کے لیے حمزہ کا نام تجویز کرنا چاہتا ہوں۔" محمود صاحب نے کہا۔

"اب شاید اس کی ضرورت نہیں رہی۔" عافیہ نے کہا۔ "آپ کی وائف کی توجہ دلانے پر ہی ہمیں خیال آیا کہ دوسروں کی طرف دیکھنے کے بجائے ہم میراں کو اپنی ہی بہو کیوں نہیں بنا لیں کیونکہ ہم تو اس کی عصمت

اور کردار کے گواہ ہیں، اس کے لیے ہمیں اپنے بیٹے کا طے شدہ رشتہ ہی کیوں نہیں توڑنا پڑے ہم اس نیک کام کو اپنے گھر ہی سے کیوں نہ شروع کریں۔"

"نہیں میری بہن......" محمود درانی نے عافیہ کی بات سن کر حمزہ کے چہرے پر اترتی بے چینی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں اگرچہ ابھی تک اس بچی سے ملا نہیں ہوں مگر بغیر دیکھے، ملے اور جانے ہی اس کی پاکبازی اور عصمت و کردار کی گواہی دیتا ہوں اور یہ کوئی جذباتی گواہی نہیں ہوگی، یہ حالات و واقعات کے منطقی تجزیے کا نتیجہ ہوگا۔" عافیہ نے کن انکھیوں سے جہانگیر سہگل کی طرف دیکھا۔

"ویسے عجیب سی بات یہ ہے کہ ہم سب اپنی، اپنی جگہ پر کوشش کر رہے ہیں، ہم نے میراں سے اس کی رائے نہیں لی، وہ اقبال، حمزہ، فہد ان تینوں میں سے اسے اپنے لیے کون مناسب ساتھی محسوس ہوتا ہے۔" جہانگیر سہگل نے یک دم کہا۔ ان کی بات سن کر وہ اقبال نے بے چینی سے اپنی نشست پر بیٹھے، بیٹھے پہلو بدلا تھا اور حمزہ اٹھ کر اندر چلا گیا تھا۔ اس کا رخ میراں کے کمرے کی طرف تھا۔ دروازے پر دستک دینے اور اندر داخل ہونے کی اجازت پانے کے بعد وہ میراں کے سامنے تھا۔

"مجھے زیادہ لمبی چوڑی باتیں کرنی نہیں آتیں میراں، یہ بات تم بہت پہلے سے جانتی ہو۔" اس نے اس کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے بغیر کوئی تمہید باندھے کہا۔

"ایک عرصے سے بی اماں اور خصوصاً بوا جی مجھے خواب میں تمہاری کھوج میں نکلنے کی تلقین کر رہی ہیں، ساتھ کے ساتھ وہ مجھے یہ اشارہ بھی دیتی رہی ہیں کہ تمہارے سر پر چادر ڈالنا میرا فرض اور میری ذمے داری ہے۔" اس نے رک کر میراں کی طرف دیکھا جو بہت توجہ سے اس کی بات سن رہی تھی۔

"میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا...... بچپن، ایک ہیولے کی طرح میری یادوں میں زندہ ہے...... مگر جب میں ایک عرصے بعد ایبٹ آباد گیا تو اس شہر کو دیکھ کر مجھے تمہارا اور بوا جی کا خیال آیا اور غالباً اسی روز سے میری ڈیوٹی لگ گئی کہ تمہیں تلاش کروں، تمہاری کھوج میں جہاں اتنے لوگ نکلے وہاں ایک دیا تمہاری تلاش کا میں نے بھی جلایا اور اپنی بساط بھر کوشش کرتا رہا ہے۔"

میراں کے چہرے پر الوہیت کے آثار نظر آنے لگے۔

"اور اب جب تم اس زنداں سے باہر نکل چکی ہو میرے سامنے موجود ہو، میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر تمہاری عصمت اور پاکبازی کی گواہی دیتا ہوں اور خود کو تمہارے ساتھ کے لیے سوالی کے طور پر پیش کرتا ہوں، بی اماں اور بوا جی تو شاید ہم دونوں کا تعلق بہت پہلے...... طے کر چکی تھیں، میں اس کمٹ منٹ کو حقیقت بنانے کے لیے تم سے ریکوئسٹ کرنا چاہتا ہوں، اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔ ہم دونوں مل کر بی اماں اور بوا جی کی ریتوں، روایتوں اور اس دم توڑتی اقدار کو دوبارہ زندہ کر سکتے ہیں جن کو ہم نے بھلا رکھا ہے کیونکہ اس نسل کی وضع داری کے امین شاید صرف ہم دونوں ہی ہیں۔"

"کیا تم اس پُر ہنگام زندگی سے دور مجھے پھر سے سادگی اور بے تکلفی کے اس دور میں واپس لے جا سکتے ہو جو بی اماں اور بوا جی کا دور تھا؟" میراں نے اس کی لمبی بات سننے کے بعد صرف ایک سوال پوچھا۔ "کسی ایسی جگہ جہاں میں اپنی نئی شناخت بنا سکوں جہاں میں بوا جی کی بیٹی اور بی اماں کی بہو کی حیثیت سے جانی جاؤں؟"

"بالکل!" حمزہ نے فوری جواب دیا۔ "میرا تم سے وعدہ رہا...... میں تمہیں ایسی ہی جگہ لے جا کر بساؤں گا۔"

"کیا تمہارے والدین مجھے قبول کر لیں گے؟" میراں نے دوسرا سوال کیا۔

"میرے والد باہر تمہارے سوالی بنے بیٹھے ہیں عافیہ آنٹی کے پاس۔"

"ٹھیک ہے، میں تمہارے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیتی ہوں۔" میرال نے ہاتھ بڑھایا، اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے حمزہ نے دیکھا وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی بھاری غلافی آنکھوں میں حزن تھا، ملال تھا، سوگواری تھی۔

"لو آج میں بھی تم سے دست بردار ہوئی مہرزاد خان۔" اور میرال سوچ رہی تھی۔ "ایک صرف تمہارے خیال سے نجات پانے کے لیے اس شخص کی نیک فطرتی اور پُر خلوص محبت کے آگے سرنڈر کر دینے میں مجھے کوئی ملال نہیں ہونا چاہیے...... مگر نہ جانے ایسا کیوں ہے کہ میرے اندر کچھ کٹتا محسوس ہو رہا ہے اور میرے جسم میں کانٹے سے چبھنے لگے ہیں۔"

☆☆☆

"میرا بیٹا، شہید کا بیٹا، ظالموں کے قبضے میں، حکومت مدد کرے، ہم کارواں بنائیں گے، احتجاجی ریلی وغیرہ۔ واہ بھئی اتنے کم دنوں میں تم نے بہت کچھ کر ڈالا۔ مجھے توقع نہیں تھی سائیں کہ تم اتنی باہمت ثابت ہوگی، بک اپ سائیں بک اپ۔"

"میں کانٹوں کے بستر پر سوتی ہوں صاحب، میری آنکھوں کی نیندیں اُڑ چکی ہیں، میرا بیٹا نہ جانے کس حال میں جیتا ہوگا۔"

"تو ایسا کرو ناں بابا ایک چیز ہوتی ہے ٹرینکولائزرز، کیا تمہیں ٹرینکولائزرز دے دوں لینا شروع کرو رات کو سونے سے پہلے، دماغ کو آپوں آپ (اپنے آپ) سکون آنا شروع ہو جائے گا۔"

"صاحب آپ باتوں میں تُرخار ہے ہیں مجھ کو۔"

"تو اور کیا کروں بابا...... اُدھر جہاں تمہارا بیٹا ہے ناں اُدھر بات کرنے کے لیے پہلے ڈالروں کی بوریوں کے منہ کھولنے پڑتے ہیں۔ ڈالر بات شروع کرواتے ہیں۔ ڈالر ہی بات آگے بڑھاتے ہیں...... لے آؤ اتنے ڈالر اور کرلو ان سے بات، نہیں تو پڑا رہنے دو اسے اُدھر اس اسکار چنگ ہیٹ میں ٹھنڈی ٹھار چٹانوں میں پڑا آرام کرتا ہے، canned فوڈ کھاتا ہے اور اصلی شراب پیتا ہے، اسے وہاں دکھ کیا ہے جو رو رہی ہو، بس رقت کو نالتی جاؤ، احتجاج کرتی رہو گا بے بگا ہے یہی تمہارے لیے لائن آف ایکشن ہے، اگر ڈیزاسٹرز جوڑے ختم ہو گئے ہیں تو وہ اور بنوا لو البتہ، یہیوں نے دبئی میں ایک نیا ڈیزاسٹر ڈھونڈا ہے، فرانس سے آیا ہے، دنوں میں جھنڈے گاڑ دیے اس نے، کہو تو اس کا ٹکٹ دے دوں؟"

"رہنے دیجیے...... بہت تمسخر اڑا چکے آپ ہماری بے بسی کا، وقت بدلنے کا وقت اب آیا ہی چاہتا ہے، اب آپ بھی تیل دیکھیں گے اور تیل کی دھار بھی۔"

"ہاہاہا...... ہمیں ذراتی ہو نہ بابا نہ...... یاد رکھنا رادھا کے ناچنے کے لیے بھی نو من تیل چاہیے ہوتا ہے، کوئی نو من تیل لائے گا تو رادھا کو نچوائے گا ناں...... اس لیے ہمیں تیل کی دھار کی کیا فکر بھلا!"

"اللہ آپ سے پوچھے صاحب، میرا تو خاندان برباد ہو گیا آپ کی دوستی میں۔"

"میں تو پہلے ہی عرض کرتا تھا تم لوگ ٹھہرے اہلِ علم و دانش کی اولادیں، فدوی اللہ والوں کی سرزمین کا خادم، دوستی کیسے ہوگئی کچھ سمجھ نہیں آیا۔"

''تھینک یو صاحب اینڈ گڈ بائے فار گڈ۔''

''گڈ بائے بی بی جان..... گڈ بائے۔ سانپ کی دھار دکھانے والی مکانی تم نہ جانے کدھر سے آ گئی تھیں اہلِ علم و دانش کے خاندان میں۔''

☆☆☆

اس کے سامنے تین شادیوں کے کارڈز رکھے تھے، سادہ مگر بے حد خوب صورت کارڈ تین باراتیں ایک ہی گھر سے نکلنے والی تھیں اور تینوں کو ایک ہی جگہ جا کر تین دلہنیں بیاہ کر لانی تھیں۔ ان تینوں باراتوں میں وہ بصد احترام مدعو تھا بلکہ شاید وی آئی پی گیسٹ ہوتا اگر وہ ان میں شرکت کرتا..... مگر وی آئی پیز کو مدعو کرنے کے جھگڑے اور قصے لمبے ہوتے ہیں، پروٹوکول، خصوصی انتظامات، حفاظتی دستے اور نہ جانے کیا، کیا..... اپنے میزبانوں کو اس زحمت سے بچانے کے لیے اس نے شرکت سے معذرت کر لی تھی۔ اس کی طرف سے تینوں جوڑوں کے لیے تہنیتی پیغامات کے ساتھ قیمتی تحائف بھجوائے جا چکے تھے۔ اس شام جب یہ تقریب منعقد ہو رہی تھی تو وہ اسکائپ پر عافیہ جہانگیر کے ساتھ رابطے میں تھا۔ تینوں نکاح مسجد میں ہوئے تھے اور تینوں باراتیں سادگی کے ساتھ کنٹری کلب میں اتری تھیں۔ تینوں دولھا خوب صورت تھے اور روایتی لباس میں شاندار لگ رہے تھے۔ وہ بہت دلچسپی کے ساتھ عرصے کے بعد کسی شادی کی تقریب دیکھ رہا تھا۔ تینوں دلہنوں نے روایتی گھونگٹ کاڑھ رکھے تھے۔ تینوں کو وہ ساتھ بیٹھے دولھاؤں کے ذریعے پہچان پا رہا تھا۔ فہد صدیقی کی دلہن، دانیال جہانگیر کی دلہن اور حمزہ محمود کی دلہن اس تیسری جوڑی پر آ کے آ کے اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ تینوں دولھاؤں کے چہرے پر ہنس اور مسکرا رہے تھے مگر لمبے گھونگٹ کاڑھے تینوں دلہنوں میں سے کون کتنی خوش تھی کون جانے..... اسے لگا وہ مزید نہیں دیکھ پائے گا..... اس نے اپنے ٹیب کی اسکرین آف کر دی اور گلاس وال کے پار اندھیرے میں چمکتی مصنوعی روشنیوں کو دیکھنے لگا۔

''میں کہتا تھا ناں کہ تمہاری قسمت کا ستارہ بہت بلند ہو رہا ہے جو بات منہ سے نکالتی ہو پوری ہو جاتی ہے، کیسے طنطنے کے ساتھ تم نے کہا تھا۔ دیکھتے ہیں کون یہاں سے جا کر واپس آتا ہے اور لو تمہاری کہی بات پوری ہو گئی۔ مبارک ہو اس بار بڑا بول حسبِ عادت تم نے بولا اور اس کی فصل مجھے کاٹنی پڑی..... مگر تمہاری عطا کردہ یہ سوغات میرے سر آنکھوں پر، بس ایک خواہش دل میں جاگتی رہے گی کہ تم ہمیشہ خوش رہو اور میرے دل کے نہاں خانوں میں بستی رہو۔'' اس نے حمزہ محمود کے پہلو میں بیٹھی دلہن کو تصور میں مخاطب کرتے ہوئے سوچا اور کمرے میں جلتی تمام روشنیاں بجھا دیں۔

☆☆☆

''اُف اگر حمزہ تمہاری ڈیٹ جاتا تو میں تو گیا تھا کام سے۔'' دانیال نے ہنس کر کہا تھا۔

''میں تو مر ہی جاتی۔'' بینش کی آواز ابھری۔

''میں تمہاری لائف ہوں جانِ من، تم کیسے مر سکتی تھیں.....'' دانیال کے لہجے میں شوخی ابھری تھی۔ وہ دونوں ہنس رہے تھے۔

☆☆☆

''مجھے ابھی تک یقین نہیں آیا کہ تم نے میرال کو چھوڑ کر میرا انتخاب کر لیا۔'' علینہ نے کہا۔

''میرال کو میں نے پکڑا کب تھا محترمہ..... اسے صرف تلاش کر رہا تھا میں، وہ بھی انسانیت کے نام

پر۔۔۔" فہد کی آواز آئی۔
"جاؤ، جاؤ جیسے میں جانتی نہیں۔" علینہ نے مصنوعی خفگی دکھائی۔
"تم واقعی نہیں جانتیں کیونکہ تم sadist ہو، اب دیکھنا، میں تمہیں کیسے ایک optimist میں convert کرتا ہوں۔"
"ایک بات بتا دوں، میں گھر میں کوکنگ نہیں کیا کروں گی کیونکہ یہ تمہارا شعبہ ہے۔" علینہ کی ہنسی کی آواز پھولوں سے سجے کمرے میں پھیلی۔
"چلو کوکنگ مت کرنا، کچن ڈریس ٹھکانے لگانا تمہارا کام ہوگا۔" فہد بھی ہنسا تھا۔
"نہیں، میں صرف زندگی انجوائے کروں گی...... ہاں زندگی کی ہر خوب صورتی کو رک کر کچھ دیر دیکھتے رہنے کی لگژری انجوائے کروں گی۔"
"leisure" نامی نظم کا ری ایکشن۔" فہد ہنسا۔
"بالکل......" اک ادائے ناز سے کہا۔
"چلو ٹھیک ہے، زندگی کی سب خوب صورتیاں اور یہ لگژری تمہارے نام۔" اب وہ دونوں اکٹھے ہنس رہے تھے۔

☆☆☆

"اللہ کا شکر ہے آج میں بی اماں اور بوا جی کے سامنے سرخرو ہوا۔" حمزہ کی پُرسکون آواز کمرے میں گونجی۔
"میں تمہاری ممنون ہوں کہ تم مجھے بیاہ کر بی اماں کے گھر لے آئے، اپنی ممی کے گھر لے جانے کے بجائے۔" میرال نے کہا تھا۔
"کیا تمہیں یہاں آ کر اپنائیت محسوس نہیں ہو رہی؟"
"لگتا ہے سب وہی ہے، اپنا سا، مانوس سا۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔
"یہ میرے اس عزم کی نشانی ہے جو بی اماں اور بوا جی کو خوابوں میں دیکھنے اور سننے کے بعد میں نے باندھا تھا۔ تمہاری تلاش اور تم سے شادی......"
"مجھے تمہارے عزم پر فخر ہے...... مجھے اپنا آپ بہت honoured محسوس ہو رہا ہے...... آسمانوں پر اُڑتا ہوا...... تم ایک عظیم انسان ہو۔"
"تم شاید اندازہ نہیں کر سکتیں کہ تم ایسے "تجربے" کو پا کر میں کتنا honoured محسوس کر رہا ہوں، مجھے یقین ہے تمہارے ساتھ چلتی صوفی صاحب کی دعائیں ہماری زندگی میں رحمت و برکت بھر دیں گی۔"
"اللہ کرے......" دل کے ساتھ زبان نے بھی پُرزور تائید کی۔
"انشاءاللہ......" وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

☆☆☆

گورنر ہاؤس میں جاری سرکاری تقریب کے دوران چینی نژاد پاکستانی مسز زوئی نادر حسین کو سماجی بھلائی کے کاموں میں اعلیٰ خدمات کے عوض صدارتی تمغہ برائے حسنِ کارکردگی سے نوازا گیا تھا۔ زوئی حسین کی ہسٹری بتانے والے کمپئر کی بات سننے کے بعد اکثر لوگوں نے اسے سفارشی انعام قرار دیا تھا۔ یہی تبصرہ ملک شہباز کو ملنے والی خصوصی انعامی رقم کے نتیجے میں بھی کیا گیا تھا...... مگر زوئی حسین اور نادر کو بخوبی اندازہ تھا کہ

ملک کی ایک بیٹی کی عصمت کو بچانے کے لیے چھوٹی سی سی ان پر کیسی بھاری بن کر گزر رہی تھی۔ تمام نامساعد حالات کا سامنا کر لینے کے بعد بھی زوئی حسین کی پاکستان سے محبت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ پُروقار سرکاری تقریب کے اختتام پر سبز ہلالی پرچم کے ہم رنگ سبز لباس اور سفید دوپٹے میں ملبوس زوئی حسین ٹی وی کیمرے کے سامنے اپنا میڈل پہنے کھڑی اپنی باریک آواز اور چہکتی لب و لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"مجھے پاکستانی قوم کی فرد ہونے پر فخر ہے۔ پاک سرزمین شاد باد....." اس کے ارد گرد کھڑے لوگ بھی ہاتھوں میں پکڑی چھوٹی، چھوٹی جھنڈیاں اٹھائے قومی ترانہ سنا رہے تھے۔

☆☆☆

قیوم نے "steady green" سگنل دینے کے بعد پیچھے ہٹتے ہوئے اپنے سامنے موجود سیسنا جہاز کو ٹیکسی فارورڈ کا اشارہ دیا اور مزید پیچھے ہٹ گیا۔ جہاز نے اپنے پہیوں پر آگے آتے ہوئے انجن سے دھواں چھوڑا اور دھیرے، دھیرے اوپر اٹھنے لگا۔ والٹن فلائنگ کلب لاہور کے فلائنگ انسٹرکٹر قیوم شہزاد کے لیے یہ فلائٹ، اس کی زندگی کا سب سے بڑا معجزہ تھی۔ چار سال قبل جو فلائر اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے جہاز سمیت بلندیوں سے نیچے آ گرا تھا۔ ایک ایسی فال جس نے جہاز کو آگ کے شعلوں میں لپٹے ہوئے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا تھا، جہاز اڑانے والے کا جسم زخموں سے چور تھا اور دماغ کوما میں جا چکا تھا اور جس کی جواں مرگی کا سوچ کر اس کی روح فنا ہوتی تھی اور جسے اس حادثے کے بعد ایک لمبے عرصے تک وہ موت اور زندگی کے دوراہوں پر کھڑے اور بھٹکتے دیکھتا رہا تھا۔ آج وہی ہوا باز..... اس کی نظروں کے سامنے اپنے کامل اعضا اور مکمل حواسوں کے ساتھ اس کے "steady green" سگنل پر ہاتھ کے انگوٹھے کے اشارے سے اسے چیئرز کا اشارہ دیتے ہوئے آسمان کی بلندیوں پر پرواز کر رہا تھا۔ قیوم نے اپنی زندگی کے اس سب سے بڑے معجزے کا نظارہ کرتے ہوئے اپنی بھیگی آنکھوں کو ہاتھ کی انگلیوں سے خشک کرتے ہوئے اپنے بائیں طرف کھڑے دانیال جہانگیر کی والدہ، والد اور بیوی کو دیکھا..... ان سب کی آنکھیں بھی برس رہی تھیں اور چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے۔

"وہ ایک مکمل فائٹر ہے....." قیوم نے عافیہ جہانگیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اور مکمل فائٹر ہی عظیم ترین فلائرز ہوتے ہیں۔"

"تم خوش قسمت ہو بیٹی جو تمہیں اس شخص کا ساتھ ملا جو اللہ کی قدرت کا چلتا پھرتا اور اس کی رحمتوں کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔" پھر اس نے بینش دانیال کو مخاطب کیا تھا جس کا معصوم چہرہ ہلکے گلابی دوپٹے کے ہالے میں اور بھی معصوم نظر آ رہا تھا۔

"ہم سب خوش قسمت ہیں مسٹر قیوم..... جو ایک حادثے نے ہماری زندگیوں کے محور بدل ڈالے، ہمیں راہِ ہدایت اور صراطِ مستقیم حاصل ہو گئی، اب یقیناً دانیال کی پرواز میں اور بھی مہارت اور خوب صورتی نظر آئے گی کیونکہ یہ ایک سچے اور پختہ ایمان والے کی فلائنگ ہے۔" عافیہ نے مسکرا کر کہا۔ آسمان کی بلندیوں پر دانیال کا جہاز یکساں اور متوازن پرواز کر رہا تھا..... ایک دعائے خیر نے ناممکن کو ممکن میں بدل ڈالا تھا۔

☆☆☆

"میں نے تمہاری ماں کو جو حقیقت تھی سچ، سچ بتا دی تھی مہرزاد خاناں....." بلغمی آواز والے بزرگ اس روز بھی اس کے گھر میں اس کے سامنے بیٹھے تھے، کمرے میں موجود باقی نشستوں پر بھی وہی جانے پہچانے

لوگ براجمان تھے جو برادری کی پنچایت میں شامل ہوتے تھے۔

"میں نے آپ کی اور اماں جان کی ساری بات سن لی تھی نانا جان---" اس نے تحمل سے جواب دیا۔ "اور آج صبح میں آپ کو فون پر اپنے فیصلے سے مطلع کر چکا ہوں پھر میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ نئی عدالت کس سلسلے میں لگی ہے؟"

"لو بُے چھنڈ، مہرزاد خاناں......!" وہ شخص جو اس کا سسر بننے کی سعادت سے محروم رہ گیا تھا اٹھ کر اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔ "تو زیادہ ہی غصہ نہیں کھا گیا۔ ان رشتوں، ناتوں کا کیا ہے، مقدر میں ہوں تو جڑ جاتے ہیں، نہ ہوں تو نہیں جڑتے، ان کے پیچھے تعلق داریاں تو نہیں ناں خراب کر لیتی ہم نے۔"

"ایسا بڑا یوٹرن......؟" وہ محفل میں بیٹھے ہونے کے سبب کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ بھی نہیں کر سکا تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے ادریس خان کی طرف دیکھا جو اس کے انکار کے نتیجے میں گدّی کو گھر بٹھانے والا تھا، وہ اسی کی طرف خوشامدی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے دیکھ رہا تھا۔ نظریں چار ہونے پر وہ اسی مسکراہٹ کے ساتھ بول اٹھا۔

"یار مہرزاد خان...... ابھی ہی تو میلا بھرنے لگا ہے، مت مارنی ہے ہماری جو بھری ہانڈی کو لات مار جائیں گے، چل شاباش!" اس نے پچکارا۔ "غصہ تھوک دے، قبیلہ اور برادری پہلے بھی تیرے پیچھے کھڑی تھی، اب بھی اسی طرح اسٹینڈ اسٹل ہے۔"

"اب اس کا کوئی فائدہ نہیں ادریس خان۔" مہرزاد خان کو ان سارے لہجوں اور رویوں سے کراہیت محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کا لہجہ اکھڑ رہا تھا۔ "میں اپنے فیصلے کی کاپی فارورڈ کر چکا ہوں اور اسے واپس لینے کا میرا قطعی کوئی ارادہ نہیں، میرے باپ کے مرنے پر جو وقتی خلا آپ لوگوں کی صفوں میں پیدا ہوا تھا، وہ پُر ہو چکا، اقتدار کے ایوانوں، بیوروکریسی، عدلیہ، مقننہ...... اس ملک کا کوئی ستون ایسا نہیں جس پر آپ لوگوں کے پنجوں کی گرفت مضبوط نہ ہو گئی ہو...... میرا کام اتنا اور ادھر تک ہی تھا...... اب آپ بے فکر ہو کر راج کر سکتے ہیں...... اور ہاں مزہ تو بھرا میلا ہی چھوڑ کر جانے میں ہے ناں......" وہ ذرا سا مسکرایا۔

"مگر وزارت......؟" ایک بوڑھی ہوئی آواز سنائی دی۔

"وزارت کی مدت رہ ہی کتنی گئی ہے۔" وہ طنزیہ ہنسی ہنسا۔ "اور اب تک تو یہ وزارت ایک ایسا لافنگ اسٹاک بن چکی ہے کہ جو بھی اسے اپنے سر پر سجائے گا لطیفوں کا بادشاہ اور ہنسی کا گول گپا ہی بن کر رہ جائے گا۔"

"نہ کر خاناں--- نہ کر ایسا...... آنے والے کئی الیکشنز تک ہمیں تیری ضرورت ہے۔" بلغمی آواز بولی۔

"آپ لوگ میری شہادت کیش کرانا چاہتے تھے، مجھے شہادت درکار نہیں تھی۔ نانا جان! میں اس شہادت سے دست بردار ہوا، اب آپ میرے اس فیصلے کو خاندانی اصول پرستی اور راست گوئی قرار دے کر برسوں کیش کراتے رہیے گا...... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"اپنی ماں کو بھی اپنا ہم نوا بنا کر تو نے تو پورا یوٹا ہی اکھیڑ ڈالا خاناں...... اس خاندان کو تیرے ایسا کہاں ملنا ہے برسوں...... ہر توقع کا رخ موڑ ڈالنے والا، ہر فیصلے پر سب کے منہ کھول دینے والا، ہر قدم پر سرپرائز، ہر موڑ پر اندھی گلیوں کو مات دے دینے والا...... نہ کر یہ ظلم خاناں نہ کر۔"

"آپ کو یاد ہے ناں آپ سب نے مجھے گولی سے وارن کیا تھا، وارن بھی کیا بلکہ تھریٹ کیا گیا تھا میں۔" وہ کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ "مجھے اس گولی سے بچنا ہے، میری زندگی اتنی کم قیمت نہیں، اتنی غیر اہم نہیں کہ جسے

میں شہادت کے نعرے مارنے والوں کے لیے قربان کر جاؤں۔ مجھے اپنی زندگی کو جتنی کہ وہ ہے بہت سے اور کاموں کے لیے استعمال کرنا ہے۔ ایسے کام جو میرے ہی کرنے کے ہیں۔ آج میں آپ کو آپ کے قبیلے کی، آپ کی برادری کی اور آپ سب حضرات کی اپنی، اپنی دستار، عزت، غیرت اور سرداری واپس کرتا ہوں، جتنی دیر یہ میرے پاس رہی، میرا خدا گواہ ہے میں نے اس سے غداری نہیں کی لیکن مزید وفاداری اب میرے لیے ممکن نہیں رہی لہٰذا اب یہ آپ کو مبارک ہو۔" اس نے حتمی لہجے میں آخری بات کی اور ان سب چہروں پر نظر ڈالی جن پر مایوسی تھی، شرمندگی تھی، پریشانی تھی، پشیمانی تھی، فکر تھی...... مگر چیلنج نہیں تھا، وارننگ بھی نہیں تھی اور دھمکی بھی نہیں تھی، مہرزاد خان نے بغیر اپنے مہرے، ادھر ادھر کیے انہیں سیدھی شاہ مات سے دوچار کر دیا تھا۔

☆☆☆

تمام ٹی وی نیوز چینلو پر ایک بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔ وفاقی وزیر اطلاعات ونشریات سردارزادہ مہرزاد خان نے اپنی وزارت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ انہوں نے نہ صرف وزارت بلکہ قومی اسمبلی کی رکنیت اور پارٹی کی بنیادی رکنیت سے بھی استعفیٰ دے دیا تھا۔ استعفیٰ کی وجہ ذاتی مسائل بتائی گئی تھی۔ چند منٹوں کے اندر سیٹلائٹ ٹی وی کے نیوز چینلو پر تمام مخصوص چہرے اپنے اپنے مائیک سنبھالے اس بریکنگ نیوز پر تبصرے اور بحث کرنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔

☆☆☆

"His was an entry of a leading soldier and his is an exit of a high-headed conqueror".

اگلے روز ایک لیڈنگ نیوز پیپر میں نامور صحافی نبیل رئیس کا تبصرہ اس عنوان کے تحت شائع ہوا تھا۔ نبیل رئیس جس نے چند ہفتے قبل ہی مہرزاد خان کی ترجمان کی حیثیت سے ذاتی اختلافات کی بنا پر استعفیٰ دیا تھا کا یہ تبصرہ جانبدارانہ اور انتہائی منطقی تھا۔

☆☆☆

"میں جانتا تھا بابا...... تم اگلا دایاں قدم ایسا اٹھاؤ گے جس کی خبر تمہارے بائیں قدم کو بھی نہیں ہوگی مگر تم نے یہ قدم کچھ اچھا نہیں اٹھایا۔"

"آپ سب جانتے ہیں سر!"

"ہاں بابا میں جانتا ہوں...... مگر یہ کوئی مردوں والی بات تو نہ ہوئی ناں......"

"میں نے پہلے روز کہا تھا سر، میں اپنی سی کوشش کروں گا لیکن اگر نظام کو نہ بدل سکا تو نظام کا حصہ بننے کے بجائے نظام کو چھوڑ جاؤں گا۔"

"پہلے روز کی کہی باتیں کوئی سمجھے تو نہیں ہوتی ناں سائیں، کیوں اپنا نقصان کرتے ہو...... آگے لمبا سیاسی کیریئر پڑا ہے، جانتے ہو تم کتنی بار گولی سے بچے ہو، اتنی بار گولی سے بچ جانے والے کو تو سنتے خیر اں ہوتی ہیں سائیں۔"

"آپ میرے قبیلے، میری برادری اور خاندان کو جانتے ہیں سر، میں ان کے سروائیول کے لیے انہیں ایک اور شہید کا تحفہ نہیں پیش کرنے والا۔ اب انہیں اپنے ہتھیار خود اٹھا کر فرنٹ پر آنا ہوگا...... یا تو ختم ہو جائیں گے یا ہمیشہ کے لیے مین اسٹریم میں آ جائیں گے۔"

"تو بابا میرا کیا قصور ہے اس میں، تمہارے راستے صاف کرنے کو میں نے کون، کون سا کانٹا کیسے نکالا جانتے ہو ناں......"

"جانتا ہوں سر...... اور اسی لیے آپ کو سلیوٹ کرنے آیا ہوں۔ آپ بہت بڑی سپورٹ رہے۔"

"یہ اچھی بات نہیں ہے سائیں، سپورٹروں کو یوں دغا دے جانا۔"

"میں یہ بھی جانتا ہوں اور معذرت خواہ بھی ہوں لیکن کبھی اگر مجھے محسوس ہوا کہ تبدیلی کا محض نعرہ نہیں لگ رہا تبدیلی واقعی نظر آنے لگی ہے تو لوٹ آؤں گا۔"

"یار تم تو بڑے گٹوں والے بندے ہو، حوصلہ مند چنگیز خان کے مداح، تم retreat کیوں کر رہے ہو سائیں۔"

"یہ retreat نہیں ہے سر، تمام چالیں ایک individual کو بچانے کے لیے تھیں۔ individual سروائیو کر گیا تو واپسی کا سفر آسان ہو جائے گا۔"

"صرف ایک لڑکی کی وجہ سے بساط الٹ کر جا رہے ہو سائیں، کم آن سائیں۔"

"صرف ایک لڑکی......؟" وہ ہنسا۔ "وہ صرف ایک لڑکی نہیں سر، وہ پورا جہان ہے۔ جب ہی تو اللہ مجھے ادھر لایا، الیکشن لڑایا، وزارت عطا فرمائی، وہ صرف ایک لڑکی ہوتی تو یہ اتفاقات کہاں ہاتھ لگتے۔"

"ایسی ہی ہوتی آئی ہے سائیں، اپنی محبوبائیں تمام ہیروز کو پورا جہان ہی نظر آتی رہی ہیں، جب ہی ہمیں دیکھو کہیں ایک جگہ دل نہیں لگایا۔ جو آئی اسے جانا تو ہے کہ مصداق کیا، کیا سمجھے گئے ہم۔"

"آپ کی تو بات ہی کیا ہے سر، آپ تو گریٹ ہیں، میں نے آپ سے بہت سیکھا ہے سر...... خصوصاً بساط پر بیٹھے بغیر چالیں چلتے دیکھنے کا فن۔ مگر میں ابھی تک ہاتھ کے کامل کہاں جو پردے کے پیچھے سے آئے اور سب مہرے میرے حق میں چل جائیں۔ اس انتہا تک پہنچنے کے لیے مجھے آپ کا سا سفر طے کرنا ہوگا...... وہی سفر طے کرنے جا رہا ہوں۔"

"bon voyage سائیں bon voyage، تم بہت کامیاب رہو گے، موقع پر آئے اور موقع پر نکل لیے...... آنے والا وقت تمہارا ہی ہوگا۔"

"مجھے میرے وقت کی بشارت مت سنائیں سر، میرے لیے اب سارے وقت ایک سے ہی ہوتے ہیں۔"

"ہاہاہا......"

"anyway تھینک یو فار دی سپورٹ یو آل ویز ا یکسٹنڈ ٹو می۔"

"تم ذہین تھے، سپورٹ تمہاری بنتی تھی، ورنہ کون محافظ اپنے ہی صاحب کو گولی مار دیتا ہے اور کون سا...... قاتل خود کو hired قاتل hire کرنے والے کو اغوا کر کے لے جاتا ہے۔ سب co-incidence کا نتیجہ ہے سائیں...... اللہ تمہاری حفاظت کرے۔"

"تھینک یو سر...... گاڈ بلیس یو۔"

"یاد رہے یہ ایک فارمل الوداعی ملاقات ہے، اندر کھاتے ہم ملتے رہیں گے۔"

"شیور سر شیور......!"

☆☆☆

تین سال بعد

لندن میں مقیم ساؤتھ ایشین اسٹڈیز کی استاد اور معروف پاکستانی صحافی کی کتاب "Meharzad

"khan a dynasty in himself" لندن کے ایک معروف اور مہنگے پبلشنگ ہاؤس سے شائع ہوئی اور ایک ساتھ پورے یورپ اور امریکا کے بک اسٹالز کے شیلفوں کی زینت بنی..... ڈیشنگ مہرزاد خان کی بلیک اینڈ وائٹ پروفائل والے سرورق سے سجی اس کتاب میں ایک پاکستانی سیاست دان کی زندگی کو موضوع بنا کر پاکستان بالخصوص اور جنوبی ایشیا بالعموم کی سیاست کے حالات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی تھی اور مہرزاد خان کو ایک تاریخ ساز، دیومالائی شخصیت کے طور پر سامنے لایا گیا تھا۔ اس کتاب نے اپنی اشاعت اور مارکیٹ میں آمد کے ساتھ ہی کتب بین حلقے میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ پورے یورپ اور امریکا کے تمام بڑے اخبارات میں اس کتاب پر ریویو لکھے گئے اور چھ ماہ کے اندر اندر ہی یہ کتاب booker's award کی ایک مضبوط امیدوار قرار دی جا چکی تھی۔

پاکستان میں البتہ اس کتاب کی خرید وفروخت پر مکمل پابندی لگ چکی تھی کیونکہ پاکستان میں مہرزاد خان کی پارٹی کی مخالف جماعت اقتدار میں آچکی تھی۔ انٹرنیٹ پر دستیاب یہ کتاب آئندہ آنے والے سالوں میں انتخابات اور نئی قیادت کے حوالے سے پاکستانیوں خصوصاً نوجوان پاکستانیوں کے ذہن میں کس انقلاب کا پیش خیمہ بننے والی تھی۔ یہ آنے والا وقت ہی بتانے والا تھا۔

☆☆☆

"ایک اجتماعی المیے سے مردانہ وار لڑنے والی پاکستانی قوم شاید ہی کبھی اندازہ کر پائے کہ اس اجتماعی المیے کے اندر کتنے ہی انفرادی المیوں نے جنم لیا۔ سن دو ہزار پانچ میں جس خوفناک زلزلے نے پاکستان کے شمالی علاقوں کو اپنے آہنی پنجوں میں آن دبوچا تھا۔ وہ ایک قدرتی آفت قرار دی جا سکتی ہے بلکہ وہ تھی ہی ایک قدرتی آفت ..... لیکن اس زلزلے کے اندر جنم لینے والے چھوٹے، چھوٹے انفرادی المیوں کو برپا کرنے کا ذمے دار کون ہے، کون ذمے دار ہے اس بچے کی موت کا جسے بھوک اور آفت کی دہشت کی ماری ماں نے خود اپنے ہاتھوں سے بلندی سے نیچے پھینک دیا، کون ذمے دار ہے ان لوگوں کی موت کا جو کسی امداد کا انتظار کرتے کرتے بے قرار ہو کر خود ہی پتھروں میں بھرے زندہ دفن اپنے پیاروں کو نکالنے چل پڑے اور خود بھی موت کا شکار ہو گئے۔ کون ذمے دار ہے ان سیکڑوں باعصمت دوشیزاؤں کی عصمت دری کا جو امدادی کیمپوں سے زخمی حالت میں اٹھائی گئیں اور آج تک جن کی کسی کو خبر تک نہیں کی۔ میں جانتی ہوں میرا یہ بلاگ، صرف چند سو لوگوں کی نظروں سے گزرے گا یا شاید اس سے بھی کہیں کم ..... لیکن کیا ان چند سو میں سے کوئی ایک ہے جو مجھے بتائے کہ ان باعصمت وباکردار زخمی بچیوں کو امدادی کیمپوں سے امداد اور طبی سہولتوں کے نام پر اٹھا کر کسی امراؤ بیگم، کسی زمرد خانم، کسی سلطانہ جان کے کوٹھے یا پھر کسی وزیر، مشیر، بڑے افسر، اعلیٰ عہدیدار کی سیجیں سجانے کو چھوڑ دینے والے ہاتھ کس کے ہیں، امدادی کاموں میں بے قاعدگیوں اور لوٹ مار کی تحقیقات کرنے والے کیا کبھی اس امر کی تحقیق بھی کر پائیں گے کہ ان بے کس، مجبور، لاوارث بچیوں کی عصمتوں کا قاتل کون ہے، حکومت، معاشرہ، ناقص قانون سازی یا پھر یہ سب مل کر ان کے مجرم ہیں؟

میں ایسی ہی گم کردہ راہ بچیوں میں سے ایک ہوں، جس نے اس عظیم انسانی المیے میں دنیا میں باقی بچنے والا اپنا واحد رشتہ بھی کھو دیا اور قیامت کے منظر اپنی آنکھوں سے دیکھے ..... امداد کے نام پر کیمپ سے اٹھائی گئی اور انسانی تماشوں کا حصہ بنتی رہی..... میرے مہربان رب نے نہ جانے کس، کس کی دعا کے صدقے ہر گام پر مجھے تباہی وذلت سے بچاتے ہوئے ایک عظیم انسان کی آستین پکڑا کر آگ کا دریا عبور کرایا اور اس سے آگے

بھی اپنی رحمتوں کے صدقے ایک اور عظیم انسان کے گھر کی عزت بنا دیا۔ آج میں اپنے جاں لٹا دینے کی حد تک محبت کرنے والے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ اپنی من چاہی زندگی گزار رہی ہوں...... لیکن زندگی کے ان خوب صورت و حسین رنگوں میں کھیلتے ہوئے جو آج مجھے میسر ہیں، کیا میں قدرت کی وہ قیامت خیزیاں اور انسان کی وہ شیطانیت بھلا پاؤں گی جنھیں میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا اور بار بار دیکھا..... کیا میں اپنی زندگی کی کتاب سے بھی وہ باب نکال پاؤں گی جو تاریک ہے مگر سب سے طویل بھی ہے۔"

پاکستان کی بہادر بیٹیوں میں سے ایک بیٹی کے نام سے... انٹرنیٹ فورم پر آنے والا یہ بلاگ مہر زاد خان نے بھی پڑھا اور اسے کسی طرح بھی یہ پہچاننے میں غلطی نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ بلاگ کس کا لکھا ہوا تھا۔

"بہت اچھا ہوا یہ بلاگ میری نظر سے گزر گیا۔" اس رات اس نے اپنے دل کے نہاں خانوں میں پوشیدہ اس شخصیت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے کسی بھی قسم کا رابطہ کرتے ہوئے ڈرتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ حمزہ محمود بہت عظیم انسان سہی مگر وہ فرشتہ ہرگز نہیں اور اسے میرے اور تمہارے ماضی کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے۔ میں تمہاری ہنستی مسکراتی زندگی کو طوفانوں کی نذر کر دینے کا جرم کیسے کر سکتا ہوں لیکن تمہارا یہ بلاگ پڑھنے والوں کو تو کیا پیغام دے گا، میں نہیں جانتا مگر مجھے یہ پیغام دے گیا ہے کہ تم خوش ہو، مطمئن ہو، اللہ نے تمہیں شوہر کی محبت اور اولاد جیسی نعمت سے نواز رکھا ہے، بھلا بتاؤ میرے جیسے انسان کے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کا اہتمام اور کیا ہوگا۔"

☆☆☆

وہ اپنے پسندیدہ ترین لیبارڈور ریٹریور کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اعلیٰ نسل کا یہ لیب (lab dog) پچھلے پانچ سالوں سے اس کے ساتھ تھا، جن دنوں وہ بہت مصروف رہا کرتا تھا اس وقت بھی وہ اس کے لیے وقت نکال لیا کرتا تھا اور اب تو ہر ویک اینڈ پر اس کے دن کا ایک حصہ ضرور اس کے ساتھ کھیلتے گزرتا تھا۔ دنیا کے بہترین کتوں کی نسل میں سے ایک یہ کتا... اپنی ذاتی وفاداری، دوستانہ فطرت، دوسروں کی راہنمائی کرنے کی صلاحیت اور محبت کے فطری جذبے رکھنے کی وجہ سے دنیا کے بہترین کتوں کی کسی بھی دوسری نسل سے اُسے کہیں زیادہ پسند تھا۔ اس وسیع سر سبز لان کی لش گرین گھاس پر لیٹا وہ لیب کے خصوصی کرتبوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا جب اس کے قریب کسی کے قدم آ کر رکے تھے۔ اس نے یونہی لیٹے، لیٹے ایک نظر ذرا اپنے دائیں طرف ان ڈارک براؤن چمکیلے کورٹ شوز پر ڈالی اور مسکرا کر سر اٹھاتے ہوئے اوپر دیکھنے لگا..... اس کی یہ خصوصی مہمان اس کے اس وقت کی خوشگی اپائنٹمنٹ لے چکی تھی..... اور اس نے دیکھا اس کی مہمان کے عقب میں سورج کی تیز کرنیں چمک رہی تھیں۔

"کیا یہ ایک پرفیکٹ ویک اینڈ ہے؟" اس کی مہمان نے چاکلیٹ براؤن لپ اسٹک سے سجے اپنے ہونٹ پھیلاتے ہوئے کہا۔ وہ آف وائٹ بلاؤز اور چاکلیٹی رنگ کے پھولوں سے سجی..... اسکرٹ میں ملبوس تھی۔ اس کے گلے میں قیمتی موتیوں کی مالا نظر آ رہی تھی اور کانوں میں انہی موتیوں کے اسٹڈز سجے تھے۔ اس نے بالوں کو ایک ڈھیلے جوڑے کی شکل میں باندھ رکھا تھا اور وہ ہمیشہ سے زیادہ میچور اور دل کش نظر آ رہی تھی۔

"ہاں، یہ ایک بہت پُرسکون ویک اینڈ ہے۔" وہ گھاس پر سے اٹھتے ہوئے بولا اور اپنی کشیروئل پولو شرٹ کی پشت پر چپکے گھاس کے تنکے جھاڑنے لگا۔

"کیا یہ ایک اچھی ریٹائرڈ لائف ہے؟" اس کی مہمان نے اس کے ہمراہ چلتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے بتایا یہ ایک بہت پرسکون زندگی ہے، ریٹائرڈ اگرچہ نہیں۔ میں محنت کرتا ہوں اور اس محنت کی کمائی پر زندگی گزار رہا ہوں، یہ ایک اچھی زندگی ہے۔"

"دنیا بھر کی لیڈنگ یونیورسٹیز میں جنوبی ایشیا کی سیاست پر وزیٹنگ لیکچر دینا محنت ہے کیا؟" وہ مسکرائی اور اس کے ساتھ چلتی وسیع بیک یارڈ میں چھت کی طرح تنی سرسبز و شاداب بیلوں کے سائے تلے رکھی کرسیوں میں سے ایک پر جا کر بیٹھ گئی۔

یشل رئیس اس روز خصوصی طور پر نارتھ کیرولینا کے علاقے ڈرہم میں واقع سردار مہرزاد خان کے اس جاپانی طرز تعمیر کے شاہکار فارم ہاؤس میں اس سے ملنے آئی تھی۔ اس وسیع فارم ہاؤس میں مہرزاد خان تنہا رہتا تھا۔ چند ماہ قبل ہی یہاں اس کی والدہ کا انتقال ہوا تھا۔ وہ ساڑھے تین سال پہلے اس کے ساتھ یہاں آ گئی تھیں۔

"ہاں یہ محنت کی کمائی ہے۔" وہ گارڈن چیئر پر آرام سے بیٹھتے ہوئے بولا۔ "اس میں کوئی دھوکا، ڈراما اور سیاست انوالو نہیں ہے۔"

"آپ پاکستان سے کیوں فرار ہوئے...... دھوکے، ڈرامے اور سیاست کی وجہ سے؟" یشل نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں وہاں سے فرار ہوا نہ ہی میں نے خود ساختہ جلا وطنی اختیار کر رکھی ہے۔" مہرزاد نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ "میں کوئی عزم لے کر وہاں گیا تھا نہ ہی کرسی و دیواروں کو دھکا دینے کا خیال میرے ساتھ تھا۔ مجھے حالات کی ستم ظریفی خود بخود بہا کر وہاں لے گئی تھی۔" اس نے اپنے ذاتی ملازم کی پہنچائی جانے والی چائے کے لوازمات پر نظر ڈالتے ہوئے کہا..... جو ایک عمدہ دیک اینڈ ٹی کے لیے کافی تھے۔

"زندگی کی اکثر چوائسز ہماری اپنی نہیں ہوتیں...... پاکستان جانا اور اپنے باپ کی چھوڑی سرداری کو سنبھالنا میری چوائس نہیں تھی مگر اس وقت کے حالات کا تقاضا تھی۔ میرے علاقے کے لوگ خود کو بے آسرا اور یتیم سمجھ رہے تھے، ان کے سروں پر ہاتھ رکھنا میرا فرض تھا۔"

"کیا اب وہ ایسا نہیں سمجھ رہے ہوں گے؟" یشل نے بٹر بلڈ مفن اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"اب......!" وہ مسکرایا۔ "میں نے اس مختصر عرصے میں وہاں چھوٹے بڑے سرداروں کی شروعات ہوتے دیکھی ہے، اب ہر پندرہ گز کے فاصلے کے علاقے کا اپنا ایک سردار ہے، ہر سردار کے اپنے مفادات ہیں اور ان مفادات کے لیے وہ سب اپنی، اپنی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اس علاقے کو شاید ایسے ہی زمینی حقائق سوٹ کرتے ہیں۔"

"آپ کی پاکستان میں انٹری اور ایگزٹ...." یشل نے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا دونوں ہی غیر متوقع نہیں رہے؟"

"زندگی کے اس اسٹیج پر جہاں ہم سب انسان اپنا، اپنا حصہ پرفارم کر رہے ہیں، ہم سب میں سے ہر ایک کے لیے دو ہی چیزیں تو سب سے اہم ہیں، کون کیسے انٹر ہوا اور کون کیسے ایگزٹ کر گیا۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"میں اقرار کرتی ہوں کہ زندگی کے اس اسٹیج پر آپ سے بہتر پرفارمر ابھی تک میں نے کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔" یشل نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔ "اور آج میری یہاں آمد کا ایک مقصد اپنی ان تمام منفی اور تلخ باتوں پر معذرت کرنا بھی ہے جو اپنے استعفیٰ پیش کرنے کے دن میں نے آپ سے کیں۔"

''اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔'' وہ ایک بار پھر مسکرایا۔ ''اس حادثے کے روز تمہارا پیغام، میرے استعفیٰ پر تمہارا کالم اور گزشتہ سال شائع ہونے والی تمہاری کتاب، تمہاری سوچ کی عکاس ہے اور یہ سب چیزیں مجھ تک پہنچ چکی ہیں...... تمہیں یاد ہوگا میں نے کہا تھا کہ میں کوشش ضرور کروں گا، کامیاب نہ ہوسکا تو چھوڑ جاؤں گا۔''

''کیا اسی کو فرار نہیں کہتے؟'' ہیتل کے لہجے میں طنز کی چبھن اتری۔

''نہیں، یہ بقا ہے......'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس نظام سے جڑے رہتے ہوئے اور اس کو بدل ڈالنے کا ایک کھوکھلا اور انفرادی نعرہ لگاتے ہوئے چاروں میں سے کسی ایک بھی سمت سے آتی ہوئی گولی کا شکار ہو جانا مردانہ واری کہلاتی کیا......؟''

''ضروری تو نہیں کہ ایسا ہی ہوتا۔'' ہیتل نے کہنا چاہا۔

''ضروری ہی تھا کہ ایسا ہوتا...... سو فی صد امکان یہی تھا۔'' اس نے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھتے ہوئے اپنی کرسی کو پیچھے کی طرف جھلایا۔ ''تم بتاؤ میں کس کے نعروں کے لیے شہید ہو جاتا، شہادت کا درجہ تو کیا ملتا کس، کس کے مفاد اس خود ساختہ شہادت سے نہ جڑ جاتے...... میں کیوں اپنے تابوت کو کتوں کے دانت تیز کرنے کے لیے چھوڑ دیتا...... میں کیوں بقا کا راستہ نہ اپناتا...... بقا جس میں نئی امید کی کونپلیں کھل سکتی ہیں...... میں نے اپنے ہتھیار پھینکے نہیں، اپنے قدموں میں رکھے ہیں، بقا کی شکل میں کسی بھی وقت جنہیں دوبارہ اٹھایا جاسکتا ہے۔''

''میں جانتی ہوں آپ ہارے نہیں، آپ نے پشت پروا نہیں کھایا، مختصر ہی سہی اس عرصے میں آپ نے دلوں میں گھر بنائے ہیں، جس کا ثبوت آپ کے حامیوں اور مخالفین کے وہ بیان ہیں جو آپ کے استعفیٰ پر سامنے آئے۔''

''میری وہی ایک انفرادی کوشش ایک روز اجتماع کی آواز بنے گی تم دیکھنا...... اور اسی روز کے انتظار میں، میں یہاں رہتے ہوئے اپنی توانائیاں جمع کر رہا ہوں۔'' اس نے اپنے اردگرد دیکھا۔

''یہاں سکون ہے، میرے پرندے ہیں، جانور ہیں، درخت ہیں، پھل پھول ہیں، کتابیں ہیں، میں ہوں...... اور......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''اور......'' ہیتل نے اس کی طرف دیکھا۔

''اور میری سوچ کا لگایا ہوا باغ ہے۔'' وہ مسکرایا۔ ''کسی کے بارے میں میری ہر سوچ میرے دل میں ایک پھول کھلا دیتی ہے اور اب تک یہ پھول ایک وسیع باغ میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ میں ان پھولوں کی چھاؤں میں خوش باش، مسرور و مگن دن، رات گزارتا ہوں۔''

''وہ......'' ہیتل کے لہجے میں ایک بار پھر طنز ابھرا۔ ''وہ جو صرف ایک نہیں تھی...... وہ جو پورا جہان تھی...... آپ نے اسے بھی ہار دیا؟''

''تمہیں معلوم نہیں اسے جیت کر بھی تو میں نے ہارنا ہی تھا۔'' وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بدصورتی میں چھپی جس خوب صورتی کو...... کیچڑ میں کھلے جس کنول کو میں وہاں سے نکال لانا چاہتا تھا...... وہی بدصورتی اور کیچڑ میرا اپنا جہان تھی۔ وہ مجھے جہاں تک جانتی تھی اس سے آگے میں بہت مکروہ تھا، گندا اور بدصورت، وہاں تک اسے لے کر آتا تو وہ سانس لینا بھول کر مر جاتی۔ اسی لیے میں نے اسے جیت کر بھی ہار دینا بہتر جانا۔''

''اور اس کے بعد آپ موت سے ڈرنے لگے؟''

"نہیں، اسی کے بعد تو مجھے زندگی سے پیار ہونے لگا...... اس سے پہلے تو موت مجھے ایک کھیل لگا کرتی تھی...... اس کی یاد نے تو مجھے زندگی جینا سکھا دیا۔ میں خود کو کیوں اُن، ان گنت روحوں میں شامل کر دیتا جن کی یاد میں تو اب کوئی ایک شمع تک بھی نہیں جلاتا...... میں اپنی جان کو کسی تعمیری کام میں کیوں نہ مصروف کر دیتا...... ایک مقصد ادھورا رہ گیا تو کیا ہوا...... کئی اور مقصد تو پورے ہو سکتے ہیں۔"

"یونہی رہ جائیں گے، اکیلے اور مست......؟"

"ہاں کیونکہ یہ ہی میرا مقسوم ہے۔" وہ ایک بار پھر مسکرایا۔

"میں نے واقعی آپ کو غلط سمجھا...... میرا خیال تھا آپ نظام کا حصہ بن چکے ہیں۔"

"نظام......!" وہ ہنسا...... "نظام تو بس ایک نام ہے، ہم ہی تو ہیں جو نظام بناتے ہیں، ہم ہی تو ہیں جو نظام کو فرسودہ اور مکروہ شکلیں عطا کرتے ہیں۔ ہم خود ہی تو نظام ہیں...... ہم نہ بدلے تو نظام کیا بدلے گا...... میں نے اس بھاری پتھر کو بدقت اٹھایا، چوما اور پھر واپس رکھ دیا۔ میرے لیے زندگی میں کرنے کو شاید اور بہت سے کام تھے۔"

"کوئی پچھتاوا، کوئی دکھ......؟"

"نہیں، میں بہت مسرور ہوں، خوش ہوں، میں نے دعا کی تھی، اس نے قبول کی اور اسے پورا کر پایا۔ اسی دعا کے ماحصل سے جب مجھے خوشی اور مسرت کی لہریں وصول ہوتی ہیں تو میرا جہان اور بھی خوب صورت ہو جاتا ہے۔ میں خوش ہوں کہ میرے شہر یاراں کی گلیاں تر و تازہ اور شاداب اور پرسکون ہیں، کیا میرے جینے کے لیے خوشی اور اطمینان کا اتنا احساس ہی کافی نہیں......" اس نے ہیثل کی طرف دیکھا اور لمحے کے اس ہزارویں حصے میں ہیثل کو سمندروں دور زندگی گزارتی میرال صلاح الدین پہ ٹوٹ کر رشک آیا۔

"آپ واقعی بہت unpredictable ہیں۔" ہیثل نے بے ساختہ کہا۔

"انسان کو ہونا بھی چاہیے...... قلم کار کو اپنے قاری سے کم از کم دو قدم آگے چلنا چاہیے...... جس کہانی کی ابتدا پڑھ کر قاری انتہا کا پتا نہ لگا لے وہ کامیاب کہانی نہیں ہوتی۔"

یہ وہ زریں الفاظ تھے جن پر آکر مہرزاد خان سے گفتگو کا اختتام ہوا۔

"an afternoon with brown beard and olive green eyed sardar from pakistan" ہیثل نے اپنے نوٹ پیڈ پر اس گفتگو کا عنوان ٹائپ کیا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ مہرزاد کے سر پر چھت کی طرح تنی مارننگ گلوری کی بیل کے نیچے جھولتی ایک شاخ کو ہمنگ برڈ نے اپنی چونچ میں دبوچ رکھا تھا۔ اس شاخ کو چھوڑ کر کسی اور شاخ کو دبوچنے کی چاہ میں ہمنگ برڈ نے اپنی چونچ کھولی اور جھولتی شاخ سے کتنے ہی شنگرفی رنگ کے پھول گر کر نیچے بیٹھے مہرزاد خان پر بکھر گئے۔

"کچھ لوگوں کو نیچر خود tribute پیش کرتی ہے شاید اسی طرح جیسے ان پھولوں نے گر کر مہرزاد خان کو پیش کیا۔ کیا کوئی بھی دوسرا tribute اس tribute کا مقابلہ کر سکتا ہے۔" ہیثل نے سوچا اور مسکرا دی۔

"یہ ایک بہت اچھا انٹرویو تھا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"ہاں...... ہمیشہ کی طرح۔" وہ بھی مسکرا دیا اور اپنی جگہ پر بیٹھے، بیٹھے ہیثل ریمس کو خود سے دور جاتے دیکھنے لگا۔ حسین شام کے شنگرفی سائے سارے میں پھیل رہے تھے۔

(ختم شد)